مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا

علم المعیشت

اصول اکنامکس یا پولٹیکل اکانمی

پر

اُردو میں سب سے پہلی جامع اور مستند کتاب

مصنفہ

محمد الیاس برنی ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

پروفیسر اکنامکس محمڈن کالج علی گڑھ

بار اوّل

بسلسلۂ اشاعات انجمن ترقی اُردو

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں طبع ہوئی ۱۹۱۷ء

میں علمی مشاغل کے اس ثمر اولین کو

بطور اظہار عقیدت و امتنان

اپنے لایق و شفیق اُستاد

مسٹر جے۔ ایچ۔ ٹول ایم۔ اے (کینٹب)

پرنسپل محمڈن کالج علی گڑھ

کے

نام نامی سے منسوب کرتا ہوں

جنکی

کارگر توجہ اور قابلانہ تعلیم نے میرے

دل میں علم المعیشت کا مستقل شوق پیدا کیا

محمد الیاس برنی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

تعلیم کے ذریعہ سے عوام میں بیداری پھیلائے بغیر قوم کا سنبھلنا ممکن نہیں اور
غیر مادری زبان میں عوام کو تعلیم دینا اکارت ہے اوّل تو اس کا اہتمام دشوار دوم
زبان سیکھتے سیکھتے عمر کا بہترین حصہ نکل جاتا ہے اور جب علم پڑھنے کی نوبت آتی ہے
تو نہ سکت باقی رہتی ہے اور نہ موقع۔ غیر مادری زبان کی وساطت سے عوام کو تعلیم
دینے کی کوشش کا نتیجہ کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ اسوقت قوم کی ایک سب سے بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ جنکو خدا نے ضروری
استعداد عطا کی ہو وہ علوم جدیدہ پر کامل دسترس حاصل کر کے اُن کا مادری زبان میں
ترجمہ کر ڈالیں اور ساتھ ہی عوام کا بھی فرض ہے کہ ان کوششوں کی مناسب قدر
کر کے کارگذاروں کی ہمت بڑھائیں۔ بنگالی مرہٹی ہندی جیسی محدود زبانوں کو
اُن کے سرپرست علوم جدیدہ کے ترجموں سے مالا مال کرنے میں کس سرگرمی

سے مصروف ہیں اور اردو جو اپنی حیرت انگیز وسعت پذیری سے عام ملکی زبان بننے کی صلاحیت کا روز افزوں ثبوت دے رہی ہے اسکی ترقی کے متعلق بہی خواہان قوم کی جو ذمہ داری ہے محتاج بیان نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ کچھ عرصہ سے ترقی اُردو کی ضرورت کا احساس روز بروز ہر طرف پھیل رہا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ وہ دن بہت دُور نہیں جبکہ اُردو بھی دنیا میں اوّل درجہ کی ہونہار اور زندہ زبان شمار ہوگی۔

چونکہ تہذیب جدید کا رجحان مالی ترقیات کی طرف خاص طور سے بڑھا ہوا ہے اور علم المعیشت کا بھی مالی ترقیات سے بغایت قریبی تعلق ہے اسلئے علم ہٰذا کی کل ترقی یافتہ ممالک میں ایک دھوم مچی ہوئی ہے۔ ہر سال صدہا نئی نئی تصانیف شایع ہو رہی ہیں کثرت سے اخبار و رسائل اس کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں نہ صرف حکومت و سیاست کی رگ و پے میں معیشت کے اصول سرایت کیے ہوئے ہیں بلکہ زندگی کے معمولی کاروبار تک میں قدم قدم پر عوام کو معاشی معلومات کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے خود ہندوستان میں اس علم کو دن دونی اور رات چوگنی ہر دلعزیزی حاصل ہو رہی ہے۔ یہ عام رجحان سراسر اقتضائے وقت ہے اور خدا جانے اس میں کیا کیا قوتیں مضمر ہیں۔

ترقی اُردو کی ضرورت اور اشاعت علم المعیشت کی مصلحت پر نظر کر کے اوّل اوّل ایک مختصر سی ابتدائی کتاب لکھنے کا قصد ہوا۔ لیکن جب لکھنے کی نوبت

آئی تو محض سطحی اور ادھوری بحث پر اکتفا کرنا گوارا نہو سکا اور طبیعت نے مجبور کیا کہ ایک جامع اور مستند کتاب لکھنی چاہیے جس میں کل ضروری اصول و مسائل صحت و وضاحت سے پیش ہوں اور کوئی بحث تشنہ نہ رہنے پاوے۔ چنانچہ باوجود اختصار مدنظر رکھنے کے اکثر مباحث مبتدیوں کی ضرورت سے بڑھ کر منتہیوں کی دلچسپی کی حد تک پہنچگئے لیکن اس جامعیت کے باوجود بھی کتاب مبتدیوں کے واسطے کافی سہل رہی۔ اوّل تو ہر بحث میں ایسی تشریح اور ترتیب اختیار کی گئی ہے کہ اگر چاہے تو مبتدی بھی تھوڑی کوشش سے عبور حاصل کر لے۔ دوم بغرض ہدایت فہرست مضامین میں کل دشوار دشوار مقامات پر چلیپا نما نشان بنادیا گیا ہے اور اُن کو ترک کرنے پر باقی حصہ محض ایک سہل سی ابتدائی کتاب رہجاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس میں بھی وہی سلسلہ مضامین قائم رہے۔ چنانچہ امید ہے کہ اردو داں مبتدی اور انگریزی خواں منتہی ناظرین کے دونوں طبقے اسی ایک کتاب کے مطالعہ سے حسب استعداد لطف اور فائدہ اٹھا سکیں گے۔

اس کتاب میں نہ تو کسی انگریزی تصنیف سے ترجمہ کیا گیا اور نہ کسی مصنف کی خاص طور پر تقلید کی گئی ہے بلکہ مستند اور منتخب کتابیں مطالعہ کر کے اصول خذ ما صفا و دع ما کدر کے مطابق ہر مبحث کو بطور خود بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کے لکھنے میں سلاست زبان صفائی بیان اور دلچسپی عنوان یہ تین پہلو

خاص طور سے مدنظر رہے ہیں۔ اکثر مثالیں ہندوستان سے لی ہیں اور حسب موقع
اصولی بحث کے تحت میں ہندوستان کی معاشی حالت پر بھی جا بجا روشنی ڈالی
گئی ہے۔ بالخصوص تجارت بین الاقوام، ہندوستانی تجارت خارجہ کی سرگذشت
اور ہندوستان میں گرانی کے اسباب و نتائج ان تین ابواب میں بہت سے غور
طلب معاملات آئے ہیں۔

اکثر مصنفین نے مضمون کو اپنے اپنے طرز پر ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے
بھی ترتیب میں کسی خاص کتاب کی پیروی نہیں کی۔ اکثر تو ہر بحث پر ماسبق
مباحث کی روشنی پڑتی ہے لیکن کہیں کہیں مباحث مابعد سے بھی مدد لینے
کی ضرورت آپڑی ہے۔ ہم نے ناظرین کی سہولت کے خیال سے ہر موقع پر مباحث
متعلقہ کا حوالہ دیدیا ہے۔ اور امید ہے کہ ان کو شریک مطالعہ کرنے سے اصلی
بحث کے سمجھنے میں قابل قدر مدد ملے گی۔ ہر باب اور فصل چند اجزا میں منقسم ہے
اجزا کے نمبر شمار کے حوالہ سے کل مضمون کا خلاصہ بحث سے قبل بعنوان تجزیہ پیش کر دیا
گیا ہے اور ہر ہر جزو کا خلاصہ اُس کی ابتدا کے ساتھ حاشیہ پر درج ہے
تاکہ مضامین کی ترتیب بالکل آئینہ ہو جاوے اور مطالعہ میں ناظرین کی رہنمائی ہو۔

اصطلاحات کا ترجمہ بیشک ٹیڑھی کھیر ہے۔ حتیٰ کہ اسی دقت کے خیال سے
بعض لوگ کتاب لکھنے سے بچتے ہیں۔ لیکن اصطلاحات کو یوں ہوا بنانا ٹھیک نہیں۔
علوم جدیدہ کے نفس مضمون کا بیان مقدم ہے۔ رہیں اصطلاحات تو یہ کتاب لکھتے

وقت جو بہترین نظر آئیں اختیار کرلی جائیں۔ ان میں ضروری اصلاح اور ترمیم بعد کی تحقیق اور تنقید سے ہوتی رہیگی۔ خود انگریزی اصطلاحات اسیطرح بتدریج قرار پائی ہیں۔ عمدہ اصطلاحات کی ضرورت سب کو تسلیم ہے۔ لیکن اگر اوّل علم کا ترجمہ پیش کردیا جاوے تو ایسی اصطلاحوں کی تیاری میں بہت سہولت ہوگی۔ وجہ یہ ہے کہ اصطلاح تجویز کرنے کے واسطے ایک طرف تو خود علم سے عمدہ واقفیت ہونی چاہیئے۔ دوم عربی فارسی میں اعلیٰ دستگاہ بھی ضروری ہے اور یہ دونوں صفات کمتر یکجا پائی جاتی ہیں لیکن محض عربی فارسی کے عالموں کی کوئی کمی نہیں پس اگر نفس مضمون اُردو میں اُن کے پیش نظر ہوجاوے تو وہ بآسانی تمام مناسب اصطلاحات مقرر کرسکتے ہیں۔ چنانچہ یہی خیال ہے جس نے اصطلاحات کی دقت کو سدِّراہ ہونے نہ دیا اور موجودہ کتاب لکھنے کی جرأت دلائی نفس مضمون حتی الامکان پوری صحت اور وضاحت کے ساتھ پیش کردیا ہے اور اپنی سی کوشش کرکے موزوں اصطلاحات بھی وضع کی ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض کا غیر صحیح یا ناموزوں ہونا عجیب نہوگا۔ ایسی اصطلاحات پر اعتراض کرنا بجا اور ضروری سہی لیکن بہتر بدل نہ ملنے تک لاحاصل بھی ضرور ہے۔ اصطلاحات کے متعلق جو خیال ہے صاف عرض کردیا گیا تاہم ناظرین براہ مہربانی جب بہتر اصطلاحات تجویز فرمائیں گے تو انکو نہایت شکریہ کے ساتھ شامل کرلیا جاوے گا۔ رہے انگریزی الفاظ سو نہ تو بلا ضرورت ان کی بھرمار کی ہے۔ اور نہ خواہ مخواہ ان کی بجائے غیر مانوس عربی

فارسی لغات ٹھونسے ہیں۔ انگریزی کے صرف مروّجہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جنکو عوام بھی بلاتکلف سمجھتے اور بولتے ہیں برائے سہولت ناظرین انگریزی اردو مرادف اصطلاحات وغیرہ مندرجہ کتاب کی ایک جامع فہرست بھی بطور ضمیمہ اول شامل کر دی گئی ہے۔

۳ علم المعیشت افعال انسانی کا ایک خاص نقطہ نظر سے مطالعہ کرتا ہے لیکن انسان کے افعال بہت کچھ اس کے ارادہ کے تابع ہیں اور وہ کسی عام قانون کے اس درجہ پابند نہیں ہوسکتے جیسے کہ بے جان چیزوں کے افعال ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس علم کے اصول و قوانین بیشتر تخمینی ہیں۔ اُن میں وہ تعین نظر نہیں آتا جو ہندسہ یا طبیعات جیسے علوم کے قوانین کو حاصل ہے۔ دیگر علوم تمدن مثلاً تاریخ اور معاشرت کا بھی یہی حال ہے جان اسٹوارٹ مل جیسے عالی دماغ منطقی و فلسفی کو شوق ہوا کہ معاشی مسائل کا بھی قطعی فیصلہ کر دے چنانچہ بزعم خود اُس نے مسئلہ قدر کو طے کرکے اس کی تکمیل کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح پر مسئلہ اجرت فنڈ پر اُسکو اتنا ہی اعتماد تھا جتنا کہ کسی کو قانون کشش مرکزی پر اُس کی علمیت کے رعب میں آکر کچھ روز عوام بھی اس علم کو تقریباً ہندسہ و طبیعات کی مانند معین خیال کرنے لگے لیکن تیس سال کے اندر اندر مل کا مغالطہ رفع ہوگیا اور غیر معروف ہمعصر نکتہ چینوں نے بالآخر مسئلہ قدر کی تنگ نظری اور مسئلہ اجرت فنڈ کی خامی مل سے منوالی۔ چنانچہ اس معاملہ میں مل کا اعتراف اخلاقی جرأت کی قابل یادگار مثال مانی جاتی ہے۔ اسکے

بعد سے یہ خیال روز بروز قوی ہوتا گیا اور اب اس نکتہ پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے کہ معیشت میں تعین کی بہت کم گنجائش ہے۔ اس کے اصول و قوانین چند در چند مفروضات پر مبنی ہیں جن کے بغیر ان کا تعین دشوار تھا لیکن وہ مفروضات کمتر پورے ہوتے ہیں۔ معاشی مباحث صحیح طور پر سمجھنے کے لئے معمول سے زیادہ وسعت نظر درکار ہے اور تنگ نظری سے بہت سے مسائل پر لا تقربوا الصلوٰۃ کی مثل صادق آسکتی ہے۔ ہر مسئلہ میں بہت سے پہلو پیش نظر رکھنے ضروری ہیں حالانکہ ان میں سے ہر ایک کا اظہار اصل بحث میں ممکن نہیں پروفیسر مارشل کا یہ قول بہت پر معنی ہے کہ جو مسائل جسقدر معین اور قطعی نظر آئیں وہ غالباً اسی قدر ناکمل اور مغالطہ انگیز ہوں گے۔ خود اس کی مشہور تصنیف کی خصوصیت متائز یہی وسعت نظر ہے۔ موجودہ کتاب میں بھی ہر مسئلہ کے کل ضروری پہلو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے خواہ مخواہ ان میں تعین نہیں دکھایا گیا۔ جہاں کل پہلو یکجا نہیں ہو سکے وہاں ماسبق اور مابعد مباحث متعلقہ کا حوالہ دیدیا گیا ہے اور اصلی بحث کے ساتھ مقامات محولہ کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

مزید براں بعض مباحث اسقدر نازک اور پیچیدہ ہیں کہ اچھے اچھے راہ گم کر بیٹھے اور بڑے بڑوں کے بیانات میں عدم مطابقت بلکہ تضاد تک کی نوبت آگئی۔ مثلاً مسئلہ سود کی بحث میں کوئی مصنف بھی پورے طور پر عہدہ برآ نہیں

ہو سکا۔ یہی اشتراک کا حال ہے پھر بھی روز بروز صحیح معلومات کا اضافہ ہو ہو کر ایسی خامیوں کی مقدار گھٹ رہی ہے۔ چنانچہ پروفیسر جیونس کا مقولہ ہے اور نہایت صحیح ہے کہ معاشی تحقیقات کے متعلق صرف اسقدر دعویٰ بجا ہے کہ وہ حقیقت سے روز بروز قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک دن پوری حقیقت منکشف ہو جاوے گی۔ تاہم اس وقت تک جو معلومات حاصل ہو چکی ہیں وہ ہمارے واسطے از حد مفید ہیں۔ اور بہترین توجہ کی مستحق ہیں۔ گو ہم نے تمام مباحث میں پوری پوری احتیاط سے کام لیا ہے لیکن پھر بھی اگر کہیں کوئی خامی رہ گئی ہو تو تعجب نہیں علم ہونے پر اسکو رفع کرنے کی کوشش کیجاوے گی۔

ہر مناسب طریق سے کتاب کو سہل بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن صحت کو کہیں بھی سہولت پر قربان نہیں کیا۔ بحث میں اکثر ضروری پہلو یکجا پیش کئے ہیں یا اُن کا حوالہ دیدیا ہے اور وسعت نظر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس حالت میں کتاب اس قدر سہل نہیں رہ سکتی جس قدر کہ بصورت دیگر سہل ہونی ممکن تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سہولت نہایت ضروری و مفید ہو کر کتاب کی اعلیٰ خوبی شمار ہونی چاہئے لیکن وہی جو اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔ مباحث کو ضرورت سے زیادہ سہل بنا کر پیش کرنے سے علاوہ نقص صحت کے ناظرین کی دماغی قوتوں پر ایسا ہی مضر اثر پڑتا ہے

جیسا کہ ازحد زود ہضم غذا کا عادی ہو کر معدہ ضعیف ہو جاتا ہے۔ علمی مباحث میں
ناظرین کے غور و خوض کے واسطے بھی کچھ گنجائش چھوڑنی ضروری ہے تاکہ
دماغی قوتیں بھی تو کام میں آکر نشوونما پائیں۔ سوچنے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو
یہی تو تعلیم کا حقیقی منشا ہے سہل الحصول معلومات سے دماغ پُر کرنا بھی شاید
کام آئے۔ لیکن دماغی تربیت و ترقی تو اس طرح ہرگز ممکن نہیں۔ موٹر پر
بیٹھے بیٹھے ہزاروں میل کا سفر کرنا ممکن ہے اور کارآمد بھی سہی۔ لیکن
ٹانگوں میں قوت دوڑنے پھرنے ہی سے آتی ہے اور جو چلنے سے معذور ہو
وہ اپاہج ہی کہلاتا ہے خواہ سواری میں بیٹھکر وہ سینکڑوں میل کا دھاوے
بولے خواہ دنیا بھر کی معلومات سے دماغ لبریز ہو لیکن حقیقی مفہوم میں وہی
شخص تعلیم یافتہ شمار ہو سکتا ہے جس میں غور و فکر اور سوچنے سمجھنے کی قابلیت ہو
جو بیانات و مشاہدات سے اصول و نتائج اخذ کر سکے اور یہ قابلیت کوشش
سے ہاتھ آتی ہے۔ چنانچہ اسی اصول کو مدنظر رکھ کر اگرچہ ہم نے کتاب میں
بہت کچھ سہولیت پیدا کی ہے مگر نہ اسقدر کہ غور و فکر کی ضرورت ہی نہ رہے اور
کل کتاب حلوائے بے دود بن جاوے جو گو خوشگوار و مرغوب سہی لیکن
مضعف دماغ بھی ہے اور مطالعہ کا حقیقی منشا دماغ سے کام لے کر اسکو
تقویت پہنچانا ہے۔

دہلی کالج کسی زمانہ میں تعلیم کا بڑا مرکز رہ چکا ہے۔ یہاں اچھے اچھے عالموں کا

مجمع رہتا تھا جن کی تعلیم اور فیض صحبت سے طلبا میں بھی خاص علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ اسی کالج کے ایک سربرآوردہ طالب علم پنڈت دھرم نراین صاحب نے جن کو سینیر اسکالر کا خطاب اور وظیفہ بھی حاصل تھا کالج کے علم دوست پرنسپل جناب بوٹرس صاحب کی فرمایش پر فرانسس وے لینڈ کی کتاب ایلیمنٹس آف پولیٹکل اکانمی کا اُردو ترجمہ کیا اور اصول علم انتظام مدن اس کا نام رکھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی انجمن اشاعت علوم مفیدہ بہ سرپرستی دہلی کالج اُردو ترجمے کرنے کرانے میں مصروف تھی۔ چنانچہ بوٹرس صاحب کے جانشین سپرنجر صاحب نے جو کچھ کم علم دوست نہ تھے اس کتاب کو انجمن مذکور کی طرف سے ۱۸۴۵ء میں شایع کرایا۔ یہ ایک چھوٹی سی پُرانی کتاب کا لفظی ترجمہ ہے لیکن عبارت قدیم طرز کی ثقالت سے پاک اور اپنی اشاعت کے زمانہ کے لحاظ سے نہایت قابل داد ہے۔

ایک اور مختصر تصنیف بنام رسالہ علم انتظام مدن دستیاب ہوئی لیکن اس کا سرورق گم ہے اور مصنف وسن اشاعت کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ بھی ترجمہ مذکور کے تھوڑے عرصہ بعد تحریر ہوا مصنف نے اس علم کے چند اصول مختصراً بطور خود عمدہ پیرایہ میں بیان کرکے جدت و معاملہ فہمی کا اچھا ثبوت دیا ہے۔ اس کی عبارت بھی مقابلۃً صاف

اور سلیس ہے۔ سر سید مرحوم کو نہ صرف خود علمی کام کرنے کا بیحد شوق تھا بلکہ دوسروں سے کام لینے کا بھی اُن کو عجیب ملکہ حاصل تھا اُن کے اور اُن کے ہم صحبتوں کے علمی کارنامے مدتوں یادگار رہیں گے علوم جدیدہ کا اُردو ترجمہ کرنے کی غرض سے انھوں نے بھی ۱۸۶۳ء میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اور جس سرگرمی سے اس سوسائٹی نے کام شروع کیا تھا اگر وہ سر سید کے بعد بحال رہتی تو خدا جانے اُردو شاہراہ ترقی پر کہاں سے کہاں پہنچی ہوتی۔ اس سوسائٹی کے دو ممبروں یعنی بابو رام کلی چودھری صاحب اور رائے شنکر داس صاحب نے (جن میں سے ہر ایک بعہدہ منصفت سرفراز تھا) سر سید مرحوم کی خاص فرمائش پر سینیر صاحب کی کتاب پولیٹکل اکانمی کا اُردو ترجمہ کیا جو کہ سوسائٹی کی طرف سے بنام رسالہ علم انتظام مدن ۱۸۶۵ء میں شایع ہوا۔ اسی دوران میں سر سید مرحوم نے پنڈت دھرم نرائن صاحب دہلوی کو مل کی کتاب ترجمہ کرنے پر آمادہ کیا اور پہلے مقالہ کا ترجمہ بعنوان اصول سیاست مدن سوسائٹی نے ۱۸۶۹ء میں شایع کر دیا۔ ان دونوں ترجموں کو لفظی اور سلیس بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے لیکن پھر بھی ترجمہ میں اصل عبارت کی سی روانی کہاں پیدا ہو سکتی ہے اور چونکہ مل کی کتاب دقیق ہے اس کا ترجمہ بالخصوص گراں محسوس ہوتا ہے۔ بعد مدت جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب نے ایک مختصر کتاب بنام علم الاقتصاد تصنیف فرمائی جو ۱۹۰۴ء

میں شایع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اگر چاہتے تو اس علم پر بہتر سے بہتر کتاب تصنیف فرماسکتے تھے لیکن یہی ایک ابتدائی کتاب لکھنے کے بعد انھوں نے سکوت اختیار فرمالیا۔ غالباً اُس زمانہ میں اُردو ناظرین کا مذاق ایسی تصانیف کے واسطے موزوں بھی نہ تھا۔ لیکن اب وقت آن پہنچا ہے علوم جدیدہ کے ترجموں کی ہر طرف مانگ ہے۔ شاعری اور فلسفہ کے علاوہ یہ علم بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کی توجہ اور دستگیری کا کچھ کم مستحق نہیں المختصر جہاں تک پتہ چلا ۱۸۴۵ء سے لے کر آج تک اس علم میں تین اُردو ترجمے ایک مختصر رسالہ اور ایک ابتدائی کتاب شایع ہو چکی ہے۔ اس طرح موجودہ کتاب کی اشاعت چھٹے نمبر واقع ہوتی ہے۔ لیکن بلحاظ نفس مضمون وہ اپنی پیش رَوں پر اسقدر فائق ہے کہ اُردو زبان میں اپنی قسم کی سب سے پہلی جامع اور مستند کتاب شمار ہو سکتی ہے۔

اس کتاب میں تو اکثر معاشی قوانین۔ اصول اور مسائل مختصر مختصر طور پر پیش ہو سکے تفصیل کی گنجایش کہاں تھی۔ لیکن ان میں سے بعض مباحث اسقدر وسیع ہیں کہ ان کے واسطے جداگانہ کتابیں درکار ہیں۔ چنانچہ جابجا ایسی کتابوں کی ضرورت جتائی گئی ہے۔ مثلاً سود محصول اجارہ اشتراک زر بنک اور تجارت بین الاقوام وغیرہ کی بحث جدا جدا کتابوں کی مستحق ہے۔ علاوہ ازیں اصولی معلومات حاصل ہونے کے بعد اس علم کی روشنی میں اپنے ملک

کی حالت بغور دیکھنی ضروری ہے بلکہ اگر سچ پوچھو تو حصول علم کی غرض و غایت ہی یہ ہے۔ قصد ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ بشرط مہلت ایک جامع کتاب **معیشت الہند** جلد شایع کی جاوے گی جس میں کافی تحقیق اور تنقیہ کے بعد ہندوستان کے معاشی حالات نہایت صحت اور شرح و بسط کے ساتھ پیش ہوں اور ہر پہلو سے اس کتاب کو اسقدر دلچسپ اور سہل بنایا جاوے کہ عوام شوق سے پڑھیں اور بلا تکلف سمجھ لیں اس کے بعد اگر ہو سکے تو اصول کے وسیع مباحث پر بھی جداگانہ کتابیں تصنیف ہوں عام ناظرین کے واسطے تو موجودہ کتاب بھی کافی سہل ہی خصوصًا نشان زدہ مقامات ترک کرنے پر باقی کتاب عام فہم رہ جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک ایسی ابتدائی کتاب لکھنے کا ارادہ ہے جس کو بچے بھی بطور قصہ کہانی شوق سے پڑھیں اور لطف اُٹھائیں تاکہ بچپن ہی سے ان کو اس علم کا چسکا لگ جاوے اور معاشی حالات پر غور کرنے کی عادت پڑے۔

آیندہ تصانیف کی تجاویز ایک خاص غرض سے یہاں پیش کی گئی ہیں اصل مقصد تو اردو کی ترقی اور علوم جدیدہ کی اشاعت ہے۔ کسی پر کچھ انحصار نہیں جو کام جس سے بن پڑے سرانجام دے۔ مجوزہ بالا کتابیں یا ان کے علاوہ جو مفید و ضروری معلوم ہوں دیگر صاحبان ان کی تیاری شروع کر دیں۔ اس کام کو بحسن و خوبی تمام سرانجام دینے والوں کی اسوقت بھی اتنی قلت نہیں جتنی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے صرف توجہ درکار ہے اور امید ہے کہ وہ جلد ہر طرف

غور کرے گی مستند انگریزی کتابوں کی ایک مختصر فہرست (جو بطور ضمیمہ دوم اس کتاب میں شامل ہے)، اس علم کے شائقین کو مطالعہ تصنیف میں مشیر کا کام دے سکتی ہے۔

سچ پوچھیے تو اس تصنیف کا باعث مکرمی جناب مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کی توجہ اور کوشش ہے۔ کتاب لکھنے کا ارادہ تو مدت سے تھا لیکن خدا معلوم یہ کام کبتک معرض التوا میں پڑا رہتا۔ مولوی صاحب موصوف کی پراثر ترغیب بے تکلف تاکید قابلانہ مشوروں اور مخلصانہ ہمت افزائی نے دل و دماغ پر کچھ ایسا قابو پایا کہ کتاب لکھنے کی دھن بندھ گئی اور جبتک وہ ختم نہولی چین نہ پڑا۔ خود کام کرنے والوں سے کہیں زیادہ ہمکو دوسروں سے کام لینے والوں کی ضرورت ہے اور خدا نے یہ دونوں خوبیاں انجمن کے موجودہ سکرٹری کو عطا کی ہیں۔ مکرم دوست کی عنایات کے شکریہ کے اظہار سے الفاظ قاصر سہی لیکن دل میں احسانمندی کے احساس کی کوئی کمی نہیں۔

اپنے مخلص دوست جناب مولوی محمد مقتدے خاں صاحب شروانی مینجر انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڈھ کا شکریہ ادا کرنا بھی نہایت خوشگوار فرض ہے۔ اس کتاب کے چھپنے میں جو چند در چند سہولتیں آپ کی توجہ اور عنایت سے حاصل ہوئیں وہ کسی دوسرے مطبع میں میسر آنی ممکن نہ تھیں اور اُن کے

بغیر کتاب کا یوں حسب دلخواہ تیار ہونا بھی محال تھا۔ اصل مسودہ کی بدخطی اور پراگندگی کا لحاظ کرتے ہوئے کتابت کی صحت جیسی کچھ بھی ہے بدرجہا غنیمت ہے۔ اگر کچھ غلطیاں رہ گئیں تو وہ انشاءاللہ تعالیٰ طبع دوم میں رفع ہو جائینگی۔

محمدن کالج۔ علی گڈھ
جنوری ۱۹۱۷ء

محمد الیاس برنی

فہرست مضامین

ضروری ہدایت جن جن مقامات پر چلیپا نما + نشان بنا ہوا ہے
وہ بوجہ دشواری صرف منتہیوں کے مطالعہ کے واسطے موزوں اور مقصود ہیں مبتدی
انکو ضرور ترک کردیں ورنہ نتیجہ الجھن اور حیرانی ہو تو عجب نہیں۔

حصہ اوّل

حصہ دوم

پیدایش دولت

باب اوّل

باب دوم

عاملین پیدایش

فصل اوّل

فصل دوم

فصل سوم

فصل چہارم

باب سوم

حصّہ سوم

تقسیم دولت

باب اوّل

باب دوم

باب سوم

اجرت

فصل اوّل

فصل دوم

فصل سوم

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

باب ہفتم

باب ہشتم

ٹکس

حصّہ چہارم

مبادلہ دولت

بابِ اوّل

قیمت

باب دوم

باب سوم

زر

فصل اوّل

فصل دوم

فصل سوم

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

باب ہفتم

باب ہشتم

باب نہم

باب دہم

ہندوستان میں گرانی کے اسباب و نتائج ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۸۰ صفحہ

حصہ پنجم

صرف دولت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷۲۷ صفحہ

مکمل فہرست انگریزی وارُدو مرادف اصطلاحات وغیرہ مندرجہ کتاب

علم المعیشت کی مستند انگریزی تصانیف کی مختصر فہرست جن میں سے بعض اس کتاب کی تیاری میں بھی کام آئیں

خلاصہ مباحث بزبان اُردو و انگریزی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً

حصہ اول

مقدمہ

(تجزیہ) (۱) قدرت اور ضروریات کی کفالت (۲) قدرت پر دسترس انسانی کی افزونی اور اُس کی وسعت (۳) ہندوستان کی بے التفاتی و محرومی (۴) اصطلاح افادہ (۵) اصطلاح استبدال (۶) دولت کی تعریف (۷) دولت کے اقسام (۸) دولت کی مختلف شکلیں (۹) خدمت کی تشریح (۱۰) قابلیت وخدمت کا فرق (۱۱) استبدال و استہلاک کا تعلق اور اُس پر ایجادات کا اثر (۱۲) ایک ضروری احتراز (۱۳) معاشی جدوجہد کی تعریف (۱۴) علم المعیشت کی تعریف (۱۵) معیشت میں تقسیم مباحث (۱۶) معیشت اور علوم متجانسہ (۱۷) معیشت کے مسلمات (۱۸) معیشت کے قوانین (۱۹) معیشت کی وسعت (۲۰) معیشت کا طریق (۲۱) لفظ اکانمی کی تحقیق (۲۲) اصطلاح معیشت کی صحت

(۲۳) معیشت کی مختصر سرگذشت (۲۴) معیشت کا حاضر و مستقبل۔

قدرت اور ضروریات کی کفالت

(۱) اللہ جلّ شانہٗ جیسے خالقِ اکبر اور حکیم مطلق نے کوئی چیز فضول و بیکار پیدا نہیں کی۔ گو ہم واقف ہوں لیکن یقیناً ہر چیز سے کچھ کام مقصود ہے اور ہر کام کے لیے کوئی چیز مخصوص۔ کتنی چیزیں اب بھی نامعلوم ہونگی جو براہ راست یا بالواسطہ بحالت قدرتی یا مصنوعی ہمارے واسطے مُفید اور کارآمد ہوسکتی ہیں۔ تحقیق اور تجربہ سے آئے دن نئی نئی چیزیں اور چیزوں کے عجیب وغریب خواص دریافت ہوتے رہے ہیں۔ ہیرے سے مدرجہا سخت کاربورنڈم اور جواہرات سے کہیں بیش قیمت ریڈیم جیسی نادر چیزیں ہاتھ آئی ہیں جنسے وہ کام لیے جاسکیں گے جو کبھی وہم وگمان سے بھی باہر تھے خصوصاً ریڈیم سے عجیب وغریب اُمیدیں قائم ہورہی ہیں۔ بمقدار قلیل زبردست سی زبردست قوت محرکہ پیدا کرنا۔ صدہا سال حمام گرم رکھ سکنا۔ احسام کثیف کے پار مثل آئینہ چیزیں صاف دکھا دینا تو اس کے ادنیٰ کرتبے ہیں۔ اس کی بہت تھوڑی مقدار ابتک دستیاب ہوسکی ہے اور ایک ایک ریزہ دھڑیوں بلکہ منوں سونے کے معاوضہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ یہی بجلی کہ جس نے ہزارہا سال تک بیشمار جان ومال جلا جلا کر خاک سیاہ کرنے کے سوائے اِنسان کے ساتھ کوئی بھلائی نہ کی اور جو اسی وجہ سے غضبِ الٰہی کا مظہر بنی رہی۔ اب کسقدر مطیع وکارگذار بن گئی کہ ہر خدمت کیواسطے کمربستہ نظر آتی ہے۔ کھانا پکانا۔ پنکھا جھلنا۔ مکان روشن کرنا۔ کھیل تماشے دکھانا۔ جیسے معمولی خدمات سی لیکر ہوا سے بھی جلد تمام عالم میں خبریں پھیلانا۔ کرۂ ہوا میں کبھی سطح زمین پر اور کبھی سمندر کے اندر اندر بسرعت وآسایش ہماری سواری لیے پھرنا جیسی کرامت نما کارگزاریوں تک وہ کون کام ہے جس میں اُسکو عذر ہو۔ یہی نائٹروجن جیسی ناگزیر اور بیش بہا چیز جو کرۂ ہوا میں بقدر ۴/۵ حصہ فاضل وبیکار پڑی ہوئی ہے جرمنی جیسے ترقی یافتہ ممالک بذریعہ قوت برقی ہوا سے نکالکر شورۂ بارود۔ نہایت زرخیزی افزا کھاد حتیٰ کہ اشیاء خورد ونوش براہ راست اس سے تیار کر رہے ہیں۔ گویا برقی کنجی سے ہوائی

خزانوں کے دروازے بھی حضرتِ انسان نے کھولنے شروع کر دیئے، خدا خیر کرے اب بجلی کی کوند اور کڑک سے بھی کوئی دھمکی میں نہیں آتا۔ ہم نے ایک سیڑھی لگا دی ہے جس کے ذریعہ سے وہ جب چاہے بلا تکلف زمین پر اتر سکے اور کسی کو کانوں کان بھی خبر نہو۔ ترقیات سائنس کی بدولت جو بجلی کبھی سراپا ضرر تھی سرچشمۂ فیض بن گئی آگ اور پانی جو ہزارہا سال تک نہایت ادنی کاموں میں لگے رہے اب سحر و طلسم سے بڑھکر عجیب و غریب کرشمے دکھا رہے ہیں۔ لق و دق میدان ہوں یا طوفان خیز سمندر برفستان ہوں یا ریگستان۔ سر بفلک پہاڑ ہوں یا گہری گھاٹیاں۔ غرضیکہ تمام روئے زمین پر گرم و تر ہوا یعنی بھاپ کی طاقت شب و روز کروڑہا من سامان اور لکھوکھا انسان مثل پرکاہ اڑائے پھرتی ہے۔ سفر تو ایسا سہل و مختصر ہو گیا کہ گویا زمین کی طنابیں کھنچ گئیں۔ سوئی سے لیکر عالیشان محلات، لانبے لانبے پلوں ریلوں اور سر بفلک جہازوں تک کونسی چیز ہے جس کی بنانے میں وہ حصہ نہیں لیتے کھانے پینے سے لیکر کوہ کنی۔ ریل کشی اور جہاز رانی تک وہ کون کام ہے جس میں وہ ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتے۔ لوہے لکڑی بلکہ مٹی کی سونے سے بیش قیمت چیزیں بنتی ہیں۔ پھٹے پرانے چیتھڑ گودڑوں اور درختوں کی چھال پتوں سے۔ جنکی ہمارے ہاں ذرہ برابر قدر نہیں۔ کروڑہا روپیہ قیمت کے کاغذ تیار ہوتے ہیں۔ کاغذی تختوں سے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں نہایت مضبوط اور سبکبار ریل کے ڈبے بنتے ہیں جن کے سامنے لکڑی کے وزنی اور بیش خرچ ڈبے بھی ہیچ ہیں۔ کوئلہ کی کی راکھ سے طرح طرح کے خوشنما رنگ نکالے جاتے ہیں۔ گلی کوچوں کی خاک سے کیسے ہلکے دیرپا اور خوشنما الومینیم کے برتن بنتے ہیں۔ حتّٰی کہ فضلاتِ حیوانی بھی جن سے ہر شخص کو طبعی نفرت ہے ترقی یافتہ ممالک میں اس طور پر کام میں لائے جاتے ہیں کہ

حصہ اوّل

لاکھوں روپیہ منافع حاصل ہوتا ہے۔ غرضیکہ سائنس کی جدید تحقیقات اور صنعت و حرفت کی موجودہ ترقیات کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خداداد نعمتوں سے روزافزوں فائدہ اٹھا رہا ہے۔ معمولی معمولی چیزیں بیش بہا اور ردی سے ردی چیزیں کم و بیش کارآمد بنتی جاتی ہیں۔ اور جو چیزیں وہم و گمان میں بھی نہیں گزرتی تھیں۔ وہ روز بروز ہماری ضروریات میں داخل ہو رہی ہیں۔ چنانچہ معاشی لحاظ سے تہذیب جدید کی خصوصیت متاثر ہی ضروریات اور ان کی بہم رسانی کے وسائل کا روزافزوں اضافہ قرار پایا ہے۔

قدرت پر دسترس انسانی کی ارزانی اور اسکی وسعت

(۲) لیکن موجودہ ترقیات کے بھروسہ پر یہ امید کرنا بیجا نہیں کہ ہم قدرت کے تمام خزانوں پر کبھی قابض ہو سکیں گے کیونکہ قدرت کی لاتعداد نعمتوں کے مقابلہ میں ہماری ہزارہا سال کی تحقیق اور تجسس کا سرمایہ سمندر کے ایک قطرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس وقت نباتات میں چودہ لاکھ انواع کا تو پتہ لگ چکا ہے اور خدا جانے کتنی بے شمار انواع اور ہیں جو معلوم نہیں۔ مگر ہم ابتک تین سو سے زیادہ کام میں نہیں لاسکے۔ حیوانات کی بیشمار قسموں میں صرف تقریباً دو سو ایسی ہیں جو ہمارے کام آرہی ہیں۔ اور جمادات پر تو ہماری دسترس اس سے بھی زیادہ محدود ہے۔ پھر ہم کیسے ایکدن ساری خدائی کے مالک بننے کی امید کر سکتے ہیں۔ البتہ ترقی علوم کے ساتھ نسبتاً ہماری دسترس ضرور بڑھتی جائیگی لیکن وہ ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی بے اتفاقی و محرومی

(۳) قدرت نے سب ملکوں میں اپنی نعمتیں یکساں تقسیم نہیں کیں نہ سب ملک یکساں زرخیز ہیں نہ سب میں قیمتی معدنیات پائے جاتے ہیں نہ سب کی آب و ہوا اور قدرتی وسائل صنعت و حرفت کی ترقی کیواسطے یکساں موزوں۔ تھوڑی تحقیق سے ظاہر ہوگا کہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کا نصف حصہ کسی دوسرے ملک سے کم نہیں بلکہ اکثر سے بہت زیادہ پایا۔ مگر وہ اپنی خداداد نعمتوں سے بمقابلہ دیگر مہذب ممالک کے بہت کم مستفید ہو رہا ہے۔

نہ اس کو اپنی نعمتوں کا پورا علم ہے نہ اُن سے مستفید ہونے کے اُس کے پاس کافی وسائل
باوجود اس کے ہندوستان دُنیا کے تختۂ پر سونے کا ٹکڑا اور تاج برطانیہ کا سب سے
قیمتی جگمگاتا ہیرا مانا جاتا ہے اسی سے قدرتی نعمتوں کی کثرت ثابت ہوتی ہے۔ کاش اگر وہ
اِس طرح بے لاچار نہ ہوتا۔ اور اپنی کوشش سے عطیاتِ قدرت کی قدر کر سکتا۔ تو خدا جانے
ممالکِ عالم میں آج اس کا کیا رُتبہ ہوتا۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ ایسا زرخیز ملک اور وہ
شکر جیسی ضروری چیز کے واسطے جرمنی اور آسٹریا کا محتاج ہو جو گھاس پتّوں اور غلّہ تک سے
شکر نکالتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شکر یہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ ہزار ہا من شکر قند پیدا ہوتی ہے
جو سوائے کھانے کے کسی کام نہیں آتی۔ ریاست حیدرآباد میں شریفہ کے کیسے کیسے
وسیع جنگل موجود ہیں۔ اور شریفہ بھی کیسا گویا مصری کا کوزہ کہ اُس سے چھٹنکیوں شیرہ ٹپکے
مگر توجہ کسے کہ اس خداداد عطیہ کو سنگوائے۔ کچھ تو لوگ جنگلوں سے مُفت چھکڑے بھر
بھر کے فروخت کرنے کے لیے شہر لے آتے ہیں۔ اور ہر سال ہزار ہا من جنگلوں ہی میں
گَل کر خاک ہو جاتے ہونگے۔ یہ گنگا جمنا کی چاندی جیسی سفید ریتی! اگر کوئی خدا کا بندہ
اس میں لوچ پیدا کر کے چینی کے برتن بنا سکے تو اسی ریتی پر چاندی سونے کے گنگا جمنی
دریا بہنے لگیں۔ رنگ جیسی ضروری چیز میں ہمارا ملک جرمنی کا ایسا محتاج ہے کہ جب
جنگ چھڑی تو بوجہ بندشِ درآمد اُس کی قیمت دس گُنی ہو گئی حالانکہ کُسم۔ ہارسنگھار
ہلدی۔ اودی گاجر۔ پتنگ۔ آل بدقسمت نیل۔ اور ایسی بہت سی چیزیں موجود ہیں جن سے
ہر قسم کا عمدہ رنگ تیار ہو سکے۔ غرضکہ بہت سی خداداد نعمتیں جنکی ہم کو اشد ضرورت
ہے، ہمارے قدموں کے نیچے پامال ہو رہی ہیں اور اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ البتہ
کچھ عرصہ سے ہندستان بھر میں ریاست میسور معاشی معاملات میں قابلِ فخر و مبارک باد
بیداری اور مستعدی کا اظہار کر رہی ہے۔ حال ہی میں وہاں ایک معاشی کانفرنس بھی

حصہ اوّل

قایم ہوئی ہی جس کا مقصد واحد ریاست کی صنعت و حرفت کو زندہ کرنے اور اُس کو حدِ اعلیٰ ترقی دینے کی باقاعدہ کوشش کرنا ہی - یہ کانفرنس نہایت سرگرمی سے اپنے حصولِ مقصد میں مصروف ہی - اور عنقریب تمام ہندوستان کیواسطے قابلِ تقلید نمونہ بنجائے گی خلافِ انصاف ہوگا اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ ہندوستان کی اس بے اتفاقی اور بے قدری کا باعث ہندوستانیوں کی کاہلی اور غفلت کے علاوہ اور بھی چند زبردست غیراختیاری اسباب ہیں - جن سے ہم آیندہ مناسب موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ بالتفصیل بحث کریں گے -

اصطلاحِ افادہ

(۴) جب ہم کسی چیز کو مفید اور کارآمد کہتے ہیں تو اُس سے یہ مُراد ہوتی ہی کہ وہ ہمکو آرام پہنچاتی ہی یا ہماری تکلیف رفع کرتی ہی - یا بالاختصار، اُس سے ہماری احتیاج پوری ہوتی ہی - یہ جاننا ضروری ہی کہ علم المعیشت فی لفظ احتیاج نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہی - ہمکو اس سے بحث نہیں کہ کوئی احتیاج حقیقی ہی یا وہمی، دائمی ہی یا عارضی - قدرتی ہی یا رسمی - طبعی ہی یا غیر طبعی، قوی ہی یا ضعیف، اختیاری ہی یا غیر اختیاری، جائز ہی یا ناجائز، بھلی ہی یا بُری احتیاج کسی قسم کی بھی ہو - اُس کا لحاظ کیا جائیگا - اور جو چیز اُس کو پورا کریگی وہ مُفید سمجھی جائیگی - مثلاً پانی پیاس بُجھاتا ہی - آگ گرمی اور روشنی پہنچاتی ہی - چھتری دھوپ اور بارش کی تکلیف سی بچاتی ہی - عمدہ لباس اور زیور خودنمائی کی خواہش پوری کرتے ہیں - پھولوں کی مہک اور باجوں کے سُریلے راگ دماغ کو فرحت اور دل کو سرور بخشتے ہیں - قدیم کرم خوردہ کتابیں، زنگ آلودہ سکّے، بدرنگ تصویریں، ٹوٹے پھوٹے برتن محققین آثارِ قدیمہ کے نزدیک بیحد قیمتی ہوتے ہیں - دوا ازالہ مرض کرتی ہی - اور شراب جیسی مخربِ صحت چیز سے بھی شرابی کو ایک خاص لذّت حاصل ہوتی ہی - اور چونکہ مذکورۂ بالا چیزیں ایک نہ ایک

حصہ اول

احتیاج پوری کرتی ہیں معیشت کے نزدیک یہ سب مفید ہیں۔ اور احتیاج پورا کرنے کی صلاحیت جو ان سب میں پائی جاتی ہے اصطلاحاً افادہ کہلاتی ہے ۔ اس صفت افادہ کی اہمیت آگے چل کر دولت کے بیان میں ظاہر ہوگی۔

اصطلاح استبدال

(۵) یہاں تک ہم نے چیزوں کا مفید ہونا ظاہر کیا۔ اب ہم اُن پر ایک دوسری حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں۔ چند چیزیں تو ایسی ہیں کہ ہم انکا کسی دوسری چیز سے مبادلہ کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ ہمارے قبضہ اور تصرف سے باہر ہیں۔ مثلاً چاند، سورج ہوا سمندر اور بعض چیزوں کے مبادلہ کو ہم فضول سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ بکثرت دستیاب ہوتی ہیں اور کسی کی ملک خاص نہیں۔ مثلاً لب دریا پانی۔ خودرو جنگلوں کے پھل پھول اور لکڑی۔ اور بہت سی چیزوں کا مبادلہ ہم کر بھی سکتے ہیں اور ایسا کرنا مفید اور ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ مثلاً غلہ کپڑا۔ گھوڑا۔ مکان۔ اور ہر قسم کی اشیائے منقولہ و غیر منقولہ آخری قسم کی چیزوں سے معیشت کو خاص تعلق ہے اور ہم اُن خصوصیات کو جن کی وجہ سے ان کا تبادلہ مفید اور ضروری سمجھا جاتا ہے مختصراً بیان کرنا چاہتے ہیں۔ افادہ کے اصطلاحی معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں مبادلہ سے اُس کا تعلق بتانا ضروری ہے۔ افادہ کے واسطے تو مبادلہ شرط نہیں۔ مثلاً چاند۔ سورج۔ ہوا میں افادہ موجود ہے مگر ان کا مبادلہ ممکن نہیں۔ لیکن مبادلہ کیواسطے افادہ لازمی ہے۔ کیونکہ اگر اشیائے متبدلہ سے فریقین کی احتیاجیں ہی رفع نہو سکیں گی تو پھر اُن کے مبادلہ کی تکلیف کوئی خواہ مخواہ کیوں گوارا کریگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کارآمد چیزوں ہی کا لین دین ہو سکتا ہے۔ ردی اور نکمی چیزوں کا مبادلہ کون کرتا ہے۔ اسی واقعہ کو اصطلاحی زبان میں یوں کہینگے کہ مبادلہ کیواسطے افادہ لازمی ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ کسی چیز میں محض مفاد کا وجود مبادلہ کیواسطے

کافی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہو کہ انسان کو مفاد کا علم اور چیز پر دسترس ہو مثلاً جب تک کہ مشہور دوا کُنین کے خواص معلوم نہیں ہوئے تھے۔ وہ محض نکمّی چیز سمجھی جاتی تھی کوئی اس کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ اور نہ اس وقت کوئی اس کا مبادلہ کرسکتا تھا۔ حالانکہ فی نفسہ اس میں وہ افادہ اُس وقت بھی موجود تھا جس کے دریافت ہونے پر وہ قابل مبادلہ ہوگئی۔ اسی طرح پر وہ چاندی سونا جو نہایت ہی گہری کانوں میں دبا پڑا ہی ہمارے نزدیک ایسا ہی بیکار ہی جیسے مرّیخ کی خیالی دولت۔ گو ایسے چاندی سونے میں مفاد موجود ہی مگر ہماری دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے نزدیک مٹی کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ نکمّے ہیں۔ اور ظاہر ہی کہ ان کا مبادلہ ممکن نہیں۔ پس علم و دسترس بغیر محض افادہ کی موجودگی مبادلہ کی بنا نہیں ہوسکتی۔

مبادلہ کے واسطے علاوہ افادہ کے اور دو شرطیں بھی ضروری ہیں یعنی کم از کم مابین فریقین کسی چیز کی مقدار معیّن اور تملیک کلّی ہو۔ اور یہ دونوں شرائط خود بھی ایک دوسرے سے متعلّق ہیں۔ تملیکِ کُلّی، تعیینِ مقدار پر منحصر ہی۔ کسی چیز کا غیر معیّن مقدار میں دستیاب ہونا ظاہر کرتا ہی کہ وہ کسی خاص شخص کی ملک نہیں اور ہر کسیکو بلا تعرض دیگرے مُیسّر ہوسکتی ہی۔ گنگا کے کنارے نہ پانی کی کمی، نہ وہ کسی کی ملک۔ جو جتنا چاہے پانی بہائے، پیئے اور گھر لیجائے۔ مبادلہ کی ضرورت ہی نہیں۔ مگر دُور اُفتادہ مقامات میں خوش اعتقاد ہندو دل کھول کر گنگا جلی کی قیمت اس وجہ سے دیتے ہیں کہ وہاں گنگا تو بہتی نہیں۔ صرف اتنا ہی تھوڑا سا پانی جو بیچنے والے کے پاس ہی۔ دستیاب ہوسکتا ہی لہذا بوجہ تعیین مقدار او تملیکِ کُلی گنگا جلی قابل مبادلہ ہوجاتی ہی۔ تحقیق طور پر سُنا ہی کہ سیب، انار، اور انگور جیسے قیمتی میوے افغانستان میں اسقدر کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو چاہے ہر روز بلا قیمت گرد و نواح کے درختوں سے جی بھر کر کھا سکتا ہی۔ گویا

حصہ اول

چونکہ کثرتِ پیداوار کے سبب سے ان میں تعیین مقدار اور تملیک کلّی کی صفت کم پائی جاتی ہے ان کا مبادلہ بھی کم ہوتا ہے۔ بڑے بڑے جنگلوں میں لکڑی کی کوئی قیمت نہیں لی جاتی۔ یہ ایک عام اُصول ہے کہ کسی شے میں مذکورۂ بالا ہر دو صفات کی کمی یا زیادتی کی نسبت سے مبادلہ کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی معاشی اُصول کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔ ع

"لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر"

مذکورۂ بالا تیسری قسم کی چیزوں کی یہ صفت کہ اُن کا مبادلہ ممکن بھی ہو اور ضروری بھی سمجھا جائے۔ اور جس کی ماہیت کو ابھی سمجھا چکے ہیں، اصطلاحاً استبدال کہلاتی ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالتوں میں مبادلہ قانوناً یا بشرطِ معاہدہ۔ فریقین تک محدود ہوتا ہے۔ یعنی شے مبدلہ کا کسی عام یا خاص فریق کے ہاتھ جدید مبادلہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قانون انتقال جائداد میں اس کی چند مثالیں بھی موجود ہیں۔ لیکن مبادلہ کی اس پابندی سے صفت استبدال میں کوئی فرق نہیں آتا۔

دولت کی تعریف

(۶) دولت کا مفہوم ان چند مسئلوں میں سے ہے کہ جن پر معیشت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر ابتک کوئی قطعی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ بہت سی چیزیں ہیں کہ جنکے دولت شمار کرنے نہ کرنے پر ابتک اختلافِ رائے موجود ہے۔ لیکن اس اصطلاح کے بہترین معنی کینیس صاحب نے بیان کیے ہیں جن کے نزدیک دولت میں وہ تمام چیزیں اور صرف وہی چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ اور استبدال کی دونوں صفتیں موجود ہوں۔ دولت کی اسقدر مختصر مگر جامع تعریف کی تشریح افادہ اور استبدال کے مذکورہ بالا بیان سے بخوبی ظاہر ہو گی۔

حصہ اول
دولت کے اقسام

(۷) دولت کی معاشی تعریف ابھی بیان کی جاچکی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ تنہا لفظ دولت سے مُراد **شخصی دولت** ہے۔ لیکن خود معیشت نے بہ مقتضائے ضرورت دولت کی اصطلاحی معنوں میں کچھ کچھ ترمیم بھی گوارا کی ہے۔ مثلاً انسان کے ذاتی صفات و خصائل، جیسے شرافت، عزت، ہردل عزیزی اور اعتبار، جو کاروبار میں مدد دیتے ہیں، **ذاتی دولت** کہلاتے ہیں۔ اسی طرح پر گنگا جمنا جیسے بڑے بڑے دریا۔ اور ہمالیہ جیسے سربفلک پہاڑ۔ جو ملک کی زرخیزی، سرسبزی اور آب و ہوا پر اپنا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ملک کی وہ عمدہ چیزیں جن کا کثرتِ پیداوار کی وجہ سے مبادلہ کم ہوتا ہے۔ مگر جو لوگوں کے کام آتی ہیں جیسے جنگلوں کی لکڑی۔ خوشگوار موسم صحت افزا آب و ہوا، دلکش مناظر نیز عمدہ سوسائٹی، روشن خیال حکومت وغیرہ جو معاشی ترقیات کے واسطے لازمی ہیں، **قومی دولت** کہلاتی ہیں۔ چنانچہ دریائے ٹیمس انگلستان کی دولت کا ایک بیش بہا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔ اور وہ ساتوں سمندر بھی جو بذریعہ بارش و جہاز رانی دنیا کی مالی بہبودی کے بہترین معادن ہیں **بین الاقوامی دولت** کہے جاتے ہیں۔ اگرچہ مذکورۂ بالا تینوں آخری قسم کی دولتوں میں سوائے افادہ کے استبدال نہیں پایا جاتا مگر معیشت کو مجبوراً ان کا لحاظ کرنا پڑا۔ کیونکہ براہِ راست یا بالواسطہ خاص معاشی دولت کی پیدائش میں اُن سے قابلِ قدر بلکہ اکثر ناگزیر امداد ملتی ہے۔

دولت کی مختلف شکلیں

(۸) دولت کی ماہیت اور اُس کے اقسام بیان کرنے کے بعد اب اُن چیزوں کی تفصیل کرنی باقی ہے جو دولت میں شامل ہو سکتی ہیں۔ ان کی حسب ذیل چار قسمیں ہیں:۔

(۱) مادی اشیا خواہ منقولہ یا غیر منقولہ۔ مثلاً غلہ۔ کپڑا۔ گھوڑا۔ درخت، زمین

اور ہر قسم کی مِلک و جائداد۔

(ب) مادی اشیا کی ملکیت اور استعمال کے حقوق، مثلاً کتاب کا حق تصنیف آلات کا حق ایجاد۔ کاشتکار کا حق کاشت خواہ وہ از روئے قانون یا معاہدہ بلا جازت زمیندار دیلی کو منتقل کیا جا سکے یا نہیں۔ نیز کسی کلب یا لائبریری کی ممبری کا حق کھیل و مُطالعہ، اگرچہ وہ محض ذاتی اور ناقابلِ انتقال ہو۔

(ج) ذاتی خدمات، خواہ اُن کا نتیجہ بشکل مادی ظاہر ہو یا نہ ہو۔ مثلاً لوہار، بڑھئی معمار، درزی، باورچی اور حجام کا کام یا گانا بجانا یا ورزشی کرتب اور کھیل تماشے جو عموماً تھیٹر اور سرکس وغیرہ میں دکھائے جاتے ہیں۔

(د) ذاتی خدمات کرانے کا حق مثلاً ریلوے کمپنی کا ملازمان پر۔ تھیٹریکل کمپنی کا ایکٹروں پر۔ ٹرسٹیانِ کالج کا پروفیسروں پر۔ جب کبھی ہم ان حقوق کے ذریعہ سے نہ کہ براہِ راست اِن خدمات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اس حق کے معاوضہ میں حقداران یعنی مالکان کمپنی یا ٹرسٹیان کالج کو کچھ روپئے کرایہ یا فیس کے طور پر ادا کرتے ہیں۔

پہلی شکل میں تو دولت کو ہر کوئی پہچانتا ہے۔ البتہ بشکل سوم اس سے روشناس کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم خدمات کا معاوضہ دیتے ہیں۔ خواہ نتیجہ بشکل مادی ظاہر ہو یا نہ ہو۔ مثلاً کھانا پکانا۔ کپڑا سینا یا پنکھا جھلنا۔ گانا سنانا، تو گویا خدمت میں بھی صفات افادہ و استبدال موجود ہیں اور وہ بھی دولت کی ایک شکل ہے۔ واضح ہو کہ قرآن شریف سے بھی خدمات کا دولت ہونا ثابت ہے۔ مِلک و جائداد اور زرِ نقد کی طرح مہر بشکل خدمت بھی قرار پا سکتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ادائیگی مہر میں اپنی بیوی کی کچھ سال بکریاں چرائی تھیں۔ اور بیوی کو قرآنِ پاک کی تعلیم دینا بھی شرعاً مہر شمار

حصہ اول

ہو سکتا ہی۔ رہے دولت کی ملک اور استعمال کے حقوق، سو وہ بھی افادہ و استبدال کی موجودگی سے دولت ہیں۔

خدمت کا دولت ثابت کرنا کافی نہیں۔ اس مسئلہ کی مزید تشریح ضروری معلوم ہوتی ہی جو درج ذیل کی جاتی ہی۔

خدمت کی تشریح

(۹) خدمت کے متعلق یہاں پر دو نکتے جتانا چاہتے ہیں جو عملاً زیادہ کارآمد نہ بھی لیکن علمی لحاظ سے دلچسپ و مفید ضرور ہونگے۔ اوّل یہ کہ دولت خدمت پیش کرنے کیواسطے خادم بننا لازمی نہیں۔ کبھی کبھی مخدوم بننا گوارا کرنا بھی خدمت کا حکم رکھتا ہی یعنی دولت میں شمار ہوتا ہی کسی محبوب کے تحفہ قبول کر لینے سے عاشق کو ایسی حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہی کہ وہ تحفوں میں گھر بار لٹا دے تو عجب نہیں۔ اور محبوب کی قبولیت ہی اسکے حق میں سب سے بیش بہا دولت ہی حقیقی سخاوت میں خیرات دینے سے ایسی طمانیت قلب حاصل ہوتی ہی کہ مفلس کا خیرات لے لینا ہی سخی کی نظر میں بڑی خدمت ہی۔

پرورش اولاد کا بھی بیشتر یہی حال ہی۔ پیروں اور امرا کی خدمت میں جو مرید اور متوسلین دولت لٹاتے اور جان کھپاتے ہیں۔ اگر کوئی خاص غرض بھی پیش نظر نہو تو تقرب اور خصوصیت کا فخر و امتیاز، ایسا دل آویز ہی کہ اس کے سامنے لوگ جان و مال کی بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کے حق میں گویا بڑوں کی مخدومیت ہی بیش بہا دولت ہی۔ چنانچہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

دوسرا نکتہ قابل تشریح یہ ہی کہ کام کرنے کی طرح کام سے باز رہنا بھی خدمت کی ایک صورت ہی۔ اور اس کا بھی مثل دولت مبادلہ ہوتا ہی۔ چنانچہ دقعہ ہی کہ موجودہ جنگ

یورپ میں متخاصمین گرد و نواح کے ملکوں کو نہ صرف شرکت بلکہ غیر جانب داری
کے معاوضے بھی حسب غرض پیش کر رہے ہیں۔ کھلا ہوا راز ہے کہ ہندوستان کے سرحدی
جرگوں کو لوٹ مار سے باز رکھنے کے لیے نہایت فیاضی سے انعام و اکرام تقسیم ہوتے
رہتے ہیں۔ بعض دولتمند لوگ مشہور چور ڈاکوؤں کو لے دیکر خوش رکھتے ہیں تاکہ انکے
دست برد سے محفوظ رہیں۔ پس جو شخص جرمانہ ادا کرتا ہے یا جان کے خوف سے مال
ڈاکوؤں کے حوالہ کردیتا ہے یا بیگار میں مفت کام کرتا ہے بظاہر تو اس کے مال و محنت خدمت
کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ لیکن درحقیقت سرکار کا اس کو قید کرنے ڈاکوؤں کا اس کی
جان لینے اور بیگار خواہوں کا اس کی اذیت رسانی سے باز رہنا جیسی خدمات اسکو
اپنی دولت کے مبادلہ میں حاصل ہوتی ہیں اور مشقت قید ضرر جان و اذیت سے
رہائی جیسے مفاد ان خدمتوں میں داخل ہیں۔ ایسی خدمات کو جن میں تحفظ از ضرر
دگرند کے علاوہ ذرہ برابر کوئی اور مفاد نہ پایا جاوے۔ خدمتِ منفی، اور باقی کو
جن میں بے شمار مفاد موجود ہیں خدمتِ مثبت کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ دیگر اسباب کو ضرر
رسانی سے باز رکھنے کا کام بھی، مثلاً ڈوبتے کو پانی سے نکالنا۔ جلتے گھر کی آگ بجھانا
مریض کو اچھا کرنا۔ ملزم کی پیروی کرنا، چور نہ آنے دینا، کم و بیش خدمتِ منفی کے
مشابہ ہے۔

ظاہر ہے کہ خدمتِ منفی باوجود دولت ہونے کے اپنے مبادلہ سے دولت کی
مجموعی مقدار میں بجائے اضافہ تخفیف کر دیتی ہے البتہ تخفیف کی مقدار اس مقدار
سے کم ہوگی جس کی تخفیف ہونے کا بحالت عدم مبادلہ خدمتِ منفی اندیشہ ہو
گویا ان خدمات کا انجام مفاد تخفیف میں تخفیف کرنا ہے۔ اس پر بھی دولت کا جزو شمار
ہوتی ہیں۔ ہندی مثل سارا جاتا دیکھئے تو آدھا دیجیے بانٹ۔ اسی نکتہ کی طرف

اشارہ کرتی ہے۔ ایسی خدمت کی بعض صورتیں ترقی تمدن کیواسطے مفید و ضروری ہونے کی وجہ سے بکثرت رائج ہیں۔ اور بعض بوجہ ضرر رساں ہونے کے رسمًا، مذہبًا اور قانونًا ممنوع ہیں۔

واضح ہو کہ بیکاری اور کام سے باز رہنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ بیکاری خدمت کی متضاد ہے اور کام سے باز رہنا خدمت کی ایک شکل۔ ان دونوں میں بعینہٖ وہی فرق ہے جو ضعیف القویٰ کے حلم یا غریب و امیر کی سادہ وضعی میں۔ اس فرق کا باعث گویا قدرت میں مضمر ہے۔

قابلیت و خدمت کا فرق

(۱۰) اول یہ جاننا چاہیئے کہ قابلیت اور خدمت دو جُداگانہ چیزیں ہیں خدمت کیواسطے قابلیت شرط ہے مگر قابلیت سے خدمت لازم نہیں آتی۔ مثلاً عمدہ گانے کے لیے خوش گلوئی اور بلند آوازی شرط ہے۔ عمدہ معلّم یا مصنّف ہونے کے لیے علمیت ضروری ہے۔ لیکن ہر خوش گلو اور بلند آواز شخص گانا نہیں جانتا۔ اور نہ ہر صاحب علم مصنف یا معلّم ہوتا ہے۔ ان دونوں کا فرق جتانا اس وجہ سے ضروری ہے کہ خدمت تو دولت کی ایک قسم ہے مگر قابلیت دولت میں نہیں شمار کی جاسکتی۔ کیونکہ اگرچہ وہ خدمت کی شرط اور بنا ہے لیکن بذاتِ خود اس میں دولت کے صفات نہیں پائے جاتے نہ استبدال نہ افادہ۔ مثلاً کوئی شخص گو وہ اپنے فن میں کیسا ہی کامل کیوں نہو۔ کوئی طبیب خواہ وہ کیسا ہی حاذق کیوں نہ ہو۔ کوئی وکیل ہر چند کہ وہ کیسا ہی قانون داں کیوں نہو۔ ہم اُن میں سے کسیکو بھی محض قابلیت کی وجہ سے کچھ نہیں دیتے۔ البتہ جب وہ اپنی قابلیت عمل میں لاکر ہماری خدمت کرتے ہیں یعنی بیماری کا علاج کرتے ہیں۔ یا مقدمہ کی پیروی۔ تو ان خدمات کے صلے میں ہم خوشی خوشی اُن کو بھر بھر فیس دیتے ہیں۔ محض قابلیت نہ صرف فرق ثانی کیواسطے

بلکہ خود صاحب قابلیت کے واسطے بھی خالی از افادہ ہی۔ مثلاً کسی کو اپنے عمدہ گویّے ہونے سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہی جبتک کہ وہ گائے نہیں۔ البتہ یہ اختیار ہی کہ وہ اوروں کو بھی سنائے یا خود ہی لطف اٹھائے۔ علیٰ ہذا نری علمیت کس کام کی ہی جب تک وہ عالم کے خیالات میں جدّت، وسعت، باریک بینی اور بلند پروازی پیدا نہ کرے البتہ یہ امر اختیاری ہی کہ عالم اپنے خیالات کے لطف میں دوسروں کو بھی بذریعہ تحریر یا تقریر شریک کرے یا نہ کرے۔ چنانچہ جو علمیت سی کام نہیں لے سکتے اُن کو چارپائے بروکتابے چند سے تشبیہ دیجاتی ہی جس سے مذکورۂ بالا معاشی اُصول بخوبی ثابت ہوتا ہی۔ ایسی علمیت جس سے کام نہ لیا جائے، عالم کے واسطے اُسی قدر بیکار ہی جس قدر کہ چوپائے کیواسطے کتابیں۔ وہ عالم پر محض ایک بار ہی اور کچھ نہیں۔ پس صاف ظاہر ہی کہ جو لوگ خداداد یا اکتسابی قابلیت سے کام نہیں لیتے وہ دیدہ و دانستہ بہت بڑی دولت ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔

افادہ کی طرح دولت کی دوسری صفت استبدال بھی قابلیت میں مفقود ہی۔ گویّا اپنے گانے سے سامعین کو محظوظ کر سکتا ہی۔ دوسروں کو فنِ موسیقی بھی سکھا سکتا ہی مگر اپنی خوش گلوئی اور بلند آوازی کسی قیمت پر منتقل یا فروخت نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنا اُس کی قدرت سے باہر ہی۔ مصوّر تصویر بنا کر بیچتا ہی اور شاگردوں کو اس فنِ لطیف کی تعلیم بھی دے سکتا ہی مگر اُس کی قوتِ متخیلہ اور ہاتھ کی صفائی ایسی چیزیں ہیں کہ بیشمار قیمت ادا کرنے پر بھی دوسرے کے قبضہ و تصرف میں نہیں آسکتیں۔ جب پروفیسر طلبا کو تعلیم دیتا ہی تو گو وہی طلبا پروفیسر کے برابر بلکہ اُس سے بڑھ کر علم حاصل کرلیں، مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہی کہ پروفیسر نے اپنے

حصّۂ اوّل

علمیت طلبا کو فیس کے معاوضہ میں دے دی۔ علم کو دولتِ لازوال اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ انسان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ بعض قابلیتیں محض خداداد ہُوا کرتی ہیں کہ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے میسر نہیں آسکتیں۔ مثلاً فہم و ذکا حُسن وظرافت وغیرہ۔ اور بعض قابلیتیں ایک دوسرے سے اس طرح پیدا ہوتی ہیں جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مگر مبادلہ کسی کا بھی ممکن نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ قابلیت اور خدمت معاشی حیثیت سے بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اور خدمت کی طرح قابلیت کو ہم دولت اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ نہ اس میں افادہ ہے نہ استبدال۔

استبدال و استملاک کا تعلق اور ایجاد کا اس پر اثر

(۱۱) قابلیت تملیک جو عموماً مادی چیزوں میں موجود اور غیر مادی میں مفقود ہوتی ہے اصطلاحاً استملاک کہلائے گی۔ گو مبادلہ میں انتقال ملک اکثر شامل ہوتا ہے مگر لازمی نہیں۔ مبادلہ بغیر انتقال بھی ممکن ہے۔ مادی اشیا کے مبادلہ میں انتقال موجود ہوتا ہے۔ مثلاً کتاب کے بدلے میں قلم۔ مکان کے بدلے میں باغ۔ روپیے کے بدلہ میں غلّہ اور کپڑا۔ مگر خدمات کے مبادلہ میں کبھی انتقال ممکن ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ جن خدمات کا نتیجہ بہ شکل مادی ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً معمار، بڑھئی، اور لوہار کا کام، ان کے مبادلہ میں انتقال مانا جا سکتا ہے۔ گویا کہ ایسی خدمات بشکل نتیجہ مادی اشیا میں مقید رہتی ہیں۔ مگر جن کا نتیجہ بہ شکل مادی ظاہر ہوتا ہی نہیں مثلاً تھیٹر میں گانا۔ بجانا۔ یا سرکس میں جرأت اور طاقت کے کرتب دکھانا۔ تو وہ بوجہ سریع الفنا ہونے کے ناقابل تملیک ہیں اور اسی وجہ سے ان کے مبادلہ میں انتقال ممکن نہیں۔ اگر ایسی خدمات کا مبادلہ کسی مادی چیز سے کیا جائے تو انتقال محض یکطرفہ ہوگا۔ اور اگر آپس میں ایک دوسرے سے کیا جائے تو کسی

جانب بھی انتقال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب ہم تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں تو ایکٹروں کی خدمات کے مبادلہ میں ہم ٹکٹ کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ اس حالت میں صرف یکطرفہ انتقال ہوتا ہے۔ جب ہم تھیٹر سے لوٹتے ہیں تو کمپنی کے مینجر کا بکس تو ٹکٹ کے داموں سے بھرا ہوتا ہے اور سب تماشائی خالی جیب ہاتھ ہلاتے چلے آتے ہیں۔ تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم روپیہ کھو آئے ہ نہیں۔ بلکہ جو چیز ہمنے مبادلہ میں لی وہ بوجہ سریع الفنا ہونے کے ناقابلِ انتقال تھی۔ اور پیدا ہوتے ہی ناپید ہو گئی۔ اگر سوال کیا جائے کہ لوگ تھیٹر کیوں جاتے ہیں تو جواب ملیگا کہ لطف اُٹھانے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایسی چیز کا مُبادلہ ضرور ہوتا ہے جس میں افادہ اور استبدال موجود ہے۔ بالفاظِ دیگر جو دولت ہے مگر مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر چونکہ اسکا انتقال ممکن نہیں اس وجہ سے تماشائی خالی ہاتھ نظر آتے ہیں۔

اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص گانا اچھا جانتا ہے۔ اور دوسرا شخص بانسری بجانا۔ اور وہ باری باری اپنے کمال سے ایک دوسرے کو محفوظ کرتے ہیں۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُنکا یہ فعل مجنونانہ یعنی عبث اور بیکار ہے۔ نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی خدمت سے بیحد لطف حاصل کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، دونوں کی خدمتوں میں افادہ موجود ہے۔ اور باری باری گا بجا کر وہ اپنی خدمات کے استبدال کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ پس وہ اپنی دولت کا ایسا ہی مبادلہ کرتے ہیں جیسا کہ قلم کا کتاب سے یا مکان کا باغ سے یا روپے کا غلّہ اور کپڑے سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بوجہ سریع الفنا ہونے کے انکی دولت کے مبادلہ میں انتقال مِلک ممکن نہیں۔

۱۱۔ یہاں یہ بتانا خالی از لطف نہ ہوگا کہ زمانۂ جدید کی ایجادات نے بعض غیر مادّی خدمات میں استملاک پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً فونوگراف نے گانے میں کہ اکثر گوّیئے اپنے گانے ریکارڈ کی شکل میں کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں جس سے وہ کمپنی کی مستقل مِلک ہو جاتے

ہیں۔ یہی صفت تمام جسمانی کرتبوں میں بائیسکوپ نے پیدا کر دی ہے۔ گاما اور زبسکو کی مشہور عالم کشتی جس کے دیکھنے کو لوگوں نے صدہا روپیہ خرچ کیا ہوگا، تمام بائیسکوپ کمپنیاں دکھاتی پھرتی ہیں۔

ایک ضروری گذارش

۱۲- واضح ہو کہ دولت کی بحث میں خلاف معمول بہت زیادہ تنقیح و توضیح سے کام لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ عام اصول سے بعض دقیق مگر مفید و دلچسپ نتائج بطور خود اخذ کرکے جدت نمائی کی بھی جابجا جرأت کیگئی ہے۔ اپنی معلومات کی پوری مدد سے ان جدید نکات کی بنیاد مستحکم اصول پر قائم کی ہے۔ عالمان معیشت کی تنقید سے آئندہ ظاہر ہوگا کہ یہ کوشش کہانتک کامیاب ہوئی۔ لیکن یہ سب کچھ علمی مذاق کی خاطر کیا گیا ورنہ علم المعیشت میں دولت کی انھی عام شکلوں سے بحث کیگئی ہے جو بکثرت ہر طرف نظر آتی ہیں اور جنکو سب لوگ حسب معمول پہچانتے ہیں۔ اسکی باقی شکلیں بوجہ نادر الوجود اور عملاً غیر اہم ہونے کے اکثر نظر انداز کردی جاتی ہیں۔ یہ اعتراف اسوجہ سے اور بھی ضروری معلوم ہوا کہ اکثر مروجہ انگریزی کتابوں میں دولت کے عام اصول بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ موجودہ تشریح ان میں تلاش کرنا بیسود ہوگا۔

معاشی جدوجہد

۱۳- دولت کی ماہیت۔ اُسکی اقسام اور اُسکی مختلف اشکال واضح کر دینے کے بعد ہم اصل موضوع علم معیشت سمجھانے کے لئے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ نظر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوائے اُن معدودے چند خاص کاموں کے جو انسان مذہبی اغراض سے بغرض مفاد آخرت کرتا ہے۔ باقی جس قدر کام ہیں وہ براہ راست یا بالواسطہ ہماری ایک نہ ایک موجود یا آئندہ احتیاج رفع کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر ہمارے اکثر کام کسی نہ کسی طرح پر دولت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ایسے تمام کام اصطلاح میں معاشی جدوجہد کہلاتے ہیں۔

جامع تعریف

۱۴- افادہ اور استبدال سے دولت کی ماہیت اور دولت کے ذریعے سے معاشی جدوجہد کے معنی سمجھانے کے بعد اب ہم علم المعیشت کی تعریف یوں کرسکتے ہیں کہ معیشت وہ علم ہے

حصہ اول

جو انسان کی تمام معاشی جد و جہد سے بحث کرتا ہی اور اس مجمل تعریف کی تفصیل یہ ہی کہ معیشت
انسان کی معاشی جد و جہد سے بحث کرتا ہی اور معاشی جد و جہد سے مراد انسان کے وہ کام ہیں
جو دولت سے متعلق ہوں اور دولت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ اور استبدال
موجود ہو۔ یعنی جن میں احتیاج پوری کرنے کی صلاحیت پائی جائے اور جن کا مبادلہ ہو سکتا
ہو۔ معیشت کی مختصر تعریف علم دولت بھی ہی۔ مگر بیان بالا سے ظاہر ہی کہ معیشت کا اصلی
موضوع انسانی احتیاجات اور انکے پورا کرنے کی جد و جہد ہے اور دولت سے جو کہ احتیاج پورا کرنیکا
آلہ ہے۔ اسکا تعلق محض بالواسطہ ہی۔ اس مختصر تعریف نے معیشت کے موضوع کے متعلق زمانہ
گذشتہ میں نہایت بے بنیاد غلط فہمی پیدا کر دی کہ گویا وہ دولت پرستی کی تلقین کرتا ہی جسکی
بدولت اس علم کی راہ ترقی میں تعصب اور مخالفت کی ایسی رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں کہ سالہا
سال کی کوشش سے بمشکل رفع ہو سکیں۔ علم المعیشت میں دولت کی تقریباً وہی حیثیت ہے جو
ادویہ کی علم طب میں۔ گویا وہ موضوع سے متعلق ضرور ہی لیکن بذات خود موضوع نہیں۔

معیشت کی تقسیم مباحث

۱۵۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ معیشت کا موضوع کیا ہے۔ اب یہ بتانا بھی ضروری ہے
معاشی جد و جہد چار صورتیں اختیار کر سکتی ہے۔ یا تو وہ پیدائش دولت سے متعلق ہوگی
یا تقسیم۔ یا مبادلہ۔ یا صرف دولت سے۔ اور ان چاروں صورتوں میں حسب ترتیب بالا
ایک رشتۂ تعلق بھی قائم ہے۔ اول دولت پیدا کی جاتی ہے۔ پھر جو لوگ پیدا کرنیمیں شریک
ہوتے ہیں اُسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ بعدہٗ بمقتضائے ضرورت اپنی چیز کا دوسرونکی
چیز سے مبادلہ کرتے ہیں اور بالآخر اُس کو کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً کاشتکار اپنے ہل بیل
کھاد اور بیج لگا کر کچھ مزدوروں کی مدد سے زمیندار کے کھیت میں غلہ پیدا کرتا ہے۔ جب
راس تیار ہوتی ہی تو وہ کاشتکار مزدور اور زمیندار کے درمیان منافع امزدوری اور لگان
کیصورت میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنا کل حصہ یا اُس کا ایک جزو بازار

حصہ اول

میں فروخت کرکے حسب ضرورت کپڑا، جوتہ اور ضروری سامان خریدتا ہے جن کو وہ اپنے گھر لاکر استعمال کرتا ہی۔ پس ہم اپنی کتاب میں انھیں چار صورتوں یعنی پیدایش تقسیم مبادلہ اور صرفِ دولت کے تحت میں حسب ترتیب مذکورۂ بالا بحث کرینگے۔

واضح ہو کہ معاشی جدوجہد کی چار صورتوں کی موجودہ ترتیب سے علمی بحث میں سہولت ہوگی ورنہ حقیقت یہ ہی کہ عملاً صرف پیدایش پر مقدم ہے اور مبادلہ تقسیم دولت پر۔ واقعات ومشاہدات خود اسکی توضیح کرتے ہیں۔ یہاں صرف اشارہ ضروری سمجھا گیا۔

معیشت اور علوم متجانسہ

۱۶۔ اوپر کے بیان سے واضح ہوگا کہ معیشت انسان کی کوششوں اور کاموں کے ایک خاص پہلو سے بحث کرتا ہی۔ اسکی نظر میں تمام انسان کاروبار میں مصروف اور اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض دیگر علوم انسانی گروہ کے افعال پر دوسرے نقطۂ خیال سے نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً علمِ قانوں کے نزدیک تمام لوگ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت اور حق تلفی کے معاوضہ یا سزا کا مطالبہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ علمِ سیاست کے خیال میں سب آدمی سلطنت کے نظم ونسق اور حکومت کی کل چلانے میں مصروف ہیں۔ تاریخ تمدن گروہ انسان کی مختلف طرز ہائے بود و باش اُس کے عجیب رسم ورواج اور عادات اور روایات کا تماشا دکھاتا ہے۔ علم الاخلاق عقل یا مذہب کی کسوٹی پر افعال انسانی کا حسن وقبح جانچتا ہی۔ غرضکہ یہ کئی علم ایک ہی چیز یعنی انسانی گروہ کے افعال کو مختلف نظروں سے دیکھتے اور انکے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ اور ان کو اصطلاحاً علوم متجانسہ کہتے ہیں۔ چونکہ انسان کے تعلقات تمدن ان تمام علوم کا مشترک موضوع ہی ان کو ایک جامع علم تمدن کی جنس کا نوع سمجھنا چاہیئے۔ یہ سب آپس میں اس قدر ملے جلے ہیں کہ بھول بھلیاں معلوم ہوتے ہیں اور ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنا محال ہی جس طرح کہ ہوا میں گرد ونواح کی چیزوں سے سردی۔ گرمی۔ نمی۔ آواز اور بو پھیلتی

حصہ اول

ہے۔ علوم متجانسہ کے اثرات بھی ہر ایک علم کی بحث میں اسی طرح پیوست نظر آتے ہیں۔ جو کچھ تفریق کیجاتی ہے وہ بیشتر خود اختیاری ہے۔ کسی قطعی اصول کی پابند نہیں۔ تاہم سہولت مطالعہ سخت مقتضی ہے کہ علم تمدن جیسا وسیع مبحث چند کم وبیش جداگانہ علوم میں تقسیم کیا جاوے چنانچہ اسی ضرورت سے تفریق باوجود ادھوری ہونے کے برقرار رکھی گئی اور تجربہ سے مفید بھی ثابت ہو رہی ہے۔ مذکورۂ بالا علوم متجانسہ سے معیشت کا میل جول جیکے سمجھنے کیواسطے مسائل معیشت کا علم شرط اول ہے اس قدر گہرا اور گوناگوں ہے کہ اسکی دقیق وطویل تشریح یہاں پر قبل از وقت خیال کرکے ترک کرتے ہیں۔ آیندہ مسائل پر غور کرنے سے اس کی جھلک خود نظر آنے لگے گی۔

معیشت میں مسلمات

۱۷۔ علم المعیشت میں علوم متجانسہ کا گوناگوں اثر تو اس طرح پھیلا ہوا ہے جیسے کہ ہوا میں گرمی۔ سردی۔ نمی۔ آواز اور بو لیکن اسکے علاوہ معیشت نے علوم غیر متجانسہ کی معلومات سے اپنے مباحث میں جابجا بلا تکلف سنگ بنیاد اور ارض اساسی کا کام لیا ہے دیگر علوم کے اصول و قوانین کو بطور مسلمات قبول کرکے ان پر معاشی مسائل کی عمارات قائم کی گئی ہیں۔ ایسے مسلمات کی بعض علما نے لمبی چوڑی فہرستیں مرتب کی ہیں چند خاص طور پر قابل ذکر ہیں انکے استعمال کی تفصیل اور مثالیں آیندہ مباحث میں جابجا مل سکینگی۔ اور غور و تجسس سے انکا پتہ لگانا نہ صرف بیحد دلچسپ بلکہ مسائل سلجھانیمیں کارآمد بھی ہوگا۔ یہاں صرف اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے :۔

(۱ الف) **قانون تقلیل حاصل**۔ عمل پیدائش خصوصاً زراعت میں اگر اضافہ پیداوار کی اُمید سے مصارف بڑھاتے رہیں تو ایک ایسی حد آتی ہے کہ اس سے آگے بڑھنے کا نتیجہ مصارف سے پیداوار کی نسبت میں بیش از فزوں تخفیف ہوگا۔ یعنی بمقابلہ جدید مصارف کے مزید پیداوار کی مقدار نسبتاً گھٹتی چلی جاویگی۔ مسئلہ لگان اسی قانون پر مبنی ہے۔

حصہ اول

(ب) **قانون تکثیر حاصل**۔ مذکورۂ بالا قانون کا بالکل برعکس ہی اور صنائع میں اسکا عمل بکثرت رائج ہی۔ اسکی تفصیل پیدائش پر پیمانہ صغیر و کبیر کی بحث میں کیجاوے گی۔

(ج) **قانون طلب**۔ شے مطلوبہ کی مقدار مقبوضہ میں ہر جدید اضافہ کا افادہ نسبتاً گھٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ اگر اضافہ برابر جاری ہی تو ایک حد پر مزید اضافہ کا افادہ بالکل غائب ہو جاتا ہی۔

(د) **قانون رسد**۔ ہر شخص قلیل ترین صرف سے اپنی احتیاج پوری کرنے کی کوشش کرتا ہی۔ یہ دونوں قانون علم النفس سے متعلق ہیں اور معیشت میں انکا استعمال بحث مبادلہ دولت سے ظاہر ہو گا۔

معیشت کے قوانین۔

۱۸۔ واضح ہو کہ ہر علم میں قانون کا مفہوم چند اسباب سے ہمیشہ یکساں نتائج پیدا ہونے کا واقعہ ہی۔ مثلاً جب ہم کوئی چیز ہوا میں اُچھالتے ہیں تو وہ بالآخر زمین پر گرتی ہی۔ اسی واقعہ کو **قانون کشش مرکزی** سے تعبیر کرتے ہیں جسکا منشا یہ ہے کہ زمین ہر چیز اپنی طرف کھینچتی ہی۔ لیکن اگر اُڑتے ہوئے پرند۔ اور غبارے اور درختوں میں لگے ہوئے پھل میز پر رکھی ہوئی کتابیں زمین پر نہیں گرتیں تو کیا اس سے قانون کی صحت پر حرف آسکتا ہی۔ نہیں۔ ان چیزوں پر قانون برابر عمل کر رہا ہے لیکن اسباب مخالف یکساں نتیجہ پیدا نہیں ہونے دیتے۔ تقریباً ہر قانون سے ایسی مزاحمت ممکن ہی۔ چنانچہ قوانین کے عملدرآمد میں ہمیشہ موانع کی عدم موجودگی فرض کر لیجاتی ہی گویا قوانین مشروط ہوتے ہیں۔ مادی علوم میں تو ہر قانون کے اسباب، نتائج اور موانع کی پوری تحقیق اور تفریق ممکن ہی۔ اسی وجہ سے یہ قوانین بہت زیادہ صحیح اور محقق ہوتے ہیں۔ لیکن علوم متجانسہ کی بحث سے ظاہر ہو گا کہ علوم تمدن کے قوانین کی حالت بالکل برعکس ہی۔ مزید براں چونکہ یہ علوم گروہ انسانی کے افعال سے بحث کرتے

ہیں اور انسان دیگر مخلوق کی مانند قدرت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں۔ بلکہ اپنے افعال کا وہ بہت کچھ مختار ہے اسکی مرضی جو کسی قانون کی پابندی سے آزاد ہے۔ قوانین تمدن کے عملدرآمد میں بہت کچھ معاون یا مانع ہو سکتی ہے۔ اور لطف یہ کہ اسکی مداخلت بھی خود اختیاری ہی نتیجہ یہ کہ علوم تمدن کے قوانین اکثر تخمینی اور کم و بیش غیر متعین ہوتے ہیں۔ اور مادی علوم کے قوانین سے بدرجہا مشروط اور اس حیثیت سے معیشت کے قوانین تمام باقی سب پر فایق نظر آتے ہیں۔ مزید براں معاشی قوانین نہ صرف پابند شرائط ہیں بلکہ اکثر ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جو بحیثیت مجموعی خلاف حقیقت نہ سہی لیکن نادر الوجود اور بعید از واقعات ضرور ہیں۔ یہاں پر یہ اہم نکتہ سمجھنا ضروری ہی کہ ایسے مفروضات میں اسباب زیر بحث ہمیشہ واقعی اور حقیقی ہوتے ہیں۔ البتہ وہ بہت سے اسباب میں سے چند منتخب ہوتے ہیں اور انکے عملدرآمد کی حالتیں بھی بغرض سہولت نہایت سادہ فرض کیجاتی ہیں۔ چنانچہ اس آخر الذکر حیثیت سے یہ مفروضات بعید از واقعات کہے جاسکتے ہیں۔ ورنہ انہیں کبھی بے بنیاد اور خیالی اسباب سے ہرگز بحث نہیں کیجاتی۔ پس ان مفروضات کی بنا پر معاشی قوانین کو محض خیالی اور ناکارہ سمجھنا بیجا ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ مفروضات ناگزیر بھی ہیں جبکہ بیشمار موافق اور مخالف اسباب کا تصادم ہو اور اختلاف حالات کی کوئی انتہا نہو تو تعین قوانین کا سوائے اسکے کوئی طریقہ نہیں کہ فروعات اور خصوصیات کو نظر انداز کرکے صرف چند قوی اسباب اور ازحد سادہ حالات کے مفروضات پر اکتفا کیا جائے۔ ایسے مفروضات پر جو قانون مبنی ہونگے۔ وہ بشکل اول گو معاشی واقعات کی سچی تصویر نہوں لیکن بتدریج مختلف اسباب کا لحاظ کرکے ان میں ایسی ترمیم اور اصلاح ممکن ہے کہ وہ حقیقی حالات کے مطابق بنجاویں اور واقعات کی تشریح کرسکیں۔ واضح ہو کہ جو قوانین

حصہ اول

اسباب کثیر پر مبنی ہوں انکے تعین کا یہی علمی طریقہ ہی اور اس کو اصطلاحاً طریق تسہیل کہتے ہیں۔ لگان کی بحث میں بھی ہمنے معاشی قوانین کی ہیئت فرضی اور طریق تسہیل کیطرف اشارہ کیا ہی۔ غور کرنے سے دیگر مسائل میں بھی یہی کیفیت نظر آئیگی۔ قوانین جانے بغیر انکے اساسی مفروضات کی مفصل بحث سراسر قبل از وقت ہوگی یہاں بیان مجمل کافی ہی۔ آیندہ بغور خود مفروضات اساسی کی تحقیق اور واقعات کی تطبیق کرنا طالب علم کے حق میں بیحد مفید کوشش ثابت ہوگی۔ بشرط وقت اشارہ سے ہم بھی مدد دینگے۔

معیشت کی وسعت

۱۹۔ علما میں مدتوں سے یہ بحث جاری ہی کہ معیشت آیا محض علم ہے یا فن یا دونوں کا مجموعہ اور آیا من حیث العلم وہ علم الحقیقت ہے یا علم الهدایت یا دونوں کا مرکب۔ اس بحث پر بیحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو موانع علوم متجانسہ کی تفریق میں پیش آتے ہیں وہی بدرجہ اولیٰ یہاں پر وسعت بحث کے تعین میں سد راہ بنتے ہیں اور اس سوال کا حل بھی بجائے کسی متفق علیہ اصول کے بیشتر خود رائی پر منحصر کیا گیا ہے۔ بحث معیشت پانچ جداگانہ درجوں میں منقسم ہو سکتی ہی۔ (۱) جد و جہد معاشی کا صحیح و سالم بیان (۲) جد و جہد معاشی کی توجیہ اور معاشی قوانین کی تحقیق (۳) کسی ایک معیار کا تعین جس سے معاشی معاملات کی بھلائی برائی دریافت ہو سکے (۴) مذکورۂ بالا معیار کے ذریعہ سے بہبودی اور مرفہ الحالی کے معاون اصول منتخب کرنا (۵) اصول منتخبہ پر کاربند ہونے کے طریق و تدابیر بتانا۔ ان میں سے پہلے دو درجے علم الحقیقت کے ماتحت ہیں۔ بعد کے دو علم الهدایت سے متعلق ہیں اور پانچواں فن میں داخل ہی۔ سچ پوچھئے تو معیشت کی تینوں مذکورۂ بالا حیثیتوں کا لحاظ لابد اور ناگزیر ہے

علم التحقیقت بغیر تو علم الھدایت اور فن کا مطالعہ ممکن ہی نہیں اور ہر حالت میں معیشت کا علم التحقیقت ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ محض علم التحقیقت بھی بذات خود عبث اور لاحاصل ہے۔ بھلا معاشی جد وجہد کے بیان و توجیہ اور قوانین اساسی کی تحقیق سے کیا فائدہ اگر بعد کو بہبودی اور مرفہ الحالی کے اصول نہ قرار دئے جاویں اور نیز ان پر عمل پیرا ہونے کی تدابیر نہ نکالی جائیں۔ ان علوم اور فن کا گہرا تعلق اور باہمی انحصار سب تسلیم کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی اختلاف رائے ہے وہ انکی ترتیب اور تسمیہ پر ہے مدت تک یہ تینوں بلا تفریق علم المعیشت میں داخل رہے۔ لیکن ایک جدید گروہ نے جو ان تینوں کی تفریق مفید بلکہ ضروری خیال کرتا ہے تقسیم کار کے زریں اصول کے مطابق معیشت کو علم التحقیقت تک محدود کرکے علم الھدایت اور فن کو علی الترتیب فلسفہ تمدن اور مالیات کے تحت میں منتقل کر دیا۔ مثلاً مسئلہ ٹکس لیجئے (۱) ٹکس کی ماہیت اور ادا کرنے والوں پر اسکا گوناگوں اثر دریافت کرنا علم المعیشت کا کام ہے (۲) ٹکس کے ایسے اصول قرار دینا کہ وہ ملک کے حق میں سراسر مفید ہو سکے فلسفہ تمدن سے متعلق ہے اور (۳) اور ٹکس کے مذکورۂ بالا اصول پر کاربند ہونیکی تدبیر نکالنا مالیات کے ذمہ ہے۔ آیندہ ٹکس کی بحث میں اس مثال کی تشریح میگی یہاں پر مختصراً بیان کر دیگئی۔ واضح ہو کہ اس جدید تفریق کی چند نہایت معقول اور قابل لحاظ وجوہات پیش کیجاتی ہیں جنمیں سے ایک صفائی بیان اور سہولت مطالعہ بھی ہے۔ گویا علمی بحث میں یہ تفریق نہایت مفید ہے۔ اور علوم متجانسہ کے تعلق سے صاف ظاہر ہے کہ عملی حیثیت سے بعد تفریق بھی ان تینوں کے رشتہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جس طرح علماء معیشت بلا تکلف حسب ضرورت علوم متجانسہ کے قوانین اور انکے اثرات کا معاشی مباحث میں پورا لحاظ کرتے ہیں۔ اسی طرح بمقتضائے ضرورت مذکورۂ بالا حیثیتیں بھی معاشی بحث میں یکجا پیش کیجاتی ہیں۔ چنانچہ حامیان تفریق نے بھی علم المعیشت کی

حصہ اول

کتابوں میں جابجا یہی طریق برتا ہے۔ لیکن اس سے ان پر ترک تفریق کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آخری دو حیثیتوں کا لحاظ بطور علوم متجانسہ کرتے ہیں اور ان کو قدیم گروہ کی طرح جو علم المعیشت کا جزو تسلیم نہیں کرتے۔ بعض علما نے معاشی فن اور مالیات میں بھی تفریق کرکے اول کو آخر کا ماخذ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ نکتہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہے۔ نیز ظاہر ہے کہ مالیات اور فن قانون سازی میں وہی تعلق ہے جو جسم و روح یا متین اور انجن میں۔ گویا قانون ہی جان ڈالتا اور حرکت پیدا کرتا ہے۔ مالیات بذات خود معطل ہے۔

حاصل کلام یہ کہ علم المعیشت بذات خود نہ کفایت شعاری کی تلقین کرتا ہے نہ فضول خرچی کی ممانعت۔ نہ دولتمند بننے کا راز بتاتا ہے نہ مفلسی دُور کرنے کی تدبیر وہ علم الحقیقت ہے اور محض معاشی جد وجہد کی تشریح و توجیہ اور قوانین اساسی کی تحقیق اسکا کام ہے۔ اور ساتھ ہی اسکے فلسفۂ تمدن اور مالیات کو اصول مرفہ الحالی کی تعین اور ان پر کاربند ہونے کی تدابیر معلوم کرنے میں ناگزیر مدد دیتا ہے۔ اگر ایک ہی شخص یہ تینوں کام سرانجام دے تو اسکی تین جداگانہ حیثیتیں ہونگی۔ یعنی جہاں وہ عالم معیشت کہلائیگا وہاں فلسفی تمدن اور مدبر مالیات بھی مانا جائیگا۔ اور محض اوّل الذکر حیثیت میں آخری دو کام باوجود نہایت موزوں ہونیکے اسکے حلقۂ فرائض سے باہر ہیں۔ چونکہ علم الحقیقت شرط اول اور علم الہدایت و فن عرض و غایت ہیں نہ صرف عملی میدان میں یہ تینوں دوش بدوش چلتے بلکہ علمی بحث میں بھی زانو بہ زانو بیٹھتے ہیں۔ انکے قریبی تعلقات سب کو تسلیم ہیں جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں صرف ترتیب و تسمیہ پر اختلاف رائے ہے۔ ایک گروہ انکی تفریق بے معنی قرار دیکر تینوں کو علم المعیشت میں شامل کرتا ہے۔ دوسرا ایسی تفریق مفید بلکہ ضروری سمجھکر ان کو علم المعیشت۔ فلسفہ تمدن اور مالیات میں تقسیم کرتا ہے اور یہی رائے آجکل زیادہ مقبول و مفتے بہ ہو رہی ہے۔

قسمیں:۔ علم المعیشت کی ایک تقسیم معیشت اصولی اور معیشت عملی بھی ہے قسم اول میں علاوہ علم الحقیقت

حصہ اول

کے علم الہدایت بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اور قسم دوم مالیات کا دوسرا نام ہے۔ اور اس میں سکہ بنک اور حصول ٹکس جیسے عملی مسائل سے بحث کیجاتی ہے۔

معیشت کا طریق

۲۰۔ واضح ہو کہ علمی تحقیق کے دو طریق ہیں۔ منفرق فروعات سے کسی اصول واحد کا پتہ لگانا۔ تفصیل سے اجمال نکالنا یا کوئی اصول تسلیم کرکے اس سے فروعات اخذ کرنا۔ اجمال سے تفصیل پیدا کرنا دونوں منطق کی شاخیں ہیں۔ اصطلاحی زبان میں اول کو **استقرا** او دوم کو **استخراج** کہتے ہیں۔ معیشت کی تحقیق میں یہ دونوں اس طرح سے ملے جلے نظر آتے ہیں۔ جیسے کہ دال چاول کھچڑی میں۔ مدتوں علمائے معیشت کو کسی ایک طریق کا پابند ثابت کرنے کی فضول کوشش کی۔ تجربہ سے تحقیق کے واسطے دونوں طریق کا اجماع اس طرح یہ لازمی ثابت ہوا جیسے کہ تراش کیواسطے قینچی کے دو پلڑوں کا ملنا۔ معیشت کے جن مباحث میں عملی حیثیت غالب ہے۔ مثلاً اضافہ اصل۔ مسئلہ آبادی۔ پیدایش دولت۔ وہاں طریق اول موزوں اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ اور جن مباحث پر اصول کا رنگ گہرا چڑھا ہوا ہے۔ مثلاً مبادلہ یا تقسیم دولت۔ وہاں طریق دوم بیشتر مستعمل ہے۔ لیکن یہ دونوں طریق نہ صرف اس طرح بحیثیت مجموعی تحقیق معیشت کے واسطے ضروری ہیں۔ بلکہ خود ہر طریق کا عمل بغیر دوسرے کی شرکت اور معاونت کے ناقص اور ناممکل ہوتا ہے۔ چنانچہ نتائج استقرائی علمی حیثیت سے بے سود ہیں جبتک استدلال استخراجی سے انکی توجیہ نہ کیجاوے۔ علیٰ ہذا نتائج استخراجی عملاً بے کار ہیں جبتک کہ بطریق استقرا ان کی صحت واقعات سے ثابت نہ ہو جائے۔ اور لازمی شرائط دریافت ہوں۔ المختصر دونوں مذکورۂ بالا منطقی طریق معیشت کی تحقیق میں لابد ہیں۔ البتہ حسب حال مسئلہ زیر بحث کبھی طریق استقرا کا استعمال مقدم ہوتا ہے کبھی طریق استخراج کا۔ لیکن ہر حال میں انکا اجماع لازمی ہے۔ واضح ہو کہ طریق معیشت کی بحث فی نفسہ دقیق ہے اور اس کے سمجھنے کے واسطے معاشی اصول و مسائل کا علم شرط مقدم ہے۔ یہاں صرف

حصہ اول

مختصر اور سلیس بیان کافی اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔

لفظ اکانمی کی تحقیق

۲۱۔ مذکورۂ بالا بحث مباحثوں کا ذمہ دار خاص طور پر لفظ اکانمی ہے۔ جو اس علم کے معروف نام پولیٹکل اکانمی میں داخل ہے۔ اس لفظ کی سرگزشت نہایت دلچسپ ہے جس کو ہم یہاں مختصراً بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک یونانی لفظ ہے۔ اسکے لغوی معنی ہیں گھربار کا انتظام یعنی ضروریاتِ خانہ داری کی بہم رسانی اور آمدنی اور خرچ کا حساب اصطلاحاً اس کو تدبیرِ منزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ یورپ میں انقلابِ فرانس سے قبل حکومت لوگوں کے معاشی معاملات میں اسی طرح مداخلت کرتی تھی جیسے کوئی استبداد پسند بڑا بوڑھا اپنے گھر کے کاموں میں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ مثلاً ایسے قانون وضع کئے گئے تھے کہ کوئی مزدور ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ میں جا کر بغیر اجازتِ خاص محنت مزدوری نہیں کرسکتا تھا۔ کوئی پیشہ ور اپنا کاروبار بے اجازت جاری نہیں کرسکتا تھا۔ قیمتی دھاتوں کی برآمد قطعاً ممنوع تھی اور ایسے ہی بہت سے قانون جاری تھے جنھوں نے معاشی جد و جہد کو طرح طرح کی ناقابل برداشت بندشوں سے جکڑ دیا تھا۔ اور ناواقفیت معیشت کی وجہ سے یہ طرز عمل ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کا معاون سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ انتظام خانہ داری اور معاشی معاملات کی سرکاری نگرانی میں ایک مشابہت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا محض اکانمی یا تدبیرِ منزل سے مشابہت اور نیز فرق ظاہر کرنے کے لئے اس علم کا نام اکانمی پر اسم صفت یعنی لفظ پولیٹکل اضافہ کرکے پولیٹکل اکانمی یا تدبیرِ مدن قرار دیا۔ اور چونکہ طلبِ منفعت ایسے کاموں کی لازمی خصوصیت ہے۔ لفظ اکانمی سے کفایت شعاری کا خیال بتدریج پیوست ہوکر بالآخر ایسا حاوی ہوا کہ لوگ اصلی معنی یعنی انتظام خانہ داری۔ یا معاشی جد و جہد کی نگرانی بھلا بیٹھے اور مدت تک اچھے اچھے اس مغالطہ میں مبتلا رہے کہ یہ علم کفایت شعاری، دولت پرستی اور حد درجہ کی خودغرضی

سکھاتا ہے۔ چنانچہ اکثر پاک طینت علما نے اس علم پر بہت زہر اُگلا ہے اور دل کھول کر اسے صلواتیں سُنائی ہیں۔ مگر دراصل ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے وہ بھی حق بجانب اور اس لیئے قابل معافی ہیں۔

حصہ اول

چونکہ لفظ پولیٹکل اکانمی سے مغالطہ کا اندیشہ باقی رہتا ہے اسلیئے اب یہ علم زیادہ تر اکنامکس کے سیدھے سادھے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اصطلاح معیشت کی صحت

۲۲۔ اس علم کے اصلی موضوع اور اسکی وسعت کے متعلق جو جو غلط فہمیاں پیدا ہوچکی ہیں اُنکی جھلک اسکے اُردو ناموں میں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ علمِ ثروت، اصول دولت، اصولِ تونگری اور مُلکی کفایت شعاری وغیرہ جیسے مختلف خطابات اسکو دیئے جاچکے ہیں۔ اور لفظ اقتصاد کو تو اخبار اور رسالوں نے اس قدر رواج دے دیا ہے کہ اس پر اُنگلی اُٹھانے سے لوگ چونکتے ہیں لیکن اس علم کے مباحث کی ماہیت اور وسعت سے واقف ہوجانے کے بعد جو بہترین نام نظر آتا ہے وہ علم المعیشت ہے۔

معیشت کی مختصر سرگزشت

۲۳۔ یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ کسی زمانہ میں حکومت معاشی معاملات میں بہ کثرت جا و بیجا مداخلت کیا کرتی تھی اس طرزِ عمل کو اصطلاحاً طریق استبداد اور اسکے حامیوں کو مستبدین کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں معیشت بحیثیت فن سرکار کی معاشی پالسی سے متعلق تھا اور بس۔ لیکن انقلاب فرانس کے بعد فرانس میں حکما کا ایک زبردست گروہ متوکلین نام پیدا ہوا جس نے سرکاری مداخلت کی بڑے زور سے مخالفت کی۔ اس کو بیحد مضر ترقی و بہبود ثابت کیا۔ اور اصول غیر مداخلت کی اس شدومد سے منادی کی کہ گھر گھر چرچا ہوکر وہ بہت جلد ہر دلعزیز ہوگیا اور بالآخر حکومت کو بھی عام رائے کے مطابق اپنی پالسی تبدیل کرنی پڑی روز بروز معاشی معاملات قانونی بندشوں سے آزاد ہونے لگے۔ چنانچہ جب آدم اسمتھ

نے اس اصول کی انگلستان میں اشاعت کی تو قانون غلہ جو درآمد غلہ کو روکتا تھا اور مدتوں تک نہایت ضروری و مفید خیال کیا جاتا تھا منسوخ کر دیا گیا۔ اور درآمد و برآمدِ غلہ میں پوری آزادی مل گئی۔ اصول غیر مداخلت کے اثر سے سرکاری نگرانی گھٹتے گھٹتے تقریباً بالکل مفقود ہو گئی۔ معاشی معاملات کو قانون کے پنجے سے رہائی ملی اور اسی عرصہ میں معیشت نے بھی محض سرکار کی معاشی پالیسی کی بحث سے آگے بڑھ کر علمی میدان میں قدم رکھا۔ کچھ تو انسان بالطبع نگرانی کا محتاج ہے۔ اور کچھ کلوں کی ایجادات نے ملک کی معاشی حالت میں ایسا انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور اس انقلاب کی ہم مناسب موقع پر کافی تشریح کرینگے کہ سرکاری نگرانی کی ضرورت پھر بشدت محسوس ہونے لگی۔ غیر مداخلت کا طرز عمل بالکل تو متروک نہیں ہوا۔ لیکن اس میں مناسب ترمیمات ضرور کر دی گئیں اور بمقتضائے ضرورت سرکار نے پھر معاشی معاملات کی نگرانی کے واسطے قوانین پاس کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ قانون بنک قانون فیکٹری وغیرہ اسی تبدیلی کا نتیجہ ہیں مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حکومت کی گزشتہ اور موجودہ مداخلت و نگرانی میں بہت بڑا فرق ہے۔ اُس زمانہ میں مداخلت عام طرزِ عمل تھا اور بوجہ معاشی ناواقفیت کے اس کے کثرت استعمال سے بہت سی صورتوں میں مداخلت غیر ضروری اور مضر ہوتی تھی۔ برخلاف اسکے آجکل غیر مداخلت عام طرز عمل ہے۔ اور اگر بمقتضائے ضرورت کبھی نگرانی کی بھی جاتی ہے تو بوجہ واقفیت معیشت وہ ضروری اور مفید ہوتی ہے۔ یہ جدید پالیسی طریق استبداد و غیر مداخلت کا ایک معتدل مرکب سمجھنا چاہیئے۔ جسکو سرکاری نگرانی کہنا موزوں ہوگا۔ اس تیسرے دور میں معیشت کے علم و فن میں امتیاز پیدا ہو کر دونوں جدا ہو گئے۔

حصہ اول

اس بحث سے ظاہر معلوم ہوگا کہ تاریخی لحاظ سے معیشت اول بشکل فن نمودار ہوا لیکن ترقی کرتے کرتے اُس نے ایک علم کی شان حاصل کر لی اور بالآخر اس میں علم و فن کی دو جداگانہ حیثیتیں پیدا ہوگئیں۔ یہاں ایک یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم سے فن پیدا ہونا چاہیئے نہ کہ فن سے علم۔ لیکن یہ بحث بعینہ ایسی ہے جیسے کہ "انڈا پہلے پیدا ہوا یا مرغی"۔ واقعہ یہ ہے کہ اول انسان تجربۃً اپنی احتیاج پوری کرنے کی تدابیر نکالتا ہے۔ اور کامیاب ہونے پر وہی تدابیر علم و فن کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ کچھ عرصہ تک علم و فن ایسے ملے جُلے رہتے ہیں جیسے دُودھ میں گھی لیکن ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں جُدائی شروع ہونے لگتی ہے۔ اور بالآخر علم، فن سے بالکل ممیز اور ممتاز ہوجاتا ہے۔ چنانچہ فنِ طب اور علم الابدان۔ نجوم اور ہیئت کے تاریخی رشتہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ غرضکہ معیشت میں بھی ترقی ہوتے ہوتے فن سے جداگانہ ایک علم الحقیقت کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اور من حیث العلم گروہ انسان کے افعال کا ایک خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا اُسکا مقصدِ اعلیٰ قرار پایا ہے۔

معیشت کا حاضر اور مستقبل

۲۴۔ ترقیِ تہذیب کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں روز افزوں پیچیدگیاں پیدا ہورہی ہیں جنکو سُلجھانے کے لیۓ ناخنِ علم ناگزیر ہے۔ زندگی کے متعدد شعبوں میں سے صرف ایک معاشی جد و جہد ہی پر ذرا غور کیا جاۓ کہ اب اسکا حلقۂ اثر شہروں، صوبوں، بلکہ ملکوں سے نکلکر تمام عالم پر محیط ہوگیا ہے زمانۂ جدید کی ایجادات تار، مطبع، ریل، جہاز اور طرح طرح کی کلوں نے تمام دنیا کو کیسے کیسے قوی تعلقات اور مضبوط رشتوں سے جکڑ دیا ہے۔ کبھی ہماری ضروریات انگلیوں پر گنی جاسکتی تھیں اور ان کو پورا کرنے کے وسائل کیسے سیدھے سادھے اور مختصر تھے۔ ہر قصبہ و شہر اپنے اپنے باشندوں کی ضروریات کا بیشتر کفیل ہوتا تھا اور رسد ضروریات کے

حصہ اول

واسطے اپنے ملک سے باہر کوئی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا۔ مگر آج مہذب اور متمول طبقہ کا تو ذکر ہی کیا ہے، دنیا کا وہ کون سا ملک ہے جہاں کی کوئی نہ کوئی چیز انکے محل یا کوٹھی کے سامان میں داخل نہیں۔ آپ ایک غریب اور جاہل گنوار کے جھونپڑے میں بھی کم از کم روس یا برھما کا مٹی کا تیل، امریکہ یا جرمنی کی لالٹین جاپان یا آسٹریا، ناروے یا سویڈن کی دیاسلائی کا بکس اور انگلستان کا کپڑا ضرور موجود پائیں گے۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ سوئٹزرلینڈ کی سستی گھڑیوں، امریکہ کے سگریٹ، انگلستان کے قلم، چاقو اور چھتریوں کا رواج بھی گانوں کے اسکول جانے والے بچوں میں بکثرت پھیلتا جاتا ہے۔ اس سے ہم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک طرف تو ہماری ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف اُن کے پورا کرنے کے وسائل وسیع ہو رہے ہیں۔ اور یہ تہذیب کی ترقی اور آبادی کی فراوانی کا مقتضا ہے۔ جس کی توضیح ہم آیندہ مناسب موقع پر کریں گے۔ یہاں صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ اس عالمگیر رجحان کو روکنا نہ ممکن ہے نہ مفید۔ البتہ اس کو چند اصول کا پابند بنانا ضروری ہے۔ جس کی تفصیل تجارت بین الاقوام کے تذکرہ میں کیجائے گی۔ دُنیا کا کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جو اپنی تمام ضروریات کو خود پورا کرسکے اور دوسرے ممالک کا کم وبیش دست نگر نہ ہو۔ کسی ملک میں اشیائے صنعتی کی درآمد ہے جیسے ہندوستان میں اور کسی میں پیداوار خام کی مانگ ہے جیسے انگلستان میں۔ لیکن دنیا کے تمام ممالک اپنی ضروریات کے رفع کرنے میں کم وبیش اسی طرح محتاج ہیں۔ جس طرح کسی چھوٹے سے گانوں میں ایک پیشہ ور دوسرے کا محتاج ہوتا تھا۔ رسد ضروریات کے وسائل نہ صرف وسیع ہوگئے ہیں بلکہ ان کی حالت میں بھی انقلاب عظیم پیدا

ہوگیا ہے۔ ذرا جلاہے کے کرگھے کا مانچسٹر یا بمبئی کی ملوں، ہوچی کی دوکان کا رھمبٹن یا کانپور کی فیکٹریوں اور لوہار کی بھٹی کا لیڈس یا ٹاٹا ورکس کے کارخانوں سے مقابلہ تو کرو۔ کوئی بھی نسبت ہی؟ حالانکہ ان کے کام اب بھی یکساں ہیں۔ مزید براں سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جو عام ملکی اور قومی بہبودی اور مرفہ الحالی کے سنگ بنیاد ہیں اور جن کا حل کرنا علم اور تجربہ کی مدد کے بغیر محال ہے۔ سکہ نوٹ بنک مل اور فیکٹری ریل نہریں معدنیات وجنگلات تعلیم صحت ٹیکس تجارت درآمد و برآمد اور عام مرفہ الحالی وہ چند جدید اور اہم مسائل ہیں جنکو حل کرنے میں آج دنیا کے بہترین دماغ براہِ راست یا بالواسطہ مصروف ہیں اور یہی وہ مسائل ہیں جو تمام مہذب سلطنتوں کی داخلی وخارجی پالیسی کے رُوح رواں بنے ہوئے ہیں۔ واقعات شاہد ہیں کہ عرصہ سے معاشی اغراض جنگ کے محرک ہوا کرتے ہیں۔ اور معاشی تسلط اکثر ملک گیری کا پیش خیمہ ہوتا ہی قدیم و جدید طریق ملک گیری کے متعلق مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کا لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پہلے تو قاعدہ تھا آگے لٹھیا پیچھے گھٹیا۔ لیکن آجکل اس کے برعکس آگے گھٹیا اور پیچھے لٹھیا پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ہندوستان فارس مصر مراکش سب اسی مہلک راز کا زبانِ حال سے اعلان کررہے ہیں اور ٹرکی کی بیچارگی اور جاپان کی خودداری سے معاشی تسلط اور آزادی کا کیسا افسوسناک فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پس جبکہ انسانی زندگی کا معاشی شعبہ اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہوگیا ہی اور اسکا اثر ہماری بہبود پر اس قدر حاوی ہے تو علم المعیشت کا جاننا ہم پر لازم ہے۔ تاکہ ہم زندگی کے جدید

ناہموار پیچیدہ اور طویل راستوں سے آسانی گزر کر منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔ اور میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مُردہ جسم میں علم معاشیات ہی ایک دن نئی روح پھونکے گا اور مسیحائی کا سہرا اسی کے سر بندھے گا۔

حصۂ دوم
باب اول

حصۂ دوم

پیدائش دولت

باب اول

پیدائش کا مفہوم

تجزیہ۔ انسان کے کارنامے (۲) پیدائش کی ماہیت (۳) پیدائش کا منشا (۴) خلاصہ

انسان کے کارنامے

(۱) انسان کے کارناموں پر تو ذرا نظر ڈالیے کہ اس نے پہاڑ کاٹے۔ سمندر پاٹے۔ ریگستان روندے۔ برفستان کھوندے۔ جنگل میں منگل منائے۔ سمندر سے موتی رولے۔ زمین کے دفینے کھولے۔ کرۂ ارض کی طنابیں کھینچیں۔ وقت میں قیامت کی وسعت پیدا کی۔ اور آگ پانی کے عمل سے تمام دنیا کو مسخر کر ڈالا۔ چیزیں اتنی بنائیں کہ ان کا حد نہ حساب۔ اور ہر ایک ایسی انوکھی کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے اور ابھی نچنت ہو کر بیٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ جس قدر اس کی استطاعت بڑھتی ہے ہوس بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو خدا جانے یہ سیلاب ترقی دنیا کو بہا کر کدھر لیجائے اور کیا انجام دکھائے۔ غرضکہ تمام عالمگیر تلاطم اور انقلابات کے باعث یہی چھوٹے سے حضرت انسان ہیں کہ جو جسامت۔ جرأت طاقت۔ تیز رفتاری۔ دُور بینی۔ اور دیگر صفات جسمانی میں حیوانوں سے کہیں

حصہ دوم
باب اول

پھسڈی ۔ اپنی بقا اور پرورش کے واسطے بیرونی امداد کے سب سے زیادہ محتاج
لیکن خدا نے ان کو عقل کا ایسا اسم اعظم عطا کیا ہے اور چھوٹے چھوٹے دو ہاتھ
ایسے زبردست آلے دیئے ہیں کہ ساری دنیا قدموں سے لگی پڑی ہے۔

پیدائش کی ماہیت

(۲) جب انسان نے تمام عالم کو تہ و بالا کر دیا ہو اس کی قدرت کا کیا ٹھکانا ہوگا
اور کون چیز پیدا کرنے پر وہ قادر نہوگا ۔ لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے ۔ اگر سچ
پوچھو تو اس کو پیدائش میں برائے نام بھی دخل نہیں وہ نہ ایک ذرہ پیدا کر سکتا
ہے نہ ناپید ۔ یہ قدرت تو اس خالق اکبر نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے کہ جس نے
ایک لفظ کُن سے سارا جہان موجود کیا اور اک اشارہ سے معدوم کر دے گا۔
انسان البتہ خدا کی بنائی چیزوں سے بچوں کی طرح کھیل خوب رہا ہے ۔ دنیا گویا
اک سیر بیں ہے کہ جس میں رنگ برنگ شیشے ہلانے جلانے سے اپنی ترتیب
بدل بدل کر نت نئے بیل پھول اور عجیب و غریب نقش و نگار دکھاتے ہیں ۔
نادان انسان اتراتا ہے کہ وہی تماشہ گر ہے ۔ چنانچہ انسان کی تمام کارگزاریوں کا
لُبّ لباب یہ ہے کہ یا تو وہ موجودہ چیزوں کا صرف مقام بدل دیتا ہے ۔ مثلاً
موتی اور معدنیات نکالنا ۔ یا موجودہ اشیا کے اجزا کو نئی ترکیب دیدیتا ہے ۔
مثلاً لکڑی ۔ لوہا ۔ بید اور وارنش سے کُرسی بنانا ۔ اور یا عاملین قدرت کی
وساطت کلّی سے صورت بھی بدل دیتا ہے ۔ مثلاً زراعت ۔ کسان کا کام صرف
اتنا ہے کہ بوقت معیّن اور بطریق مخصوص زمین ۔ کھاد ۔ تخم اور پانی یکجا کر دے ۔
پودے اُگانا ۔ پھول کھلانا ۔ پھل لگانا اور ان کو پکانا ۔ یہ سب کام عاملین قدرت
مثل گرمی ۔ سردی ۔ ہوا اور روشنی کے متعلق ہیں ۔ غریب کسان کو ذرہ برابر
دخل نہیں ۔ وہ تو کھیتی بو کر بزبان حال قدرت سے کہدیتا ہے ۔ مصرع

سپردم بتو مایۂ خویش را۔ کبھی ابر رحمت اور موسم موافق کی دعائیں مانگتا ہے کبھی آفات سماوی سے پناہ چاہتا ہے۔ اکثر کھیت سے گونیں بھر بھر غلہ اٹھاتا ہے اور کبھی ساری لاگت خاک میں ملا کر دست حسرت ملتا رہ جاتا ہے۔ عمل پیدائش میں کسان کی بے بسی بھی کس قدر قابل رحم اور عبرت آموز ہے۔ حالانکہ پیدائش کا سب سے اہم صیغہ اسی کے متعلق ہے۔ اور یہ جو ایک دانہ غلہ سے بہت سے دانے نکلتے ہیں اور چھوٹے سے تخم سے اونچے اونچے دیرپا اور بار آور درخت پیدا ہوتے ہیں۔ مانا ہم نے کہ عاملین قدرت ان کو ظہور میں لاتے ہیں لیکن کیا وہ ان کو نیست سے ہست کرتے ہیں؟ ان کی تخلیق پر قادر ہوتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہ قدرت تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ بلکہ حسب قوانین قدرت صرف مادہ کی صورت بدل کر نمودار کر دیتے ہیں۔ یہ پھل پھول سے لدے پھندے پودے اور درخت کیا ہیں۔ مادہ کے بیشمار اجزا عاملین قدرت کی مدد سے بطریق نامعلوم ہزار ہا رنگ و روپ بدل کر پردۂ زمین سے نکلتے ہیں کہ گویا آسمان سے اترے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ پیدائش سے مراد تخلیق نہیں بلکہ چند خاص قسم کی تبدیلیاں ہیں۔ جو اوپر بیان کیجا چکی ہیں۔

پیدائش کا منشا

(۴) اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیدائش کی غرض و غایت کیا ہے۔ اس کا جواب ہے۔ ابدا یا ازدیاد افادہ کا۔ مقدمہ میں بیان ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں کم و بیش افادہ ضرور موجود ہے۔ لیکن ہم یا تو اس سے سراسر بیخبر ہیں۔ یا باوجود واقفیت بوجہ عدم دسترسی اس سے مستفید نہیں ہو سکتے یا اگر ہوں بھی تو کمتر ہر ایک چیز سے پورا پورا افادہ حاصل کرنا اور موجودہ محرومی کے اسباب رفع کرنا پیدائش کی اصلی غرض اور منشا ہوتی ہے۔ صرف چند سال

حصہ دوم
باب اول

ہمنے گلی کوچوں کی خاک سے المونیم کے برتن بنانے سیکھنے ہیں۔ موتیوں اور قیمتی دھاتوں کی قدر و قیمت سے تو واقف تھے مگر سمندر اور کانوں کی تہہ سے ان کا نکالنا بیحد مشکل تھا۔ جو سن آج ریشم کو بھی ماند کر رہا ہے۔ مدتوں ہم اُس سے صرف رسّی ڈور بٹا کئے۔ اور ظاہر ہے کہ افادہ پہلے ہی سے ہر چیز کی ذات میں مضمر ہوتا ہی۔ کچھ پیدائش اس کو عدم سے وجود میں نہیں لاتی۔ البتہ انسان کا قابو اور دسترس افادہ پر ضرور بڑھا دیتی ہے اور بس۔

خلاصہ

(۴) بالفاظ مختصر علم المعیشت میں پیدائش سے یا تو نقل مقام۔ تبدل ترکیب۔ اور تغیر صورت مراد ہوتی ہے۔ یا ان افعال میں سے کسی دو یا تینوں کا اجماع۔ پیدائش کا منشا ابدایا ازدیاد افادہ ہوتا ہی۔ چیزیں اور اس میں خواص پیدا کرنا اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے محض جوڑ توڑ اور اُلٹ پھیر کی نام نہاد قدرت سے جب حضرت انسان نے یہ گُل کھلا رکھے ہیں۔ تو اختیار پانے پر کیا کچھ نہ کر گذرتے۔

اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

حصہ دوم
باب دوم

باب دوم
عاملین پیدائش
فصل اوّل
عاملین پیدائش کی تفصیل

تجزیہ۔ (۱) زمین (۲) محنت (۳) اصل
(۴) اصل کی سرگذشت (۵) اصل کی کارگذاری (۶) خلاصہ

زمین (۱) پیدائش کا مفہوم تو بیان ہو چکا۔ اب دیکھیں کہ کون خاص خاص وسائل پیدائش کے واسطے لابد ہیں۔ کن عاملین کی کارگذاری پر پیدائش کا دارمدار ہی۔ اور انمیں ہر ایک اپنے اپنے طور پر کہانتک اس کام میں حصہ لے رہا ہے۔ سب سے اول تو زمین ہی کہ وہ ہر ایک چیز کی مبدا اور منبع ہے اگر زمین نہو تو خلقت کہاں رہی اور نباتات و جمادات کہاں سے آویں۔ کیا ہوا پر دنیا بسے اور بیشمار ضروریات من وسلویٰ کی طرح آسمان سے اُتریں۔ غرضکہ اگر زمین نہو تو کچھ بھی نہو۔ دنیا اسی کے وجود سے وابستہ ہے۔ پس عاملین پیدائش میں اس پر کس کو سبقت حاصل ہو سکتی ہی۔ نہ صرف لابد اور ناگزیر ہے۔ بلکہ جتنی ضروریات زندگی ہیں شاید ہی کوئی ایسی ہو کہ اس کی

حصہ دوم
باب دوم

پیدائش میں زمین مدد نہ دیتی ہو۔ ہماری خوراک ۔ ہمارا لباس ۔ ہمارے مکانات اور موجودہ زمانہ کے لاتعداد تعیشات ۔ اگر ان کی اصلیت پر غور کرو اور ان کی ابتدا کا سُراغ لگاؤ تو وہ یقیناً زمین پر ہی ختم ہو گا۔

محنت

(۲) زمین مواد ضرور مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن اس کو دولت بنانا انسان کا کام ہی۔ زمین کی پیداوار بغیر انسان کی محنت کے دولت نہیں بن سکتی۔ جیسا کہ مقدمہ میں واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ اگر سونے کے پہاڑ اور جواہرات کے انبار ہوں۔ لیکن انسان کے ہاتھ نہ آسکیں تو یقیناً مٹی اور کنکر سے بھی زیادہ نکمے ہیں۔ کوئی ان کو دولت نہیں شمار کر سکتا۔ ورنہ یہ بیشمار جگمگاتے ستارے جنہیں خدا جانے کیسے کیسے عجائبات بھرے پڑے ہیں سب ہی ہماری دولت ہیں اور شاید ہی کوئی چیز احاطۂ دولت سے خارج ہو سکے۔ لیکن اس بات سے کوئی بھی ایک لمحہ کے واسطے متفق نہیں ہو سکتا۔ دولت کے واسطے افادہ اور استبدال لازمی ہیں اور مقدمہ کی مفصل بحث سے ظاہر ہوگا کہ انکے واسطے انسانی دسترس لابدی ہے۔ جو چیز انسان کے کام نہ آسکے اس کے افادہ کے کیا معنی اور جو چیز انسان کی دسترس سے باہر ہو اس میں استبدال کیونکر ممکن ہے۔ وہی خودرو جنگل جنہیں وحشی قومیں نہایت قابل رحم افلاس کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ جب مہذب قوموں کے ہاتھ آجاتے ہیں تو محنت کے ذریعہ سے اتنی پیداوار اگلتے ہیں کہ دنیا مالا مال ہو جاتی ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہی کہ بحیثیت دولت وہ جنگل دونوں حالت میں یکساں ہی۔ اگر فرق ہی اور یقیناً زمین آسمان کا فرق ہے۔ تو اس کا باعث کیا۔ یہی محنت۔ ورنہ وہی جنگل۔ اسی کی پیداوار۔ نہ جنگل بدلا۔ نہ پیداوار آسمان سے برسی۔ البتہ جب سے

حصہ دوم باب دوم

محنت کا دخل ہوا۔ اس جنگل کو کچھ ایسا پارس پتھر چھوا کہ سونا ہی سونا ہو گیا۔ پس صاف ظاہر ہی کہ دولت کی پیدائش کے واسطے زمین اور محنت دونوں لابد ہیں۔ اور یہ طے کرنا کہ ان میں سے کون زیادہ ضروری ہے اور کون کم۔ بعینہٖ ایسا سوال ہی کہ اولاد کی پیدائش میں زیادہ حصہ کس کا ہوتا ہے۔ ماں کا یا باپ کا بھاپ زیادہ تر پانی سے پیدا ہوتی ہے یا آگ سے۔ قینچی کا اوپر والا پھلر کپڑا کترتا ہے یا نیچے والا۔ اور ان سوالات کا صحیح جواب صرف ایک ہے کہ دونوں یکساں لابد اور ناگزیر ہیں۔ اور بس

اصل

(۴) اک لطیفہ سُنئے کہ زمین اور محنت کے عقد سے ایک بچّہ پیدا ہوا۔ جو ایسا بلند اقبال نکلا کہ آج چار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ امیر۔ غریب سب اسکے دست نگر ہیں۔ جدھر گذرتا ہے خلقت نہال ہو جاتی ہی۔ پیدائش کے میدان میں وہ کمال دکھا رہا ہے کہ والدین بھی اس کے توسل کے طالب نظر آتے ہیں۔ اسکی دستگیری سے ان میں بیحد چُستی وطاقت آتی ہی۔ اسکے تقرب سے انکی بہت کچھ قدر و پرستش کیجاتی ہی۔ اگر ساتھ چھوٹ جاوے تو کس مپرسی میں والدین کو ہاتھ پیر ہلانا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ محض اشتیاق بڑھانے کی غرض سے تعارف میں نام ظاہر نہیں کیا۔ صاحب موصوف در اصل حضرت اصل ہیں۔ دُور اندیش مغربی قوموں نے بیحد خاطر و مدارات کرکے ان کو اپنی طرف اس قدر مائل کر لیا ہے کہ اب وہ زیادہ تر انھی کے پاس مقیم رہتے ہیں اور اپنے کمالات سے ان کو فیض پہنچا پہنچا کر دُنیا کی باقی اقوام سے بدرجہا معزز اور ممتاز بنا رہے ہیں۔ صاحب موصوف کی ولادت۔ اور پرورش کا تھوڑا سا حال بیان کرکے ہم انکی کارگذاریوں کی ضروری تشریح کرینگے۔

حصہ دوم
باب دوم
اصل کی
سرگذشت

(۴) کسی زمانہ میں انسان خود رو درختوں کے پھلوں سے اپنا پیٹ پالتا اور پتّوں سے اپنا جسم ڈھانکتا ہوگا۔ زمین اور محنت کی ملاقات کا یہ سب سے پہلا موقع ہوگا۔ اول اول وہ صرف ہاتھ سے کام لیتا ہوگا۔ بلند درختوں کے پھل اور پتّے توڑنے میں دقت پیش آتی ہوگی۔ بالآخر فرصت کے وقت فراغت سے بیٹھکر تدبیر سوچتے سوچتے اس نے کسی سیدھی لانبی اور ہلکی لکڑی کے سرے پر چھوٹی سی بالشت بھر لکڑی گھاس سے ترچھی باندھکر ڈنکی بنالی ہوگی کہ جس درخت سے چاہے پھل گرالے۔ یہی ڈنکی غالباً اصل کی ابتدا ہوگی۔ جب پھل توڑنے میں آسانی ہوگئی۔ تو اسکے پاس فرصت کا وقت زیادہ نکل آیا۔ اور اس نے جال۔ تیر کمان۔ اور سخت پتھروں کے دھاردار آلے بناکر چھوٹے موٹے چرندوں پرندوں کا شکار شروع کر دیا۔ ان ایجادات کا بھی اصل میں اضافہ ہوا۔ اب روز غذا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہوگی۔ ایکدن شکار اور پھل جمع کرکے کئی دن کام چلاتا ہوگا۔ فرصت کے دنوں میں لاکھ تدبیریں کرکے اس نے رفتہ رفتہ چند تربیت پذیر وحشی جانوروں۔ مثلاً گائے بھینس۔ گھوڑی۔ بکری کو پکڑ پکڑکر پالتو بنایا ہوگا۔ انکا دودھ پیتا اور گوشت کھاتا ہوگا۔ ان پر سوار ہوکر جنگل جنگل گھومتا ہوگا اور انکی کھال کا لباس بناتا ہوگا۔ بالآخر خانہ بدوشی سے تنگ آکر کوئی اچھا سا سرسبز اور زرخیز قطعہ پاکر وہیں رہ پڑا ہوگا۔ ہل بنا، گھوڑے۔ بیل کی مدد سے زمین جوت کھیتی شروع کر دی۔ رہنے سہنے۔ پیداوار رکھنے اور بیل ڈھور باندھنے کے لئے کچھ کچے جھوپڑے بنالئے۔ گویا کسان نے گاؤں بسانا شروع کیا۔ پالتو جانور اور آلات کاشتکاری بھی اصل میں داخل ہوئے۔ کھانا۔ لباس۔ مکان۔ بیل۔ ڈھور۔

حصہ دوم
باب دوم

کھیتی کا سامان۔ اب ضروریات اس قدر بڑھ گئیں کہ ان کا مہیا کرنا ایک آدمی کے قابو سے باہر ہوگیا۔ لہذا تقسیم عمل کے زریں اصول پر کاربند ہونا پڑا۔ کسان گھیارے۔ جولاہے بڑھئی۔ لوہار۔ حجام اور موچی غرضکہ چند فرقے پیدا ہوگئے اور معاشی ترقی آجکل پس ماندہ گاؤں کی حالت تک آپہنچی۔ ہر پیشہ کے آلات اور اوزار۔ اصل میں اضافہ ہوئے۔ کسان کا اصل ہل۔ بیل۔ لوہار کا ہتوڑا اور دھونکنی۔ بڑھئی کا آرہ۔ بسولہ۔ جولاہے کا چرخہ اور کرگہ۔ گھیارے کا جالی کھرپا۔ اور حجام کا اُسترہ قینچی اور موچی کی رانپی سوتاری۔ وہی اصل جو اول بشکل ڈنگی نمودار ہوا ہوگا اب کتنی مختلف شکلیں اختیار کرتا جاتا ہے۔ لیکن کام سب کا ایک ہی۔ دولت کی پیدائش میں ہاتھ بٹانا۔ اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ زمین اور محنت ہی نے ملکر اور فرصت کا وقت نکال کر اسکو پیدا کیا۔ اب خدا کی رحمت دیکھئے کہ اصل کی نسل مچھلی سے زیادہ بڑھی۔ اور سرکنڈے بیل سے زیادہ پھیلی۔ آج نہ اسکی قسموں کا شمار۔ نہ اس کے تصرف سے کوئی پیشہ آزاد۔ درزی کی سوئی۔ اور حجام کے اُسترے سے یورپ کے بے انتہا قیمتی انجنوں۔ مشینوں اور آلات تک اصل ہی کا خاندان پھیلا ہوا ہے۔ مثل آدمیوں کے اتنا فرق ضرور ہے کہ انمیں سے کوئی قوی ہے کوئی ضعیف۔ کوئی معزز۔ کوئی حقیر۔ لیکن ہیں سب ایک ہی نسل سے اور ہر ایک اصل کے لقب کا پورا پورا مستحق ہے۔ یہ تو اصل کی خاندانی سرگزشت تھی۔ اب اسکی کارگذاریوں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

اصل کی کارگزاری

(۵) اگر مغرب و مشرق کی معاشی حالت کا موازنہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک جوان رعنا ہے تو دوسرا پیر فرتوت۔ ایک دریائے مواج ہے تو دوسرا چشمۂ تنک آب۔ ایک مالا مال ہے تو دوسرا خستہ حال۔ آخر اس قدر فرق

حصہ دوم
باب دوم

کیوجہ؟ ایشیا کی زمین بحیثیت مجموعی یورپ کی زمین سے زیادہ زرخیز۔ یہاں کی آب و ہوا پیداوار زرعی کیواسطے زیادہ موزوں۔ یہاں کے باشندے کم خرچ اور بیشتر محنتی اور جفاکش۔ اور اس پر نتیجہ یہ کہ ایشیا یورپ کا محتاج۔ دستنگر۔ خوشہ چین۔ اس معمے کا راز صرف یہی اصل ہی۔ ایشیا کے پاس دو عامل زمین اور محنت بدرجہ اولی موجود مگر ایک اصل کے نہونے سے بے بس اور لاچار۔ یورپ کی معاملہ فہم دُور اندیش اور باریک بین قوموں نے اصل کی قوت کا صحیح اندازہ کرکے اپنی تمامتر توجہ اس کے غور و پرداخت اور ترقی پر صرف کرکے آج وہ اقتدار پایا ہے کہ گھر بیٹھے دنیا کی دولت پر حکومت کرتے ہیں۔ اور خلقت پر احسان دھرتے ہیں۔ لکڑی۔ لوہا۔ کوئلہ۔ پانی۔ زمین۔ سواری اور کارکنوں کی بڑی جماعت سب ہندوستانی لیکن ریل کے منافع کا مالک انگلستان۔ اور اس پر بھی ہم شاد و فرحاں۔ مشکور و ممنون۔ ریل کی تعریف میں رطب اللسان۔ اور کچھ بیجا بھی نہیں۔ کیونکہ یہاں کا اصل تو معلوم۔ اگر انگریزی اصل سے بھی ریلیں نہ بنتیں تو جو کچھ تھوڑا بہت آرام اور فائدہ پہنچ رہا ہے۔ جسکی ہم مناسب موقع پر تشریح کرینگے۔ ہندوستان اس سے بھی محروم رہتا۔ معاشی جد و جہد میں ایک عام اصول سا قرار پا گیا ہی کہ پیداوار خام ایشیا کی اور مصنوعات یورپ کے۔ حاصل کلام یہ ہی کہ اگر ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی پس ماندگی کی اصلی وجہ دریافت کروگے تو وہ نہ زمین کی کمی ہوگی۔ نہ محنت کی قلت۔ بلکہ کارآمد اور کافی اصل کی احتیاج ہوگی جس نے کمر ہمت توڑدی۔ اور دل کو بیشمار اُمنگوں کا مدفن بنا رکھا ہی ؎ آنکہ شیراں را کند روبہ مزاج ٭ احتیاج است احتیاج است احتیاج اور پھر احتیاج بھی کسکی۔ اصل جیسی لازمی چیز کی۔ معاذ اللہ۔ کیسی نامور قومیں آج اسی احتیاج کی بدولت مفلس۔ پس ماندہ۔ اور نیم مہذب۔ کے خطابات پا رہی ہیں۔

حصہ دوم
باب دوم

(۶) اصل کی احتیاج خود ہندوستان کہانتک اور کیونکر پوری کرسکتا ہی۔ اور اصل کی قلت کا وہ کس حدتک خود ذمہ دار ہی۔ یہ بحث ہم آیندہ مناسب موقع پر کرینگے۔

خلاصہ

یہاں حالات بیان کرنے سے یہ جتلانا مقصود تھا کہ عمل پیدایش دولت میں ہر سہ عاملین کا کیا کیا حصہ ہی۔ اور مقابلتہً ہرایک کا کیا رتبہ ہی۔ معلوم ہوا کہ پیدایش دولت کیواسطے زمین لابد۔ محنت شرط لازمی اور اصل سب سے زیادہ کارگر آلہ ہے۔ اور یہی تینوں مل جلکر دنیا میں دولت پیدا کر رہے ہیں۔ اب ہم انکے حالات سے جُداگانہ مفصل بحث کرینگے۔

حصہ دوم
باب دوم

فصل دوم

زمین

تجزیہ (۱) زمین کا مفہوم (۲) زمین کے خواص (۳) کاشت کے دو طریق اور اسکے جداگانہ فوائد (۴) زرخیزی کا مفہوم (۵) زرخیزی بڑھانے کے عام وسائل (۶) گورنمٹ ہند کا محکمہ زراعت (۷) قانون تقلیل حاصل (۸) معاشی ترقیات کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۹) شہروں کی افزونی کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۱۰) شہروں میں پارک کی ضرورت (۱۱) ٹرنیلم کا شہر کی آبادی اور زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۱۲) اضافہ قیمت زمین کے حقدار۔

زمین کا مفہوم

(۱) علم المعیشت میں لفظ زمین سے عموماً تو یہی زمین مُراد ہوتی ہے مگر اصطلاحاً اسمیں چند دیگر عاملین قدرت مثل پانی ہوا۔ گرمی۔ روشنی کے جو وجود خلقت اور پیدائش دولت کیواسطے لازمی ہیں شامل کرلئے جاتے ہیں۔ مثلاً دریا کھیتی باڑی کو شاداب کرتے ہیں۔ کشتیوں میں مال ڈھوتے ہیں۔ پن چکیاں چلاتے ہیں سمندر جہاز تیراتے ہیں۔ آبشار بجلی پیدا کرتے ہیں۔ ہوا بھی علاوہ شرط زندگی ہونے کے۔ بادبانی کشتی کھیتی ہے۔ پنکھا گھماکر مشینیں چلاتی ہے۔ ہندوستانی کسان کا غلہ برساتی ہے گرمی اور روشنی کی ضرورت بھی اظہر من الشمس ہے۔ پس ایسی چیزوں کو عاملین پیدائش میں شامل نہ کرنا کس طرح ممکن ہے۔ اور ہر ایک کو جداگانہ شمار کرنا بھی نامناسب طوالت معلوم ہوتی ہے۔ ان کو محنت تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ وہ انسان کے کام سے مخصوص ہے

اٹل بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ محنت اور زمین کے اتفاق عمل سے پیدا ہوا ہے۔ اور انسان کی مرضی کا مطیع ہوتا ہے۔ اور ان چیزوں کو پیدا کرنا تو درکنار قابو میں لانا بھی محال ہے۔ جب آندھی چلتی ہے۔ طوفان آتا ہے۔ گرمی پڑتی ہے۔ تو انسان کو فوراً اپنی بے بسی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور سوائے دعا کے اس سے کچھ نہیں بن پڑتا۔ البتہ لفظ زمین میں ان کو اصطلاحاً شامل کرنا کچھ مضائقہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اول تو یہ سب زمین سے قریب تر متعلق ہیں اور طریق عمل میں بھی زمین سے بہت کچھ مشابہ ہیں ان سب کے اعمال براہ راست قدرت کے اٹل قوانین کے تابع ہیں اور محنت و اٹل کی مانند ان پر انسان کو تصرف حاصل نہیں۔ بعض مصنفین نے زمین کی بجائے لفظ قدرت ان معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور بلحاظ جامعیت یہ اصطلاح زمین سے بہتر ہے۔ مگر چونکہ ان تمام عاملین قدرت میں سب سے زیادہ کثیر اور اہم کام زمین کا ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے زمین عاملین پیدائش میں جداگانہ شمار کیجاتی ہے۔ ایک نیا لفظ داخل کرنے کے بجائے۔ زمین ہی میں ان چیزوں کو شمار کرکے۔ اصطلاحی معنے مع وجوہات واضح کر دینا زیادہ قرین اصول معلوم ہوتا ہے۔ اور اب زمین کے مذکورہ بالا اصطلاحی معنے علم المعیشت میں بالعموم تسلیم کئے جاچکے ہیں۔

زمین کے خواص

(۲) ۲۔ ہم عاملین پیدائش کے بیان میں بتا چکے ہیں کہ زمین وجود خلقت اور پیدائش دولت کیواسطے لابدی ہے۔ اب یہاں چند دیگر خواص اور ان کے معاشی اثرات واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(ب) زمین کی دوسری قابل توجہ خصوصیت تعین مقدار ہے۔ خدا نے جتنا کرۂ ارض بنانا چاہا بنا دیا۔ کچھ سمندروں سے ڈھک دیا۔ کچھ پہاڑوں سے گھیر دیا کچھ ناقابل آبادی برفستان اور ریگستان بنا دیا۔ اور باقی ہموار میدانوں میں دریا بہا کے

بار آور درخت اُگائے اور موسم خوشگوار بنائے تاکہ انسان وہاں بود و باش اختیار کرسکے۔ یہ تو ممکن ہی کہ کوئی سمندر ساحل سے ہٹ کر زمین چھوڑدے۔ جنگل میں اور پہاڑوں پر آدمی جابسیں۔ امریکہ کی طرح اب بھی کسی نامعلوم براعظم کا پتہ لگجائے لیکن یہ سب کچھ اسی ایک زمین کے اجزا کا تغیر و تبدل ہوگا۔ خود زمین کی وسعت مین ایک انچ اضافہ ممکن نہیں۔ عام قاعدہ ہی کہ جس چیز کی مانگ بڑھتی ہے۔ اسکی پیداوار بھی بڑھائی جاتی ہی۔ جب سے رُوئی ولایت جانے لگی۔ ہندوستان میں اسکی کاشت بہت وسیع ہوگئی اور مصر میں بھی یہی حال ہے۔ جب سے افیون چین جانی شروع ہوئی۔ اسکی کاشت بھی بہت رواج پاگئی۔ یہی حال مصنوعات کا ہی گھڑیاں۔ بائیسکل۔ اسٹیل ٹرنک۔ گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ مگر زمین کا معاملہ بالکل برعکس ہی۔ اسکی ضرورت اول تو لابد۔ دوسرے بوجہ ترقی آبادی۔ روزافزوں اور اس پر لطف یہ کہ مقدار معین۔ اس کا اضافہ ناممکن۔ نتیجہ ظاہر کہ زمین روز بروز نایاب اور بیش قیمت ہوتی جاتی ہی۔

(ج) زمین کی تیسری خصوصیت یہ ہی کہ وہ غیر منقولہ ہی۔ عام قاعدہ ہے کہ جہاں مانگ زیادہ ہوتی ہے اور قیمت اچھی اُٹھتی ہی۔ وہیں چیز لیجاکر فروخت کرتے ہیں۔ چنانچہ تمام تجارت داخلہ اور خارجہ اسی اصول کی تشریح ہی۔ اگر اصول یہ نہوتا تو جو چیز جہاں پیدا ہوتی ہے وہیں بکتی۔ حلقہ تجارت ہر ایک بستی تک محدود ہوتا حالانکہ آجکل گوشت۔ پھل اور ترکاریاں جیسی جلد خراب ہوجانے والی چیزیں بھی ہزار۔ ہا میل جاکر فروخت ہوتی ہیں۔ انگلستان کو گوشت اور مچھلی زیادہ تر آسٹریلیا مہیا کرتا ہی۔ صدہا من پھل اور میوے مثل آم و سیب ہندوستان سے جاتے ہیں اور دیرپا چیزوں مثل غلہ اور معدنیات کی دوررسی کا تو ذکر کیا ہی۔ لیکن زمین اٹل ہے۔

حصہ دوم باب دوم

گاؤں والے زیادہ قیمت کی ہوس میں غلہ اور ترکاریاں تو شہر لاکر بیچتے ہیں۔ اگر ممکن ہوتا تو صدہا بیگہ ناکارہ بنجر زمین اُٹھا کر شہر نہ لے آتے اور بیشمار دولت رولتے۔ گاؤں میں زمین کی کمی نہیں۔ اور گنجان شہروں میں بیحد نایاب ہوتی ہے۔ لیکن جو قطعہ زمین جہاں ہی ہے۔ اپنی جگہہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ ہی کہ ابتک قصبات میں عموماً زمین روپیہ گز ملتی ہی اور ہندوستان ہی کے بعض شہروںمیں چارسو روپیہ گز تک فروخت ہو چکی ہے۔ ایک دو آنہ روپیہ کے نفع پر ہندوستان کا غلہ اور روئی ولایت پہنچتی ہے۔ لیکن صدہا روپیہ گز کے منافع پر قرب وجوار سے زمین نہیں لائی جاسکتی۔ تیسری خصوصیت غیر منقولیت بھی زمین کی قدر و قیمت بڑھاتی ہی۔

(د) چوتھی خصوصیت تعین پیداوار ہے۔ سکونت سے زیادہ پیدائش ضروریات ناگزیر مثل خوراک ولباس کیواسطے زمین درکار ہی۔ غلہ۔ پھل اور ترکاریاں جو انسان و حیوان کی غذا ہیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایندھن اور عمارت کی لکڑی اس سے اُگتی ہی۔ لباس کے اکثر اشیا زمین سے ملتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ زمین کی قوت پیدائش محدود رکھی گئی ہی۔ ایک قطعہ زمین مقدار معین سے زیادہ غلہ یا ترکاری پیدا نہیں کرسکتا ہر ایک کسان اسکی تصدیق کریگا۔ قانون تقلیل حاصل کے تحت میں اس خصوصیت کی مزید تشریح کرینگے۔ لیکن اسکا اثر زمین کی قدر و قیمت پر جو پڑتا ہے ظاہر ہی۔

(ر) پابندی وقت۔ زمین کے عمل پیدائش پر وقت کی پابندی بھی لازم کیگئی ہی۔ کہ ہر چیز اپنے ہی فصل وموسم میں پیدا ہوسکے۔ مثلاً جوار۔ باجرا۔ اور مکا فصل خریف میں۔ گیہوں۔ جو اور چنا فصل ربیع میں۔ اس کے خلاف ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں ہر چیز کی پیدایش کے واسطے جتنا وقت درکار ہی وہ بھی معین ہی۔ اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں فصل خریف دو مہینے میں تیار ہوتی ہی۔ ربیع چھ مہینے میں۔ نیشکر۔ تمباکو

حصہ دوم
باب دوم

آلو اور کپاس نو نو مہینے میں۔ انسان وقت بیوقت محنت کرکے اور اصل سے شب و روز کام لیکر پیداوار بڑھا سکتا ہے۔ مگر زمین پر اسکا کچھ بس نہیں چلتا۔ وہ تو قدرت کے پروگرام کی پابند ہے۔ اگر سائنس کے جدید انکشافات سے پیدائش زمین کے اوقات میں کچھ ردوبدل ہوتا بھی ہے تو اتنا قلیل کہ قابل لحاظ نہیں ہوسکتا۔

(س) علاوہ مذکورہ بالا ایک سے ایک سخت پابندیوں کے۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں خود عمل پیدائش میں انسان کا حصہ نقل مقام و تبدیل ترکیب پر ختم ہوجاتا ہے۔ کھیت جوتنا کسان کا کام ہے۔ لیکن کھیت پر دان چڑھانا عاملین قدرت کے ہاتھ ہے۔ کسان لاچار محض ہے۔ پس بلحاظ عمل پیدائش بھی زمین انسان کے تصرف سے بہت کچھ آزاد ہے۔ حالانکہ اسکی پیداوار سب سے زیادہ ضروری ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ زمین پر قدرت نے عجیب و غریب پابندیاں عائد کرکے انسان کے اختیار اور قابو سے اسکو بالکل باہر کردیا ہے۔ اول تو اس کو لابد قرار دیا۔ پھر اسکی ضرورت روز افزوں بناکر اسکی مقدار محدود کردی۔ اسکو غیر منقولہ بنایا۔ اسکی قوت پیدایش کو محدود کیا۔ اس پر پابندی وقت کی سخت قید لگائی اور عمل پیدایش کا بیشتر حصہ عاملین قدرت کی تصرف میں دیکر انسان کو بے بس اور لاچار کردیا۔ ان خصوصیات کی اصلی مصلحت تو خدا جانے۔ لیکن ایک بین نتیجہ جو ان سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ زمین کی قدر و قیمت دن دونی رات چوگنی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور علم المعیشت میں ایک اہم ترین حل طلب مسئلہ یہ پیش ہو رہا ہے کہ اس اضافہ قیمت کا حقدار کون ہے مالک زمین یا گورنمنٹ۔ اور اگر دونوں تو کس اصول کے مطابق کس نسبت سے یہ اضافہ انمیں تقسیم ہونا چاہیئے۔ اضافہ قیمت زمین کا مسئلہ بہت غور طلب ہے اور اس سے جزواً جزواً حسب موقع بحث کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حصہ دوم
باب دوم
کاشت کے
دو طریقے
اور انکے
جُداگانہ
فوائد

(۳) یوں تو زمین سکونت اور کان کنی کے کام بھی آتی ہے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا حصہ زراعت میں مصروف نظر آتا ہے۔ کاشت کی دو قسمیں ہیں۔ کاشت عمیق و کاشت وسیع۔ ایک قطعہ زمین خوب جوتے۔ بہت سا کھاد ڈالے۔ جتنا تخم بویا جا سکے بوئے۔ اچھی طرح پر پانی دے اور کافی محنت وصل اپہر صرف کرکے بیشترین مقدار پیداوار حاصل کرے۔ اسکو کاشت عمیق کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کھیت کو کچھ یونہی جوت کر اور تھوڑا سا کھاد ڈال کر کمترین مصارف سے کچھ پیداوار حاصل کرے تو اس کو کاشت وسیع کہتے ہیں۔ کاشت عمیق میں نسبت مصارف تو زیادہ موافق نہیں ہوتی مگر مقدار پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور کاشت وسیع میں اسکے برعکس مقدار پیداوار کم ہوتی ہے مگر نسبت مصارف بہت موافق ہوتی ہے۔ مثلاً اگر دس بیگہ زمین سے بصرف تین روپیہ من پچاس من غلہ پیدا ہو اور پندرہ بیگہ زمین سے بصرف دو روپیہ من کل تیس من پیدا ہو تو پہلی کاشت عمیق اور دوسری وسیع کہلائے گی

یہاں یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جب پیداوار زمین کی زیادہ مانگ ہو اور قیمت اچھی اُٹھتی ہو تو کاشت عمیق سے زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے اور بصورت دیگر کاشت وسیع زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر مذکورۂ بالا کھیتوں کی پیداوار پانچ روپیہ من کے نرخ سے فروخت ہو تو پہلے کھیت سے بحساب دو روپیہ من کل سو روپیہ منافع ہوگا اور دوسرے کھیت سے بحساب تین روپیہ من صرف نوّے روپیہ لیکن اگر قیمت گھٹ کر صرف چار روپیہ من رہجاوے تو منافع حسب ترتیب پچاس روپیہ اور ساٹھ روپیہ ہوگا۔ اور قیمت بہت ہی گرجاوے مثلاً دو روپیہ من تو حسب ترتیب پچیس روپیہ گھاٹا اور پندرہ روپیہ منافع ہوگا۔ غرضکہ زیادتی قیمت کاشت عمیق کی معاون ہے اور کمی قیمت کاشت وسیع کی ان دونوں نتائج کو جُداگانہ حسب ترتیب قیمت کے

حصہ دوم
باب دوم

اثر موافق و مخالف سے تعبیر کرینگے اور دونوں کا مشترکہ نام صرف اثر قیمت ہوگا۔ چنانچہ ناخواندہ کسان بھی تجربہ کی مدد سے اسی اصول پر کاربند ہوتا ہی۔ شہر و قصبات کے گرد و نواح میں عموماً کاشت عمیق ہوتی ہی اور دُور افتادہ گاؤں میں کاشت وسیع طریق عمل اس اثر کا یہ ہی کہ اگر ہر دو قسم کی کاشت کے اوسط مصارف میں فرق کم ہوگا مثلاً تین روپیہ اور دو روپیہ من اور اوسط پیداوار میں فرق زیادہ ہوگا مثلاً پانچ من اور دو من بیگہ تو اثر موافق بہت قوی ظاہر ہوگا۔ اسکے برعکس اگر اوسط مصارف میں فرق زیادہ ہو مثلاً ۸ روپیہ اور دو روپیہ من اور اوسط پیداوار میں کم مثلاً پانچ من اور تین من بیگہ تو اثر موافق ضعیف ہوگا یا اثر مخالف حسب حالت ضعیف یا قوی نمودار ہوگا۔ کسی مقام میں دونوں قسم کی کاشت کے اعداد مصارف و پیداوار دریافت ہونے پر یہ بتایا جاسکتا ہی کہ کونسی کاشت کس حد تک مفید تر ہوگی۔

علاوہ اثر قیمت کے طریق کاشت ایک اور قوی اثر کے بھی تابع ہی۔ ہر ایک کسان کو پیداوار کا کچھ حصہ زمیندار یا سرکار کو دینا پڑتا ہے۔ لگان کی تین شکلیں ہوسکتی ہیں۔ خواہ وہ بشرح منافع ہو۔ یا پیداوار کلی یا وسعت زمین مثلاً پچاس فیصدی منافع۔ یا ۲۰ فیصدی پیداوار یا دو روپیہ بیگہ۔ مذکورۂ بالا دو کھیتوں کی مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ شرح منافع کا کوئی اثر۔ اثر قیمت کے عملدرآمد پر نہیں پڑیگا۔ بشرح ۵۰ فیصدی مثال بالا میں بعد ادائیگی لگان منافع ۵۰ اور ۲۵ روپیہ حسب ترتیب رہ جاویگا۔ گویا حسب سابق کاشت عمیق ہی زیادہ نافع ہوگی اور اسی طرح پر بحالت کمی قیمت۔ بعد ادائیگی لگان بھی کاشت وسیع مفید رہے گی لیکن لگان بشرح پیداوار کے اثر کا عمل درآمد ذرا پیچیدہ ہی۔ یہ اثر قیمت کے اثر موافق کے مخالف اور قیمت کے اثر مخالف کے موافق کام کرتا ہے۔ گویا کاشت عمیق کا

منافی اور کاشت وسیع کا معاون ہے۔ اگر لگان بشرح پیداوار کا اثر قیمت کے اثر مخالف سے ملا دیا جاوے تو دونوں یکساں اثر ملکر بہت قوی ہوجاتے ہیں۔ لیکن اگر قیمت کے اثر موافق سے مقابلہ آپڑے تو جو اثر قوی تر اور غالب ہوگا۔ کاشت کا طریقہ اسکے مطابق ہوگا۔ لگان بشرح وسعت کا اثر بھی بعینہ لگان بشرح پیداوار کا سا ہے پس معلوم ہوا کہ کاشت کے دو طریق ہیں۔ اور قیمت پیداوار و لگان کے مختلف اثرات کے تابع ہیں قانون تقلیل حاصل و لگان کی بحث میں واضح ہوگا کہ منافع زراعت کو حاصل زاید کہتے ہیں

زرخیزی کا مفہوم

۴۔ زرخیزی زمین کی کوئی مقررہ صفت نہیں۔ بلکہ اس سے زمین کی کئی حالتیں مراد ہوسکتی ہیں۔ اول تو زرخیزی طریق کاشت سے متعلق ہے۔ کاشت عمیق میں وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے جو بلا لحاظ نسبت مصارف بڑی مقدار پیدا کرے مثلاً کسی کھیت میں ۴ یا ۵ من بیگہ غلہ پیدا ہو۔ صرف مصارف پیدائش خواہ زیادہ مثلاً ۴ یا ۵ روپیہ من تک ہوں اسکے برعکس کاشت وسیع میں زرخیز زمین سے مُراد یہ ہے کہ بلا لحاظ مقدار پیداوار۔ مصارف کا اوسط کمتر ہو۔ مثلاً کسی کھیت میں صرف دو یا تین روپیہ من کے صرفہ سے غلہ پیدا ہو۔ اوسط پیداوار خواہ ایک یا دو من فی بیگہ ہو۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ بعض زمینیں تو ان میں سے صرف کسی ایک طریق کاشت میں زرخیز ثابت ہوتی ہے اور بعض دونوں حالتوں میں زمین کی زرخیزی فصل سے بھی متعلق ہوتی ہے۔ بعض زمینیں نیشکر کی کاشت کیواسطے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں اور بعض تمباکو۔ کپاس۔ سَن یا ایسی ہی کسی خاص چیز کیواسطے اگر فصل موزوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز کاشت کیجاوے گی تو نتیجہ حسب دلخواہ نہوگا۔ گویا ایک ہی قطعہ زمین بعض فصل کے لحاظ سے زرخیز ہے اور بعض کے لحاظ سے نہیں پنجاب میں گیہوں عمدہ پیدا ہوتا ہے۔ برار کی روئی نرم اور لانبے ریشہ کی ہوتی ہے۔

حصہ دوم
باب دوم

مشرقی بنگال کا سن جو جوٹ کہلاتا ہی۔ تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اسی طرح پر پھل مثلاً آم انار سیب۔ ناشپاتی وغیرہ کے واسطے بھی خاص خاص مقام مشہور ہیں۔ کبھی بلالحاظ مقدار پیداوار یا اوسط مصارف۔ یا موزونی فصل محض پیداوار کی قیمت بہت بڑھ جانے سے زمین زرخیز شمار ہونے لگتی ہی۔ پس معلوم ہوا کہ زرخیزی صفت اضافی ہی۔ اور وہ کبھی طریق کاشت کبھی نوعیت فصل اور کبھی اضافہ قیمت سے متعلق ہوتی ہی۔

زرخیزی بڑھانیکے عام وسائل

۵- زرخیزی کی نوعیت سمجھانے کے بعد اب ہم مختصراً وہ وسائل بتانا چاہتے ہیں جو زرخیزی پیدا کرنے اور بڑھانے کیواسطے عموماً اختیار کئے جاتے ہیں اور تجربہ سے مفید ثابت ہوئے ہیں۔

عمدہ زمین کی ایک خاص صفت یہ ہی کہ وہ نہ اتنی سخت ہو کہ نازک پودے جڑ نہ پکڑ سکیں۔ اور پانی جذب ہونے کے بجائے سطح پر بہتا ہوا گزرجائے۔ اور نہ اتنی نرم اور بیدم ہو کہ جڑ مضبوط نہ جمے۔ پودے گر گر پڑیں۔ اور نہ پانی رُکے سب رس رس کے نکل جاوے۔ بلکہ وہ اتنی تو نرم ہو کہ نازک جڑیں اسمیں جگہ کرسکیں مگر اتنی سخت بھی ہو کہ جڑوں کی گرفت اس قدر مضبوط ہو کہ وہ پودے سنبھال سکیں۔ پانی جو زمین سے پودے کو غذا پہنچاتا ہے۔ کھیت میں بآسانی پھیل سکے لیکن پودے کی غذا بہا کر باہر نہ لیجاسکے۔ ورنہ یا تو پودے نہیں جمینگے یا بعد خشک ہو کر رہجاوینگے۔ کھیت جوتنے کا اصلی مقصد یہی صفت پیدا کرنا ہوتا ہے کہ سخت سطح اور ڈھیلے ٹوٹ کر حسب ضرورت نرم ہوجاویں۔ ریتیلی زمینیں بھی نئی مٹی ہل سے ملا کر سخت کیجاسکتی ہیں۔

زمین کی دوسری ضروری صفت یہ ہی کہ اسمیں وہ تمام اجزا جو پودے کی غذا ہیں پوری مقدار میں موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسے اجزا کی مقدار کم ہوگی یا ایک

جزو بھی غائب ہوگا تو پودوں کی نشو و نما پر مضر اثر پڑے گا اور پیداوار علاوہ مقدار میں کم ہونے کے ادنی قسم کی ہوگی۔ کھاد کے ذریعہ سے زمین میں پودوں کی غذا بڑھائی جاتی ہی۔ ہندوستان میں تو نادان کسان تھوڑے بہت تجربہ کے بھروسہ پر جیسا کھاد میسر آتا ہی کوڑی سے اُٹھا کر کھیت میں ڈالدیتا ہی۔ مگر یورپ والوں نے اسمیں بھی بہت تحقیق سے کام لیا ہی۔ اول ہر قسم کے پودونکی غذا کے اجزا دریافت کیے مثلاً آلو کے پودے کی نشو و نما کن کن چیزوں سے ہوتی ہی اور نسبتاً وہ کن کن مقداریں درکار ہیں۔ غرضکہ بہت سے مروجہ پودونکی خوراک کے اجزا اور انکی ترکیب سائنس اور مشاہدات کی مدد سے دریافت کرلیگئی ہی۔ اور کیمیائی طریق سے یہ بھی معلوم ہوسکتا ہی کہ زمین میں کیا کیا اجزا کس مقداریں موجود ہیں۔ چنانچہ جرمنی وغیرہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں کسان اپنے کھیت کی تھوڑی سی مٹی کسی کھاد کے کارخانے میں بھیجدیتا ہے اور جو چیز بونی مقصود ہوتی ہی اس سے اطلاع دیتا ہی۔ کارخانے میں زمین کی موجودہ اجزا اور پودے کی غذا کو پیش نظر رکھکر کوئی مناسب کھاد اسی طرح پر تجویز کیا جاتا ہے جیسے کہ ہمارے ہاں مریض یا کمزور کیواسطے ڈاکٹر دوا یا غذا تجویز کرتے ہیں۔ کارخانہ میں ہر قسم کا کھاد بھی تیار ہوتا ہی اور فرمایش آنے پر باحتیاط بکسوں میں بند کرکے روانہ کردیا جاتا ہی۔ چنانچہ دواسازی کے ساتھ کھادسازی بھی یورپ میں ایک فن ہوگیا ہی۔ اور اسکے باقاعدہ کارخانے قائم ہیں۔ کبھی کبھی دو مختلف الخواص مٹیوں کے ملانے سے بھی کھاد کا نتیجہ حاصل ہوتا ہی۔ مثلاً اگر دو زمینوں میں سے ہر ایک میں انھی اجزا کی بہت کثرت ہو جنکی دوسری میں قلت ہی۔ تو انکی مٹی ملانے سے زمین زرخیز بنجاویگی۔ چنانچہ چونا۔ کھریا۔ چکنی مٹی۔ کوئلہ کا چورا زمین میں ملانے سے اکثر زرخیزی پیدا ہوجاتی ہی۔ خیال کیا جاتا ہی کہ آیندہ مختلف الخواص مٹی ملانیکا

حصہ دوم
باب دوم

طریقہ کھاد سے بھی زیادہ مروج ہوگا۔

معلوم ہوا کہ انسان زمین کی زرخیزی بڑھا کر اور نیز نگہداشت کرکے نباتات کو بیش بہا مدد پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اسکے مدارج مختلف ہیں۔ نازک بیل۔ پودے۔ بحالت کس مپرسی اپنا وجود بھی بمشکل قایم رکھ سکتے ہیں۔ مگر انسانی امداد سے حیرت انگیز ترقی کر دکھاتے ہیں۔ چنانچہ نباتی باغات اور نمایش گاہوں میں اتنے خوشرنگ لذیذ اور بڑے بڑے پھل پھول اور ترکاریاں دیکھنے میں آتی ہیں کہ انکی شناخت میں دھوکا ہوتا ہے۔ غلے۔ ایکھ۔ کپاس اور دیگر مزروعہ چیزوں کے پودے بھی انسان کی مدد کے خواستگار ہیں۔ یہ چیزیں خودرو بھی پائی گئی ہیں مگر اس قدر ادنی قسم کی کہ انکو اپنے مزروعہ ہمجنسوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ مستقل چراگاہیں بھی بقدر نگہداشت انسانی توجہ کی مستحق ہیں۔ مگر جنگلات کی درخت انسانی امداد سے بالکل مستغنی ہیں۔ وہاں بقائے اصلح کا قانون جاری ہے اور ہر ایک درخت و پودا اپنا خود نگہباں ہے۔ اور اگر انسان چاہے بھی تو بھلا جنگل کے اُن بلند اور گنجان درختوں کی نشو و نما میں کیا قابل لحاظ اضافہ کر سکتا ہے کہ جنکی زوردار جڑیں پتھر چیر کر پانی کے سوت سے ملاوت اور ار دگرد کی صدہا گز وسیع زمین سے خوراک وصول کرتی ہیں۔

گورنمنٹ ہند کا محکمہ زراعت

۱۴۔ ہندوستان خاص طور پر زرعی ملک ہے۔ تقریباً ۷۰ فیصدی کی معاش براہ راست یا بالواسطہ زراعت پر منحصر ہے۔ اور ملک کی سب سے بڑی آمدنی کا ذریعہ بھی زراعت ہی ہے۔ چند سال سے زراعت کی اہمیت پر نظر کرکے گورنمنٹ نے اسکی ترقی کیواسطے خاص اہتمام شروع کیا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ نے صوبہ بنگال میں بمقام پوسا ایک نہایت مکمل اور مہتمم بالشان زرعی کالج قائم کرنا تجویز کیا۔ تاکہ نہایت اعلی پیمانہ پر علم نباتات کی باقاعدہ تعلیم دیجاوے اور سائنس کی جدید تحقیقات کی مدد سے ہندوستانکی

زراعت میں نئی روح پھونکی جاوے۔ چنانچہ تقریباً بائیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے یہ
کالج تیار ہوچکا ہے۔ اسکی کارگذاری دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ کیجانب
سے زرعی ترقیات پر بیس لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کرنا منظور ہوا۔ ماہرین زراعت و نباتات
کا ایک زرعی بورڈ بنا کہ وہ محکمہ زراعت کے کاروبار کا اہتمام اور نگرانی کرے۔ اور
مفید تجاویز وقتاً فوقتاً گورنمنٹ ہند میں پیش کر کے تکمیل کی اجازت حاصل کرتا ہے
مرکزی کالج پوسا کے علاوہ ہر صوبہ میں جداگانہ زرعی کالج قائم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ
ہمارے صوبہ کا کالج کانپور میں جاری ہے۔ کالجوں کے علاوہ ہر صوبہ کے متعدد ضلاع
میں سرکاری زرعی مرکز قائم کئے جارہے ہیں۔ سرکاری ملازمین کے اہتمام اور نگرانی
میں صدہا بیگہ زمین پر ہر قسم کی فصل بو بو کر تجربہ سے بہترین پیداوار کے اسباب دریافت
کئے جاتے ہیں۔ جب قابل اطمینان طور پر تحقیق ہوجاتے ہیں تو بذریعہ تحریر عام
لوگوں کی اطلاع کیواسطے مشتہر کئے جاتے ہیں۔ اور مزید براں سرکاری ملازم گاؤں
گاؤں منادی کرتے پھرتے ہیں اور کاشتکاروں کو ترغیب دیتے ہیں کہ انکی ہدایات
پر کاربند ہوکر زراعت سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ جدید طرز کے آلات کشاورزی
بھی تجربتاً استعمال کئے جاتے ہیں اور جو سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتے ہیں انکو
رواج دینے کی کوشش کیجاتی ہے۔ کسانوں کو تجربہ کے لئے عاریتاً مفت دیتے ہیں۔
نہایت کم شرح سے کرایہ پر دیتے ہیں۔ مناسب شرائط پر اُدھار فروخت کرتے ہیں
اور برائے نام منافع پر نقد بیچتے ہیں چنانچہ علیگڈھ میں بھی کالج سے تھوڑے فاصلہ پر
ایک سرکاری زرعی مرکز قایم ہے جو اپنے مفید معلومات اور مشوروں سے گردونواح
کے کسانوں کو مدد دینے میں بہت کوشاں نظر آتا ہے۔ بحالت ضرورت سرکاری خزانے
سے کسانوں کو روپیہ بھی بطور قرض تقسیم ہوتا ہے تاکہ وہ ساہوکاروں کے دام

حصہ دوم
باب دوم

میں گرفتار نہوں۔ قانون کے ذریعہ سے کسان کو زمیندار کی گرفت سے بھی بہت کچھ آزاد کر دیا ہے۔ غرضکہ ہر ممکن طریقہ سے گورنمنٹ زراعت کی ترقی کے واسطے کوشاں نظر آتی ہی۔ لیکن اسی سلسلہ میں آگے چلکر مسئلہ مالگذاری بھی قابل غور ہی۔

قانون تقلیل حاصل

۷ زراعت کے متعلق زمین کی ایک عجیب خاصیت تجربہ سے معلوم ہوئی ہی۔ جس کا نام قانون تقلیل حاصل ہی۔ یہ قانون ترقی زراعت پر ایک لازمی حد قائم کرتا ہی۔ اور مسئلہ لگان کے اصول بھی اسی قانون سے اخذ کیے گئے ہیں۔ لہذا اسکی ضروری تشریح یہاں پر برمحل معلوم ہوتی ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہی کہ قدرت نے ہر زمین کی قوت پیدایش معین اور محدود کر دی ہی۔ فن زراعت کے اصول کے مطابق جوت کر۔ کھاد ڈال کر۔ ہم زمین کی قوت پیدایش میں اضافہ ضرور کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں مگر اسکی بھی ایک حد ہی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ زمین کی پیداوار ہم ڈیوڑھی۔ دوگنی یا سہ گنی کر لیں۔ مگر اسکو دس بیس یا پچاس گنی حسب دلخواہ بڑھانا ممکن نہیں۔ اگر ممکن ہوتا تو ہر ایک کسان چھوٹا سا کھیت لیکر جتنی چاہے پیداوار حاصل کر لیا کرتا۔ اس کو بڑے بڑے کھیت جوتنے بونے اور انکی نگہداشت کرنے کی زحمت اُٹھانی نہ پڑتی۔ اور نہ پھر زراعت کیواسطے زمین کی اسقدر مانگ ہوتی۔ اکثر دیکھا جاتا ہی کہ جو قطعات صدہا برس سے کس مپرسی کی حالت میں ویران پڑے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ زیر کاشت آرہے ہیں۔ اگر زمین کی قوت پیدائش لامحدود ہوتی تو موجودہ کھیت کافی ہوتے اور غیر مزروعہ زمینوں پر کاشت پھیلانے کی ضرورت کیا تھی لیکن واقعہ یہ ہی کہ ہر ایک زمین خواہ کیسی زرخیز کیوں نہو۔ اور خواہ فن زراعت کا کل کمال اس پر صرف کر دیا جائے۔ صرف ایک خاص حد تک حاصلات کی متحمل ہو سکتی ہی اگر اس حد سے تجاوز کرکے اضافہ پیداوار کی ہوس میں

زیادہ محنت اور عامل صرف کیا جاوے تو یقیناً وہ سب اکارت جاویگا۔ اگر کسی کسان سے سوال کیا جاوے کہ وہ اپنے کھیت کو بجائے دو مرتبہ جوتنے کے چار مرتبہ نرائے۔ اور دس مرتبہ پانی دینے اور ایک من تخم بونے کے بیس مرتبہ جوت کر چالیس مرتبہ نرا کر سو مرتبہ پانی دیکر اور دس من بیج بوکر دس گنی پیداوار حاصل کیوں نہیں کرتا۔ تو وہ صاف جواب دیگا کہ زمین میں اتنی پیداوار کی گنجائش نہیں۔ ایسا کرنے سے ساری لاگت خاک میں ملجاوے گی۔ جو پیدا ہوتا وہ بھی نہ ہوسکیگا۔ دس گنی پیداوار کے واسطے ایسے ایسے دس کھیتوں کی ضرورت ہے۔

یہ تو بخوبی ذہن نشین ہوگیا کہ زمین کی قوت پیدایش محدود ہے۔ اب اس خاصیت کے عمل کا حال سنئے۔ بغرض سہولت بیان ہم کھیت کو جوتنے۔ بونے۔ نرانے۔ اور پانی لگانے کو جداگانہ **جرعون** سے تعبیر کرینگے اور ہر جرعہ کی لاگت فرض کرو دس روپیہ قرار دینگے۔ اگر کھیت ایک مرتبہ جوتا گیا تو گویا ایک جرعہ صرف ہوا۔ اسی طرح بونے۔ نرانے وغیرہ کے متعلق ہر فعل ایک جرعہ کھلاویگا۔ فرض کرو کہ کسی مناسب ترکیب سے کسان نے ایک کھیت پر دس جرعے صرف کئے۔ یا بالفاظ دیگر سو روپیہ لاگت لگائی اور تیس من غلہ پیدا ہوا اوسط ۳ من فی جرعہ پڑا۔ تجربتاً اسی کھیت پر بارہ جرعے صرف کئے اور پیداوار ۳۷ من ہوگئی۔ گویا دو جدید جرعوں کا ماحصل ۳½ من فی جرعہ ہوا۔ اضافہ کی اُمید پر بارہ پندرہ جرعے صرف کئے اور پیداوار پچاس من ہوئی۔ آخری تین جرعوں کا اوسط چار من فی جرعہ پڑا۔ ابتو کسان کو چسکا لگ گیا اور چوتھی مرتبہ اُس نے سولہ جرعے صرف کئے۔ مگر قدرت نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس مرتبہ پیداوار صرف ۵۲ من ہوئی۔ یعنی سولھویں جرعہ کا ماحصل صرف دو من ہوا معلوم ہوا کہ پندرھویں جرعہ پر قوت پیدایش کمال پر پہنچ گئی۔ اور سولھویں جرعے

حصہ دوم
باب دوم

سے انحطاط شروع ہوا۔ پس اصطلاحاً کہیں گے کہ پندرھویں جرعہ تک تو قانون تکثیر حاصل جاری رہا۔ مگر سولھویں جرعے سے قانون تقلیل حاصل کا عمل شروع ہوا۔ زراعت میں قانون تکثیر حاصل کچھ زیادہ قابل توجہ اس وجہ سے نہیں کہ اسکا اثر کمتر ظہور میں آتا ہے اور محض عارضی ہوتا ہے۔ البتہ مصنوعات میں اسکا اثر بہت اہم ہوتا ہے اور مناسب جگہ ہم اسکی تشریح کرینگے۔ یہاں ہم کو صرف قانون تقلیل حاصل سے بحث کرنا مقصود ہے کیونکہ اسکا اثر زراعت پر ہر حالت میں یقینی اور دائمی ہوتا ہے اور اسکا مسئلہ لگان اور قیمت زمین سے بہت قریبی تعلق ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون تقلیل حاصل جاری ہونے کے بعد بھی کسان جرعوں میں اضافہ کریگا یا نہیں اور اگر کریگا تو کہاں تک۔ اسکا جواب قیمت پیداوار پر منحصر ہے عام اصول یہ ہے کہ خواہ قانون تقلیل حاصل جاری ہو یا نہو کسان اپنے جرعوں میں اس وقت تک برابر اضافہ کئے جاویگا جبتک کہ ہر جدید جرعہ کی پیداوار کی قیمت جرعہ کی لاگت سے زیادہ ہو حتیٰ کہ کسی جدید جرعہ کی پیداوار کی قیمت اسکی لاگت کے برابر آپہنچے۔ تو کسان اضافہ فوراً بند کردیگا اور یہ آخری جرعہ اصطلاحاً جرعہ مختتم اور اسکی پیداوار حاصل مختتم کہلاویگی۔ کاشت کی اس حالت کو اتمام کاشت سے تعبیر کرتے ہیں صاف ظاہر ہے کہ جرعہ مختتم کسی خاص حد پر قایم نہیں ہوتا۔ بلکہ پیداوار کی قیمت بڑھتے گھٹنے پر حسب ترتیب یہ کبھی آگے بڑھتا اور پیچھے ہٹتا رہتا ہے۔ اضافہ قیمت کے زور پر کبھی قانون تقلیل حاصل کی حد سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور کمی قیمت کے باعث کبھی اس کی حد سے پیچھے چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ اور آباد ممالک میں اس قانون کا اثر بہت قوی اور وسیع پایا جاتا ہے اور پس ماندہ غیر آباد ممالک میں اسکے عمل کی نوبت تک نہیں آتی۔ آخر میں ہم پھر یہ جتلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون

حصہ دوم
باب دوم

تقلیل حاصل کا تعلق مقدار پیداوار سے ہی نہ کہ قیمت پیداوار سے جب کسی جرعہ کی پیداوار اپنے ماسبق جرعہ کی پیداوار سے مقدار میں گھٹ گئی۔ قانون کا عمل شروع ہوا قیمت پیداوار سے قانون کو کچھ سروکار نہیں۔ البتہ جرعہ مختتم تمام وکمال قیمت کے تابع ہوتا ہے۔ قیمت کی بیشی کمی جرعہ مختتم کو قانون تقلیل حاصل کی حد سے فٹ بال کی مانند کبھی اس طرف پھینک دیتی ہی کبھی اُس طرف۔

چونکہ جرعہ مختتم کی لاگت حاصل مختتم کی برابر ہوتی ہی۔ لہذا کسی کھیت میں جتنے جرعے صرف ہوں اتنی مرتبہ حاصل مختتم پیداوار کلی سے منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہیگا وہ ماحصل زاید کہلاویگا۔ یہ کبھی کسان کا خالص حصہ ہوتا ہے اور کبھی زمیندار کاشتکار میں باہم تقسیم ہوجاتا ہے۔ گورمنٹ بھی اسکی مستقل شریک بنگئی ہی اگر کسی کھیت میں دس جرعے صرف ہوں اور پیداوار کی مقدار کلی بارہ من ہے اور حاصل مختتم کی مقدار ایک من تو گویا دس من مصارف کاشت ہوئے۔ اور باقی دو من ماحصل زاید کہلائیں گے۔ اور یہی ماحصل زاید بہ ترمیمات خاص جنکی تشریح مناسب موقع پر کیجاویگی معاشی لگان کہلاتا ہی۔

معاشی ترقیات کا زمین کی قدر قیمت پر اثر

۸۔ ہر شخص جانتا ہی کہ زمین کی قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ آخر اسکی وجہ کیا ہی مستقل اسباب تو خواص زمین کے تحت میں واضح ہوچکے۔ چند اسباب جو ترقیات جدید کا نتیجہ ہیں۔ بیان کئے جاتے ہیں۔ جو قطعات شہر اور قصبات سے بہت دُور واقع تھے اور بوجہ فاصلہ وقلت ذرائع آمد ورفت انکی پیداوار منڈی تک لانا نہایت دشوار اور صرف طلب تھا۔ وہ بیکار پڑے ہوئے تھے نہ کوئی انکو جوتتا بوتا تھا نہ انکی کچھ قیمت اُٹھ سکتی تھی، کس مپرسی کی حالت میں لاوارثی پڑی ہوئی تھی۔ مگر جب سے ہندوستان میں ریل کے قدم آئے اور اسکا جال تمام ملک پر

پھیل گیا۔ دُور اُفتادہ زمینوں کے دن پھرے اور جس ویران میدان میں اسکا گذر ہوا بشرط صلاحیت تختۂ عدن بنگیا۔ ازکار رفتہ زمینوں سے دولت اُبل پڑی۔

ابتک کھیتوں کی آبپاشی کا دارومدار بارش یا کنوؤں کے پانی پر تھا۔ بمقابلہ چاہی زمینوں کے بارانی کی قیمت بہت کم تھی۔ بارش کا کیا بھروسہ ہو نہ ہو لہذا ایسی زمینوں کی پیداوار بھی اتفاقی تھی۔ لیکن جب سے شمالی ہندوستان میں بڑے بڑے دریاؤں سے نہریں۔ تالے۔ نکالکر اور دکن کے پہاڑوں میں گھرے ہوئے میلوں وسیع قدیم تالابوں سے کام لیکر تمام ملک پر پانی کا جال پورا گیا۔ آبپاشی بہت کچھ بارش اور کنوؤں سے مستغنی ہو گئی ہے۔ اور جہاں چھوٹی سی نالی بھی گذر گئی ہے۔ غیر چاہی زمینوں کی قیمت چاہی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ غرضکہ ریلوں اور نہروں کی بدولت ملک کا بہت سا ناکارہ حصہ قابل کاشت بنکر بہت کچھ قیمتی ہو گیا۔

جنگلات کی پیداوار سے بھی روزافزوں منافع حاصل ہو رہا ہے اور اُمید کیجاتی ہے کہ کچھ عرصہ میں جنگلات گورنمنٹ ہند کا نہایت مستقل اور کثیر آمدنی کا ذریعہ بنجاویں گے علم معدنیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ کان کنی کا حلقہ بھی وسیع ہو رہا ہے۔ میسور اور حیدرآباد میں سونا نکلتا ہے۔ لوہا اور کوئلہ بنگال کے اکثر حصوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مٹی کے تیل کے ذخیرے بھی دریافت ہوئے ہیں اور اُمید کیجاتی ہے کہ جستجو کرنے پر ہندستان میں بہت سی نامعلوم معدنیات سے بیشمار منافع حاصل ہوگا۔ غرضکہ مزروعہ زمین جنگلات و معدنیات سب روزبروز بیش بہا ہو رہی ہیں سکنی زمینوں سے ہم شہروں کی تحت میں جداگانہ بحث کرینگے۔

۹ کسی زمانہ میں زیادہ تر لوگ دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبات میں رہتے تھے ذرایع آمد و رفت کم اور وقت طلب تھے۔ بالعموم لوگ اپنے وطن یا اسکے گرد و نواح میں عمر بسر کر دیتے تھے۔ جہاں بادشاہ۔ اُمرا۔ اور حکّام کا قیام رہا وہاں البتہ شہر آباد ہو گئے۔ لیکن جب سے ایجادات جدیدہ نے فیکٹریوں۔ مِلوں عظیم الشان کارخانوں کی بنا ڈالی اور ریل نے آمد و رفت کو ایک کھیل بنا دیا۔ ڈاک اور تار نے ناواقفیت کا پردہ اُٹھا دیا تب سے بڑی بڑی تجارت گاہوں اور صنعت و حرفت کے مرکزوں کی بُنیاد قایم ہوئی۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کے بانی اکثر معاشی اسباب بنے۔ لندن برطانیہ عظمیٰ کا دارالسلطنت سہی۔ لیکن اسکی عظمت کے حقیقی اسباب اسکے معاشی خصوصیات میں مضمر ہیں۔ خود ہندوستان کے نامور شہر کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس۔ ناگپور۔ دہلی۔ لاہور۔ تجارت اور صنعت و حرفت کیوجہ سے اس قدر پُر رونق اور آباد ہیں۔ ورنہ محض بہ حیثیت دارالسلطنت ان کو موجودہ عروج ہرگز میسّر نہوتا۔ آبادی اب اس قدر وسیع انتقال پذیر ہو گئی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی مہذب ملک ہو گا جہاں کے کم از کم دو چار باشندے بڑے شہروں میں مصروفِ کاروبار نہ پائے جائیں۔ خود ہندوستانی جیسے گھر گھسنے لوگ چین جاپان افریقہ اور امریکہ تک تلاشِ معاش میں چکر لگا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشی ترقیات کے ساتھ شہروں کی وسعت اور تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

اگر ایک منارے پر چڑھ کر کسی شہر کا منظر دیکھو تو بوجہ گنجانی آبادی وہ بھڑوں کا چھتا نظر آئیگا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہر کے گرد و نواح میں زمین خالی پڑی ہے۔ تو پھر لوگ شہر کے اندر تنگ و تاریک مکانات میں رہنے پر کیوں جان دیتے ہیں۔ شہر سے باہر ہوادار مکان بنا کر آرام سے کیوں نہیں رہتے۔ شہری لوگ کچھ دیوانے تو ہوتے نہیں۔

حصہ دوم باب دوم

شہروں کی آبادی کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر

ضرور کوئی زبردست مصلحت ہوگی کہ وہ شہر کی کوٹھری کو بیرون شہر کی کوٹھی پر ترجیح دیتے ہیں۔ بازاروں۔ کارخانوں۔ دفتروں۔ عدالتوں۔ کالجوں۔ اور ریلوے اسٹیشن کے قرب وجوار میں شرح کرایہ مکانات بہت زیادہ ہوتی ہے اور باوجود زیادتی کرایہ لوگ ایسے ہی مکانات کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ اسکی وجہ بتانا دشوار نہیں۔ لوگ اپنی کاروبار کی جگہ سے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ اور کفایت وقت وسہولت آمدورفت کو زیادتی کرایہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاہی زمانہ کے محلات جنکی تعمیر میں لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہوگا دہلی کے اندرونی محلوں میں سُن سان اور غیر آباد پڑے ہوئے ہیں۔ کوئی اگر برائے نام ہی کرایہ دے تو مکان کی صفائی۔ روشنی آبادی غنیمت سمجھی جاتی ہے۔ اور ریلوے اسٹیشن کے قریب سراؤں کی کوٹھریاں اور ہوٹلوں کے معمولی مکانات صدہا روپیہ ماہوار کرایہ کما رہے ہیں۔ یہی حال بازاروں کا ہے۔ جو بازار کسی غیر آباد حصہ میں بیموقع بنا ہے کہ وہاں کوئی بھولا بچھڑا خریدار آنکلے تو آنکلے ورنہ ساری خرید وفروخت پڑوس کے غریب لوگوں تک محدود ہے۔ وہاں وسیع دُوکانیں نہایت قلیل کرایہ پر چلتی ہیں۔ یہاں کے دوکاندار محض بوجہ مجبوری تھوڑی سی خردہ فروشی کو بیکاری سے غنیمت سمجھتے ہیں۔ لیکن جو بازار عام گذرگاہ شہر کے آباد حصہ میں واقع ہوگا جہاں خریداروں کا دن بھر ہجوم رہتا ہوگا۔ چھوٹی سے چھوٹی دوکان بھی دس گنے کرایہ پر اٹھتی ہوگی۔ اور اس پر بھی لوگ متلاشی پھرتے ہونگے۔ دوکاندار اپنی تجارت کے فروغ پر ایسا ایسا پچاس گنا کرایہ بھی تو قربان کرسکتے ہیں۔ چنانچہ دہلی میں چاندنی چوک اور کشمیری بازار کی دوکانوں کا جو کرایہ ہے۔ دوسرے بازاروں میں اسکا نصف بھی نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ شہر کی گنجانی اور تنگی بیوجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ زبردست معاشی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔

حصہ دوم
باب دوم

اوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شہر کی زمین کی قدر و قیمت کا باعث جائے وقوع ہے۔ موقع کی اہمیت کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے بخوبی واضح ہوگا۔ مدراس میں ساحل کے قریب قریب نہایت کشادہ۔ ہموار اور صاف سڑک کئی میل تک چلی گئی ہے۔ اس کو بیچ لائن کہتے ہیں۔ بلحاظ خوبصورتی مناظر ساحل نیپلس کے بعد دنیا بھر میں وہ دوسرے درجے کی خیال کیجاتی ہے۔ شہر کے حکام۔ معززین تاجر۔ عالم۔ صدہا یوروپین عورتیں اور بچے شام کے وقت چہل قدمی کے لئے جمع ہوتے ہیں عجیب سماں ہوتا ہے چھوٹے چھوٹے بچے سمندر کی ریتی پر خوب دوڑ لگاتے اور لوٹتے ہیں۔ مگر ریتی ایسی صاف نہ کیا مجال کپڑا میلا ہو۔ جہاں ذرا جھٹکا۔ کپڑا صاف۔ قریب ہی منتہائے نظر تک سمندر لہریں مارتا ہے اور غروب آفتاب کا منظر کچھ عجب بارعب اور شاندار ہوتا ہے سڑک پر بینڈ بجتا ہے۔ جگہ جگہ بنچیں پڑی ہیں۔ کہیں دوستوں کی ٹولی خراماں خراماں چلی جارہی ہے۔ کہیں لوگ کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ بعض لوگ کسی کے انتظار میں یا دم لینے کو بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور تمام مجمع نہایت صاف و پاکیزہ۔ پانچ بجے شام سے آٹھ بجے رات تک یہی سماں بندھا رہتا ہے۔ خصوصاً چاند کی بارھویں سے سولھویں شب تک جبکہ سمندر میں جوار بھاٹا زور شور پر ہوتا ہے۔ آدھی آدھی رات تک لوگ قدرت کے اس شاندار تماشے میں محو رہتے ہیں۔ سڑک کے کنارے۔ پرنس ارکاٹ کی کچھ خاندانی عمارتیں ہیں جنہیں آجکل سرکاری دفاتر قائم ہیں بتحقیق طور پر سنا ہے کہ یہاں کے قرب و جوار میں چار سو روپیہ گز تک زمین فروخت ہونے کی نوبت آگئی۔ بالآخر پرائیویٹ خرید و فروخت بند کرکے گورنمنٹ نے وہ کل قطعہ اپنے قبضہ میں لے لیا اور اب وہ سرکاری ملک تصور ہوتا ہے۔ امریکہ کے مشہور شہر نیویارک میں جہاں سنا ہے بوجہ کثرت آمد و رفت صدر اسٹیشن سے شب و روز ہر چوتھے منٹ پر ایک ٹرین گذرتی ہے

حصہ دوم باب دوم

وال اسٹریٹ اور براڈوے۔ بازاروں کی قرب وجوار میں بارہ ہزار روپیہ اور لندن کے مشہور بازار لمبارڈ اسٹریٹ میں تقریباً ۱۰ ہزار روپیہ مربع گز کی شرح سے میں فروخت ہوچکی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے مکان کیواسطے کچھ نہیں تو دو سوگز زمین تو ہو۔ اور اسکی قیمت کیا ہوئی۔ چوبیس بلکہ چونتیس لاکھ روپیہ گویا وہاں کے جھونپڑے یہاں کے محلات سے بدرجہا قیمتی ہوتے ہیں۔ کیا وہاں کی زمین سونے کی ہے۔ زمین تو ہمارے ہاں کی روپیہ گز والی قصباتی زمین سے کسی طرح پر بہتر نہو گی۔ جو کچھ قیمت ہے وہ قیمت موقع ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شہر کی زمینوں کی قیمت میں قیمت زمین اور قیمت موقع دو جداگانہ چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ اور قیمت موقع میں اضافہ کی بیحد گنجائش ہے۔ موقع کا اثر تو مزروعہ زمینوں کی قیمت پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ قصبات کے قرب وجوار کے کھیت دیہات کے کھیت سے زیادہ قیمتی خیال کئے جاتے ہیں مگر سکنی زمین کے مقابلہ میں مزروعہ زمین کی قیمت موقع کی کچھ حقیقت نہیں ہوسکتی۔ اور اسی وجہ سے صرف شہر کی زمینوں کے ساتھ قیمت موقع کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شہروں میں پارک کی ضرورت

۱۰۔ گنجانی آبادی اور افزونی قیمت زمین کا اثر شہر کی ساخت پر یہ پڑتا ہے کہ گلی کوچے تنگ اور عمارتیں کئی کئی منزل بلند بنائی جاتی ہیں۔ امریکہ میں سات سات منزل تک عمارت اُٹھ چکی ہے۔ روشنی اور پاک وصاف ہوا جو زندگی کے واسطے لازمی ہیں۔ کافی میسر نہیں آتیں۔ باشندوں کی صحت کو مضرت پہنچتی ہے۔ کچھ دنوں سے یہ طریق بہت مروج ہوچلا ہے کہ ہر شہر میں ایک یا زیادہ وسیع پارک بنائے جاتے ہیں۔ جہاں دن بھر کے تھکے ماندے لوگ شام کو آکر دل بہلاتے ہیں۔ سبزہ سے آنکھیں ٹھنڈی کرتے ہیں۔ پاک وصاف ہوا کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ اکثر جگہ ہفتہ میں ایک یا دو روز بینڈ بھی بجتا ہے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کی تفریح سے دن بھر کے کام کاج کا تکان اُتار کے تازہ دم مکان

حصہ دوم باب دوم

جاتے ہیں۔ یورپ میں تو شہر شہر پارکوں کی کثرت ہے۔ لیکن اب ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی انکی ضرورت محسوس ہو چلی ہے۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس۔ بنگلور جیسے مقامات میں جہاں انگریزی آبادی کی کثرت ہے۔ مدت سے کئی کئی پارک موجود ہیں۔ الہ آباد میں ایک پارک تیار ہو چکا ہے۔ اور دوسرا زیر تجویز ہے۔ لکھنؤ کا مختصر سا امین آباد پارک بھی بہت پُرفضا ہے۔ اب اسکی توسیع کیجا رہی ہے۔ جس قدر شہروں کی آبادی زیادہ گنجان ہوگی پارک کی ضرورت بڑھیگی۔ عرف عام میں پارک شہر کے پھیپھڑے کہلاتے ہیں اور آبادی کی صحت کیواسطے وہ اسی قدر ناگزیر ہیں جس قدر کہ جسم انسان کے واسطے پھیپھڑے۔

ٹریم کار کا شہروں کی آبادی اور زمین کی قیمت پر اثر

۱۱۔ ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ٹریم کار کا شہر کی حالت پر بہت مفید اثر پڑ رہا ہے موٹر تو قیمتی بہت۔ بائیسکل کی قیمت بھی معمولی لوگوں پر گراں۔ اور شہر کی تنگ گلیوں اور بھیڑ دار سڑکوں پر اس کا چلانا خطرناک۔ گھوڑا گاڑی کا کرایہ زیادہ اور ہمیشہ وقت پر ملنا دشوار۔ لیکن ٹریم کا حسب قاعدہ ہر چوتھے چھٹے یا دسویں منٹ اپنے راستہ سے گذرنا یقینی۔ کرایہ نہایت واجبی۔ تیز رفتار حسب دلخواہ۔ اور پھر کافی مطیع ستون کے قریب ذرا ہاتھ کا اشارہ کیا کہ کھٹ سے رک گئی۔ اطمینان سے چڑھے کہ چلدی منزل مقصود پر حسب ہدایت چلانے والے نے بلا منت روکدی۔ اور چند پیسے دیکر چشم زدن میں میلوں دور۔ کارخانے۔ دفتر۔ کالج۔ عدالت۔ دوکان۔ جہاں ضرورت ہوئی پہنچگئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب لوگ کاروباری جگہ کی قرب کے اس قدر خواہشمند نہیں جتنا کہ قبل رواج ٹریم کار تھے۔ اب بجائے زیادہ گنجان ہونے کے شہر کی آبادی گرد و نواح میں پھیلنے لگی ہے۔ بیرون شہر کی زمینوں میں صرف فاصلہ کا نقص تھا سو وہ ٹریم کار نے رفع کر دیا۔ ورنہ بحیثیت آب و ہوا تو یقیناً شہر کی زمینوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ لوگ وہاں بشوق آباد نہوں۔ جس طرح پرنالیوں سے کسی

حصہ دوم باب دوم

تالاب کا پانی بہتا ہے۔ ٹریم سے شہر کی آبادی ہر چہار طرف پھیل رہی ہے۔ مضافات شہر کی زمینوں کی قیمت بڑھ رہی ہے اور اندرون شہر زمینوں کی قیمت کی رفتار ترقی سست پڑ گئی۔ شہر کی گنجانی اور قیمت زمین کے بیجا اضافہ کا تشویش ناک مسئلہ ٹریم کا رنے حسب دلخواہ حل کر دیا اور ظاہر ہے کہ اس کا رواج دوسری سواریوں سے شہر کے حق میں بہت زیادہ مفید ثابت ہوا۔

اضافہ قیمت زمین کے حقدار

۱۲۔ چونکہ اضافہ قیمت زمین کے اسباب قدرتی خصوصیات اور معاشی ترقیات ہیں۔ اور مالک کی ذاتی کوشش کو اس میں بہت ہی کم دخل ہے۔ یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اضافہ قیمت زمین کا حقدار کلی کیوں سمجھا جائے۔ اگر کل نہیں تو اضافہ کا ایک معقول حصہ ضرور گورنمنٹ کو ملنا چاہیئے۔ تاکہ تمام ملک کی ترقی اور بہبودی پر صرف کیا جا سکے۔ اسی اصول پر زمینداروں سے مالگذاری اور مکانداروں سے ہاؤس ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ تفصیل اضافہ کی بحث ہم آئندہ بالتفصیل کریں گے۔ اب زمین کا بیان ختم کرتے ہیں۔

حصہ دوم
باب دوم

فصل سوم

محنت

تجزیہ۔ (۱) محنت کا مفہوم (۲) محنت کے اقسام (۳) محنت کے خواص (۴) کارکردگی کا مفہوم (۵) لوازم کارکردگی۔

محنت کا مفہوم

۱۔ محنت کے اصطلاحی معنوں میں قدیم علمائے معیشت کی کوتہ نظری اس قدر جذب ہوگئی ہے کہ باوجود تحقیق نقص ابتک اکثر مصنفین پُرانی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور محنت کی وہی قدیم تنگ تعریف دُہرائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مارشل تک نے نہ معلوم کیوں دولت کی تعریف میں محض تقلید پر اکتفا کیا مگر ساتھ ہی اتنا ضرور کیا کہ مروجہ تعریف کی نقص و خامی کی پوری توضیح کردی اور کم از کم دوسروں کو اصلاح اور ترمیم کی جُرأت دلائی۔ آج سے پچاس برس پہلے تک بہت سے مسائل ناواقفیت اور غلط فہمیوں کے تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ آدم اسمتھ کے زمانہ تک دولت میں صرف مادی چیزیں شامل تھیں اور قیمتی دھاتیں مثل سونا، چاندی بوجہ دیرپا ہونے کے بالخصوص اعلیٰ قسم کی دولت مانی جاتی تھیں۔ دولت کے اسی مفہوم کے مطابق محنت سے صرف وہی کام جسمانی یا دماغی مراد تھے جنکے معاوضہ میں کچھ مادی آمدنی ہو سکے۔ اسمیں شک نہیں کہ ابتک محنت کی عام شکل یہی ہے اور آیندہ بھی رہیگی۔ لیکن دولت کے جدید معنے جنکو ہم مقدمہ میں واضح کرچکے ہیں مدنظر رکھتے ہوئے محنت کا مفہوم وسیع تر بنانے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یعنی محنت میں وہ کام بھی شمار کرنے چاہئیں جن کے بدلے

حصہ دوم
باب دوم

مادی آمدنی کے بجائے کوئی حظ۔ لطف مسرت۔ جیسے افادہ والی دولت حاصل ہو۔ ہمنے مانا کہ اس آخری قسم کی محنت کا حلقہ عمل تنگ اور مختصر ہے اور ہونا چاہیئے ورنہ نظام عالم منقلب ہوجاتا۔ لیکن اصولاً محنت کے معنوں میں صرف قسم اول کے کاموں کو شامل اور قسم دوم کو خارج کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ملازم تنخواہ کے لالچ سے خدمت کرتا ہی لیکن ماں باپ کو اولاد کے پالنے اور عاشق کو محبوب کی ناز برداری میں جو لطف آتا ہے وہ اسی دولت کا افادہ ہے جو بشکل مخدومیت بمعاوضہ محنت خدمت حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ ماں باپ یا عاشق کیا لایعقل ہیں کہ بیکار اپنی جان کھپاتے اور دولت لٹاتے ہیں۔ پھر ملازم کے کام کو محنت شمار کرنا اور والدین وعاشق کی جانفشانی کو نظر انداز کرنا سراسر بیجا اور خلاف اصول معلوم ہوتا ہے کھیل کود اور ورزشیں بھی جنکے معاوضہ میں قدرت تفریح صحت وقوت عطا کرتی ہی فی نفسہ محنت ہیں اور مروجہ محنت سے اس قدر قریبی تعلق رکھتی ہیں کہ انکا لحاظ کرنا لازمی ہی بیکار پڑا رہنا اس قدر تکلیف دہ ہوتا ہی کہ وہ بشکل قید تنہائی ایک سخت سزا تجویز کیا گیا ہی۔ اگر محض جی بہلانے کی غرض سے بیکار آدمی کہیں آجاوے جاوے تو یہ فعل گو بظاہر بے سود نظر آتا ہے۔ مگر درحقیقت وہ ایک تکلیف سے نجات دیکر دل کو آرام پہنچاتا ہی اور محنت میں شمار کرنے کے قابل ہی۔ اگر کوئی سوال کرے کہ جو لوگ مفت بیگار میں بہزار ناخوشی کام کرتے ہیں ان کو تو کوئی بھی معاوضہ نہیں ملتا۔ یعنی نہ مزدوری نہ لطف۔ انکا کام محنت کیسے کہلا سکتا ہی۔ لیکن یہ سطحی دھوکا ہے۔ بیگار نہ کرنے پر جو سزا کی تکلیف پہنچتی اس سے نجات کام کا معاوضہ ہی۔ اور بیگاری بھی محنت کرتے ہیں۔ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہی کہ جب محنت کا مفہوم اس قدر وسیع ہی تو آخر وہ کون کام ہیں جو محنت نہوں جواب صاف ہی جن کاموں کا معاوضہ نہ ملے وہ محنت نہیں

مثلاً راستہ بھٹکنا۔ چیز گم کرنا۔ بات بھولنا۔ حادثات سے مجروح یا ضایع ہونا۔

یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری ہی کہ جس طرح متقدمین تفریط پر اڑے تھے۔ ہم بھی افراط پر بڑھے ہیں۔ تاکہ دونوں انتہا دیکھنے سے ناظرین میں وسعت نظر پیدا ہو اور وہ عقل سلیم سے کام لیکر خیرالامور اوسطہا کے اصول پر خود طے کر سکیں کہ محنت کا مفہوم کیا ہی اور کس قسم کے کام اس میں شمار ہونے چاہئیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جو علوم انسان کے افعال ارادی سے متعلق ہیں انکے اصول و قوانین کم و بیش تخمینی اور مذبذب ہوتے ہیں۔ انمیں بھلا علم ہندسہ یا طبیعات کے اصول و قوانین کا سا استحکام اور تیقن کہاں۔ یہ دشواری علم المعیشت میں بوجوہات معلومہ خاص طور پر پیش آتی ہے۔ تحقیق جدید جس قدر وسعت مفہوم کی مقتضی تھی وہ ہمنے بیان کردی اور محنتی و غیر محنتی کاموں میں جہانتک ممکن تھا حد فاصل قایم کردی لیکن قطعی طور پر ان دونوں قسم کے کاموں کی کوئی جداگانہ فہرست نہیں بنائی جاسکتی اکثر کام تو محنت ہوتے ہیں۔ بعض کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے اور معدودے چند محنت سے خارج کئے جاسکتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا یہ سب مفہوم محنت کی ایک علمی بحث تھی۔ عملاً اسکی اہمیت کچھ زیادہ نہیں معیشت میں ہم کو بیشتر ایسی ہی محنت کے اصول و نتائج سے سروکار ہوتا ہی جس کو عام طور پر سب محنت سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ کام جن کا کچھ مادی معاوضہ ہاتھ آوے والدین عشاق اور شوقین لوگوں کے مشاغل سے ہم کو معدودے چند مفید مطلب باتیں تحقیق ہوئی ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ بیان کیجاوینگی۔ یہاں وہ اصلی بحث سے متعلق نہیں ہیں محض علمی مذاق کے لحاظ سے مفہوم دولت میں انکا ذکر بھی کرنا ضروری معلوم ہوا۔

پس بالفاظ مختصر محنت سے وہ تمام جسمانی اور دماغی کام مراد ہیں جو بغرض حصول معاوضہ کئے جاویں۔ اکثر یہ معاوضہ بشکل مادی اور بکمتر بشکل حظ و لطف وغیرہ مطلوب

حصہ دوم باب دوم

ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک محنت کو معاشی جدوجہد سے تعبیر کرنا نہایت مختصر جامع اور صحیح تعریف ہوگی معاشی جدوجہد کی تشریح مقدمہ میں موجود ہے۔

محنت کے اقسام

۲ ۔ مدت سے محنت کی دو قسمیں چلی آتی ہیں۔ بارآور اور بے ثمر یہ تفریق بھی محض قدیم ناواقفیت اور تنگ نظری کی یادگار ہے۔ وہ محنت ہی کیا جو بے ثمر ہو۔ اس سے گویا اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ مگر چونکہ یہ بحث تاریخی حیثیت سے بہت دلچسپ ہے اور ترقی خیالات کا تمام سلسلہ اس سے پیش نظر ہو جاتا ہے۔ ہم اس کا لب لباب بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

سترھویں صدی میں حکمائے مستبدین کا زمانہ علم المعیشت کا دور اول خیال کیا جاتا ہے ان حکما کے نزدیک صرف سونا۔ چاندی ٹھیٹ دولت تھی اور جس محنت کا معاوضہ براہ راست چاندی۔ سونا ملتا تھا وہ تو بارآور تھی اور باقی بے ثمر۔

انقلاب فرانس کے زمانہ میں جب حکمائے متوکلین کا گروہ نمودار ہوا تو انہنے معاوضہ میں زر وسیم کی شرط تو اڑا دی لیکن صرف زراعت کو محنت بارآور اور باقی کو بے ثمر قرار دیدیا اور وجہ تفریق یہ قایم کی کہ تمام پیداوار کا مخزن و منبع زمین ہے۔ باقی تمام پیشے اسی زمین کی پیداوار میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں اپنی ذات سے پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

دولت کی تعریف اور پیدایش دولت کے مفہوم سے صاف ظاہر ہے کہ صنعت کی مدد بغیر زمین کی کوئی پیداوار دولت نہیں کہلا سکتی۔ اسکی کافی تشریح کیجا چکی ہے پس جب پیدایش دولت کیواسطے صنعت شرط لازمی ہے تو وہ محنت بے ثمر نہیں ہو سکتی صنعت بھی مثل زراعت محنت بارآور ہے۔

باربرداری کسی زمانہ میں محنت بے ثمر مانی جاتی تھی۔ کیونکہ کسی چیز کو ایک جگہ

حصہ دوم
باب دوم
(د)

سے دوسری جگہ لیجانے میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ وہی کی وہی چیز باقی رہتی
ہے۔ پھر باربرداری کیونکر محنت بارآور ہوسکتی ہے۔ لیکن مفہوم پیدایش کی بحث میں
ثابت ہوچکا ہے کہ پیدایش کی ایک حالت محض نقل مقام ہوتی ہے۔ کانکنی اور باربرداری
میں کیا فرق ہے۔ صرف یہی نہ کہ ایک معدنیات کو غار سے سطح زمین پر لاتی ہے۔ گویا
حرکت عمودی ہوتی ہے اور دوسری ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں پہنچاتی ہے گویا
حرکت افقی ہوتی ہے صرف حرکات کی سمت میں فرق ہے۔ ورنہ نتیجہ دونوں کام کا ایک
ہی ہے۔ یعنی ایک ایسے مقام سے جہاں چیز ناکارہ پڑی ہے یعنی صفت دولت سے معرا
ہے۔ ایسی دوسری جگہ لیجانا جہاں وہ کارآمد ہوکر دولت بنجاوے۔ دونوں کاموں سے
محض بذریعہ نقل مقام دولت پیدا ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ کہ کانکنی تو محنت بارآور رہو اور
باربرداری نہو۔ اگر زمین کی پیداوار زمین ہی پر چھوڑ دی جائے اور مصنوعات کارخانوں
میں انبار رہوتی رہیں اور منڈی تک نہ لائی جاویں تو وہ کسی طرح پر دولت نہیں شمار
ہوسکتیں نقل مقام انکے دولت بننے کی شرط لازمی ہے اور خصوصاً اس زمانہ میں تو
باربرداری پیدایش دولت میں بحیثیت مدد دیگر بدرجہ ادنے محنت باثمر کہلانے کی مستحق ہے
کسی زمانہ میں تجارت اور باربرداری دونوں کام ایک ہی شخص کے متعلق تھے۔
تاجر اپنی ذاتی اہتمام اور نگرانی سے مال شہر بشہر لئے پھرتے تھے۔ مگر معاشی ترقیات کی
بدولت اب یہ دونوں کام جدا ہوگئے۔ تاجر اپنی دوکان سے مال روانہ کرتے ہیں اور
دوکان پر وصول کرتے ہیں۔ باربرداری کا کام اب ریلوے کمپنی نے اپنے ذمہ لے لیا
ہے۔ باربرداری تجارت سے اس قدر وابستہ ہے جیسے چولی سے دامن۔ ناخن سے گوشت
باربرداری کا باعث اور غرض تجارت نہیں تو اور کیا ہے۔ پس جب باربرداری محنت بارآور
قرار پائی تو اس کی روح رواں یعنی تجارت اس سے بڑھکر محنت بارآور سمجھی جانا چاہیے

زراعت۔ صنعت بار برداری اور تجارت۔ درحقیقت ایک ہی عمل پیدایش کے لازمی حصّے ہیں اور ہر ایک بطور خود محنت بارآور ہے۔

لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدمات عامہ بھی محنت بارآور ہو سکتی ہیں مثلاً جج جو فیصلے لکھتا ہے۔ ڈاکٹر شگاف دیتا ہے طبیب دوا تجویز کرتا ہے۔ پروفیسر لڑکے پڑھاتا ہے اڈیٹر اخبار۔ رسالے چھاپتا ہے۔ مصنف کتابیں لکھتا ہے ان کاموں سے کیا دولت پیدا ہوتی ہے اس کے دو جواب ہیں۔ اوّل تو مقدمہ سے ان خدمات کا دولت ہونا ثابت ہے۔ لہذا محنت بارآور ہیں۔ کیونکہ افادہ اور استبدال کے ہوتے ہوئے بے ثمر ہونے سے اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کی بیشمار قسمیں تو پیدا ہوگئیں لیکن وہ ایک دوسرے سے یوں منسلک ہیں کہ کسی ایک کا بھی باقی سے جدا کرنا محال ہے۔ اگر انسان تمام پیشوں کی باہمی تعلق پر غور کرے تو وہ ہر ایک کو باقی تمام کا جزو لاینفک پائیگا۔ تحقیق ہوا ہے کہ جو روٹی ہم کھاتے ہیں اس کی تیاری سے براہ راست اور بالواسطہ تین سو پیشے متعلق ہیں۔ حتیٰ کہ ادیب و شعرا اور تمام علوم کے حکما جو ملک میں پاکیزہ خیالات۔ عمدہ جذبات اور بیداری پیدا کرتے ہیں۔ طرح طرح کے مفید معلومات پھیلاتے ہیں وہ بھی روٹی کی اہتمام میں کم و بیش شریک ہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ کسی کا تعلق قریبی ہے اور کسی کا بعید۔ کسی کا ظاہر۔ کسی کا پوشیدہ۔ مگر سلسلہ تعلق میں سب تسبیح کے دانوں کی طرح پرے ہوئے ہیں۔ جدا ایک بھی نہیں۔

تفصیل بالا سے واضح ہوا کہ تمام قسم کی محنت بارآور ہے۔ اگر کوئی کام بے ثمر ہے تو وہ محنت ہی کہاں رہا۔ پس محنت بارآور اور بے ثمر کی تفریق سراسر بے معنی ہے لیکن کسی زمانہ میں جبکہ پیدایش کا مفہوم نہایت دھندلا تھا محنت کی یہ تفریق بہت اہم خیال کیجاتی تھی یہ خیال کرنا بیجا ہوگا کہ مذکورۂ بالا خامیوں سے متقدمین کی علمیت پر کچھ الزام آتا ہے

حصہ دوم
باب دوم

کوئی علم دنیا میں مکمل نہیں اُترتا بلکہ صدہا سال کی مسلسل کوشش سے بتدریج ترقی پاتا ہے۔ اور خواہ کسی درجہ پر پہنچ جاوے لیکن جو متقدمین کسی علم کی بناڈالتے ہیں اور جہالت کی ابتدائی تاریکی سے نکال کر دنیا سے متعارف کرتے ہیں انکا فخر کسی دوسرے کو کب نصیب ہوسکتا ہے۔ جن علما کی تنگ نظری کا ہمنے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی قابلانہ تحقیق سے اس علم میں بیش بہا معلومات کا اضافہ کرکے اگر سچ پوچھو تو دنیا پر احسان کیا ہے۔ انکے علمی خیالات میں آجکل خامیاں نظر آتی ہیں آیندہ چلکر موجودہ خیالات میں اس سے بڑھ کر نقص نکالے جائیں گے۔ یہ تو ترقی علم کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس سے کسی کی قابلیت پر حرف نہیں آتا۔ اور اسی اصول کی روشنی میں ہماری نکتہ چینی پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

محنت کی ایک تقسیم اور بھی کی گئی ہے۔ محنت بامہارت و بے مہارت دونوں قسموں کے کچھ خواص مقرر نہیں۔ صرف اتنا فرق ضرور ہے کہ جس کام کے سیکھنے میں کچھ وقت اور ذہانت درکار ہو وہ بامہارت کہلاتا ہے۔ اور جو بلا غور جلد آجائے وہ بے مہارت لیکن ان دو قسموں کے درمیان کوئی بین اور مستقل حد فاصل قایم نہیں ہوسکتی۔ علمی اخلاقی اور معاشی پس ماندگی اور ترقی کے مطابق انکے حلقوں میں کام داخل یا خارج ہوتے رہتے ہیں چنانچہ گاؤں کی محنت بامہارت قصبہ میں بے مہارت اور قصبہ کی بامہارت شہر میں بے مہارت شمار کیجاتی ہے۔ درزی کی محنت لو۔ گاؤں میں معمولی کرتہ پاجامہ۔ قصبہ میں اچکن۔ انگرکھا۔ اور شہروں میں فیشن ایبل کوٹ۔ پینٹ۔ محنت بامہارت سمجھے جاتے ہیں اس طرح پر گاؤں میں ہل۔ چرخہ۔ قصبہ میں صندوق۔ چوکی۔ اور شہروں میں خوشنما میز کرسی۔ بڑھئی کی محنت بامہارت مانی جاتی ہیں۔ عام شناخت تو وہی ایک ہے۔ سیدھا سادہ آسان کام بے مہارت اور دقیق و دشوار بامہارت۔ البتہ ترقی کے ساتھ آسانی و دشواری کے معیار بدل جاتے ہیں۔ اور اسی کے مطابق کام داخل خارج ہوتے رہتے ہیں

حصہ دوم
باب دوم

محنت کے خواص

محنت کا مفہوم اور اس کے اقسام بیان ہو چکے۔ اب ہم ضروری خواص بتانا چاہتے ہیں۔

۲۳۔ جب کوئی شخص مکان تعمیر کراتا ہے۔ باغ لگاتا ہے۔ ہاتھی۔ گھوڑے جیسے جانوروں کے سدھانے میں روپیہ صرف کرتا ہے۔ یا کوئی قیمتی مشین خریدتا ہے۔ تو وہ جس چیز پر روپیہ صرف کرتا ہے اسکا پورا مالک ہوتا ہے اور اس کے استعمال یا فروخت سے اپنی لاگت وصول کرسکتا ہے۔ لیکن جو روپیہ انسان کی تعلیم اور تربیت پر صرف کیا جاتا ہے اسکی حالت بالکل جداگانہ ہے۔ ماں باپ محض فطری محبت کے جوش میں اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر ہزارہا روپیہ لٹا دیتے ہیں۔ لیکن ان کو اپنے مصارف کی واپسی کا کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اگر اولاد اہل ہو تو شاید اپنی کمائی سے بوڑھے والدین کی خدمت کرے ورنہ والدین تمام عمر کی کمائی اور محنت سے ہاتھ دھو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ خصوصاً جب سے رسم غلامی بند ہوئی اور شخصی آزادی نے زور پکڑا۔ ہر کوئی خود مختار بن بیٹھا۔ کسی کی ملک ہونا تو درکنار اب انسان سوائے قانون کے کسی کا مطیع نہیں رہا۔ جب یہ حالت ہے تو غیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی کی تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کریں۔ چنانچہ حیوانات۔ نباتات۔ مکانات آلات اور دیگر مادی سامان کی اصلاح و ترقی میں روپیہ جس قدر بیدریغ صرف کیا جاتا ہے تعلیم و تربیت کے خرچ میں اسی قدر بخل برتا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مصارف اول الذکر کی بنا منفعت طلبی ہے۔ اور آخر الذکر کی محبت انسانی ہمدردی اور ان دو جذبات کی قوت اور وسعت عمل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ محبت اور ہمدردی جیسے پاک جذبات تو کمتر دلوں میں بستے ہیں۔ مگر منفعت طلبی جیسی قوی خواہش کی کسی دل میں کمی نہیں۔ پس جن مصارف میں منفعت طلبی داخل ہے انکی کثرت ہے۔ اور جو محض ہمدردی پر مبنی انکی قلت۔

جو روپیہ غیروں کی تعلیم پر صرف کیا جاوے اسکی واپسی میں قانون سے مدد مل سکتی ہے مگر وہ مدد بھی پوری کارگر نہیں ہوتی۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص وظیفہ سے تعلیم حاصل

کر کے اسکی واپسی میں تساہل کرے تو اُس سے روپیہ وصول کرنا بہت دشوار ہی۔ البتہ وہ
حیران و پریشان کیا جاسکتا ہی۔ تعلیمی وظایف کی واپسی زیادہ تر نیک نیتی اور خوش معاملگی
پر منحصر ہی۔ نہ کہ جبر اور قانونی کارروائی پر۔ اگر وظائف جائیداد کی ضمانت پر دیے جائیں
تو جائداد ہوتے ہوئے وظیفہ کی حاجت کیا۔ وظیفہ کی غرض تو نادار اور ذہین طلبہ کی امداد
ہی۔ جائداد کی ضمانت سے گویا وظیفہ کی اصلی غرض فوت ہوتی ہی۔ اور اگر ضامن طلب کیے
جاویں تو وظیفہ چاہنے والے جیسے لوگوں کو ضامن میسر آنا معلوم۔ غرضکہ وظیفہ عاریتاً محض اعتماد
پر دیا جاتا ہی یا مفت بطور ہمدردی۔ مثل دیگر مصارف۔ وظیفہ دہی کبھی کاروباری حیثیت
اختیار نہیں کرسکتی۔ اگر کسی متمول تاجر سے دریافت کیا جاوے کہ جب وہ لاکھوں روپیہ
کارخانوں کی تعمیر اور مشینوں کی خرید میں صرف کرتا ہی۔ تو تعلیم میں جو تمام ترقیوں کا منبع ہے۔
وہ کچھ روپیہ کیوں نہیں لگاتا۔ غالباً جواب دیگا کہ اس سے مجھکو کیا فائدہ۔ اگر یقین دلایئے کہ
پڑھ لکھ کر جب لوگ کمائیں گے تمہارا روپیہ واپس کردینگے تو اس کی ہرگز تشفی نہ ہوگی۔ اور اگر
سمجھایئے کہ قوم ترقی کریگی اور تعلیم پھیلانا بہت ثواب کا کام ہی۔ تو جواب دیگا کہ ثواب کے کام
میں پچاس۔ سو روپیہ سے ہم بھی شریک ہوسکتے ہیں۔ ہزاروں کی رقم خیرات کرنا ہماری
حیثیت نہیں۔ اور تعلیم دلانے سے بھی زیادہ ثواب کے کام ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا
اپاہجوں کی مدد کرنا۔ اول وہ کام کرنے ضروری ہیں۔ البتہ کچھ بچا تو تعلیم میں بھی دیں گے
جو لوگ تعلیمی وظائف کیواسطے چندہ فراہم کرتے ہیں۔ قدم قدم پر یہ جواب ان کے سننے میں
آتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ لوگوں میں بیداری پیدا ہو چلی ہی۔ ہمدردی کا حلقۂ اثر وسیع ہوتا
جاتا ہی۔ تعلیم کی ضرورت اور عام ملکی بہبودی کے فوائد محسوس ہونے لگے۔ چنانچہ نادار و ہونہار
طلبا کو وظیفہ دینے والی انجمنیں جگہ جگہ قایم ہوسکی ہیں۔ گورنمنٹ بھی بحیثیت مربی اپنے

خزانے سے وظیفے دیتی ہے۔ لیکن اگر شبنم سے کنوئیں بھر سکیں تو ان وسائل سے تعلیمی ضروریات بھی پوری ہوجاوینگی۔ ہندوستان کا تو ذکر کیا ہے۔ انگلستان جیسے بیدار اور ترقی یافتہ ملک میں جہاں گورنمنٹ اور قوم کی جانب سے بیشمار روپیہ عوام کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے۔ نادار طلبہ کو تعلیم میں خاص دقتیں پیش آتی ہیں۔ اور وہاں بھی زیادہ تر والدین ہی کو تعلیمی مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جبتک انسان انسان ہے اور ذاتی منفعت کا شوق محبت و ہمدردی کے جذبات پر غالب ہے۔ ممکن نہیں کہ تعلیم و تربیت پر روپیہ ایسی بے تکلفی سے خرچ کیا جاوے جیساکہ پرورش حیوانات و باغات اور تعمیر عمارات و خرید آلات پر۔ اور وجہ صرف وہی ہے جو بیان کی گئی کہ انسان آزاد ہے اور اپنے فعل کا مختار۔ وہ اپنی محنت بمعاوضہ اُجرت فروخت کردیتا ہے۔ مگر خود اپنی ملک رہتا ہے۔ مشین کیطرح وہ محنت خریدنے والے کے ہاتھ خود نہیں بک جاتا۔ اور نہ اسکی محنت پر خریدار کو مشین کے کام کی طرح پورا اقتدار۔ پس جب مزدور اس قدر آزاد اور مختار ٹھہرا تو اسکی تعلیم و تربیت میں منفعت کی غرض سے روپیہ لگانا بعینہٖ ایسا ہے کہ کوئی کسان جس کو زمیندار حسب شرائط پٹہ بلامعاوضہ ہر وقت بیدخل کر سکے۔ اپنے کھیت کی درستی میں لاگت لگاوے۔

مذکورہ بالا خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی تعلیم و تربیت میں سخت دقت پیش آرہی ہے۔ اسکا زیادہ تر دارومدار والدین کی کوشش پر ہے۔ سو بہت سے بچے کم عمری میں والدین کے ظل عاطفت سے محروم ہوجاتے ہیں۔ بہت سے والدین اس قدر نادار ہوتے ہیں کہ تعلیم تو درکنار۔ اولاد کا روٹی کپڑا ہی بارگراں ہوتا ہے۔ بہت سے والدین اس قدر بے مہر اور دولت پرست ہوتے ہیں کہ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر کافی روپیہ صرف کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بہت سے اس قدر کم عقل اور ناعاقبت اندیش ہوتے

ہیں کہ محبت میں اندھے ہو کر اولاد کو بیجا صرف سے ناکارہ اور بد اطوار بنا دیتے ہیں اور جو تھوڑے باقی بچے وہ البتہ دنیا کے حالات سے باخبر۔ اولاد کے سچے بہی خواہ۔ اور روپیہ کے صحیح مصرف سے واقف ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد کو خاص اہتمام سے تعلیم دلاکر اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ دنیا میں عزت و ناموری کی زندگی بسر کر سکیں۔

پر ادھر والدین کی یہ حالت لاچاری و بے اعتدالی۔ ادھر عوام کی وہ بے تعلقی اور عدم توجہی۔ اور اسکا صحیح نتیجہ تعلیم و تربیت کی قلت و خامی۔ کیا معلوم کتنے ذہین۔ طباع اور ہونہار بچے جو قوم ملک بلکہ دنیا کے سرمایہ ناز و افتخار بن سکتے تھے۔ حالات نامساعد کا شکار ہو کر اور اپنی زندگی گمنامی و تلخ کامی میں کاٹ کر۔ خداداد قوتوں اور صلاحیتوں کا بیش بہا خزانہ دل و دماغ میں سے زمین کے نامعلوم تنگ و تاریک غاروں میں پڑے سوتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ میر انیس مرحوم نے اس نامرادی کو کیا خوب بیان فرمایا ہے ؎

کچھ پھول تو دکھلا کے بہار اپنی ہیں جاتے کچھ سوکھ کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے
کچھ گل ہیں کہ پھولے نہیں جامے میں سماتے غنچے بہت ایسے ہیں کہ کھلنے نہیں پاتے

(ب) تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کرنے میں ایک اور بھی امر مانع ہوتا ہے۔ اعلیٰ قابلیت حاصل کرنے کیواسطے بہت سا وقت اور صرف درکار ہے۔ پھر اگر کوشش میں کمی رہجائے یا استعداد ناقص ہو یا حالات نامساعد پیش آجائیں تو وقت اور صرف سب اکارت جاتا ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے بہت سوں کی تو ہمت ہی نہیں بندھتی۔ اور کوشش کرنے والوں میں بھی صرف تھوڑے ایسے تو منزل مقصود تک پہنچتے ہیں اور باقی سب تھک کر منزل بمنزل پڑاؤ ڈالدیتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ اگر خوش قسمتی سے کوئی بصد کوشش بہت سا بیش بہا وقت اور مقدار کثیر صرف کرکے کمال حاصل کرتا ہے اور کسی کام کے قابل بنتا ہے تو اسکی زندگی کا ایک لمحہ اعتبار نہیں۔ خواہ سالہا سال قابلیت سے

فیض پہنچائے۔ فائدہ اُٹھائے۔ خواہ اس کو اچھوتا اپنے ساتھ قبر میں لیجائے۔

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے حسرت اُن غنچوں پہ ہی جو بِن کھلے مرجھا گئے

گویا انسانی تعلیم و تربیت مثل ایک لب دریا کاشت کے ہی کہ جس کے طغیانی سے تباہ ہو جانیکا اندیشہ ہر لحظہ لگا رہتا ہو۔

(ج) محنت کی تیسری خصوصیت یہ ہی کہ وہ مزدور سے جُدا نہیں کیجا سکتی جہاں محنت درکار ہوتی ہی مزدور کا اپنی ذات سے وہاں موجود ہونا لازمی ہے۔ برخلاف اسکے دیگر عاملین پیدائش یعنی زمین و اصل اکثر اپنے مالک سے جدا رہتے ہیں۔ زمیندار کی زمینیں بہت سے گاؤں میں مصروف کاشت رہتی ہیں۔ اور زمین تو غیر منقولہ ہی۔ اصل کو دیکھئے کہ وہ مالک سے جُدا رہکر ہر جگہ کام کر سکتا ہی۔ اُن یورپینوں کا کروڑہا روپیہ قیمتی اصل ہندوستان میں لگا ہوا ہی جنہوں نے سوائے نقشہ کے ہندوستان کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ یہاں یہ جتانا ضروری ہی کہ محنت مزدور سے جُدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن محنت کے اثرات بہت دُور دُور تک پھیل سکتے ہیں۔ مثلاً وزیر ہند۔ انڈیا آفس لندن سے اور وائسرائے دہلی یا شملہ بیٹھے بیٹھے اپنے محنت کا اثر تمام ہندوستان پر پھیلاتے رہتے ہیں۔ اخبارات اور ٹیلی فون انکی تحریر اور تقریر کو بھی ملک کے ہر گوشہ تک پہنچا سکتے ہیں۔ مگر خاص محنت انکی ذات سے وابستہ ہی۔ جسم سے سایہ جُدا ہو سکتا ہی۔ مگر مزدور سے محنت جُدا نہیں ہوتی۔ اس خصوصیت کا اثر محنت کی مقامی نقل و حرکت پر بہت پڑتا ہی۔ کبھی گھر کی محبت کبھی آمد و رفت کی دقت۔ کبھی نئے ممالک کی آب و ہوا کی ناموافقت کبھی زبان و معاشرت کی ناواقفیت کبھی خریدار محنت یعنی آجر کی سخت گیری و تند مزاجی۔ کبھی خود پیشہ کی ناخوشگواری۔ اور اسی قسم کی بہت سی مزاحمتیں نقل محنت میں پیش آتی ہیں اور مزدور وطن چھوڑ کر دور افتادہ مقامات میں اعلیٰ اُجرت حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہی۔

حاصل کلام یہ ہی کہ محنت نہ تو مانند زمین قطعاً غیر منقولہ ہے اور نہ اصل کی مانند سریع الانتقال۔ منقولہ ضرور ہی مگر مزدور کے ساتھ ساتھ۔ اور برخلاف زمین و اصل کے مزدور کی ذات سے جُدا نہیں کیجاسکتی۔ اور یہ خصوصیت محنت کی نقل و حرکت سی سخت مزاحمت کرتی ہی۔

(د) زراعت حسب قوانین قدرت پیدا ہوتی ہے۔ مشین بھی ایک معمول پر چلتی ہی مگر محنت کی حالت جُداگانہ ہی۔ اس میں مزدور کی مرضی کو بھی دخل ہے۔ مزدور اگر چاہے تو باوجود تاکید و نگرانی کام سست کرے۔ بگاڑ دے۔ اور چاہے تو بحالت آزادی کام جلد سے جلد اور عمدہ سے عمدہ کر دکھا دے۔ مزدور کو سرزنش اور جرمانہ کے ذریعہ سے قابو میں لانے کی کوشش کیجاتی ہی۔ ترقی اور انعام کے لالچ سے کام کی ترغیب دیجاتی ہی۔ لیکن فی نفسہ مرضی کا عمل محنت سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ گندم از گندم بروید جو ز جو۔ سنگر مشین ایک سی بخیہ کرتی ہی۔ لیکن وہی درزی ایک ہی کپڑے کا عمدہ سے عمدہ اور خراب سے خراب لباس تراش سکتا ہی۔ گویا محنت مزدور کی مرضی کے تابع ہے چنانچہ مقولہ ہے۔ کہ مزدور خوش دل کند کار بیش۔

(س) محنت پر بھی قدرت نے وقت کی پابندی کئی طرح پر لازم کردی ہی۔ اول تو طوالت عمر کا حال سنئے۔ یورپ کی مردم شماری کے تازہ ترین اعداد سے واضح ہوتا ہی کہ ایک چہارم بچّے چھ سال کی عمر تک ضائع ہو جاتے ہیں۔ ان کو شامل کرکے ۱۶ برس کی عمر تک مرنیوالوں کی تعداد نصف کے قریب ہوتی ہی۔ ایک تہائی ۴۵ اور ۶۵ سال کے درمیان عمر پاتے ہیں اور ۶۵ سال سے تجاوز کرنے والوں کا اوسط صرف ایک فیصدی پڑتا ہی۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اس مختصر عمر کا کتنا حصّہ محنت میں صرف ہوتا ہی۔ ابتدائی چھ سات سال تو بچپن کے کھیل کود کی نذر ہوتے ہیں۔ اسکے بعد تعلیم شروع ہوئی۔ اگر تعلیم

موزوں ہو۔ کوشش کافی کیجائے۔ دیگر حالات بھی مساعد ہوں تو آجکل کم از کم بیس سال۔ اور زیادہ سے زیادہ تیس سال کی عمر تک تکمیل تعلیم و تحصیل فن سے فارغ ہوکر انسان کام کے قابل بنتا ہے۔ مزدور کل تو ہے نہیں کہ رات دن چلے اور تھکنے کا نام نہ لے۔ کھانا۔ پینا۔ سونا۔ سیر۔ تفریح۔ اسکی قیام صحت کے واسطے لازمی ہیں۔ اگر قانون قدرت کی خلاف ورزی کریگا۔ جلد سزا پاوے گا اور پچھتا دیگا۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بالعموم صحت کو مضرت پہنچائے بغیر انسان آٹھ گھنٹے روزانہ سے زیادہ محنت نہیں کرسکتا۔ علیٰ ہذا مزدور متواتر ہر روز تمام سال کام نہیں کرسکتا۔ ہفتہ وار یکروزہ تعطیل اور متفرق تعطیلات کا مجموعہ تین ماہ اور بعض محکموں مثلاً تعلیمات میں چار مہینہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ علالت اور اتفاقی ضروریات کی رخصتوں کا اوسط بھی سال میں ایک مہینہ سے کم نہیں پڑتا۔ مذکورۂ بالا حساب سے کل وقت جو جزاً محنت میں صرف ہوتا ہے سال میں ڈھائی ماہ کی تعداد سے زیادہ نہیں ہوتا بلکہ بعض پیشوں میں اس سے بھی کم۔ بیس پچیس سال کی عمر میں لوگوں نے کام شروع کیا پچاس سال کے بعد سے ضعف پیری کے ہاتھوں جلد ناکارہ بنکر بحالت ملازمت مستحق پنشن قرار پاگئے۔ ورنہ اندوختہ پر بیکاری کی زندگی بسر کرنے لگے۔

غرضکہ اوقات کی مذکورۂ بالا پابندی نے محنت کی مقدار بہت گھٹا دی۔ اور معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ صرفِ محنت کی بیشمار راہیں پیدا ہوگئیں۔ مگر باینہمہ محنت ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور بیکار مزدور متلاشی روزگار نظر آتے ہیں۔ بیکاری کا مسئلہ ہر ملک میں باعث تشویش بنا ہوا ہے۔ اُجرت اور ترقی آبادی کے تحت میں ہم بھی اس سے مزید بحث کرینگے۔

۴۔ سخت محنت خواہ جسمانی یا دماغی بلا اکراہ و تکان دیر تک برداشت کرنا کام

میں سمجھ بوجھ۔ معاملہ فہمی اور ہوشیاری دکھانا۔ غرضکہ طاقت چستی۔ استقلال۔ تندہی اور ہوشیاری جیسے صفات جو عمدہ مزدور کا امتیاز ہوتی ہیں۔ مجموعتہً کارکردگی کہلاتی ہیں۔ مہارت اور کارکردگی دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ جو قابلیت کسی ایک کام سے مخصوص ہو مثلاً جراحی۔ مصوری۔ انجینیری۔ یا درزی کی فیشن ایبل تراش مہارت کہلاتی ہے۔ مگر جو صفات ہر ایک کام کی عمدگی کے واسطے عموماً لازمی ہیں۔ وہ کارکردگی میں شامل ہیں۔

کارکردگی کا کسی قوم کی عام جسمانی و دماغی صحت اور اخلاقی و معاشرتی حالت سے نہایت قریبی تعلق ہے۔ کارکردگی محنت کی جان اور قومی ترقی کی سنگِ بنیاد ہے۔ چنانچہ جاپان کا موجودہ عروج اسی کارکردگی کی تازہ ترین تفسیر ہے۔ اسکی سی آزادی اور خودمختاری آج دنیا میں کتنے ملکوں کو میسر ہے۔ رہی معاشی حالت۔ ہندوستان میں جو مصنوعات خارجہ کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ وہ جرمنی کا جانشین ہوتا جاتا ہے۔ کچھ نہیں تو ۷۰ فیصدی مصنوعات ہندوستان میں جرمنی سے آتے تھے۔ اور اگر آج کسی دوکاندار سے دریافت کیجئے کہ فلاں چیز موجود ہے تو اکثر جواب ملتا ہے کہ جرمنی سے تو آمد بند ہو گئی۔ البتہ جاپان سے ابھی آئی ہے۔ لیکن بعینہ جرمنی کی سی اور قیمت اس سے بھی کم۔ ہمارا باتیں بنانے والا اور کام چور ہندوستان جس نے سودیشی کی منادی سے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔ آج موقع ملنے پر اپنا گھر بار کیوں نہیں سنبھالتا۔ کیوں نہیں مُردہ صنعت و حرفت میں جان ڈالتا۔ کل تک جرمنی کا محتاج تھا۔ کل کو جاپان کا دستنگر ہو جاویگا ہم نہیں کہتے کہ وہ نعوذ باللہ کُن فیکون کر دکھائے۔ مگر یہ اصرار بیجا نہو گا کہ وہ ہاتھ پیر ہلائے۔ پیداوار خام پر نظر ڈالے اور موجودہ علم و آلات سے جو چیزیں تیار

حصہ دوم باب دوم

کر سکے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑی تیار کرے۔ محبّان وطن اور حامیان قوم کے امتحان کے واسطے خدا نے ہندوستان کو یہ موقع دیا ہے تاکہ خلوص و نمائش دلسوزی و خود غرضی۔ نیک نیتی و فتنہ انگیزی۔ کہنے اور کرنے میں پورا پورا فرق ظاہر ہو جاوے۔ معاشی حالت کی اصلاح اور ترقی کا اس سے بہتر موقع دوبارہ ملنا دشوار ہے۔ جبکہ قوی تر مقابلوں سے میدان خالی ہے۔ اگر سُدیشی کے رواج میں دل توڑ کر کوشش کیجاوے تو ممکن ہے کہ بیکاری و افلاس کا تسلط ہندوستان سے اُٹھ جاوے۔ خدا نہ کرے کہ اغیار طعن دیں ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اِک قطرۂ خون نکلا

کارکردگی ۹ ۵۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا حالات خاص طور پر کارکردگی کی ترقی کیواسطے موزوں اور مساعد ہیں۔

(۱) سب سے مقدم آب و ہوا اور موسم کا اثر ہے۔ انتہا درجہ کی گرم اور سرد آب و ہوا اور موسموں کا جلد جلد تبدیل ہونا۔ کارکردگی پر مضر اثر ڈالتا ہے۔ منطقہ حارہ میں سخت محنت خصوصاً جسمانی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیجاسکتی اور محنت کی وہاں ضرورت بھی کم ہے۔ بوجہ کثرت نباتات زمین کی پیداوار سے بلا مشقت غذا حاصل ہو جاتی ہے۔ گرمی میں اتنا کپڑا کافی کہ بدن ڈھک جاوے گھنے درختوں کے ٹھنڈے سایہ سے زیادہ آرام کہاں مل سکتا ہے۔ مختصر چیزیں بسر رکھنے کو ایک جھوپڑا کافی۔ گرم اور خشک ممالک کی زندگی بھی نہایت سادہ ہوتی ہے۔ بوجہ قلت پیداوار۔ وہاں کی ضروریات بھی مایحتاج زندگی سے آگے کم بڑھ سکتی ہیں۔ چنانچہ منطقہ حارہ کی معاشی زندگی ہمیشہ سے ایسی ہی چلی آتی ہے اور غالباً کبھی قابل لحاظ تغیر واقع نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح پر منطقہ باردہ میں بوجہ

شدت سردی وکثرت برف۔ نہ زمین سے پیداوار ہوتی ہے۔ نہ باشندوں کو محنت کا موقع ملتا ہے۔ ہفتوں جھونپڑوں میں بند رہکر خدا جانے جانوروں کے گوشت پر کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہی کہ ریگستان اور برفستان۔ کبھی زراعت۔ صنعت و حرفت۔ تجارت اور دیگر معاشی ترقیات کے مرکز بن سکیں۔ موسم جلد جلد تبدیل ہونا کاہلی کی وجہ سے مضر ہی۔ ہندوستان میں تین موسم ہوتے ہیں۔ کبھی تڑاقے کی گرمی۔ کبھی کڑاکے کا جاڑا۔ اور کبھی موسلا دھار بارش۔ طبیعت ایک موسم کی عادی نہیں ہونے پاتی کہ دوسرے کی پیروی عائد ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے کیطرف متوجہ ہوئی کہ تیسرا موسم آپہنچا۔ غرضکہ تمام سال اسی ردّو بدل میں ختم ہوجاتا ہی۔ طبیعت کو کبھی سکون اور یکرنگی میسر نہیں آتی۔ نتیجہ کمزوری اور اضمحلال ہوتا ہی۔ چنانچہ علاوہ دیگر اسباب کے تغیرات موسم بھی ہندوستانیوں کی آرام طلبی کا باعث خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ تو عام تجربہ ہی کہ تبدیلی موسم کے زمانہ میں کم از کم ہفتہ عشرہ طبیعت کُند اور کسلمند ضرور رہتی ہے۔ اور بارش و سرما کے وسطی زمانہ میں بوجہ گرمی و رطوبت ملیریا اور ہیضہ اکثر مقامات میں بلا ناغہ ہر سال پھیلتا ہی۔ چونکہ طبیعت پورے طور پر عادی نہیں ہوتی۔ ہر موسم کی شدّت سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ جون جولائی میں ہاتھ سے پنکھا اور گلاس نہیں چھوٹتا۔ ہر شخص کسی تاریک کوٹھری میں دن بھر خاموش پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔ صبح کی ٹھنڈ ٹھنڈ میں سب ضروری کام کر لئے جاتے ہیں۔ یا غروب آفتاب کے قریب لوگ باگ گھر سے نکلتے ہیں۔ دوپہر کو شہر بھر میں ہُو کا عالم ہوتا ہی۔ بارش میں سوائے زراعت کے کھُلے میدان کے اکثر کاروبار بند ہو جاتے ہیں۔ آب و ہوا کی خرابی محنت سے مانع ہوتی ہے۔ البتہ جاڑے کے چار مہینے کام کاج کے واسطے نہایت موزوں ہیں۔ اسی موسم میں عدالتیں۔ دفتر۔ اسکول

کالج۔ فیکٹریاں۔ کارخانے۔ منڈیاں اور بازار آباد اور مصروف کار نظر آتے ہیں۔
اس کے برعکس منطقہ معتدل خصوصاً شمالی حصہ کے ممالک میں خوشگوار آب وہوا اور رنگ برنگ موسم بدن کو چست اور طبیعت کو قوی و بشاش رکھتے ہیں۔ نہ پسینہ آئے۔ نہ بدن ٹھٹھرے۔ بہت دیر تک محنت کا تکان محسوس نہیں ہوتا۔ موسمی تغیرات نہ طبیعت پراگندہ کریں۔ نہ محنت میں ہارج ہوں۔ سال بھر کاروبار ایک رفتار پر چلتا ہے پیداوار زمین کی نہ اس قدر کثرت کہ آدمی قناعت کر بیٹھے۔ نہ اس قدر قلت کہ لاچار بن بیٹھے۔ بلکہ اس کی مقدار ایسی مناسب ہوتی ہے کہ عمل پیدائش میں محنت اور اصل کو بھی حصہ لینے کا کافی موقع مل جاتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ منطقہ معتدل کارکردگی کی نشوونما اور معاشی ترقیات کے واسطے نہایت موزوں ہے۔ منطقہ حارہ کمتر اور منطقہ باردہ سب سے کم۔ چنانچہ واقعات اس اصول پر بالاتفاق شاہد ہیں۔

(ب) آب وہوا اور موسم کا اثر کم وبیش تمام ضروریات زندگی پر پڑتا ہے۔ سب سے اول خوراک کو لیجئے کہ وہ زمین سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے پیداوار زمین کی نوعیت بیشتر آب وہوا اور موسم سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کا آم افغانستان میں نہیں پھلتا اور نہ کاشمیر کا سیب دکن میں۔ برار کی عمدہ روئی ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ہوتی۔ جوٹ کی کاشت مشرقی بنگال تک محدود ہے۔ کھجور ریگستان کی نعمت ہے۔ اور ایسا ہی حال تمام نباتات کا ہے۔ ہماری خوراک نباتات سے مرکب ہے اور نباتات کے خواص مختلف۔ بعض میں مادہ نشوونما بہت زیادہ۔ بعض میں متوسط اور بعض میں بہت کم۔ اسی طرح پر بعض مفید اور معاون صحت ہیں اور بعض مضر اور مخرب افغانستان میں میوہ جات کی وہ کثرت کہ کھائے بن نہیں پڑتا۔ اور قریب ہی راجپوتانہ میں جوار باجرہ نعمت عظمیٰ سمجھا جاتا ہے۔ اور ان دونوں غذاؤں کا فرق باشندوں کی حالت

جسمانی سے صاف ظاہر ہے۔ مدراس اور بنگال کی غذا عام طور پر چاول مچھلی ہے۔ یہ دونوں پانی کی مقدار بڑھا کر خون کو رقیق اور اس کی حرارت کو کم کر دیتے ہیں لیکن چونکہ گندھک کا جزو غالب ہی دماغ کو خاص طور پر تقویت پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ بنگالی نہایت ذہین و طبّاع دیکھنے میں بھی جسیم مگر جسمانی محنت سے کمتر مانوس ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے پنجاب کی خوراک گیہوں اور گوشت، دونوں چیزیں خون میں فولادی ذرّات پیدا کر کے حرارت بڑھاتی ہیں۔ جسم کو قوی کرتی ہیں۔ چنانچہ پنجابی لوگ ذہین تو کچھ ایسے نہیں، مگر اکھڑ، غصّیل۔ جفاکش خاص طور پر ہوتے ہیں۔ ترشی اور منشّیات کی کثرت سے دکن میں اکثر لوگ ضعیف و ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ عرب دیکھنے میں کیسے دُبلے پتلے مگر چونکہ اُن کی غذا عموماً گرم خشک ہوتی ہی۔ اُن کے پٹھّے فولاد جیسے مضبوط اور دل شیر جیسے قوی ہوتے ہیں۔ اسکے برعکس سرد تر چیزوں کی کثرت استعمال سے بنیوں کے جسم خمیر کے مانند پھول کر کس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ صحت و قوت کا دار و مدار خاص طور سے خوراک پر ہی اور خوراک مقامی آب و ہوا اور موسم سے مخصوص ہوتی ہی۔ پس آب و ہوا کارکردگی پر بذریعہ خوراک بھی بہت قوی اثر ڈالتی ہی۔ اور کسی ملک میں عمدہ نباتات کی کثرت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔

اس لحاظ سے ہندوستان خاص طور پر خوش قسمت نظر آتا ہے۔ معدودی چند عمدہ نباتات ایسے ہیں جو کم و بیش یہاں پیدا نہ ہوتے ہوں۔ آم۔ امرود۔ اور خربُزہ جیسے لاجواب پھل اس قدر بکثرت پیدا ہوتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی شخص ان سے محروم رہتا ہو۔ واقعہ ہی کہ جو پھل اور میوے فصل کے زمانہ میں یہاں کے غربا بھی جی بھر کر کھا لیتے ہیں۔ اُن کے چکھنے کی تمنا دوسرے ملکوں کے اچھے اچھوں کو مدّتوں بیچین رکھتی ہے۔ ہندوستان کے آموں کی تعریف میں ہم سے ایک تازہ ولایت

حصہ دوم
باب دوم

پروفیسر نے نہایت صاف گوئی سے اعتراف کیا کہ آم تو ولایت میں بھی شیشوں میں بند دیکھے تھے اور اُن کے ذائقے کا دل میں اشتیاق بھی بہت تھا مگر کبھی خریدنے کا موقع نہ ملا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام دنیا کی کاشتکاروں میں ہندوستانی کسان بہترین غذا کھاتا ہے اُس کے دودھ دہی جو چنے کی روٹی اور مکا یا جرے کے مالیدہ کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ اور درحقیقت اگر معدے میں قوت ہاضمہ کافی ہو تو یہ چیزیں قیمتی حلوؤں سے کہیں بڑھکر مقوی بدن ہیں۔ یورپ میں اکثر کاشتکاروں کی مُروجہ غذا اُبلے ہوئے آلو اور پیاز ہے۔ جس کو نمک مرچ ملا کر وہ بہت رغبت سے کھاتے ہیں۔

ریل اور جہازوں نے ہر ایک پیداوار تمام دُنیا پر پھیلا دی ہے۔ گوشت جیسی جلد سڑنے والی چیز کو طرح طرح کے مصالحہ لگا کر اور پھل جیسی گلنے والی چیز کو شہد و شراب میں ڈال کر ہزاروں میل لیجاتے ہیں اور مہینوں رکھکر کھاتے ہیں علم نباتات کے زور سے غیر ملکوں کی چیزیں بھی بوسکتے ہیں۔ چنانچہ ولایت میں گرم ملکوں کے پھل اور ترکاریاں شیشے کے مکانات میں عارضی گرمی کی مدد سے پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر ان ترکیبوں سے قدرتی پیداوار کی سی کثرت کہاں ہوسکتی ہے۔ صرف اُمرا اور دولتمند اپنا اشتیاق پُورا کر لیتے ہیں۔ عوام کو تو خواب و خیال میں بھی وہ چیزیں مُیسّر نہیں آتیں۔

(ج) خوراک کے بعد لباس اور مکان قابلِ غور ہیں۔ سرد ممالک میں ان کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کافی مُیسّر نہ آسکیں، تو بیماری کا اندیشہ قوی ہوجاتا ہے۔ گرم ملک میں کپڑہ صرف بقدر ستر پوشی درکار ہوتا ہے۔ اگر گھنے درختوں کی کثرت ہے تو اُن کے سایہ میں جنت کا لطف آتا ہے ورنہ دھوپ سے بچنے کیلئے جھونپڑے کافی ہیں۔ اُن کو سرد ملک والوں کے برابر محفوظ اور مضبوط مکان کی ضرورت نہیں لیکن اگر موسم معتدل ہو تو لباس و مکان اس قدر لابدنہیں کہ اگر مُیسّر نہ آسکیں تو جان پر آبنے اور صحت تباہ ہوجائے۔ جب بارش

نہیں ہوتی اور سردی نہیں پڑتی تو بہت سے محتاج اور مفلس ہمارے قصبوں اور شہروں کی سڑکوں کے کنارے اور دسرم شالوں مسافرخانوں کے پختہ چبوتروں پر خواب راحت کا وہ لطف اُٹھاتے ہیں جو امرا کو نرم بستروں پر خواب میں بھی میسّر نہیں آسکتا۔ اُن کو نہ بچھونے کی ضرورت نہ اوڑھنے کی وہی ایک کپڑا جو جسم ڈھانکے ہوئے ہے ہر حال میں کافی۔ غریب لوگ بھی مکان اور لباس میں زیادہ صرف کرنے پر مجبور نہیں دھوتی کُرتا اور ٹوپی، وہ بھی اونی نہیں بلکہ سستے گاڑھے مارکین کی۔ ہمارے مزدوروں کا ضروری لباس اور ایک چھوٹا سا چھپّر کا کچّا مکان اُس کی آرامگاہ ہے۔ جوتہ وہ صرف بیاہ شادی یا عید تیوہار کو پہنتا ہے۔ مگر چونکہ محض تکلف ہی راستہ بھر ہاتھ میں لٹکا کر لیچلتا ہے اور صرف منزل مقصود کے قریب اُس کو زیرباری کی تکلیف دینا گوارا کرتا ہے۔ سرد ملکوں کی حالت اس سے مختلف ہے۔ وہاں پر غربا جنکا کوئی ٹھکانا نہیں اپنی بھیک میں سے کم از کم ایک پیسہ بچا لیتے ہیں۔ تاکہ کرایہ دیکر کسی پینی بیڈ میں رات بسر کرسکیں۔ ورنہ شدت سردی سے ٹھٹھر کر مرجانا یقینی ہے۔ اب ان پینی بیڈوں کی کیفیت سُنئے یہ عموماً زمین دوز کوٹھریاں یا تہ خانے ہوتے ہیں جن میں نلوی جیسی کوئی گھانس بچھی ہوتی ہے۔ اکثر میں بخوف سردی ہوا کی آمدورفت کے واسطے کافی دریچے بھی نہیں ہوتے۔ شام کو صدہا غریب ہر ایک پینی بیڈ میں کھچا کھچ بھر جاتے ہیں۔ بوڑھے، بچے، جوان، مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہوتی سب اُسی گھاس پر پال کے آموں کی طرح ایک دوسرے سے اڑکر سورہتے ہیں۔ اور صبح کو پھر منتشر ہوجاتے ہیں۔ خیال کرو کہ ہمارے ملک کے غربا کی رات بمقابلہ ان کے کسقدر راحت سے کٹتی ہے اور اس فرق کا باعث آب وہوا اور موسم نہیں تو کیا ہے۔ اب مزدور کا حال سُنئے کہ تمام جسم کو گرم اونی لباس سے ڈھاکنا اُس کے واسطے لازمی ہے

حصہ دوم
باب دوم

نہ صرف جوتا بلکہ ادنیٰ موزے بھی سردی سے محفوظ رہنے کے واسطے ضروری ہیں مکان بھی اس قدر پختہ ہونا چاہیئے کہ برف باری کا مقابلہ کرسکے اور سرد ہوا کو پورے طور پر روکے۔ غرضکہ لباس و مکان جنکا صحت سے قریبی تعلق ہی آب وہوا اور موسمی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ کہیں وہ لابد ہوتے ہیں اور کہیں راحت کا سامان خیال کیئے جاتے ہیں۔ کہیں اُن پر کمائی کا معقول حصّہ صرف کرنا پڑتا ہے اور کہیں بہت کم۔ لیکن ہر ملک کی ضروریات کے مطابق کافی مکان و لباس ملنا کارکردگی کے واسطے ضروری ہی۔ اگر کمی ہوگی تو صحت کمزور، نشو و نما ادھوری اور کارکردگی ادنیٰ درجے کی ہوجائے گی۔

(د) اُمنگ آزادی اور سیاحت بھی کارکردگی کے لئے ازحد موزوں و موافق ہیں۔ اُمنگ تو تمام ترقی کا منبع ہی۔ آزادی کام کو آسان اور خوشگوار بنا دیتی ہے۔ علم النفس سے ثابت ہی کہ آدمی جو کام شوق سے کرتا ہی اُس میں تکان بہت کم ہوتا ہے۔ چنانچہ تفریح کھیل کود اور مزدوری کے کاموں کا طبیعت پر مختلف اثر ہوتا ہی۔ واقعہ ہے کہ بطور چہل قدمی چار میل جانا اتنا گراں نہیں گزرتا جتنا کہ کسی ضروری کام سے دو میل جانا۔ غلام جو کوڑے کے ڈر سے کام کرے اور آزاد مزدور جو کمائی کے شوق میں جان کھپاتا ہے ان کی کارکردگی میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ رہی سیاحت۔ اس سے اول تو معلومات میں اضافہ، خیالات میں وسعت اور حوصلے میں بلندی پیدا ہوتی ہے، ہر قسم کے حالات آنکھ سے دیکھکر انسان بُرائی بھلائی اور اُن کے اسباب سمجھنے لگتا ہی چنانچہ سفر تعلیم کا لازمی جزو مانا جاتا ہے۔ انسان کتنا ہی کتابی علم حاصل کرلے جب تک سفر کے تجربوں اور مشاہدات سے اپنے علم کی تصدیق اور اصلاح نہیں کرے گا اُس کی تعلیم ناقص

رہیگی اور وہ تالاب کے مینڈھک سے کچھ زیادہ بہتر ہو گا۔

دوسرے ایک عجیب بات یہ ہی کہ وطن میں انسان کی ہمیشہ نسبتہً کم قدر کیجاتی ہی ہندی مثل ہے ''گھر کا جوگی جوگنا اور آن گاؤں کا سادھ،، اسی مضمون کی ضرب المثلیں تقریباً دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ انسان کا عام تجربہ ہے اور کسی ملک و قوم کی خصوصیت نہیں۔ احباب و اعزہ پر قابلیت و کمال کا اثر اور رُعب اتنا نہیں پڑسکتا جتنا کہ اغیار اور ناواقف لوگوں پر۔ چنانچہ بالعموم بڑے بوڑھے ترقی یافتہ نوجوانوں کو جتایا کرتے ہیں کہ اب پڑھ لکھکر قابل بنگئے تو اوروں کے لئے ہماری نظر میں تو وہی ہو جو بچے سے تھے۔ تمہارے بھولے پن اور ناسمجھی کی باتیں سب یاد ہیں۔ دوست احباب کو بھی ترقی و امتیاز کا اثر ناگوار معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی کسی کا قدیم سطح سے بلند ہونا کم از کم اپنے مقابلے میں ناپسند کرتے ہیں۔ ان وجوہات سے قابل آدمی اپنے وطن میں زیادہ نہیں اُبھر سکتا اور غیر جگہ ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہی۔ وکیل طبیب جیسے پیشہ ور جن کو حُسن ظن اور رُعب کی ضرورت ہوتی ہے ہمیشہ وطن سے دُور جاکر کامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر شہر اور قصبے کے معزز پیشہ ور جماعتوں میں سربرآوردہ لوگ اکثر باہر والے ہوتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر وطن میں بھی اُن کو یہی ترقی و امتیاز نصیب ہو سکتا تو احباب و اعزہ کو چھوڑکر دُور کیوں بستے۔ سفر کے متعلق عربی کی مثل ہے ''السفر وسیلہ الظفر و نمونہ السقر،، انقلابات زمانہ سے سفر نے ظفر کے تو صدہا نئے راستے نکال لئے، مگر اب وہ سقر نہیں رہا اور قیام سے بدرجہا پُر لطف و راحت رساں بنگیا۔

ہندوستان میں صدہا برس فرقہ بندی اور مذہبی رسم و رواج نے اُمنگیں اسدرجہ پامال کیں کہ انکے سرچشمے اٹ گئے۔ معاشی آزادی سلب کرتے کرتے۔ انکی خواہش و خیال

دلسے محو کر دیئے۔ ہر ایک کا پیشہ اور اس کی ترقی کا معیار نسلہا نسل کے واسطے مقرر کر دیا کہ اس سے سر مو تجاوز کسی طرح ممکن نہ تھا۔ رہا سفر۔ آجتک پابند مذہب ہندوؤں کو سفر میں بیحد دقتیں پیش آتی ہیں۔ البتہ جو لوگ مذہب کو پس پشت ڈال چکے ہیں انکا ذکر نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت کچھ خداداد استعداد و ذہانت قدیم استبدادی نظام سے ضائع ہوتی رہی۔ البتہ کچھ دنوں سے جو جدید اثرات نے پُرانی بندشیں توڑ ڈالیں۔ تو ادنیٰ طبقوں میں کچھ جان پڑنے لگی ہے۔ ان کو اپنے انسانی حقوق یاد آنے لگے۔ ان کو اپنی استعداد کا پتہ لگتا جاتا ہے۔ آزادی کی ہوا سے ان کے دلمیں بھی ترقی کی پھُریری آگئی۔ ادنیٰ طبقوں کی بیداری نہ صرف خود ان کو فائدہ پہنچائیگی بلکہ اعلیٰ طبقوں کی غیرت و حمیت پر بھی جو بحیں ہوگئی ہے۔ تازیانہ لگا کر خواب خرگوش سے بیدار کریگی اور سب کو شاہراہ ترقی پر لیجلے گی۔

(۴) عام معاشرتی اور اخلاقی حالت کا بھی کارکردگی پر نہایت اہم اثر پڑتا ہے۔ صحبت کا اثر مشہور ہے۔ خربُزہ کو دیکھکر خربُزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اور پھر بچوں کی طبیعت موم جیسی نرم ہوتی ہے۔ جس سانچہ میں چاہو ڈھالدو۔ پس جس فرقہ کا طرز معاشرت ہمت افزا اور جہد پرور ہے وہ لوگ بالعموم بلند خیال عالی حوصلہ اور مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ تجارتی مرکزوں کے مصروف کار اور پس ماندہ قصبوں کے کاہل پسند باشندوں کی حالت کے موازنہ سے معاشرت کا اثر بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ہندوستان کے سکون پسند نووارد کو انگلستان کی ہلچل سب سے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ جسے دیکھو چیونٹی اور شہد کی مکھی کی مانند اپنے کام میں پوری تندہی اور توجہ سے مصروف ہے۔ لمحہ لمحہ جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہفتہ میں ایک روز اتوار کا آرام کے واسطے مخصوص اور اس روز کاروبار قانوناً ممنوع ورنہ کام کے

شوق میں لوگ صحت قربان کر گذرتے۔ ہندوستان میں اس گرمجوشی کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا اور نووارد یوروپین کو یہاں کی سہل انکاری افسردہ دلی اور وقت کی ناقدری کچھ کم عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ اور کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ شہر شہر اور قصبہ قصبہ بہبودی کی اُمنگ اور کاروبار کا شوق پیدا کرنا۔ ہندوستان کی ترقی کا پہلا قدم ہے۔

اخلاق وعادات کا اثر بھی صحت وتندرستی پر نہایت قوی اور دیرپا پڑتا ہے آجکل بدقسمتی سے بہت سے نوجوانوں کی پس ماندگی۔ خستہ حالی۔ اور دائم المریضی کا باعث خود ان کی غلط کاریاں۔ بے اعتدالیاں اور اخلاقی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ نہ معلوم بعض لوگوں کی یہ شکایت کہاں تک درست ہے کہ مشرقی اقوام کو مغلوب اور پس پا کرنے کی غرض سے ترقی یافتہ قومیں قصداً اخلاقی کمزوری کا خوفناک آلہ اپنے مفید مطلب استعمال کر رہی ہیں۔ اور خصوصاً بادہ نوشی وآوارگی کا رواج۔ جو قوموں کو دیمک کی مانند تھوتا کر دیتے ہیں۔ جونک کی مانند خون چوس لیتی ہیں۔ سیاسی پالسی کا جزو بنا ہوا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ یہ عادات ملعونہ شعلہ کیطرح ہمارے ملک میں ہر چہار طرف پھیل رہی ہیں۔ اکثر شہروں کی حالت اخلاقی لحاظ سے تشویش ناک ہو چلی ہے۔ اسکول اور کالجوں کی حالت ابھی تک توغنیمت ہے مگر اثرات بد وہاں بھی راستہ پیدا کر رہے ہیں۔ اور اگر جلد مدافعت وحفاظت کا کافی اہتمام نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ قوم کا بہترین حصہ جسکی ذات سے ملک کی بیشمار اُمیدیں وابستہ ہیں۔ ان موذی اثرات کا شکار ہو کر ہمیشہ کے واسطے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیگا لہذا ہر بہی خواہان ملک کا اوّلین فرض ہے کہ اس آتش جہانسوز کو جلد بجھائیں۔ لوگوں میں نہ صرف اپنی تحریر وتقریر بلکہ اپنے طرز عمل اور

حصہ دوم باب دوم

ذاتی مثال سے اعتدال پسندی۔ پاکبازی۔ بلند خیالی اور جدپسندی کی مستقل عادتیں پیدا کر کے ان کو شاہ راہ ترقی پر لا ڈالیں۔ اگر اخلاق کی نگہداشت نہیں کی گئی تو عادات خبیثہ جن کا طوفان ہر طرف بڑھ رہا ہے دیکھتے دیکھتے اس بدبخت ملک کو زنگ خوردہ لوہے کی مانند از کار رفتہ کر دینگی۔

بداطواری کی ابتدا ہمیشہ نادانی و اشتیاق سے ہوتی ہے۔ بندی کو مضرت کی تو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ دوسروں کی مثال یا ترغیب سے تقلید کا شوق پیدا ہوتا ہے اور چند قدم بڑھتے ہی ایسی دلدل میں جا پھنستا ہے کہ صحیح سالم نکلنا محال ہو جاتا ہے بچے سب سے زیادہ والدین پر اعتماد کرتے ہیں۔ انہی کی بات وہ سب سے زیادہ مانتے ہیں۔ اگر والدین اس معاملہ میں مروجہ مہر سکوت توڑ ڈالیں۔ اور سب سے اول خود عاقلانہ طریقے سے بچوں کو تمام ضروری باتوں سے آگاہ کر کے انکے اچھے بُری نتایج بخوبی ذہن نشین کر دیں۔ تو ممکن نہیں کہ جس طرح بچے کی نرم طبیعت اور باتوں سے متاثر ہوتی ہے۔ اس سے نہو۔ اور اس اثر کا رنگ افعال و عادات پر نہ چڑھے۔ یہ عام خیال صحیح نہیں کہ اس قسم کی آگہی سے بچے بگڑ جاوینگے۔ موزوں وقت پر یعنی قبل رسائی اثرات بد اگر مناسب طور سے صحیح واقفیت بچوں کے ذہن نشین کر دیجائے تو محفوظی کا اس سے زیادہ کارگر کوئی طریق نہیں۔ چنانچہ ایک ماہر تربیت نے والدین کی موجودہ خامشی اور بے التفاتی کو سراسر خلاف عقل و مصلحت قرار دیکر مذکورہ بالا طرز عمل کی بہت تاکید کی ہے اور ہم بھی اس رائے سے پورا اتفاق رکھتے ہیں ؎

چو کاسے بے فضول من بر آید — مرا در وے سخن گفتن نشاید
وگر بینم کہ نابینا و چاہ ست — اگر خاموش بنشینم گناہ ست

(س) اس زمانہ میں ہر قسم کے کام اور پیشوں کے واسطے تعلیم کس قدر ضروری

ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ ہر ایک سمجھدار آدمی خود اندازہ کر سکتا ہے۔ مولانا حالی مرحوم نے علم کی ضرورت کا فوٹو اپنی مشہور نظم میں کس خوبی سے کھینچا ہے ؂

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری
جہاں میں چارسو علم و عمل کی ہے عملداری

جنھیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ انکو
کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنے ذلت و خواری

ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجّاری نہ معماری

جہاں علم تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر
تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری

نہ آئیگی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت
جنھیں پائینگے آقا زیور تعلیم سے عاری

اگر چاہینگے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی
تو دینا ہوگا ان کو امتحانِ علم بیطاری

نہ مستغنی بجاول علم سے ہیں اب نہ باورچی
ہوا ہے مدرسوں سے مطبخوں تک فلسفہ جاری

یقیں جانو کہ آیندہ ملیگی درس گاہوں میں
گر آٹا پیسنے کو چاہئے ہوگی پسنہاری

کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز
نہ فصّادی۔ نہ جرّاحی۔ نہ کحّالی نہ عطّاری

جہاں تک دیکھئے تعلیم کی فرمانروائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہُنر انساں کا اک زیور
ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر

کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا
نہ زرگر اور نہ آہنگر نہ بازی گر نہ سوداگر

مہندس چاہیئے مزدور اب اور راج اُقلیدس
بس اب دنیا میں بے علموں کا ہے اللہ ہی یاور

گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے
برابر تھا بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر

یہ دورہ ہے بنی آدم کی روز افزوں ترقی کا
جو آج اک کام ہے اعلیٰ تو کل ہے اس سے اعلیٰ تر

کوئی دن میں خسارہ سے بڑھ کر اسکو سمجھینگے
کہ دو دن آدمی ٹھہرا رہے یاں ایک حالت پر

نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان و حیواں میں
دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آکر

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دونگا
کہ جو تعلیم سے بھاگینگے نام انکا مٹا دونگا

اب غور کیجئے کہ موجودہ طریق تعلیم کہانتک ہمارے درد کی دوا اور ہماری ضروریات کی کفیل ہے۔ پنجاہ سالہ کوششوں کے پھل کروڑہا روپیہ تعلیمی مصارف کے ماحصل ترقی کے زندہ آثار۔ سرمایۂ ناز و افتخار۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے کمالات پر ذرا نظر دوڑائیے۔ ایک انبوہ کثیر سرگردان و حرماں نصیب سائلوں اور اُمیدواروں کا۔ ایک جم غفیر سپاس گذار و فرماں بردار محرّروں کا۔ ایک روزافزوں گروہ نزاع پرور و جدال پسند وکیلوں کا۔ دو فرقے آزاد کیش و بیباک اور مصلحت اندیش و کرم خواہ مقرّروں کی۔ اور سب سے چھوٹی جماعت خود دار و متانت شعار کارگذاروں کی جو صنعت و حرفت زراعت و تجارت کو ترقی دیکر صحیح اصول کے مطابق ملک کی بہبودی اور مرفہ الحالی کے وسائل پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ مطالبات جیسے چاہو اعلیٰ۔ ہمت جتنی چاہو پست قول بغایت فصیح و بلیغ۔ عمل بنہایت بدسلیقہ و بے ترتیب۔ نہ خیالات میں تمکنت نہ جدوجہد میں استقلال۔ جذبات سریع الاشتعال۔ ارادات۔ سریع الزوال۔ اکثر منصوبے کڑھی کا اُبال۔ بقول حضرت اکبر ؎

ضعف مشرق نے تو رکھا پاؤنکو پھیلا ہی   مغربی فقروں نے لیکن مُنہ کو انجن کر دیا

ہمارے جیسی بے اصول و ناکمل طریق تعلیم سے اور کیا نتائج برآمد ہوسکتے ہیں جسم کے تمام اعضا کو معطل کر کے دماغ مجسم بننے کی کوشش کا نتیجہ، اضمحلال، مرض اور موت کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ کامل صحت اور تندرستی کے واسطے تمام اعضا کا قوی ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح قومی عروج بھی اخلاقی۔ معاشرتی اور بالخصوص معاشی حالت کے عمدگی بغیر محض دماغی ترقی پر قائم نہیں ہوسکتا۔ افراد کیا ہیں۔ جسم قوم کے بیشمار اعضا اور ہر

عضو کا کام جداگانہ مخصوص ہے۔ اگر کسی عضو کو معطل کیا جاوے یا کار مخصوص کے بجائے اس سے دوسرا کام لینے کی کوشش کیجاوے تو ممکن نہیں کہ جسم قوم کی صحت و قوت کو مضرت نہ پہنچے۔ کیسے ممکن ہے کہ تمام لوگ ادیب۔ زبان دان۔ مؤرخ۔ فلسفی۔ مہندس۔ طبیعی۔ یا عالم الٰہیات بنجاویں اور اگر ایسا ہو بھی تو اسکا نتیجہ نظام عالم کی درہمی برہمی نہیں تو اور کیا۔ بہت سے بدقسمت نوجوان اپنا قیمتی وقت اور بہت سا روپیہ مروجہ تعلیم میں ضائع کرکے۔ ناکام و نامراد رہجاتے ہیں۔ لیکن انمیں بہت سے صنعت و حرفت کے واسطے ایسی موزوں طبیعت اور اس قدر وافر استعداد رکھتے ہیں کہ اگر ان کو ٹکنیکل تعلیم (صنعتی تعلیم) میسر آسکتی تو بہت بڑی کامیابی اور نام و نمود حاصل کرتے۔ اور بجائے بار کے سہارا اور بجائے عار کے سرمایۂ افتخار بنجاتے ان لوگوں کی خداداد قابلیتوں کا خون اور انکی بربادی کا گناہ۔ ہمارے ناقص طریق تعلیم کی گردن پر نہیں تو اور کس پر ہے۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ یورپ کا عروج و اقتدار۔ ادنی مزدوروں۔ صناعوں۔ پیشہ وروں اور تاجروں کی کارگزاری کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ طبقے ہیں جو بجا طور سے قومی ریڑھ کی ہڈی کہلاتے ہیں۔ حکومت اور سوسائٹی میں انکا روز افزوں رسوخ و احترام۔ انکی اہمیت کا بین ثبوت ہے لیکن ہمارے طریق تعلیم میں انکی ضروریات کو خدا جانے کیوں اس قدر نظر انداز کیا گیا ہے۔ لبرل تعلیم (غیر صنعتی تعلیم) تو بھلی بری میسر آبھی جاتی ہے لیکن ٹکنیکل تعلیم بیحد نایاب ہے ہم لبرل تعلیم کو غیر ضروری اور غیر مفید نہیں سمجھتے۔ لیکن قومی تعلیم کو اس پر ختم کرنا۔ سخت مہلک خیال کرتے ہیں۔ لہذا جبتک کافی اہتمام نہو جاوے۔ ہم کو تمام تر کوشش اور روپیہ ٹکنیکل تعلیم کے بہم رسانی اور ترویج پر صرف کرنا لازمی ہے۔ تاکہ قومی ترقی کے تمام شعبوں میں ضروری نسبت قایم ہوجاوے۔ اور کوئی ایک بھی کمزوری

اس کی باقی تمام قوتوں کو بیکار نہ کرسکے۔ جس طرح کہ مضبوط زنجیر کے تمام حلقے فرداً فرداً مضبوط ہونے لازمی ہیں۔ قومی قوت کے واسطے بھی ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک تمام فرقوں کا حسب ضرورت خوشحال اور اپنے کاروبار میں ہوشیار ہونا ضروری ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ نام نہاد مروجہ لبرل تعلیم سے ٹکنیکل تعلیم کی ہمارے ملک کو کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اور اسکے اہتمام میں کوشش کرنا ہر ایک خیرخواہ قوم کا فرض ہے۔

ہندوستان میں جیسی کمتر مفید تعلیم مروج ہے۔ ظاہر ہی اور اس پر طرہ یہ کہ وہ بھی روز بروز گراں اور کمیاب ہو رہی ہے۔ فیس میں اضافہ نصاب تعلیم میں ہر سال تبدیلی۔ ہر جماعت میں طلبا کی تعداد مقرر۔ معلموں میں ضروری قابلیت کی قلت تعلیم میں عدم توجہی۔ امتحانات میں سخت گیری۔ بشکل ناکامیابی۔ اخراج۔ ملازمت سے انکار۔ عمر۔ دولت محنت سب برباد۔ خستہ حالی و تلخ کامی ماحصل خود یورپ میں تعلیم خانقاہوں سے پھیلی۔ جاپانیوں نے بھی۔ جھونپڑوں۔ برآمدوں اور سرراہ دکانوں میں تعلیم حاصل کی۔ مگر ہماری تعلیم کے واسطے عالیشان عمارات۔ بیش بہا سامان اور امیرانہ ٹھاٹھ لابد ہیں۔ حضرت اکبر نے ہماری بیش قیمت تعلیم کا کیا نقشہ کھینچا ہے

قومی ترقی کی رادھا پیاری   بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری   چندہ کی تحصیل ہے جاری

ہم کو کالجوں سے زیادہ پرائمری مدارس کی ضرورت ہی۔ تاکہ عوام حرف شناس اور رشد بد ہوکر اپنے سیدھے سادھے کام بطریق احسن سرانجام دیسکیں۔ اور اعلیٰ تعلیم کے واسطے بھی میدان وسیع ہو جاوے۔ زیادہ مصارف کی ضرورت نہیں۔ صرف کوشش اور اہتمام درکار ہے۔ مقامی امداد سے ایسے مدارس بآسانی چل سکتے ہیں۔

مسٹر گوکھلے مرحوم کو جنھوں نے نمائشی اور دلآویز باتوں سے بچکر اپنی تمام عمر مفید تجاویز کی تکمیل میں صرف کی پرائمری تعلیم کا خیال پیدا ہوا تو انھوں نے پرائمری ایجوکیشن بل کا ایک نہایت قابلانہ مسودہ امپریل کونسل میں پیش کیا۔ اور گو ان کا بل رد ہوا اور ہونا تعجب نہیں لیکن اگر زندگی وفا کرتی تو مرحوم کی کوشش کا کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ ضرور نکلتا۔ اور یہ نتیجہ کیا کم ہے کہ عام لوگوں کو پرائمری تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہتمام کا طریقہ مرحوم کی تحریروں اور تقریروں سے ذہن نشین ہوگیا۔ اور نیز بعض بیدار مغز ریاستوں مثل بڑودہ و میسور میں پرائمری تعلیم کا رواج خاص اہتمام سے شروع کردیا گیا۔ اور انشاء اللہ تعالی اسکے نتائج بھی جن سے خوشامدی یا خودغرض لوگ منکر ہیں۔ چند ہی روز میں ظاہر ہوجاوینگے۔

کاش ہمارے لیڈر جو محض سیاسی قیل وقال کو اپنا ورد بنائے ہوئے ہیں دھواں دھار تقریریں اور فلک رس چیزز جن کے دلوں کو محو کئے ہوئے ہیں اس نکتہ پر غور کریں کہ عالیشان عمارت کے واسطے مضبوط بنیاد اور بارآور درخت کے واسطے زرخیز زمین لازمی ہے۔ سیاسی آزادی حریت کے نعرے لگانے سے نہیں ملتی بلکہ علمی ترقی۔ اخلاقی جرات ارادی قوت اور معاشی استحکام شرائط اولی ہیں۔ اور بحالت پابندی و محکومی انکو پورا کرنا ہی نوجوانمردوں کا کام ہے۔ گرما گرم تقریروں سے فوری جذبات جس قدر جی چاہے ابھارئے۔ اجرت تحسین نقد وصول کیجئے۔ مگر عملی کوشش کی تکالیف و محنت برداشت کئے بغیر محض باتوں سے تعلیم نہیں پھیلتی۔ اخلاق درست نہیں ہوتے۔ زراعت صنعت وحرفت اور تجارت ترقی نہیں کرتی۔ جو لوگ نام ونمود کے بجائے ملکی بہبودی کے خواہاں ہیں۔ ان میدانوں میں کمر باندھکر اتریں اور قوم لنگ پا کی دستگیری کریں۔ اسوقت قدر نہو۔ مگر یہی آئندہ نسلیں یقیناً انکی

شکرگذار اور احسانمند ہونگی۔ اور حقیقی محبّان وطن کی مختصر فہرست میں ان کا نام آبِ زر سے لکھا جاویگا۔ تالاب کے کنارے خواہ کتنے اُونچے اور مضبوط ہوں پانی کی سطح بلند کئے جاؤ۔ ایک نہ ایک دن پانی بالآخر اُبل پڑے گا اور اپنا راستہ آپ بنالیگا۔ کام کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ ہر شخص مناسب اور موزوں کام اپنے اپنے ذمے لے کر خموشی اور تندہی سے مصروف ہوجاوے۔ چنانچہ سمجھدار فرقوں کا کچھ دنوں سے یہی طرزِ عمل نظر آتا ہے۔ خدا دوسروں کو بھی توفیق دے۔

حصہ دوم
باب دوم

فصل چہارم

اصل

تجزیہ (۱) اصل و دولت کا فرق (۲) پیدایش اصل کی شرط
(۳) افرادی اصل کے اسباب (۴) اصل کے خواص (۵) اصل کے اقسام

اصل و دولت کا فرق

۱۔ اصل کی پیدایش اور کارگذاری کا مختصر حال عاملان پیدایش کے بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن تھوڑی سی مزید تشریح یہاں بھی ضروری معلوم ہوتی ہے بلحاظ ماہیت اصل و دولت میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ لیکن بلحاظ طریق استعمال ان میں بہت بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز کو ہم عامل پیدایش بنائیں۔ یعنی اسکو اس طرح پر کام میں لائیں۔ کہ اس سے مزید دولت پیدا ہو۔ تو وہ اصطلاحاً اصل کہلاتی ہے۔ اور اگر اسی چیز کو ہم ماحصل پیدایش مانیں اور اس طرح پر صرف کریں کہ بجائے مزید دولت پیدا ہونے کے اس سے ہماری کوئی احتیاج پوری ہو تو وہ دولت کہلائیگی۔ مثلاً رہنے کا مکان دولت ہے۔ لیکن اگر اس میں کوئی کارخانہ چلایا جاوے یا وہ کرایہ پر دیدیا جاوے تو اصل بنجاویگا۔ اسی طرح کرایہ پر چلنے والی گاڑی اصل شمار ہوتی ہے اور سیر و تفریح کی گاڑی دولت۔

لیکن نہ صرف دولت کے وسعت مفہوم کی وجہ سے اصل کا تعین دشوار ہے۔ بلکہ یہ سوال بھی کہ مزید دولت کی پیدائش میں علاوہ زمین و محنت کون چیزیں معاون ہیں۔ فی الحقیقت اس قدر مبہم ہے کہ اسکا کوئی قطعی جواب ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک گروہ نے

تو یہ **تفریط** کی کہ صرف آلات۔ پیداوار خام۔ اور زر نقد کو جو اُجرت میں صرف ہو۔ اصل قرار دیا۔ کیونکہ پیدایش سے انہی تین چیزوں کا نہایت قریبی تعلق ہی۔ دوسرا گروہ افراط پر اس قدر جھکا کہ اس نے دولت اور اصل کو مترادف قرار دے دیا۔ کیونکہ انسان جس قدر چیزیں برتتا ہے وہ برشتہ قریب یا بعید پیدایش دولت میں مدد ضرور دیتی ہیں۔ مثلاً خوراک۔ لباس۔ مکان اور دیگر ضروریات قیام صحت و قوت کے واسطے لازمی ہیں اور صحت و قوت۔ محنت کیواسطے لابد۔ لہذا مذکورۂ بالا چیزیں بھی بالواسطہ پیدایش دولت میں مدد دے کر اصل میں شامل ہیں لیکن تیسرے اعتدال پسند گروہ نے افراط و تفریط دونوں کو ترک کرکے یہ فیصلہ کیا کہ اصل کے معنی کو صرف اُن چیزوں تک محدود کرنا جنکا پیدایش سے قریب ترین تعلق ہے۔ یا اس قدر وسعت دینا کہ تمام دولت داخل ہو جاوے۔ دونوں غلط اصول ہیں۔ گو اصل کا مفہوم اس قدر متحقق اور متعین نہیں ہو سکتا کہ اصل اور غیر اصل دولت کی کوئی مکمل فہرست تیار ہو سکے لیکن جو چیز کہ عرف عام کے مطابق پیدایش دولت میں شریک مانی جاویں ان کو اصل اور باقی کو دولت شمار کرنے کا اصول ہماری عملی ضروریات کے واسطے کافی ہدایت کن ہی۔

اصل و دولت میں ایک فرق یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ اگر کسی چیز کے استعمال سے کچھ آمدنی ہو تو وہ اصل ہے ورنہ دولت۔ لیکن آمدنی کے معنی میں وہی عدم تعین کے وقت پیش آتی ہے۔ اگر آمدنی صرف مادی معاوضہ تک محدود دیکھی جاتی ہے تو اصل کا مفہوم نہایت تنگ ہو جاتا ہی۔ اگر ہر قسم کا معاوضہ شامل کرتے ہیں تو پھر اصل و دولت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس حالت میں بھی بہترین طریق یہی ہے کہ آمدنی سے مُراد وہ کل معاوضے لینے چاہئیں جو عرف عام کے مطابق آمدنی کہلا سکیں اور جن

چیزوں کے استعمال سے ایسی آمدنی حاصل ہو وہ اصل ہیں باقی دولت۔ اصل و دولت کے فرق کی بحث بھی اسی واقع کی مثال ہے کہ جو علوم انسان کے افعال ارادی سے بحث کرتے ہیں انکے اصول کبھی پورے طور پر مقرر اور متعین نہیں ہو سکتے۔ کم و بیش خامی ضرور باقی رہتی ہے۔ اور اخلاقی معاشرتی اور معاشی مسائل پر جو اس قدر اختلاف رائے کی کثرت ہے۔ اس کا باعث یہی عدم تعین ہے۔

گو کوئی قطعی معنی تحقیق نہ ہو سکے لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا اور ہماری ضرورت کے واسطے اتنی معلومات کافی ہے کہ اصل و دولت میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک عامل پیدائش مانا جاتا ہے اور مزید دولت پیدا کرتا ہے۔ دوسرا حاصل پیدائش ہوتا ہے اور ہماری احتیاجات پوری کرتا ہے۔ ایک ہی چیز مختلف اوقات میں حسب طریق استعمال اصل و دولت دونوں ہو سکتی ہے۔

پیدایش اصل کی سرط

۲۔ عاملین پیدایش کے بیان میں یہ تو وضح ہو چکا کہ اصل زمین و محنت کے اتفاق عمل کا نتیجہ ہے۔ گویا اُن سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر جس قدر دولت پیدا ہو۔ کُل صرف کر دیجائے تو کچھ نہ بچیگا اور با وجود اتفاق عمل زمین و محنت اصل پیدا نہ ہو سکے گا اس کی مثال بعینہ یہ ہے کہ بچہ انڈے سے اور انڈا جوڑہ کے اتفاق عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ پس اگر انڈا کھا لیا جائے تو باوجود جوڑہ کے اتفاق عمل کے بچہ پیدا نہ ہو سکے گا گویا جو انڈا کھا لیا جاوے وہ محض دولت ہے اور جس کو سے کر بچہ نکالا جاوے وہ اصل ہے۔ پس ظاہر ہے کہ پس اندازی بغیر اصل کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اور یہ ایسا صریح واقعہ ہے کہ کوئی اس سے ناواقف نہیں۔ آمدنی بچا بچا کر لوگ جائداد خریدتے ہیں۔ کارخانے چلاتے ہیں۔ تجارت کرتے ہیں۔ اگر کل کمائی ضروریات میں صرف کر دیجائے اور کچھ پس انداز نہ ہو تو یہ ایک چیز بھی میسر نہیں آسکتی۔ پس ثابت ہوا کہ زمین اور محنت کا

حصہ دوم باب دوم

اتفاق عمل اصل کا منبع اور پس اندازی پیدائش اصل کی شرط لازمی ہے۔

افزونی اصل کے اسباب

۴۔ اصل کی ماہیت اور پیدائش کا حال بیان کرنے کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ افزونی اصل کے واسطے حالات مساعد کیا ہیں۔ بالفاظ دیگر اصل کیونکر کسی ملک میں بڑھتا ہے۔

(۱) پس انداز کی مقدار آمد و خرچ کے باہمی نسبت سے متعلق ہوتی ہے محض آمد کی زیادتی۔ یا خرچ کی کمی سے جدا گانہ کچھ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ جس شخص کی آمد و خرچ حسب ترتیب ایک ہزار اور نو سو روپیہ ہو۔ وہ صرف سو روپیہ بچا سکتا ہے۔ حالانکہ پانسو روپیہ آمدنی والا تین سو روپیہ کے خرچ سے۔ اپنے سے دوگنے آمدنی والے سے دوگنا پس انداز کرتا ہے۔ آمد و خرچ کے موافق و ناموافق نسبت ہندو اور مسلمانوں کی معاشی حالت کا عام فرق ہے۔ محض بچت کے لالچ سے ضروریات جائز کو بھی نظر انداز کر کے دولت اندوزی زندگی کا مقصد قرار دینا ہرگز پسندیدہ اور قرین عقل نہیں ایسی کفایت شعاری نہ صرف عقلاً و اخلاقاً مذموم ہے بلکہ کارکردگی گھٹا کر معاشی لحاظ سے بھی سخت مضر ہے اور بالآخر خود افزایش اصل میں مارج ہوتی ہے تخفیف مصارف کسی حالت میں قیام و ترقی کارکردگی کی مانع نہ ہونی چاہیئے ورنہ خود مطلب فوت ہونا یقینی ہے لیکن تمام دولت کو محض عشرت پرستی پر لٹانا اس سے کہیں زیادہ معیوب اور قابل اعتراض ہے۔ اعتدال ہر حالت میں بہتر ہے۔ مسلمانوں کو اپنے اخراجات کا احتساب ضروری معلوم ہوتا ہے اس معاشی شعبہ کی مناسب اصلاح اور ترمیم سے وہ بڑے بڑے کام نکال سکتے ہیں ہر قوم کی معاشرت کا معیار کچھ مقرر سا ہوتا ہے۔ اگر کوئی معیار سے بالاتر چڑھے تو امتیاز و وقعت پاتا ہے۔ لیکن اگر اس سے نیچے گرے تو سُبکی اور تحقیر کی نظر سے دیکھا

جاتا ہے بمجبوریِ افلاس اس ذلت کو گوارا کیا جاتا ہے۔ یا مصلحان قوم جن کے اعلیٰ خیالات رواج کے اثر سے بالاتر ہیں۔ عمدہ مثال قائم کرنے کی غرض سے باوجود ہزار استطاعت مروجہ معیار سے نیچے اُتر آتے ہیں۔ مگر عوام میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں کہ وہ نام نہاد ذلت برداشت کرسکیں۔ جبتک دم میں دم ہوتا ہے۔ تباہی کی حدتک رسم و رواج کا ساتھ دیتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے متوسط الحال شریف مسلمانوں کی خستہ حالی کا باعث شادی غمی کی رسومات ہوتی ہیں۔

ہر بیدار طبقہ میں اصلاح رسوم کی خاص کوشش جاری ہے۔ ہندوؤں کی شادی بیاہ میں ناچ آتش بازی اور پھلواری پر ہزاروں روپیہ صرف ہوتا تھا۔ مگر چند روز سے یہ رسم بالکل بند ہو گئی۔ اور چونکہ متمول اور سربرآوردہ لوگوں سے ابتدا ہوئی عوام کو تقلید میں کوئی پس و پیش نہوا۔ اسی طرح پر دکن کی بوہرہ قوم میں نہایت بیش خرچ رسوم جاری تھیں۔ لیکن بمبئی کے ملک التجار اور مشہور کروڑپتی سر آدم جی پیر بھائی مرحوم نے اپنی خاندانی تقریبات میں اُن تمام رسومات کو ترک کرکے غربا کے واسطے ایسی آسانیاں پیدا کردیں کہ جہاں ہزار ہا روپیہ کفایت نہیں کرتا تھا وہاں اب صرف چند روپے سے کام بنجاتا ہے۔ اصلاح رسوم سے مرحوم نے جو اپنی قوم کو فائدہ پہنچا اسکا تخمینہ کروڑہا روپیہ سے بھی کرنا مشکل ہے۔

قصہ مختصر افزونی اصل کی پہلی شرط یہ ہے کہ جہانتک ہوسکے مقدار پیداوار بڑھائی جاوے اور مصارف حد مناسب کے اندر رکھی جائیں۔ افزایش پیداوار کے وسائل تو بکثرت اس کتاب میں موقع بموقع مذکور ہیں اور تحدید مصارف کی ترکیب درستئ معاشرت اور اصلاح رسومات ہی ہے۔

(ب) اضافہ اصل کی دوسری شرط امن و محفوظی ہے۔ پس انداز کرنیوالے کو

حصہ دوم
باب دوم

یہ اطمینان ہونا ضروری ہے کہ اسکا اندوختہ اس سے بالجبر نہیں چھینا جاوے گا۔ وہ اسکا مالک رہیگا اور حسب دلخواہ اس سے کام لے سکیگا۔ بدامنی کے زمانہ میں ہر ایک کا عملدرآمد یہی ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے کہ "ہرچہ داری بخور امروز غم فردا مخور" برعکس اسکے جن ملکوں میں امن وامان کا تسلط ہے وہاں مستقبل بعید کے واسطے بھی اہتمام مد نظر رہتا ہے۔ اسی طرح پر سپاہی اور ملاح جنکا پیشہ ہی جانبازی ہے فضولخرچی کیواسطے ضرب المثل ہیں۔ اور جو لوگ غیر مخدوش کاموں میں مصروف ہیں بالعموم کچھ پس انداز ضرور کرتے رہتے ہیں۔ یہ واقعہ فطرت انسانی پر مبنی ہے۔ اور ہر جگہ اسکی مثال موجود ہے چنانچہ انگلستان میں موجودہ کثرت اصل کا بڑا باعث یہ بھی ہے کہ وہاں صدہا برس سے اندرون ملک کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ اور چونکہ بہت قدیم زمانہ سے کم وبیش آئینی حکومت چلی آتی ہے لوگوں کا اندوختہ شاہی دست بردسے بھی محفوظ رہا۔ سرمایہ چھننے کا خدشہ لوگوں کے دل سے قطعاً محو ہوگیا۔ اور اطمینان کی بدولت اصل میں دن دوگنا رات چوگنا اضافہ ہونے لگا۔ حتیٰ کہ آج انگلستان کا اصل دنیا پر محیط نظر آتا ہے۔

انسان بالطبع امتیاز کا شایق ہے۔ اور ہر ملک وقوم میں وسائل امتیاز مختلف پائے جاتے ہیں کہیں جرات۔ بہادری اور جسمانی طاقت کا دور دورہ ہے۔ مثلاً عرب۔ ٹرکی اور افغانستان یا روہیلکھنڈ اور پنجاب میں کہیں علم کا جھنڈا لہلہا رہا ہے۔ جیسے جرمنی۔ فرانس۔ امریکہ اور انگلستان یا بنگال میں اور کہیں دولت کا سکہ رواں ہے جیسے یورپ امریکہ۔ بمبئی۔ یا من حیث القوم یہودیوں۔ مارواڑیوں اور بوہروں میں لیکن بالعموم ترقی واستحکام امن وامان کا خاصہ ہے کہ امتیاز اول الذکر کے مقابلہ میں آخر الذکر کا اشتہا قوی کرتا ہے۔ یورپ وامریکہ میں تو تجارت کے اقتدار کا ذکر کیا ہے۔ خود ہندوستان میں

اس طبقہ کا رسوخ ہر طرف بکثرت پھیل رہا ہے۔ اہل قلم و اہل عَلَم جو ابتک تجارت کو بنیوں کا ادنیٰ کام خیال کرتے تھے۔ اب اسکے روزافزوں اقتدار سے چونک کر حیران و ششدر نظر آتے ہیں۔ میونسپلٹی سے لیکر امپریل کونسل تک تمام نیابتی انجمنوں میں قومی جلسوں و کانفرنسوں میں ملکی بہبودی کے تمام منصوبوں اور تجاویز میں۔ عام اور سرکاری حلقوں میں غرضکہ ہر طرف دولت کا رسوخ پیش پیش اور غالب نظر آتا ہے۔ ایسے حالات بھی جو امن و امان کے آفرید ہیں اضافہ اصل کے بیحد معاون ہیں۔

(ج) اصل سے کام لینے اور فائدہ اُٹھانے میں جو آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں انکا اثر بھی اضافہ اصل پر قابل لحاظ پڑ رہا ہے۔ گو دفینہ بھی اڑے وقت کام آتا ہے اور اسکی یہی صفت پس اندازی کے واسطے کافی سفارش ہے۔ لیکن اگر اندوختہ سے کچھ فائدہ بھی حاصل ہو سکے تو کیا اچھا ہو۔ مصرع چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار۔ اس زمانہ میں ہر شخص کارخانوں اور تجارت کے بکھیڑوں میں پڑے بغیر بذریعہ شراکت اصل اپنے اندوختہ سے بلا دقت و اندیشہ کافی نفع اُٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ ریلوں۔ بنکوں اور کمپنیوں کے حصے خرید کر۔ اندوختہ سے فائدہ اُٹھانے کا عام رواج ہو چلا ہے۔ غریب مزدوری پیشہ لوگ بھی چند روپے سیونگ بنک میں جمع کر کے نہ صرف اندوختہ کی نگہداشت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ بلکہ بموجب قواعد کچھ سود کا نفع بھی پاتے ہیں۔ سیونگ بنکوں کی روزافزوں ترقی سے ثابت ہے کہ پس اندازی کی عادت غربا او۔ مزدوروں میں بھی پیدا ہو رہی ہے

(د) انسانوں کے فطری خواص کو بھی افزونی اصل میں بہت بڑا دخل ہے۔ پس اندازی کی طاقت قوت متخیلہ اور قوت ارادی پر منحصر ہے۔ نہ صرف مستقبل قریب بلکہ بعید کی احتیاجات کا پورا پورا اندازہ کرنا اور انکی بہمرسانی کے واسطے موجودہ احتیاجات میں ترمیم کر کے پس انداز کرنا یہ دو قوتیں سب میں یکساں نہیں پائی جاتیں۔ بعض لوگ جو

کوتہ بیں کہلاتے ہیں مستقبل کو صاف طور پر دیکھنے سے فطرتاً معذور رہوتے ہیں۔ حاضر کے سوا ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ بعض لوگ دُور بیں تو ہوتے ہیں لیکن انکی قوت ارادی اسقدر قوی نہیں ہوتی کہ موجودہ احتیاجات کی جو بوجہ قرب زیادہ دلکش ہوتی ہیں اصلاح کرکے کچھ بچا سکیں۔ اس کمزوری کے اسباب اخلاقی لحاظ سے اچھے بُرے دونوں قسم کے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً تن پروری۔ عیش پرستی۔ یا سخاوت و فیاضی۔ لیکن معاشی طور پر افزایش اصل میں اس سے رُکاوٹ ضرور پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی دُور بین مگر کمزور قوت ارادی والوں پر غالب مرحوم کا شعر صادق آتا ہے ؎

قرض کی پیتے تھے مے پر جانتے تھے ہم کہ ہاں رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پس اندازی کی مذکورۂ بالا طاقت کے محرک ذاتی اغراض اس قدر نہیں ہوسکتے جتنا کہ اولاد کی محبت یا ترقی یافتہ ممالک میں قوم پرستی معاشی دنیا میں جن لوگوں نے جھنڈے گاڑے ہیں اور جنکا آج ڈنکا بج رہا ہے انھوں نے ملک اور قوم کی ترقی و اقتدار کی خاطر یہ سب کچھ کارگذاریاں دکھائی ہیں۔ محض اپنی زندگی کے واسطے وہ اسقدر جدوجہد ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ہر کوئی صاحب اولاد اپنے دل سے دریافت کرسکتا ہے کہ پس انداز کرنے کی بڑی غرض اولاد کی مستقبل بہبودی ہوتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قوت متخیلہ اور قوت ارادی طاقت پس اندازی کے دست و پا اور دوسروں کی محبت و خیر طلبی اسکی زبردست محرک ہوتی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ معاشرتی اور معاشی حالات ان خواص کو قوی او رضعیف کردیتے ہیں۔ لیکن بایںہمہ انکا جداگانہ اثر قابل لحاظ ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ پیدایش اصل کے واسطے زمین و محنت کا اتفاق عمل لابد اور پس اندازی شرط لازمی ہے۔ پس اندازی کی مقدار آمد و خرچ کی باہمی نسبت۔ مُلکی امن و امان۔ حصول منفعت کے آسانی اور فطری خواص سے کم و بیش متعلق ہے۔

حصہ دوم
باب دوم

اصل کے
خواص

۴ (۱) یوں تو ہر چیز حتیٰ کہ کرۂ ارض کی بھی ایک حد ہے۔ لیکن اصل کی مقدار اس معنے میں محدود اور معین نہیں کہلائی جاسکتی جس معنے میں زمین کہلاتی ہے کہ اسکی مقدار بڑھ ہی نہ سکے۔ اصل میں اضافہ کی بہت گنجایش ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ اصل کی مقدار بہ نسبت سابق صدہا گنی ہو گئی ہے اور برابر بڑھ رہی ہے۔

(ب) زمین کی قوت پیدایش قدرت نے معین کر دی ہے۔ محنت بھی ایک حد تک قوانین قدرت کی پابند ہے۔ کچھ عرصہ میں تھک کر انسان کام چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اصل سب سے زیادہ آزاد ہے اور اسکی قوت پیدایش بھی دوسرے عاملوں سے زیادہ ہے۔ اصل سے شب و روز سالہا سال بلا روک عمل پیدایش جاری رکھا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ فرسودہ ہو کر بیکار ہو جاوے۔ سو یہ عجب نہیں۔ خود دنیا فانی ہے۔

(ج) زمین تو قطعاً غیر منقولہ جسکی وجہ سے اسکی قدر و قیمت میں حسب موقع زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ محنت منقولہ مگر مزدور کی ذات سے لاینفک۔ نتیجہ یہ شرح مزدوری میں اختلاف۔ لیکن اصل پانی کی مانند سیال۔ جہاں ضرورت ہوئی کھٹ سے جا پہنچا۔ شرح سود میں کوئی قابل لحاظ فرق ممکن نہیں۔ یہ جو کمپنیوں اور بنکوں کی شرح سود میں تین فیصدی سے لیکر عموماً دس بارہ فیصدی تک اختلاف پایا جاتا ہے۔ محض سطحی دھوکا ہے۔ اسکی اصلیت تقسیم دولت کے بیان میں واضح کیجاویگی۔

۵۔ علماء معیشت نے یوں تو کئی اصول پر اصل کی مختلف قسمیں قرار دی ہیں لیکن اُن سب میں مِل کی تقسیم خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ مِل نے دو قسمیں قرار دیں۔ اصل دائر و اصل قایم۔ جو اصل عمل پیدایش میں اول ہی مرتبہ اپنا کام پورا کرے وہ اصل دائر کہلاتا ہے۔ مثلاً پیداوار خام۔ تیل۔ کوئلہ۔ اور اُجرت جو مصنوعات کے بنانے میں صرف ہو۔ اور جو اصل عمل پیدایش میں عرصہ تک اپنا کام سر انجام دیتا ہے

وہ اصل قایم کہلاتا ہے مثلاً انجن مشین - آلات - اور عمارت کارخانہ - جو ایک مرتبہ مہیا ہونے پر عرصہ تک مصنوعات کی پیدایش میں مدد دیتے رہتے ہیں -

اصل دائر و قایم کی تفریق میں ایک خاص اہمیت مضمر ہے - جسکو ہم مختصراً واضح کئے دیتے ہیں - فرض کرو جوتہ کی دو فیکٹریاں ہیں - ایک میں نسبتاً اصل دائر کی مقدار بہت زیادہ ہے - دوسرے میں اصل قائم کی - اب اگر جوتہ کی تجارت سرد ہوکر مقدار منافع بہت گھٹجاوے تو فیکٹری اوّل الذکر اس سرد بازاری کی متحمل نہو سکے گی اور غالباً کاروبار بند کرنے پر مجبور ہوگی - لیکن فیکٹری آخر الذکر ان حالات نامساعد میں بھی کام جاری رکھ سکے گی اور ایسا کرنا بالکل غیر مفید بھی نہوگا - وجہ غور کرنے سے سمجھ میں آسکتی ہے - اصل دائر تو جلد جلد گرہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے - اور جب نقصان کا اندیشہ صریح ہو - تو بھلا کون اپنا روپیہ خطرہ میں ڈالے گا - لیکن اصل قایم میں ایک مرتبہ روپیہ لگتا ہے اور مدّتوں وہ اصل کام دیتا ہے - جب ایسا اصل موجود ہو تو اسکو بیکار ڈالنے سے کیا فائدہ - اگر تھوڑے مصارف نقد یعنی اصل دائر پر بھی کچھ منافع ملتا رہے - تو اصل قایم کا منافع نظر انداز کرکے - کاروبار جاری رکھنا بہتر ہوگا - مثل مشہور ہے - بیکاری سے بیگار بھلی - علاوہ ازیں ایسے زمانہ میں جبکہ دوسری مقابل فیکٹریاں بند ہوں - کاروبار سے حیثیت اور ساکھ بڑھنے کی اُمید ہو سکتی ہے اور اسی دوران میں جبکہ میدان خالی ہو عمدہ تجارتی تعلقات پیدا کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے - اگر دونوں فیکٹریوں کی اصل دائر و قایم کی مقدار حسب ترتیب دس ہزار و چار ہزار و چار ہزار و دس ہزار ہے - کم سے کم قابل لحاظ شرح منافع ۲ فیصدی ہو تو دونوں فیکٹریاں کم از کم اصل دائر پر بشرح مذکور حسب ترتیب دو سو روپیہ - اور اسی روپیہ منافع تک - بحالت مجبوری کام جاری رکھ سکتی ہیں - گویا بمقابلہ فیکٹری اول فیکٹری دوم کمتر مقدار منافع پر کام کرنے کی قوت رکھتی ہے - لیکن ظاہر ہے کہ دوسری بھی عرصہ دراز تک

ان ناموافق شرائط پر کام نہیں چلا سکتی۔ البتہ دو چار مہینے کی عارضی کسا و بازاری
حس استقلال سے وہ برداشت کر سکتی ہے۔ اوّل الذکر فیکٹری نہیں کر سکتی۔
اصل کی مذکورۂ بالا تقسیم سے معاشی مباحث میں اور بھی جابجا کام لیا گیا ہے
جس کی حسب موقع ہم آیندہ تشریح کرینگے۔

حصہ دوم

باب سوم

باب سوم

طریق پیدایش

تجزیہ (۱) اصول تقسیم عمل کی تشریح (۲) تقسیم عمل کے فوائد (۳) تقسیم عمل کی مضرت (۴) مشین کا رواج (۵) مشین کے فوائد (۶) مشین کا اثر مزدوروں پر (۷) پیدایش بر پیمانہ صغیر و کبیر (۸) پیدایش بر پیمانہ کبیر کے فوائد (۹) کفایات داخلی و خارجی (۱۰) قوانین تکثیر حاصل و استقرار حاصل (۱۱) تحقیر صنائع (۱۲) صنائع تصمیمی و تضمنی (۱۳) کمپنیاں (۱۴) آجر و مستاجر اور تخمین و مخمن۔

اصول تقسیم عمل کی تشریح

۱۔ اصول تقسیم عمل کوئی جدید تحقیق نہیں۔ ہزارہا سال سے انسان کا اس پر عملدرآمد چلا آتا ہے۔ وحشی قوموں میں بھی اسکا برابر رواج ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ تہذیب و ترقی کی بدولت اس اصول کا دائرہ عمل نہایت وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس اصول کا اثر اول اول پیشوں پر پڑا جبکہ کھیتی کرنا۔ کپڑا بننا۔ جوتہ سینا۔ اور ایسے ہی لابد کام مختلف لوگوں نے جداگانہ اپنے اپنے ذمہ لے لئے اور کسان۔ جولاہے۔ موچی جیسے قدیم فرقوں کی بنا پڑی۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا تقسیم عمل کا رواج بھی پھیلتا گیا۔ پیشوں کی تفریق کے بعد ہر پیشہ کے کام میں تقسیم شروع ہوئی۔ اور اس طرح پر کام سے کام نکلنے لگے جیسے کہ پیاز کی گنٹھی میں پرت کے نیچے پرت نکلتے ہیں۔ کام کی اتنی مختصر اور بیشمار قسمیں ہوگئیں گویا کہ عمل پیدایش کا عالیشان پہاڑ کٹتے کٹتے محض سنگریزوں کا انبار بنگیا۔

کپڑا یا جوتا سینا جیسا سادہ کام دس۔ دس۔ بارہ۔ بارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کام کا ہر جزو۔ مقررہ لوگوں کے سپرد ہوتا ہے اور سوائے جزو مخصوص کے وہ کسی دوسرے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے۔

کسی ایک چیز پر اپنی تمامتر توجہ اور محنت صرف کرنا تاکہ کمال حاصل ہو اصول تخصیص کہلاتا ہے۔ اور اس طریقے سے کمال حاصل کرنے والے اپنے کام کے ماہر کہلاتے ہیں۔ اور ہر ایک ماہر کی رائے اور مشورہ اس کے کام کے متعلق مستند اور قابل ترجیح مانا جاتا ہے۔ اصول تخصیص کا علم تو اور قوموں کو بھی مدت سے تھا۔ چنانچہ یک در گیر و محکم گیر اور اسی مضمون کی ہدایات دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں مگر کبھی اس اصول پر اس قدر اہتمام سے عملدرآمد نہیں کیا گیا جیسا کہ کچھ عرصہ سے یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے ہمارے ملک کے ہونہار دل و دماغ سے بھی بحر العلوم و عقل کل ہونے کا خبط جلد رفع ہونا چاہیئے مصرع ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ اپنی خداداد استعداد اور قوتوں کا صحیح اندازہ کرکے ہر شخص کو موزوں اور مناسب کام منتخب کرکے اسمیں کمال حاصل کرنا چاہیئے۔ تاکہ کوشش کا کوئی خاص نتیجہ نکلے۔ یہ کیا کہ موزوں اور ناموزوں سب کاموں میں دخل دینا اور باہمہ در دسری ادھورے رہجانا۔ وکالت۔ ڈاکٹری انجینیری جیسے اعلیٰ مخصوص کاموں میں تو رائے زنی کی جرأت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ فوراً قلعی کھلجانے کا اندیشہ ہی۔ لیکن آجکل بالعموم تعلیم یافتہ نوجوان اور خصوصاً لیڈر صاحبان۔ علاوہ سیاست دینیات۔ تعلیمات۔ اور معیشت کے بھی اپنے آپ کو پیدایشی عالم اور ماہر سمجھتے ہیں۔ اور نہایت دلیری و بے دردی سے قوم کو اپنی نادانی کا تختہ مشق بناکر پریشان و خستہ حال کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ انمیں سے ہر ایک شعبہ بذات خود

حصہ دوم باب سوم

اس قدر وسیع اور تحقیق طلب ہو کہ اگر کسی ایک میں بھی انسان کما حقہ دستگاہ حاصل کرلے تو اس کی کامیابی قابل آفریں ہے۔ اور وہ اپنے ہی مخصوص حلقہ میں کوشش کرکے قوم کو بیش بہا فوائد پہنچا سکتا ہے۔ یہی طریقہ ہے جس پر تمام مہذب اور بیدار قومیں کام کر رہی ہیں۔ کاش ہمارے ملک کو بھی اصول تخصیص سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق نصیب ہو۔

تقسیم عمل کے فوائد

(۱) عمل پیدایش کی اعلیٰ تنظیم کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شخص سے پورا پورا کام اور صرف وہی کام لیا جاوے جس کے واسطے وہ موزوں ہے۔ کسی کام کے کل حصّے یکساں نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض نسبتاً دشوار اور بعض آسان ہوتے ہیں۔ اگر ایسا کل کام کمزور آدمی سے لیا جاوے تو یقیناً خراب ہو جاوے گا۔ اور اگر قوی آدمی سے کرایا جاوے تو آسان حصّوں کے کرنے میں اسکا وقت ضائع ہو گا۔ اسلئے بہترین طریقہ یہ ہو کہ ہر کام کے دشوار اور آسان حصّے جدا جدا کر دیئے جاویں۔ اور ہر مزدور کے مناسب حال کام اسکے سپرد کیا جاوے۔ چنانچہ اس طریق سے جو پیشے ابتک محض مردوں سے مخصوص تھے عورتیں اور بچے بھی اب ان میں ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ کام بھی عمدہ ہوتا ہے۔ اور محنت بھی ضائع نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں جو کام بحیثیت مجموعی نہایت دقیق اور پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اور جسے کرنے کے واسطے بہت سمجھ درکار ہوتی ہے۔ جب چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو ہر حصّہ جداگانہ اس قدر سہل ہو جاتا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی بلا تکلف اس کو کر سکتا ہے۔ غرضکہ تقسیم عمل کا اول نتیجہ یہ ہے کہ کام آسان ہو کر کفایت کے ساتھ عمدہ طور پر سرانجام پا سکتا ہے۔

(ب) یہاں یہ نکتہ ظاہر کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہو گا کہ تقسیم عمل آجر اور مزدور دونوں کے واسطے حسب ترتیب بلحاظ کفایت مصارف و اضافہ اجرت مفید ہے۔

مثلاً کسی گھر میں ایک مرد، چار لڑکے ۰ وعورتیں اور تین لڑکیاں ہیں۔ اگر گرد و نواح میں سرف طاقت طلب کام ملتا ہے تو عالبًا دس آدمیوں کے کنبے کا گزارا ایک مرد کی کمائی پر ہو گا کیونکہ بموجب حالت مفروضہ سہل کام لڑکے، عورتوں اور لڑکیوں کے کرنیکے قابل نایاب ہی۔ اور آجر خواہ کتنی زیادہ اجرت دے بسر اوقات فراغت سے نہو سکے گی۔ لیکن اگر وہی دشوار کام بہت سے حصّوں میں تقسیم کرکے بعض کام عورتوں اور بچوں کے قابل آسان نکال لئے جاویں تو گھر کے اکثر لوگ کام سے لگجاویں۔ اور اگر مرد کی شرح اجرت بہ نسبت سابق کم کر دیجاوے اور عورتوں بچوں کو مرد سے بھی کمتر اجرت دیجاوے تو کام بھی مقدار اور عمدگی میں پہلے سے کم نہو گا۔ آخر کو تکل اجرت کم صرف کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی اسکے مزدور کے گھر کی مجموعی آمدنی بہ نسبت سابق کہیں زیادہ ہو جاوے گی۔ مصرع چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار۔ البتہ اس نتیجہ کے واسطے یہ شرط لازمی ہے کہ کام کی مقدار اسقدر ہو کہ سب لوگ پورے طور پر مصروف رکھے جاسکیں۔ اگر کام کی مقدار قلیل ہے تو ایک آدمی کا کام چند سے لینا سراسر فضول ہے۔

(ج) تجربہ شاہد ہے کہ مشق سے کمال حاصل ہوتا ہے۔ اول اول جب ہم گھوڑے یا بائیسکل پر چڑھتے ہیں تو کس قدر خوف معلوم ہوتا ہے اور گر گر پڑنا لازمی سا ہوتا ہے لیکن اسی مشق کی بدولت سرکسوں میں لوگ گھوڑوں اور بائیسکلوں پر وہ کرتب دکھلاتے ہیں کہ کرامات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی مشق کی بدولت درزی کیسے موزوں اور ٹھیک کپڑے تراشتا ہی۔ اور مصور کیسی تصویر بناتا ہے کہ جان ڈالنی باقی رہجاتی ہے۔ دماغی کاموں کا بھی یہی حال ہے۔ اول اول وکیل و طبیب کو بہت غور و خوض اور ورق گردانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کچھ تجربہ کے بعد دماغ اسقدر مشاق ہو جاتا ہے

حصہ دوم
باب سوم

کہ تشخیص مرض یا مشورہ قانونی میں بہت کم اہتمام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔پس
جب مدت تک آدمی ایک ہی چھوٹے سے کام کو بیشمار مرتبہ دُہراتا رہیگا تو اسکو جو کمال
حاصل ہوگا ظاہر ہے۔چنانچہ ادنیٰ اور اعلیٰ کارخانوں کا عام فرق تقسیم عمل کی قلت و
کثرت ہوتی ہے۔عام دو کانوں پر عموماً ایک ہی درزی کپڑے تراشتا اور سیتا ہے
لیکن اسکوئتہ اینڈ ارڈیا باڈہم پائل جیسے اعلیٰ سلائی کے کارخانوں میں لباس
کے مختلف چیزیں بلکہ ایک ہی چیز کے مختلف اجزا تک تراشنے والے اور سینے والے
جدا جدا ہوتے ہیں۔بالعموم ایک کپڑے کی تیاری میں کچھ نہیں تو پانچ سات کاریگروں کا
ہاتھ لگتا ہے۔اور نتیجہ ظاہر ہے۔

(د) جب کوئی شخص متواتر ایک ہی کام دُہراتا رہتا ہے۔تو بصورت دیگر جو وقت
کام بدلنے میں ضائع ہوتا وہ بچ رہتا ہے۔اور کام کی مجموعی مقدار بڑھ جاتی ہے خصوصاً
بڑے بڑے کاموں میں اس وقت کی کفایت کا اثر بہت نمایاں ہوتا ہے۔

تقسیم عمل کے فوائد کا کچھ اندازہ ذیل کی مثال سے ہوسکیگا۔آڈم اسمتہ اپنے
زمانہ کے آلپن سازی کے کارخانہ کا چشم دید حال لکھتا ہے کہ جو آلپن بلا مشق ایک بھی
دن بھر میں بمشکل تیار ہوسکتی ہے تقسیم عمل کی بدولت حیرت انگیز سہولت اور سرعت
سے بنائی جاتی ہیں۔انکے بنانے کا طریق یہ ہے کہ ایک شخص تار کھینچتا ہے۔دوسرا
اسکو سیدھا کرتا ہے تیسرا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتا ہے۔چوتھا نوک نکالتا ہے۔پانچواں
ٹوپی بٹھانے کو دوسرا سرا موزوں کرتا ہے۔تین چار مسلسل ترکیبوں سے ٹوپی تیار
ہوتی ہے ٹوپی جمانا۔آلپن نکھارنا۔اور انکو کاغذ میں ترتیب سے لگانا سب جُدا جُدا
کام ہیں۔گویا کہ آلپن سازی کا طریقہ تقریباً اٹھارہ کاموں میں تقسیم کردیا گیا ہے
جس کارخانہ کا آڈم اسمتہ نے حال لکھا ہے وہ نہایت ادنیٰ درجے کا تھا۔لیکن تقسیم عمل کے

حصہ دوم باب سوم

۔ور سے دس آدمی دن بھر میں تقریباً اڑتالیس ہزار آلپین بنا ڈالتے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تخمیناً چالیس پیشے گھڑی سازی سے اور سنوا سے زیادہ کپڑے کی تیاری سے متعلق ہیں۔

لیکن ہم پہلے ہی جتا چکے ہیں کہ تقسیم عمل مفید ہونے کے واسطے شرط لازمی یہ ہے کہ کام کی اس قدر کثرت ہو کہ سب لوگ برابر مصروف رہ سکیں۔ جس قدر کام کی قلت ہو گی یہ طریق غیر مفید اور ناقابل عمل ثابت ہو گا۔

تقسیم عمل کی مضرت

۳۔ تقسیم عمل میں جو سب سے بڑا نقص نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مزدور کی واقفیت اور مہارت نہایت مختصر اور محدود ہو جاتی ہے۔ اور فی نفسہ یہ ایک ناپسندیدہ حالت ہے۔ اسکے دو جواب ہیں۔ اول تو مہارت میں جو کمال پیدا ہو رہا ہے اور جو محض بصورت تخصیص ممکن ہے۔ اس نقص کی مضرت سے مقابلۃً کہیں زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ علاوہ ازیں تخصیص سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ انسان اپنے کام کے علاوہ دنیا کی تمام باتوں سے بیخبر ہو جاوے۔ بلکہ اسکا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سب باتیں کچھ کچھ۔ اور چند باتیں پوری پوری جانے۔ خصوصاً علمی تخصیص کا یہی طریق ہے کہ بہت سے علوم سے ابتدا کر کے بڑھتے بڑھتے ایک علم پر آرہے۔ اور اسی میں کمال حاصل کرے۔ چونکہ تمام علوم میں باہمی رشتہ اور تعلق ہے۔ جو شخص ایک ہی علم سے ابتدا کر کے ایک ہی پر اکتفا کرے گا۔ وہ نہ صرف کم علم بلکہ اپنے علم میں بھی ادھورا رہ جائیگا۔ اگر کوئی شخص سوائے طب یا قانون کے کچھ نہ پڑھے اور دنیا کے حالات سے باخبر نہ ہو تو وہ نیم حکیم خطرہ جاں و نیم وکیل خطرہ جان و مال و آبرو سے بھی بدتر ہو گا۔ لہذا تخصیص سے قلت واقفیت لازم نہیں آتی۔ رہی مزدوروں کی حالت کہ انکا حلقہ مہارت تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کاروبار میں دوسروں کے بشیتر محتاج ہو جاتے ہیں۔ جو کام آسان اور سیدھے

ساد ھی ہیں اُنپر تو یہ اعتراض عائد نہیں ہوسکتا۔ اور جو کام دشوار و مہارت طلب ہیں وہ اکثر مشین سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ایسے کاموں میں بوجہ تنگی مہارت مزدور کو جو مضرت کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ اسکے دفعیہ کا بھی قابل اطمینان طریقہ نکال لیا گیا ہے۔ جسکا مفصل حال مشین کی بحث میں بیان کیا جاوے گا۔

۴۔ مشین اور آدمی کے کام میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ مشین ایک ہی کام کو ایک طریق پر دُہرانی رہتی ہے۔ لیکن انسان کے کام میں اسکی مرضی کو بھی دخل ہے اور وہ جب چاہے کام میں تغیر تبدل کر دیتا ہے۔ پس جب تقسیم عمل سے کام کے بہت سے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں تو ایسے ٹکڑے جنکو صرف دُہرانا کافی ہے مشین کے سپُرد کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جن ٹکڑوں میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کرنا پڑتا ہے وہ انسان اپنے ذمہ رکھ لیتا ہے۔ مثلاً سنگر مشین یکساں بخیہ کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن کپڑے کو اس طرح پر گھوماتے رہنا کہ تمام جوڑوں پر بخیہ ہو جاوے ہاتھ کا کام ہے یا ریلوے انجن کا کام صرف دوڑنا ہے۔ لیکن رفتار کی کمی بیشی اور روکنا چلانا ڈرائیور کے متعلق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تقسیم عمل اور استعمال مشین میں نہایت قریبی تعلق ہے۔ مشاہدہ سے ظاہر ہوگا کہ مصنوعات اور وسائل آمد و رفت میں مشین بیحد مستعمل اور کارآمد ہے۔ اور اسکے برعکس تعمیرات میں کمتر اور زراعت میں بہت ہی کم رائج ہوئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کاموں میں اول تو تقسیم عمل کی گنجایش زیادہ نہیں۔ اور علاوہ ازیں ایسے کام کے ٹکڑے کہ جنکی محض تکرار درکار ہو۔ اور جنکو مشین کر سکے۔ معدودے چند نکالے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں کام ابتک بیشتر انسان کے ہاتھ پر منحصر ہیں۔ حالانکہ مصنوعات میں بہت سی چیزیں ہیں جنکی ساخت میں انسان شاید برائے نام ہاتھ لگاتا ہو۔ اور آمد و رفت پر تو ریل، جہاز، ٹریم کا

حصہ دوم باب سوم

مسن کا رواج

حصہ دوم
باب سوم
مبس کے
فوائد

اور موٹر نے پورا پورا قبضہ کر لیا ہے۔

۵۔ جو کام ہزارہا آدمی مل کر نہیں کر سکتے تھے مشین دو چار آدمیوں کے سہارے سے کر دکھاتی ہے۔ انجنوں کی طاقت کا تخمینہ گھوڑے کی طاقت کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ اور ایک گھوڑے کی طاقت چھ قوی آدمیوں کی طاقت کے برابر مانی جاتی ہے۔ اب اندازہ کرنا چاہیئے کہ دس، پندرہ، بلکہ بیس ہزار گھوڑوں کی طاقت کے انجن جو چند چلانے والوں کی مدد سے ہر طرف کام کر رہے ہیں۔ کس قدر بیشمار آدمیوں کی قایم مقامی کرتے ہیں۔ ایک ریل ہی کو دیکھو کہ کس تیز رفتاری سے کتنا وزن ایک انجن اور دو تین چلانے والے ہزارہا میل بلا تکان لئے پھرتے ہیں کیا بلا انجن کے ایسا کرنا ممکن ہو سکتا تھا؟ چنانچہ مشین نے انسان کا اقتدار اور تصرف قدرت پر اس قدر بڑھا دیا ہے کہ وہ بہت کم باتوں کو محال سمجھتا ہے۔

(ب) مشین اس قدر نازک کام کرتی ہے جو انسان کے وہم و گمان میں بھی گزرنا مشکل ہے۔ ایک انچہ کو دس ہزار مساوی حصوں میں تقسیم کرنا مشین کا اک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

(ج) مشین نہ صرف سخت سے سخت اور نازک سے نازک کام کرتی ہے۔ بلکہ جو کام کرتی ہے جلد سے جلد کرتی ہے۔ چنانچہ اسکی بیشمار مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں تقسیم عمل کے بیان میں ایک قدیم آلپن سازی کے کارخانہ کا حال آدم سمتھ سے نقل کر چکے ہیں۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ دس آدمی ۴۸ ہزار پن روز بنا لیتے تھے اب مشین کی مدد سے ایک ہزار آدمی فی ہفتہ ۲۵ ٹن پن تیار کرتے ہیں۔ فی پونڈ چار ہزار سے زیادہ پن بنتے ہیں۔ لہذا روزانہ اوسط فی کس تین ہزار پن ہوتا ہے۔ حالانکہ بلا تقسیم عمل ہاتھ سے دن بھر میں ایک پن بھی بمشکل تیار ہو سکے گا۔

(د) جو کام دستی محنت کے زمانہ میں خاص خاص لوگوں کا حصہ مانا جاتا تھا اور برسوں کی کوشش سے آتا تھا اب معمولی عورتیں اور بچے چند مہینوں کی مشق سے کرنے لگتے ہیں۔ سنگر مشین چلانا کیا دشوار ہے۔ اور اسکی سلائی کے سامنے بڑے بڑے کاریگروں کی دستی سلائی ہیچ ہے۔ اس سہولت اور وسعت کام کے فوائد آجر اور مزدور دونوں کے حق میں تقسیم عمل کے فوائد میں واضح ہو چکے ہیں۔

(ر) مشین کے ذریعہ سے اس قدر یکساں چیزیں تیار ہو سکتی ہیں کہ انمیں سے کسی دو میں تفریق کرنا محال ہے۔ اس سے ایک تو تجارت کو بہت فروغ ہوتا ہے صرف ایک نمونہ دیکھکر اسی قسم کی ہزار چیزوں کی فرمایش بلا تکلف دیسکتے ہیں کیونکہ ہم کو اطمینان ہے کہ مشین کی بنی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں۔ دوسرے خود مشین کے رواج میں اس سے بیحد مدد ملتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی پُرزا خراب ہو جاوے تو تو اس نمبر کا بعینہ ویسا ہیا پرزا کارخانے سے منگا کر مشین درست کیجا سکتی ہے۔ اسکی مرمت میں کوئی دردسر نہیں اُٹھانا پڑتا ہے۔

(س) تقسیم عمل پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ حلقہ مہارت کو تنگ کر کے مزدور کو دوسرونکا محتاج بنا دیتا ہے اسکے دو جواب دیئے جا چکے ہیں۔ سیدھے سادھے آسان کام تو اس اعتراض سے بری ہیں۔ رہے دشوار اور مہارت طلب کام وہ آجکل مشین سے زیادہ تر متعلق ہیں اور اب مختلف مشینوں کی ساخت میں اسقدر مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ کہ جو شخص گھڑی سازی کی مشین جانتا ہے وہ تھوڑی سی مشق سے بلا دقت بندوق اور سینے کی مشین بنانے کے کارخانہ میں مشین چلا سکتا ہے۔ اور باوجود تخصیص کام بدلنے میں دقت نہیں ہوتی۔ البتہ جو مہارت محض ہاتھ کے کام سے متعلق ہو اس پر یہ اعتراض بظاہر بجا معلوم ہوتا ہے،

حصہ دوم باب سوم

لیکن تجربہ شاہد ہے کہ کسی چیز کی تجارت کے فروغ اور تنزل کا اثر بنانے والوں پر دونوں حالتوں میں یکساں پڑتا ہے۔ خواہ وہ کل چیز خود بناوے یا ایک جزو۔ پس تنگی مہارت سے مضرت کا اندیشہ زیادہ تر وہمی ہے۔ عملاً کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

مشین کے مذکورۂ بالا فوائد کے متعلق یہاں پر یہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کام کی کثرت شرط لازمی ہے۔

مشین کا اثر مزدوروں پر

۶۔ آیا مشین کا رواج بحیثیت مجموعی ادنیٰ مزدوری پیشہ لوگوں کے حق میں مضر ہے یا مفید۔ اس پر بہت کچھ بحث ہو چکی ہے۔ جس کا ماحصل ہم بیان کئے دیتے ہیں۔

(۱) پہلی شکایت یہ ہے کہ مشین کام سہل بنا کر شرح اجرت بہت گھٹا دیتی ہے جواب دیا جاتا ہے کہ مشین مصارف پیدایش میں تخفیف کرکے شرح قیمت بھی کم کر دیتی ہے۔ لہذا جو نقصان مزدور کو بشکل تخفیف اجرت پہنچتا ہے۔ اسکی تلافی ضروریات کی ارزانی سے ہو جاتی ہے۔ یعنی آمدنی کے ساتھ خرچ بھی گھٹ جاتا ہے اور بالجملہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ جواب الجواب ہے کہ جو قیمتی سامان اور تعیشات اکثر مشین سے تیار ہوتے ہیں اور جنکی قیمت میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔ وہ مزدوروں کی ضروریات سے بالا تر ہیں۔ اور بالعموم مشین کی بنی چیزیں اس کی ضروریات کا اس قدر جزو قلیل ہوتی ہیں کہ انکی قیمت کی بچت۔ کمی اجرت کا معاوضہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر تخفیف اجرت کے ساتھ ساتھ مزدور کی تمام ضروریات کی قیمت بھی نسبتاً گھٹ جاوے تو بیشک نقصان نہ ہوگا۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ مشین کا عمل وسائل آمد و رفت اور مصنوعات میں بیشتر پایا جاتا ہے اور زراعت و عمارت کہ جن سے مزدوروں کی ضروریات کا خاص تعلق ہے مشین کے حلقہ عمل سے باہر ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مشین سے خوشحال لوگوں کو بشکل ارزانی مصنوعات فائدہ پہنچتا ہے اور مزدوروں کی اجرت کی تخفیف سے نقصان۔ یہاں ہم

؟

حصہ دوم
باب دوم

یہ جانا ضروری سمجھتے ہیں کہ مشین نے عورتوں اور بچوں کے واسطے بھی طرح طرح کے نئے کام پیدا کر دیئے ہیں اور اگر شرح اجرت گھٹ بھی جاوے۔ گھر کی مجموعی آمدنی بہ نسبت سابق زیادہ ہوگی۔ کم نہیں۔ اور مزدوری پیشہ لوگ خوشحال رہیں گے۔

(ب) دوسری شکایت یہ ہے کہ مشین بہت سا کام تھوڑے وقت میں کر کے بہت کچھ مزدوروں کو بیکار کر دیتی ہے۔ جواب دیا گیا ہے کہ مشین مصنوعات کی قیمت گھٹا کر انکی تجارت اسقدر بڑھا دیتی ہے کہ پہلے سے زیادہ مزدور کام سے لگ جاتے ہیں۔ آج کروڑہا لوگ کتابیں رسالے اور اخبار چھاپنے میں مصروف ہیں۔ چھاپہ کی ایجاد سے پہلے بھلا کتنے خوشنویس کتابیں لکھتے ہوں گے۔ پس ثابت ہوا کہ مشین بجائے کام ضبط کرنے کے مزدوروں کے واسطے کام بڑھاتی ہے۔ اس جواب پر بھی یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ رواج مشین کا اثر تو فوراً مزدوروں پر پڑتا ہے اور ہزارہا بیکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن قیمت کی تخفیف سے پیداوار میں اضافہ ہونے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے گویا باپ دادا کی بیکاری کی مصیبت کا پھل بیٹوں پوتوں کو ملتا ہے۔ یہ شکایت بجا بھی سہی۔ لیکن اکثر حسب ضرورت عام مستقبل بہبودی پر موجودہ ذاتی منفعت قربان کرنی پڑتی ہے۔ جو سپاہی وطن کی حفاظت اور ملکی فتوحات میں مارے جاتے ہیں انکی آیندہ نسلیں آزادی اور حکمرانی کا لطف اٹھاتی ہیں۔ مشینوں کی فوری مضرت اور مستقبل فوائد کو اس روشنی میں دیکھنا بیجا نہ ہوگا۔

دوسری شکایت کا ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ مشین سے اگر کچھ مزدور بیکار ہو جاتے ہیں تو بوجہ تخفیف مصارف کچھ اصل بھی ضرورت سے زائد بچ رہتا ہے۔ اور چونکہ محنت اور اصل میں کشش مقناطیسی ہے، بیکار مزدوروں کے واسطے نئے نئے کارخانے جاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اصل تو نہایت سریع الانتقال گویا پانی کی

حصہ دوم باب سوم

مانند سیال ہی۔ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ مگر محنت جو مزدور کی ذات سے لاینفک ہے۔ اصل کے ہمراہ ہر جگہ نہیں جا سکتی۔ نہ معلوم زاید اصل کہاں کام سے لگایا جاوے۔ مثلاً اگر ولایت کا اصل ہندوستان میں کام کرے تو اس سے ولایت کے بیکار مزدور کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بیکاری کا مسئلہ ہر ملک میں کم و بیش تشویش پیدا کر رہا ہے۔ ہر جگہ بیکار مزدوروں کے چھوٹے بڑے گروہ موجود ہیں۔ ان کو کام سے لگانے کی بہت تدبیریں نکالی جاتی ہیں۔ بہترین دماغ اس مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر مستقل طور پر بیکاری نیست و نابود کر دینے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ باکاری و بیکاری بھی نظام عالم کے لازمی جزو معلوم ہوتے ہیں۔

پیدایش بر پیمانہ صغیر و کبیر

۷۔ اگر کسی شہر میں سو موچی جداگانہ کام کر کے پانسو جوڑہ جوتہ ماہوار بنائیں اور کسی ایک فیکٹری میں بھی پانسو جوڑہ ماہوار تیار ہوں۔ تو گو مقدار پیداوار برابر ہے لیکن طریق پیدایش میں بہت نتیجہ خیز فرق موجود ہے۔ اسی وجہ سے اول کو پیدایش بر پیمانہ صغیر و دوم کو پیدایش بر پیمانہ کبیر کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بحالت اول محنت اور اصل بہت سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں منتشر ہوتے ہیں اور بحالت دوم محنت و اصل کی معقول مقدار یکجا فراہم ہو کر عمل پیدایش میں مصروف ہوتی ہے۔ جس زمانہ میں صرف چند آلات اور اوزار سے کام لیا جاتا تھا۔ لوگ جدا جدا یا دو چار مل کر کام کرتے تھے۔ مگر جب سے ایجاد کی بدولت بڑے بڑے طاقتور انجن اور قیمتی مشینیں رائج ہوئیں ہزارہا لوگ مل جلکر یکجا کام کرنے لگے چنانچہ آجکل کی ملیں فیکٹریاں کمپنیاں اور کارخانجات پیدایش بر پیمانہ کبیر کی عمدہ مثالیں ہیں۔

پیدایش بر پیمانہ کبیر کے فوائد

۸ (۱) بہت سے کام اس قدر عظیم الشان اور اہتمام طلب ہیں کہ سوائے پیدایش بر پیمانہ کبیر کے۔ اور کسی طرح سرانجام نہیں پا سکتے۔ مثلاً انجن۔ مشین۔ آہنی پل ریل اور

جہاز سازی کے کارخانے۔ ریلوے اور ٹریم کمپنیاں۔ نہریں کاٹنا اور کان کنی۔

(ب) تقسیم عمل اور استعمال مشین کے متعدد فوائد کم وبیش صرف پیدایش بر پیمانہ کبیر میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کام کی کثرت حصول فوائد کی لازمی شرط ہے۔

(ج) کفایت محنت۔ اگر دس چھوٹے چھوٹے کارخانے ملا کر ایک بڑا کارخانہ بنا دیا جاوے۔ تو دس کلرکوں کی بجائے غالباً دو ہی ہوشیار کلرک تمام حساب و کتاب پہلے سے بہتر حالت میں رکھ سکینگے۔ اور صرف ایک قابل مینیجر بہ نسبت سابق کہیں عمدہ انتظام کریگا۔ اس فائدہ کی بہترین مثال ڈاکخانہ ہے کہ صرف چند ڈاکیئے شہر بھر کے خطوط تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور بوجہ کفایت محنت صرف ایک یا دو پیسہ میں دور سے دور خط جا سکتا ہے۔ اگر دو کانات یا کارخانوں کی مانند۔ کئی کئی ڈاکخانے لوگ ایک ہی شہر میں بطور خود جُدا گانہ قائم کریں۔ تو مصارف بہت زیادہ اور کام کی حالت غالباً ابتر ہو گی۔ علاوہ ازیں مزدور اور کاریگر بھی بڑے بڑے کارخانوں میں کام کرنا بمقابلہ چھوٹے کارخانوں کے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لہذا پیدایش بر پیمانہ کبیر میں اچھی سے اچھی محنت میّسر آسکتی۔

(د) کفایت مشین۔ دو۔ دو ہزار گھوڑوں کی طاقت والے پانچ انجنوں سے دس ہزار گھوڑے کی طاقت والا ایک انجن زیادہ اور بہتر کام کر سکتا ہے۔ اور لطف یہ کہ کوئلہ بھی کم خرچ ہوتا ہے۔ جگہ بھی کم گھرتی ہے۔ چلانے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔ اور دیگر ہر قسم کے مصارف انجن میں کفایت رہتی ہے۔ علاوہ ازیں بوجہ مستقل کثرت کار بڑے کارخانے نہایت اعلیٰ اور بیش بہا مشین لگا کر پورا پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس چھوٹے کارخانے معمولی مشین پر قناعت کرتے ہیں۔

(س) کفایت جگہ۔ صنعت وتجارت کے گنجان مرکزوں میں جہاں زمین بہت قیمتی

حصہ دوم باب سوم

اور کرایہ بہت گراں ہوتا ہے۔ جگہ کی کفایت ایک بڑی کفایت مانی جاتی ہے۔ دس گنا بڑا کارخانہ بنانے کے واسطے دس گنی زمین اور عمارت درکار نہیں ہوتی۔ کیونکہ انجن گھر، مشین گھر، دفاتر۔ اور گوداموں میں اتنی جگہ نہیں گھرتی جتنی کہ دس گنی چھوٹی ایسی دس دس عمارتوں میں۔

(س) کفایت اصل۔ سوگن زیادہ کاروبار چلانے کے لئے۔ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس گنا اصل کافی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر سال بھر میں چھوٹے کارخانے دو مرتبہ مال تیار کرتے ہیں تو بڑے کارخانے اسکا ہر مرتبہ دوگنا مال سال میں دس مرتبہ تیار کر ڈالتے ہیں اور خریدار بھی خوشی خوشی نیا اور تازہ مال بڑے کارخانے سے بکثرت خریدتے ہیں۔ جب کسی چیز کا ایک سانچہ تیار ہو جاتا ہے۔ یا کسی کتاب کی کاپی پریس میں کمپوز ہو جاتی ہے۔ تو اُن سے ہزارہا بلکہ لاکھوں ویسی ہی چیزیں اور کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ اسی کام کے لئے بہت سے جداگانہ سانچے یا کاپیاں کمپوز کرانا۔ مزید محنت و اصل کو ضائع کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کتاب کی کم کاپیاں چھپوائی جائیں تو شرح مصارف زیادہ اور جتنی زیادہ کاپیاں چھپیں شرح مصارف کمتر ہو گی۔ اسی طرح پر برقی طاقت اور روشنی جتنی زیادہ مقدار میں تیار ہو گی ارزاں پڑے گی۔ کفایت اصل۔ اضافہ پیداوار میں خاص طور پر تخفیف مصارف کا باعث ہوتی ہے۔

کفایت مصارف

(ص) اکثر مذکورۂ بالا فوائد سے مصارف میں تخفیف ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ بڑے کارخانے پیداوار خام وغیرہ زیادہ مقدار میں خریدتے ہیں۔ ان کو عمدہ سے عمدہ چیز تھوک فروشی کے کمتر نرخ سے ملتی ہے۔ اور ریل کے کرایہ یا بار برداری کے مصارف میں بھی معقول کفایت ہو جاتی ہے۔ یہ فوائد چھوٹے کارخانوں کو

حصہ دوم
باب سوم

کمتر میسّر آتی ہیں۔

(ط) ہر کارخانہ دار کی کوشش اصل پر زیادہ سے زیادہ شرح منافع فیصدی

ازدیاد

سالانہ حاصل کرنی ہوتی ہے۔ بڑے کارخانے میں چونکہ زیادہ مقدار میں مال

مساع

جلد جلد تیار ہوتا ہے۔ خریداری بڑھانے کی غرض سے فی چیز شرح منافع کم رکھنے
پر بھی سال بھر میں مجموعی منافع کی شرح نہایت اچھی پڑتی ہے۔ اور چونکہ ہر قسم کا
تازہ مال ایسے کارخانوں سے مل سکتا ہے۔ لوگ دُور دُور تک مال منگاتے ہیں
اور یہ تمام اسباب ملکر او رحلقہ کی مانند گھوم گھوم کر کارخانہ دار اور خریدار۔
دونوں کو بشکل ازدیاد منافع و تخفیف قیمت فائدہ پہنچاتے ہیں۔

مثلاً اگر ایک کارخانے میں پچاس ہزار کے اصل سے دو۔ دو ہزار چیزیں سال
میں چھ مرتبہ کل بارہ ہزار ایک روپیہ فی چیز کے صرف سے تیار ہو کر عہ فی چیز کے
حساب سے بکتی ہیں۔ تو شرح منافع ۶ روپیہ فیصدی سالانہ ہوگا۔ لیکن اگر دوسرا
کارخانہ صرف دس ہزار کے اصل سے وہی چیز بنا دے تو بوجوہات مذکورۂ بالا
صرف ایک روپیہ سے یقیناً زائد یعنی تخمیناً کم از کم عہ پڑے گا۔ اور چیزوں کی تعداد
کا سالانہ اوسط بھی نسبتاً کم یعنی زیادہ سے زیادہ دو ہزار رہیگا۔ اس حالت میں
چھ فیصدی منافع حاصل کرنے کی غرض سے نرخ عہ سے بڑھا کر عہ بلکہ اس سے
بھی زیادہ کرنا پڑیگا۔ یا اگر بڑے کارخانہ کے مقابلہ میں عہ کے نرخ سے چیزیں فروخت
کرنی پڑیں۔ تو چھوٹے کارخانہ کو زیادہ سے زیادہ پانچ روپیہ فیصدی منافع مل سکیگا یعنی
بڑے کارخانہ سے ایک روپیہ فیصدی کم۔ حالانکہ نرخ وہی ایک ہی۔ اس فرق کا
باعث کفایت مصارف اور کثرت فروخت نہیں تو اور کیا ہے۔

جدت گری

(ع) اس زمانہ میں جدت بہت بڑی طاقت ہے۔ محض تجربوں پر پڑے

حصہ دوم
باب سوم

کارخانے جتنی رقم صرف کردیتے ہیں وہ چھوٹے کارخانوں کی سرمایہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور انکے تجربے کامیاب بنکر دنیا کے رواج اور فیشن میں داخل ہوجاتے ہیں تو معقول منافع ونیز مصارف تجارب بیشمار خریداروں سے بسہولت وصول ہوجاتے ہیں چنانچہ نت نئی چیزیں بنا بنا کر نئی نئی ضروریات پیدا کرنا اور لوگوں کو نئے نئے شوق دلانا۔ آجکل اعلیٰ کارخانوں کا سب سے مہتم بالشان کام اور امتیازی نشان بنا ہوا ہے۔

استہار

(ف) اس زمانہ میں تجارتی ترقی کا ایک سب سے بڑا راز اشتہار بھی ہے۔ چنانچہ سنگر اور لپٹن جیسے عالمگیر کاروبار والے کارخانے۔ لاکھوں روپیہ ہر سال صرف اشتہار میں صرف کردیتے ہیں۔ کوئی ریلوے اسٹیشن۔ ہوٹل۔ نمایش گاہ اور اخبار ایسا نہیں کہ انکے اشتہار سے خالی ہو۔ علاوہ ازیں انکے سفری ایجنٹ دنیا بھر میں ذاتی کوشش سے خریدار بڑھاتے پھرتے ہیں۔ اور کل مصارف اشتہار علاوہ منافع بآسانی خریداروں کی بڑی جماعت سے وصول ہوجاتے ہیں اور کاروبار کو دن دوگنا رات چوگنا عروج ہوتا چلا جاتا ہے۔

کفایات داخلی و خارجی

۹۔ اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ بڑے کارخانوں کو چھوٹے کارخانوں سے پیدایش میں بہت زیادہ آسانیاں حاصل ہیں جنکی وجہ سے وہ مال عمدہ اور سستا تیار کرکے حسب دلخواہ منافع اُٹھاتے ہیں۔ ایسی کل آسانیاں **کفایات داخلی** کہلاتی ہیں۔ لیکن کچھ آسانیاں ایسی بھی ہیں جو ترقی عام کا نتیجہ ہیں اور چھوٹے بڑے کارخانوں کو یکساں مُیسّر ہیں۔ مثلاً ریل وجہاز کی آسانیاں پیداوار خام اور مشینوں کی ارزانی۔ پیدایش کی نئی نئی آسان ترکیبیں جو علمی تحقیقات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ انکو **کفایات خارجی** کہتے ہیں۔ پریس اور تعلیم کی مدد سے کفایات خارجی۔ کفایات داخلی

حصہ دوم
باب سوم

پر غالب ہوتی جاتی ہیں۔

۱۰۔ تقسیم عمل اور استعمال مشین کی تمام بحث سے بخوبی واضح ہے کہ مصنوعات کی مقدار جس قدر بڑھتی ہے۔ مصارف کی نسبت گھٹتی جاتی ہے۔ یعنی چیزیں سستی تیار ہوتی ہیں۔ یا سابق مصارف کی وہی مقدار بیشتر چیزیں پیدا کر سکتی ہے۔ اس حالت کو اصطلاحاً **قانون تکثیر حاصل** کہتے ہیں۔ پیدائش جس قدر بر پیمانۂ کبیر ہوگی۔ اس قانون کا اثر قوی ہوگا۔ چنانچہ ریل۔ جہاز۔ کپڑے کی ملیں۔ جوتہ کی فیکٹریاں۔ اور دیگر تعیشات کے کارخانے۔ سب اس قانون کے خاص طور پر تابع ہوتے ہیں۔

قوانین تکثیر حاصل و استقرار حاصل

یہ بتایا جا چکا ہے کہ زمین کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے پس پیداوار خام میں قانون تقلیل حاصل کا اثر اور صنعت میں قانون تکثیر حاصل کا اثر مضمر ہوتا ہے اگر دونوں مساوی ہوں تو مجموعی اثر مصنوعات میں بشکل **قانون استقرار حاصل** نمودار ہوتا ہے۔ یعنی مصارف کی نسبت ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ بیشی پیداوار سے بڑھتی گھٹتی نہیں۔ اور اگر کوئی اثر غالب رہا تو مصنوعات بقدر غلبہ اسی کے قانون کی اطاعت کرینگی۔ عمل پیدائش کے یہ تینوں قانون یعنی تقلیل حاصل تکثیر حاصل و استقرار حاصل۔ اکثر مسائل خصوصاً ٹیکس کی بحث میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ جنکی موقع بموقع ہم تشریح کرینگے۔

تحدید صنائع

۱۱۔ کچھ صنعتیں بعض مقامات سے اس قدر مخصوص پائی جاتی ہیں کہ کسی دوسری جگہ ان کو رواج دینے کی کوشش اکثر لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔ **تحدید صنائع** کے اسباب کئی ہیں۔ آب و ہوا کی موافقت۔ پیداوار خام کی ارزانی۔ خریداری کی کثرت سرکاری سرپرستی اور کبھی محض اتفاق بھی۔ کشمیری شال دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اگر کشمیری بھیڑیں دوسری جگہ پالی جائیں یا اون بھی کشمیر سے لیکر دوسری جگہ شال بنی جاویں۔ تو

حصہ دوم
باب سوم
فصل ۲

تجربہ سے ثابت ہوا کہ کشمیری جیسی عمدہ شال تیار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کشمیر کی آب و ہوا اُون کے ریشے کی نرمی۔ لمبائی اور مضبوطی کے واسطے بیحد موزوں ہے۔ علیٰ ہذالقیاس شائر اور مانچسٹر جو انگلستان بھر میں کپڑے کی صنعت کے مرکز ہیں وہاں کی آب و ہوا میں ایک خاص نمی پائی جاتی ہے۔ جو تاگے کو نرم اور مضبوط بنا دیتی ہے۔ ترچناپلی کی آب و ہوا عمدہ تنباکو کی کاشت اور سگرٹ کی ساخت دونوں کے واسطے موزوں ہے۔ بریلی کے گرد و نواح میں جنگل ہے۔ جہاں پر فرنیچر کے قابل لکڑی بکثرت دستیاب ہوتی ہے لوہے کے کارخانے بالعموم لوہے یا کوئلہ کی کانوں کے قرب و جوار میں قائم کئے جاتے ہیں۔ بنارس میں ہر سال لاکھوں ہندو جاتری جمع ہوتے ہیں۔ اور تانبے کے برتن بکثرت فروخت ہوتے ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ جو مدتوں بادشاہوں۔ نوابوں اور امرا کا مسکن رہ چکے ہیں۔ آجتک وہاں سونے چاندی کے زیورات نہایت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ آگرہ بھی کسی زمانہ میں شاہان مغلیہ کا دارالسلطنت تھا۔ جے پور میں ابتک مہاراجہ رہتا ہے۔ گرد و نواح میں پتھر کی کانیں بھی موجود ہیں۔ یہاں کے عالیشان محلات مشہور عالم ہیں اور سنگ مرمر کا کام لاجواب مانا جاتا ہے۔ قصہ مختصر تخصیص صنائع کا رواج ملک میں پایا جاتا ہے اور اسکے کچھ نہ کچھ اسباب بھی ضرور ہوتے ہیں۔ تخصیص صنائع بھی گویا ایک قسم کی تخصیص اور مقامی تقسیم عمل کی صورت ہے۔ اور وہی نتائج بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں۔

تخصیص صنائع بھی تقسیم عمل کی مانند معاون کمال و مہارت ہے۔ آب و ہوا میں ایک خاص کاروباری اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک کو مصروف و کامیاب دیکھکر دوسرے کے دل میں کام کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ضروری معلومات۔ آلات اور پیداوار خام بآسانی میسر آتے ہیں۔ بڑے بڑے ماہر کاریگر اور عمدہ مزدور سب آکر ایسی جگہ جمع

حصہ دوم باب سوم

ہو جاتے ہیں اور حسب دلخواہ محنت مہیا ہو جاتی ہے۔ مقابلہ کے جوش میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ مقامی خوشحالی اور صنعت کی ترقی ہوتی ہے۔

صنائع تضمینی و تضمیمی

۱۲۔ مقامی صنعت کے تعلق سے اور بھی چند ایسی صنعتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو اس خاص صنعت کو مختلف طور پر مدد دیتی ہیں۔ ایسی صنعتوں کو اصطلاحاً صنائع تضمینی کہتے ہیں۔ مثلاً کانپور میں جوتہ صنعت خاص ہے۔ چمڑہ دھونے اور رنگنے کے مصالحے تیار کرنا۔ جوتوں کے فرمے اور تسمے بنانا۔ جوتہ رکھنے کے کاغذی ڈبے اور جوتہ باہر بھیجنے کے واسطے لکڑی کی پیٹیاں تیار کرنا سب صنائع تضمینی کہلاوینگے اسیطرح پر جہاں مٹی کا تیل نکالنا صنعت خاص ہے۔ کنستر اور لکڑی کی پیٹیاں جنمیں کنستر بند ہوکر آتے ہیں۔ صنائع تضمینی میں داخل ہیں۔ کاغذ۔ روشنائی۔ جلد سازی پریس کی صنعت خاص سے بطور صنائع تضمینی متعلق ہیں۔

اگر خاص مقامی صنعت طاقت طلب ہوکر سوائے مردوں کے عورتیں اور بچے شریک نہو سکیں۔ مثلاً کانکنی۔ تو اس حالت میں شرح اجرت بھی زیادہ ہوتی ہے اور مزدوروں کی خاندانی آمدنی کم۔ وجہ تقسیم عمل میں سمجھائی جا چکی ہے۔ پس اس ناگوار حالت کو رفع کرنے کی یہ سبیل نکالی ہے کہ خاص اہتمام سے کچھ ایسی صنعتیں قایم کیجاتی ہیں کہ جنمیں بوڑھے۔ بچے اور عورتیں شریک ہوکر۔ خاندانی آمدنی بڑھا سکیں چنانچہ ولایت میں لوہے کے کارخانوں اور کان کنی کے قرب وجوار میں آسان صنعتیں مثلاً اُون صاف کرنا اور رنگنا۔ موزے جُراب بنانا کشیدہ کاڑھنا۔ اکثر مروج پائی جاتی ہیں ان کو اصطلاحاً صنائع تضمیمی کہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں صنعت تضمینی و تضمیمی ایک ہی ہوتی ہے۔

حصہ دوم
باب سوم

کمپنیاں

۱۳ا۔جب تجربہ سے پیدائش بر پیمانہ کبیر کے بیش بہا فوائد تحقیق ہوگئے تو بڑے بڑے کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں کی بنا پڑی جن کو ہم بغرضِ سہولتِ بیان کمپنی کہینگے کمپنی سے مراد محنت اور اصل کی مقدار کثیر یکجا فراہم کرکے عمل پیدایش جاری کرنا ہے بعض دولتمند محض اپنے ذاتی سرمایہ سے کمپنی قائم کرتے ہیں۔لیکن آجکل اکثر کمپنیاں مشترکہ سرمایہ سے چلتی ہیں۔ ہر طبقہ کے لوگ حسب حیثیت و مرضی بشکل خریداری حصص جن کی کچھ قیمت مثلاً سو روپیہ فی حصہ مقرر ہوتی ہے۔کمپنی کے سرمایہ میں اپنا روپیہ شامل کرکے کاروبار کے نفع نقصان میں بحیثیت حصہ دار شریک ہوجاتے ہیں۔ایک قانون کی روسے اب کمپنیاں محدود (لمیٹڈ) ہوسکتی ہیں کہ نقصان کا اثر حصہ کی مقدار تک محدود رہے۔حصہ دار کی ذات اور دوسری ملک وجائداد پر نہیں پڑسکتا۔حصہ داروں کی ایک مختصر انتظامی کمیٹی کی نگرانی میں اکثر تنخواہ دار مینجر کے اہتمام سے کمپنی کاروبار کرتی ہے۔گورنمنٹ نے ایسے قانون نافذ کر دیئے ہیں کہ حصوں اور منافع کے روپیہ میں کوئی تغلّب نہ کرسکے۔سرکاری انسپکٹر وقتاً فوقتاً کارخانوں کا معائنہ کرتے ہیں۔اور سرکاری سند یافتہ محاسبوں سے ہرسال حساب وکتاب جانچ پڑتال کراکر مفصل رپورٹ شائع کرنا قانوناً لازمی ہے۔

آجر ومینجر اور تحمین وتحمن۔

۱۴ا۔جو شخص ذاتی یا مستعار سرمایہ سے کمپنی قائم کرے وہ آجر کہلاتا ہے کمپنی کے مہتمم کو مینجر کہتے ہیں اور وہ اکثر تنخواہ دار ہوتا ہے۔مینجر کے فرایض بہت ذمہ داری کے ہوتے ہیں۔اسکی حیثیت بعینہ کپتانِ جہاز کی سی ہے۔نہ صرف تمام مزدوروں کے کام کی نگرانی کرنا اس کا فرض ہے بلکہ وہ تمام دنیا پر نظر دوڑاتا ہے کہ بہترین پیداوارِ خام سب سے ارزاں کہاں ملتی ہے۔کہاں کہاں مصنوعات کی خرید زیادہ ہے۔دوسرے کارخانوں کے مقابلہ میں خریدار اپنے طرف راغب کرنے کے لئے کیا کیا وسائل مفید

اور کارگر ثابت ہوں گے۔ بالفاظ مختصر کاروبار کے فروغ کی عمدہ سبیلیں نکالنا اور ان پر عملدرآمد کرانا مینیجر کا فرض ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے واسطے بیحد توجہ، تندہی، دُوراندیشی وسعت معلومات اور زمانہ شناسی درکار ہے۔

کچھ لوگ کمپنی قائم کرنے کے بجائے دوسروں کی کمپنیوں سے ٹھیکہ پر کام کراتے ہیں۔ اور قیمتِ خرید و فروخت کے فرق سے منافع اُٹھاتے ہیں یہ لوگ اگر دُوربین ہوں اور مستقبل کا صحیح اندازہ کر سکیں تو ایسے کاروبار سے بہت منافع اُٹھا لیتے ہیں۔ چونکہ یہ کاروبار محض مستقبل کے تخمینہ سے متعلق ہوتا ہے اس کو تخمین اور کرنے والے کو مخمّن کہتے ہیں بعض مخمّن تو یہ غضب ڈھاتے ہیں کہ یا تو کُل روپیہ قرض لیکر یا محض بہت تھوڑے ذاتی سرمایہ سے محض تخمینہ کے بھروسہ پر لاکھوں روپیہ کا کاروبار چلاتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً بیحد ذہین سمجھدار باخبر اور وقت شناس ہوتے ہیں۔ تخمینہ میں شاذونادر غلطی کرتے ہیں۔ مگر جب کرتے ہیں تو بری طرح قرض خواہ یا فریق ثانی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ چونکہ اہتمام کا درد سر کم اُٹھانا پڑتا ہے۔ تخمین کا یورپ میں بہت رواج ہو چلا ہے۔

حصہ سوم
باب اول

حصّہ سوم

تقسیم دولت

باب اول

دولت کے حصّے دار

زمین۔ محنت اور اصل۔ یہی تینوں مل جُلکر دولت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان عاملینِ پیدایش کو یکجا کرنا اپنی ذمہ داری اور نگرانی میں اُن سے کام لینا اور اُن کے اتفاق عمل سے پیداوار دولت حاصل کرنا، گو ایک قسم کی محنت سہی لیکن فی نفسہٖ اس قدر اہم اور مخصوص شئے ہے کہ بغرض امتیاز اس کو تنظیم کہتے ہیں۔ پیدایش دولت کے واسطے ملک میں قیام امن و امان بھی لابُد ہے۔ اور یہ دشوار کام ہر گورنمنٹ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ پس بحیثیت مجموعی دولت کی پیدایش میں زمین۔ محنت۔ اصل۔ تنظیم اور گورنمنٹ پانچ عامل شریک ہوتے ہیں اور پیداوار میں انکے جُداگانہ حصّے علی الترتیب۔ لگان۔ اجرت۔ سود۔ منافع اور ٹیکس کہلاتے ہیں۔ اب اگر ہر شخص جداجدا ان تمام عاملوں کا مالک ہوتا تو اپنی کل پیداوار کا بھی بلا شرکت غیرے حقدار رہتا۔ ایسی صورت میں پیداوار کو مذکورۂ بالا عاملوں کے حصّوں میں جداگانہ ناموں سے تقسیم کرنا بھی فضول ہوتا۔ لیکن حقیقت حال اسکے برعکس ہے۔ زمیندار بہت کم اپنی زمین سے خود کام لیتا ہے۔ بلکہ اکثر

حصہ سوم
باب اول

اپنے کھیت مکان و دوکان لگان اور کرایہ پر دوسروں کو اُٹھا دیتا ہے۔ علیٰ ہذا مزدور اکثر اُجرت پر دوسروں کے کھیت اور کارخانوں میں کام کرتا ہے۔ اصل میں اسکا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ **اصل داروں** کا ایک علیحدہ گروہ ہے۔ جو آلات اور سامان ضروری مہیا کر دیتے ہیں اور محنت میں کوئی حصّہ نہیں لیتے۔ یہ لوگ کارخانوں اور کمپنی کے **حصّہ دار** بھی کہلاتے ہیں۔ ایک مختصر مگر بااثر جماعت **تاجروں** کی پیدا ہو چلی ہے جن کا خاص کام تنظیم عاملین ہے۔ جو اصل بھی اکثر دوسروں سے لیکر لگاتے ہیں اور سوائے نگرانی اور اہتمام کے کسی محنت میں ہاتھ نہیں لگاتے۔ رہا امن و امان۔ سو اسکے قیام کے واسطے گورنمنٹ نے فوج، پولیس اور عدالت جیسے بیش خرچ متعدد محکمے قائم کر رکھے ہیں پس جبکہ تمام عاملین پیدائش ہر شخص کے جدا گانہ مِلک نہیں بن سکتے اور انمیں سے ہر ایک مختلف گروہ کے ہاتھ میں ہے تو پیداوار دولت کو بھی لازمًا جُدا جُدا حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ تاکہ ہر مالک اپنا حصّہ لے سکے۔ چنانچہ زمیندار لگان وصول کرتا ہے مزدور اُجرت پاتا ہے۔ اصل دار سود لیتا ہے۔ آجر منافع اُٹھاتا ہے۔ اور گورنمنٹ ٹیکس لگاتی ہے۔ کس اصول کے مطابق یہ مختلف حصّے تقسیم ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں؟ یہ ایک نہایت اہم، پیچیدہ اور معرکتہ الآرا مسئلہ ہے۔ اس پر نہایت قابلیت سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ ہم بھی اس حصّہ میں اسی بحث کا ایک سادہ خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرینگے۔

یہاں پر یہ واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ لگان، اُجرت، سود اور منافع اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے سے بالکل جُدا اور متمیز ہیں۔ لیکن عرف عام میں یہ اکثر مخلوط بھی کر دئے جاتے ہیں۔ مثلاً اُجرت سے مُراد پیداوار کا صرف وہ حصّہ ہے جو محنت کا ماحصل ہو۔ لیکن اُجرت عرفی میں اکثر مزدور کے اصل کا سود بھی شامل ہوتا ہے۔ لوہار

حصہ سوم
باب اول

بڑھئی یا درزی کو جو اُجرت دیجاتی ہے وہ نہ صرف اسکی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے
بلکہ بشکل آلات جو اصل وہ کام میں لگاتا ہے اسکا سود بھی جزواً اس میں داخل ہوتا
ہے۔ علیٰ ہذا لگان یعنی زمین کے ماحصل زائد میں کاشتکار کے ہل بیل چرس جیسے
اور زمیندار کے کنواں وغیرہ جیسے اصل کا سود بھی شمار کرلیا جاتا ہے۔ ساہوکار کے
سود میں لین دین چلانے کی محنت کی اُجرت اور دیگر مصارف کا معاوضہ بھی شریک
ہوتا ہے۔ منافع میں بھی اُجرت تنظیم کے علاوہ آجر کے ذاتی اصل کا سود اور مطالبات
خطر داخل ہوتے ہیں۔ اختصار بیان اور سہولت حساب کی غرض سے اگر زبان عرفی
میں یہ جُدا گانہ حصے حسب ضرورت مخلوط کردیئے جائیں تو کچھ مضایقہ نہیں۔ لیکن انکے
حقیقی مفہوم اور اختلاط کی ماہیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔

حصہ سوم
باب دوم

باب دوم

لگان

تجزیہ (۱) لگان کی ماہیت (۲) قانون تقلیل حاصل کا تعلق لگان سے (۳) سدایش لگان کے شرائط (۴) اقسام لگان (۵) لگان مصارف پیدایش کا جزو نہیں ہوتا (۶) لگان کیونکر بالواسطہ مصارف پیدایش کا جزو بن سکتا ہی (۷) قیمت پیداوار اور لگان کا تعلق (۸) زرعی ترقیات کا لگان پر اثر (۹) مالک اراضی اور کاشت (۱۰) زمینداری لگان (۱۱) سرکاری مالگذاری (۱۲) زمین کو قومی ملک بنانے کی تجویز۔

لگان کی ماہیت

۱۔ لگان کا مسئلہ ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کے لحاظ سے جس قدر اہم اور قابل توجہ ہی اسیقدر پیچیدہ اور بحث طلب اسباب گوناگوں اور پیچ درپیچ اثرات ناقابل تفریق اور تخمینی اصول دقیق و تشریح طلب فروعات کثیر و گنجان۔ ترک تفصیل سے مسئلہ سمجھنا آسان۔ لیکن تنگی نظر سے مغالطہ میں پھنسنا اغلب ہم صحت معلومات کو سہل فہمی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ ماہیت سمجھنے کے واسطے جس قدر تفصیل لابد معلوم ہوئی بلا تامل اختیار کی گئی ہی اور ساتھ ہی اسکے غیر ضروری پیچیدگیاں ترک بھی کر دی گئیں تاکہ مسئلہ مثل پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا کا مصداق نہ بنجاوے۔ مگر باوجودیکہ صفائی اور سلاست کی بیحد کوشش کی گئی اس مسئلہ کا مطالعہ پھر بھی خاص توجہ کا محتاج ہوگا۔
عرف عام میں تو لگان سے پیداوار زمین کا وہ حصہ مراد ہی جو کاشتکار زمیندار

یا سرکار کو بموجب رواج یا معاہدہ دیتا ہی۔ لیکن **معاشی لگان** ایک بالکل مختلف چیز ہی جو قوانین قدرت کے عملدرآمد سے پیدا ہوتا ہی۔ اوّل ایک مثال دیکر ہم اسکی ماہیت بیان کریں گے۔

فرض کرو کہ دس ہزار من گیہوں کسی منڈی میں برائے فروخت آویں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقدار بہت سے مختلف الحالات کھیتوں کی پیداوار کا مجموعہ ہی۔ اب تقریباً ہر کھیت کے مصارف پیدایش کی نسبت مختلف اور جداگانہ ہوگی۔ مثلاً دو اور تین روپیہ کے درمیان اسکے بیشمار مدارج ہو سکتے ہیں۔ قلیل فرقوں کو نظر انداز کر کے ان کھیتوں کے چند بڑے بڑے طبقے بتائے جاسکتے ہیں کہ جنکے نسبت مصارف میں نمایاں فرق پایا جاوے۔ مثلاً تین درجہ مقرر کئے جاویں۔ اعلیٰ اوسط ادنیٰ جنکے مصارف کی نسبت علی الترتیب دو روپیہ ڈھائی روپیہ اور تین روپیہ من ہو۔ لیکن باوجود فرق مصارف منڈی میں گیہوں کا نرخ یکساں ہوگا۔ اور اگر مانگ اس قدر زیادہ ہو کہ ادنیٰ کھیتوں کے گیہوں خریدے بغیر نہیں رہا جاسکتا تو نرخ تین روپیہ من سے کسی حالت میں کم نہ ہوگا۔ ادنیٰ کھیت کا کاشتکار اگر ما حصل زائد بھی نہ پاسکے تو ایسی حالت میں کم از کم مصارف پیدایش تو ضرور پیداوار کی قیمت سے وصول کر سکے گا۔ اعلیٰ و اوسط کھیتوں کے کاشتکار تین روپیہ من کے نرخ سے علی الترتیب ایک روپیہ اور آٹھ آنے فی من نفع اُٹھاوینگے۔ اور یہی ما حصل زائد جو فرق مصارف کی موافقت سے پیدا ہوتا ہی۔ معاشی اصطلاح میں **لگان** کہلاتا ہی۔

یہاں پر نرخ کے متعلق دو نکتے واضح کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ بحث بالا سے تعین نرخ کا یہ اصول تحقیق ہو گیا کہ جس قدر مقدار مطلوب ہوتی ہی اسکا نرخ بیشترین مصارف پیدایش کی نسبت سے کم نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ برابر یا کچھ زیادہ ہوگا۔ مساوات

نرخ کا مفروضہ جو بظاہر خلاف واقعات معلوم ہوتا ہے تشریح طلب ہی۔ ایک ہی جنس کے چند حصوں کا نرخ بلحاظ خوبی مختلف ہوتا ہے۔ اور درحقیقت کل مقدار ایک نرخ سے فروخت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر متوسط خوبی کی پیداوار کا نرخ معیار قرار دیکر اعلیٰ خوبی والے نرخ کا اضافہ تخفیف مصارف شمار کریں اور ادنیٰ خوبی والی کے نرخ کی کمی ازدیاد مصارف سمجھیں تو باوجود فرق خوبی واختلاف نرخ مساوات نرخ کا نیتجہ حاصل ہوگا اور لگان کی بحث میں اس مفروضہ سے یہی مُراد ہی۔

صاف ظاہر ہی کہ بوجہ افزونی آبادی ومعاشی ترقیات پیداوار زمین کی طلب جس قدر زیادہ ہوگی ادنیٰ زمینوں پر کاشت پھیلتی جاوے گی۔ جیسا کہ آجکل خود ہندوستان میں ہو رہا ہی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ واوسط زمینوں کے لگان میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کسی وجہ سے طلب میں کمی آجاوے تو ادنیٰ کھیتوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہوکر باقی کھیتوں کے لگان میں بھی تخفیف ہو جاویگی۔ پس ثابت ہوا کہ مصارف پیدائش کا فرق جسکے اسباب ہم ابھی واضح کرینگے اور جو طلب کی کمی بیشی سے گھٹتا بڑھتا ہی لگان کا باعث ہی۔ لگان خود پانے والے کی کوشش سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ اکثر غیر اختیاری اسباب کا نیتجہ ہوتا ہی۔ صرف لے لینا پانے والے کا کام ہی۔ لگان کی پیدائش میں اسکو زیادہ دخل نہیں۔

اب ہم مصارف پیدائش کی تفصیل کرتے ہیں جس سے انکے فرق کی وجہ خود ظاہر ہو جاوے گی معمولاً خرچ کی جو مدیں مصارف میں شمار کیجاتی ہیں۔ درحقیقت اُن سے کہیں زیادہ مدیں مصارف میں شامل ہیں۔ گو روزمرہ کے حسابات میں بغرض سہولت وہ نظر انداز کردیجا دیں۔ لیکن علمی بحث میں بحیثیت جزو مصارف ان سبکا پورا لحاظ لازمی ہی۔ چنانچہ تخم اور کھاد کی قیمت۔ جُتائی۔ نرائی۔ آبپاشی۔ رکھوال۔ کٹائی۔ اور پیداوار کو

قابل فروخت بنانیکے کُل کاموں کی لاگت کھیتی کے مویشیوں کا خرچ۔ ہل۔ بیل۔ اور دیگر سامان زراعت میں کاشتکار کا جو اصل لگا ہی اور کنویں، پختہ برہے جیسے مستقل ترقیات اراضی جن میں زمیندار کا اصل صرف ہوا ہی۔ اس سب کا سود۔ یہ اصل قائم دوران استعمال میں جس رفتار سے فرسودہ اور زائل ہو رہا ہی اسی کے مطابق مطالبات فرسودگی کی ایسی شرح سالانہ کہ بیکار ہونے تک کل اصل کی قیمت وصول ہو سکے خود کاشتکار اور اسکے خاندان کی محنت کی اُجرت۔ نیز پیداوار کو منڈی تک لانے اور فروخت کرنے کا خرچ۔ یہ سب کچھ مصارف پیدایش میں شامل ہی۔ اتنے لحاظ سے چند کھیتوں کا بھی مساوی الحالت ہونا محال ہی۔ اول تو قدرتاً زمینوں کی زرخیزی میں فرق۔ اسکے علاوہ کھیت تمام ملک میں منتشر کوئی منڈی کے بالکل قریب۔ کوئی بیسیوں کوس دور۔ بعض ریل اور پختہ سڑکوں کے ارد گرد بعض دُور از راہ قطعات میں واقع۔ آبپاشی کہیں نہایت بیش خرچ اور کہیں بیحد ارزاں۔ زرعی ضروریات کی قیمت جگہ جگہ مختلف یہی حال زرعی مزدوروں کی اُجرت کا قدرتاً زرخیز اور باموقع کھیتوں میں بہ نسبت دیگر کھیتوں کے اصل اور اسکے سود کی مقدار کم۔ اور سب پر طُرّہ یہ کہ سب کاشتکار بھی یکساں ہوشیار اور محنتی نہیں۔ ان تمام اختلافات کا نتیجہ یہ ہے کہ بمشکل چند کھیتوں کے مصارف پیدایش کی نسبت برابر ہونگے ورنہ عموماً ہر کھیت کی جُداگانہ اور مختلف ہوتے ہیں۔ اور جیسا کہ مثال بالا سے ظاہر ہی۔ انہی مصارف کے باہمی فرق سے لگان پیدا ہوتا ہی۔

کہا گیا ہی کہ لگان زمین کے قدرتی اور مستقل خواص سے پیدا ہوتا ہی۔ اس قول کی ایک شرح تو خواص زمین کی وہ تفصیل ہی جو اس سے قبل پیدائش دولت کے حصے میں بیان کیجا چکی ہی۔ لیکن علاوہ ازیں اس قول سے ایک اور نکتہ جتا نا بھی

حصہ سوم
باب دوم

مقصود ہی جس کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں۔ فرق مصارف کے جو اسباب بیان کیے گئے ان میں سے اکثر مثلاً زرخیزی۔ شرح اُجرت۔ نرخ ضروریات۔ موقع اراضی محنت اور اصل کے زور سے بہت کچھ درست اور بہتر ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ ممکن ہے کہ مزید پیداوار جو ان کی درستی اور بہتری سے حاصل ہو وہ اس محنت اور اصل کے اُجرت و سود کی برابر ہو۔ یا کم رہے۔ یا کچھ بڑھ کر لگان میں اضافہ کرے لیکن کمی بیشی مصارف کے چند اسباب ایسے بھی ہیں جو انسان کے اختیار اور قابو سے باہر ہیں محنت اور اصل کا ان پر کوئی زور نہیں چلتا۔ عاملین قدرت گرمی۔ بارش۔ روشنی اور ہوا زراعت میں زمین۔ محنت اور اصل کے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ اور پیداوار کی خوبی اور مقدار پر نہایت گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ان کو مجموعاً **قدرتی زرخیزی** سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قدرت نے یہ عاملین مفت عطا کیے ہیں۔ ان کی پیدایش اور ترقی میں محنت اور اصل کا کچھ بس نہیں چلتا ہے۔ انکی موافقت سے مصارف کی نسبت بہت گھٹ سکتی ہے۔ ایسی تخفیف مصارف سے جو **ماحصل زاید** پیدا ہو وہ ہر حالت میں خالص لگان ہوگا حتیٰ کہ بعض علما تو معاشی لگان کی مقدار صرف اسی تک محدود کرتے ہیں جو **ماحصل زاید** دیگر حالات کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ گو بظاہر لگان معلوم ہو لیکن کل یا اسکا کوئی جزو در پردہ اس محنت اور اصل کی اُجرت اور سود ہو سکتا ہے جو حالات کو موافق بنانے کی غرض سے صرف کیا گیا ہو۔ گویا آخر قسم کے ماحصل زائد کی ماہیت کم و بیش غیر محقق ہوتی ہے۔ اور اسکا لگان ہونا تو تا برابر ممکن ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ نکتہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ اگر کسی زمین کی قیمت میں لگان کا معاوضہ بھی شامل ہو تو ایسی زمین کے خریدار کے حق میں لگان بھی اس اصل کا سود بجا ہوگا جو اس کے معاوضہ میں قیمتاً دیا گیا۔ اس کے برعکس جو ماحصل زائد دوسروں کی

لگان

ت اور اصل سے پیدا ہو۔ مثلاً جدید ریلوے لائن کھلنا۔ نہر جاری ہونا۔

ہیں منڈی قائم ہونا۔ تو وہ بلاشک لگان شمار ہوگا۔ گویا کبھی خود لگان

تا ہی اور کبھی وہ ماحصل زائد بھی جو اصل و محنت کا آفریدہ ہو لگان ہو

یہ ماننا پڑتا ہی کہ مصارف پیدایش کا نہ تو کوئی اس قدر مفصل حساب رکھ

رکھ سکتا ہی۔ خاص خاص مصارف مثلاً اُجرتِ مزدوران۔ خرچ آبپاشی

کھاد وغیرہ کا کاشتکار صرف تخمینہ کرلیتا ہی۔ صحیح مقداران کی بھی نہیں

وجہ سے کھیت کے منافع میں لگان کی ٹھیک مقدار معلوم کرنا نہایت دشوار

ہی۔ مگر تمام حالات متعلقہ بغور مطالعہ کرکے صرف لگان کے پیدا ہو

سکے گھٹنے بڑھنے کا اندازہ کیا جاسکتا ہی۔ مصارف پیدایش سے خالص

کرنا محال ہی۔ البتہ اسکی پیدایش اور کمی بیشی کے عام اصول تجزیہ تخمین

علمی اغراض کے واسطے ان کو جاننا کافی ہے۔

قانون تقلیل حاصل کو جو پیداوار زمین پر خاص طور سے مسلط پایا جاتا

تشریح خواص زمین کے بیان میں کیجا چکی ہی مسئلہ لگان

نہوگا۔ اگر یہ قانون ہر کھیت کے کاشت کی حد معین نہ کرتا تو اعلیٰ درجہ کے

نی درجہ کے کھیت نہ بوئے جاتے اور موجودہ طریق سے لگان حاصل

سے یہ خیال کرنا کہ پیدایش لگان کے واسطے ادنیٰ زمینوں کی

ست نہوگا۔ بلکہ بفرض محال اگر تمام کھیتوں کی زرخیزی دیگر حالات

کی نسبت سب یکساں ہوں۔ تو بھی اس قانون کے عمل سے لگان

مثلاً محنت اور اصل کے پہلے جرعہ کی پیداوار کے مصارف

کی ۲½ روپیہ من اور تیسرے کی تین روپیہ من ہو

کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ اسکے برعکس یہ خود نرخ کا آفریدہ ہوتا ہے۔ نرخ کی کمی بیشی سے یہ بھی گھٹتا بڑھتا ہے۔ اپنی طرف سے نرخ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ بالفاظ مختصر لگان اضافہ نرخ کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ باعث۔ چنانچہ اگر زمیندار یا سرکار لگان (بشرطیکہ معاشی لگان کی برابر یا اس سے کم ہو) لینا چھوڑ بھی دے تو کل لگان کاشتکار کی جیب میں جانے لگے گا۔ اور نرخ پیداوار میں ترک مطالبہ لگان سے کوئی تخفیف ہوگی لگان جزو مصارف ہونے کے قول سے اسی واقعہ کا اظہار مقصود ہے۔

حصہ سوم باب دوم

لگان کیونکر بالواسطہ مصارف پیدایش کا جزو بن سکتا ہے

۶۔ جبکہ تمام کھیتوں میں ایک ہی چیز کاشت کیجائے تو لگان نہ مصارف پیدایش کا جزو ہوتا ہے نہ اضافہ قیمت کا باعث۔ لیکن جبکہ مختلف چیزیں کاشت ہوتی ہوں تو ایک پیداوار کا لگان دوسری پیداوار کے صرف میں بالواسطہ شامل ہو سکتا ہے۔ کسان تو وہی فصل بوئے گا جس سے بیشترین لگان ملنے کی اُمید ہو۔ اور جبتک کم ازکم اسی قدر لگان کی اُمید دوسری فصل سے نہو۔ وہ فصل اوّل کے بجائے فصل دوم نہ بوئیگا۔ مثلاً کسی کھیت میں آلو کی کاشت سے پچاس روپیہ لگان حاصل ہو۔ آلو بوتے وقت کسان کو یقین ہوگا کہ اس سے زیادہ لگان بلکہ اس قدر بھی کسی دوسری فصل سے نہیں مِلسکتا۔ اور اگر واقعہ بھی یہی ہو تو یہ کاشتکار بجائے آلو کے گیہوں اسیوقت بوئیگا جبکہ جدید فصل سے بھی کم ازکم پچاس روپیہ لگان مل سکے بلکہ کسی قدر زیادہ۔ فرض کرو کہ گیہوں کی طلب بڑھے۔ ادنی کھیتوں کی پیداوار بھی ملکر رسد ناکافی رہی آلو کے کھیت میں گیہوں کے مصارف پیدایش ادنی کھیتوں کے مصارف سے کم نہوں۔ اس صورت میں آلو کا کل لگان گیہوں کے مصارف پیدائش کا جزو بنے گا اور اضافہ نرخ کا باعث ہوگا۔ آلو کا لگان گیہوں کا نرخ بعینہ اس طرح چڑھائیگا جیسے کہ نہر کی چھال پانی کی سطح بلند کرتی ہے مثلاً ادنی کھیتوں کے مانند آلو کے کھیت میں بھی گیہوں کے مصارف تین روپیہ

حصہ سوم باب دوم

من ہوں اور مقدار پیداوار سو من۔ اب اگر یہ مقدار بوجہ قلت رسد ناگزیر ہو تو کاشتکار
آلو کا پچاس روپیہ لگان گیہوں کے مصارف میں شمار کر کے تین روپیہ آٹھ آنہ من کے
نرخ سے گیہوں فروخت کریگا۔ صاف ظاہر ہے کہ آٹھ آنہ فی من محض آلو کی لگان کی بدولت
نرخ میں اضافہ ہوگا۔ نیز اگر آلو کے کھیت میں مصارف ادنی کھیتوں سے زیادہ یا کم
ہوں مثلاً ۳ روپیہ ۴ر من یا دو روپیہ بارہ آنہ من تو نرخ علی الترتیب تین روپیہ
بارہ آنہ من اور تین روپیہ چار آنہ من قرار پائیگا۔ لیکن آلو کا لگان ہر حالت میں جزو
مصارف رہکر اضافہ قیمت کا باعث ہوگا۔ اس صورت میں ادنی کھیتوں کو بھی ماحصل
زائد ملیگا جسکو **لگان قلت** کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

یہاں یہ واضح کر دینا غیر ضروری نہو گا کہ اگر آلو کے کھیت میں گیہوں کے مصارف
ادنی کھیتوں کے مصارف سے اس قدر کم ہوں کہ آلو کا لگان شامل ہو کر آخر الذکر مصارف
کی برابر ہیں تو گویا کسان کے نزدیک آلو یا گیہوں بونا دونوں یکساں ہے۔ ہر حالت
میں ایک ہی لگان ملیگا اور اگر اس سے کم ہوں تو گویا کاشتکار کو گیہوں کی کاشت سے
بمقابلہ آلو کے زیادہ لگان حاصل ہوگا۔ اور ان دو صورتوں میں سے کسی میں بھی آلو کا
لگان جزو مصارف نہوگا۔ گویا آلو کا لگان گیہوں کے مصارف میں اسی وقت شامل
ہو کر اضافہ نرخ کا باعث ہو سکتا ہے جبکہ یہ مجموعی مصارف گیہوں کے ادنی زمینوں
کے مصارف سے زیادہ ہوں اور بوجہ قلتِ رسدِ گیہوں۔ آلو کے کھیت میں پیدا ہوئے
گیہوں بھی طلب پوری کرنے کیواسطے ناگزیر ہوں۔

قیمت پیداوار اور لگان کا تعلق

۷۔ جب کسی زرعی پیداوار کی قیمت بڑھتی ہے تو نہ صرف ادنی کھیتوں پر کاشت
پھیلنے لگتی ہے بلکہ اعلیٰ کھیتوں کی کاشت بھی زیادہ دقیق ہوتی جاتی ہے۔ اور پیداوار کی
بیشتر مقدار قانون تقلیل حاصل کے تحت میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہر کھیت میں اس

قانون کے عمل کی رفتار یکساں نہیں۔جہاں سُست ہوتی ہی نسبت مصارف میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے۔جہاں تیز ہوگی چند ہی جرعوں کے مصارف کی نسبت میں بسرعت نمایاں فرق پیدا ہو جائے گا۔اب ہم یکساں اور مختلف زرخیزی کی زمینوں کے لگان پر عمل قانون تقلیل حاصل کی سُست اور تیز رفتار کے لحاظ سے اضافہ قیمت کا اثر بذریعہ اشکال واضح کرینگے۔کیونکہ محض الفاظ سے یہ مسئلہ ایسی اچھی طرح پر ذہن نشین نہیں ہوسکتا۔اس کے سمجھنے میں اشکال بیحد مفید ثابت ہوئی ہیں۔

حالت اول۔ زرخیزی یکساں عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار مختلف

شکل اول میں ہر جدید جرعہ کی پیداوار بتدریج گھٹتی ہے یعنی مصارف نسبتاً آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور دقیق کاشت بڑھانے کی زیادہ گنجایش ہے۔ اسکے برعکس شکل دوم میں جدید جرعوں کی پیداوار بسرعت گھٹتی ہے۔ اور نسبت مصارف جلد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ کاشت دقیق پانچویں جرعہ پر ختم کرنی پڑتی ہے۔ جبکہ پیداوار کا نرخ اس قدر بڑھے کہ بجائے مقدار ا ج کے اب ہر جرعہ کے مصارف پورے کردے تو لگان میں بمقدار ب ج ر س اضافہ ہوکر مجموعی مقدار ج د ر کے ب د س ہو جاوےگی مقابلہ سے ظاہر ہے کہ شکل اول میں اضافہ لگان ب ج ر س کی مقدار نسبتاً شکل دوم کی مقدار سے بہت زیادہ ہے۔ نتیجہ نکلا کہ اضافہ نرخ سے قانون تقلیل حاصل کے عمل کی تیز اور سست رفتار کے مطابق علی الترتیب لگان میں اضافہ کم و بیش ہوگا۔

حالت دوم۔ زرخیزی مختلف۔ عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار یکساں

شکل ۳ کی زمین شکل ۴ کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے لیکن قانون تقلیل حاصل دونوں پر ایک ہی رفتار سے عمل کرتا ہے۔ اضافہ زرخ سے جو جدید لگان ب ج ر س حاصل ہوا اُس کی نسبت سابق لگان ج د ر سے شکل چہارم میں بمقابلہ شکل سوم کے زیادہ موافق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر قانون کے عمل کی رفتار یکساں ہو تو کمتر زرخیز زمین میں بمقابلہ زیادہ زمین کے لگان نسبتاً زیادہ بڑھیگا۔

حالت سوم ۔ زرخیزی مختلف ۔ عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار مختلف

شکل پنجم کی زمین شکل ششم کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے ۔ لیکن ساتھ ہی اسکے زمین اوّل میں قانون تقلیل حاصل کا عمل نہایت تیز ہے اور زمین دوم میں سُست ۔ نتیجہ یہ ہے کہ نرخ بڑھنے سے رفتار عمل قانون کی فرق کی بدولت کمتر زرخیز زمین کے لگان میں بمقابلہ بیشتر زرخیز زمین کے زیادہ اضافہ ہوگا ۔

حالت چہارم۔ زرخیزی یکساں۔ عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار یکساں۔

ظاہر ہی کہ اضافہ نرخ سے ایسی یکساں زمینوں کے لگان میں مقابلتاً کوئی فرق پیدا نہو گا۔ ایک ہی نسبت سے لگان میں اضافہ ہوگا۔

مذکورۂ بالا نتائج سے ایک عملی ہدایت واضح ہوتی ہی۔ وہ یہ کہ اگر اضافہ نرخ کی امید ہو تو کمتر زرخیز زمینوں کو جنمیں عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار بھی سست ہو۔ بہ قیمت حیثیت موجودہ خریدنا۔ آیندہ اضافہ نرخ پر بہت کچھ منفعت کا باعث ہوگا۔ کیونکہ ایسے کھیتوں میں اضافہ لگان کی نسبت سب سے زیادہ موافق ہوگی۔ چنانچہ واقع میں اعلیٰ کھیتونکی قیمت نسبتاً اس قدر نہیں بڑھ رہی ہی جس قدر کہ اوسط اور ادنیٰ کھیتوں کی۔

مختلف اور یکساں زرخیز زمینوں کے لگان پر بلحاظ رفتار عمل قانون تقلیل حاصل اضافہ نرخ کا اثر بالتفصیل بیان ہو چکا۔ اب صرف یہ دکھانا باقی ہے کہ کس طرح پر اضافہ نرخ سے لگان میں دوگونہ اضافہ ہوتا ہی۔ کیونکہ بوجہ اضافہ نرخ بہ نسبت سابق کمتر مقدارِ پیداوار مصارفِ پیدایش پورا کر سکتی ہے۔ اوّل تو مقدار لگان میں اضافہ ہوگا۔ اسکے علاوہ اضافہ شدہ مقدار لگان کی قیمت بھی اسی نسبت سے بڑھ جائیگی۔ مثلاً کسی کھیت میں ۲۰ روپیہ کی لاگت سے ۶ من غلّہ پیدا ہو۔ اب اگر نرخ ۴ روپیہ من قرار پائے تو لگان کی مقدار ایک من قیمتی ۴ روپیہ ہوگی۔ اور اگر کسی وجہ سے قیمت ۵ روپیہ من ہو جائے تو نہ صرف لگان کی مقدار ایک من سے دو من ہو جائیگی بلکہ قیمت بھی بجائے ۴ روپیہ من کے حساب سے ۸ روپیہ ہونے کے ۵ روپیہ من کے حساب سے ۱۰ روپیہ ہوگی۔ پس صاف ظاہر ہی کہ اضافہ نرخ سے لگان میں دوگونہ اضافہ ہوتا ہی۔ اول مقدار میں دوم اسکی قیمت میں۔ اب یہ سمجھنا دشوار نہو گا کہ اگر نرخ گھٹ جائے تو لگان میں اسی طرح پر دوگونہ تخفیف ہوگی۔ اوّل مقدار میں۔ دوسرے اس کی قیمت میں۔

زرعی ترقیات کا لگان پر اثر

۸۔ زرعی ترقیات کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں۔ ایک وہ کہ صرف مصارف پیداوار میں تخفیف کریں۔ اور مقدار پر انکا کچھہ اثر نہو۔ مثلاً جدید ریلوے لائن یا پختہ سڑک کا اجرا قرب وجوار میں نئی منڈی کا قیام۔ دوسرے وہ کہ زمین کی زرخیزی بڑھاکر ہر جریب اور ہر کھیت کی قوت پیدایش میں اضافہ کریں۔ گویا تخفیف مصارف کے ساتھ مقدار پیداوار میں بھی اضافہ ہو۔ مثلاً کھاد۔ آبپاشی۔ زرعی محنت کی ارزانی۔ جدید آلات کا رواج اور طریق کاشت کی ترقی۔ اب ہم دونوں قسم کی ترقیوں کے نتائج سے جداگانہ بحث کرتے ہیں۔

(۱) ترقی قسم اول۔ مقدار پیداوار قائم۔ مصارف میں تخفیف۔ اس ترقی سے اگر صرف اعلیٰ زمینیں مستفید ہوں اور ادنیٰ زمینیں بالکل محروم رہیں۔ تو نرخ میں کوئی تخفیف نہو سکے گی۔ صرف اعلیٰ زمینوں کا لگان اور بڑھ جائیگا۔ اسکے برعکس اگر یہ ترقی صرف ادنیٰ کھیتوں تک محدود ہو تو نرخ ضرور گھٹے گا اور اعلیٰ کھیتوں کے لگان میں دوگونہ تخفیف ہوگی لیکن اگر اعلیٰ ادنیٰ سب زمینیں یکساں مستفید ہوں یعنی سب کے مصارف میں مقدار معین برابر تخفیف ہو تو نرخ گھٹے گا۔ مقدار لگان میں اضافہ ہوگا۔ لگان کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہوگی۔ یہ پیچیدہ نیتجہ شکل ذیل سے بآسانی سمجھ میں آسکے گا۔

(۷)

اس شکل میں اول کمترین وبیشترین مصارف اور قیمت لگان علی الترتیب اج۔ طس اور
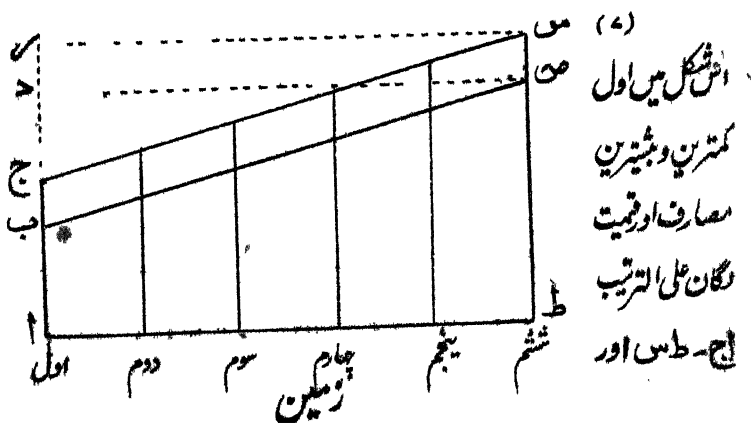
ج ر س سے تھے۔ زرعی ترقیات کی بدولت مصارف میں بقدر ص س برابر تخفیف ہوکر ہرسہ مذکورۂ بالا مدین علی الترتیب ا ب ط ص اور ب د ص ہوگئیں۔ اصول اُقلیدس کی رو سے ج ر س اور ب د ص دونوں مثلث برابر ہیں۔ گویا قیمت لگان میں اس تبدیلی سے کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن چونکہ نرخ میں تخفیف ہوگئی ظاہر ہے کہ بہ نسبت سابق لگان کی مقدار بڑھ گئی ہوگی واضح ہو کہ اعلیٰ ادنیٰ تمام کھیتوں کو جنکی پیداوار زیر بحث ہے ایک قطعہ اراضی تصور کرکے ہر ایک کے مصارف بترتیب اضافہ اس شکل میں دکھاکر تخفیف مصارف کا اثر لگان کی مجموعی مقدار اور قیمت پر دکھایا گیا ہے۔ زمینوں کے جداگانہ لگان میں جو تبدیلیاں واقع ہونگی وہ اس قدر گوناگوں ہوسکتی ہیں کہ ان کے متعلق کوئی عام اصول قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(ب) ترقی قسم دوم۔ پیداوار میں اضافہ نسبت مصارف میں تخفیف۔

ظاہر ہے کہ بوجہ اضافہ پیداوار۔ نرخ میں تخفیف ہوگی۔ فرض کرو کہ صرف اعلیٰ زمینوں پر ان ترقیات کا عملدرآمد ممکن ہو۔ اب اگر تخفیف مصارف۔ کمی نرخ سے زیادہ رہے اور باوجود کمی نرخ اعلیٰ زمینوں کی لگان میں تخفیف مصارف کی بدولت اضافہ ہوسکے تو یہ ترقیات اعلیٰ زمینوں میں پیدا کیجائینگی اور بقدر اضافۂ پیداوار۔ ادنیٰ زمینوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہوجاویگی۔ نتیجہ یہ کہ نرخ گھٹ جائیگا۔ اور لگان میں بھی اضافہ نہ ہوسکے گا۔ اس کے برعکس اگر کمی نرخ تخفیف مصارف پر غالب ہو اور نرخ کی کمی سے باوجود تخفیف مصارف لگان گھٹنے کا اندیشہ ہو۔ تو اعلیٰ زمینیں ان ترقیات سے قصداً محروم رکھی جائینگی اور باوجود امکان یہ ترقیاں وجود میں نہ آسکیں گی۔ ادنیٰ زمینوں کی کاشت حسب سابق جاری رہیگی اور نرخ بھی قایم رہیگا۔

دوسرے فرض کرو کہ صرف ادنیٰ زمینوں تک یہ ترقیاں محدود ہوں۔ تو ان کے

پیدا کرنے سے ادنیٰ زمینوں کو کچھ نہ کچھ ضرور فائدہ ہوگا۔ غالباً نرخ میں بقدر تخفیف مصارف جلد کمی ہو سکے گی اور کم از کم کچھ عرصہ تک مزید حاصل ملنا ممکن ہوگا۔ ایسی حالت میں اعلیٰ زمینیں بے بس اور لاچار ہونگی اور ادنیٰ زمینوں کی ترقیات کا نتیجہ بذریعہ کمی نرخ۔ اعلیٰ زمینوں کے لگان کی وہی دوگونہ تخفیف ہوگی۔ لیکن اگر کل اعلیٰ ادنیٰ زمینیں ان ترقیات سے یکساں مستفید ہوسکیں یعنی سب کی پیداوار میں برابر بقدر معین اضافہ ہوسکے۔ تو بوجہ اضافہ پیداوار نرخ میں کمی ہوکر۔ اکثر ادنیٰ زمینوں کی کاشت اور آخری جرعوں کا استعمال ترک ہوجائیگا اور لگان میں وہی دوگونہ تخفیف ہوگی۔ یہ نتیجہ بھی شکل ذیل سے صاف ظاہر ہوگا۔

اس شکل میں ایک ہی معین جرعہ کی بیشترین اور کمترین پیداوار اعلیٰ اور ادنیٰ زمینوں سے علی الترتیب ا د اور ص ط ہے۔ ا سے ط تک کل زمینیں کاشت ہوتی ہیں۔ مقدار ا ب ص ط مصارف کاشت ادا کرتی ہے اور ب د ص خالص لگان ہے۔ اب ترقیات کی بدولت ہر جرعہ کی پیداوار بقدر د ر برابر بڑھجائے اور پیداوار کی مقدار ا ر س ع۔ مقدار ا د ص ط کے برابر ہو تو صرف ا سے ع تک زمینیں کاشت ہونگی اور ع سے ط تک کی کاشت بتدریج ترک ہو جائیگی۔ مقدار ا ج س ع مصارف پورے کریگی اور مقدار ج ر س لگان ہیگی۔ جو کہ سابق مقدار لگان ب د ص سے مقابلۃً بہت کم ہے۔ گویا ترقیات کی بدولت نرخ میں کمی ہوگی۔ ادنیٰ کھیتوں کی کاشت اور آخری جرعوں کا استعمال ترک ہوگا۔ اور لگان میں دوگونہ تخفیف ہوجائیگی۔

(۸)
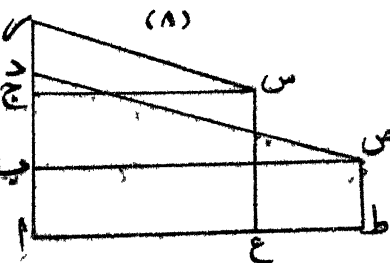
اس شکل میں بھی پہلے مثل شکل نمبر۷ کل زمینوں کو ایک قطعہ اراضی تصور کرکے ترقیات کا اثر لگان کی مجموعی مقدار اور قیمت پر ظاہر کیا ہے۔ ہر زمین کی جداگانہ

تبدیلیوں کے متعلق بوجہ کثرت اختلافات کوئی عام اصول قرار نہیں دیا جاسکتا۔

واضح ہو کہ ترقیات کا لگان پر جو اثر پڑتا ہی۔ اس کا ہر حال میں صحیح صحیح پتہ لگانا محال ہی۔ ہم نے صرف چند نہایت عام اصول قرار دینے کی کوشش کی ہی۔ لیکن تغیر حالات سے ان اصول کے عملدرآمد میں بیحد رد و بدل ممکن ہی۔ یہ جتا ھی لازمی ہے کہ مذکورہ بالا نتائج چند ایسے مفروضات پر مبنی ہیں کہ جو ہمیشہ واقعات کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ دقت اور پیچیدگی سے بچنے کے لئے ہم نے کل نتائج میں طلب کو معین اور غیر متبدل فرض کیا ہی۔ حالانکہ طلب میں برابر کمی بیشی ہوتی رہتی ہی اور اس تبدیلی سے نتائج کی صحت پر بہت کچھ موافق اور مخالف اثر پڑ سکتا ہی۔ اسی طرح حسب ضرورت بعض نتائج میں پیداوار کے اضافہ اور مصارف کی تخفیف کو بھی یکساں بمقدار معین فرض کیا ہی۔ حالانکہ اکثر یہ تبدیلیاں ہر زمین میں بمقدار مختلف ہوتی ہیں۔ یہ اعتراض بجا ہوگا کہ خلاف واقعات حالات فرض کر کے نتائج مرتب کرنے سے واقعات سمجھنے میں کیا مدد مل سکتی ہی۔ تحقیق کا یہ بھی ایک مسلمہ علمی طریق ہی جس کو طریق تسہیل کہتے ہیں۔ پیچیدہ مسائل کے سلجھانے میں اس سے بیحد مدد ملتی ہی۔ چند عام مفروضات متعلقہ کو خواہ ایک حد تک وہ بعید از واقع ہی کیوں نہوں سیدھے سادھے اصول قرار دیکر۔ بتدریج واقعات کے اثر کا لحاظ کر کے ان عام نتائج میں رد و بدل کرنے سے بالآخر نتائج واقعات کے مطابق بنائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی دوسرے طریق سے بعض پیچیدہ مسائل کا حل کرنا اگر محال نہیں تو بدرجہا دشوار ضرور ہوگا۔ مسئلہ لگان کے مختلف پہلوؤں پر اسوقت تک جو کچھ کہا گیا اس سے صاف ظاہر ہی کہ اس بحث کا تعلق سال بہ سال جیسے مختصر دوران وقت کے بجائے سالہا سال کے وسیع زمانہ سے ہوتا ہی۔ تمام اسباب و نتائج متعدد سال کے عرصہ پر مبنی ہیں۔ سالانہ عارضی تبدیلیاں اس بحث میں ناقابل لحاظ سمجھی جاتی ہیں۔

حصہ سوم
باب دوم
ملک اراضی
اور کاشت

۹- اکثر مہذب ممالک میں زمینداروں کا ایک ممتاز گروہ پایا جاتا ہے۔ بیشتر زمینیں انکی ملک ہوتی ہیں۔ لیکن خود کاشت کرنے کے بجائے وہ اکثر پیداوار کے مقررہ حصے یا رقم معین کی فصلانہ ادائیگی کے معاوضہ میں جس کو قانوناً لگان کہتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کو وقت معین کے واسطے اپنی زمین پر کاشت کرنے کی اجازت دیدیتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی یہی طریق بکثرت رائج ہے۔ ملک اور کاشت کی موجودہ علیحدگی سے زراعت کی ترقی میں جو رکاوٹیں پیش آرہی ہیں انکو رفع کرنے میں قانون بہت سرگرمی سے مصروف نظر آتا ہے چونکہ کاشتکار کا تعلق زمین سے محض چند روزہ ہوتا ہے اور اضافہ لگان کا بھی اندیشہ لگا رہتا ہے۔ وہ کھیت کی درستی اور کاشت کی ترقی میں ایسی دل توڑ کوشش نہیں کرتا جیسی کہ خود مالک ہونے کی حالت میں کرتا۔ اور سچ پوچھو تو اسکا ایسا کرنا محض اقتضائے فطرت ہے۔ تعلق کے عارضی ہونیکا خیال اور حاصل کے ایک جزو سے بھی محروم ہونے کا اندیشہ خود قدرتاً کوشش کے منافی ہے۔ قانون ان موانعات کا زور توڑنے کی بہت کوشش کر رہا ہے۔ زمیندار کو خود اسکی ذاتی نفع کے دباؤ سے زیادہ زیادہ عرصہ کے واسطے کاشتکار کو حق کاشت دینے کی بدرجہ مجبوری ترغیب دیتا ہے۔ اضافہ لگان پر طرح طرح سے حدود اور بندشیں قائم کرتا ہے۔ اور بیدخلی کیوقت کاشتکار کو زمیندار سے ان تمام ترقیات کا معاوضہ دلاتا ہے جو کاشتکار نے اپنے صرف سے کھیت میں پیدا کی ہوں۔ بعض صورتوں میں کاشتکاروں کو تقریباً نیم ملک کی حد تک حقوق دیدیئے جاتے ہیں ان پر لگان بڑھانا نہایت دشوار اور ان کو بیدخل کرنا شاذ و نادر ممکن ہوتا ہے۔ اور بعض بیدخلی سے قطعاً مستثنے کر دیئے جاتے ہیں۔ ان حقوق کے پیدا ہونے کی شرائط جو قانون نے مقرر کی ہیں وہ بھی زیادہ سخت نہیں۔ ایسے خاص حقوق والے کاشتکار موروثی اور باقی عام غیر دخیل کار کہلاتے ہیں۔ غرضکہ قانون نے کاشتکار کو اضافہ لگان۔ بیدخلی اور معاوضہ ترقیات کے

لحاظ سے زمیندار کے جبر و تشدد کے مقابلہ میں بہت معقول امان دی ہی۔ اور غرض واحد یہی ہی کہ کاشتکار ترقی زراعت میں دل سے کوشش کرے اور اپنی کوشش کا پھل پاوے۔ حصہ سوم باب دوم

زمیندار و کاشتکار اور خود کاشت زمیندار دو طریق مروج ہیں۔ اول بہت عام ہی لیکن دوم مدرجہا بہتر ہی۔ ملک اور کاشت کی جدائی جس قدر ترقی زراعت کے منافی ہے ان کی یکجائی اسی قدر معاون ہی۔ چنانچہ قانون کا خاص منشا طریق اول کو حتی الوسع طریق دوم کے مشابہ بنا نا قرار پاچکا ہی۔ علما معیشت کا ایک گروہ **سرکار و کاشتکار** کا طریق تجویز کرتا ہی۔ گویا قوم یا گورمنٹ کو زمیندار کا جانشین بنانا چاہتا ہی۔ اس جدید طریق پر بہت کچھ اختلاف رائے پھیلا ہوا ہی۔ حامی اسکو طریق دوم پر قابل ترجیح بتاتے ہیں۔ معترض خلاف انصاف اور ناقابل عمل ثابت کرتے ہیں۔ ہم بھی اسکی خوبیوں اور نقائص سے اسی فصل کے آخر میں مختصراً بحث کرینگے۔

۱۰۔ زمیندار کاشتکار سے جو لگان لیتا ہی۔ اسکا ایک جزو تو اس اصل کا سود ہوتا ہی جو زمیندار نے اس زمین کے خریدنے اور اس کی ترقیات میں لگایا ہو۔ جو کچھ باقی رہے وہ کاشتکار کو حق کاشت دینے کا معاوضہ سمجھنا چاہیئے۔ اسکی مقدار کا جو رواج یا قانون یا معاہدہ کے مطابق قرار پاتی ہی۔ معاشی لگان کے مساوی ہونا ضرور نہیں اگر کم ہی تو کاشتکار کا فائدہ ہی۔ اگر برابر ہے تو نہ فائدہ نہ نقصان اور اگر زیادہ ہے تو کاشتکار مقدار زائد یا تو اپنے ذاتی محنت اور اصل کے اُجرت و سود میں سے ورنہ بشرطیکہ طلب رسد پر غالب ہو۔ اسکو داخل مصارف کرکے اور نرخ بڑھا کر جدید حاصل زائد سے ادا کریگا۔ گویا زمینداری لگان کا معاشی لگان سے زائد حصہ یا تو غریب کاشتکار کی ذاتی اُجرت اور سود کاٹ کر اس کو ہمیشہ کے واسطے خستہ حال یا چند روز میں تباہ کردیگا۔ یا بحالت غلبۂ طلب داخل مصارف ہوکر نرخ چڑھا دیگا اور خریداروں یعنی زمینداری لگان

عوام کی جیب سے ادا ہوگا۔ لیکن زائد حصہ اکثر کاشتکار اور خریدار دونوں ملکر ادا کرتے ہیں۔ جسکا نتیجہ نہ صرف زرعی پیداوار کی گرانی بلکہ کاشتکار کی تباہ حالی بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے حالات ابھی نایاب نہیں ہیں۔ لیکن کم ضرور ہو رہے ہیں۔

زمین کی رسد اور طلب کا زمینداری لگان پر خاص اثر پایا جاتا ہی۔ تو آباد ملکوں میں جہاں زمین بکثرت دستیاب ہوسکتی ہی۔ زمینداری لگان اصل کے سود سے بہت کم بڑھ سکتا ہی۔ اسکے برعکس قدیم ممالک میں جہاں آبادی گھنی ہی۔ زمین کی قلت ہی اور عام ذریعہ معاش زراعت ہی۔ زمینداری لگان معاشی لگان سے بھی بڑھ کر یا تو کاشتکار کو زیر بار کرتا ہی یا پیداوار کے خریدار کو۔ بالفاظ دیگر کاشتکار کی آمدنی گھٹاتا ہے یا نرخ پیداوار چڑھا دیتا ہی۔ چنانچہ ہندوستان اور آئرلینڈ کے بعض حصوں میں یہ نوبت آچکی ہی۔ قانون حتی الامکان زمینداری لگان کو حد اعتدال سے آگے بڑھنے سے روکتا ہی۔

یہ مسئلہ بھی قابل توجہ ہے کہ آیا لگان پیداوار کا کوئی مقررہ حصہ ہونا چاہئیے مثلاً تہائی۔ چوتھائی یا کوئی مقدار معین ہو۔ مثلاً دس یا پندرہ من یا کوئی رقم مثلاً چالیس یا پچاس روپیہ لگان قسم اول سب سے بہتر ہی کیونکہ زمیندار مقدار کی کمی بیشی میں حصہ رسد شریک رہتا ہی۔ بشکل دوم گو مقدار لگان معین ہی لیکن کم از کم نرخ کی کمی بیشی میں زمیندار کی شرکت قائم رہتی ہی۔ لیکن بحالت سوم زمیندار کو نہ مقدار پیداوار سے تعلق نہ نرخ سے کچھ سروکار۔ ہر حالت میں وہ اپنی مقررہ رقم کا طالب ہوتا ہی لیکن جبکہ بوجہ قلت بارش یا وبا پیداوار میں نمایاں کمی واقع ہو تو قانون بخیال انصاف زمیندار کو وصولی لگان کچھ عرصہ تک ملتوی کرنے یا لگان کا مناسب حصہ معاف کرنے پر مجبور کرتا ہی۔

حصہ سوم
باب دوم

سرکاری
مالگذاری

۱۱۔ گورنمنٹ پیداوار زمین کا جو حصہ خود لیتی ہے۔ مالگذاری کہلاتا ہے۔ ایک حد تک یہ خیال صحیح ہے کہ جبکہ سرکاری حصہ زمینداری لگان کا ایک جزو ہو۔ جیسا کہ ہندستان کے بعض صوبوں میں نصف پایا جاتا ہے۔ تو مالگذاری سے صرف زمیندار کی آمدنی گھٹ جاتی ہے۔ کاشتکار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خواہ کل لگان زمیندار کی جیب میں رہے۔ یا گورنمنٹ اس میں حصہ بانٹے۔ کاشتکار کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ گورنمنٹ کی حصہ طلبی سے زمیندار کو لگان بڑھانے کی ترغیب پیدا ہوسکتی ہے۔ اور اپنی سابق مقدار لگان برقرار رکھنے کے لئے وہ تا حد امکان مالگذاری کا بار کاشتکار پر ڈالنے کی کوشش کرے تو عجب نہیں۔ مگر اسی دوراندیشی سے بذریعہ قوانین اضافہ لگان پر ایسی شرائط عائد کردی گئی ہیں کہ زمیندار کو مالگذاری کا کوئی جزو کاشتکار پر منتقل کرنے کا بہت کم موقع مل سکتا ہے اور جہاں زمیندار موجود نہوں اور سرکار مالگذاری براہ راست کاشتکار سے وصول کرے۔ جیسا کہ دکن میں ہوتا ہے تو سرکار کی حیثیت زمیندار کی ہوجاتی ہے اور مالگذاری کا مضر اور غیر مضر اثر حسب حالات لگان کا سا پڑتا ہے۔ اگر حقیقتاً مالگذاری معاشی لگان کے اندر اندر ہے۔ تب تو کچھ مضایقہ نہیں۔ صرف زمیندار یا کاشتکار کے محاصل زائد میں سے حصہ نکل جائیگا لیکن اگر اس حد سے آگے بڑھ کر زمیندار کے سود۔ یا کاشتکار کی اُجرت وسود میں سے بھی حصہ بانٹے تو اسکے دو نتیجے ممکن ہیں۔ زرعی ترقیات میں رُکاوٹ۔ زراعت میں تنزل اور پیداوار میں کمی ہونا تو بہر صورت یقینی ہے۔ اب اگر تخفیف رسد سے پیداوار کی قیمت میں معقول اضافہ ہوسکا تو مالگذاری کا بار بقدر اضافہ قیمت خریداروں یعنی عوام پر جا پڑیگا۔ کچھ زمیندار اور کاشتکار کے سود اور اُجرت سے وصول ہوگا۔ اور باقی بڑ لگان والے کھیتوں کے غریب کاشتکاروں کی زراعت رُوک کر اور ان کو تباہ حال

حصہ سوم
باب دوم

بناکر خود بھی غارت ہو جائیگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ قیمت میں اضافہ ہو سکا۔ تو زراعت بند ہونے سے کاشتکار برباد ہو جائیں گے اور سرکار کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئیگا جب زراعت ہی نہ ہو گی تو مالگذاری کہاں سے آویگی۔ پس صاف ظاہر ہی کہ تعین مقدار مالگذاری میں بیحد اعتدال اور احتیاط کی ضرورت ہی۔ بزعم خود سرکاری آمدنی بڑھانے کے خیال سے بے بس زمیندار اور بے زبان کاشتکار پر مالگذاری ازحد بڑھا دینا مُرغی مار کر ایک دم سونے کے انڈے نکالنے کی احمقانہ حرکت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا شمالی ہندوستان میں تو مالگذاری ترقی زراعت میں کمتر حارج نظر آتی ہی۔ لیکن مسٹر جسٹس رانا ڈے۔ آنریبل مسٹر گوکھلے اور مسٹر رومیش چندر دت جیسے معاملا فہم اور با خبر لوگ۔ جنھوں نے ہندوستان کے معاشی حالات کا مطالعہ اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دیدیا تھا۔ اور جنکو اہل الرائے سمجھے جانیکا پورا حق حاصل ہی شاکی ہیں کہ خصوصاً دکن میں مالگذاری حد مناسب سے تجاوز کرکے کم وبیش وہی افسوسناک نتائج پیدا کر رہی ہی۔ جنکا اوپر ذکر کیا جاچکا ہی۔ اور شمالی ہندوستان میں بھی آیندہ اضافہ احتیاط طلب ہی۔ نہ معلوم گورنمنٹ ہندوستانیوں کے ایسے بے لوث اور قابلانہ مشوروں سے مستفید ہونا کہاں تک پسند کرتی ہی۔ لیکن معاشی قوانین بدلنا بھی گورنمنٹ کے قبضۂ قدرت سے باہر ہی۔

اگر بلا لحاظ **حاصل** زائد تمام زمینوں پر بشرح معین مثلاً کل پیداوار کی ایک چوتھائی مالگذاری قایم کیجائے۔ تو اسکا کاشت اور نرخ پر کیا اثر ہوگا۔ پیدایش لگان کی بحث میں ہمنے حیدابسے ادنیٰ کھیتوں کی کاشت یا انتہائی جرعوں کا استعمال درج کیا ہی کہ جنکے مصارف پیدایش پیداوار کی قیمت کے برابر ہیں اور جن پر کچھ لگان نہیں ملتا۔ ان کو اصطلاحاً زمین بے لگان یا جرعہ بے لگان کہتے ہیں

زمین بے لگان

حصہ سوم باب دوم

اب اگر یے لگان زمین یا جرعوں کی پیداوار مجموعی پیداوار کا جزو قلیل ہو اور سخت ناگزیر نہو۔ تو ایسی زمینوں کی کاشت اور جرعوں کا استعمال ترک ہوکر۔ مقدار پیداوار میں خفیف سی کمی ہوکر نرخ میں تھوڑا سا اضافہ ہونا ممکن ہی۔ لیکن مالگذاری کا بیشتر حصہ معاشی لگان سے وصول ہوگا۔ اور بحیثیت مجموعی کاشت اور نرخ پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑیگا۔ صرف زمیندار یا کاشتکار کی آمدنی جو اسوقت تک کل معاشی لگان پا رہے تھے۔ گھٹ جائے گی۔

اسکے برعکس اگر یے لگان زمین اور جرعوں کی پیداوار مجموعی مقدار کا جزو اعظم ہو اور قطعاً ناگزیر ہو۔ تو کاشت بحالت موجودہ جاری رہیگی۔ مالگذاری مصارف میں شامل ہوکر اسی قدر نرخ بڑھا دیگی۔ ہر زمین کے لگان کی قیمت وہی رہیگی۔ البتہ مقدار میں تخفیف ہوجائیگی۔ چنانچہ شکل نمبر ۹ سے یہ نتیجہ بخوبی واضح ہوگا۔
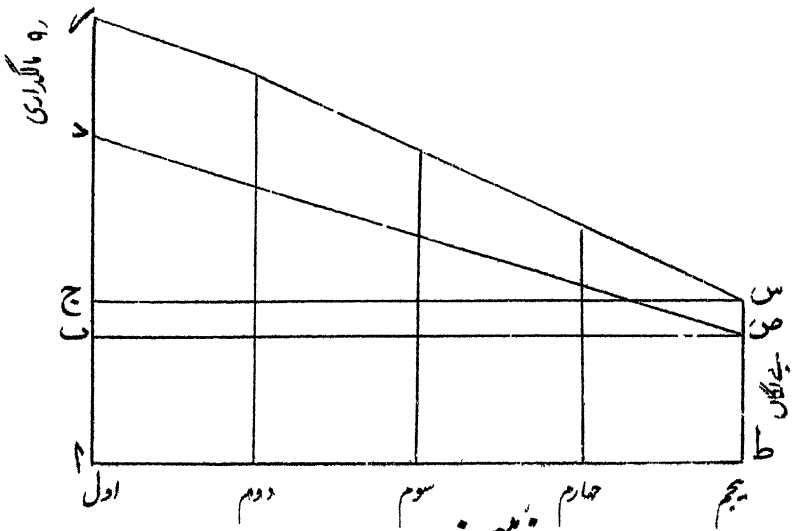
قبل مالگذاری نرخ ا ح ہی اور مقدار لگان ج ر س بعد قیام مالگذاری بشرح یک

چہارم پیداوار نرخ بھی اسی شرح سے بڑھکر اب ہوجاتا ہی۔ لگان کی مقدار گھٹ کر ب د ص رہ جاویگی۔ لیکن بوجہ اضافہ نرخ۔ قیمت سابق برقرار رہیگی۔ اُس شکل میں مختلف زرخیزی کی زمینوں کا اوسط پیداوار فی جرعہ دکھایا گیا ہی اور بغرض سہولت فرض کیا گیا ہی کہ تمام زمینوں میں صرف ایک ہی جرعہ استعمال ہوتا ہی۔

یا فرض کرو کہ اعلیٰ اوسط اور ادنیٰ تین زمینیں ہیں جن سے علی الترتیب ۱۵ ۱۲ اور ۸ من غلہ پیدا ہوتا ہے اور بنسبت مصارف ۴- ۵ اور ۶ روپیہ من ہے۔ اس حالت میں اعلیٰ اور اوسط زمین کو ۵ من اور ۲ من لگان قیمتی ۳۰ و ۱۲ روپیہ حاصل ہوگا۔ اب فرض کرو کہ تینوں زمینوں پر بشرح ایک چوتھائی پیداوار مالگذاری قائم کردیجائے اور ادنیٰ زمین کی پیداوار بھی سخت ناگزیر ہو۔ چونکہ ادنیٰ زمین ہمارے مفروضہ کے مطابق بے لگان ہی اسکے باقی ۶ من کی قیمت سابق ۸ من کے لازمًا برابر ہوجائیگی اور نرخ بجائے ۶ روپیہ من کے ۸ روپیہ من قرار پائیگا۔ چونکہ کل کی $\frac{1}{4}$ مالگذاری باقی $\frac{3}{4}$ کے ایک تہائی یعنی $\frac{1}{4}$ کے برابر ہی۔ قیمت بھی اسی نسبت سے ۶ روپیہ کے $\frac{1}{3}$ کی برابر بمقدار ۲ روپیہ بڑھکر ۸ روپیہ ہوجاتی ہی۔ گویا مالگذاری اور اضافۂ نرخ کی نسبت یکساں ہوتی ہی۔ قیام مالگذاری کے بعد اعلیٰ اور اوسط زمین کا لگان علی الترتیب { مصارف (۱۵×۴) - ($\frac{1}{4}$ ۱۱ × ۸) قیمت } وہی ۳۰ روپیہ اور { مصارف (۱۲×۵) - (۹ × ۸) قیمت } ۱۲ روپیہ رہے لیکن بوجہ اضافہ نرخ مقدار بجائے ۵ من اور ۲ من کے صرف ۳ $\frac{3}{4}$ اور ۱ $\frac{1}{2}$ رہجائیگی۔ ان دو مثالوں پر غور کرنے سے مذکورۂ بالا نتائج صاف ظاہر ہوسکتے ہیں۔

لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ اضافہ نرخ میں دیر بھی لگتی ہی اور اسکی نسبت مالگذاری کی نسبت سے کم رہتی ہی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ کاشت میں کچھ کمی ہوجاتی ہی۔

حصہ سوم
باب دوم
زمین کو
قومی ملک
بنانے
کی تجویز

کچھ نرخ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور کچھ زمیندار یا کاشتکار کی آمدنی گھٹ جاتی ہے ان سہ گانہ تبدیلیوں کی باہمی نسبت حالات حاضرہ پر منحصر ہوتی ہے۔

(۲) لگان میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے وہ زمین کی قدرتی خواص اور یہی عام معاشی ترقیات کا نتیجہ ہے جس میں زمیندار کی ذاتی کوشش کو کچھ دخل نہیں زمین کی ترقی میں زمیندار اگر کچھ محنت اور اصل صرف کرتا ہے تو اُسکا معاوضہ بشکل اجرت و سود لگان سے جداگانہ شمار ہوتا ہے۔ زمیندار کے حق میں لگان کو محض خوش قسمتی اور حسن اتفاق کا نتیجہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا۔ یہی حال زمینوں کی قیمت کا ہے کہ مالک کے ہاتھ ہلائے بغیر دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ اضافہ قیمت بھی اسباب لگان کا آفریدہ ہے۔ حاصل کلام یہ کہ لگان اور قیمت زمین قدرت اور بیشمار غیر متعلق لوگوں کی کوشش سے بسرعت بڑھ رہی ہیں اور ہر اضافہ پر صرف قبضہ کرنا زمیندار کا کام ہے۔ شہر شکاگو میں ایک افتادہ زمین جو ۱۸۳۰ء میں محض مفت ایک آنہ فی مربع گز سے بھی کم قیمت پر خریدی گئی چونسٹھ برس کے عرصہ میں حسن اتفاق کی بدولت شہر کی توسیع سے اُس کا موقع ایک ایسے آباد اور کاروباری چوک کے کنارے آپڑا کہ ۱۸۹۴ء میں وہی زمین تین ہزار روپیہ گز سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت ہوئی۔ غضب ہے کہ ۱۸۹۵ء میں لندن کے مشہور عالم بازار لمبارڈ اسٹریٹ کے پہلو میں ایک قطعہ اراضی سترہ ہزار روپیہ فی گز سے کچھ ہی کم قیمت پر فروخت ہوا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عام ملکی اور معاشی ترقیات جو بیشمار لوگوں کی محنت اور اصل کی کوشش کا نتیجہ ہیں لگان اور قیمت یوں بے حد و حساب بڑھا ئیں تو ان اضافوں کی مالک بھی منجانب ملک، گورنمنٹ کیوں نہ بنے۔ مالک زمین اپنی محنت اور اصل کا معاوضہ شوق سے لے لیکن ما حصل زاید کے لامحدود اضافوں سے اس کو کیا تعلق

عوام کی کوشش اور صرف سے وہ پیدا ہوتا ہے اور عوام کی نمائندہ گورنمنٹ اس کی جائز حقدار ہے۔

اضافہ ما حصل زاید پر گورنمنٹ کے قبضہ کرنے کی چند ترکیبیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ گورنمنٹ کل زمین مالکوں سے خود خرید لے لیکن اوّل تو اس کے واسطے کافی رقم مہیا ہونی دشوار۔ دوسرے بحیثیت ملک سرکار لاتعداد قطعات کا انتظام بہت طوالت طلب و بیش خرچ ہوگا۔ زیادہ آسان ترکیب یہ ہے کہ سرکار مالگزاری اور اور ہاوس ٹیکس اس قدر بڑھا دے کہ مالک زمین کو اس کے اصل اور محنت کا جو خرید زمین اور اس کی ترقیات میں صرف ہوئی ہو پورا پورا معاوضہ ملکر باقی کل اضافہ داخل خزانہ ہو۔ اس صورت میں گورنمنٹ بہت کچھ دردسر سے بچے گی اور مقصد اصلی بھی حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ اکثر مہذب ممالک میں یہی طریق رواج پا رہا ہے۔

لیکن واضح ہو کہ طریق آخر الذکر میں بھی چند خطرناک نقص مضمر ہیں اوّل تو زمیندار کے اصل و محنت کا معاوضہ باقی اضافہ سے جدا کرنا دشوار ہے اور اندیشہ ہے کہ سرکاری ملازموں کا اندازہ اکثر خلاف واقعہ اور زمیندار کے حق میں مضر ہوگا۔ یہ طرز عمل نہ صرف انصاف کے خلاف ہے بلکہ زرعی ترقیات اور اضافہ کاشت یا بالفاظ دیگر ملکی مرفہ الحالی کے سخت منافی ہوگا۔ دوسرے جبکہ گورنمنٹ اضافہ لگان وقیمت زمین کی مالک بنتی ہے تو عام ملکی حالات کی تبدیلی سے زمیندار کے معاوضہ میں جو کمی پیدا ہو اس کی تلافی کرنی بھی گورنمنٹ پر فرض ہونی چاہیئے ورنہ نفع ہتیانا اور نقصانات کا بار غریب زمیندار پر ڈالنا تو وہی مثل ہوگی کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ گورنمنٹ اپنی گرہ سے ایسے نقصانات کی تلافی کرنے پر کہاں تک آمادہ ہوگی۔ تیسرا اعتراض بھی معقول ہے کہ کل لگان یا اضافہ قیمت پر گورنمنٹ کا

قبضہ ہو جانے سے زمین کی قیمت بیحد گھٹ جاوے گی اور جن لوگوں نے موجودہ بڑہی ہوئی شرح سے زمین خریدی ہے یا تو اُن کو جدید تخفیف قیمت کا معاوضہ ملنا چاہئے یا تخمینہ لگان سے اس کل رقم کا سود خارج کرنا چاہیئے جو اس نے قیمتاً ادا کیا ہو - ورنہ کسی عام شرح سے اپنر مالگذاری یا ٹیکس قائم کرنا سراسر بیجا او ظلم ہوگا -

ظاہر ہے کہ طریق دوم کے رواج میں بھی کس قدر احتیاط لازمی ہے اور اس کا لحاظ رکھنے کی سرکاری ملازموں سے توقع کرنا خلاف تجربہ اور مشاہدہ ہے - بد احتیاطی جس کا اثر سرکار کے موافق اور زمیندار کے مخالف ہونا تقریباً یقینی ہوتا ہے نہ صرف لوگوں کے حق میں ظلم بلکہ عام بہبودی اور مرفہ الحالی کے واسطے سخت مضر ہوگی -

گویا سب سے بہتر یہ ہے کہ جدید نظام میں کوئی بڑا رد و بدل نہ کیا جائے - اضافہ لگان و ہاوس ٹیکس میں نہ صرف بلحاظ انصاف بلکہ بخیال بہبودی عامہ اعتدال ملحوظ ہے - ملکی ترقی روک کر سرکاری آمدنی بڑہانا گویا مرغی مار کر سونے کے انڈے لینے کی ہوس کرنا ہے - البتہ اب سے موجودہ طریق ملک کو روکا جائے جو رمیں اب تک کسی کی ملک نہوں سرکارات پر قبضہ کر لے اور اُن کے لگان اور قیمت کی بلا شرکت غیرے مالک بنے

چنانچہ اسی اصول پر جنگلات سرکاری ملک قرار دیے جا رہے ہیں - عام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک زمین کے معاملہ میں صرف گزشتہ را صلوٰۃ و آیندہ را احتیاط کا اصول قابل عمل اور بے ضرر نظر آتا ہے زمین کے نجی ملک کا موجودہ طریق ناقص سہی لیکن اس قدر پھیلا ہوا ہے اور مستحکم جڑ پکڑ چکا ہے کہ اس کے استیصال کی کوشش سے اور بھی زیادہ مضرت پہنچنے کا خوف ہے - البتہ ایک حد تک تدریجی اصلاح ممکن ہے

حصہ سوم
باب سوم

باب سوم

اجرت

فصل اوّل

قوانین اجرت

(۱) تجزیہ اجرت کا مفہوم (۲) قوانین اجرت (۳) مسئلہ اجرت فنڈ (۴) مسئلہ معیار مایحتاج زندگی (۵) مسئلہ پیدا آوری محنت (۶) مسئلہ پیدا واری تخمینہ (۷) اجرت و لگان کی مساوات

اجرت کا مفہوم

نہ دانوں تو ہر قسم کی محنت کا معاوضہ اجرت ہے۔ لیکن معیشت جس اجرت سے بیشتر بحث کرتا ہے وہ محنت کی ایک خاص حالت سے متعلق ہے۔ ہم اصل داروں اور آجروں کی نوعیت مختصراً دولت کے حصہ داروں کے تحت میں بیان کر چکے ہیں۔ جب سے ان دو طبقوں نے زور پکڑا۔ مزدوروں کا بھی ایک گروہ کثیر پیدا ہو گیا اور محنت بھی مثل دیگر اشیا باقاعدہ خرید و فروخت ہونے لگی۔ محنت فروش مزدور خریدار آجر اور قیمت اجرت کہلاتی ہے۔ اس سے قبل نہ تو تجارت محنت کا بازار اس قدر گرم تھا اور نہ اجرت مثل قیمت معاشی قوانین کی اس قدر پابند ہو سکتی تھی۔ اکثر صناع اور پیشہ ور اپنے ہی اصل سے بطور خود چیزیں تیار کرتے تھے۔ پیداوار کی قیمت میں سود اور اجرت دونوں شامل تھے۔ لیکن بوجہ ملک واحد ہونے کے۔ اُن کی تفریق غیر ضروری تھی۔ محنت کی خرید و فروخت خانگی خدمات مثلاً یا و چیگری سائیسی خدمتگاری یا چند معزز پیشوں مثلاً معلمی طبابت تک محدود تھی۔ شرح اجرت بیشتر رسم و رواج کی پابند تھی اور تعین شرح پر معاشی قوانین کا اثر آج کل کے

مقابلہ میں عشر عشیر بھی نہ تھا گوناگوں ترقیات کی بدولت تجارتِ محنت نے وہ فروغ پایا ہے کہ تمام ملک اس کی منڈی بنا ہوا ہے۔ ہر ملک کا گروہ کثیر اس کاروبار میں لگا ہوا نظر آتا ہے اور خواص محنت کی وجہ سے جن کی تشریح اوپر کیجا چکی ہے مزدور اور اجرت ہر ترقی یافتہ ملک میں نہایت دشوار اور نتیجہ خیز معاشی مسائل خیال کیے جاتے ہیں۔ اجرت کو اکثر مزدور کا حصہ پیداوار یا حصہ قیمت پیداوار کہتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اجرت پیداوار کی تیاری اور فروخت کے قبل محنت شروع ہوتے ہی آجر بشکل زر ادا کرنے لگتا ہے۔ مزدور کو نہ تو پیداوار مابعد میں سے حصہ ملتا ہے۔ نہ فروخت پیداوار تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کام شروع ہوتے ہی آجر ماحصل مستقبل کی امید پر اپنی گرہ سے اجرت روزانہ ہفتہ وار یا ماہانہ پیشگی ادا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اجرت کی مذکورہ بالا تعریف ایک معنی میں صحیح ہے کیونکہ اجرت کا موجودہ پیداوار اور ماحصل مستقبل کی مقدار سے اور جب سے زر ادائیگی کا رواج ہوا ہے قیمت سے بھی قریبی تعلق ہے۔ انہی تعلقات کی تحقیق و تشریح معیشت کا منشا ہے۔

قوانین اجرت

(۲) بظاہر تو شرح اجرت باہمی رضامندی اور معاہدہ سے قرار پاتی ہے۔ لیکن خود رضامندی اور معاہدہ گوناگوں معاشی حالات سے بیحد اثر قبول کرتے ہیں حتیٰ کہ تعین اجرت کے اسباب معاشی قوانین کے تابع ثابت کیے جاتے ہیں۔ رہا اجرت پر رسم و رواج کا اثر۔ سو وہ بھی سیاسی اور معاشی ترقیات سے بسرعت زائل ہو چلا ہے اول اول شرح اجرت کو قانون طلب و رسد سے سمجھایا گیا۔ اگر دو آجر ایک مزدور کو بلاویں تو اجرت بڑھے گی۔ اور اگر دو مزدور ایک آجر کی طرف دوڑیں تو اجرت گھٹیگی یہ مسئلہ بالکل درست سہی لیکن یقیناً سطحی ہے اور علمی صحت و صراحت سے معرا۔ یہ صرف ایک واقعہ کا بیان ہے۔ کمی بیشی اجرت کے اسباب اور حدود کا اس سے کچھ پتہ نہیں

حصہ سوم
باب سوم
مسئلہ
اجرت
فنڈ

چلتا۔ تاہم اس قانون کا اجرت کے اساسی قوانین سے قریبی تعلق ہے۔ جن کی توضیح آیندہ فرق اجرت کے تحت میں کرینگے اوّل قوانین اجرت مع تنقید درج ذیل کرتے ہیں

(۱) اوائل بیسویں صدی میں انگلستان کے مزدوروں کی مالی حالت مقابلہ دیگر ممالک یورپ سے بدرجہا بہتر تھی اور ساتھ ہی اس کے وہاں اصل کی مقدار بھی سب ملکوں سے بہت زیادہ موجود تھی۔ لہٰذا اس زمانہ کے علما معیشت نے مقدار اصل اور شرح اجرت کے درمیان براہ راست ایک قریبی تعلق قرار دیا جس کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے چنانچہ پیدائش دولت کے بیان میں یہ رشتہ واضح کیا جا چکا ہے۔ اصل محنت بغیر مردہ ہے اور محنت اصل بغیر اپاہج۔ مزدور کو اصل نہ صرف بشکل آلات مشین و پیداوار خام درکار ہے بلکہ بطور مایحتاج زندگی مثلاً خوراک و لباس بھی ناگزیر ہے۔ تاکہ دوران عمل پیدائش میں وہ زندہ اور تندرست رہے لیکن بہت کم اصل مزدوروں کی ذاتی ملک ہوتا ہے۔ بحالت موجودہ آجر اصل داروں سے اصل بمعاوضہ سود مستعار لیکر کارخانہ جاری کرتے ہیں جن میں مزدور اصل قائم سے کام کرتے اور اصل قسم دائر بطور اجرت پاتے ہیں بہرحال اصل محنت کا ناگزیر معاون ہے اور اس کا اضافہ مزدوروں کے حق میں بیحد مفید ہے۔ چنانچہ کمی وبیشی اصل کا نتیجہ مشرق و مغرب کے مزدوروں کی مالی حالت سے بخوبی روشن ہے۔

لیکن گزشتہ صدی کے علما معیشت نے محنت و اصل کے مذکورہ رشتہ پر اکتفا نکرکے اس میں مبالغہ سے کام لیا اور صحت کی کوشش میں حقیقت سے تجاوز کر گئے۔ انہوں نے اصل دائر کی مقدار جو ادائیگی اجرت میں صرف کیا جاتا ہے معین تصور کرکے شرح اجرت کو تعداد مزدوران اور مقدار اصل دائر کی باہمی نسبت پر منحصر قرار دیا۔ مثلاً اگر کسی ملک میں اصل دائر کی مقدار ایک کروڑ روپیہ ہو اور مزدوروں کی تعداد ایک لاکھ تو ہر مزدور کی اوسط آمدنی سو روپیہ سال ہوگی۔

حصہ سوم
باب سوم

جدید تحقیقات سے چند معقول اعتراضات کی بنا پر یہ مسئلہ غیر معتبر قرار پا چکا ہے۔ اول تو اصل دائر کی کوئی ایسی مقدار معین فرض کرنا جس کی ادائگی بشکل اجرت لازمی ہو محض بے بنیاد ہے آجر ہمیشہ اپنی ذاتی غرض سے جو متعدد اسباب کے تابع ہوگی اجرت میں کمی بیشی کرتا ہے کسی مقدار معین کی لازمی تقسیم کی مجبوری سے اجرت میں تبدیلی نہیں کرتا۔ دوسرے خود اس مسئلہ کی سلاست ایک سطحی دھوکا ہے۔ غور کرنے سے اس کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ اجرت کی مجموعی مقدار تعداد مزدوران سے تقسیم کرکے اوسط شرح اجرت دریافت کی جاتی ہے۔ ایک معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ کثرت اصل اضافہ اجرت کا باعث ہوتا ہے لیکن یہ دونوں باتیں اس قدر صریح ہیں کہ انکا بیان تحصیل حاصل ہے۔ لہذا اس مسئلہ سے اجرت کی کوئی علمی توضیح نہیں ہوتی بایں ہمہ اس سے محنت و اصل کے باہمی تعلق پر توجہ ضرور منعطف ہوتی ہے۔

موجودہ ایجادات نے اصل میں بشکل مشین جو کچھ اضافہ کیا ہے اور جس کی بدولت عمل پیدائش میں اصل و محنت کے حصے گھٹتے بڑھتے ہیں۔ اس سے پیدائش دولت کے تحت میں مفصل بحث کی جا چکی ہے۔ اس موقع پر مذکورہ بالا بحث کی طرف رجوع کرنا خالی از منفعت نہ ہوگا۔

بہر حال اضافہ اصل کا خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ نتیجۃً قریب یا بعید از دیاد طلب محنت اور بیشی شرح اجرت ہوتا ہے لہذا مسئلہ اجرت فنڈ سے محنت کے پہلوئے طلب پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے۔ محنت کا پہلوئے رسد جو اس مسئلہ میں سراسر نظر انداز کیا گیا ہے ایک دوسرے مسئلہ سے واضح ہوگا جس کو ہم درج ذیل کرتے ہیں اور ان دونوں کی روشنی میں محنت کے ہر دو پہلوئے طلب و رسد کا مطالعہ کرنے سے اجرت کے متعلق ایک قرین حقیقت مسئلہ مترتب ہو سکتا ہے۔

حصۂ سوم
باب سوم
مسئلہ
معیار
مایحتاج
زندگی

(۴) جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے بڑے بڑے کارخانے مل اور فکٹری جاری ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور بھی اپنی محنت کو آجر کے ہاتھ مثل دیگر اشیا بکثرت فروخت کرنے لگے قیمتِ محنت اجرت کہلائی۔ عام قاعدہ ہے کہ کسی چیز کی قیمت اس کے مصارفِ پیدائش سے کم نہیں ہو سکتی کسی قدر زیادہ یا کم از کم برابر ضرور ہوگی۔ ایسا کون احمق ہوگا جو نقصان اٹھانے کے لیے کوئی چیز بنانے کی زحمت گوارا کریگا۔ اگر کسی وجہ سے قیمت مصارفِ پیدائش سے گھٹ جائے تو جلد سے جلد ایسی چیز کی پیدائش ترک کردیجاوے گی پس قیمت کا مصارف پیدائش کے کم از کم مساوی ہونا ہر چیز کی پیدائش کے واسطے شرط لازمی ہے۔ اس اہم مسئلہ سے مبادلۂ دولت کے بیان میں مفصل بحث کرینگے۔ یہاں اس کا سیدھا سادھا مفہوم سمجھ لینا کافی ہے۔ فرض کرو انجن سے برقی طاقت بنائی جاتی ہے اب جو کوئلہ انجن چلانے میں جلتا ہے اس کی قیمت اور نیز مطالبات و سود کی ایسی شرح سے کہ انجن کہنہ اور بیکار ہونے تک اس کی کل قیمت وصول ہو جائے جس سے نیا انجن خریدا جا سکے یہ دونوں مدیں برقی طاقت کے مصارف پیدائش میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں زمین کا لگان انجن تعمیرات فکٹری میں جو لاگت لگی ہے اس کا سود اور ملازمین کی تنخواہ بھی جزو مصارف ہیں۔ لیکن اس موقع پر اول الذکر دو مدوں کا لحاظ کرنا کافی ہے باقی نظر انداز کی جاتی ہیں۔ مزدور اور محنت کا تعلق بھی بعینہ ایسے انجن اور برقی طاقت کا سا ہے گویا مزدور کی مایحتاج زندگی اور پرورش اولاد کے مصارف جو اس کے جانشین ہوں گے مصارف پیدائش محنت میں شامل ہیں اور اگر اجرت کسی وجہ سے اُن کی مجموعی مقدار سے گھٹ جائے تو افلاس غریب مزدور کی زندگی کو ناقابل برداشت بنا کر اس کو جلد تباہ کر دے گا۔ اور اس تباہی کا اثر آیندہ نسلوں پر پھیلکر کثرت مرض ضعف

پست حیالی اور ناکارگی جیسی ناقابل اصلاح ابتری کا باعث ہوگا اور عام مرفہ الحالی کے سرچشمے مسدود کردیگا کسی چیز کا بنانا یا نہ بنانا اختیاری ہے بصورت اندیشہ نقصان پیدائش ترک کیجاسکتی ہے لیکن غریب مزدور کو محنت سے کوئی مفر نہیں اوّل تو اسکے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ بیکار بیٹھکر کہا سکے۔ دوسرے ترک محنت خود اس کے حق میں سراسر نقصان ہے۔ چنانچہ مزدور کی ان کمزوریوں سے خواص محنت کے تحت میں ہم مفصل بحث کرچکے ہیں۔ پس تخفیف اجرت کے لحاظ سے غریب مزدور کی حالت نہایت قابل رحم ہے اور اکثر اس پر نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی مثل صادق آتی ہے لیکن جیساکہ اشارہ کیا جاچکا ہے ارحد تخفیف اجرت نہ صرف مزدور کے حق میں تباہ کن ہے بلکہ ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کو بھی ناقابل تلافی مضرت پہنچاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہوچکا کہ اجرت کا مزدور اور اس کے خاندان کی مایحتاج زندگی کے واسطے کافی ہونا کس قدر ضروری اور مفید ہے۔ اب سال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مایحتاج زندگی کا کوئی معیار معین ہے یا اس میں کمی بیشی ممکن ہے۔ اور اگر ہے تو ایسی تبدیلی تخفیف و اضافہ اجرت کی پیشرو ہے۔ یا پس آیندہ۔

اٹھارویں صدی کے آخری نصف دوران میں جب حکما متوکلین نے اس مسئلہ کی بناڈالی تو اس وقت فرانس کے مزدوروں کی مالی حالت نہایت خستہ تھی اور جو کچھہ اجرت ملتی تھی وہ اشد مایحتاج زندگی کے واسطے بمشکل کفایت کرتی تھی وقتی حالات سے متاثر ہوکر انھوں نے قرار دیا کہ مایحتاج زندگی ناگزیر ضروریات تک محدود ہے اور اجرت اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اوّل تو پہلے ہی سے بیکار اور متلاشی روزگار مزدوروں کی ایک بڑی جماعت موجود ہے دوسرے آبادی اصل اور کاروبار سے کہیں زیادہ جلد بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اجرت ناگزیر

حصہ سوم باب سوم

ضروریات کی حد سے سر مو نہیں بڑھ سکتی۔ البتہ گھٹنے کا اندیشہ اکثر دامنگیر رہتا ہے چنانچہ پس ماندہ ممالک میں ابتک مزدوروں کا یہی حال ہے۔ گنی بوٹی یا شوربا وہی کنواں کھودنا وہی پانی پینا۔ اگر چار دن کام نہ ملے تو اندوختہ کا صفایا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مایحتاج زندگی ضروراً شد ضروریات تک محدود ہے اور اجرت مایحتاج تک۔

لیکن ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی مالی حالت دیکھکر یقین ہوتا ہے کہ مایحتاج زندگی کا کوئی ایسا معیار معین نہیں کہ اس میں ردوبدل نہو سکے بلکہ ناگزیر ضروریات سے لیکر رسمی ضروریات حتی کہ کم خرچ تعیشات اس میں شامل پائی جاتی ہیں گویا مایحتاج کا معیار کسی ملک کی معاشی ترقی یا پس ماندگی کے مطابق بلند اور پست ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکن مزدور اچھا خاصا خوش خوراک خوش پوشاک ہے اور اس کے مکان میں علاوہ ضروری سامان کے۔ آرائش و تفنن طبع کی بھی معمولی چیزیں از قسم تصاویر و باجہ موجود ملیں تو عجب نہیں شنبہ کی رات کو وہ کہیں تماشے دیکھنے کا بھی لطف اُٹھاتا رہتا ہے البتہ اس میں ایک عیب ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ فضول خرچ ہے اور اڑے وقت کے خیال سے کافی پس انداز نہیں کرتا۔ لیکن مزدوروں کی انجمن اتحاد نے ضمانت فنڈ قائم کر کے۔ جس کا ہم آیندہ مفصل حال لکھیں گے یہ خرابی بھی ایک بڑی حد تک رفع کر دی۔ یورپ کے مزدوروں کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔ لیکن ایشیا میں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے یعنی مزدور کی زندگی سب سے سادی اور کم خرچ ہے اور اس کی شرح اجرت بھی بہت کم ہے۔ ہندوستانی مزدور کی حالت اس سے بہتر سہی۔ لیکن یورپین مزدور کے مقابلہ میں پھر بھی ادنیٰ ہے نہ اس کو زندگی کا اس قدر لطف

لطف میسر ہی نہ اس کے پاس زیادہ اندوختہ۔ یہ تو تحقیق ہو چکا کہ مزدوروں کا معیار
مایحتاج زندگی ہر ملک میں جدا ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بلند اور پس ماندہ میں
پست اب یہ سوال ہوتا ہے کہ آیا اضافہ اجرت بلندی معیار کا باعث ہوتا ہے
یا نتیجہ بحیثیت عمل کس کو کس پر تقدم حاصل ہے۔

گو تعجب ہوتا ہے لیکن علماء معیشت کے ایک گروہ کا قول ہے کہ معیار مایحتاج
سے اجرت قرار پاتی ہے۔ گویا کہ معیار بلند کرنے سے اجرت میں اضافہ ہوتا ہے۔
لیکن اگر ایسا ممکن ہوتا تو غریب مزدور کے دن پھر جاتے۔ جب چاہتا نئی نئی
ضروریات اختیار کر کے اجرت میں اضافہ کرا لیتا۔ اور حسب دلخواہ زندگی کا
لطف اٹھاتا۔ سیدھا سادھا کھانا موٹے جھوٹے کپڑے اور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں پر قناعت کرنے کی
اس کو کون خوشی یا مجبوری ہوتی۔ ہم نہیں کہتے کہ اس طریق سے وہ اجرت میں لاانتہا اضافہ
کرا سکتا لیکن کم از کم موجودہ تنگدستی کو وہ ضرور رفع کر دیتا اور اپنے کو ایسا بے بس اور
لاچار نہ پاتا کہ دوسروں کی ہمدردی اور حمایت کا محتاج ہوتا۔

واضح ہو کہ اگر محنت کی رسد محدود ہو اور طلب غالب۔ یا بالفاظ دیگر اگر مزدوروں کی
تعداد معین ہو اور ان کی بہت جگہ مانگ ہو گویا کہ کوئی مزدور بیکار نہ ہو تو ایسی حالت میں
مزدور جتھا کر کے اجرت میں مناسب اضافہ کرا سکتے ہیں چنانچہ محنت باصہارت کی اجرت
میں اس تدبیر سے مزدوروں کے موافق تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن محنت بے مہارت
کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے بیکار مزدوروں کی جماعت موجودہ شرح اجرت
قبول کر کے کوشش اضافہ سے مزاحم ہوتی ہے اور مزدوروں کا گروہ اعظم اسی دشواری
سے اضافہ اجرت میں لاچار ہے لیکن دباؤ ڈالے بغیر اضافہ اُن کی اجرت میں کبھی بتدریج
برابر ہو رہا ہے اور ساتھ ساتھ معیار مایحتاج بلند ہوتا جاتا ہے۔ مگر اس تبدیلی کے اسباب کچھ

حصہ سوم
باب سوم

اور جن کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

مسئلہ پیدا آوری محنت

(۵) جیسا کہ عاملین پیدائش کی بحث میں واضح کیا جاچکا ہے۔ محنت کیا ہے۔ دولت پیدا کرنے کا ایک آلہ۔ اس کا افادہ کیا ہے پیدا آوری۔ معلوم ہے کہ زمین کی قیمت زرخیزی اور اصل کی قیمت طاقت محرکہ کے مطابق ہوتی ہے اور یہ دونوں معیار قیمت افادہ پیدا آوری کی محض مختلف شکلیں ہیں۔ پس اگر محنت کی قیمت بھی یعنی اجرت مقدار پیدا آوری پر منحصر ہو تو کیا عجب ہے۔ چنانچہ خود واقعات اس اصول کے شاہد ہیں۔ جس مزدور کی محنت میں پیدا آوری خواہ بشکل عمدگی یا مقدار کام خواہ بشکل ہر دو زیادہ پائی جاتی ہے اس کو اجرت بھی زیادہ دی جاتی ہے اجرت اور پیدا آوری کا تعلق اس قدر بدیہی ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن اصول پیدا آوری سے صرف اجرت کی کمی بیشی کا ایک اساسی سبب واضح ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم تعین شرح اجرت کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کریںگے۔

پیداوار محنتم

(۶) یوں تو پیدائش دولت کے واسطے ہر سہ عاملین زمین محنت اور اصل کی شراکت لازمی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ زراعت میں زمین کا حصہ غالب رہتا ہے اور صنعت وحرفت میں اصل کی کارگزاری خاص طور سے قابل لحاظ ہوتی ہے محنت دونوں صورتوں میں یکساں ضروری ہے اوپر جابجا خصوصاً لگان کی بحث میں زراعت پر قانون تقلیل حاصل کا قوی اثر ظاہر کرچکے ہیں یعنی یہ کہ کاشت میں چند ابتدائی جرعوں کے استعمال کے بعد کوئی ایک جرعہ ایسا پایا جاتا ہے کہ اس کا اور اس کے مابعد جرعونکا ماحصل مقابلتہً ماسبق جرعوں کے ماحصل سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان جرعوں میں محنت اور اصل دونوں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر قطعہ زمین کی طرح مقدار اصل بھی جو استعمال ہو مقرر کرلی جائے اور خالص محنت کے جرعوں میں اضافہ کیا جائے تو بھی اس قانون کا عملدرآمد نمودار ہوگا مثلاً دس بیگہ

زمین میں سو روپیہ کی لاگت سے کاشت کی جائے خود کاشتکار اور اس کے دو لڑکے مل جلکر
کھیت پر کام کریں۔ اور ۵۰ من غلہ پیدا ہو۔ اب اگر ایک مزدور لگایا جائے تو پیداوار ۶۰ من
ہو جائے۔ دو مزدور بڑھانے سے ۶۶ من اور تین بڑھانے سے ۷۰ من ہو گی۔ ایسی حالت
میں مزدور اوّل کی محنت کی پیداوار ۱۰ من دوم کی ۶ من اور سوم کی ۴ من شمار
ہو گی اب اگر مزدور سوم بقدر ۴ من اجرت طلب کرے تو کاشتکار کو کچھ بچت نہ ہو گی اور
غالباً وہ اس کو رکھنے پر رضامند نہ ہو گا اس لیے جب کہ مزدور سوم کو بوجہ تہیدستی محنت کے
بغیر کوئی چارہ ہی نہیں اور بوجہ کثرت مزدوران بہ پابندی قانون تقلیل حاصل اس سے
زیادہ اپنی محنت سے پیدا ہی نہیں کرسکتا تو بمجبوری اس کو کچھ کم چار من اجرت پر قناعت
کرنی ہو گی۔ لیکن لطف یہ ہے کہ کاشتکار اوّل اور دوم مزدور کو بھی اس سے زیادہ اجرت
دینا گوارا نہ کریگا اور اُن کو بھی قبول کرنی پڑے گی کیونکہ بحالت مفروضہ اُن کو دوسری
جگہ ۴ من سے زیادہ اجرت نہیں ملسکتی اگر ایسا ممکن ہوتا تو مزدور سوم ہی ۴ من پر کیوں
رضامند ہوتا۔ اگر مزدور اوّل یہ کھیت چھوڑ کر دوسری جگہ کام تلاش کرے تو اس کی
حیثیت مزدور سوم کی سی ہو گی۔ اور نئی جگہ غالباً وہی ادنے اجرت قبول کرنی پڑیگی
کاشتکار زیر بحث کا مزدور اوّل کے چلے جانے سے کوئی نقصان نہ ہو گا کیونکہ اب باقی
دونوں مزدوروں کی محنت کا پیداوار ۱۰ من اور ۶ من ہو جانے سے ۴ من شرح
اجرت کے حساب سے وہی ۸ من بچت ہو گی جو پہلے ہوتی۔ اگر موجودہ مزدور دوم نے اپنی
پیداوار محنت کے اضافہ کی بنا پر اجرت میں بھی اضافہ چاہا تو متلاشی روزگار مزدوروں
میں سے کوئی نہ کوئی آکر مزدور سوم کی جگہ لے لیگا اور اضافہ اجرت پر بوجوہات
مذکور الصدر پھر وہی بندش قائم ہو جائے گی۔ جو مزدور اوّل کے جانے سے قبل پیش
آئی تھی۔ بلکہ اگر کوئی گردش کا مارا چوتھا مزدور کھیت مذکور الصدر پر آ لگے

حصہ سوم
باب سوم

اور قانون تقلیل حاصل کی بدولت شرح اجرت ۴ من سے بھی گھٹادے تو عجب نہیں۔ مذکورہ بالا تیسرے یا چوتھے مزدور اور اس کی محنت کی پیداوار کو مزدور مختتم اور پیداوار مختتم کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ اجرت قانون تقلیل حاصل کے اثر سے پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے اور مزدوروں کی کثرت سے اس کی مقدار میں کمی ہوتی ہے۔

زراعت کی مثال میں ہمنے اوپر جو کچھ بیان کیا۔ بعینہ وہی حال صنعت وحرفت کا ہے عمل پیدائش میں وہاں زمین کا حصہ بڑھا ہوا ہے یہاں اصل کا۔ اس فرق سے قانون تقلیل حاصل کے عملدرآمد میں کوئی تغیر نہیں ہوتا مثال بالا میں اگر کھیت کے بجائے کارخانہ اور زراعت کے بجائے صنعت اور ۴ من کے بجائے چار شئے لکھدیجائیں تو اس کی صحت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہاں یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے قبل صنعت وحرفت قانون تکثیر حاصل کی ماتحت بتائی جاچکی ہے یہاں وہ قانون تقلیل حاصل کے تابع کہی جاتی ہے۔ گویا اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ لیکن یہ ایک سطحی دہوکا ہے قانون تقلیل حاصل کی ماتحتی سے مراد یہ ہے کہ قطعہ اراضی کی طرح کوئی مقدار اصل بھی لامحدود محنت کی متحمل نہیں ہوسکتی یعنی یہ ممکن نہیں کہ اگر دس ہزار اصل سے ۵۰ مزدور کام کرکے ایک مقدار پیدا کریں تو اسی اصل سے سو مزدور کام کرکے دوگنی مقدار پیدا کرسکیں گے۔ غالباً ڈیوڑھی کرنی بھی دشوار ہوگی اور یہ عمل قانون تقلیل کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اب غور کیجے کہ صنعت وحرفت قانون تکثیر حاصل کے زیر عمل کیوں کہلاتی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت میں استعمال مشین اور پیدائش بر پیمانہ کی بیحد گنجائش ہے جس کا نتیجہ نسبتاً تخفیف مصارف پیدائش ہے اور یہی قانون تکثیر حاصل کا منشا ہے کا اور صحت پر کیا منحصر ہے۔ بعض بعض حالتوں میں زراعت پر بھی اس

قانون کا ایک حد تک اثر نمایاں ہوتا رہتا ہے پس واضح ہوا کہ قانون تکثیر حاصل کا زمین محنت اور حاصل کی مقدار سے تعلق ہے جو ملکر کام کریں اور قانون تقلیل حاصل عمل پیدایش میں محنت اور حاصل کے باہمی نسبت سے متعلق ہے بالفاظ دیگر اگر عاملین نی بڑی بڑی مقدار یکجا کام کرسکیں تو قانون تکثیر حاصل کا عمل ظہور پذیر ہوگا اور اگر عاملین میں سے کسی کی مقدار نسبت مناسب سے تجاوز کرے گی تو اس کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہوگی۔

حاصل کلام یہ کہ زراعت و صنعت دونوں یکساں قانون تقلیل حاصل کے تابع ہیں محنت کے جرعوں کی پیداوار ایک خاص حد کے بعد نسبتاً گھٹنے لگتی ہے اجرت ہمیشہ محنت کی پیداوار مختتم کی مساوی ہوتی ہے اور کثرت مزدوران سے اس کی مقدار گھٹنی یقینی ہے۔

اوّل تو اجرت پیداوار مختتم کے برابر قرار پائی کثرت مزدوران سے اس کی مقدار گھٹی اس پر طرہ یہ کہ مزدوروں کی لاچاری۔ تہیدستی۔ جہالت۔ پست ہمتی۔ رسم و رواج کی پابندی اور آجروں کے غلبہ اور تسلط کی بدولت یہ کمترین معاوضہ بھی پورا پورا بمشکل ہاتھ آتا ہے جیسا کہ آگے چلکر واضح ہوگا۔ محنت کا حصل زاید بشکل منافع آجر کی جیب میں جاتا ہے آجر اگر محنت کی پیداوار میں سے ایک مناسب حصہ بطور کمیشن لے بھی تو کچھہ مضائقہ نہیں لیکن جب کہ وہ مزدوروں کے کمترین حصہ میں سے بھی کچھہ غصب کرے تو یہ ظلم ہے۔ یا تو مزدور پامال ہو جاویں گے یا تنگ آکر وہ اسٹرائک شروع کردیں گے۔ دونوں صورتوں میں عام ملکی مرفہ الحالی کو مضرت پہنچنا یقینی ہے۔

واضح ہو کہ مزدور مختتم آجر کا بہت بڑا محسن ہے اضافہ ما حصل زائد کے لحاظ سے اس کی حالت بعینہٖ نہر کی جھال کی چوٹی جیسی ہے۔ جو سطح آب بلند کرتی ہے یا یہ

حصہ سوم
باب سوم

مزدور جتنا ہی آگے بڑھیگا ماسبق مزدوروں کو بشکل تخفیف اجرت نقصان پہنچائے گا اور آجر کو بشکل اضافہ ماحصل زاید نفع۔ لیکن اگر پیچھے ہٹے تو نتیجہ بالکل برعکس ہوگا کسی کاروبار میں بمقابلہ دسویں مزدور مختتم کے پانچواں مزدوروں کے حق میں مفید اور آجر کے حق میں مضر ہے دسویں کی حالت اس کے برعکس ہے اور مزدور مختتم کا قرب و بعد بھی گویا قانون طلب و رسد کی محنت اور اجرت کے متعلق ایک گونہ تشریح ہے یہ خیال کرنا صحیح ہوگا کہ مزدور مختتم سے لازمًا وہی مزدور مراد ہے تو بلحاظ ترتیب یا وقت سب سے آخر میں شریک کار رہے۔ بلکہ مزدوروں کے اسی گروہ میں جو ایک ہی وقت کام شروع کرے مزدور مختتم کی موجودگی ممکن ہے درحقیقت مزدور مختتم سے مراد کام کرنے والی ایسی جماعت کا کوئی فرد ہے کہ جس میں اگر کوئی جدید مزدور شامل کریں تو مزید ماحصل اس کی اجرت سے کم رہے اوّل تو جب مزدوروں کی ایک جماعت ملکر کوئی کام کرے تو ہر ایک کے کام کی جداگانہ مقدار دریافت کرنا اکثر محال ہوتا ہے دوسرے یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ مزدور مختتم کارکردگی میں باقی دوسروں کے برابر ہے پس اس کی محنت کا جداگانہ ماحصل جس کا دریافت کرنا دشوار ہے دوسروں سے کم ہونا ضروری نہیں۔

اس کے شریک جماعت ہونے سے جو ماحصل میں اضافہ ہوتا ہے اور جو سب ماسبق اضافوں سے کم مقدار ہوتا ہے درحقیقت کل جماعت کی مجموعی محنت سے پیدا ہوتا ہے نہ اس کی جداگانہ محنت سے اور اس کے سبب کم مقدار ہونے کا باعث مزدور مختتم کی کارکردگی کا نقص نہیں بلکہ قانون تقلیل حاصل ہے یہ تو عام تجربہ ہے کہ کسی کام میں تعداد مناسب سے زیادہ مزدوروں کی شرکت نہ صرف مالی نقصان بلکہ خرابی کام کا باعث ہوتی ہے۔ اور مزدور مختتم کی کل بحث اسی واقعہ کی تشریح ہے اور کچھ نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ اجرت کا محنت کی پیداآوری سے اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ پیداوار
مختتم کے برابر ہوتی ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا باقی ہے کہ خود یہ معیار کس قدر غیر معین ہے اور کتنے
بےشمار اسباب اس کی کمی بیشی کا باعث ہوسکتے ہیں ایک سادہ مثال لو جو زراعت و صنعت
دونوں سے مشابہ ہے۔ کسی شخص کے یہاں دودھ مکھن کا کارخانہ جاری ہے گائے بھینس
کی نگرانی کے واسطے دس گھوسی نوکر ہیں اگر گیارہواں گھوسی ملازم رکھا جائے
تو گلہ میں دس گایوں کا اضافہ ہوسکے گا گویا موجودہ بھینسوں سے ان کے دودھ کا مکھن
نکل سکے گا اور ان کے رہنے کے واسطے موجودہ جگہ میں سے گنجائش نکل سکے گی۔
کسی طرح پر کارخانہ میں توسیع کی ضرورت ہوگی۔ اب اگر اس گیارہویں گھوسی کی
اجرت جدید دس گاؤں کی آمدنی سے کم ہوگی تو کارخانہ دار اس کو ضرور ملازم رکھ لیگا
اور اس کا کام محنت مختتم ہوگا واضح ہو کہ محنت مختتم کے ما حصل کی کمی بیشی گھوسیوں کی
تعداد پر منحصر ہے۔ خود تعداد قوانین رسد و طلب کے تابع ہے۔ ایک طرف تو موجودہ نسل کا
وہ طبقہ ہے جس سے گھوسی مہیا ہوسکیں دوسری جانب دودھ مکھن کا صرف اور ایسے کارخانوں
کی تعداد۔ گویا دودھ مکھن کی حالت طلب و رسد اور یہ حالت خود بےشمار اثرات کے
تابع ہے علاوہ ازیں چارہ کی قلت و کثرت کا بھی محنت مختتم سے قریبی تعلق ہے اور چارہ
کی پیداوار زرعی حالت سے متعلق ہے جو خود بےشمار اسباب کے زیر اثر ہے مزید برآں
گائے بھینسوں کی رسد جس کا دارومدار چارہ کی مقدار اور چراگاہوں اور گھوسیوں
کی تعداد پر ہے اور اُن کی طلب جو چمڑہ۔ گوشت۔ دودھ۔ مکھن اور زرعی کام کی طلبوں
پر منحصر ہے۔ محنت مختتم پر گہرا اثر ڈالتی ہے قصہ مختصر محنت مختتم کا تعین بےشمار پیچ در پیچ
اسباب پر منحصر ہوتا ہے۔ ہم کو یہ جاننا کافی ہے کہ کسی کام میں یکساں کارکردگی والے
مزدوروں کی شرح اجرت محنت مختتم کے ما حصل کے برابر ہوتی ہے۔ گویا پیداوار

حصہ سوم
مخمتم شرح اجرت کا معیار ہے۔

ماسوم
اجرت کے متعلق اس وقت تک جو چار مسئلے بیان کئے گئے اُن میں سے ہر ایک جداگانہ کل حقیقت کا صرف ایک جزو واضح کرتا ہے۔ ہر ایک بذات خود نامکمل ہے لیکن مکمل تشریح اجرت کے واسطے ان سب کا اجماع لازمی ہے۔ اگر ربڑ کے چند تسموں سے کوئی چیز لٹکائی جائے تو وزن سنبھالنے میں ہر ایک تسمہ باقی تسموں کو مدد دیتا ہے اور سب کی مجموعی قوت سے اُن کی یکساں لمبائی قرار پاتی ہے اب اگر کسی تسمہ کی لمبائی گھٹائی بڑھائی جائے یا اس کی قوت میں کمی بیشی پیدا کی جائے تو یقیناً باقی تسموں کی لمبائی میں بھی فرق پیدا ہوگا اور لٹکنے والی چیز کی سطح بھی ضرور اونچی نیچی ہو جائے گی۔ بعینہٖ یہی حال مذکورہ بالا مسائل کے تعلق کا ہے۔ مسئلہ اجرت فنڈ محنت کی طلب پر مسئلہ معیار مایحتاج زندگی محنت کی رسد پر اور مسائل پیدا آوری محنت و پیداور مختتم تعین شرح اجرت پر روشنی ڈالکر مسئلہ اجرت کی کامل توضیح کرتے ہیں۔ اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ گویا یہ کل مسائل اجرت پیدا کرنے والے مشین کے پرزے ہیں اور ظاہر ہے کہ مشین چلنے کیواسطے ہر ایک پرزہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کوئی دوسرا ان تمام مسائل کو کسی ایک جامع مسئلہ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کامیاب ہونی محال نظر آتی ہے ہر ایک کو جداگانہ ذہن نشین کر کے انکا باہمی تعلق سمجھ لینے سے بھی وہی مطلب حاصل ہوتا ہے اور یہ طریق سہل بھی ہے۔

اجرت اور لگان کا موازنہ
(۷) اوپر واضح ہو چکا ہے کہ لگان مصارف پیدائش کا کوئی جزو نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اجرت مصارف میں شامل ہوتی ہے۔ اسباب فرق حسب ذیل ہیں۔

(۱) محنت و زمین پیدائش کے واسطے لابد ہیں۔

حصہ سوم
باب سوم

(ب) محنت مزدور کی ذات سے وابستہ ہے۔ زمین کے واسطے زمیندار لازمی نہیں۔
(ج) اجرت کے بغیر مزدور کام نہیں کرتا بالفاظ دیگر محنت میسر نہیں آسکتی لیکن لگان کے بغیر زمین دستیاب ہوسکتی ہے اور زراعت میں کام آتی ہے۔
(د) اجرت پیدائش دولت کا باعث بھی ہے۔ مگر لگان صرف نتیجہ ہے باعث نہیں۔
(س) اگر اجرت ضبط کر لی جائے تو مزدور کام چھوڑ دیں محنت غائب ہو جائے لیکن اگر بذریعہ ٹیکس کل معاشی لگان چھین لیا جائے تو بھی زراعت جاری رہے گی اور زمین کی کوئی قلت ہوگی۔

فصل دوم

تشریح اجرت

تحریہ (۱) اقسام اجرت (۲) فرق اجرت کے اسباب (۳) ارزانی وگرانی محنت (۴) اضافہ اجرت اور ان کے نتائج۔

اقسام اجرت

(۱) چند اصول پر اجرت کی کئی قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ اول اجرت متعارف اور اجرت صحیحہ کو لیجئے بالعموم مزدور کو اجرت بشکل زر نقد ادا کیجاتی ہے مثلاً کچھ آنے روز یا چند روپیہ ماہوار۔ لیکن فی نفسہ یہ زر نقد کیا ہے سونے چاندی اور تانبے جیسی دہاتوں کے ٹکڑے کہ جن کو مزدور کہا پی سکے نہ پہن اوڑھ سکے۔ دولتمند لوگ جو قیمتی زیورات اور سامان کے شائق ہوں ان دہاتوں کے ٹکڑوں سے کچھ کام لے سکتے ہیں۔ لیکن غریب مزدوروں کے نزدیک جن کی ضروریات زندگی سادہ اور مختصر ہیں یہ ٹکڑے بذات خود مٹی کے برابر نکمے ہیں وہ تو اس لیے محنت کرتے ہیں کہ کھانے کو روٹی پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان ملے۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سامان راحت میسر آسکے تو بہا ورنہ مضائقہ نہیں۔ براہ راست نہ زر نقد سے مزدور کی احتیاج پوری ہو نہ مزدور کو اس سے سروکار جیسا کہ ہم آگے چلکر تقسیم دولت کی تحت کرینگے زر نقد نہایت سہولت افزا آلہ مبادلہ ہے۔ بذات خود مزدور کی ضروریات سے خارج ہی لیکن بحیثیت آلہ مبادلہ وہ مزدور کو حصول ضروریات میں بیش بہا مدد دیتا ہے اور اسی وجہ سے مزدور بھی بلا حجت اس کو بطور اجرت قبول کر لیتا ہے۔ جب خورد و نوش اور لباس و مکان کا سامان مزدور کا مقصود ٹھیرا اور اسی کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ محنت کرتا ہے

تو اس کی اجرت کا صحیح معیار۔ اس سامان کی وہ مقدار ہے جو وہ اجرت کے زر نقد سے خرید سکے۔ زر نقد کی مقدار فی نفسہ اس کے نزدیک نا قابل لحاظ ہے۔ اجرت بمعیار ضروریات، اجرت صحیحہ اور بمعیار زر نقد۔ اجرت متعارف کہلاتی ہے۔ مزدور کی کل ضروریات کو شے واحد مثلاً گیہوں تصور کرکے فرض کرو کہ کسی زمانہ میں اجرت متعارف دس روپیہ ماہوار ہے اور اجرت صحیحہ ۵ من گیہوں اب اگر اجرت متعارف ۱۰ سے بڑھکر ۱۶ روپیہ ہوجائے لیکن بوجہ گرانی نرخ اجرت صحیحہ ۵ من سے گھٹ کر ۴ من رہ جائے تو اجرت متعارف میں نصف سے زیادہ اضافہ کے باوجود اجرت صحیحہ میں بمقدار ۱/۵ تخفیف ہوجائے گی۔ اس کے برعکس اگر اجرت متعارف صرف آٹھ روپیہ ہو۔ لیکن بوجہ ارزانی نرخ اجرت صحیحہ ۶ من گیہوں ہوجائے تو باوجود کمی اجرت متعارف۔ اجرت صحیحہ میں بیشی ہوجائے گی۔ گویا بلحاظ اضافہ وتخفیف ان دونوں قسم کی اجرتوں میں کوئی تعلق معین نہیں۔ اُن کی تبدیلی میں موافقت اور مخالفت دونوں ممکن ہیں۔ اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں مزدور کو تو مقدار گیہوں سے غرض ہے نہ کہ نقد اور روپیہ سے لہذا اجرت صحیحہ کا اسکی حالت پر مفید و مضر اثر پڑتا ہے نہ کہ اجرت متعارف کا۔ چونکہ اجرت کا تعین اور ادائگی بشکل زر نقد بیحد آسان ہے اجرت متعارف کا رواج ہوگیا ورنہ مزدور کو صرف اجرت صحیحہ سے سروکار ہے اور جب کہ زر نقد کا استعمال اس قدر رائج نہ تھا اور نیز اب بھی پس ماندہ دیہات میں اجرت بشکل غلہ ادا کیجاتی ہے ان دونوں قسم کی اجرتونکے فرق سے بخوبی واضح ہوگا کہ مزدور کی مرفہ الحالی اجرت صحیحہ کے اضافہ سے وابستہ ہے یہ اضافہ دو طرح پر ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اگر نرخ ضروریات معین ہو تو اجرت متعارف کے بڑھنے سے اور اگر اجرت متعارف متعین ہو تو نرخ ضروریات گھٹنے سے

حصہ سوم
باب سوم

اور اگر اضافہ اجرت متعارف کے ساتھ نرخ ضروریات میں تخفیف بھی ہو تو پھر کیا کہنا۔ گویا اجرت صحیحہ میں دو گونہ اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ ایک طرف تو اجرت متعارف بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف ضروریات گراں ہوتی جاتی ہیں گویا دو متضاد قوتیں اجرت صحیحہ پر عمل کر رہی ہیں! اب اگر اضافہ اجرت متعارف کا اثر گرانی ضروریات پر غالب آگیا تو اجرت صحیحہ میں اسی نسبت سے اضافہ ہو جائے گا اور اگر اثر اُلٹا پڑا تو نتیجہ بھی برعکس ہوگا۔ گویا باوجود اضافہ اجرت بوجہ گرانی ضروریات متعارف اجرت صحیحہ میں تخفیف ہو جائے گی۔ یہی آخری حالت ہے جو ہندوستان کے مزدور اور ملازمت پیشہ لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر آمدنی کو روپیہ سے شمار کرتے ہیں تو بہ نسبت سابق معقول اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ضروریات کے معیات سے تخمینہ کرتے ہیں تو معاملہ اکثر برعکس نظر آتا ہے اور اس معمہ کی وہ کیسی بھولی توجیہہ کرتے ہیں کہ چودہویں صدی میں دنیا سے خیر و برکت اُٹھ گئی کلجگ میں مایا کا ست نکل گیا گھر گھر بڑے بوڑھے شاکی ہیں کہ خدا جانے روپیہ کے کیا پر نکل آئے۔ آتا معلوم ہوتا ہے جاتا نظر نہیں آتا۔ کوئی کتنا ہی کمائے اس زمانہ میں پورا نہیں پڑتا۔ اس میں شک نہیں کہ ضروریات کا اضافہ بھی خاندانی مصارف کی زیادتی کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی مزدوری اور ملازمت پیشہ لوگوں میں یہ ادبار نیز گرانی مایحتاج زندگی کی بدولت پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستانی مزدور کی مالی حالت اور اس کے اسباب سے مفصل بحث کرنا ایک جداگانہ کتاب معیشت الہند میں زیادہ موزوں ہوگا یہاں مجمل اشارہ کافی ہے۔

واضح ہو کہ ازالہ مرض سے انسداد مرض بہتر ہے۔ اجرت صحیحہ بڑھانے یا بالفاظ دیگر مزدور کی مالی حالت قوی کرنے کا طریق بہ نسبت اجرت متعارف بڑھانے کے نرخ ضروریات

گھٹانا بدرجہا زیادہ کارگر ہوگا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ افزونی آبادی اور قانون تقلیل حاصل کے قوی اثرات گرانی کے معاون و ارزانی کی راہ میں سخت مزاحم بنے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ترقی کارکردگی اور عجیب و غریب ایجادات کی مدد سے ان اثرات کا زور بہت کچھ توڑا جارہا ہے اور مصنوعات میں اکثر قانون تکثیر کا اثر نظر آتا ہے۔ محنت کی پیداآوری میں جتنا اضافہ ہوگا یعنی ان کی ایک مقدار معین سے جتنی زیادہ پیداوار حاصل ہوگی یا پیداوار کی معین مقدار حاصل کرنے کے واسطے جسقدر کم محنت درکار ہوگی ضروریات جو ان محنت سے پیدا ہوں گی ارزاں ہوجائیں گی۔ چنانچہ کارکردگی کی ترقی اور کلوں کی ایجاد کا منشا یہی محنت کی پیداآوری کا اضافہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اُن کے عمل کا اثر ارزانی ضروریات پر بہت موافق پڑتا ہے۔ یہ خیال نکرنا چاہئے کہ ارزانی ضروریات اگر مزدوروں کے حق میں مفید ہے تو ضروریات کے پیدا کرنے والوں کی حق میں بشکل تخفیف آمدنی مضر ہوگی۔ اوّل تو خود ہر ایک پیدا کرنے والے کو بہت سی ضرورتیں درکار ہیں اور اگر اس کی پیدا کی ہوئی ضرورت کی ارزانی سے اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو باقی دوسری ضروریات کی ارزانی جو اس کو درکار ہیں اس نقصان کی بشکل تخفیف مصارف پوری تلافی کردیگی علاوہ ازیں ارزانی کی بدولت خود اس کی پیدا کی ہوئی ضرورت کی طلب بڑھیگی اور پیدائش برپیمانہ کبیر کے فوائد یا قانون تکثیر حاصل کے اثرات کی بدولت مصارف پیدائش میں ارزانی کی مطابق کم و بیش تخفیف ہو سکے گی۔ اور مزید براں شرح منافع تی ستے بوجہ ارزانی گھٹ بھی جائے تو منافع کی مقدار کلی بوجہ اضافہ خرید اشیا بڑھ جاتا عجیب نہیں اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کو منافع کی مقدار کلی سے

حصہ سوم
باب سوم

مطلب ہی نہ کہ شرح منافع فی نفسہ سے اس سے ثابت ہوا کہ ارزانی ضروریات
سب کے حق میں مفید ہے اور غالباً کسی کے حق میں بھی مضر نہیں - اور قوم کو
خوشحال اور دولتمند بنانے کا کارگر طریق محنت اصلی کی پیداآوری بڑھا کر ضروریات
کو ارزاں کرنا ہے اور بس -

اجرت کی دو قسمیں متعارف اور صحیحہ بلحاظ معیار ادائگی بیان کی جا چکی ہیں بلحاظ معیار
تعین شرح بھی اجرت کی تین قسمیں پائی جاتی ہیں - جبکہ اجرت کا حساب مطابق اس مقدار
وقت کے ہو جو محنت میں صرف کیجائے تو یہ اجرت مختص بالزمان کہلاتی ہے - مثلاً
بیس روپیہ ماہوار یا چار آنہ روزہ اور جبکہ اجرت مطابق مقدار کام قرار پائے تو اس کو اجرت
مختص بالعمل کہتے ہیں مثلاً کپڑا سلوائی ۲ آنہ گز یا اناج پسوائی عہ من یا کتاب لکھوائی
صہ ر جزو - اجرت خواہ مختص بالزمان ہو یا مختص بالعمل اس کی مقدار کارکردگی کے مطابق
اکثر مزدوروں کے حق میں جدا ہوگی - معمولی خدمتگار کو آٹھ روپیہ تو ہوشیار کو دس روپیہ
ماہوار دئے جا سکتے ہیں - معمولی بڑھئی آٹھ آنہ اور کاریگر بارہ آنہ روز پاتا ہے یہی حال
اجرت مختص بالعمل کا ہے - جو جتنا کام کریگا اتنی اجرت پاوے گا - ایک ہی شرح سے
بعض زودنویس اور محنتی کاتب عہ روز کماتے ہیں اور بعض بمشکل آٹھ آنہ جو مقدار اجرت
بلحاظ کارکردگی دریافت کرتے ہیں اس کو اجرت مختص بہ کارکردگی کہتے ہیں -

واضح ہو کہ بندش رسم و رواج سے مزدوروں کی رہائی کا بالفاظ دیگر ان کے آزادانہ
مقابلے کا نتیجہ اجرت مختص بالزمان و نیز مختص بالعمل میں فرق اور اجرت مختص بہ کارکردگی
میں یکسانیت پیدا ہونا ہے - مقابلہ کے دباؤ سے ہر مزدور کی اجرت اس کی کارکردگی
کے مطابق بنجاوے گی اسی وجہ سے اجرت مختص بالزمان اور مختص بالعمل میں فرق نمایاں
ہوگا کیونکہ غیر مساوی کارکردگی والے مزدور نہ اجرت مختص بالزمان برابر پاسکیں گے نہ اجرت

حصہ سوم
باب سوم

مختص بالعمل ہر ایک کی اجرت کارکردگی کے مطابق ہوگی اور مساوات کارکردگی کے ساتھ ہی مساوات اجرت خواہ مختص بالزماں یا مختص بالعمل ممکن ہی لہذا جب کہا جاتا ہی کہ مزدوروں کے آزادانہ مقابلہ کا نتیجہ مساوات اجرت ہی تو وہاں پر اجرت مختص بہ کارکردگی مراد ہوتی ہی۔

واضح ہو کہ محنت جس قدر زیادہ نقل پذیر ہوگی اور کام جس قدر غیر تخصیص طلب ہوگا اتنا ہی آزادانہ مقابلہ کا مذکورہ بالا نتیجہ بیشتر واضح ہوگا۔

اجرت مختص بہ کارکردگی کے متعلق ایک مغالطہ جس کا پیدا ہونا ممکن ہی حتانا ضروری معلوم ہوتا ہی۔ مسئلہ پیدا آوری مختتم کے تحت میں بیان کیا گیا ہی کہ مزدوروں کی کسی جماعت کی شرح اجرت مزدور مختتم کی پیدا آوری محنت کے جو سب سے کم ہوتی ہی۔ برابر ہوگی۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جاچکا ہی ایسی جماعت کے کل مزدوروں کی کارگردگی یکساں ہوتی چاہیئے نہ کہ کم و بیش۔ اور محنت مختتم کی پیدا آوری کی کمی کا باعث عمل قانون تقلیل حاصل ہی۔ نہ کہ مزدور مختتم کی کارکردگی کا نقص۔ اور یہاں پر آزادانہ مقابلہ کا اثر جو ہر مزدور کی اجرت اس کی کارکردگی کے مطابق بنا دینا ظاہر کیا گیا ہی۔ تو ایسے مزدوروں کی کارگردی میں بجائے یکسانیت کے فرق فرض کیا جاتا ہی۔ گو ان دونوں بحثوں کا علی الترتیب نتیجہ یہ ہی کہ یکساں کارکردگی والے مزدوروں کی شرح اجرت میں مطابق کمی بیشی کارکردگی تخفیف و اضافہ ہوتا ہی جو جتنا کام کرتا ہی اتنی اجرت پاتا ہی۔

چونکہ ان دونوں مسئلوں میں بظاہر تضاد نظر آنے کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ احتیاطاً مزید تشریح کردی گئی۔

فرق اجرت کے اسباب

(۲) شرح اجرت میں بیشمار فرق پائے جاتے ہیں۔ غریب قلی دن بھر بوجھ ڈھو کر بمشکل

کنبہ کی گذر کے لائق شام تک کماتا ہے اور ایک مشہور گویا گھنٹہ بھر گا کر صدہا روپیہ پا لیتا ہے۔ سرکاری ملازمین یا کارخانجات کے مزدوروں کی فہرست تنخواہ یا اجرت اُٹھا کر دیکھو تو چند روپیہ سے لیکر ہزاروں روپیہ تک بیشمار مدارج نظر آئینگے ظاہر ہے کہ یہ بیشمار دیرپا اور بڑے بڑے فرق محض اتفاقات کا نتیجہ نہیں ہو سکتے اجرت صحیحہ کے تخمینہ میں جن جن باتوں کا لحاظ لازمی ہے اوّل اُنکی تفصیل کرینگے بعدہٗ فرق اجرت کے اسباب تحقیق کرنا چاہئے ہیں

تخمینہ اجرت صحیحہ میں امور ذیل لازمی طور سے توجہ طلب ہیں۔

(۱) زر نقد کی قوت مبادلہ میں کمی بیشی۔ با لفاظ دیگر ضروریات کی گرانی وارزانی باوجودیکہ ریلوں نے اکثر چیزوں کی قیمت ہر جگہ کم وبیش مساوی کر دی ہے۔ تاہم واقعات شاہد ہیں کہ خورونوش کی معمولی چیزیں۔ جن کی مزدور کو ضرورت ہے۔ شہروں میں بہ نسبت دیہات وقصبات کے زیادہ گراں ملتی ہیں۔ ایندھن۔ گھاس۔ چارہ جن کی مفصلات میں کوئی کمی نہیں۔ شہروں میں غلہ کی مانند تول کر فروخت ہوتے ہیں۔ اور مکانات کے کرایہ میں تو زمین وآسمان کا فرق نظر آتا ہے حاصل کلام یہ کہ جو ضروریات شہروں میں ایک روپیہ سے پوری ہوتی ہیں اُن کے واسطے مفصلات میں آٹھ آنے بلکہ اس سے بھی کم کافی ہیں اور اسی وجہ سے دیہات کے مزدور گو اجرت میں زر نقد کم پاویں لیکن بلحاظ حصول ضروریات وہ شہر والوں سے بہتر نہیں تو بدتر بھی نہونگے چنانچہ شہر والوں کی آمدنی کی زیادتی اکثر سطحی دھوکا ہوتی ہے۔ ان کو قصبات کے کم آمدنی والوں سے زیادہ آرام میسر نہیں ہوتا۔ شہروں میں جو چیزیں بمقابلہ قصبات کے ارزاں ملتی ہیں وہ اکثر تعیشات سے متعلق ہیں دولت مند اُن سے لطف اٹھا سکتے ہیں غریب مزدور کی حیثیت سے وہ بالاتر ہیں۔ جہانتک مایحتاج زندگی کا تعلق ہے۔

مفصلات کی بود و باش بمقابلہ شہروں کے بہت کم خرچ ہوتی ہے۔

(ب) طریق ادائیگی اجرت۔ بالعموم تو مزدورنکو صرف اجرت متعارف دیجاتی ہے لیکن بعض پیشہ وروں کو اجرت کا ایک جزو بشکل ضروریات بھی ملتا ہے۔ یعنی انکی کچھہ اجرت متعارف ہوتی ہے اور کچھہ صحیحہ۔ مثلاً سائیس کو علاوہ ماہواری تنخواہ کے رہنے کے واسطے مکان۔ جلانے کے واسطے بچی کچی گھاس اور امرار کے ہاں پہنے کے واسطے وردی بھی ملتی ہے۔ باورچی کو بھی علاوہ تنخواہ۔ خوراک و مکان ملتا ہے ریلوے ملازمین کو کرایہ معاف ہے۔ کہیں کہیں بڑے کارخانوں کے مزدورونکو مکانات ملا کرایہ یا کم کرایہ پر دئیے جاتے ہیں۔ انکو ضروریات تھوک فروشی کے کمتر نرخ سے مہیا کی جاتی ہیں۔ اور نیز پیداوار خام کے بعض ناقص حصے جو کارخانہ دار کے نزدیک از کار رفتہ ہوتے ہیں مزدوروں کو ملجاتے ہیں جن سے وہ تہوڑا بہت کام ضرور نکال لیتے ہیں۔ غریب مزدور موسم سرما میں خصوصاً رات کے وقت روئی اوٹنے کے کارخانوں میں نہایت شوق سے کام کرتے ہیں کیونکہ علاوہ اجرت ملنے کے انکو سردی کی تکلیف سے بھی نجات ملجاتی ہے۔ یہ تمام ضروریات جو مزدورنکو حاصل ہوتی ہیں اجرت صحیحہ کا جزو ہیں۔ اور اجرت کلی کے تخمینہ میں انکا لحاظ ضروری ہے یہاں یہ نکتہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مزدور کو جو ضروریات مہیا کیجاتی ہیں اُن کی قدر و قیمت کا تخمینہ مزدور کے نقطۂ خیال سے کرنا چاہئیے نہ کہ آجر کے۔ فرض کرو کہ کوئی امیر۔ اپنی تزک و شان کے خیال سے اپنے ملازمین کو زرق برق قیمتی لباس پہنائے یا اپنے پاس اسکو کسی ایسی جگہ رکھے جہاں کرایہ مکانات وصرف خوراک بہت زیادہ ہو۔ تو ایسے لباس کی قیمت یا خرچ خوراک و کرایہ مکان کا حصہ رسد جزو اس کی اجرت میں شمار کرنا صحیح نہوگا۔ ظاہر ہے کہ مزدو

اگر آجر کا مطمع ہوتا تو نہ ایسا لباس پہنتا۔ نہ ایسی جگہ آکر رہتا مذکورہ بالا مصارف کی مقتضی آجر کی ضروریات ہیں نہ کہ مزدور کی۔ لہٰذا آجر کی ایسی ضروریات مہیا کرنے میں خواہ کچھ ہی صرف ہو مزدور کی اجرت میں اُن کے مصارف کا صرف اس قدر حصہ شمار کرنا چاہئے جو خود مزدور کی ضروریات کے واسطے بحالت خودمختاری مزدور کو درکار ہوتا۔ اسی طرح اگر مزدور کو ایسی چیز ملے جو آجر کے نزدیک مخفی کمی اور ناکارہ ہوا لیکن مزدور کا اس سے کوئی کام نکل سکے تو یہ چیز نہ ملنے کی حالت میں ایسی ضرورت پر مزدور کو جو کچھ صرف کرنا پڑتا وہ اس چیز کے تعلق سے مزدور کی اجرت میں شمار کرنا چاہئے حاصل کلام یہ کہ کوئی چیز جو مزدور کو دیجاتی ہے آجر کے نزدیک بیش قیمت ہو یا ناکارہ اس کی قیمت وہ رقم قرار دینی چاہئے جو مزدور کو چیز نہ ملنے کی حالت میں۔ ضرورت متعلقہ حاصل کرنے کے لیے صرف کرنی پڑتی۔

(ح) خود مزدور کو یا اس کے خاندان کو مزید اجرت حاصل کرنے کا موقع۔ بعض پیشے ہیں کہ ان میں علاوہ تنخواہ کے مزید آمدنی حاصل کرنے کے موقع بھی پیدا ہو سکتے ہیں اسکول کے مدرس نجی کے طور پر طلبا کو پڑھا کر تنخواہ ملازمت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ روپیہ کما لیتے ہیں بعض طبیب اور ڈاکٹر کسی عزیز یا دوست کا دواخانہ جاری کرا کر اپنے مریضوں کو وہاں سے دوا خرید واتے ہیں اور منافع میں خود بھی شریک رہتے ہیں۔ اسی طرح ہوشیار درزی کپڑا بھی خود ہی فروخت کرتے ہیں۔ اور دوسری جگہ سے خریدے ہوئے کپڑے کے مقابلہ میں اپنے ہاں کے کپڑے کو جلد تر اور زیادہ عمدگی سے تیار کر کے گاہکوں کو اپنی دوکان سے کپڑا خریدنے پر ایک حد تک مجبور کرتے ہیں علاوہ اجرت سلائی۔ کپڑے کی تجارت سے بھی منافع اُٹھاتے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں اور دفتروں کی ملازمت

میں اپنے عزیز واقربا کے واسطے صورتیں پیدا کرنی آسان ہوتی ہیں۔ ورنہ بعض محکموں مثلاً ریلوے میں تو کسی ملازم کی رشتہ داری ازروے قاعدہ امیدوار کے حقوق میں داخل ہے۔ حصول ملازمت میں اکثر مسلمانوں کو انہی تعلقات کی کمزوری کی وجہ سے بمقابلہ دیگر قابو یافتہ فرقوں کے ناکامی یا کم از کم دقت پیش آتی ہے۔ اگر کسی خاندان کے اکثر افراد ملازم ہوں اور فرداً فرداً تنخواہ کم ہو تو خاندان کی مجموعی آمدنی کسی ایسے خاندان سے زیادہ ہونی ممکن بلکہ اغلب ہے کہ جہاں صرف ایک شخص بڑی تنخواہ پاتا ہے اور باقی سب بیکار ہوں اور چونکہ مالی حالت کل خاندان کی مجموعی آمدنی اور مصارف کی نسبت سے متعلق ہے لہذا اقربا و اعزا کے واسطے ملازمتیں پیدا کرسکنے کی قدرت۔ اجرت صحیحہ کا اس وجہ سے ایک جزو ہے کہ اس سے خاندانی آمدنی بڑھنے کی ضرورت حاصل ہوتی ہے۔ ہر سمجھدار مزدور اپنے کارخانہ میں جہاں صرف اسکی محنت درکار ہو۔ ۸ آنہ روز پر کام کرنیکے مقابلہ میں۔ دوسرے کارخانہ میں ۶ آنہ روز پر کام کرنا پسند کریگا جہاں اُسکے بچے بھی سہل کام کرکے ۲ روز کما سکیں۔ چنانچہ باوجود کمی شرح اجرت مزدور اس جگہ رہنا پسند کرتے ہیں جہاں خاندان کے اکثر افراد کام پاسکیں۔ گویا مزدور کے نزدیک خاندان کی مجموعی آمدنی قابل لحاظ ہے نہ کہ شرح اجرت اور یہی بات قرین عقل بھی ہے خاندانی آمدنی کی اہمیت صنائع تقسیمی و تقسیمی کے تحت میں بھی واضح کی جاچکی ہے۔

کسی پیشے میں خود ملازم کو جو مزید آمدنی حاصل ہوسکتی ہے۔ مثلاً اسکول کے مدرس کو نجی تعلیم سے فیس ملتی ہے تو اس کو اصطلاحاً اجرت تقسیمی کہتے ہیں خاندان کی مجموعی کمائی کو بھی اجرت خاندانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان دونوں قسم کی اجرتوں کا اجرت صحیحہ سے جو قریبی تعلق ہے ہم ابھی ظاہر

حصہ سوم
باب سوم

کر چکے ہیں ۔

(د) سلسلۂ ملازمت کا قیام ۔ بعض پیشے تو بارہ مہینے یکساں چلتے ہیں جیسے دہوبی حجام سقے اور باورچی کا کام لیکن بعض خاص خاص موسم یا حالات میں فروغ پاتے ہیں اور باقی وقت بیکاری میں بسر کرتے ہیں مثلاً درزی اور معمار بارش کے موسم میں ہاتھ پر ہاتھ دہرے بیٹھے رہتے ہیں لیکن موسم سرما آتے ہی اُنکا روزگار چمک اٹھتا ہے تجارتی مرکزوں میں غلہ ڈہونے والے مزدور جن کو پلہ دار کہتے ہیں فصل ربیع و خریف کے موقع پر اتنا زیادہ کما لیتے ہیں کہ برسات میں گھر بیٹھکر کہاتے ہیں ہندوستان میں ہندو اور نیز مسلمانوں کے بیاہ شادی کے موسم کچھہ مقرر سے ہیں ان دنوں میں تو باورچی اور باجہ بجانے والوں کو سائیاں سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے ۔ لیکن باقی دنوں میں وہ اتفاقی تقریبات کا نہایت بےچینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں جب آب و ہوا بگڑتی ہے تو طبیب اور ڈاکٹروں کو دم لینے تک کی مہلت نہیں ملتی اور ہر وقت مٹھی گرم رہتی ہے لیکن اچھے موسم میں وہ بھی باطمینان مطب میں بیٹھے دوستوں کی گپ یا تاش و شطرنج کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں ۔ اگر کوئی مریض آگیا تو نسخہ لکھدیا ورنہ اکثر مبارک دن وہ دوستوں کی لطف صحبت ہی سے دلشاد رہتے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ روزگار چلنے کے زمانہ میں ایسے غیر مستقل ملازمت والے اتنا زیادہ کمانے کی کوشش کرینگے کہ بیکاری کا زمانہ بسر کرنے کے لیے کافی پس انداز کر سکیں لہٰذا اگرچہ ایسے پیشہ وروں کی شرح اجرت زیادہ معلوم ہو لیکن درحقیقت باکاری و بیکاری کا زمانہ شمار کرنے سے ان کی اجرت کا اوسط بہت گھٹ کر معمولی شرح پر آجاتا ہے ۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اگر بیکاری کا زمانہ سخت محنت اور جفاکشی کے بعد

بیش آئے تو اس سے صحت و تندرستی کو بیحد نفع پہنچتا ہے اور مالی آمدنی رکجانے
سے جو کچھ نقصان ہوتا ہے اس کی بہت کچھ تلافی راحت اور تقویت صحت سے ہوجاتی ہے
مثلاً کامیاب بیرسٹر کو کس قدر دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے۔ عدالت کی تعطیل کلاں
اس کی تندرستی کے حق میں اس قدر مفید ہے کہ کاروبار رک جانے سے اُس کو
حقیقتاً کوئی نقصان نہیں پہنچتا اس بیکاری کے زمانے میں ماسبق کاروبار کا دماغی اور
جسمانی تکان رفع ہوکر بعد تعطیل بیرسٹر تازہ دم کام شروع کرنے کے قابل ہوجاتا ہے
جو صحت و راحت ایسی بیکاری میں حاصل ہوتی ہے وہ بھی اجرت صحیحہ کا جزو سمجھنی چاہئے
اس کے برعکس اگر کاروبار کی کساد بازاری سے بیکاری مسلط ہوجائے تو ایسی
حالت میں بجائے۔ آرام و تقویت کے پریشانی کی تکلیف سے صحت کو مضرت
پہنچتی ہے۔ گویا ایسی بیکاری سے اجرت صحیحہ کے اوسط میں تخفیف ہوجاتی ہے۔

بیکاری کی مذکورہ بالا فرق کی بدولت بلاتنخواہ رخصتی ملازم اور بیکار آدمی کی
حالت میں کتنا فرق نظر آتا ہے۔ ایک کے نزدیک بیکاری ضروری ہے اور دوسرے
کے حق میں وبال جان۔

(۳) پیشہ کا صحت و طاقت پر اثر۔

اکثر کام تو ایسے ہیں کہ مزدور اُن کو عرصہ دراز تک سرانجام دیسکتا ہے لیکن بعض
کاموں کا مزدور کی صحت پر اس قدر مضر اثر پڑتا ہے کہ اس کو جلد ناکارہ بنا دیتا ہے تحقیق
سے ثابت ہوا کہ تعداد اموات کا پیشہ کی نوعیت سے بہت کچھ تعلق ہے۔ پادریوں میں
تعداد اموات سب سے کم پائی جاتی ہے۔ ان کی تعداد اموات سو فرض کر کے نسبتاً تعداد اموات
کاشتکاروں میں صرف ۱۱۴ قانون پیشہ لوگوں میں ۱۵۲ شراب بنانے والوں میں
۲۴۵ شراب فروشوں میں ۲۷۴۔ کمہاروں میں ۳۱۴ اور کان کھودنے والوں

میں ۱۳۳۱ انگلستان میں تخمینہ کی گئی۔ چنانچہ بیمہ کمپنیاں بھی اس واقعہ کا لحاظ کرکے ایسے لوگوں کی زندگی کا بیمہ کرنے سے انکار کر دیتی ہیں جو از حد خطرناک اور مضر صحت پیشوں میں مصروف ہوں۔ باوجود تمام احتیاطوں کے کان کنی خطرناک اور مضرت رساں ہے اور خصوصاً پارہ کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی صحت دو ایک ہی سال میں اس قدر تباہ ہو جاتی ہے کہ ان کو زندگی کے باقی دن کاٹنے دوبھر ہو جاتے ہیں۔ اتنا ہے کہ دکن میں جہاں پارہ نکلتا ہے مزدوروں سے کم وبیش دھوکہ لالچ اور جبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے خطرناک اور مخرب صحت کام لینے کے لیے مزدوروں کو اعلیٰ شرح اجرت کا لالچ دینا لازمی ہے۔ اضافہ آمدنی کے لالچ بغیر کون خطرہ اور علالت اپنے ذمہ لینا گوارا کرسکتا ہے اور جہاں مضرت کا اندیشہ اتنا قوی ہو کہ لالچ کی کشش بھی مزدور مہیا نہ کرسکے تو مجبوراً دھوکہ یا جبر سے بھی کام لینا عجب نہ ہوگا۔ اگرچہ قانون کی تیز شعاعیں ہر جگہ امن وعافیت کی روشنی پھیلا رہی ہیں۔ پھر بھی خدا جانے ظلم وتشدد کی تاریکی ابھی کہاں کہاں چھپی ہوئی ہوگی۔ ایسے معدودے چند از حد مضر صحت پیشوں کے علاوہ معمولی پیشوں میں بھی کام کا صحت پر کم وبیش مضر اثر پڑتا ہے اور شرح اجرت میں بھی اکثر اسی کے مطابق کمی بیشی ہوتی ہے۔

جو مزدور ایک پرامن کام میں ۴ ر روز کماتا ہے۔ خطرناک کام میں دس بارہ آنہ روز کماسکے تو عجب نہیں ہے اور جو "زیستن برائے کارے" کے قائل ہیں وہ جان پر کھیل کر آمدنی بڑھاتے ہیں

(۳) مصارف پیشہ۔ عام مقولہ ہے کہ وکالت کا پیشہ نمائش طلب ہے۔ وکیل کو کامیابی کے واسطے ظاہری ٹھاٹھ رکھنا لازمی ہے۔ مکان شاندار اور آراستہ ہو

گھوڑا گاڑی بھی قیمتی اور نفیس ہو۔ عمدہ لباس سے ذاتی وجاہت بھی بڑی چیز ہی رہی۔ عام تعلقات وسیع ہوں حکام اور رؤسا سے ربط ضبط بڑھا ہوا ہو تب کہیں وکالت زور پکڑ سکتی ہے۔ ورنہ محض سادگی کی وجہ سے لوگ اس قدر بدعقیدہ ہو جاتے ہیں کہ بعض قابل سے قابل وکیلوں کے جوہر کھلنے نہیں پاتے۔ اور یوں کوئی لعل گودڑ میں چمک اُٹھے تو وہ مستثنےٰ سمجھنا چاہیئے یوں تو ہر پیشے میں ذاتی وجاہت اور طریق بود وباش کا اثر پڑتا ہے لیکن وکالت میں وہ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ طبابت کا بھی کم وبیش یہی حال ہے اسی طرح پر عدالتی عہدوں کے مقابلہ میں انتظامی عہدہ بیش خرچ ہے۔ ڈپٹی کلکٹر ونکو مقامی روسا، اور معززین سے میل ملاپ رکھنے کے لیے طریق بودوباش بھی اعلیٰ اختیار کرنا پڑتا ہے اور کھانے کھلانے میں بھی انکا صرف ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر منصف چاہے تو بہت سادہ زندگی بسر کرے اور اس کے کام میں کوئی خلل واقع نہو اس سے معلوم ہوا کہ بعض مصارف محض پیشہ کی مجبوری سے انسان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں ورنہ اس کی کوئی ضرورت اُن سے حاصل نہیں ہوتی اگر وہ اس پیشے میں شریک نہوتے تو ایسے مصارف کبھی گوارا نکرتا۔ محض موکلوں یا مریضوں کی یا طالب علموں کی ضرورت سے وکیل۔ طبیب یا معلم۔ معقول کرایہ پر عمدہ موقع کے وسیع مکانات لیتے ہیں۔ ورنہ اگر وہ کسی دفتر میں ملازم ہوتے تو شاید اس سے ایک چوتھائی کرایہ کے مکان کو ہی کے برابر اپنے واسطے آرام دہ پاتے۔ یا فرض کرو کہ کوئی شخص اپنے ملازم کو مجبور کرے کہ وہ معمول سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ تو ایسے کل مصارف جو مزدور کو محض پیشے کی خاطر برداشت کرنے پڑیں اور جو شریک پیشہ نہونے کی صورت میں وہ گوارا نکرتا۔ اس کی اجرت سے منہا کرنے ضروری ہیں۔ جو کچھہ باقی بچے وہی اس کی اجرت ہے۔

حصہ سوم اس کی اجرت کو قبل و بعد منہائی مصارف پیشہ علی الترتیب اجرت خام و اجرت
ماسبق خالص کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔

(ص) مناسبت شوق و مذاق: اکثر اشخاص کو کسی نہ کسی چیز کا خاص شوق اور مذاق ہوتا ہے۔ کوئی لذیذ کھانے کا شوقین ہے تو کوئی نفیس لباس کا۔ کسی کو گانے بجانے کی دھن ہے تو کوئی سیر و شکار پر مٹا ہوا ہے۔ کوئی روپیہ کا خواہاں ہے کوئی عزت کا طالب اور کسی کو حکومت و اقتدار سے زیادہ کوئی چیز بھی مرغوب نہیں اور بعض طبیعتوں کے خواص اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ وہ افعال و اعمال پر حاوی ہو جاتے ہیں گنوارو کہاوت ہے "چار سے دو ہی کر دے۔ پر نام داروغہ دھر دے" حکومت پسند طبیعتیں مالی آمدنی کی پروا کم کرتی ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر جیسے انتظامی عہدوں سے ایسے مصارف وابستہ ہیں کہ آمدنی خالص بعد دیگر مساوی تنخواہ والے عہدوں سے کم ہے۔ اور ہر ایک شخص رشوت ہی نہیں لیتا۔ اس عہدہ کے واسطے جو اس قدر سخت کوشش اور مقابلہ ہوتا ہے اس کا حقیقی باعث وہ تعزز و اقتدار ہے جو اس سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے فوج کی تنخواہ نسبتاً دوسرے محکموں سے کم ہے لیکن سپاہی منش لوگ اسی جانبازی کی ملازمت پر جاں دیتے ہیں۔ سیاحت پسند لوگ ریلوے کی ملازمت سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ شکاریوں کو جنگلات کی نوکری بیحد پسند ہے۔ سیر و تفریح کے شائق ایسے مقامات میں رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں جہاں کی آب و ہوا عمدہ ہو اور دلکش قدرتی مناظر کی کثرت ہو چنانچہ ہمارے ایک دوست جنکو دوسری جگہ زیادہ تنخواہ مل رہی تھی کمتر تنخواہ پر گھر سے صدہا میل خوشی خوشی کشمیر چلے گئے وہاں کی ملازمت کی اصلی کشش یہی سیر و تفریح کا شوق تھا۔ واضح ہو کہ عام طور پر تو لوگ جہاں موقع پاتے ہیں ملازمت کر لیتے ہیں لیکن بعض

حصہ سوم
باب سوم

طبیعتوں پر شوق اور مذاق کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ انتخاب ملازمت میں ان کا خاص لحاظ کرنا پڑتا ہے اور ان کی خاطر مالی منفعت کی تخفیف تک گوارا کیجاتی ہے ایسے لوگوں کی اجرت صحیحہ میں علاوہ اجرت متعارف کے۔ وہ لطف و مسرت بھی شمار کرنا چاہئے جو شوق پورا ہونے سے حاصل ہو اور جس کا تخمینہ زر نقد کی وہ مقدار ہے جو شخص مذکور اس کی خاطر چھوڑنے پر رضامند ہو سکے۔

گویا شوق پورا کرنے کی حالت میں خود محنت مزدور کے حق میں دولت بنکر اجرت صحیحہ کا جزو ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ کو بعنوان تشریح خدمت مقدمہ میں واضح کر چکے ہیں یہاں یہ جتانا بھی ضروری ہے کہ جو کام مذاق کے خلاف ہو اور طبیعت کو گراں گزرے اس کی اجرت صحیحہ سے وہ بے لطفی اور تکلیف منہا کرنی چاہئے جو ایسے کام کرنے سے محسوس ہو اور جو محنت کے تکان سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہے۔ اور جس کا تخمینہ بھی وہ زر نقد ہے جو اس سے بچنے کے لیے مزدور چھوڑنے پر آمادہ ہو سکے۔ گویا کوئی کام جس حد تک مزدور کے مذاق کے خلاف ہوگا اس کے حق میں دولت منفی بنکر اجرت صحیحہ میں تخفیف کردیگا۔ گویا بحالت مساوات اجرت متعارف بے مذاق کام کرنے والے کی اجرت صحیحہ سے حسب مذاق کام کرنے والے کی اجرت زیادہ اور خلاف مذاق کام کرنے والے کی کمتر ہوگی۔ پس مزدور اول کی اجرت صحیحہ مزدور سوم سے بدرجہ اولی زیادہ ہوئی

مثلاً اگر کوئی شخص مجبوری سے یا اتفاق سے یا شوق سے کاشمیر یا شملہ رہکر کام کرے تو ان تینوں حالتوں میں بمقابلہ یکدیگر علی الترتیب اجرت صحیحہ زیادہ ہوگی جب تکمیل شوق بھی اجرت صحیحہ کا جزو ٹہیرا تو اگر علمی مذاق کے لوگ مالی منفعت کی جستجو ترک کر کے۔ مناسب ضروریات پر اکتفا کریں اور مشغلۂ تعلیم و تصنیف

میں شاد و فرحاں رہیں تو کیا عجب ہی۔ چنانچہ حقیقی شاعر۔ ادیب۔ فلاسفر جیسے قوی علمی مذاق والوں نے ہمیشہ مادّی دولت کو نا قابل التفات سمجھا ہی۔

یہاں یہ جتانا خالی از لطف نہو گا کہ افراد کی طرح قوم اور فرقوں کے شوق و مذاق بھی کم و بیش جداگانہ اور مخصوص ہوتے ہیں مثلاً۔ پٹھان۔ سکھ راجپوت اور مرہٹے اب تک فوجی خدمت کے شائق ہیں۔ انتخاب ملازمت میں مسلمان بالعموم حکومت اور اختیار کا زیادہ لحاظ کرتے ہیں۔ اور اہل ہنود مقدار تنخواہ پر نظر رکھتے ہیں۔ پارسیوں کو دفتر کا کام بہت پسند ہی۔ بنگالی دماغی محنت کے بڑے مرد ہیں۔ راجپوتانہ کے مارواڑی لین دین کے کام میں بے اعتدالی اور بدنامی کی حد تک مصروف اور ماہر ہیں۔ اور کاٹھیاوار گجہہ کے بوہرے میمن تجارت میں ایسے مگن رہتے ہیں جیسے پانی میں مچھلی۔

اجرت صحیحہ کے تخمینہ میں جن باتونکا لحاظ لازمی ہی۔ اُن کی تفصیل بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اس کے فرق کے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اجرت کی اضافہ و تخفیف کے اسباب اور حدود۔ قوانین اجرت کی بحث میں واضح کئے جا چکے ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ مذکورہ بالا قوانین کا مجموعی عمل بشکل قانون طلب و رسد نمودار ہوتا ہی۔ بالفاظ دیگر مزدوروں کی موجودہ اور مطلوبہ تعداد کی باہمی نسبت سے ان قوانین کے مطابق اجرت میں کمی بیشی پیدا ہوتی ہی۔ قانون طلب رسد کا اجرت کے اساسی قوانین سے تعلق جتانے کے بعد اب ہم اس کا اجرت پر اثر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

عام تجربہ یہ ہی کہ اگر ایک چیز کے دو خریدار ہوں تو قیمت بڑھے گی اور اگر ایک کے خریدار کو ایسی دو چیزیں پیش کی جائیں تو قیمت گھٹ جائے گی۔

گویا قیمت میں اضافہ اور تخفیف علی الترتیب سد اور طلب کی کمزوری یا بالفاظ دیگر طلب و رسد کے غلبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی حال اجرت کا ہے۔ اگر ایک مزدور کو دو آجر بلائیں تو اجرت بڑھے گی۔ اور اگر ایک آجر کی طرف دو مزدور دوڑیں تو اجرت میں تخفیف ہونا یقینی ہے گویا قیمت کی طرح اجرت بھی بلحاظ کمی بیشی قانون طلب و رسد کے زیر عمل ہے۔ چیزیں بنانے کے واسطے محنت ناگزیر ہے۔ لہذا کسی چیز کی طلب میں کمی بیشی ہونے سے۔ اس محنت کی طلب میں بھی کمی بیشی لازمی آتی ہے جو چیز مذکور کے بنانے میں صرف ہو مثلاً گھڑی سگریٹ یا موٹر کا رواج جس قدر گھٹے بڑھے گا۔ اسی قدر کم زیادہ ان کے بنانے والے درکار ہوں گے۔ گویا چیزوں کی طلب سے محنت متعلقہ کی طلب محنت کی حقیقت سے وابستہ ہے اوپر بیان کر چکے ہیں اب ہم رسد محنت کے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں اور یہ دونوں پہلو پیش نظر ہونیکے بعد قانون طلب و رسد کا اجرت پر عملدرآمد بخوبی ذہن نشین ہو سکے گا۔ واضح ہو کہ جس طرح نہر کی جھالیں پانی کے بڑے بڑے تختے جا بجا روکے رکھتی ہیں اور صرف سطح کا پانی ان پر گذر گذر کر آگے بڑھتا رہتا ہے بعینہٖ محنت کی آزادانہ رسد میں بھی چند زبردست بندشیں سد راہ ہو کر ترقی پذیر محنت کی مقدار گھٹاتی چلی جاتی ہیں اگر یہ بندشیں نہ ہوتیں تو سطح آب ہر جگہ برابر ہوتی پانی جدھر ڈھلاؤ پاتا بہنے لگتا۔ مزدوروں کی طبقوں میں اعلیٰ ادنیٰ کا کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ رسد محنت فوراً طلب کی پیروی کرتی لیکن جبکہ متعدد بندشیں آزادانہ حرکت میں مزاحم ہوں تو پانی میں پست و بلند تختے اور مزدوروں میں اعلیٰ ادنیٰ طبقے پیدا ہو جانے لازمی ہیں۔ اور پانی کا بہاؤ اور محنت کی رسد بیشتر بندشوں کی حالت پر منحصر ہو جاتی ہے۔ چند قابل لحاظ رکاوٹیں جو رسد محنت میں مزاحم ہوتی ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) قدرتی مناسبت و استعداد۔ کہتے ہیں کہ شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے

حصہ سوم
باب سوم

تعلیم سے نہیں بنتا۔ گویا استعداد شاعری خداداد ہوتی ہے اکتسابی نہیں ہوسکتی۔ یہی حال کم و بیش مصوری اور موسیقی کا ہے۔ ان فنون لطیفہ میں ہر کوئی محنت اور کوشش کے زور سے کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ خیال ہے کہ عمدہ تراشی اور اعلیٰ جراحی کے واسطے بھی بعض ہاتھ قدرتاً موزوں ہوتے ہیں جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں صرف بعض نہائت توانا تندرست ہوتے ہیں اور بعض ا رحد ذکی و تیز فہم اور باقی دونوں لحاظ سے اوسط اور ادنیٰ درجہ میں شمار ہوتے ہیں گویا مناسبت اور استعداد کی تقسیم غیر مساوی ہے خود قدرت نے محنت کی رسد پر حدود قائم کرکے مزدوروں کے جدا جدا طبقے پیدا کردئے۔ جس کام کے واسطے خداداد استعداد کی ضرورت ہے اس کے کرنے والوں کی رسد قدرت کے ہاتھ میں ہے الہ آباد کی مشہور نمائش میں مس گوہر سرکاری اہتمام سے مشکل ایک گھنٹہ روز گاتی ہوگی۔ کئی ہزار روپیہ کے ٹکٹ روز فروخت ہوتے تھے جس میں سے صرف ایک ہزار مس گوہر بطور فیس لے لیتی تھی اگر مس گوہر جیسی گانے والوں کی کثرت ہوتی تو ایسی آمدنی ناممکن تھی۔ ملکۂ روس نے جب ایک مشہور گانے والے سے شکایت کی کہ وہ روس کے سپہ سالار اعظم کی ماہانہ تنخواہ سے بھی زیادہ روزانہ فیس وصول کرتا ہے تو اس نے کیا معقول جواب دیا کہ پھر آپ اپنے سپہ سالار اعظم ہی سے گانا کیوں نہیں گنوا لیتی ہیں میری کیا ضرورت ہے اگر محض کوشش سے مصوری میں کمال پیدا کرنا ممکن ہوتا تو مانی و بہزاد کا نام دنیا میں یوں غیر فانی نہ ہوسکتا۔ ایک ایک تصویر کی ہزار ہا روپیہ قیمت کیوں دیجاتی ہے دستی تصاویر فوٹو کی طرح کیوں ارزاں نہیں بکتیں۔ اکثر کلوں کی ایجاد نے جسمانی طاقت کی ضرورت گھٹا دی۔ تاہم بعض کاموں میں ابتک جسمانی طاقت خاص طور سے درکار ہے اور ایسے طاقتور مزدوروں کی قلت کی وجہ سے شرح اجرت بھی معمول سے زیادہ ہے۔ لوہا صاف

کرنے اور ڈھالنے کے کارخانوں میں بعض اَن پڑھ مزدور نہایت طاقت طلب کام کرکے تین سو روپیہ ماہوار تک کما لیتے ہیں علمی کاموں میں خداداد دماغی قوت کا فرق ہر طرف نمایاں ہے۔ قانونی دنیا کے آسمان پر مسٹر محمود مرحوم کا نام مثل آفتاب کیوں روشن ہے ڈاکٹر راش بہاری گھوش سے سٹر بھی نہیں صرف وکیل ہائیکورٹ ہوکر ہزار روپیہ یومیہ کیونکر کما لیتے ہیں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر قلتِ رسدِ محنت جو اضافہ شرح اجرت کا باعث ہوتی ہے قدرت کی آفریدہ ہے۔

(ب) صرف و وقت اکتساب قابلیت۔ قدرت نے انسان میں جو استعداد ودیعت کی ہے اس کی حالت اس سونے کی سی ہے جو مٹی میں ملا کان میں پڑا ہو۔ کان سے کھود کر نکالنا مٹی سے صاف کرنا سونے سے کام لینے کی مقدم شرطیں ہیں بعینہ خدا نے انسان کو جو استعداد عطا کی ہے اس کا پتہ لگانا اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اسکو صلاح اور ترقی دیکر کمال پیدا کرنا قابلیت کے واسطے لازمی ہیں۔ خواص محنت کی بحث میں ہم بالتفصیل واضح کر چکے ہیں کہ کیونکر تعلیمی مصارف اور تربیت کی دقتیں اکثر ہونہار مگر غریب بچوں کو ان ترقیات سے محروم کردیتی ہیں جن کی استعداد اُنکی ذات میں موجود ہوتی ہے۔ بہت نہیں لیکن پھر بھی چند نیوٹن شیکسپیر نپولین بسمارک اور گلیڈسٹون یورپ میں ضرور پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے ایک ایک کے سوائے باقی سب نامساعد حالات کے شکار ہوگئے۔ اس موقعہ پر خواص محنت کا بیان پڑھنے کی سفارش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ گویا رسد محنت پر ایک حد تک تو خود قدرت نے غیر مساوی تقسیم استعداد سے قائم کردی۔ دوسری حد استعداد کو قابلیت بنانے کے مصارف اور دقتوں سے پیدا ہوگئی۔

(ج) مذکورہ بالا غیر اختیاری بندشوں کے علاوہ۔ کچھ رکاوٹیں مذہب

حصہ سوم
باب سوم

رسم ورواج اور قانون نے بھی رسد محنت میں پیدا کر رکھی ہیں مثلاً مسلمان شراب کے کام سے جدا رہتے ہیں ہندو گوشت اور چمڑے کے کاروبار میں بہت کم ہاتھ لگاتے ہیں۔ مسلمان تو بلا تکلف ہندوؤں کی بنائی چیزیں کھاتے ہیں مگر اکثر ہندو سوا ئے اپنے ہم مذہب اور خصوصاً برہمن کے اور کسی کی بنائی حتیٰ کہ چھوئی ہوئی کھانے پینے کی چیز کو پاس تک نہیں آنے دیتے۔ اسی وجہ سے مسلمان حلوائیوں کی دکانیں بہت کم سرسبز ہو سکتی ہیں۔ لوہار، بڑھئی، معمار، درزی وغیرہ جیسے پیشے رذیل خیال کیے جاتے ہیں اگر یہ اب ان پیشوں کی اجرت معقول ہو گئی ہے اور برابر بڑھ رہی ہے لیکن اب تک رسم ورواج کے اثر سے نادار شریف قلیل ملازمت حتیٰ کہ فاقہ کشی کو یہ پیشے اختیار کرنے پر ترجیح دیتے ہیں غریب شریف دس روپیہ کی معلمی کو بیس روپیہ کی درزی گری سے ہزار درجہ غنیمت سمجھے گا۔ اسی شیخت کا نتیجہ ہے کہ بیکار شریفوں پر افلاس کی مصیبت چھائی ہوئی ہے۔ اور پیشہ ور لوگ جن کو رذیل خیال کیا جاتا ہے روز بروز خوشحال اور مالدار بنتے جاتے ہیں۔ شریفوں کو خاندانی محلات کی مرمت کی بھی توفیق نہیں اور پیشہ ور نئے نئے مکانات تیار کرا رہے ہیں۔ شریف آبائی جائداد گرو رکھتے پھرتے ہیں۔ پیشہ وروں میں جائداد کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔ اگر کچھ دنوں رسم ورواج پیشے اختیار کرنے میں یوں ہی مزاحم رہی تو ان دونوں طبقوں کی مالی حالت میں بالکل کایا پلٹ ہو جاوے گی۔ بمقابلہ ہمسایہ قوموں کے مسلمانوں میں پیشے خاص طور سے شرافت کے منافی خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید گزشتہ حکومت کا خمار ہو۔ ورنہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ذات کے فرق مٹائے اور پیشہ ورں کا رتبہ بڑھا کر ہر ایک کو بلا تکلف پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ اسلامی تاریخ کے سب سے درخشاں حصے میں مسلمانوں کی آزادی

حصہ سوم ماتم

آزادیٔ پیشہ گیری ہی خاص طور سے نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن کیسے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ خود فرقہ نما ہمسایہ قوم تو ہمارے آزادانہ اصول اختیار کرکے شاہراہ ترقی پر چل نکلے اور ہم اس کے پابندگن اصول اپنے اوپر عائد کرکے بید دست و پا، افلاس و نکبت کے جال میں پھنسے رہیں۔ پیشہ کی عزت اور دولت کا اسلامی معیار اکل حلال کا ملنا نہ ملنا ہے۔ اس معیار کو مد نظر رکھتے ہوئے مشکل کوئی ایسا پیشہ ہوگا جس کو تھوڑا بہت عمائد و اکابر اسلام نے اختیار نہ کیا ہو۔ جب تک ہم اپنے قدیم مسلک کی طرف پھر عود نہ کریں، ہماری مالی اور لہٰذا ہر قسم کی اصلاح و ترقی محال ہے۔

قانون نے رسد محنت پر ایک طرف نمایاں حد قائم کی ہے یعنی فوج میں سوائے سکھ، پٹھان، راجپوت اور مرہٹہ جیسی جنگجو قوموں کے اور کوئی ہندوستانی فرقہ بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ بعض محکموں کی ملازمت کے واسطے عمر کی بھی شرط لازمی ہے۔ چونکہ جدید کارخانوں میں جہاں ہزارہا مزدور یکجا کام کرتے ہیں بحالت عدم نگرانی مزدوروں کی صحت و اخلاق خراب ہونے حتیٰ کہ جان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے لہٰذا ایک فکٹری ایکٹ پاس کرکے کارخانوں کی رسد محنت پر قانونی حدود عائد کر دی گئیں۔ ۹ سال سے کم عمر بچے داخل نہیں ہو سکتے اور ۱۴ سال تک عمر والے ۶ گھنٹہ روز سے زیادہ اور رات کے وقت کام نہیں کر سکتے۔ عورتیں بھی صرف روئی اوٹنے کے کارخانوں میں رات کے وقت کام کر سکتی ہیں۔ کوئی مزدور ۱۲ گھنٹہ روزانہ سے زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ ہر ترقی یافتہ ملک میں فکٹری مزدوروں کی خاص نگرانی کیجاتی ہے۔ ورنہ آجروں کی چیرہ دستی اور مزدوروں کی ہوس کا یقینی نتیجہ تباہی ہوتا۔

حصہ سوم باب سوم

علاوہ مذکورہ بالا مذہبی رسوم اور قانونی حدود کے خود انسانی طبیعت اور عادات بھی رسد محنت میں حارج ہوتی ہیں۔ جراحی کا کام گھناؤنا مانا جاتا ہے چنانچہ ہمارے نفاست پسند طبیب اس سے ہمیشہ دست کش رہے اور یہ فن اکثر حجاموں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا واقعہ ہے کہ بعض لوگ تو عمل جراحی دیکھنے تک کی تاب نہیں لاسکتے حتیٰ کہ بیہوش ہو جاتے ہیں سنا ہے کہ ڈاکٹری مدرسوں میں جو طالب علم داخل ہوتے ہیں اُن میں سے تخمیناً دس فیصدی چند ماہ میں اس وجہ سے علیحدہ ہو جاتے ہیں کہ چیر پھاڑ کے کام سے اُن کی طبیعت از حد متنفر ہے بعض لوگ اس قدر احتیاط پسند ہوتے ہیں کہ وہ کمتر اجرت پر قناعت کر کے جرات طلب اور خطرناک کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتے بعض کام گندے بھی ہیں اور اس قدر آسان کہ ادنی ترین مزدور جن کی تعداد ہمیشہ کثیر ہوتی ہے انکو کرسکتے ہیں ایسی محنت کی رسد ہمیشہ وافر ہوتی ہے اور شرح اجرت بھی ادنیٰ چنانچہ حلال خور اور جاروب کش اسی طبقہ میں شامل ہیں

ارزانی و گرانی محنت

(۳) ارزانی محنت کا مسئلہ جس قدر عملی لحاظ سے اہم اور قابل تحقیق ہے۔ اتنا ہی اصولی حیثیت سے دقیق اور پیچیدہ ہے۔ عام طور پر تو ارزانی سے مقدار اجرت کی کمی مراد لیجاتی ہے یعنی ۴ آنہ روزوالے مزدور کی محنت ۸ آنہ اجرت والے سے ارزاں مانی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت محنت کی ارزانی کو فی نفسہ مقدار اجرت سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ارزانی نسبت پیداوار محنت اور اجرت کی موافقت سے متعلق ہے مثلاً اگر ایک مزدور ۴ آنہ روزانہ اجرت پر ۱۲ آنہ کا کام کرے اور دوسرا آٹھ آنہ پر چھ کا تو پہلے کی پیداوار محنت اور اجرت کی نسبت متقابلۃ دوسرے کے زیادہ موافق ہے۔ لہٰذا پہلے کی محنت دوسرے سے لازماً ارزاں ہے۔ بظاہر تو یہ اصول بالکل درست نظر آتا ہے۔ لیکن

حصہ سوم
باب سوم

بعض حالتوں میں یہ غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ واقعہ ہے کہ امریکہ میں مقابلۃً اکثر ترقی یافتہ ممالک سے باوجودیکہ نہ صرف مقدار اجرت سب سے زیادہ بلکہ بنسبت پیداوار اجرت بھی کمتر موافق ہے تاہم وہاں کی محنت سب سے ارزاں خیال کی جاتی ہے۔ اس معمہ کا حل ارزانی کے تعبیر پذیر مفہوم میں مضمر ہے۔ یاد ہوگا کہ بلحاظ کاشت وسیع و دقیق زرخیزی زمین کے دو مفہوم بیان کیے گئے تھے۔ بحالت اوّل اس سے پیداوار اور مصارف کاشت کی موافقت مراد ہے اور بحالت دوم مقدار پیداوار کی مبنی۔ بعینہٖ ارزانی اجرت کا مفہوم بھی دو معنی ہے۔ بلحاظ دوگونگی مفہوم زرخیزی زمین اور ارزانی محنت میں کامل مشابہت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ زرخیزی کی مذکورہ بالا بحث کا ارزانی کی مندرجہ ذیل توضیح سے مقابلہ کرنا نہ صرف مفید بلکہ باعث دلچسپی ہوگا۔

فرض کرو کہ چار مزدور ۴ - ۶ - ۸ اور ۱۰ آنہ اجرت لیکر ۱۲ - ۱۵ - ۲۰ اور ۲۴ آنہ قیمتی چیزیں روز تیار کریں۔ اب اگر آجر کو ایک مہینہ میں ۴۵ ہزار روپیہ کا سامان تیار کرانا مقصود ہو تو اس کام کے واسطے قسم اوّل کے مزدور ۲ دوم کے ۱۶۰۰ - سوم ۱۲ اور چہارم کے ۰۰ درکار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی و صنعتی مرکزوں میں لگان زمین بہت اعلیٰ ہے اور کارخانوں میں نہایت بیش بہا کلوں سے کام لیا جاتا ہے فرض کرو کہ سو۔ سو مزدوروں کی ٹولی کے واسطے ۱۵۰ روپیہ ماہوار تنخواہ کے نگراں - ۱۰۰ روپیہ ماہوار کرایہ کا قطعہ اراضی اور پچاس ہزار کا اصل قائم بشکل مشین و عمارت درکار ہو۔ جس کی شرح سود ۵ فیصدی اور مطالبات فرسودگی (جن کی مفصل تشریح آیندہ کریں گے) ۴ فیصدی سالانہ ہو تو مختلف قسم کے مزدوروں سے کام لینے میں مجموعی مصارف پیدائش علاوہ قیمت پیداوار خام حسب ذیل ہوں گے۔

مزدور	قسم اول (۲۰۰)	دوم (۱۶۰)	سوم (۱۲۰۰)	چہارم (۱۰۰۰)
اجرت	۱۵۰۰	۱۸۰۰	۱۸۰۰	۱۸۷۵۰
تنخواہ نگران و لگان زمین	۱۵	۴	۳۰۰	۲۵۰
سود و مطالبات فرسودگی	۷۵۰۰	۶	۳۵۰	۳۷۵
	۲۰۵۰۰	۲۸۰۰	۲۵۵۰۰	۵۰۰

تخمینہ اوّل و چہارم پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ پس ماندہ ممالک میں جہاں مشین بہا اس سے کام نہ لیا جائے اور لگان زمین بھی اعلیٰ ہو بالفاظ دیگر مقدار سود و لگان پیدائش مصارف کا جزو قلیل ہو ارزانی محنت پیداوار و اجرت کی نسبت کی موافقت پر منحصر ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جہاں سود و لگان مصارف پیدائش کے قابل لحاظ اجزا ہوں ارزانی محنت خاص طور سے مقدار پیداوار کی بیشی سے متعلق ہے۔ اگرچہ نسبت پیداوار و اجرت مقابلتہً کمتر موافق ہو۔ لیکن اگر کمی موافقت حد مناسب سے تجاوز کر جائے گی تو باوجود بیشی پیداوار ایسی محنت ارزاں نہ ہوسکیگی چنانچہ اگر قسم چہارم مزدور بجائے ۱۰ ر ۱۲ آنہ اجرت لیکر ۲۴ آنہ قیمتی چیز تیار کریں تو اُن سے کام لینے میں مصارف پیدائش ۲۸۷۵۰ پڑ کر اُن کی محنت قسم اوّل سے بھی گراں ہو جائے گی دوسرے اور تیسرے تخمینہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں اجرت مختص بالعمل کی یکساں شرح سے جو مزدور اجرت مختص بالزماں جس قدر زیادہ مقدار میں حاصل کر سکے گا۔ اس کی محنت بھی اُسی قدر ارزاں پڑے گی۔ اوّل تینوں تخمینوں کے مطالعہ سے تیسرا قابل توجہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر مقدار پیداوار محنت میں زیادہ فرق ہو جیسا کہ اوّل و سوم میں تو باوجود کمتر موافقت نسبت پیداوار و اجرت ارزانی محنت بیشی پیداوار کی بہرہ ہوگی۔

حصہ سوم ماسوم

اور اگر مقدار پیداوار میں فرق کم ہو جیسا کہ اول و دوم میں تو یا وجود بیشی پیداوار ارزانی موافقت نسبت پیداوار و اجرت کے تابع ہوگی۔ گویا فرق مقدار پیداوار کی کمی بیشی کے مطابق ارزانی اجرت علی الترتیب موافقت نسبت پیداوار و اجرت اور بیشی مقدار پر منحصر ہے۔ حاصل کلام مذکورہ بالا تینوں نتیجوں کا یہ ہے کہ پس ماندہ ممالک میں شرح اجرت مختص بالعمل جس قدر ادنیٰ ہوگی محنت ارزاں ہوگی یکساں پس ماندہ اور ترقی یافتہ ممالک میں مزدور اجرت مختص بالعمل کی مساوی شرح سے جس قدر زیادہ اجرت مختص بالزمان حاصل کر سکے گا اس کی محنت اسی قدر ارزاں ہوگی۔ اور خاص ترقی یافتہ ممالک میں اس مزدور کی محنت ہی ارزاں ہے جو سب سے زیادہ اجرت مختص بالزمان حاصل کرے اگرچہ حد مناسب تک شرح اجرت مختص بالعمل بمقابلہ دیگر ممالک ناموافق بھی ہو چنانچہ یہی اسری حالت امریکہ میں پائی جاتی ہے وہاں پر مزدور بمقابلہ دوسرے ملکوں کے زیادہ کماتا ہے اور اجرت مختص بالعمل کی شرح بھی مقابلتہً اعلیٰ ہے لیکن پھر وہاں کی محنت سب سے ارزاں اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت وہاں پر مصارف پیدائش میں سود اور لگان کا جزو بہت غالب ہے۔ اور اس علت کا نتیجہ ہم مندرجہ بالا تمہید میں بھی واضح کر چکے ہیں۔

چنانچہ امریکن علمائے معیشت کا مقولہ کہ سب سے اعلیٰ اجرت والی محنت سب سے ارزاں ہے بظاہر ایک چیستاں معلوم ہوتا ہے لیکن مذکورہ بالا بحث سے اس قول کی صداقت اور اہمیت ظاہر ہے۔ علاوہ ازیں معاشی ترقیات اور کلوں کی ایجادات کا مزدور کی مالی حالت پر کیونکر مفید اثر پڑ سکتا ہے اور کس حالت میں اضافۂ اجرت آجر و مزدور کے حق میں برابر مفید ہونا ممکن ہے۔ ان اہم مسئلوں کی بھی یہاں تشفی بخش توضیح ہوگئی۔

اضافہ اجرت اسکے نتائج

(۴) جو معاملات شمار و اعداد میں ظہور پذیر ہو سکیں۔ مثلاً آبادی اموات و

حصہ سوم باب سوم

پیدائش۔ امراض۔ تجارت درآمد و برآمد ان کے اعداد سے صحیح نتائج اخذ کرنا معاشی اصول کی صحت جانچنا۔ اُن کی ترمیم و تائید کرنا بیحد دشوار کام ہی جو معیشت میں ایک جداگانہ فن اعداد شمار کیا جاتا ہی یہاں پر اس فن کی تفصیلی بحث بر محل نہو گی اس کے واسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہی مگر اتنا جاننا کافی ہی کہ اس کام سے چند در چند شرائط متعلق ہیں جن میں سے اکثر کی پابندی اگر محال نہیں تو بیحد دشوار ضرور ہی۔ اسی دقت طلب شرائط کی بدولت یہ مقولہ صحیح ہی کہ اعداد سے ہر قسم کے حتیٰ کہ متضاد نتائج اخذ کیے جاتے ہیں جبتک شرائط لازمی کی تکمیل نہو۔ اعداد کی حالت بالکل موم کی سی ہی جس سانچے میں چاہو ڈھالدو۔ چنانچہ اعداد وہی ایک ہیں لیکن دو گروہ اپنے اپنے طور پر ہندوستان میں افلاس و دولت مندی کا اضافہ ثابت کرتے ہیں۔ فرق اجرت ہی کو لیجئے۔ طبقہ طبقہ کے مزدوروں کی تعداد اور اُن کے کاروباری وقت کا سالانہ تخمینہ کر کے اُن کی اجرت متعارف کا جداگانہ اوسط نکالنا بعدہٗ زر نقد کی قوت مبادلہ اور ہر طبقہ کی ضروریات کا علحدہ اندازہ کر کے اجرت صحیحہ کا پتہ لگانا یہ سب تحقیق زمانۂ ماضی و حال کے اوقات معین کے متعلق کر کے دونوں نتائج کے مقابلہ سے اضافہ و تخفیف اجرت کا دریافت کرنا کیا کچھ آسان کام ہی؟ علاوہ احتیاط کس قدر وسعت معلومات درکار ہی اور حسب ضرورت صحیح و مکمل اعداد کا ملنا آج جیسی ترقی یافتہ زمانہ میں بھی کس قدر دشوار ہی چونکہ پیش افتادہ اعداد سے بلا تامل نتائج نکالکر ان کی صحت پر اعتماد کرنے سے عجیب و غریب بنیادی مغالطے پیدا ہونے ممکن ہیں، بطور تنبیہ عددی نتائج کی احتیاط طلبی اور مغالطہ انگیزی کی طرف اشارہ ضروری سمجھا گیا

کسی ملک کے مزدوروں کی مجموعی کمائی تعداد مزدوران سے تقسیم کر کے جو

اوسط اجرت فی مزدور نکالا جاتا ہے اس سے نہ تو مزدوروں کی مالی حالت پر کچھ
روشنی پڑتی ہے نہ اضافہ و تخفیف شرح اجرت کا ہی پتہ چلتا ہے فرض کرو کہ ایک
ہزار مزدوروں کے دو گروہ ہیں اوّل گروہ میں ۵۰۰ کی اجرت ۱۲ روپیہ ماہانہ
۴۰۰ کی ۲۵ روپیہ اور ۱۰۰ کی ۴۰ روپیہ ماہانہ ہے۔ دوسرے گروہ میں ۵۰۰ کی
۸ روپیہ ۴۰۰ کی ۱۵ اور ۱۰۰ کی ۱۰۰ روپیہ ماہوار ہے۔ ظاہر ہے کہ بحیثیت مجموعی
اوّل گروہ کی مالی حالت دوم سے بہت بہتر ہے۔ تاہم دونوں گروہ کا اوسط
اجرت وہی ۲۰ روپیہ مزدور ہے اور اگر گروہ دوم میں آخری سو کی اجرت ۱۱۰
روپیہ ہو جائے تو اوسط اور بھی زیادہ گویا ۲۱ روپیہ فی مزدور ہو جائے۔ حالانکہ
مالی حالت اب بھی گروہ اوّل ہی کی برتر رہیگی۔ اسی طرح فرض کرو کہ ۱۲ روپیہ والے
مزدوروں میں سے ۳۰۰، ۲۵ والوں میں اور ۲۵ والوں میں سے ۳۰۰
۴۰ والوں میں آ ملیں بالفاظ دیگر ۲۰۰ کی اجرت ۱۲ ۴۰۰ کی ۲۵ اور
۴۰۰ کی ۴۰ ہو جائے تو اوسط اجرت بڑھ کر بجائے ۲۰ کے ۲۸ ۲/۵ روپیہ ہو جائیگا
حالانکہ شرح اجرت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ مزید براں اگر شرح اجرت
۱۰ فیصدی گھٹا دیجائے تو بھی اوسط ۲۵ ۳/۵ فی مزدور قائم رہیگا۔ گویا اجرت میں
۱۰ فیصدی تخفیف کے ساتھ ساتھ اوسط میں ۲۵ فیصدی اضافہ ہو گیا۔ اس کے
برعکس اگر ۲۵ روپیہ والے مزدوروں میں سے ۳۰۰ ۱۲ روپیہ والوں میں آئیں
تو اوسط صرف ۱۶ روپیہ رہ جائے گا۔ حالانکہ شرح اجرت بھی برقرار ہے بلکہ
اگر اجرت میں ۱۰ فیصدی اضافہ کر دیا جائے تو بھی اوسط تقریباً ۱۸ روپیہ پڑیگا
گویا باوجود ۱۰ فیصدی اضافۂ اجرت اوسط میں ۱۰ فیصدی تخفیف نظر آئے گی
ان سادہ مثالوں سے واضح ہوا کہ جب تک پوری تفصیل پیش نظر نہ ہو محض اوسط سے

حصہ سوم
باب ہشتم

مزدوروں کی مالی حالت اور تبدیلی شرح اجرت کا صحیح علم ہونا محال ہے۔

اوسط اور تبدیلی شرح اجرت کی بے تعلقی سے ایک قابل لحاظ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ اضافہ شرح اجرت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک انفرادی۔ جیسا کہ مثال بالا میں ۱۲ روپیہ والے مزدوروں کا ۲۵ روپیہ والوں میں یا ۲۵ والوں کا ۴۰ والوں میں آ ملنا۔ جہاں تک ادنیٰ سے اعلیٰ طبقہ میں ترقی کرنے والے مزدوروں کا تعلق ہے۔ اجرت کے اضافہ میں کوئی شک نہیں لیکن یہ اضافہ صرف اُن کی ذات تک محدود ہے۔ فی نفسہ شرح اجرت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ طبقہ ادنیٰ کے پس ماندہ اور طبقہ اعلیٰ کے سابق مزدوروں کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ اضافہ اجرت کی دوسری صورت طبقہ وار ہوتی ہے گویا مزدوروں کے کل گروہ کی اجرت میں کچھ فیصدی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور کل مزدور یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ مثال مذکورہ بالا میں جبکہ ۱۲ روپیہ والوں میں سے ۳۰۰ مزدور ۲۵ روپیہ والوں میں اور ۲۵ والوں میں سے ۳۰۰، ۴۰ روپیہ والوں میں آئیں تو اضافہ اجرت انفرادی ہوگا۔ لیکن اگر ۱۲ روپیہ والے ۵۰۰ مزدوروں کی اجرت ۲۰ روپیہ اور ۲۵ والے ۴۰۰ کی اجرت ۳۰ روپیہ اور ۴۰ والے ۱۰۰ کی اجرت ۶۵ روپیہ ہو جائے تو اضافہ اجرت طبقہ وار کہلائے گا اور دونوں صورتوں میں اوسط اجرت یکساں ۲۰ روپیہ سے بڑھ کر ۲۸½ روپیہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادی اضافہ کے مقابلہ میں طبقہ وار اضافہ کا اثر مزدوروں اور نیز ملک کی مالی حالت پر کہیں زیادہ وسیع اور گہرا پڑے گا۔ چنانچہ اضافہ شرح اجرت سے بالعموم طبقہ وار اضافہ مقصود ہوتا ہے اور اسی مفہوم میں ہم نے اوسط اور تبدیلی اجرت کی بے تعلقی اوپر واضح کی ہے۔

اضافہ اجرت کی بلحاظ وسعت دو صورتیں۔ اور اس کا عام مفہوم بیان

کرنیکے بعد اب ہم اس کا فیض یا بہ مزدوروں کی حالت پر اثر دکھانا چاہتے ہیں بعض ضرورتیں قیام زندگی کے واسطے ناگزیر ہیں مثلاً کھانا، پینا، لباس مکان بعض عمدہ کارکردگی کے واسطے لازمی ہیں مثلاً مقوی جسم غذا آرام دہ لباس او آسائش افزا مکان صحت پرور آب و ہوا راحت گیری کی مہلت خودداری کا احساس ترقی کی امنگ اور یہ سامان مقدار اجرت کی کمی بیشی پر منحصر ہے بدقسمتی سے از حد بیشی کی بدولت کہیں کہیں مزدوروں کی ضروریات اُن بیجا تعیشات کی جانب داخل ہوگئی ہیں جو اخلاق صحت اور کارکردگی سب کے حق میں کم و بیش مضر ہیں یہ حالت بیشتر یورپ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتی ہے لیکن وہاں بھی تمام مزدوروں کی ضروریات قسم دوم تک محدود ہیں۔ مقابلتہً صرف چند کو رنگ رلیاں میسر ہوسکتی ہیں۔ ایشیا کا غریب مزدور کم و بیش ضروریات قسم اول پر قانع پایا جاتا ہے۔ لیکن مزدور کے حق میں اجرت کی تفریط افراط سے بھی زیادہ مضر ہے اور ضروریات قسم دوم کی بہم رسانی نہ صرف مزدور بلکہ کل ملک کے حق میں بیحد مفید ہے واضح ہو کہ ایسی ضروریات میں بہت کچھ اضافہ اور ترقی کی گنجائش ہے۔ مزدور کی ضروریات قسم دوم تک محدود کرنے سے یہ غلط نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ اضافہ اجرت پر کوئی حد بندی مقصود ہے۔ بلکہ یہ جتانا مدنظر ہے کہ مذہبی معاشرتی اور تعلیمی اثرات اور بیحد مناسب قانونی پابندی سے مزدور کو بدمذاقی اور بری عادات سے روکا جائے تاکہ وہ ضروریات قسم سوم کی طرف کم مائل ہو اور اپنی زندگی ضروریات قسم اول و دوم پر قائم کرکے خود بھی جائز لطف اُٹھائے اور ملک کی مرفہ الحالی میں بھی اضافہ کرے۔ چونکہ ہر ملک میں جماعت کثیر مزدور پیشہ ہوتی ہے۔ لہذا مزدوروں کی تربیت و اصلاح گویا کل آبادی سے متعلق ہے۔

اگر مزدور صرف معدودے چند ضروریات قسم اول کا عادی اور انہی پر قانع ہے

تو اضافہ اجرت کا نتیجہ تخفیف محنت ہوگا۔ مثلاً اگر ۴ آنہ روز اجرت اُس کی کل ضروریات کے واسطے کافی ہیں اور ضروریات بڑہانے کا اس کو شوق نہو تو اجرت ۸ آنہ روز ہو جانے کی حالت میں وہ غالباً ہفتہ میں دو تین روز کام کرنا چھوڑ دے گا۔ بلا ضرورت وہ کام کیوں کرنے لگا۔ چنانچہ ہمارے ملک کے اکثر کاریگر درزی سونار بڑہئی۔ جو تھوڑی سی محنت سے ضرورت کے لائق کما لیتے ہیں بدشوق اور کام چور ہو نہیں مشہور عالم ہیں وہ دکان پر بہت کم نظر آتے ہیں اور اُن سے کام بنوانے کے لیے پہرہ بٹھانا لازمی ہے گرم ممالک کے باشندے جن کی ضروریات مقابلتہً مختصر ہیں اور باآسانی مہیا ہوسکتی ہیں۔ کام سے کمتر مانوس پائے جاتے ہیں اور بیشی اجرت سے وہ اکثر کمی محنت کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر مزدور کو ضروریات قسم دوم کا چسکا لگ جائے۔ اور ایسی ضروریات کا میدان نہایت وسیع ہے تو اضافہ اُجرت کے ساتھ ساتھ اس کو کام سے بھی زیادہ محبت ہوگی۔ اس کی کارکردگی ترقی کرے گی۔ گویا بہم رسانی ضروریات کا شوق۔ اضافہ اجرت۔ تکثیر محنت اور ترقی کارکردگی میں باہم سبب اور نتیجہ کا دوگونہ رشتہ قائم کرکے مزدور کا طرز بودوباش اعلیٰ اور اس کی زندگی پر لطف بنا دیگا۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے صناع جسقدر اپنے کام میں ماہر ہوں گے اور اُنکی اجرت اعلیٰ ہوگی اتنی ہی وہ اپنے کام میں توجہ و محنت کرینگے۔ تاکہ زندگی کے نئے نئے لطف جو اُن کے پیش نظر ہیں اُٹھا سکیں۔ قسم دوم کی ضروریات شائق مزدور کو محنت کے میدان میں اسی طرح دوڑاتی ہیں جیسے کہ پیاسے کو دور افتادہ سرچشمہ درمیانی فاصلہ طے کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اور منزل مقصود جس قدر قریب ہوتی جاتی ہے۔ آتش شوق تیز تر ہو کے مطابق جہد پسندی بھی بڑہتی ہے۔ حتیٰ کہ فائز المرام ہونے پر بجائے کسل و تکان کے طاقت و چستی میں

اور ترقی ہو جاتی ہے ان ضروریات میں گویا دوچند خوبی ہے نہ صرف محنت کا شوق بڑھتا ہے
بلکہ کارکردگی بھی ترقی کرتی ہے اور چونکہ انکا سلسلہ نہایت طولانی ہے۔ مزدور کو اسی طرح
شاہراہ ترقی پر بہت دور پہنچا سکتی ہیں۔ چنانچہ مزدور کو ضروریات قسم اوّل پر اکتفا
نکرنے دیں سر و بار ت قسم سوم سے بچانے اور قسم دوم کا از حد شوق پیدا کرنے کا
امریکہ میں خاص اہتمام پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ شرح اجرت اعلیٰ مزدور خوشحال
محنت ارزاں اور ملک دولتمندی میں سب سے پیش پیش ہے۔

ل
عام مشاہدہ ہے کہ پس ماندہ اور افلاس زدہ طبقوں میں بمقابلہ ترقی یافتہ اور خوشحا
لوگوں کے۔ اولاد کی ترقی ہے۔ دیگر اسباب کچھہ بھی ہوں لیکن ایک معاشی وجہ یہ بھی قرین
قیاس ہے کہ ان کی ضروریات زندگی اتنی مختصر اور کم خرچ ہوتی ہیں کہ باوجود بے مایگی
کثرت اولاد کچھہ بار نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اعلیٰ طبقوں میں ضروریات اس قدر
کثیر اور بیش خرچ ہوگئی ہیں کہ ہر عاقبت اندیش آدمی تعداد اولاد کا مسئلہ اپنے حق
میں قابل توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ علاوہ دیگر وجوہات کے مصارف خاندان
کے متحمل نہو سکنے کا خوف بھی ترقی یافتہ ممالک میں بہت سے لوگوں کو شادی سے
روکتا ہے خود ہندوستان پر نظر کیجیے کہ جوں جوں مصارف زندگی بڑھ رہے ہیں بیاہ شادیوں
میں بھی تاخیر زیادہ ہو رہی ہے۔ اول بسر اوقات کی صورت پیدا کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے بقول شاعر

بے پاس ساس بھی نہیں ملنے کی آس آہ موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

اگو اخلاقی لحاظ سے یہ فعل قابل نفرین سہی لیکن واقعہ ہے کہ باوجود شادی مصنوعی طریق سے
پیدائش کی حد بندی کر کے اچھے بھلے لوگ ایک دو بچوں سے زیادہ اولاد پسند نہیں کرتے
اور اس لیے کہ بطریق احسن پرورش پاسکیں تعین تعداد خود اولاد کے حق میں بھی مفید
خیال کرتے ہیں پیدائش اولاد کے اس نمایاں فرق کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ادنےٰ

حصہ سوم
باب سوم

طبقوں کی اجرت بڑہنے سے اُن کی کارکردگی تو بڑہتی نہیں لیکن اولاد میں جلد اسقدر اضافہ ہو جاتا ہی کہ رسد محنت کی زیادتی سے اجرت کے پھر قدیم سطح پر گر پڑنے کا اندیشہ دامنگیر رہتا ہی اس کے برعکس اعلیٰ طبقوں میں ہستی اجرت سے کارکردگی میں معقول ترقی ہوتی ہی اور مقابلتہً اولاد میں اضافہ بہت کم جس سے اجرت کا اضافہ مستقل اور دیرپا ہونے کی امید کی جاسکتی ہی

ترقی کارکردگی اور اضافہ تعداد مزدوران کا جو اجرت پر اثر پڑتا ہی اس کی مزید توضیح خالی از منفعت نہوگی ارزانی محنت کی بحث میں ثابت کیا جاچکا ہی کہ ادنے کارکردگی والے مزدوروں کی بڑی جماعت سے کام لینے کے مقابلہ میں اعلیٰ کارکردگی والے مزدوروں کے مختصر گروہ سے کام لینا آجر کے حق میں زیادہ مفید ہی - اگرچہ بحالت دوم اجرت مختص بالعمل کی شرح اعلیٰ تر کیوں نہو - گویا اعلیٰ کارکردگی والے مزدور کو ادنیٰ کے مقابلے میں اُجرت مختص بالعمل نسبتاً زیادہ ملتی بھی ممکن ہی علاوہ ازیں فرض کرو کہ دس مزدوروں کی جماعت میں گیارہویں کا اضافہ ہو - ظاہر ہی کہ محنت مختتم کی مقدار پیدا وار گھٹ کر شرح اجرت میں تخفیف ضرور کردے گی چنانچہ قوانین اجرت کی بحث میں محنت مختتم کے عنوان سے یہ مسئلہ بخوبی واضح کیا جاچکا ہے فرض کرو کہ اجرت میں بقدر $\frac{1}{30}$ کمی ہو - اب اگر ان ہی دس مزدوروں کی کارکردگی بڑھکر انکو ۱۱ مزدوروں کے کام کرنیکے قابل بنادے تو باوجود مذکورہ بالا کمی شرح اُنکی اجرت میں تخمیناً $\frac{1}{15}$ اضافہ ہوگا کیونکہ اُن میں سے ہر ایک بمقابلہ سابق اجرت کے $\frac{11}{10} \times \frac{29}{30}$ یعنی ($1\frac{9}{30}$) حاصل کرسکے گا پس ثابت ہوا کہ ترقی کارکردگی آجر اور مزدور بالفاظ دیگر کل ملک کے حق میں بیحد مفید ہی - یہی وجہ ہی کہ شرح اجرت کے متعلق جو آجر و مزدوروں میں کبھی جھگڑا ہوتا ہی تو بے غرض عوام اور نیز گورنمنٹ اکثر مزدوروں کی ہمدرد اور طرفدار پائی جاتی ہی

حصہ سوم

باب سوم

فصل سوم

ترقیات مزدوران

تجزیہ (۱) انجمن اتحاد مزدوران (۲) بیمہ فنڈ (۳) حفظان صحت (۴) تخفیف اوقات (۵) اضافہ اجرت (۶) ہڑتال (۷) شرکت منافع (۸) شراکت

انجمن اتحاد مزدوران

یورپ اور امریکہ میں اکثر پیشوں کے مزدوروں نے باقاعدہ اپنی اپنی اتحادی انجمنیں قائم کر لی ہیں جن میں ہم پیشہ مزدور جوق جوق مقررہ ماہانہ چندہ دیکر شریک ہوتے ہیں اور اتفاق عمل کے زور سے کل ممبروں کی بہبودی اور ترقی کی ہر مناسب طریق سے کوشش کرتے ہیں۔ ان انجمنوں کی ہردلعزیزی اہمیت اور تقویت روز بروز بڑھ رہی ہے کہ ہر سمجھدار مزدوران کی ممبری اپنے حق میں ضروری اور مفید خیال کرنے لگا ہے۔ جرمنی اور انگلستان میں اتحادی مزدوروں کی تعداد ۲۵ اور ۲۴ لاکھ ہے لیکن بلحاظ نسبت آبادی ایسے مزدور ڈنمارک اور سویڈن میں سب سے زیادہ ہیں ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی انجمنیں بلحاظ کارگزاری وحسن انتظام ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقوں کی انجمنوں سے بدرجہا افضل نظر آتی ہیں۔ ان کی بار آور کوششوں سے ترقی یافتہ قوموں کے افراد کی ارادی قوت اور عملی قابلیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے مزدوروں کی اتحادی انجمنوں کے مہتمم اور نگراں نہایت قابل اور کارگزار لوگ ہوتے ہیں جن میں سے بعض کو ممبری پارلیمنٹ تک کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ اتفاق کی طاقت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے اور جب ایسی طاقت نہایت باخبر، معاملہ فہم اور خیر اندیش سرگروہوں کے ہاتھ میں آجاوے

حصہ سوم
باب سوم

تو اس سے کیا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مزدور کسی شمار قطار میں نہ تھے! اور ہوتے کیسے؟ غریب، بے علم، بیشمار، منتشر، دولتمند اور قابو یافتہ آجروں کی ایک مختصر جماعت کے ہاتھ میں کم وبیش کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اوّل تو خود اُنکا افلاس، کثرت اور انتشار اُن کی سب سے بڑی کمزوری کا باعث تھے۔ علاوہ ازیں ملکی قانون سازی میں اُنکا برائے نام بھی دخل نہ تھا۔ خود غرض اور کوتہ اندیش آجر حسب دلخواہ اپنے موافق قانون پاس کرکے اپنے اقتدار سے بے بس مزدوروں کے خلاف ناجائز فائدہ اُٹھاتے رہتے تھے حتیٰ کہ انگلستان میں ۱۸۲۴ء تک اسٹرائیک میں مزدوروں کی کسی جماعت کا اپنے مطالبات پورا کرانے کی غرض سے بالاتفاق کام چھوڑ دینا قانوناً بڑا جرم تھا اور ۱۸۷۱ء تک مزدوروں کو اتحادی انجمنیں باضابطہ قائم کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ لیکن مزدوروں کے دن پھرنے کا زمانہ آن پہنچا تھا اور اُن کی ترقی اقتضائے وقت تھا۔ معاشی ترقی اور سیاسی آزادی نے مزدوروں کی اہمیت اور اُن کے حقوق پر روشنی ڈالی۔ توسیع تعلیم اور اضافہ اجرت سے خود مزدوروں میں بیداری اور خودداری کا احساس پیدا ہو چلا۔ کچھ روز تو آجروں نے انقلاب کی روک تھام کی لیکن کب تک بالآخر مزدوروں نے کروٹ بدلی اور بتدریج قابو یافتہ آجروں کے تسلط سے آزاد ہونے لگے حتیٰ کہ آج ان اتحادی انجمنوں کی بدولت مزدور آجروں کے بالمقابل مثل ہم پلہ اپنے فرائض وحقوق باآزادی طے کرتے نظر آتے ہیں۔ جب تک بہت سے غریب مزدور چند دولتمند آجروں سے جدا جدا اپنا معاملہ طے کرتے رہے وہ اپنے حقوق کی نگہداشت سے تقریباً بالکل معذور رہے۔ اور اکثر آجر کی پیش کردہ اجرت قبول کیے بغیر انکو کوئی چارہ نہ تھا۔ اس بے بسی کا خاص باعث مندرجہ ذیل حالات تھے۔

(۱) آجر تو معدودے چند تھے اور مزدوروں کی از حد کثرت تھی۔ آجر کم و بیش متحد رہ سکتے تھے لیکن مزدوروں میں برائے نام اتفاق بھی وہم وگمان سے باہر تھا نتیجہ یہ کہ آجر کو مزدور ملنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی بلکہ مزدور کو آجر ملنا دشوار تھا۔ ایسی حالت میں مزدور کو آجر سے اجرت کے متعلق ردوقدح کرنے کی کیا جرأت ہوسکتی تھی۔

(ب) دولتمند آجر تو مزدور نہ ملنے کا انتظار برداشت کرسکتا تھا لیکن غریب مزدور میں بیکار رہنے کی سکت کہاں۔ اگر دوروز کام نہ لگے تو فاقہ کی نوبت آجاوے لہذا آجر من مانی اجرت دیتے اور مزدور بخوف بیکاری اس کو غنیمت سمجھتے تھے۔

(ج) جاہل مزدور کاروباری حالات سے بالکل ناواقف اور بیخبر تھے۔ آجر اضافہ منافع کی تو ان کو کانوں کان بھی خبر نہونے دیتے تھے لیکن تخفیف کا بار ان کی اجرت پر ڈالنے کے واسطے ہر وقت تیار رہتے تھے

مزدوروں کی اتحادی انجمنوں کے قیام سے مذکورالصدر حالات میں کایا پلٹ ہوگئی

(۱) مزدوروں میں باہمی اتفاق واتحاد پیدا ہوگیا جس کی بدولت حسب دلخواہ شرائط پر مزدور ملنے کا موقع آجر کے ہاتھ سے نکل گیا۔

(ب) مشترکہ اندوختہ سے فنڈ قائم کیا گیا۔ تاکہ بحالت بیکاری مزدوروں کی مالی امداد کیجائے گویا اب مزدور آجر پر دباؤ ڈالنے کے لیے بلاخوف فاقہ محنت ترک کرسکتے ہیں۔

(ج) انجمنوں کے تعلیم یافتہ اور باخبر منتظمین کاروباری حالات پیش نظر رکھتے ہوئے مزدوروں کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتے ہیں۔

جن جن طریق سے اتحادی انجمنیں مزدور کی بہبودی کے واسطے کوشش کررہی ہیں

اُن کی ہم ذیل میں تفصیل کرتے ہیں۔

(۲) اوّل تو اکثر مزدوروں کی وہی مثل ہوتی ہے کہ وہی کنواں کھودنا وہی پانی پینا۔ اگر کہیں کام ہاتھ آگیا تو روزی ورنہ روزہ۔ ان غریبوں کے پاس اندوختہ کہاں جو اڑے وقت کام آئے اور جو اجرت کچھ زیادہ بھی ہوئی تو یہ پس انداز کرنا کم جانتے ہیں ہرچہ داری بخور امروز غم فردا مخور انکا اصول زندگی نظر آتا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں بھی جہاں مقدار اجرت سب ملکوں سے زیادہ ہے مزدور اکثر خالی جیب رہتا ہے۔ دن بھر میں جو کچھ کماتا ہے شام تک اُڑا دیتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بیش خرچی مفید ہے کہ مزدور چیونٹی کی مانند کام سے لگا رہتا ہے بحالت اندوختہ بیکاری کا شوق پیدا ہونا ممکن تھا۔ لیکن بحالت حوادث زندگی اور ناموافقت زمانہ ایسے مزدوروں کی حالت نہایت ابتر اور قابل رحم ہو جانی یقینی ہے۔ لہذا انجمنوں نے یہ طریق نکالا کہ ہر ممبر مزدور سے ماہانہ چندہ لیکر ایک مشترکہ فنڈ جاری کر دیا جس میں سے ہر ممبر کو جائز مشکلات میں بشرح معین مالی امداد دیجاتی ہے۔ گویا مزدور کو اندوختہ کے کل فوائد بھی بدرجہ اولیٰ حاصل ہوگئے اور شوق بیکاری کا اندیشہ بھی رفع ہو گیا۔ انجمن گویا مزدوروں کے اندوختہ کی امین ہے اور فنڈ انکا مشترکہ سرمایہ جس کو جس قدر ضرورت پیش آوے بہ پابندی قواعد فنڈ سے لے سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں انگلستان کی سو سر برآوردہ اتحادی انجمنوں نے جن کی سالانہ آمدنی ۳۱۲۵۰۰۰ روپیہ تھی اپنے ممبروں کی حسب ذیل مالی امداد کی

(ا) خرچ کفن دفن	۱۵۶۲۵۰۰
(ب) وظیفۂ پیری	۳۱۲۵۰۰۰
(ج) وظیفۂ علالت	۳۱۲۵۰۰۰
(س) تلافی حوادث مثلاً انشرو گی عضا شکنی	۲۱۸۷۵۰۰

حصہ سوم

(د) وظیفہ بیکاری غیر اختیاری ۔۔۔۔۔۔ ۵۰۰۰

میزان ۔۔۔۔ ۱۵۰۰۰

باب سوم

حفظانِ صحت

(۳) تجارتی اور صنعتی مرکزوں کی آب و ہوا اوّل تو یونہی بوجہ گنجانی آبادی و بلندی عمارات خراب ہوتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کارخانوں میں مزدوروں کا بیحد ازدحام ہوتا ہے۔ انجنوں سے بھاپ ہوا میں نکلتا رہتا ہے بعض پیداوار خام مثلاً روئی سن کے بیشمار باریک باریک ریشے ہوا میں بکثرت ملجاتے ہیں۔ چمڑے اور کاغذ کے کارخانوں میں بعض کام خاص طور پر غلیظ ہوتے ہیں۔ لوہے اور شیشہ کے کارخانوں میں جلنے کا خوف بہت دامنگیر رہتا ہے۔ بدحدی ہونے کی حالت میں کلوں میں پھنس کر جان ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ کارخانہ کے اندر یا اس کے محاذات میں کوڑے کچرے آب و ہوا خراب ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ کان کنی میں تحفظ جان اور صحت کیواسطے اور بھی زیادہ اہتمام اور خاص احتیاط درکار ہے ایسی حالت میں مزدوروں کی حفظانِ صحت پر جتنی توجہ صرف کیجائے کم ہے چنانچہ اوّل تو خود گورنمنٹ نے فیکٹری ایکٹ کے ذریعہ سے کارخانوں پر بہت کچھ ایک نگرانی قائم کر دی ہے۔ دوسرے اتحادی انجمنیں بھی برابر دیکھ بھال رکھتی ہیں اور جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت نظر آتی ہے خواہ گورنمنٹ کو توجہ دلا کر یا اپنے اصرار و ہڑتال کے آجر کو اسے پورا کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔

تخفیف اوقات

(۴) کار برائے زیستن است۔ نہ کہ زیستن برائے کار۔ محنت میں افراط و تفریط دونوں یکساں مضر اور قابل احتراز ہیں۔ آدمی کو محنت ایسی اعتدال پر قائم رکھنی چاہئے کہ اس کو کل خاطر ضروریات حاصل ہو سکیں نہ تنگدستی کا اسیر بنے اور نہ دولت کمانیکی کل۔ ان دونوں حالتوں میں زندگی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے پیشہ کے علاوہ راحت آسائش سیر تفریح کنبہ کی مسرت بخش صحبت اور دوست و احباب کی پر لطف ملاقات۔ ملکی

اور قومی معاملات ضروری کی شرکت جیسے اور کام بھی حسب حال مزدور کی توجہ کے طالب ہیں علاوہ ازیں خود قدرت نے مقدار محنت پر حد لگا دی ہے۔ کچھ دیر کام کرنے کے بعد آدمی تھکنے لگتا ہے حتی کہ تکان اسکو بالکل معذور کرکے آرام لینے پر مجبور کردیتی ہے اگر مزدور کچھ عرصہ تک ہدایت قدرت کی خلاف ورزی کرے تو صحت کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ اس کی کارکردگی میں بھی تخفیف ہو جانی یقینی ہے۔ گھوار وہتی ہے رات بھر پیسنا اور چیتی میں اٹھانا جو لوگ جس قدر حد سے زیادہ محنت کرتے ہیں اسیقدر اُن کی محنت کے نتائج بمقدار کمتر پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ بعض طالب علموں کے فیل ہوجانے کی وجہ حد سے زیادہ مطالعہ ہوتا ہے جو دماغ کو کند بلکہ معطل کردیتا ہے۔ اور جب زائد محنت صحت و کارکردگی کے حق میں مضر ثابت ہوئی تو اس سے اجرت میں تخفیف ہونی بھی ظاہر ہے گویا کثرت سے خود محنت کی غرض و غایت فوت ہو جاتی ہے۔

لہذا اوّل تو فرصت فی نفسہ بہت ضروری اور مفید ہے اگر تخفیف اوقات سے اجرت میں ناقابل برداشت کمی نہو تو اس کو ضرور حاصل کرنا چاہیے علاوہ ازیں اس کا کارکردگی پر جو مفید اثر پڑیگا وہ ایک حد تک ضرور اجرت کو گھٹنے سے روکے گا اور تخفیف اوقات سے اجرت میں اتنی کمی ہوگی جتنا کہ اندیشہ ہے۔ اور اگر سطح کارکردگی بہت اعلی ہو اور بہت مکمل کلوں کا استعمال وسیع پیمانہ پر جاری ہو تو باوجود تخفیف اوقات دوسرے مزدوروں سے زیادہ اجرت حاصل کرنی ممکن ہے چنانچہ واقعہ ہے کہ امریکہ اور انگلستان میں اوقات کار سب سے مختصر ہیں لیکن بوجوہات مذکورہ بالا یہاں کے مزدور کو تقریباً سب سے زیادہ اجرت ملتی ہے اور ملک کی پیداوار بھی دوسرے ملکوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

بحث بالا سے واضح ہوا کہ تخفیف اوقات کی گنجائش اور اس کا اجرت پر اثر چند دیگر حالات پر منحصر ہے جن کو مختصراً معاشی ترقی سے تعبیر کرسکتے ہیں تلوں ہی میں سے تیل

حصہ سوم باب سوم

سکتا ہے آجر اپنی گرہ سے تو مزدور کو اجرت دیتے سے رہا۔ نقصان اُٹھا کر وہ چند ماہ بھی کاروبار جاری نہیں رکھ سکتا لہذا تخفیف اوقات کے ساتھ قدیم اجرت کا بھی مطالبہ کرنا ہر حال میں بیجا ہوگا۔ اگر ترقی کارکردگی کی بدولت محنت کی قدیم پیداوار بحال ہے تو آجر کو قدیم اجرت دینے میں غالباً کوئی عذر ہوگا اور ہونا چاہیئے اور اگر پیداوار میں کمی آگئی تو آجر اجرت میں تخفیف کرنے پر مجبور ہوگا لیکن واضح ہو کہ اگر آجر کی مقدار منافع غیر معمولی طور پر زیادہ ہو تو آخری صورت میں بھی قدیم اجرت ملنی ممکن ہے۔ گویا آجر اپنے منافع کا ایک حصہ مزدوروں کو بانٹ دینا بمقابلہ اُن کو جدا کرنے کے گوارا کریگا اور گو مقدار اجرت وہی برقرار ہے لیکن تخفیف اوقات کی بدولت شرح اجرت میں اضافہ ہو جائیگا۔ تخفیف اوقات کا ایک مشابہ بیکار مزدوروں کو کام سے لگانا بھی قرار دیا جاتا گویا یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ پیداوار محنت میں کمی آجائے گی۔ پس اگر سوائے چند قابل استثنٰی حالتوں کے مقدار اجرت بھی کچھ کم ہو جائے تو کیا عجب ہے لیکن باوجود تقلیل مقدار شرح اجرت وہی برقرار رہے گی حاصل کلام یہ کہ چند در چند معقول وجوہات سے اکثر تخفیف اوقات ضروری اور مفید معلوم ہوتی ہے۔ شرح اجرت میں تخفیف ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ البتہ اگر مقدار اجرت حسب سابق برقرار رہے تو کیا کہنا ورنہ قابل برداشت کمی کا بھی مضائقہ نہیں۔

اوقات کار کا تعین آجر اور مزدور کی باہمی رضامندی پر نہیں چھوڑا جا سکتا آجر کا تو اسی میں فائدہ ہے کہ مزدور جہاں تک ممکن ہو زیادہ دیر تک کام کرے۔ کیونکہ جس قدر زیادہ مال تیار ہوگا۔ عمارت اور کل جیسے اصل مستقر پر زیادہ سود حاصل ہوگا۔ رہا مزدور سو اوّل تو وہ اتنا مآل اندیش نہیں کہ اجرت کے لالچ پر غالب آسکے۔ دوسرے اس کا بس کیا چل سکتا ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے کی شرط یہ ہے کہ مزدور ٹھیک وقت پر

حصہ سوم
باب ۹م

سیٹی سنتے ہی آوے اور سیٹی سنکر جاوے ہر ایک کا کام باقی بیشمار مزدوروں کے کام سے اس قدر وابستہ ہی کہ وہ تنہا حسب مرضی کام شروع اور ترک نہیں کرسکتا ایسی حالت میں اوقات کا از حد طویل ہونا کیا تعجب ہی۔ چنانچہ اس معاملہ کی اہمیت دیکھکر اوّل تو خود گورنمنٹ نے بذریعہ قانون اوقات کی انتہا معین کردی علاوہ ازیں اتحادی انجمنیں بھی حسب ضرور تخفیف کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں ہندوستان میں اوقات کار ۱۲ گھنٹہ انگلستان میں ۹ گھنٹہ اور امریکہ میں صرف ۸ گھنٹہ ہیں۔ ۸ گھنٹہ محنت ۸ گھنٹہ خواب اور ۸ گھنٹہ فرصت بہترین تقسیم اوقات قرار دیجاتی ہی۔ واضح ہو کہ یہاں اصل مستقر کی بیکاری سے آجروں کو نقصان پہنچنے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں اب وہ بجائے مزدوروں کے ایک گروہ کے دو سے یکے بعد دیگرے کام لیکر بمقابلہ سابق اور بھی زیادہ دیر تک روزانہ کاروبار جاری رکھہ سکتے ہیں اور اضافہ پیداوار کے ذریعہ سے اصل مستقر لشرح اعلیٰ سود حاصل کرسکتا ہی۔

اضافہ
اجرت

(۵) کامیاب اور سرسبز کارخانوں کے مزدور یہ دیکھکر کہ آجر بہت زیادہ منافع پارہا ہی اور اُن کی اجرت نسبتاً کم ہی اسٹرائیک کی دہمکی اور دباؤ سے اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ اب اگر آجر کے کارخانہ میں کوئی اشد ضروری کام ہورہا ہو جس کو وہ ترک یا ملتوی نکرسکے اور بوجہ غلبۂ انجمن اتحاد یا تخصیص طلبی محنت جدید مزدور میسر نہ ہکیں تو وہ بے بس اور لاچار ہوکر اضافہ اجرت بشرطیکہ اس کے حق میں سراسر تباہ کن اور ناقابل برداشت نہو گوارا کرے گا لیکن مزدوروں کی فوری کامیابی کچھہ بڑی بات نہیں تحقیق طلب بات تو یہ ہی کہ ایسے اضافہ کے بعید اور دیرپا نتایج کیا ہونگے وہ حسب حال تین ہوسکتے ہیں۔ اوّل اگر آجر درحقیقت معمول سے زیادہ منافع پارہا تھا۔ اگرچہ آج کل آزادانہ مقابلہ کے زمانہ میں ایسا ہونا نہایت نادر الوجود

حالات میں ممکن ہے جن کی اجارہ کے عنوان سے ہم آئندہ تشریح کریں گے۔ تو وہ کاروبار بند کرنے پر منافع کا ایک حصہ بشکل اضافۂ اجرت مزدوروں کو بانٹ دینا گوارا کریگا اضافہ اجرت کی یہ سب سے زیادہ قابل طمینان صورت ہے لیکن اتنی ہی نایاب بھی ہے۔ آجکل تمام آجر ہر طرف نظر دوڑاتے رہتے ہیں اور اگر کسی کو معمول سے زیادہ منافع ملتے دیکھتے ہیں تو خود بھی اس میں حصہ جمانے کی فکر کرتے ہیں۔ اور بالآخر مقابلہ کے اثر سے آخرالذکر آجر کا منافع بھی معمولی سطح پر اتر آتا ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ اگر آجر معمولی منافع پا رہا ہے تو اضافہ اجرت کا کیا حشر ہوگا اوّل آجر اپنی چیزوں کی قیمت بڑھانے کی کوشش کریگا تاکہ اضافہ قیمت سے اضافہ اجرت کی تلافی ہو سکے لیکن ایسا ہونا بھی خاص حالتوں میں ممکن ہے جن کی بعنوان طلب بالواسطہ ہم آئندہ تفصیل کرینگے۔ فرض کرو کہ قیمت بڑھ جائے تو گویا اضافہ اجرت چیزوں کے خریداروں کی جیب سے ادا ہوگا لیکن اگر نہ آجر کا منافع غیر معمولی طور پر اعلیٰ ہو نہ اضافہ قیمت ممکن تو آجر موجودہ کام جس طرح پر ہوسکے ختم کرا کر غالباً آئندہ جلد سے جلد کارخانہ بند کرکے کوئی اور کاروبار جاری کردیگا۔ چونکہ بیش مقدار اصل مستقر۔ کلوں اور عمارت میں پھنسا ہوا ہے ممکن ہے کہ موجودہ کاروبار بند کرنے میں اس کو کچھ وقت لگے۔ لیکن اگر حالات ایسے ہی نامساعد رہے تو جلد سے جلد بند ضرور کردیگا۔ اور اگر موجودہ کلوں میں تھوڑی تھوڑی تبدیلی کرنے سے دوسرا کام لیا جانا ممکن ہوا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو موجودہ کام ترک کرنے میں اس کو اور بھی کم دیر لگے گی۔ علاوہ ازیں اور لوگ جو یہی کام جاری کرنے کا قصد کررہے تھے حالات دیکھکر اپنی رائے بدل دیں گے۔ اور کوئی دوسرا کام شروع کریں گے۔ اس طرح پر بتدریج کاروبار زیر بحث گھٹتا چلا جائے گا اور اس چندروزہ اضافہ اجرت کا نتیجہ مزدوروں کی تباہی ہوگا۔ اگر کاروبار کی تباہی سے قبل مزدور رنگ بدلتا دیکھکر

حصہ سوم
باب سوم

اضافہ کا مطالبہ ترک ہی کردیں تاکہ آجروں کے دل میں جو اندیشہ اور وحشت پیدا ہوچکی ہوگی وہ بدقت اور بدیر رفع ہوسکے گی اور مزدوروں کو کاروبار کے زوال سے کم و بیش نقصان ضرور اٹھانا پڑے گا۔

بحث بالا سے یہ نتیجہ نکلتا معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کی طرف سے اضافہ اجرت کا مطالبہ اکثر بیجا اور ناکامیاب ہوتا ہے اور اس سے خود ان کو بمقابلہ نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ زیادہ قوی ہے یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ بحث بالا میں صرف کسی ایک خاص شعبہ صنعت و حرفت میں اضافہ اجرت فرض کیا گیا ہے اور ایسی حالت میں اضافہ اجرت کے بیشک یہی نتائج ہوں گے جو بیان کیے گئے لیکن جیسا کہ رواج بڑھ رہا ہے اگر ہر پیشہ و حرفہ والے اضافہ کا مطالبہ شروع کردیں تو قوانین اجرت کے تحت میں مذکورہ الصدر پیداوار مختتم کی بحث اور آئندہ منافع خالص کی تشریح سے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ ابھی تک منافع خالص ہی میں سے کم و بیش اجرت کا اضافہ ممکن بھی ہے اور قرین انصاف و مصلحت بھی۔ نیز واضح ہو کہ معمول شرح اور مقدار شرح دو جداگانہ چیزیں ہیں معمول سے مراد شرح کی مساوات ہے اور مقدار سے مراد شرح کی بلندی و پستی۔ پس جب کہ ہر صنعت و حرفت میں اضافہ اجرت کا یکساں مطالبہ ہوگا تو بحالت مقابلہ شرح منافع اب بھی معمولی رہے گی۔ صرف مقدار میں ہموار تخفیف ہو جاوے گی اور منافع میں ایک حد تک ابھی ایسی تخفیف کی گنجائش ضرور موجود ہے بالفاظ مختصر اگر مزدور آجر کے منافع میں سے کچھ حصہ مانگیں تو بحالت موجودہ بیجا نہیں اور اگر مطالبہ میں سب متفق ہوسکیں تو کامیابی زیادہ دشوار نہیں۔ چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ جب سے بشکل اسٹرائیک مطالبہ اضافہ کا رواج پھیلا ہے شرح اجرت تدریج بڑھ رہی ہے۔ اسٹرائیک کا مسئلہ فی نفسہ اس قدر توجہ طلب ہے کہ ہم اس سے ذیل میں جداگانہ بحث کرتے ہیں

حصہ سوم
باب سوم
اسٹرائیک

(۶) جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اسٹرائیک سے مراد مزدوروں کی کسی جماعت کا آجر
پر دباؤ ڈالنے اور اپنے مطالبات پورے کرانے کی غرض سے بالاتفاق کام ترک
کرنا ہے۔ جب سے اتحادی انجمنوں نے مزدوروں میں اتفاق وسیع اور مستحکم کر دیا ہے سٹرائیک
میں بھی اثر بڑھ گیا جب کسی کارخانہ کے مزدور کام چھوڑ بیٹھیں تو اُن کے جانشین ملنے
بہت دشوار ہوتے ہیں حتیٰ کہ جو مزدور اتحادی انجمن کے ممبر بھی نہ ہوں وہ بھی اپنے
ہم پیشوں کے اخلاقی دباؤ اور ناراضی کے خوف سے ایسے کارخانہ میں کام کرنے کی
جرأت کم کرتے ہیں۔ اور اگر ایسے موقع پر فائدہ اُٹھاتے ہیں تو بعد کو جلد ہی باقی
ہم پیشہ اُن کی حالت طرح طرح سے ناقابل برداشت حد تک ناخوشگوار بنا کر آئندہ
کے واسطے عبرت دلا دیتے ہیں۔ مزدور موقع دیکھ کر اکثر ایسے وقت پر اسٹرائیک کرتے
ہیں کہ آجر کا بہت زیادہ نقصان ہو۔ تاکہ دباؤ خوب پڑے اور آجر کو مزدوروں کے
مطالبات پورے کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ ہو لیکن واضح ہو کہ کاروباری دنیا
میں اسٹرائیک کی حالت بعینہ اس پتھر کی سی ہے جو تالاب میں کہیں گر کر پانی کی کل سطح
پر قطار در قطار لہریں پھیلا دے۔ یوں تو تمام پیشے کم و بیش ایک دوسرے سے متعلق
ہیں لیکن بعض کا بالخصوص دوسروں سے نہایت قریبی تعلق پایا جاتا ہے مثلاً کوئلہ
یا مٹی کا تیل نکالنے والے۔ یا ریلوے اور جہازوں پر کام کرنے والے اگر اسٹرائیک
کر دیں تو ناممکن ہے کہ کوئی کاروبار اور کوئی پیشہ کم و بیش اس سے متاثر نہ ہو۔ ایسے
اسٹرائیک سے علاوہ آجر کے عوام کو بھی کسی نہ کسی پہلو سے نقصان اور تکلیف پہنچتی
ہے۔ لیکن بعض نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خود مزدوروں کو اسٹرائیک
سے جس قدر مالی نقصان پہنچتا ہے بحالت اضافہ اجرت بھی اس کی تلافی ہونی
دشوار ہے اور مزید نفع کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اس واقعہ کی یوں تشریح کی جاتی ہے

حصہ سوم باب سوم

گو ایسا کمتر ممکن ہی لیکن فرض کرو کہ مزدور برابر کام سے لگا رہتا ہی اور اس کے کام کا اوسط ۵۰ ہفتہ فی سال ہی گویا ایک ہفتہ سال کے ۱/۵۰ یا ۲ فیصدی کے برابر ہی اور علیٰ ہذا ایک ہفتہ کی اجرت بھی کل سالانہ مقدار اجرت کی ۲ فیصدی ہی اب اگر ۴ فیصدی اضافہ اجرت کا اسٹرائک دو ہفتہ جاری رہی تو صاف ظاہر ہی کہ دوران اسٹرائک میں مزدوروں کا بقدر ۴ فیصدی سالانہ اجرت نقصان ہو چکے گا اور ۴ فیصدی زیادہ جدید شرح اجرت سے بھی کہیں سال بھر میں اس نقصان کی تلافی ہو سکے گی اسی طرح پر اگر ۸ فیصدی اضافہ اجرت کا اسٹرائک ایک ماہ جاری ہی تو ایک سال تک مزدوروں کو اضافہ سے کوئی نفع حاصل نہو سکے گا اور اغلب یہ ہی کہ مزدوروں کی کثرت اور مقابلہ کی بدولت شرح اجرت جلد گر کر سابق سطح پر آرہی گی اور اضافہ بطور دفع الوقتی چندروزہ ثابت ہوگا گویا اسٹرائک حسب لخواہ کامیاب بھی ہو جائے تب بھی مزدوروں کو بمقابلہ نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ قوی ہی اور اگر اسٹرائک کی کثیر الوقوع ناکامیاں اور کاروبار کے دوسرے شعبوں کا نقصان بھی پیش نظر رکھا جائے تو بحیثیت مجموعی مزدوروں اور عوام کو اسٹرائک سے سوائے مالی نقصان کے کچھہ نفع حاصل نہیں ہوتا۔ واضح ہو کہ اس بحث میں بھی یہ فرض کیا گیا ہی کہ مزدوروں کی ایک مختصر سی جماعت کسی خاص شعبہ میں اسٹرائک کرتی ہی ایسی حالت میں تو بیشک اضافہ محض چندروزہ ہوگا۔ لیکن جب کہ ہر شعبہ کے مزدور اضافہ کا مطالبہ کریں تو شرح اجرت کا سابق سطح تک دوبارہ اترنا دشوار ہوگا اور اضافہ اجرت ضرور دیرپا بلکہ مستقل ہوگا۔ اور چونکہ عام بیداری اور اتحادی انجمنوں کی بدولت مزدوروں کے تقریباً کل طبقوں میں مطالبہ اضافہ کا خیال پیدا ہو رہا ہی نتیجہ آخرالذکر زیادہ قریب حقیقت ہی۔

گو اکثر حالتوں میں آجروں کے موجودہ منافع میں تخفیف کرکے اور بعض صورتوں میں قیمت مصنوعات زیادہ کرکے اجرت بڑھانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی بھی ایک حد ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ مزدور سٹرائیک کرکے حسب دلخواہ اضافہ کراتے رہیں اگر مطالبات حد مناسب سے تجاوز کریں تو نتیجہ یقیناً کاروبار کی تباہی اور آجر و مزدوروں کی بربادی ہوگا اگر مزدوروں سے کبھی ایسی غلطی سرزد ہوگی تو تجربہ جلد اس کی اصلاح اور آئندہ کے واسطے تنبیہہ کردیگا۔ رہا نقصان و تکلیف جو عوام کو اسٹرائک سے پہنچتی ہے اس کے بیجا ہونے میں کلام نہیں لیکن آجر و مزدوروں میں سے جو فریق برسر حق ہے وہ بری الذمہ ہے اور اس کا الزام فریق ثانی کے سر رہنا چاہیئے جو گویا اسٹرائیک کا اصلی باعث ہے۔ گو بعض کا خیال اسکے برعکس ہے لیکن انسانی فطرت قدیم تجربہ اور سیر موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے غیر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ اسٹرائیک کے دباؤ بغیر بھی آجر بخوشی اجرت میں اتنا اضافہ گوارا کرتے جتنا کہ مزدوروں نے لڑجھگڑ کے کرالیا ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ شرح اجرت معاشی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن مزدوروں کی کثرت۔ تہیدستی۔ کم علمی۔ قدیم رسم و رواج۔ آجر کا اقتدار جیسے مخالف حالات اُن کے آزادانہ عملدرآمد سے مانع ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اور پس ماندہ ممالک میں اب تک بھی رورعایت اور مروت کا رواج پایا جاتا ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جائز سے جائز حقوق کے حصول کے واسطے پرزور مطالبہ شرط ہے حتیٰ کہ اکثر مطالبہ کی قوت اور کمزوری کے مطابق حق کا جواز و عدم جواز قرار پاتا ہے۔ پھر بھی اکثر اسٹرائیک عوام کے حق میں بیحد نقصان اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور جب تک حصول مطالبات کی دوسری کل تدابیر بیکار ثابت نہو چکیں تب تک اس خوفناک آلہ کا استعمال نکرنا چاہیئے۔ مزدوروں کے اعتدال اور آجروں کی فراخدلی

حصہ سوم
باب سوم

سے اسٹرائک کے بہت کچھ رُک سکتے ہیں۔ اگر اجرت میں اضافہ کرانا منظور ہو تو بجائے اسٹرائک کے یہ معاملہ مزدوروں کے نمایندوں اور آجر کے روبرو پیش ہو کر باہمی پنچایت کے تصفیہ سے طے ہونا ہزار درجہ بہتر ہوگا۔ اور اب یہی طریق رواج پا رہا ہے

شرکت منافع

(۷) بطریق موجودہ آجر اور مزدوروں کے مفاد میں مخالفت نظر آتی ہے منافع اور اجرت میں سے کسی ایک کی بیشی دوسرے کی کمی کا باعث معلوم ہوتی ہے لیکن آپس کے سب شبہات اور جھگڑے مٹ جاویں۔ اگر جس طرح اجرت کی شرح معین ہے۔ آجر بھی اپنے منافع کی مناسب شرح مقرر کرلیں اور اجرت و منافع منہا کرنے کے بعد اگر کچھ باقی بچے تو آجر و مزدور اس کو آپس میں بانٹ لیں۔ پھر مزدور کو آجر سے کوئی شکایت بھی نہ رہے۔ کاروبار کی کامیابی کے واسطے مزدور دل لگا کر کوشش کریں اور آجر و مزدور کو برابر نفع پہنچے چنانچہ بعض معاملہ فہم اور روشن خیال کارخانے شرکت منافع کا طریق جاری کرکے نمایاں کامیابی اور سرسبزی حاصل کر رہے ہیں اور امید ہے کہ شرکت منافع کے رواج سے اسٹرائک کا وبال دفع ہو جائے گا اور کاروبار زیادہ ترقی کریگا اور مزدور بھی زیادہ خوشحال ہو جائیں گے۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شرکت نقصان بھی شرکت منافع کا لازمی جزو ہونا چاہیئے اور اگر منافع کی شرح معین میں کمی پڑے تو وہ کمی نہ صرف آجر بلکہ مزدوروں کو بھی حصہ رسد برداشت کرنی چاہیئے ورنہ مزدوروں کی وہی مثل ہو گی کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔ لیکن مزدوروں کو تو اجرت منافع حاصل ہونے سے قبل ہی مل چکتی ہے۔ پھر شرکت نقصان کیونکر ممکن ہے۔ واضح ہو کہ اول تو منافع میں سال بسال بڑے تغیرات خلاف واقعہ ہیں دوسرے صاف ظاہر ہے کہ اگر منافع میں مستقل کمی پیدا ہو جائے تو اجرت پر بھی ضرور ناموافق

حصہ سوم

باب سوم

شراکت

اثر پڑے گا اور نقصان کا بار مزدور کو بھی خواہ مخواہ برداشت کرنا ہوگا

(۸) اگر ایسا ممکن ہوتا کہ خود مزدور کل اصل کے بھی مالک ہوتے اور خود مہتمم یعنی اپنے آجر آپ ہوتے تو منافع اور اجرت میں کوئی تفریق نہ ہوتی۔ مزدور بلا شرکت غیرے اپنی محنت کا کل پھل پاتے۔ لیکن اول تو غریب مزدوروں کے پاس اس قدر اصل کہاں کہ خود کارخانے قائم کریں۔ دوسرے تجربے سے ثابت ہوا کہ اُن کو اپنے طبقہ سے موجودہ آجر جیسے قابل نگراں اور مہتمم ملنے دشوار ہیں۔ ان ہی دونوں دقتوں کی وجہ سے اس طریق شراکت نے ابتک بہت کم رواج پایا ہے اور جہاں تجربہ کیا گیا حسب دلخواہ کامیابی نہ ہوسکی۔ پھر بھی گزشتہ بیس سال میں فرانس، امریکہ اور انگلستان کے مزدور چھوٹے چھوٹے پیمانہ پر شراکت سے کام کرکے اچھا خاصا نفع اُٹھا رہے ہیں لیکن اگر کاروبار ہمیشہ شراکت کے اصول پر چلایا جائے تو ہمیں توسیع کی گنجائش کم اور اگر ترقی کی طرف قدم بڑھایا جائے تو شراکت کے راستہ پر چلنا دشوار ہوگا چنانچہ واقعہ ہے کہ حقیقی شراکتی کاروبار تو بالعموم چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر جاری ہیں۔ اور جو نام نہاد شراکتی کارخانے نمایاں ترقی پا رہے ہیں اُن میں معدودے چند مزدور اصل قرض لیکر آجر بنجاتے ہیں اور باقی سب مزدور محض اجرت پر کام کرتے ہیں۔ اور مزدوروں سے ایسی روشن خیالی اور فراخدلی کی امید کرنا کہاں تک بجا ہے کہ جب سخت محنت اور کوشش کرکے اپنے کاروبار کو وہ شاہراہ ترقی پر کھینچ لائیں تو شرکت کے اصول پر نئے بیشمار مزدوروں کو اس میں شریک کرلیں۔ گویا خود بیج بوئیں اور تیار فصل میں سے اُن کو برابر کا حصہ بانٹ دیں۔

حصہ سوم
باب چہارم

باب چہارم

سود

تجزیہ (۱) مبحث سود کی قدامت و وقت (۲) سود کی سرگزشت (۳) اصل کا مفہوم (۴) شغل اصل (۵) مسائل سود (۶) انتظارکشی (۷) پیدا آوری (۸) شرح سود (۹) اقسام سود (۱۰) زر و سود کا تعلق (۱۱) سود کا حاضر و مستقبل۔

مبحث سود کی قدامت و وقت۔

(۱) علم المعیشت میں کوئی دوسرا مبحث اسقدر قدیم، دقیق، پیچیدہ اور معرکت الآرا نہیں جتنا کہ سود۔ اکثر معاشی مسائل نے تو گزشتہ دو تین صدی میں جنم لیا۔ لیکن سود کے تحت مباحثہ کا اُس قدیم ترین زمانہ تک پتہ چلتا ہے جس کا جدید تحقیقات سے ہم کو کافی تاریخی حال معلوم ہو سکا ہے۔ مصر، یونان، روم اور ہندوستان جیسے قدیم تہذیب والے ممالک میں عہد عیسوی سے بھی مدتوں پہلے سود کے متعلق قواعد و قوانین جاری تھے۔ وید، توریت، انجیل اور قرآن جیسی مشہور مذہبی کتابوں میں سود کے متعلق تاکیدی احکام موجود ہیں۔ افلاطون و ارسطو جیسے قدیم حکما کی تصانیف میں بھی تحقیق سود کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ سود کا تاریخی حال ہم ابھی بیان کرینگے جس سے واضح ہوگا کہ معاونت اقتضائے وقت مقبولیت سود نے اس کی مخالفت پر یورپ میں کیونکر غلبہ پایا۔ مذہبی رد و قدح سے آزاد ہو کر مسئلہ سود جب سے علمی تحقیقات کے تحت میں آیا، علماء معیشت کی سب سے بڑی اور قابل ترین جماعت اسپر دماغ سوزی کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ بعض تو اس کے مطالعہ اور تحقیق کیواسطے اپنی بیش بہا زندگی وقف کر چکے ہیں۔ لیکن منزل مقصود تک پہنچنا ابھی کسیکو بھی نصیب نہیں ہوا۔ سود کی

باب چہارم
حصہ سوم

معاشرتی مضرت اور معاشی ضرورت پر تو بہت کچھ بجا اور درست لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اسکی ماہیت ابھی تک قابل اطمینان اور تشفی بخش طور پر کوئی بھی واضح نہیں کر سکا۔ سود کیا ہے۔ کس طرح پیدا ہو کر کس اصول کے مطابق تقسیم پاتا ہے۔ یہ سوالات سود کی علمی بحث میں جسقدر اہم ہیں اتنے ہی دشوار بھی ہیں۔ یوں تو جزواً جزواً بہت کچھ صحیح معلومات بہم ہو چکی ہے۔ لیکن اب تک کوئی دماغ ایسا حاوی نہیں ہوا کہ منتشر اور متفرق اجزا کو اس طرح پر ترکیب دے سکتا کہ ان سے ایک باقاعدہ اور مکمل مسئلہ مرتب ہو جاتا۔ منجملہ بہت سی متفرق تحقیقات کے اکثر تو صحیح مگر ادھوری ہے اور بعض کم و بیش غلط و غیر متعلق اس کی جداگانہ تفصیل سے حیرانی افزا طوالت کا اندیشہ ہے۔ علاوہ ازیں اس جیسی کتاب میں ایسی تفصیل بیجا معلوم ہوتی ہے۔ لہذا ہم سود کے کل مروجہ مسائل زیادہ رد و قدح بغیر مختصراً بیان کرنے اور صرف بدیہی خامیاں جتانے پر اکتفا کرینگے۔ مفصل اور دقیق بحث مباحثہ کیواسطے ایک جداگانہ کتاب زیادہ موزوں ہوگی۔

اکثر نا واقف اردو خوان ناظرین کے سامنے سود جیسا دشوار مبحث پیش کرنے میں جن دقتوں کا سامنا لابد ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔ کتاب کے اسی حصہ میں ہم کو خاص طور سے مطالعہ اور غور و خوض کی ضرورت درپیش آئی۔ مستند انگریزی کتابوں سے مقابلہ کرنے پر اندازہ ہو سکے گا کہ اس بحث کو سلجھانے میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔

سود کی سرگزشت

(۲) سود نے جس آہستگی اور ثابت قدمی سے مقبولیت حاصل کی وہ اس امر کی بدیہی مثال ہے کہ اقتضائے وقت کے مقابل سخت سے سخت مخالفت کو بالآخر پس پا ہونا ہی پڑتا ہے۔ یورپ میں سود مدتوں مذہباً حرام اور قانوناً ممنوع رہا۔ اور ایسا ہونا کچھ عجب و بیجا بھی نہ تھا۔ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں صرف ایک خاص قسم کا لین دین مروج تھا۔ دولتمندوں کا ایک مختصر گروہ تھا جن کے پاس زر نقد کے بڑے بڑے ذخیرے بیکار پڑے تھے۔ معاشی پسماندگی کی وجہ سے اس زمانہ میں ایسے فاضل

باب چہارم
حصہ سوم

اندوختوں سے بطور اصل عمل پیدائش میں مدد لینے کا بہت کم موقع حاصل تھا ایسے زر نقد کا اگر کوئی مصرف تھا تو بس یہ کہ غریب آفت زدہ اور حاجتمندوں۔ یا ناعاقبت اندیش عشرت پرستوں کو سود پر قرض دیا جانا۔ بہرصورت ایسے قرضوں سے بطور دولت احتیاجات رفع کیجاتی تھیں عمل پیدائش دولت میں بطور اصل ان سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ گویا قرض دہندے اور قرض گیر دونوں کے ہاتوں میں زر قرض محض دولت تھا جو احتیاجات رفع کرنیکے کام آتا تھا۔ وہ کسی جانب بھی اصل شمار نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ اس میں ہردو جانب صفت پیدا آوری مفقود تھی۔ چنانچہ ارسطو کا مقولہ کہ زر نقد بچے نہیں دیتا۔ اسی غیر پیدا آوری پر زور دیتا ہی۔ ایسے قرض پر جو سود دیا جاتا تھا وہ دراصل غریب قرضداروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوتی تھی۔ زر قرض سے نہ اصل کا کام لیا جاتا تھا نہ رقم سود اس کی پیداوار ہوتی تھی۔ ایسے غیر پیدا آور قرضوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دولتمندوں سے جن کے پاس فاضل دولت کا کوئی اور مصرف نہ تھا۔ بیشمار غریب لوگ بحالت مجبوری و ناچاری تھوڑا سا قرض لیکر جس کو وہ جلد احتیاج زندگی میں صرف کر دیتے ہیں۔ ہمیشہ کیواسطے ان کے پنجے میں گرفتار ہوجاتے تھے۔ قرض ادا کرنے کا تو ذکر کیا ہی۔ سود ہی ادا کرتے کرتے عمر گزر جاتی تھی۔ دولتمند۔ غریبوں کی چھوٹی چھوٹی کمائیوں کے شریک غالب بنکر جونک کی مانند ان کا خون چوستے رہتے تھے حتیٰ کہ بعض ممالک میں تو جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے وہ از روے قانون قرض دہندوں کے غلام قرار دیدیئے جاتے تھے۔ بنی نوع انسان کی تباہی کا سود سے زیادہ خوفناک آلہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر وہ قطعاً حرام و ممنوع تھا تو عجب کیا ہی۔ البتہ ایسا نہونا بہت زیادہ عجیب ہوتا۔ لیکن تاریخ شاہد ہی کہ باوجود ہزاروں بندشوں کے سود کا رواج برابر جاری رہا۔ البتہ مذہبی عقوبت اور قانونی سزا سے بچنے کے لیے اُس کی شکل سو سو طرح سے بدلتی رہی۔

حاجتمندوں کو قرض لیے بغیر تو چارہ نہ تھا۔ اور بلا سود قرض دینے والے فیاض نایاب تھی۔ اور سود لینا حرام تھا۔ بالآخر مجبوراً یہودیوں کو ممانعت سود سے قانوناً مستثنےٰ کردیا گیا تاکہ قرض بھی میسر آسکے اور عیسائی سود خوری کے گناہ سے بچے رہیں۔ لیکن اپنے مقابل یہودیوں کو سود لیتے دیکھکر بھلا عیسائی کیوں رُکنے والے تھے اُنھوں نے بھی قرضداروں سے بشکل تحفہ تحائف سود وصول کرنا شروع کردیا۔ از روئے قانون بحالت رہن بالقبضہ۔ شے مرہونہ کی آمدنی ادائگی قرض میں شمار ہونی چاہیئے تھی لیکن قانوناً مالک کسی چیز کا حق استعمال یا پیداوار دوسرے کو منتقل کرسکتا تھا۔ پس قرضدار بھی شے مرہونہ کی آمدنی قرض دہندہ کو ہبہ کرکے بلا قانونی روک ٹوک سود ادا کردیتے تھے۔ نونقد نہ تیرہ اُدھار کی ضرب المثل فطرت انسانی کے ایک نہایت نتیجہ خیز خاصہ کا پتہ دیتی ہے۔ جس کا معاشی اثر سود کی بحث میں خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ چنانچہ اُس زمانہ میں بھی جب کہ سود ممنوع تھا بمقابلہ نقد کے اُدھار قیمت زیادہ طلب کرنی جائز مانی جاتی تھی۔ اس اصول کو بھی توڑ مروڑ کر حصول سود کا ایک طریق ایجاد کرلیا گیا۔ کوئی چیز فرضی طور پر قرض گیر کے ہاتھ اُدھار فروخت کی جاتی تھی اور قرض دہندہ پھر اس کو کمتر نقد قیمت پر خرید لیتا تھا۔ اس طرح پر جو قرض بشکل قیمت نقد دیا جاتا تھا وہ مع سود بشکل قیمت اُدھار وصول ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں مذہبی عقوبت اور قانونی گرفت سے بچکر سود لینے کی اور بھی چند عجیب و غریب طویل و پیچیدہ طریق ایجاد کرلیے گئے تھے۔ مگر سود خوری نہ رُکنی تھی نہ رُکی۔

قرض کی دو قسمیں قرار دیگئی تھیں ایک تو ایسی چیزوں کا قرض کہ جو دوران استعمال میں ضائع نہوں اور کچھ عرصہ بعد فی نفسہ واپس کیجاویں گویا دیرپا چیزیں جو مدت تک کام آتی رہیں جو ایک شخص کی ملک قائم رہ کر دوسرے کے استعمال میں آسکیں۔ اور جنکا استعمال

ان کی ذات سے جُداگانہ شمار ہو کر فروخت کیا جا سکے مثلاً مکان گھوڑا یا گاڑی ایسے چیزوں کا کرایہ جس میں مطالبات فرسودگی اور معاوضہ استعمال شامل ہیں دینا جائز تھا۔ دوسرے ایسی چیزوں کا قرض کہ جو دوران استعمال میں خود تو ضائع ہو جاویں اور انکی ہمجنس چیزیں واپس کیجاویں بالفاظ دیگر جو خود ضائع ہوئے بغیر کام نہ دیسکیں اور جو استعمال ہونے میں ضائع ہو کر احاطہ ملک سے خارج ہو جاویں۔ جن کا استعمال ان کی ذات سے لاینفک ہونے کی وجہ سے جداگانہ فروخت نہ ہو سکے۔ مثلاً پھل پھول یا شیرینی زر نقد بھی قسم دوم میں شمار ہونے کے قابل مانا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اسوقت تک وہ بطور دولت صرف رفع احتیاجات میں کام آتا تھا۔ گویا اس کے استعمال سے مراد اس کو بہم رسانی ضروریات میں خرچ کر ڈالنا تھا۔ اصل کے طور پر بشکل آلات و پیداوار خام اس سے پیدایش دولت میں کوئی ایسا کام نہیں لیا جاتا تھا کہ باوجود استعمال وہ باقی و قائم رہتا اور اس کی ذات سے اس کا استعمال جُداگانہ شمار ہو سکتا آخر الذکر قسم کی چیزوں کے قرض میں صرف ان کے مساوی ہمجنس چیزیں لیجا سکتی تھیں اسی وجہ سے زر نقد کے قرض کا سود بھی جائز نہ تھا قرض کی مذکورۂ بالا تقسیم سے بھی صاف طور پر ثابت ہوتا ہی کہ اس وقت تک لوگ اپنی احتیاجات رفع کرنے کی غرض سے قرض لیا کرتے تھے۔ زر مستعار سے کاروبار چلا کر پیدایش دولت میں مدد لینے کا طریق ابتک غیر مروج تھا۔ جبکہ قرض کا روپیہ صریحاً غیر پیدا آور تھا۔ اور اکثر غریب و حاجتمند لوگوں کے ہاتھ میں جاتا تھا تو دولتمندوں کا ان سے سود طلب کرنا کیوں نہ ظلم و جبر نظر آتا۔ اور کیوں ایسی آمدنی ناجائز قرار نہ دی جاتی۔

لیکن اس واقعہ کو نظر انداز کرنا بھی دشوار تھا کہ بعض قرض مارے جاتے تھے اور قرض دہندہ کو کچھ وصول نہ ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ نفع کی کوئی صورت نہ ہو اور نقصان کا اندیشہ موجود ہو۔ بھلا کون قرض دینے پر رضامند ہو سکتا تھا۔ لہذا

زرِ رہن پر تو سود ناجائز رہا۔ لیکن جو قرض محض ذاتی اعتبار پر دیا جاتا تھا اور جسکی وصولیابی میں کچھ بھی دقت نظر آتی تھی اس پر بطور مطالبات خطر کچھ سود لیا جاسکتا تھا۔

اس وقت تک سود بہر صورت غیر واجب اور سخت مضر خیال کیا جاتا تھا۔ بعض خاص حالتوں میں جو درپردہ سود خوری کی اجازت بھی تھی تو گویا وہ فطرت انسانی کی ناقابل اصلاح کمزوریوں کی ناپسندیدہ رعایت تھی۔ سود فی نفسہ کبھی بجا نہیں سمجھا گیا۔ یہاں سود کا دور اول ختم ہوتا ہے۔

یورپ میں قرون وسطی کے ساتھ ساتھ سود کے دور ثانی کی ابتدا ہوئی مذہبی ردّ و قدح کے حلقہ سے نکل کر مسئلہ سود علمی تحقیقات کے میدان میں داخل ہوا۔ اور معاشی انقلابات کی بدولت رفتہ رفتہ سود علانیہ بجا اور درست مانا جانے لگا۔ اس سے قبل تو قرض بالعموم رفع احتیاجات کے واسطے محض بطور دولت استعمال ہوتا تھا۔ لیکن جب عام بیداری اور ایجادات کی بدولت صنعت وحرفت نے فروغ پایا اور تجارت کا عروج شروع ہوا۔ تو حوصلہ مند کارگذاروں نے بیکار اندوختے قرض لے لیکر کاروبار جاری کردئے اور ماحصل زائد میں سے کچھ قرض دہندوں کو بمد سود ادا کیا اور باقی بطور منافع خود سنگوایا جب زر مستعار سے بطور اصل کام لیا جانا شروع ہوا تو اس کی پیدا آوری سب پر بخوبی روشن ہوگئی کہ سود ادا کرنے پر بھی قرضدار کو منافع بچنے لگا۔ لہذا کسی کاروبار میں صرف زرِ نقد سے شریک ہوکر منافع میں حصہ بانٹنا جائز قرار پایا اور موجودہ انجمن شراکت کی بنا پڑی واضح ہو کہ اول اول ایسے حصہ دار لازماً نفع نقصان۔ دونوں میں یکساں شریک تھے۔

لیکن ایک عجیب ترکیب سے حدود مذہب وقانون کے اندر ہی اندر رہ کر شرکت نقصان سے انھوں نے بریت حاصل کرلی۔ وہ اس طرح پر کہ زرِ نقد قرض دیکر کاروبار کے نفع نقصان میں شریک بنجانا تو علانیہ جائز تھا۔ اب طریق ضمانت کے مطابق جس کا رواج آجکل بکثرت پھیلا ہوا ہے۔ اول تو انھوں نے تخمیناً کمتر منافع قبول کرنے کے معاوضہ میں اپنے زرِ نقد کی

جو مستعار دیا تھا ضمانت کرالی گویا اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ جاتا رہا۔ دوسرے اسی طریق سے ایک تیسرے مستقل منافع کی بھی ضمانت کرالی۔ گویا آپس میں تین جداگانہ معاہدوں کی مدد سے قرض پر شرح سود بھی مقرر کر لی جاتی تھی اور قرض دہندہ کو شرکت نقصان سے بھی نجات حاصل ہو جاتی تھی اس ترکیب کو معاہدۂ ثلاثہ سے تعبیر کرنا ناموزوں نہ ہوگا۔

جبکہ بیکار اندوختوں میں خاصیت پیدا آوری نمایاں ہوگئی اور کاروبار میں صرف زر نقد سے شریک ہو کر نفع اٹھانے کی صورت نکل آئی تو ایک حالت میں قدیم طرز کے غیر پیدا آور قرضوں پر بھی سود جائز قرار پا گیا۔ فی نفسہ ایسے قرضوں پر سود لینا تو اب تک حرام و ممنوع تھا لیکن اگر قرضدار وقت معینہ پر قرض ادا نہ کرے تو دوران تاخیر میں قرض بروقت ادا نہ ہونے سے قرض دہندہ کو جو نقصان پہنچے یا جس منافع سے محروم ہونا پڑے وہ قرضدار کو بطور ہرجانہ ادا کرنا لازم تھا۔ کہنے کو تو یہ ہرجانہ بدل منافع یا تلافی نقصان تھا لیکن اس نے بآسانی سود کا ڈھنگ اختیار کر لیا۔ ترکیب یہ تھی کہ قرض برائے نام نہایت مختصر زمانے مثلاً ایک دو ہفتہ یا مہینے کیواسطے دیا جاتا تھا۔ لیکن اصلی منشا چند سال ہوتے تھے اور عدم ادائگی قرض کے بہانہ سے اصول بدل منافع یا تلافی نقصان کے مطابق بلا روک ٹوک ہر قسم کے قرضوں پر سود لیا جانا شروع ہوا۔ کچھ روز تو یہ قاعدہ رہا کہ چونکہ منافع یا نقصان کا پہلے سے صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا بحالت تاخیر صرف ادائگی قرض کے وقت ہرجانا قرار پا سکتا تھا۔ لیکن چند ہی روز میں ایسے ہرجانہ کا پہلے ہی سے تعین کر لینا بھی جائز قرار پا گیا اور اب سود کے راستہ میں کوئی قابل لحاظ رکاوٹ باقی نہیں رہی۔ ہنڈی پر جو بٹہ کاٹا جاتا تھا اور جو سود قرضوں پر بنک لیتے تھے محنت کاروبار کا معاوضہ یا بدل منافع و تلافی نقصان شمار ہو کر جائز قرار پا گیا۔ جو لوگ بنک میں روپیہ داخل کرتے تھے ان کو بھی اصول ہرجانہ کی مطابق زر داخل شدہ پر کچھ سود دیا جانے لگا

المختصر سولھویں صدی کے آخر تک سود نے اچھی طرح پر قدم جمائے اور عدم جواز سود کے

مذہبی وقانونی احکام بالکل بیجان ہو کر محض معاشی پس ماندگی کے یادگار رہ گئے۔

عدم جواز کی قید سے تو کسی نہ کسی طرح سود تقریباً بالکل رہا ہو گیا۔ لیکن شرح سود کا تعین قانون نے پھر بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا ضروری سمجھا۔ تعین شرح کی دو غرض تھیں، اول یہ کہ عدالتوں کو سود کے مقدمات فیصل کرنے میں سہولت ہو۔ دوسرے یہ کہ غریب یا ناعاقبت اندیش لوگ بیحد اعلیٰ شرح سود دینے پر مجبور ہو کر تباہ و برباد نہ ہو جاویں۔ اسوقت تک معاشی اسباب کا اثر اس قدر وسیع اور قوی نہیں تھا کہ بلا مداخلت قانون کوئی مناسب شرح قرار پا سکتی۔ اور زیادتی شرح کا اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اول اول قانونی شرح بھی ۱۰ فیصدی سے کم قرار نہ پا سکی۔ چنانچہ اسی وجہ سے قانونی شرح معین نے کچھ عرصہ تک قرضداروں کو قرض دہندوں کے دست برد سے بہت قابل قدر حد تک محفوظ رکھا۔ علاوہ ازیں سود در سود بھی ممنوع تھا اور از روئے قانون مقدار قرض سے زیادہ سود کا کسی حالت میں مطالبہ جائز نہ تھا۔ آخر الذکر قاعدہ اہل ہنود میں بھی دمدپٹ کے نام سے رائج تھا اس کے متعلق اس امر پر بہت اختلاف رائے پھیلا کہ آیا مقدار سود کے قرض سے تجاوز نہ کرنے کی شرط صرف اس سود سے متعلق ہے کہ جسکا کسی وقت مطالبہ کیا جاوے۔ یا سود کی سابق ادا شدہ رقمیں بھی اس مقدار میں شمار ہونی چاہئیں مثلاً دمدپٹ کی رو سے پانسو روپیہ قرض پر فی الجملہ پانسو روپیہ سے زیادہ رقم بطور سود نہیں لیجا سکتی۔ فرض کرو کہ تین سو روپیہ سود ادا ہو چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ادا شدہ سود ۳۰۰ روپیہ اصل کی مساوی رقم پانسو میں سے منہا کر کے آئندہ زیادہ سے زیادہ صرف باقی دو سو روپیہ بطور سود طلب کئے جا سکتے ہیں۔ یا سود کی ادا شدہ رقم منہا نہ کر کے زیادہ سے زیادہ اصل کی برابر ۵۰۰ روپیہ سود بعد کو کسی موقع پر یکمشت لیا جا سکتا ہے۔ المختصر یہ کہ دمدپٹ کی بنا پر اصل کی مساوی رقم بطور سود طلب کرنے کیوقت سود کی سابق ادا شدہ رقمیں شمار کیجاوینگی یا نہیں۔ تعجب ہے کہ جن ہندوستانی عدالتوں میں دمدپٹ کا قاعدہ

حصہ سوم
باب چہارم

مروج ہیں وہاں آخرالذکر مفہوم پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ یعنی سابق ادا شدہ سود کی رقمیں منہا نہیں کیجاتیں حالانکہ اول الذکر مفہوم صریحاً زیادہ قرین عقل و مصلحت ہی۔

مذہبی نقطہ نظر سے تو مروجہ سود کا جواز بھی ابتک قطعی طور پر فیصل شدہ نہیں مانا جاتا لیکن عملی تجربہ اور علمی تحقیقات سے وہ بہت بڑی حد تک بیجا اور درست ثابت ہو چکا ہی تاہم مضرت و منفعت رسانی کے اصول پر سود کی اسی زمانہ میں دو قسمیں قرار پاگئیں۔ اول جو سود خاص طور سے قدیم طرز کے غیر پیدا آور قرضوں پر بشرح اعلی وصول کیا جاوے۔ دوم جو جدید وضع کے پیدا آور قرضوں پر بشرح مناسب حاصل ہو۔ ان دو قسموں کے نام بھی جدا جدا قرار پاگئے اور ہم بھی ان کو حسب ترتیب ربا اور سود سے تعبیر کرینگے۔ اگرچہ دونوں اصطلاح مترادف بھی ہوں اور اختلاف زبان کے سوائے ان میں کوئی فرق نہو۔ تاہم بغرض امتیاز و سہولت حوالہ اول جتا کر ان کو مذکورۂ بالا جداگانہ معنوں میں استعمال کرنا مفید و ضروری معلوم ہوتا ہی۔

ربا اب بھی بیحد مذموم اور تباہ کن مانا جاتا ہے اور بذریعہ قانون اس کو روکنے کی کوشش میں پھر سے گرمی بڑھ رہی ہے۔ اسی واقعہ سے ہم آیندہ بعنوان سود کا حاضر و مستقبل مفصل بحث کریں گے۔ آگے چلکر شرح سود کی بحث میں واضح ہوگا کہ معاشی ترقیات کی بدولت شرح سود کیونکر خود بخود سطح اعتدال پر اُتر آئی اور کاروبار میں قانونی شرح غیرضروری و متروک ہوگئی۔ البتہ عدالتوں میں بغرض سہولت فیصلہ قانونی شرح ابتک جاری ہی۔

اصل کا
مفہوم

۳۔ پیدایش اصل کے تاریخی حال۔ افزونی اصل کے اسباب اور فرق دولت و اصل کی بحث میں اصل کا سیدھا سادھا مفہوم اوپر بیان کیا جاچکا ہی۔ اسی مفہوم کی ہم یہاں مزید تشریح کرنا چاہتے ہیں۔

اصل کے معنوں کا اختلاف اس کے استعمال کی تاریخ میں مضمر ہی۔ اول اول اصل

سے مراد وہ رقم تھی جو سود پر قرض دیجاتی تھی۔ چونکہ مذہب عیسوی کے مطابق بھی سود پر روپیہ چلانا حرام اور قانوناً ممنوع تھا۔ طرح طرح پر لین دین کی ظاہری شکل بدلنے کی کوشش کیگئی تاکہ مذہبی گرفت اور قانونی سزا سے اماں ملے۔ مثلاً براہ راست قرض دینے کے بجائے یہ طویل طریق ایجاد کیا گیا کہ کوئی چیز قرض خواہ کے ہاتھ ادھار فروخت کی اور بعدہٗ پہلے سے مقرر کی ہوئی کمتر قیمت پر اس سے واپس خرید لی گویا قرض بشکل قیمت نقد دیکر اصل مع سود بشکل قیمت ادھار وصول کر لیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں جو چیزیں عاریتاً دیجاتی تھیں انکی ٹوٹ پھوٹ اور فرسودگی کے بہانے سے کچھ مزید معاوضہ لیا جانا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اصل کے معنی میں بھی توسیع شروع ہوئی اور زرنقد کے علاوہ دیگر اشیا و سامان بھی اصل میں شمار ہونے لگا۔ اس وقت تک اصل کی خصوصیت امتیازی یہی مزید معاوضہ کی آور دتھی۔ گویا اصل سے مراد دولت کا وہ حصہ تھا جو مستعار دیا جاوے اور جس سے کچھ آمدنی غیر مکتسب بطور سود حاصل ہو۔

واضح ہو کہ اس دور اول میں صرف حاجتمند لوگ اپنی احتیاجات رفع کرنے کی غرض سے زرنقد یا سامان قرض لیتے تھے۔ کاروباری اغراض سے اصل قرض لینے کا رواج ابھی جاری نہیں ہوا تھا اور نہ کم قیمت اور سیدھے سادھے آلات سے بڑھ کر اصل کو صنعت وحرفت میں کچھ دخل تھا۔

صاف ظاہر ہے جیسا کہ ارسطو کا قول ہے کہ زرنقد انڈے بچے نہیں دیتا۔ علیٰ ہذا سرمایہ اشیا بھی رکھے رکھے خود بخود نہیں بڑھ سکتا۔ البتہ اصل سے اس طور پر کام لینا ممکن ہے کہ مزید دولت پیدا ہو سکے۔ اور اگر اصل سے مزید دولت پیدا کرنے کا کام نہ لیا جاتا تو کیونکر ممکن تھا کہ ہر ملک میں صدیوں اصل بھی بڑھتا اور سود بھی ادا ہوتا رہتا۔ اگر اصل مثل دولت محض احتیاجات رفع کرنے میں کام آتا تو افزونی کا تو ذکر کیا گنج قاروں بھی چند روز میں ختم

حصہ سوم
باب چہارم

ہو جاتا اور حاجتمند قرضداروں کو سود ادا کرنا محال تھا۔ چنانچہ اصل پیدایش دولت کا ایک عامل شمار کیا گیا ہے اور اس کی کارگذاری ہر طرف صنعت و حرفت میں اظہر من الشمس ہے۔ اصل کے پیدا آوری کے متعلق ہم اس سے قبل بھی کافی بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اسکے اعادہ سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اصل کے سابق مفہوم میں کیونکر تغیر ہوا اور کل کے زمانے میں اصل سے دولت کا وہ حصہ مراد لیا گیا کہ جو آیندہ مزید دولت پیدا کرنے کی غرض سے پس انداز کیا جاوے۔ گویا بجائے آورد آمدنی غیر مکتسب پیدایش دولت مزید اصل کی خصوصیت متمائز قرار پائی۔ اور پیدا آوری کا خیال اصل کے معنی میں جذب ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ فوری احتیاجات رفع کرنے کے بجائے تجارت اور کارخانے چلانے کی غرض سے لوگ زر نقد یا سامان قرض لینے لگے۔ اور بیش بہا انجنوں مشینوں اور پیدایش بر پیمانہ کبیر کے بدولت عمل پیدایش و دولت میں اصل نمایاں حصہ لینے لگا المختصر اصل کی دو خواص امتیازی تحقیق ہوئے۔ اول وہ آمدنی غیر مکتسب کا آلہ قرار پایا دوم پیدایش دولت کا ایک ناگزیر عامل تسلیم کیا گیا اور یہ دونوں خواص اپنی اپنی جگہ اہم اور قابل توجہ ہیں۔ چنانچہ پیدایش کی بحث میں اصل کی خاصیت دوم پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اور تقسیم دولت کے بیان میں خاصیت اول پر بیحد توجہ طلب کیجاتی ہے۔

مفہوم اصل کی بحث میں اور بھی بہت کچھ بال کی کھال نکالی گئی ہے۔ جس کی پیچیدہ تفصیل بخوف پراگندگی و حیرانی نظر انداز کرنا ہی قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے۔

شغل اصل

۴۔ پیدایش دولت کے میدان میں اس وقت اصل باقی ہر دو عامل (یعنی زمین و محنت) پر حکمران نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم ایک موقع پر پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ عہد قدیم میں پیدایش دولت کا دارمدار بیشتر زمین پر تھا۔ ازمنہ متوسط میں محنت کا دخل بڑھا اور عہد جدید میں اصل کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ معاشی زبان میں موجودہ زمانہ کو عہد اصل

کہتے ہیں۔ اصل کا عروج بھی تہذیب جدیدہ کا ایک لازمہ ہے۔ بعض نے تو اصل کو موجودہ تہذیب کا خون حیات قرار دیا ہے۔ اور کچھ مبالغہ بھی نہیں کیونکہ قلم اور علم دونوں اسی کے متوسل نظر آتے ہیں۔ اور آجکل ممالک کی پس ماندگی و ترقی کا باعث اسی اصل کی قلت و افراط میں مضمر ہے۔ مشینوں اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کے بیان سے اصل کی قوت پیدا آوری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ افزونی اصل کے اسباب بھی واضح کئے جا چکے ہیں۔ یہاں ہم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اس زمانہ میں اصل سے کام لینا۔ جس کو اصطلاحاً شغل اصل کہتے ہیں کس قدر مروج اہم اور آسان ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو عمل اصل کیواسطے نہایت وسیع میدان نکل آیا۔ دوسری طرف قانونی تسلط اور کاروباری خوش معاملگی کی بدولت اصل کو وہ امن و امان میسر ہے کہ بلا خوف و خطر چار دانگ عالم میں چکر لگا رہا ہے دنیا کا کونسا آباد حصہ ہے جہاں انگلستان کا تھوڑا بہت اصل کام نہیں کر رہا ہے یہی اصل تو دنیا کے ہر گوشہ سے دولت سمیٹ سمیٹ کر یورپ اور امریکہ لئے جا رہا ہے۔ وہاں کے اصل دار نہ صرف اپنے ملک کی صنعت و حرفت بلکہ نہایت دور دست ممالک کی ریل۔ معدنیات۔ اور جنگلات جیسی معاشی شعبوں میں بلا پس و پیش نہایت دریا دلی سے اصل لگا لگا کر غیروں کے خدا داد نعمتوں سے گھر بیٹھے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں انکی زبردست اور ذی اقتدار حکومتیں ان کے بیرونی کاروبار اور اصل کی پوری پوری حفاظت اور نگہداشت کرتی ہیں اور موجودہ بیدار قومیں دیگر ممالک میں اپنی معاشی فوائد کی ترقی۔ ملک گیری سے بھی زیادہ اہم اور قابل توجہ سمجھتی ہیں حتیٰ کہ کچھ عرصہ سے ملکی فتوحات کے بجائے معاشی تسلط کی خواہش جنگ کی محرک ہوتی ہے۔ اور بعدہٗ یہی تسلط بلا دردِ سر ملکوں پر قبضہ بھی کرا دیتا ہے۔ آجکل تو آگے کھٹیا پیچھے لھٹیا۔ ملک گیری کا عام اصول بنا یا ہوا ہے۔ ہندوستان سے لیکر مراکش۔ مصر اور فارس تک معاشی تسلط کا ہی

حصہ سوم باب چہارم

جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اب شغل اصل کی آسانیوں کا ذرا حال سُنیئے۔ اول تو صدہا بنک
ہیں جو اصل کے بیشمار چھوٹے چھوٹے اجزا سے نہایت کثیر مقدار فراہم کرکے کاروبار میں
بڑی بڑی رقمیں لگاتے ہیں۔ یہ بنک گویا ایسے تالاب ہیں کہ جنمیں بیشمار چھوٹے چھوٹے
گڑھوں کا پانی فراہم ہوکر کھیت و باغات کو سیراب و شاداب کرے۔ ہر شخص کو اتنی مہلت
کہاں کہ اپنے اندوختہ سے خود کام لے سکے اور نہ چھوٹی چھوٹی رقموں سے آجکل کام چل سکتا
ہے۔ پس اس سے بہتر کیا ہوگا کہ ایسے عدیم الفرصت اور چھوٹے چھوٹے اصل دار اپنا
اندوختہ کسی بنک میں داخل کرکے نہ صرف اس کی حفاظت سے سبکدوش ہوں بلکہ کچھ
سود بھی بطور معاوضہ پاویں اور بنک ایسی داخل شدہ بیشمار اندوختوں کی بڑی بڑی
مقدار اپنے اہتمام اور ذمہ داری پر تاجر اور کارخانہ داروں کو سود پر قرض دیں اور
داخل کنندوں کو بشرح کمتر سود دیکر فرق میں سے مصارف کاروبار اور منافع
نکالیں اور چونکہ اصولاً اکثر ایسی ضرورتوں کے واسطے روپیہ قرض دیتے ہیں کہ جنمیں اصل
کی قوت پیدا آوری سے کام لے کر مزید دولت پیدا ہونے کی اُمید ہو بنک کے قرضداروں
پر سود کچھ گراں بھی نہیں گزرتا بلکہ اصل مستعار کے توسل سے وہ خود بھی منافع اُٹھا لیتے ہیں
گویا ایک ہی اصل داخل کنندہ بنک اور قرض گیر تین طبقوں سے گذر کر پیدایش کے
میداں میں داخل ہوتا ہے اور اسکی پیداوار بھی علیٰ ہذا تینوں میں حسب حالات کسی نسبت سے
تقسیم ہو جاتی ہے۔ گویا شغل اصل میں بھی اول تقسیم کار کا عملدرآمد ہو رہا ہے۔ شغل اصل کی
ایک نہایت ہردلعزیز اور مروج شکل یہ بھی ہے کہ تجارت صنعت و حرفت یا کسی ایسے ہی
کاروبار کی غرض سے "انجمن سرمایہ مشترک" قایم کیجاتی ہیں۔ بہت سے لوگ ملکر بشکل
خریداری حصص جنکی قیمت معین ہوتی ہے۔ اول اول سرمایہ مہیا کرکے ایسے مشترک سرمایہ
سے کاروبار چلاتے ہیں اور نفع نقصان میں یکساں شریک رہتے ہیں۔ ایسی انجمنوں کا

انتظام وغیرہ اکثر تنخواہ دار منیجروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ حصہ داروں کی ایک انتظامی کمیٹی عام نگرانی قایم رکھتی ہے۔ لیکن بہت سے حصہ داروں کو اپنے حصوں پر ہر سال سود کے لینے کے سوائے کاروبار سے اور کچھ تعلق نہیں رہتا۔ قانون نے ایسی انجمنوں میں دو بڑی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ اول تو سرکاری سند یافتہ محاسبوں سے ہر ششماہی یا سالانہ حساب و کتاب کی جانچ پڑتال کرا کر عام اطلاع کے واسطے ان کی رپورٹ شائع کرانا قانوناً لازم ہے۔ گویا ناواقف حصہ داروں کو دھوکا دینا محال ہے۔ علاوہ ازیں ایسی انجمنیں محدود بھی کرائی جا سکتی ہیں جس کی بموجب اگر خدانخواستہ انجمن کو خسارہ آئے تو حصہ داروں سے صرف بقدر حصص قانوناً رقم وصول کیجا سکتی ہے۔ مطالبہ داروں کو حصوں کے علاوہ شرکا کے دیگر مال و جائداد پر کچھ حق نہوگا۔ آجکل انجمن شراکت محدودہ بکثرت جاری ہیں ایسی انجمنوں کے قیام کے وقت تو ان کے حصوں کی ایک خاص قیمت مقرر ہوتی ہے اور یہ قیمت متعارف کہلاتی ہے۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں فی حصہ سود کی شرح کے اضافہ و تخفیف کے مطابق حصہ کی قیمت بھی بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ اس تغیر پذیر قیمت کو قیمت صحیح کہتے ہیں۔ اور اسی قیمت پر حصے بھی اس طرح پر فروخت ہوتے رہتے ہیں جیسے کہ مکان یا دکان۔ حصہ کا ہر جدید خریدار انجمن کا حصہ دار اور سود کا مستحق مانا جاتا ہے۔ اس طرح پر حصہ داروں کی شخصیت برابر بدلتی رہتی ہے۔ لیکن قانون کی نظر میں انجمن وہی برقرار رہتی ہے۔

پرامیسری نوٹ۔ اسٹاک۔ بونڈ یا ڈبنچر۔ جن کی قیمت متعارف اور مقدار سود مقرر اور قیمت صحیح حسب شرح سود بازاری کم و بیش ہوتی رہتی ہے خرید کر سرکار یا میونسپلٹی کو سود پر روپیہ قرض دینا بھی شغل اصل کی ایک مروج شکل ہے۔ ادائگی قرض اکثر مقروض کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔ البتہ قرض خواہ کو وقت معینہ پر سود ملتا رہنا یقینی ہے۔ گویا ایسے شغل اصل میں ایک مستقل آمدنی بدرجہ اعلی یقینی ہو جاتی ہے۔ گو ایسی قرض کا مطالبہ

حصہ سوم
باب چہارم

نہیں کیا جاتا لیکن قرض خواہ اپنا پرامیسری نوٹ۔ اسٹاک وغیرہ مثل دیگر سامان وجائداد فروخت کرکے اپنی رقم حسب قیمت صحیح کم وبیش وصول کرسکتا ہے ایسا زرمستعار سرکار ومیونسپلٹیاں ریل۔ نہر۔ سڑک۔ روشنی اور واٹر ورکس پیدا آور جیسے کاموں میں لگاتی ہیں تاکہ مزید منافع حاصل ہوسکے۔ ایسی حالت میں قرض خواہوں کا سود کچھ بار نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی بحالت مجبوری سرکار کو ایسا زرمستعار غیر پیدا آور کاموں میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً مصارف یا تاوان جنگ۔ امداد قحط۔ یا بحالت قلت محاصل ناگزیر مصارف حکومت ایسی حالت میں سرکار کی حالت بعینہ کسی تباہ حال مقروض رئیس کی سی ہوتی ہے اور سود بھی سراسر بار ہوتا ہے ادہر اگر کوئی چاہے اور کرسکے تو اپنے ہی اصل سے کاروبار جاری کردے نہ کسی سے قرض لے نہ کسی کو قرض دے۔ ایسی حالت میں اس کو جو منافع ہوگا اور جس کی تفصیل منافع کے جداگانہ تحت میں ہم آیندہ کرینگے۔ اس کا ایک جزو اس کے اصل کا سود ہوگا رہا ایسے لوگوں کو سود پر روپیہ قرض دینا جو اس کو غیر پیدا آور کاموں میں صرف کریں اور عمل پیدایش میں اس سے مدد نہ لیں۔ بالفاظ دیگر جو کہ زرمستعار کو بطور دولت صرف کریں نہ کہ بطور اصل۔ جیساکہ قرض لیکر شادی۔ غمی۔ یا عشرت پرستی میں روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ اگرچہ قرض دہندہ کے نقطہ نظر سے یہ بھی شغل اصل ہی کیونکہ اس کو سود ملتا ہے۔ لیکن معاشی معاشرتی اخلاقی اور مذہبی۔ غرضکہ چند در چند لحاظ سے ایسا شغل بیحد ناجائز ومعیوب ہے۔ اور بذریعہ قانون اسکو روکنے کی پھر کوشش ہو رہی ہے شغل اصل کی مختلف صورتوں کے بموجب سود کی بھلائی برائی سے ہم آیندہ بعنوان "سود کا حاضر ومستقبل" مفصل بحث کرینگے۔ یہاں پر شغل اصل کی چند عام صورتیں دکھانا مقصود ہے اور بس۔

(۵) سود کیا ہے؟ کس طرح پر پیدا ہوکر کس اصول کے مطابق تقسیم ہوتا ہے؟ ماہیت

سود کے متعلق ان سوالات پر بیحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہی جس کی تفصیل کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے اور جس کے سمجھنے کے لئے معیشت کی وسیع معلومات شرط اول سود کے متعلق جو متعدد مسائل نکالے گئے ہیں وہ چند انواع میں مرتب ہو سکتے ہیں۔ ایسے کل انواع کا مختصر بیان اور جو مسئلہ مقابلتاً صحیح ترین تسلیم ہو چکا ہی اس کی مفصل بحث اس کتاب میں سب سے زیادہ موزوں ہوگی۔

(ا) مسئلہ غصب۔ جس طرح پر کہ کسی زمانہ میں صرف زمین عامل پیدایش دولت خیال کیجاتی تھی آجکل بھی بعض لوگ صرف محنت کو عامل پیدایش مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل دار غریب مزدوروں کی کمائی میں سے حصہ چھینتا ہے جس کو سود کہتے ہیں۔ گویا سود محض ان نامساعد حالات کا نتیجہ ہے کہ مزدور بالعموم غریب ہوتے ہیں اور دولتمندوں کے ہاتھ اپنی محنت فروخت کرنے کے سوائے ان کو کوئی چارہ نہیں۔ مزدوروں کو جو اُجرت ملتی ہے وہ ان کی مایحتاج زندگی سے بمشکل زاید ہو سکتی ہے اور محنت کی پیداوار سے یقیناً کم ہوتی ہے۔ پیداوار محنت اور اجرت کا فرق بشکل سود اصل دار کی جیب میں جاتا ہی۔ گویا اصل مزدوروں کی کمائی میں سے حصہ چھیننے کا آلہ ہے۔ علمی تحقیقات سے یہ مسئلہ محض وہمی اور بے بنیاد ثابت ہو چکا ہی۔ کسی زمانہ میں اس مسئلہ کا بہت زور شور تھا لیکن اس کے حامیوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ بہرحال صرف یہی مسئلہ سود کا مخالف ہی۔ اس کے علاوہ باقی کل مسائل بالاتفاق سود کے موافق ہیں۔ اور صرف تشریح و توجیہہ سود میں اختلاف کرتے ہیں۔

مسائل سود

(ب) مسئلہ پیدا آوری۔ سود اصل کی اُن خدمات کا معاوضہ ہے جو پیدایش دولت میں وہ سرانجام دیتا ہے۔ عمل پیدایش دولت میں سود کا حصہ مسلم ہے۔ چنانچہ وہ عامل پیدایش مانا جاتا ہے۔ اور جس طرح کہ مزدور کی محنت کا معاوضہ اُجرت کہلاتا ہے اصل کی

حصہ سوم باب چہارم

خدمات کے معاوضہ کو سود کہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ مسئلہ نہایت صاف اور صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن نظر غائر ڈالنے سے اس میں چند دقیق مگر اہم خامیاں نمایاں ہونگی جنکی تشریح سے ہم یہاں معذور ہیں۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ سراسر غلط تو ہے نہیں مگر ادھورا اور غیر تشفی بخش ضرور ہے

(ح) مسئلہ اجتناب۔ انسانی خاصہ ہے کہ کسی چیز سے بوقت موجودہ لطف اٹھانے کو بمقابلہ مستقبل کے زیادہ دل چاہتا ہے۔ اور التوار لطف بہت گراں گذرتا ہے۔ اول تو پیدایش اصل کے واسطے پس اندازی یعنی بعض موجودہ ضروریات ترک کرکے مستقبل ضروریات کے خیال سے کچھ بچانا شرط لابد ہے دوسرے اندوختہ سے بجائے دولت کے بطور اصل کام لینا یعنی اس سے فوری احتیاجات رفع نہ کرکے مزید دولت پیدا کرنا گویا اس کی لطف اندوزی کو ملتوی کرنا ہے۔ پس پیدایش اور شغل اصل دونوں میں اجتناب مضمر ہے اور اجتناب کیا ہے۔ لطف اندوزی کے کام سے باز رہنا۔ جو کہ ہم مقدمہ میں واضح کر چکے ہیں۔ خدمت کی ایک شکل ہے اور ہر طرح پر دولت کھلانیکا مستحق پس سود معاوضہ ہے اسی خدمت اجتناب کا یعنی موجودہ خرچ سے کچھ بچانے کا اور اندوختہ کو فوری احتیاجات پر صرف کرنے کے بجائے اس سے مستقبل دولت پیدا کرنیکا صریح واقعہ ہے کہ جبتک اندوختہ سے کچھ آمدنی کی امید نہو بہت کم پس انداز کیا جاتا ہے اور منافع کی امید بغیر اندوختہ کاروبار میں لگانا یا کسی کو قرض دینا تو محال ہے البتہ جو قرض براہ ہمدردی بلا سود دیا جاتا ہے وہ خارج از بحث ہے۔ لیکن ایسی مستثنیات بید نایاب و ناقابل لحاظ ہیں ماحصل کلام یہ کہ جو شخص کچھ روپیہ بچا کر کاروبار میں لگاتا ہے وہ فوری احتیاجات پر یہ روپیہ صرف کرنے سے باز رہنیکی خدمت سرانجام دیتا ہے۔ اور سود اسی خدمت اجتناب کا معاوضہ ہے۔ اس مسئلہ کے رو سے پیدایش اصل بہت کچھ اور شغل اصل سر سر

سود پر منحصر ہے۔ اور چونکہ پیدائش دولت میں اصل اس قدر معاون ہے، سود دینا لابد اور درست ہے۔

اس واقعہ سے تو انکار ہو نہیں سکتا کہ ہر ایک شخص مقابلۃً موجودہ مساوی لطف اندوزی کو مستقبل پر ضرور ترجیح دیتا ہے اور پیدائش و شغل اصل میں اجتناب مضمر ہے لیکن سود کو اس خدمت اجتناب کا معاوضہ قرار دینا علمی حیثیت سے کافی طور پر تشفی بخش اور قابل تسلیم نہیں۔ اس مسئلہ پر چند دقیق اور مسکت اعتراض عائد ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اجتناب کی خدمت غائب ہو جاتی ہے۔

لطف اندوزی حاضر کو مستقبل پر ترجیح دینے کا انسانی خاصہ تو بالکل درست ہے، لیکن اس مسئلہ میں اس سے جو توجیہ کی گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ بہتر توجیہ ہم آگے چلکر مکمل ترین مسئلہ کے ضمن میں بیان کرینگے۔

(د) مسئلہ محنت۔ بعض نے پس اندازی و شغل اصل کو سیدھے سادھے طور پر محنت قرار دیکر سود کو اصل دار کی اس محنت کا معاوضہ یا اجرت قرار دیدیا۔ یہہ مسئلہ بھی مسئلہ اجتناب سے ملتا جلتا مگر اس سے زیادہ سادہ ہے۔ مذکورہ بالا مسایل سے سود کے بجا اور درست ہونے کی تائید تو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سود کی علمی تشریح و توجیہ بالکل ادہوری اور غیر تشفی بخش نظر آتی ہے۔

مذکورہ بالا مسائل کے علاوہ چند اور مسائل بھی پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں سے بعض تو قطعاً رد ہو چکے اور محض تاریخی لحاظ سے سود کی بحث میں انکا ذکر کر دیا جاتا ہے اور بعض مذکورہ بالا مسائل کے عجیب عجیب مرکب ہیں جن میں اُن کی خامیاں بھی بدرجہ ادنے موجود ہیں۔

اب ہم سود کا وہ آخری مسئلہ ذرا تفصیل سے پیش کرنا چاہتے ہیں جو مقابلۃً مکمل

حصہ سوم

باب چہارم

ترین خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ فی نفسہ ابھی خود یہ مسئلہ بھی تکمیل طلب ہے۔ اس مسئلہ کے حامیوں میں بھی باہم اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے اور اسی وجہ سے مسئلہ کی موجودہ شکل بعینہ کسی ایک مصنف کی کتاب میں نظر آنی محال ہے مطالعہ اور غور سے پورا پورا کام لیکر اس مسئلہ کے بیان میں ہمنے دع ماکدر، خذ ماصفا کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہذا اگر یہ مسئلہ بعض سے ملتا جلتا لیکن ہر ایک سے جدا نظر آئے تو عجب نہیں۔ موجودہ جیسی کتاب میں یہ طریق ناگزیر معلوم ہوا ورنہ مسئلہ سود کی مفصل بحث کے واسطے ضخیم کتاب اور اس کے سمجھنے کے واسطے معیشت میں بہت کچھ وسعت معلومات لابد ہے۔

سود کی سب سے بہتر علمی تشریح و توجیہ اصل کے دو مسلم خواص سے متعلق معلوم ہوتی ہے ایک انتظار کشی جو اصل سے کام لینے میں کم و بیش لاحق ہوتی ہے دوسرے پیدا آوری جو اصل کا لابد خاصہ ہے اور جس کی بدولت وہ عامل پیدائش شمار کیا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل تفصیل سے واضح ہوگا کہ انتظار کشی سود کا باعث اور پیدا آوری اس کا منبع ہے علیٰ ہذا اصل کی رسد طلب بھی انہی خواص سے علی الترتیب متعلق ہے۔

انتظار کشی

(۱) انتظار کشی

بعض لوگوں کے پاس تو اس قدر دولت ہوتی ہے کہ اُن سے خرچ کیے بن نہیں بنتا جبکہ تمام موجودہ ضروریات حاصل ہوں تو باقی ماندہ دولت کو پس انداز کیے بغیر کیا چارہ ہو سکتا ہے بلکہ بعض زیادہ اہم مستقبل احتیاجات رفع کرنے کے خیال سے اگرچہ موجودہ ضروریات ترک کرکے بھی لوگ کچھ اندوختہ جمع کریں تو عجب نہیں چنانچہ واقعہ ہے کہ حسب حیثیت لوگ بالعموم علالت و پیری کے خیال سے موجودہ آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے اندوختے

لوگ خود بخود پس انداز کرتے ہیں ان کو مزید معاوضہ کی ترغیب ضروری نہیں بلکہ ایسے اندوختوں کی نگہداشت کا کوئی معاوضہ وہ اپنی گرہ سے دینے پر بھی رضامند ہوجائیں تو عجب نہیں۔ چنانچہ جبکہ شغل اصل کا میدان نہایت تنگ تھا۔ بنک رقم داخل شدہ کی تحفظ و نگہداشت کا معاوضہ داخل کنندوں سے الٹا وصول کرتے تھے۔ ابتک پس اندازی دو حالتوں تک محدود تھی۔ اول جبکہ دولت کی اس قدر افراط ہو کہ کل موجودہ ضروریات مہیا ہونے پر بھی کچھہ بچ رہے دوم جبکہ بمقابلہ چند موجودہ احتیاجات کے آیندہ زیادہ اہم احتیاجیں پیش آنی یقینی ہوں لیکن معاشی ترقیات کی بدولت جبکہ شغل اصل کے مواقع بیحد کثیر اور وسیع ہوگئے۔ ایک جدید تیسری قسم کی پس اندازی شروع ہوئی یعنی بلا زیادتی دولت و لحاظ احتیاجات مستقبل محض مزید معاوضہ کے لالچ سے۔ موجودہ احتیاجات دبا دبا کر لوگوں نے پس اندازی شروع کردی۔ ایک شخص سے دریافت کیا جائے کہ آیا وہ سو روپیہ آج لینا چاہتا ہے یا ایک سال بعد۔ اب اگر اس کو اس وقت کوئی احتیاج ہی درپیش نہو۔ یا آیندہ احتیاجات موجودہ سے زیادہ اہم احتیاجیں پیش آنے کا یقین ہو تو بشرطیکہ اسکو پورا اعتماد ہو وہ رقم مذکورہ سال بھر میں لینا زیادہ پسند کریگا۔ بلکہ امانت داری کا کچھہ معاوضہ بھی اپنی گرہ سے دے تو عجب نہیں۔ لیکن بحالت سوم اگر اس کو موجودہ احتیاجیں دبا رہی ہوں تو اُن کو رفع کرنے کی غرض سے وہ اس رقم کی ادائیگی حاضر کو مستقبل پر ضرور ترجیح دیگا۔ البتہ اگر کچھہ مناسب اضافہ کا وعدہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ حال کے بجائے ایک سال ہی بعد لینا گوارا کرے۔ اس واقعہ سے ایک عام اصول واضح ہوتا ہے کہ بحالت احتیاج کسی چیز کے ملنے کے وقت میں جسقدر بعد ہوگا۔ اسی قدر موجودہ معیار کے مطابق اس کی قدر گھٹ جاوے گی۔

حصہ سوم
باب چہارم

اسی کو خاصۂ انتظار کشی کہتے ہیں ۔ اگر شخص مذکور اس وقت ۱۰۰ روپیہ یا ایک سال بعد ۱۰۵ روپیہ لینے پر یکساں رضامند ہو تو گویا اس وقت ایک سال بعد ملنے والے ۱۰۵ روپیہ کی قدر اس کے نزدیک فوراً ملنے والے ۱۰۰ روپیہ کی برابر ہے ۔ لیکن واضح ہو کہ سال بھر بعد بوقت حصول ۱۰۵ روپیہ کی قدر موجودہ ۱۰۰ روپیہ کی قدر سے بمقدار ۵ روپیہ زائد ہوگی ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سال بھر انتظار کرنے پر وہ رضامند کیوں ہونے لگا تھا گویا اس وقت تاوان ۵ روپوں سے بمقابلہ ۱۰۰ روپیہ حاضر کے ۱۰۰ روپیہ مستقبل کی قدر کی موجودہ تخفیف کی تلافی ہوتی ہے ۔ لیکن سال بھر بعد جبکہ بوقت حصول یہی ۱۰۰ روپیہ مستقبل ۱۰۰ روپیہ حاضر کے مساوی القدر ہو جاویں تو وہ ۵ روپیہ سود بنجاویں گے یا بالفاظ دیگر ۱۰۵ روپیہ مستقبل کی موجودہ قدر ۱۰۰ روپیہ حاضر کی برابر ہے اور سال بھر بعد بوقت حصول ۱۰۰ روپیہ حاضر سے بقدر ۵ روپیہ زائد ہوگی یہی ۵ روپیہ جو اس وقت تخفیف قدر کی تلافی کرتے ہیں اس وقت بطور قدر مزید ۔ سود شمار ہوں گے ۔

پس صاف ظاہر ہے کہ سود کا باعث انتظار کشی ہے ۔ اور انتظار کشی اکثر اصل کی پیدائش اور تمام اصل کے شغل سے لاینفک ہے ۔ چند دولتمندوں کو چھوڑ کر عام طور پر لوگ تھوڑی بہت موجودہ احتیاجات دبائے بغیر پس انداز کم کر سکتے ہیں ۔ رہا شغل اصل ۔ خواہ اندوختہ کچھ عرصہ کے واسطے قرض دیا جائے یا زراعت صنعت و حرفت اور تجارت میں لگایا جائے ۔ اس کی واپسی ہمیشہ قریب یا بعید مستقبل میں ہوگی ۔

جو اندوختہ محض بوجہ زیادتی دولت یا بخیال اہمیت احتیاجات مستقبل جمع ہوتا ہے اگر موجودہ کاروباری ضروریات کے لیے کافی ہوتا تو انتظار کشی کا معاوضہ کوئی

حصہ سوم
باب چہارم

دخل ہوتا نہ اصل وار سود کی زیادہ پروا کرتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کل تو امرا اس اصل کا عشر عشیر بھی مہیا نہیں کر سکتے جو عوام اور متوسط الحال لوگوں کے اندوختوں سے ملتا ہے۔ اور آخر الذکر طبقہ کے اصل کی پیدائش و شغل میں انتظار کشی کو بہت بڑا دخل ہے بلا امید منفعت سود نہ تو یہ لوگ اس قدر پس انداز کر سکتے ہیں اور نہ اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی قرض دینے یا کاروبار میں پھانسنے پر رضامند ہو سکتے ہیں۔ اور موجودہ کاروبار ضروریات کے لحاظ سے اُنکا اصل بھی ناگزیر ہے پس انکو سود دینا لابد ہوا۔ اور جب اُنکو سود ملنے لگا تو پھر دولتمند اپنے اصل کا سود کیوں طلب نہ کریں۔ کام تو انکا اصل بھی ہی کرتا ہے جو دوسرونکا پھر کیا وجہ کہ اس پر سود نہ دیا جائے۔ آخر کو اس سے کیا بحث کہ آیا اس کی پیدائش اور شغل میں انتظار کشی مضمر ہے یا نہیں اس کو تو صرف اصل کے کام سے تعلق ہے اور بس۔ لہذا بلا تفریق موجودگی و عدم موجودگی انتظار کشی ہر قسم کے اصل پر سود دیا جانے لگا لیکن سود کا حقیقی باعث پھر بھی انتظار کشی ہے۔

(۷) پیدا آوری

پیدا آوری

پیدا آوری بھی اصل کا جدید ناگزیر خاصہ ہے اس واقعہ کی جابجا تفصیل بھی کی جا چکی ہے مختصراً یہاں بھی تشریح کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک درزی جو ہاتھ کی سلائی سے ۸ آنہ روز

حدید

کما سکے سنگر مشین کی مدد سے ۱۲ ر روز کمائے تو ۴ ر کی پیدا وار اصل مشین سے منسوب کرنا بیجا نہ ہوگا لیکن واضح ہو کہ اصل کی پیدا آوری ثابت کرنے کے لیے ۴ ر کا محض پیدا ہونا کافی نہیں۔ دوران شغل میں اصل قائم برابر فرسودہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصہ میں بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ ابتدائے استعمال کے وقت سے بیکاری کے وقت تک اس پیدا وار میں سے جو استعمال اصل کا نتیجہ ہو مطالبات فرسودگی ایسی شرح سے منہا کرتے رہتے ہیں کہ کل اصل واپس آجائے۔ پس اگر ایسی پیدا وار مطالبات

حصہ سوم
باب چہارم

فرسودگی سے کمتر ہو تو گویا اصل پھر واپس بھی نہیں آسکتا اور اس کے استعمال میں سراسر نقصان ہے۔ اگر مطالبات فرسودگی کے مساوی ہو تو کچھ عرصہ میں صرف اصل واپس آجائے گا۔ استعمال سے اصول انتظار کشی کے مطابق پھر بھی نقصان رہیگا۔ البتہ اگر مطالبات فرسودگی سے ایسی پیداوار کچھ زاید ہو تو بیشک وہ پیدا آوری اصل کا ثبوت ہوگی اور پیداوار اصل کہلانے کی مستحق۔ تجربہ شاہد ہے کہ تشغل اصل سے علاوہ مطالبات فرسودگی کے مزید پیداوار بھی حاصل ہوتی ہے جس میں سے بالعموم سود ادا کیا جاتا ہے یہی پیدا آوری ہے جس کی بدولت لوگ خوشی خوشی بقدر کثیر سود پر قرض لیکر اپنی مستعار سے کاروبار چلاتے ہیں سود ادا کرنے پر بھی منافع اُٹھاتے ہیں۔ اگر اصل سے پیداوار میں جداگانہ اضافہ نہیں ہوتا تو لوگ اس قدر شوق سے قرض لے لیکر اسکو کیوں کام میں لاتے اور فضول سود سے کیوں زیربار ہوتے البتہ جو لوگ روپیہ قرض لیکر بمجبوری یا بخوشی غیر پیدا آور کاموں میں صرف کرتے ہیں جیسا کہ بحالت افلاس قرض لیکر بسر اوقات کرنا۔ یا آوارہ مزاج رؤسا کی طرح رنگ رلیاں منانا۔ ایسے اصل میں قرض دہندہ کی طرف سے تو انتظار کشی موجود ہوتی ہے۔ لہذا وہ سود کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن قرض گیر کے ہاتھ میں آکر ایسا اصل محض دولت رہجاتا ہے اس سے پیدا آوری مفقود ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ خود مع سود اسپر بار گراں بنکر تباہی کا باعث ہو جاتا ہے اب اگر محض اس بناء پر کہ اصل مستعار سے پیدا آوری کا کام نہیں لیا گیا تھا۔ قرض دہندہ کو سود سے محروم کیا جائے تو وہ قرض دینے سے انکار کردیگا لیکن یہ خیال غلط ہے کہ ایسی قانونی بندش سے لین دین رک سکتا ہے ایسے قرض گیر جو نہایت ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں طرح طرح کی تدابیر نکالکر قرض لئے بغیر نہ رہیں گے۔ البتہ قانونی گرفت کے خوف سے قرض دہندہ شرح سود کو اور بھی بڑھا دینگے۔ اور اس

حصہ سوم
باب چہارم

اضافہ کو مطالبۂ خطر کہیں گے جس کی تشریح ہم اقسام سود کے تحت میں آیندہ کرینگے۔
اگر قرض دہندہ کو قانوناً سود سے محروم کرکے قرض دینے سے روکنے کے بجائے بذریعہ
قانون قرض خواہ کو روکا جائے تو نتیجہ زیادہ حسب دلخواہ ہو گا۔

محتاجوں کو اور رفاہ عام کے کاموں کے واسطے بلا سود قرض دینا۔ آوارہ لوگوں کو
قرض دینے سے انکار کرنا معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے نہایت ضروری اور پسندیدہ ہے
لیکن اس کی مثال اس قدر نایاب ہے کہ معاشی معاملات پر اس کا اثر قابل لحاظ
نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پر غریبوں سے بیحد زیادہ شرح سے سود لیکر چھوٹی چھوٹی
رقمیں قرض دیکر ہمیشہ کے واسطے اُن کی کمائی کا شریک غالب بنجانا یا شوق دلا
دلا کر بھولے بھالے وارستہ مزاج رئیس زادوں کو قرض دیکر اُن کی جائداد ضبط کرلینا
سوسایٹی کے حق میں اس قدر خطرناک اور اخلاقی لحاظ سے مذموم ہے کہ قانوناً اس کی
بندش اشد ضروری بھی ہے اور ممکن بھی سود کے بھلے بُرے نتائج سے ہم آیندہ سود کے
حاضر و مستقبل کے تحت میں بحث کرینگے۔ یہاں صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ سود
انتظار کشی اور پیدا آوری کا آفریدہ ہے اور یہ دونوں خواص شغل اصل میں مضمر ہیں۔
لہٰذا سود بھی شغل اصل سے لاینفک ہے۔

(۸) شرح سود۔

شرح سود

جیسا کہ شرح اجرت کے بیان میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اصل بھی قانون تقلیل
حاصل کا پابند ہے۔ یعنی کسی کھیت یا مزدوروں کی جماعت میں جو اصل استعمال
ہوتا ہے حسب دلخواہ کسی مقدار تک اسکا اضافہ کرکے اسی نسبت سے پیدا وار میں بھی
اضافہ ممکن نہیں۔ خواہ زراعت ہو یا صنعت و حرفت اصل کے جرعے استعمال
کرتے کرتے ایک ایسا جرعہ ملے گا کہ اس کے مابعد جرعوں کی پیدا وار درجہ بدرجہ

گھٹتی چلی جاوے گی۔ مثلاً کاشتکار اپنے کسی کھیت میں دس روپیہ کا کھاد ڈالے یا بیج بوئے یا پانی لگائے۔ اب اگر ان مدوں میں جو گنا اصل لگائے تو پیداوار کا جو گنا ہونا غیر اغلب ہے۔ اسی طرح پر کسی درزی کی دوکان میں جب ۶ سنگر مشین استعمال ہوتی ہے تو ۴ روزانہ فی مشین ملتا ہے اب اگر دو مشینیں اور بڑھا دی جائیں تو ان پر بمشکل ۲ ۳ آنہ مل سکیں گے۔ حاصل کلام یہ کہ دیگر عاملین پیدایش زمین و محنت کے مقابلہ میں اصل کی مقدار جس قدر بڑھے گی پیداوار اصل کی شرح گھٹتی جائے گی۔ اور شرح اجرت کی طرح شرح سود بھی کمترین پیداوار کے مساوی قرار پائے گی زمین کی وسعت تو تقریباً معین ہے۔ اس میں اضافہ کی برائے نام ہی گنجائش نہیں۔ محنت کے اضافہ میں بھی دیر لگتی ہے اور وبا، قحط، جنگ جیسے عاملین تو اس کی کانٹ چھانٹ کرتے رہتے ہیں لیکن اصل کے اضافہ کا کیا کہنا نہ سڑک ہیں اس قدر پھیلے نہ مچھلی کی نسل اس قدر بڑھے گذشتہ صدی میں نہ معلوم کے سو گنا ہو گیا ہوگا۔ اور جس قدر بڑھتا ہے ساتھ ساتھ قوت اضافہ اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے اصل کی مقدار بڑھ رہی ہے جس کی پس اندازی و شغل میں انتظارکشی مضر نہیں۔ ایسے اصل کی مقدار جس قدر بڑھے گی انتظارکشی والی اصل کی جانشین بنکر اس کی مقدار مطلوبہ کی تخفیف کا باعث ہوگی اور جس قدر آخر الذکر اصل کی مقدار کم ہوگی ادنیٰ تر شرح سود پر اصل ملنا آسان ہوگا۔ علاوہ ازیں قیام امن و امان اور عام بیداری کی بدولت خود انتظارکشی کا اثر کمزور ہو رہا ہے۔ یعنی بہ نسبت سابق اب لوگ کمتر معاوضہ پر اپنا اندوختہ قرض دینے یا کاروبار میں لگانے پر رضامند پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اعلیٰ یا ادنیٰ شرح سود پر شغل اصل گوارا کرنا بھی معاشی ترقی و پس ماندگی کی علامت مانی جاتی ہے۔

حصہ سوم باب چہارم

اضافۂ اصل کے ساتھ ساتھ معاشی ترقیات کی بدولت شغل اصل کے واسطے ہی نئی نئی راہیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور قانون تقلیل حاصل کے مقابلہ میں نت نئی ایجادات اصل کی قوت پیدا آوری بڑھا رہی ہیں۔ ایک طرف تو طلب اصل۔ زراعت صنعت و حرفت، تجارت اور عام کاروباری حالت پر منحصر ہے۔ دوم کثرت اندوختہ معاشی ترقیات اور عام بیداری کا رسد اصل پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور پھر طلب و رسد میں بہت کچھ باہمی انحصار موجود ہے اور اُن کے عمل میں کوئی تقدم تاخر مقرر نہیں۔ ایسی حالت میں شرح سود کے کل اسباب کا جداگانہ تعین محال ہے۔ صحت کے ساتھ اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ شرح سود طلب و رسد اصل کے باہمی عمل سے مقرر ہوتی ہے۔ لیکن اتنا تحقیق ہے اور علمی لحاظ سے یہ واقفیت نہایت اہم ہے کہ مقدار سود بالعموم اصل کے پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے۔

یہ ایک نہایت دقیق اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ چونکہ سود قلت اصل کا نتیجہ ہے۔ یعنی انتظار کشی و الا اصل ناگزیر ہے کسی زمانہ میں کثرت اصل کی بدولت یعنی جبکہ غیر انتظار کشی و الا اصل کاروباری ضروریات کے واسطے کافی ہوگا سود بھی غائب ہو جائیگا یہ تو رسد کا پہلو تھا۔ ادھر طلب کے پہلو پر بھی بوجہ کثرت اصل پیداوار مختتم میں تخفیف ہوتے ہوتے صفر رہ جائے گا۔ بالفاظ مختصر سود محض موجودہ حالات کا آفریدہ ہے پیداوار کا مستقل حصہ قرار نہیں پا سکتا۔ شرح سود برابر گھٹ رہی ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ کبھی بالکل غائب ہو جائے گا۔ دوسرا گروہ ثابت کرتا ہے کہ ایک خاص حد پر موجودہ تخفیف ضرور رک جائے گی اور سود ہمیشہ برابر جاری رہیگا اور وہ پیداوار کا مستقل حصہ ہے سود دائمی ہے یا عارضی اس کا فیصلہ تو بہت بحث طلب اور دشوار ہے لیکن عرصۂ دراز

حصہ سوم
باب چہارم

تک اس کا رواج جاری رہنا تو بہر حال یقینی ہے۔
تمام مذکورہ بالا بحث سے صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ شرح سود معاشی اسباب سے خود بخود مقرر ہو جاتی ہے وہ محض رواج یا قانون کی آفریدہ نہیں۔

اور ایسی معاشی شرح سود میں قانونی مداخلت بیکار بلکہ مضر ہوتی ہے۔ لیکن پس ماندہ ممالک میں جہاں معاشی اسباب کا اثر ضعیف ہے اور ابتک قدیم طرز پر غیر پیدا آور کاموں کے واسطے زر نقد کا لین دین ہوتا ہے، سود بالعموم قرض گیر کی احتیاج کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسے قرض لاچاری اور مجبوری کے ہوتے ہیں اور مثل مشہور ہے مرتا کیا نہ کرتا جب کسی کو قرض لئے بغیر چارہ ہی نہیں تو شرح سود پر رد و قدح کرنے کی اسکو کہاں سے جرات ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ شرح جس کا وہ بظاہر متحمل ہو سکتا ہے قرض دہندہ اس سے طلب کرتا ہے اور اس کو بھی منظور کرنا پڑتا ہے۔ ایسے لین دین کی مضرتوں سے ہم آئندہ سود کے حاضر و مستقبل کے تحت میں مفصل بحث کرینگے یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کی شرح سود قانوناً محدود و مقرر کرنا ممکن بھی ہے اور از حد مفید بھی۔

اصطلاحی زبان میں مذکورہ بالا بحث کا لب لباب یہ ہے کہ شرح سود معاشی اسباب کے تابع ہوتی ہے اور قانونی نگرانی کی محتاج نہیں لیکن شرح ربا بیشتر قرض گیر کی شدت احتیاج اور قرض دہندہ کی قوت دست برد کے مطابق ہوتی ہے اور بذریعہ قانون اس کے حدود مقرر کرنا بیحد مفید اور اشد ضروری ہے۔

(۹) اقسام سود

اقسام سود

سود کی دو قسمیں ہیں سود خام و سود خالص سود خام میں علاوہ سود خالص کے جس کی باہیئت مسائل سود کے تحت میں واضح کی جا چکی ہے۔ بعض اور مدیں بھی خصوصاً مطالبات

خطر و مطالبات فرسودگی۔ شامل ہوتے ہیں۔ کاروباری مقابلہ کی آزادی اور اصل کے سریع الانتقال ہونیکی بدولت سود خالص کی شرح تقریباً ہر جگہ ایک ہی سطح پر پائی جاتی ہے یہ جو ۲ فیصدی سے لیکر ۲ - ۲۵ فیصدی تک شرح میں فرق پھیلا ہوا ہے۔ یہ درحقیقت سود خام سے متعلق ہے۔ جن کاروبار میں اصل صائع ہونے کا اندیشہ زیادہ قوی ہے یا فرسودگی اصل کی رفتار تیز ہے اور اصل بھی بیش قیمت ہے تو سود خالص عام شرح کے مطابق ہونے کے باوجود بھی مطالبات خطر و فرسودگی کی زیادتی کی وجہ سے سود خام کی شرح بہت اعلیٰ ہو جائے گی اور مذکورہ بالا مطالبات ملے بغیر کوئی اپنا اصل ایسے کاروبار میں کیوں لگانے لگا۔ بمقابلہ زر رہن کے قرض پر زیادہ سود طلب کیا جاتا ہے خوش حال لوگوں کو بمقابلہ عوام کے کمتر شرح سود پر قرض ملتا ہے۔ کمتر شرح سود پر بھی لوگ قدیم اور معتبر بنکوں ہی میں روپیہ داخل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرنیکی غرض سے نئے بنکوں کو زر داخلہ پر شرح سود بڑھائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ شرح سود کے ایسے فرق کا باعث مطالبات خطر کی کمی بیشی ہوتی ہے۔ بعض کاروبار ایسے ہیں کہ ان میں خاص طور پر نقصان کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ مثلاً شیشہ آلات یا اونی اور زر دوز کپڑوں کی تجارت کہ ذرا سی بد احتیاطی سے ہزار ہا روپیہ کا سامان ٹوٹ پھوٹ کر یا کرم خوردہ اور ماند ہو کر اکارت ہو جاتا ہے۔ ایسے کاروبار میں بھی باقاعدہ مطالبات خطر ملتے رہنے ضروری ہیں تاکہ اُن سے اتفاقی نقصانات کی تلافی ہوتی رہے۔ ورنہ کچھ عرصہ بعد کاروبار جاری رکھنا محال ہوگا۔ اصل دائر مثل کوئلہ و پیداوار خام تو عمل پیدائش میں اول ہی مرتبہ اپنا کام ختم کرکے جلد واپس آجاتا ہے۔ لیکن عمارت و مشین جیسا اصل قائم عرصہ دراز تک عمل پیدائش سرانجام دیکر مدت میں واپس ہوتا ہے لیکن دوران عمل پیدائش میں وہ برابر کہنہ و فرسودہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصہ میں وہ بالکل ناکارہ

ہو جاتا ہے لہذا اس وقت تک اس کی واپسی بھی ضروری ہے۔ پس قاعدہ یہ ہے کہ کچھ فیصدی سالانہ بطور مطالبات و سودگی شمار کیا جاتا ہے تاکہ بتدریج کل اصل قائم اس کی ناکارگی کے وقت تک واپس آجائے۔ اصل قائم جس قدر بیش قیمت اور سریع الزوال ہوگا مطالبات فرسودگی بھی زیادہ ہوں گے۔ بصورت دیگر مطالبات کی مقدار بھی بہت کم ہوگی۔

پس معلوم ہوا کہ سود خام میں علاوہ سود خالص کے جس کی شرح کم و بیش مساوی ہو مطالبات خطر و فرسودگی بھی خاص طور پر شامل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان مطالبات کی مقدار کاروبار کی نوعیت سے متعلق ہوتی ہے۔ سود خام میں بیحد فرق پایا جاتا ہے یہاں یہ نکتہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں سود خالص کی شرح بھی معمول سے اعلیٰ پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ اس حالت میں ممکن ہے جبکہ کاروبار متعلقہ میں اجارہ حاصل ہو یعنی وہ مقابلہ کی مداخلت سے محفوظ ہو۔ اجارہ و مقابلہ سے ہم آیندہ بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتانا کافی ہے کہ مقابلہ کی خاصیت قیام مساوات ہے خواہ اجرت میں یا سود و قیمت میں۔ اس کے برعکس اجارہ دار انہیں اپنے موافق فرق بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ شرح صرف کاروبار کے قدیم شرکا کے نزدیک اعلیٰ شمار ہو سکتی ہے۔ جدید شرکا کے حق میں وہ بھی معمولی سطح پر آرہتی ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے کہ اگر کسی کاروبار میں بغایت اعلیٰ شرح سود خالص حاصل ہو رہی ہو تو مروجہ شرح کے حساب سے ایسے کاروبار کے حصص کی قیمت صحیح ہی بڑھ جاوے گی۔ اور جدید شرکا کو وہی معمولی شرح مل سکے گی۔ مثلاً کسی کارخانے میں شرح سود خالص ۱۵ روپیہ ہو اور معمولی شرح ۵ روپیہ۔ تو ایسے کارخانے کے سو سو روپیہ قیمت متعارف والے حصے تین تین سو روپیہ میں فروخت ہو کر خریداروں کو

معمولی شرح سے سود دینگے البتہ قدیم شرکار کو اب بھی ۱۰۰ روپیہ پر ۱۵ فیصدی ملیگا لیکن اُن کے قدیم ۱۰۰ روپیہ بھی اب ۱۰۰ روپیہ نہیں ہیں بلکہ تین سو کے مساوی ہوگئے لہذا اصل کی موجودہ قیمت کے مطابق اُن کو بھی ۵ فیصدی ہی ملتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کارخانہ کی شرح سود ادنیٰ ہو تو حصص کی قیمت صحیح قیمت متعارف سے گھٹکر شرح سود معمولی شرح تک بلند کردے گی۔ حاصل کلام یہ کہ سود خالص کی شرح کم وبیش ہر جگہ مساوی پائی جاتی ہے۔ جو کچھ فرق نظر آتا ہے اکثر سود خام سے متعلق ہے سود وربا اور سود خام وسود خالص کا فرق ظاہر ہوگیا۔ اب ہم سود کی ایک اور تفریق بتانا چاہتے ہیں جو کاروبار کی اصطلاحی زبان سے متعلق ہے۔ اصل قرض دیکر جو معاوضہ بشرح معین فیصدی سالانہ ہم قرض دار سے پاتے ہیں وہ سود کہلاتا ہے۔ لیکن اگر کسی انجمن سرمایہ مشترک کے حصہ دار بنکر ہم کاروبار کے نفع نقصان میں یکساں شریک ہیں اور غیر معین شرح سے حسب حالات شغل اصل کا معاوضہ پاویں تو وہ اگرچہ سود سے مختلف نہیں لیکن کاروباری زبان میں مقسوم کہلا دیگا اور اگر بلا شرکت غیرے ہم اپنے اصل سے خود کاروبار چلاویں تو اس کا سود منافع میں شمار ہوگا جو سود کہ بشکل مقسوم یا منافع حاصل ہوتا ہے اس کی شرح غیر معین ہوتی ہے اور بمقابلہ اضافہ تخفیف کا اندیشہ زیادہ دامنگیر رہتا ہے اسوجہ سے ان میں علاوہ مطالبات خطر و فرسودگی مطالبات ضمانت بھی شامل ہوتے ہیں تاکہ کمی سود کی تلافی ہوتی رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی شرح عام مروجہ شرح سود سے کسی قدر اعلیٰ ہوتی ہے۔ لیکن بحیثیت سود خالص سب تقریباً ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔

(۱۰) زر وسود کا تعلق

زر کی ماہیت اور اس کے اصول ومسائل ہمنے مبادلہ دولت کے تحت میں

مفصل بحث کی جاوے گی۔ یہاں صرف زر سود کا رشتہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے
جیسا کہ آیندہ مفصل بحث سے بخوبی روشن ہوگا۔ زر کی تین حیثیتیں ہیں وہ عام آلۂ مبادلہ
زر عام معیار ہے اور ذخیرہ قدر بھی۔ بالفاظ دیگر زر سے ہر چیز کا مبادلہ ہوسکتا ہے
اور اسی وجہ سے اس کو بدلے میں لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں چونکہ
زر کا مبادلہ بالکل عام ہے اس کے وساطت سے مختلف چیزوں کی قدر و قیمت کا
باہمی مقابلہ ممکن ہے اور بشکل زر ہی لوگ اندوختہ جمع کرتے ہیں مثلاً روپیہ سے ہم غلہ
شکر۔ نمک۔ کپڑا۔ جوتا۔ غرضکہ دنیا بھر کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ اور اگر
غلہ کا نرخ ۴ روپیہ من اور شکر کا ۸ روپیہ اور نمک کا ۲ روپیہ من ہو تو قیمت کے
مقابلہ سے ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ ۲ من غلہ ایک من شکر اور ۴ من نمک مساوی القیمت
ہیں اور چند در چند آسانیوں کی وجہ سے بجائے دیگر اشیا لوگ بالعموم روپیہ پس انداز
کرتے ہیں۔ البتہ اندوختہ سے بعد کو اور چیزیں خریدنا اختیاری ہے۔ زر کی مذکورہ
بالا تین حیثیتوں سے شرح سود کا بھی قابل توجہ تعلق ہے چونکہ دولت بشکل زر بیشتر
پس انداز کی جاتی ہے اور زر میں یہ خوبی ہے کہ حسب دلخواہ اس کا ہر چیز سے مبادلہ
ممکن ہے۔ اصل کا لین دین بشکل زر ہوتا ہے۔ اور زر کے ہی حوالہ سے فیصدی سالانہ
سود شمار کیا جاتا ہے۔ درحقیقت تو اصل سے وہ آلات۔ عمارات۔ پیداوار خام
وغیرہ مراد ہوتی ہے جو عمل پیدائش میں کام آئے۔ لیکن حساب کتاب اور علمی
مباحث میں اصل ہمیشہ بشکل زر شمار کیا جاتا ہے اوپر ہم یہ بھی سمجھا چکے ہیں کہ سود خالص
کی شرح آج کل ہر جگہ کم و بیش مساوی پائی جاتی ہے اور اصل بشکل سامان مروجہ
شرح کے حساب سے اپنی مقدار سود کے مطابق اصل بشکل زر میں منتقل کیا جاسکتا ہے
مثلاً کسی مشین سے ۴ روپیہ خالص سود سالانہ حاصل ہوتا ہے۔ اب اگر عام شرح

۳ فیصدی ہے تو یہ ۳۳۳۳ روپیہ زر اصل کے مساوی شمار ہوگا اور اگر ۵ فیصدی ہو تو ۸۰ روپیہ کے برابر ہر ایک اصل خواہ دائر یا قائم اوّل بوقت شغل اکثر زر ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زر چونکہ عام آلۂ مبادلہ ہے۔ اصل بشکل زر از حد سریع الانتقال ہے۔ جہاں بھی موقع دیکھتا ہے جا پہنچتا ہے۔ اور شرح سود سطح آب کی مانند ہموار رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اصل قائم بھی مساوات شرح کے اثر سے اپنی شکل زر بدلتا رہتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اصل یوں تو بکثرت سامان و آلات کی شکل میں موجود ہے لیکن لین دین اور علمی مباحث میں وہ ہمیشہ بہ لباس زر پیش کیا جاتا ہے۔

زر کی تیسری حیثیت بھی کہ وہ معیار قیمت ہے۔ شرح سود سے ایک نہایت دلچسپ تعلق رکھتی ہے زر یوں تو عام آلۂ مبادلہ ہے کہ اس سے دنیا کی ہر ایک چیز خرید سکتے ہیں لیکن فی نفسہ زر سے ہماری کوئی احتیاج رفع ہوسکتی ہے زر کیا ہے سونے چاندی اور تانبے کے سکے یا کاغذ کے پرزے کہ جنکو نہ ہم کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں نہ اوڑھ پہن سکتے ہیں نہ جنسے برہ رہنے ہمارا اور کوئی احتیاج پوری ہوسکتی ہے۔ لیکن زر عام آلہ مبادلہ ہے اور اس سے دنیا کی بیشمار چیزیں خریدی جاسکتی ہیں جن سے ہماری احتیاجات رفع ہوں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ زر محض مبادلہ کیواسطے درکار ہے تاکہ حسب ضرورت اس سے ہر چیز خرید لی جائے زر کے مبادلہ میں جس قدر کوئی چیز زیادہ یا کم ملے گی۔ اسی قدر گویا زر کی قدر بھی بحوالہ اس چیز کے بیش و کم ہوگی مثلاً جس زمانہ میں گیہوں کا نرخ ۱۵ سیر ہو ایک روپیہ اُس زمانہ کے بارہ آنے کی برابر ہے جبکہ گیہوں ۲۰ سیر فی روپیہ فروخت ہوتے ہوں اور ۸ کے مساوی القدر جبکہ نرخ ۱۰ سیر ہی ہو زر سے جو بیشمار چیزیں خریدی جاتی ہیں اُنکا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن ایک علمی طریق تحقیق ہوا ہے کہ جس سے من حیث المجموع زر کی قدر و قیمت کا اضافہ یا تخفیف قابل اطمینان حد تک دریافت ہوسکتا ہے۔ اس کو انڈکس نمبر کہتے ہیں

حصہ سوم
ماسٹماہم

بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ بحیثیت مجموعی تقریباً ہر ملک میں گرانی بڑھ رہی ہے یعنی زر کی قدر وقیمت گھٹ رہی ہے اور بمقابلہ سابق کمتر چیز اُس کے مبادلہ میں ملتی ہے تخفیف قدر کے اسباب کی بحث جو کہ بہت طویل ہے ہم یہاں نہیں چھیڑ سکتے صرف اسی تخفیف کا شرح سود پر اثر دکھانا مدنظر ہے - زر عام معیار قدر ہے اور معیار ہمیشہ مقرر ہوتا ہے مثلاً گز کہ وہ ۳۶ انچ لانبا ہے - یا من کہ ۴۰ سیر وزنی ہے لیکن زر ایسا معیار ہے جو خود تغیر پذیر ہے - اور اشیا کی گرانی ارزانی کے مطابق کبھی گھٹکر اپنے ماسبق روپیہ کا ۲ - ۴ تین چوتہائی یا نصف رہجاتا ہے کبھی ڈیوڑھا دوگنا ہو جاتا ہے - اس کی مثال ایک ایسے گز کی سی ہے جو کبھی سکڑ کر ۲۰ - ۲۵ انچ اور کبھی پھیلکر ۴۰ - ۵۰ انچ ہوتا ہے فرض کرو کہ کوئی شخص ۵ فیصدی شرح سود سے سال بھر کے واسطے ۱۰۰ روپیہ قرض لے اب اگر روپیہ کی قدر بمقدار ۲۰ فیصدی بڑھ جائے یعنی آخر سال میں ۱۰۰ روپیہ شروع سال کے ۱۲۰ روپیہ کے مساوی القدر ہوں تو گویا قرض دار بوقت ادائیگی قرض وسود ۱۰۵ روپیہ در حقیقت ایسے ۱۲۶ روپیہ ادا کرتا ہے جیسے کہ اُس نے قرض لیے تھے - گویا کہ شرح متعارف ۵ فیصدی اور شرح صحیح ۲۶ فیصدی ہوگی اسکے برعکس اگر روپیہ کی قدر بیس فیصدی گھٹ جائے یعنی آخر سال کے ۱۰۰ روپیہ شروع سال کے ۸۰ کے مساوی القدر رہجائیں تو بوقت ادائیگی ۱۰۵ روپیہ وہ دیکر حقیقت ایسے ۸۴ روپیہ ادا کرتا ہے جیسے کہ قرض لیے تھے - یعنی کہنے کو تو ۵ فیصدی سود ادا کرتا ہے لیکن درحقیقت ۱۶ فیصدی سود گویا بمعاوضہ قرض گیری خود کاٹتا ہے - بالفاظ مختصر زر کی قدر وقیمت تغیر پذیر ہے اور اس کے گھٹنے بڑھنے سے سود کی شرح صحیح میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے چنانچہ واقعہ ہے کہ نصف صدی میں روپیہ کی قدر گھٹتے گھٹتے بمشکل نصف رہگئی ہے اور قدیم قرض خواہوں کو بھی درحقیقت قرض کم وبیش ۵ فیصدی مل رہا ہے

اگرچہ روپیہ کی مقدار اب بھی وہی ہے لیکن اُن کی قدر چونکہ اصلی غایت ہے تو قرض دیئے ہوئے روپیوں کے نصف کی برابر رہ گئی ہے۔ ایسے قرضوں پر سود ملنا تو درکنار خود قرض دار کو اپنی گرہ سے سود دینا پڑتا ہے۔ لیکن واضح ہو کہ زر کی قدر و قیمت میں ایسا بڑا فرق کہیں مدتوں میں نمودار ہوتا ہے۔ مختصر زمانوں میں جن کے واسطے بالعموم قرض دیا لیا جاتا ہے۔ قدر و قیمت میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ تخفیف قدر زر کا واقعہ اور اس کا سود پر اثر عملاً زیادہ اہم نہیں۔ البتہ اصولاً بہت قابل توجہ ہے۔

زر کے متعلق یہاں بلحاظ ضرورت جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی مفصل تشریح مبادلہ دولت کے تحت میں ملے گی۔

سود کا
حاضر و
مستقبل

(۱۱) سود کا حاضر و مستقبل

ہم بتا چکے ہیں کہ ہماری اصطلاحی زبان میں ربا سے مراد وہ معاوضہ ہے جو غریب حاجتمندوں یا امیر نا عاقبت اندیشوں کی فوری احتیاجات رفع کرنے نہ کہ پیدا آور کاموں کے واسطے زر نقد قرض دیکر بشرح اعلیٰ وصول کیا جائے۔ شرح کی زیادتی قرض گیر کی لاچاری و شدت احتیاج اور قرض دہندہ کی چیرہ دستی و بیرحمی کے مطابق ہوگی۔ خدا کی رحمت یعنی مرفع الحالی کی ناشکری اور زر نقد کی بد استعمالی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ غریبوں کی تنگدستی اور اپنی دولتمندی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اُن کی چھوٹی چھوٹی کمائیوں سے حصہ چھینے۔ بغایت اعلیٰ شرح سود پر تھوڑا سا قرض دیکر ہمیشہ کے واسطے ان کو اپنا غلام بنالے کہ گاڑھے پسینہ کی کمائی میں سے وہ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس کو مدت العمر سود دیا کریں اور ادائیگی قرض کی کبھی نوبت نہ آنے پائے۔ یا کسی بھولے بھالے رئیس زادہ کو اوّل اوّل عیش و عشرت کی چاٹ لگا کر نہایت دلجوئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ قرض مرحمت کیا جائے

اور چند ہی روز میں بر سر عدالت اُن کو جائداد و ریاست کی ملک و آمدنی سے سبکدوش کرکے اُن کا خاتمہ بالخیر کر دیا جائے۔ یورپ میں تو یہودی شہرۂ آفاق ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے مہاجن بھی کسی سے کم نہیں۔ رباخوری کے لین دین سے سب کی آنکھوں کے سامنے، خود قانون کی ظل عاطفت میں (جس کی مشہور عالم غرض واحد کمزوروں کی حمایت اور قیام حفظ و امن ہی) چور اور ڈاکوؤں سے کہیں زیادہ بیشمار غریبا ورنا دانوں کا گھر لوٹ رہے ہیں۔ افلاس پھیلا کر عزت مند اور نیک نیت خستہ حال مقروضوں کو بھیک اور چوری کے سوائے بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہیں چھوڑتے اور اپنے مقروض فاقہ کش خاندانوں کی اموات میں طاعون کا حق ادا کر دیتے ہیں جس طرح سڑک بیل کا ایک بالشت بھر ٹکڑا بڑے سے بڑے سر سبز و شاداب درخت پر چند ہی روز میں پھیلکر سکو زرد و خشک کر ڈالتا ہے۔ مہاجن سے کچھ قرض لینا شرط ہی اس کے بعد اگر گھر بار نیلام ہو جاوے تو ہمارا ذمہ۔ انکی چیرہ دستی سے خدا کی خلقت پامال ہو رہی ہی۔ ذرا عدالتوں کے رجسٹر مقدمات اُٹھا کر دیکھئے وہ غریبوں کی تباہی کے ایسے افسانوں سے لبریز ہیں کہ جنہیں سنکر پتھر کے دل بھی پگھل جائیں۔ اگر ایسے مظلوموں کی آہ سے آسمان بھی ہلجاتا ہو تو عجب نہیں۔ صوبہ متحدہ کی عدالتوں کی مصدقہ رپورٹ میں سے چند معاملات مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہوں

نام عدالت	زر قرض	ڈگری مع سود
الہ آباد	۵۰	۴۰۰۰
کانپور	۵۰	۳۰۰۰
علیگڈھ	۹۹	۶۰۰۰

نام عدالت	زر قرض	ڈگری مع سود
علیگڈھ	۹۹	۶۰۰۰
"	۶۰	۲۰۶۹
آگرہ	۷۵	۲۷۵۰
علیگڈھ	۱۶	۷۰۰
بنارس	۱۹۹	۲۷۹۰
علیگڈھ	۲۰۰	۲۷۱۵
بنارس	۲۷۲	۱۶۲۸
"	۱۵۰	۱۱۰۰
شاہجہانپور	۷۶	۱۰۰۰

ان چند مثالوں کی یہ کہکر اہمیت گھٹانا بیجا ہوگا کہ یہ معدودے چند نادرالوجود انتہائی قسم کے واقعات ہیں۔ بلکہ ہر باخبر شخص تسلیم کریگا کہ ایسی وحشت افزا معاملات کی ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں اور بہت بڑی تعداد عدالت کے علم میں نہیں آتی۔ غرضکہ ربا سے ملک میں جو ناقابل تلافی تباہی پھیل رہی ہے کوئی ذیہوش اور ایماندار آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ ان شرمناک حالات کی اصلاح کیونکر ممکن ہے۔ رباخوری کے خلاف ۱۸۸۰ء میں جرمنی میں ایک قانون پاس ہوا اور ۱۸۹۳ء میں اس کی ترمیم ہوئی جو اتنک برابر جاری ہے اس قانون کی روسے معمولی شرح سے زیادہ سود پر غریب نادان لوگوں کو قرض دینے کا معاہدہ کالعدم ہے۔ علاوہ ازیں رباخوری کا پیشہ جرم بھی قرار دیا گیا ہے محض قرض دہندوں کو ربا سے روکنے کا نتیجہ غالباً مطالبات خطر کے بڑھنے سے سود تمام کا

حصہ سوم
باب چہارم

اضافہ ہوگا۔ خود قرض گیروں کو بیجا مصارف کے واسطے قرض لینے سے روکنے اور جائز ضروریات کیواسطے شرح مناسب سود پر قرض مہیا کرنے کا طریق کہیں زیادہ کارگر ہوسکتا ہے۔ چنانچہ کاشتکاروں و دیگر مزدوری پیشہ طبقوں کو مہاجن کے پنجہ سے انکو چھٹانے کی غرض سے سرکاری سرپرستی اور نگرانی میں جابجا انجمن ہائے امداد باہمی یورپ کے نمونہ پر قائم ہورہی ہیں۔ شرکا میں کفایت شعاری اور خوش معاملگی کی مستقل عادتیں پیدا کرنا بیجا اسراف سے روکنا اور جائز ضروریات کے واسطے مناسب شرح سود پر قرض دینا اُن کے خاص مقاصد ہیں۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں ایسی سوسائیٹیاں بہت جلد اپنے فوائد و برکات ظاہر کرکے ہردلعزیز ہورہی ہیں۔ یہاں اِن سوسائیٹیوں کے حوالہ پر اکتفا کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے۔ طریق کاروبار کی تشریح اپنے اپنے محل پر ہوگی۔

آج کل حتی الوسع ہر کوئی اپنے اندوختہ سے بطور اصل کام لینے کا خواہشمند نظر آتا ہے موجودہ طریق کاروبار نے شغل اصل میں ایسی آسانیاں پیدا کردی ہیں کہ ہر شخص بلا دردسر اپنے اصل سے سود حاصل کرسکتا ہے۔ معتبر بنک میں اندوختہ داخل کردے یا سرکاری بشرح معین سود والے پرامیسری نوٹ اور اسٹاک خرید لے یا کسی انجمن شراکت کے حصے خرید لے۔ غرضکہ بلا محنت و مشقت اصل دار اپنے سود کی آمدنی سے نہایت عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں غریب مزدور تو پیٹ پالنے کی خاطر دن رات جان کھپاتا ہے۔ زمیندار کو بھی ریاست کے انتظام میں بہت کچھ تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اکثر اصل داروں کو وقت معینہ پر گورنمنٹ یا بنک یا کارخانوں سے سود وصول کرنا اور چین اُڑانا اس کے سوا اور کام ہی نہیں۔ سیر و سیاحت شکار و تفریح کے سوا ان کو نہیں معلوم کہ دنیا میں کون سی ہوا چل رہی ہے

دوسروں کا اُن کے عیش و بیفکری پر حسد کرنا بالکل قدرتی بات ہے۔ چنانچہ اصل کے متعلق ایک عام شکایت ہے کہ وہ آمدنی غیر مکتسب کا آلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اصل کا کوئی قصور نہیں اور نہ سود میں کچھ عیب۔ اصل داروں کی اصلاح کے واسطے ان اسباب کا روکنا ضروری ہے جن کی بدولت وہ بلا محنت و مشقت بڑی بڑی مقدار دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اگر امریکہ والے راک فیلر کی طرح کوئی غریب شخص اپنی سخت محنت اور غیر معمولی قابلیت سے ناجائز طریق اختیار کیے بغیر کروڑپتی کیا بلکہ ارب یا کھرب پتی بن جائے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن عصب تو یہ ہے کہ نہایت ناکارہ لوگ خود ہاتھ پیر ہلائے بغیر باپ دادا کے بڑے بڑے ورثوں کی آمدنی پر جس کو بذریعہ شغل اصل بطور سود حاصل کرنے سے شاید ہی کوئی دنیا میں آسان کام ہوگا۔ دن عید اور رات شب برات مناتے ہیں۔ زمیندار بھی اگرچہ ریاست کے انتظام میں کچھ توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں۔ جیسا کہ لگان کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے ان کی ملک و جایداد کی آمدنی و قیمت بہت سی عام معاشی ترقیات کی بدولت اُن کی کوشش بغیر خود بخود دن دونی رات چوگنی ہو رہی ہے۔ یہ لوگ بھی ایسے اضافوں سے روز بروز بلا محنت و مشقت زیادہ دولت مند بن رہے ہیں۔ مزید براں بوجہ سہولت شغل اصل کا ان کو بھی شوق پیدا ہو چلا ہے۔ اور ان کے آمدنی غیر مکتسب کے دو ذرائع حاصل ہیں علاوہ ازیں بطریقہ اجارہ بھی کاروبار میں اجرت و سود سے زیادہ معاوضہ وصول کیا جا سکتا ہے گویا وراثت، زمین اور اجارہ یہی تین طریق ہیں جن سے کافی محنت و کوشش بغیر بڑی بڑی دولتیں افراد کے ہاتھ آجاتی ہیں۔ پس اُن کی اس طرح پر اصلاح کرنی چاہیئے کہ تقسیم دولت بہت زیادہ مساوی رہے۔ اس وقت نہ لوگوں کے

حصہ سوم
باب چہارم

یاس جدا گکا نہ بہت زیادہ اندوختہ ہوگا۔ نہ شغل اصل سے موجودہ آمدنی غیر مکتسب اس قدر زیادہ مقدار میں میسر آسکے گی۔ ماحصل غیر مکتسب کے اصلی ذرائع تو مسدود نکرنا جن کی وجہ سے لوگ بڑی بڑی دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اور شکایت یہ کرنا کہ دولتمند شغل اصل سے بہت کچھ سود پا رہے ہیں نہ اصولاً صحیح ہے نہ عملاً مفید۔

بالفاظ مختصر لوگوں کو بلا مشقت بہت سی دولت سنگوا لینے سے روکنا چاہئے نہ کہ جو دولت وہ حاصل کرلیں اس کے استعمال سے۔

حصہ سوم
باب پنجم

باب پنجم

منافع

فصل

تجزیہ (۱) آجر کی کارگذاری (۲) منافع کی ماہیت (۳) شرح منافع

آجر کی کار گذاری

۱۔ اس سے قبل بھی آجر کے کام کا جابجا ذکر آچکا ہے۔ یہاں اسی کی تفصیل مقصود ہے ہر سہ عاملین پیدائش کے مالک تین جداگانہ گروہ میں منقسم پائے جاتے ہیں۔ زمیندار۔ مزدور۔ اور اصل دار۔ چنانچہ باب اول میں واضح ہوچکا ہے کہ مالک عاملین کی اس تقسیم کی بدولت پیداوار میں لگان اجرت اور سود کی تفریق ضروری معلوم ہوئی بہت کم زمیندار خود کاشت کرنا پسند کرتے ہیں۔ لگان پر زمین اُٹھانے کا طریق مدت سے مروج ہے۔ غریب مزدور کے پاس آجکل کے کاروبار کے لایق اصل کہاں اکثر دوسروں کے ہاں اُجرت پر کام کرتے ہیں۔ اکثر اندوختہ والے چاہتے ہیں کہ کاروبار کے مخصوں میں پڑے بغیر کسی دوسرے کی معرفت شغل اصل سے سود حاصل کریں زمینداروں کا جداگانہ گروہ تو قدیم سے چلا آتا ہے لیکن جب سے پیدایش بر پیمانہ کبیر کا رواج ہوا اور خاص و عام میں اپنے اندوختہ سے بطور اصل کام لینے کا شوق بڑھا مزدور۔ اصل دار۔ اور آجر بھی جُداگانہ طبقوں میں تقسیم ہوگئے۔ چنانچہ آجر کرایہ پر زمین اور سود پر اصل قرض لیکر۔ اُجرت پر مزدوروں سے کام لیتا ہے۔ گویا اپنے اہتمام نگرانی اور ذمہ داری میں دوسروں سے عاملین پیدایش مستعار لیکر کاروبار جاری کرتا ہے۔ واضح ہو کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں آجر کے کام کی بہت گنجائش ہے اور آخرالذکر شعبۂ پیدایش میں اصل و محنت کے عمل کا غلبہ ہوتا ہے۔ براہ راست زمین اسمیں بہت کم حصہ لیتی ہے۔ لہٰذا آجر کے کام کا بالخصوص قابل لحاظ حصہ اصل و محنت کو یکجا کرنا ہے۔

مزدوراُن سے اُجرت پر کام لیے بغیر تو کوئی چارہ نہیں۔ آجر اپنی ذات سے کُل کاروبار کیسے چلاسکتا ہی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ زمین اور اصل یا ان کے کسی حصہ کا خود مالک ہو لیکن ان کے ذاتی ملک ہونے سے آجر کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بالفاظ مختصر آجر کا کام عاملین یکجا کرکے دولت پیدا کرنا ہی۔ خواہ خود مالک زمین ہو اور اپنی گرہ سے اصل لگائے یا دوسروں سے مستعار لے۔ لیکن مزدوروں سے بہرصورت اُجرت پر کام لیتا ہی اور خاص اسی وجہ سے آجر کہلاتا ہی۔ چونکہ ہر عامل ایک جُداگانہ گروہ کے ہاتھ میں جاپڑا ہی اور مالک خود کام لینے سے یا تو جان چُراتے ہیں یا معذور ہیں۔ اس لیے عاملین یکجا کرکے دولت پیدا کرنے کا کام خاص طور پر ایک علحدہ گانہ گروہ کے سپرد کرنا پڑا۔ اور حقیقت یہ ہی کہ معاشی ترقیات کی بدولت پیدائش کا کام اس قدر دشوار اور تخصیص طلب ہوگیا ہی کہ اس میدان میں اچھے اچھے ٹھوکریں کھاتے اور راستہ بھٹکتے ہیں۔ اول تو یہ پیدائش بر پیمانہ کبیر کا زمانہ ہے۔ صدہا بلکہ ہزارہا مزدور اور لاکھوں کروڑوں روپیہ قیمتی اصل کا اہتمام نگرانی کیا کوئی آسان کام ہی۔ ذرا تفصیل پر غور کیجئے تو قدم قدم پر بجید باخبری۔ وقت شناسی ذہین مستعدی اور استقلال کی ضرورت نظر آئیگی۔ آجر کو کاروبار کا کپتان کہتے ہیں۔ اور تشبیہ از حد موزوں اور درست ہی۔ لڑتی تو فوج ہی ہے لیکن فتح و نصرت کا دارمدار بیشتر جنرل کی عاقلانہ ترکیب اور موزوں چالوں پر ہوتا ہے۔ عمدہ افسر جن بہادر سپاہیوں سے بڑے بڑے فتوحات پاتے ہیں۔ ناقابل افسر انھیں بیکار کٹوا کر ہزیمت اُٹھاتے ہیں۔ ایسی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہی۔ خالد بن ولید۔ صلاح الدین اور نپولین کا نام جنگی دنیا میں کیوں روشن ہی۔ سپاہی تو ان کے بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ بہتیرے پیش رفتہ اور پس آیندہ سپہ سالاروں کے۔ لیکن کام ان سے وہ وہ لئے گئے کہ دنیا

آج تک مداح اور حیران ہے۔ یہی حال آج کل کاروبار کا ہے یوں تو سینکڑوں مزدور اور ملازمین شریک کار ہوتے ہیں لیکن کامیابی اور سرسبزی ایک ہی دو نگراں کاروں کی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے۔ چاہے اُن کی ذراسی غلطی اور لغزش سب کی کوشش خاک میں ملادے چاہے اُن کی پیش بینی اور عاقلانہ کوشش کاروبار کو آسمان پر چڑھا دے۔ دوسرے مزدور اور اصل کی نگرانی تو ادنےٰ کام ہے۔ وسیع الاثر معاشی تغیرات کا بغور مطالعہ کرنا، اقتضائے وقت کو پہلے سے تاڑنا، اُس کا ساتھ دینا نہ صرف مروجہ ضروریات بہم پہنچانا بلکہ نت نئی اختراع و ایجاد سے جدید ضروریات رائج کرنا۔ عمدگی تنظم اور سائنس کی تحقیقات اور عام معلومات سے مدد لیکر مصارف پیدائش میں کفایات داخلی وخارجی نکالنا، نرخ گھٹا کر خریدار بڑھانا یا مروجہ نرخ سے اعلیٰ منافع اُٹھانا غرضکہ ہر وقت نہایت ماہر اور مستعد رہنا اور مقابل کاروباروں سے دوڑ میں آگے بڑھنے کی کوشش برابر جاری رکھنا۔ کیسے کیسے دشوار کام آجر کے ذمہ آپڑے ہیں۔ یہ جو یورپ و امریکہ کے کارخانوں اور کاروبار نے دنیا پر تسلط کر رکھا ہے کیا یہ محض حسن اتفاق کا نتیجہ ہے نہیں۔ بلکہ علاوہ چند در چند معاشی اسباب کے آجروں کی کوشش بھی اس عالمگیر کامیابی کا خاص اور بہت بڑا باعث ہے حتیٰ کہ چند مشہور بنکوں اور کارخانوں کے ڈائرکٹر و منیجر بلحاظ کارگزاری و ذمہ داری اعلیٰ سے اعلیٰ سلطنت کے وزیر اعظم اور پریسیڈنٹ کے ہم پلہ مانے جاتے ہیں انگلستان کی وزارت اور لندن بنک کی ڈائرکٹری ان دونوں عہدوں میں کون زیادہ اہم ہے۔ اس پر اب تک اختلاف رائے موجود ہے۔ کسی گروہ وطبقہ کے کل افراد کی حالت یکساں نہیں ہوسکتی۔ علیٰ ہذا یہ کس طرح پر ممکن ہے کہ تمام آجر ایسی ہی عظیم الشان کارگزاریاں دکھا سکیں۔ یہ تو معدودے چند کا ہی حصہ ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے موافق وہ ایک خاص قسم کا ضروری اور

قابلیت طلب کام سرانجام دے رہی ہیں۔ گو یہ کام فی نفسہ ایک قسم کی محنت ہی لیکن جو باتیں مذکورہ بالا اس قدر اہم اور متمیز ہو گیا ہی کہ عمل پیدائش دولت کا چوتھا جزو شمار ہو کر **تنظیم** کے جداگانہ نام سے موسوم ہوا۔

ٹھیٹ آجر تو وہی ہی جو سہ عاملین یکجا جمع کر کے دولت پیدا کرے۔ لیکن تاجر بنکوں کے ڈائرکٹر وغیرہ جیسے لوگ جو کسی کاروبار کے نگراں ہوں اسی زمرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے کام بھی مذکورالصدر تنظیم کی صرف مختلف شکلیں ہیں۔ یہاں یہ نکتہ جتانا نہایت ضروری ہی کہ آجر کھلانے کے واسطے نہ صرف کاروبار کی نگرانی بلکہ براہ راست ذاتی نفع نقصان کا تعلق بھی لازمی ہی۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی تنخواہ دار منیجر کاروبار کا نگراں ہو تو وہ آجر نہیں شمار ہو سکتا۔ کیونکہ اگرچہ بحیثیت ملازم وہ بھی جوابدہ ہی اور کاروبار کی سرسبزی و تباہی کا اس کے مالی مفاد پر اثر ضرور پڑتا ہی۔ لیکن اس کی ذمہ داری اور تعلق اتنا قوی اور قریبی نہیں جتنا اس وقت ہوتا جب کہ وہ خود اپنی طرف سے کاروبار جاری کرتا اور اس کا خود نگراں بنتا۔ بحالت اول صرف تنزل یا زیادہ سے زیادہ ترک ملازمت کا اندیشہ ہو سکتا ہی۔ لیکن بحالت دوم کاروبار کے کل نفع نقصان کا اثر براہ راست اس کی ذاتی حالت پر پڑتا ہی۔ چنانچہ یہی وجہ ہی جیسا کہ تجربہ شاہد ہی کہ کسی کارخانہ اور کاروبار کے تنخواہ دار منیجر اس قدر توجہ اور تندہی سے نگرانی نہیں کر سکتا جتنا کہ خود مالک کرتا ہی۔

حاصل کلام یہ کہ آجر سے مراد وہ لوگ ہیں جو عاملین پیدائش کو یکجا کر کے اپنی ذاتی نگرانی اور ذمہ داری میں اُن سے دولت پیدا کریں۔ آج کل اکثر آجر زمین و اصل و سرمایہ دوسروں سے کسی معاوضہ پر مستعار لے لیتے ہیں اور بعض خود ہی اُن کے مالک ہوتے ہیں۔ آخرالذکر قسم کے آجر تو زمانہ قدیم میں بھی موجود تھے لیکن پیدائش بر پیمانہ کبیر تشغل اصل کے

حصہ سوم باب پنجم

رواج اور عام معاشی ترقیات کی بدولت اول الذکر قسم کے اُجروں کا گروہ اور اقتدار بہت بڑھ گیا ہے۔ اور چونکہ یہ یہ زمیندار ہوتے ہیں نہ محض مزدور۔ نہ اصل دار۔ اور پھر بھی پیدائش دولت کے واسطے اُن کا کام بڑی حد تک ناگزیر سا ہو گیا ہے لہذا عاملین کے مالکوں سے۔ اُنکا حیثیت عاملین سے کام لینے والوں کے ایک جدا طبقہ بنگیا ہے اور اُنکا ماحصل زاید بھی ایک خاص نام یعنی منافع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لیکن چندروز سے آجروں کا حلقہ عمل پھر تنگ ہوتا جاتا ہے۔ خصوصاً جبسے انجمن سرمایہ مشترک اور شراکت کا رواج پھیلا کاروبار کے اہتمام اور نگرانی میں تنخواہ دار منیجر آجروں کے قائم مقام بن رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مشین کا استعمال جس قدر بڑھ رہا ہے۔ بہ نسبت سابق نگرانی کی ضرورت بھی گھٹتی جاتی ہے۔ جو کاروبار کمال کو پہنچ چکے ہیں اور جن کے چلانے کے طرز و طریق مقرر سے ہو گئے ہیں وہ تو تنخواہ دار منیجر کے بھی سپرد کیے جا سکتے ہیں لیکن جن کاموں میں جدت جرأت اور جانکاہی کی ضرورت ہے وہ آجر کے ہاتھ ہی سرسبز ہو سکتے ہیں۔ آج کل بھی اسی اصول پر آجر و تنخواہ دار منیجر کے درمیان تقسیم کار میں عملدرآمد ہو رہا ہے۔

(۲) منافع کی ماہیت

منافع کی ماہیت

تقسیم دولت کے دیگر مباحث کی مانند منافع کا مسئلہ بھی کچھ کم معرکۃ الآرا اور پیچیدہ نہیں۔ اوّل تو خود اس کا مفہوم غیر معین دوم اس کے اسباب تحقیق کرنے پر ابتک معدودے چند لوگوں نے توجہ کی ہے۔ اور ایسے مسائل کی دقت لاینفک ان کی عدم تعین کی خاصیت ہوتی ہے ان کے متعلق جو کچھ بیان کیا جائے زیادہ سے زیادہ وہ قرین صحت ہو سکتا ہے کوئی بات قطعی طور پر کہنی محال ہے۔ ایسی صورت میں جس قدر بھی اختلاف رائے ہو کم ہے۔ مستند تصانیف کے مطالعہ اور ذاتی غور و خوض کے بعد منافع

کی جو تشریح سب سے زیادہ قرین اصول اور تشفی بخش نظر آئی وہ بیان کی جاتی ہے۔

منافع کا مفہوم اوّل ایک مثال سے واضح کرکے بعدہٗ اس کے اسباب دریافت کرنیکی کوشش کرینگے۔ فرض کرو کہ کسی کارخانہ کے سالانہ آمد و خرچ کا حساب حسب ذیل ہے۔

		روپیہ
قیمت پیداوار		۵
قیمت اشیاء خام جو کام آویں	۹	
اصل مستعار کا سود	۴۰۰	
بشرط امکان دوسرے کے زمین کا کرایہ جو معاشی لگان سے زاید ہو	۲۰	
دوسروں کی رقمیں جو حسب تفصیل بالا ایسی جیب سے دیجائیں گی		۴۰۰
منافع خام		۱۰۰
اجرت تنظیم	۴۰۰	
کچھ ذاتی اصل ہے جس کا سود	۳۰۰	
کچھ زمین ذاتی ہے جس کا کرایہ زاید از معاشی لگان	۱۰۰	
اصل قائم کردہ مطالبات فرسودگی و خطر	۱۰۰	
جو رقمیں حسب تفصیل بالا ایسی جیب میں رہیں		۸۰
منافع خالص		۲۰۰

اس مثال میں بغرض جامعیت وہ تمام مدیں دکھائی گئی ہیں جو منافع کی بحث میں قابل توجہ ہوسکتی ہیں لیکن ہر ایک کارخانہ کے حساب میں ان سب مدوں کی موجودگی لازمی نہیں۔ فرض کرو کہ کسی آجر کے پاس نہ ذاتی اصل ہو نہ زمین یعنی دونوں مستعار لے تو منافع خام میں سے صرف اجرت تنظیم اور اصل قائم کے مطالبات فرسودگی و خطر مہیا کرنے کے بعد جو بچے وہ منافع

حصہ سوم

منافع خام

خالص ہوگا۔ اسی طرح پر اگر کوئی آجر نہ سود پر اصل مستعار لے نہ کرایہ پر زمین یعنی دونوں اُسکے
ذاتی ہوں تو قیمت اشیاء خام و اجرت مزدوران مہیا کرلے کے بعد جو بچے وہ منافع خام ہوگا
اجرت سود اور کرایہ زمین مصارف پیدائش کی ان تین مدوں کو دو دو جزو میں منقسم کرکے
ایک ایک کو منافع خام سے خارج اور باقی کو شامل شمار کرنے کی وجہ ایک تو حساب کتاب
کی سہولت ہے جو اجرت سود یا کرایہ دوسروں کو ادا کرنا پڑتا ہے وہ تو مصارف پیدائش میں
جداگانہ شمار کیا جاتا ہے لیکن جو اپنے ہی جیب میں رہتا ہے اس کی ایسی باقاعدہ تفریق غیر ضروری
سمجھکر لوگ اس کو منافع شمار کرلیتے ہیں مطالبات فرسودگی و خطر اگرچہ مصارف پیدائش کا
ضروری جزو ہیں لیکن جب تک وہ آجر کی جیب سے نہیں نکلتے منافع ہی میں ملے جلے رہتے ہیں
اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ منافع خام محض رواج کا آفریدہ ہے علمی لحاظ سے اس کا
کوئی وجود نہیں اول تو منافع خام کے دو جزو یعنی اجرت تنظیم اور ذاتی اصل کے سود کا موازنہ اس اجرت
و سود سے جو خارج از منافع ہے علمی غرض سے ضروری ہے۔ دوم منافع خام مقابلہ کا ایک
کارگزار ہے جس کی ہم ابھی مختصر تشریح کرینگے۔

اول اجرت تنظیم کو لیجئے۔ بحیثیت ملازم دوسروں کے کاروبار کی نگرانی و اہتمام میں
اس قدر تن دہی و ذمہ داری درکار نہیں جتنی کہ ذاتی کاموں میں چنانچہ واقعہ ہے کہ آجر
اپنے کاروبار کی ترقی میں جس قدر جانفشانی کرتا ہے تنخواہ دار منیجر ہرگز نہیں کرسکتا ایسی
محنت و ذمہ داری سے بچنے کے لیے اکثر لوگ کمتر شرح معین پر اپنا اصل قرض دیدینا اور
دوسروں کے کارخانوں میں ملازمت کرنے آجر بننے کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتے
ہیں نتیجہ یہ ہے کہ منیجر کو جو تنخواہ دینی پڑے یا جو تنخواہ خود آجر کو کسی دوسرے کارخانہ میں
بحیثیت منیجر مل سکے اس سے غالباً کچھ زیادہ اُجرت تنظیم کے طور پر آجر وصول کرنے کی
کوشش کریگا۔ یہی حال سود کا ہے دوسروں کو اصل قرض دیکر اصل دار سود بشرح معین اطمینان

حصہ سوم
باب پنجم

سے وصول کر سکتا تھا لیکن اپنے کاروبار میں لگانے سے اس کے سود کی شرح ہمیشہ غیر معین رہتی ہے کبھی معمول سے زیادہ ملا تو کبھی کچھ نہیں ایسی غیر اطمینانی حالت میں آجر **مطالبات ضمانت** بغیر جنسے قلت مقدار سود کی تلافی ہوتی رہنا یقینی ہو۔ بطور خود کاروبار میں اصل لگانا ہرگز پسند نہ کریگا اور بشرح معین سود پھر دوسروں کو قرض دینا ہزار درجہ غنیمت سمجھے گا لہذا ذاتی اصل کے سود کی شرح بھی بازاری شرح سے بقدر مطالبات ضمانت زیادہ مطلوب ہو گی۔ البتہ ذاتی زمین کے کرایہ میں کوئی بیشی ضروری نہیں ورنہ اصل ذاتی و مستعار کے مطالبات فرسودگی وخطر بھی یکساں ہوں گے۔

واضح ہو کہ اس بحث میں یہ لازم نہیں آتا کہ آجر کو ہمیشہ اجرت تنظیم اور ذاتی اصل کا سود بشرح اعلیٰ ہی ملتا ہے بلکہ ایسا ہوتا عجب نہیں کہ کاروبار جاری کرنے کے بعد ناموافق تغیر حالات کی بدولت معمولی شرح سے بھی کم وصول ہو۔ یہ آجر کی بڑی بدقسمتی ہو گی لیکن وہ اکثر بے بس ہو جاتا ہے۔ فرض کرو کہ آجر ہزارہا بلکہ لاکھوں روپیہ عمارت اور مشین میں لگا کر کارخانہ جاری کرے اور حالات نامساعد اس کے کاروبار کو آگھیریں۔ اب اگر کاروبار بالکل بند کر دے تو جو کچھ منافع مل رہا ہے وہ بھی نہ ملے گا اور سراسر نقصان ہو گا اور اگر کاروبار فروخت کرے تو بحالت موجودہ قیمت نہایت ادنی اٹھے گی لہذا کچھ مجبور ہو کر اور کچھ آئندہ اصلاح کی امید پر وہ کاربار جاری رکھے گا اور بمصداق ع گندم اگر بہم نرسد جو غنیمت است، تھوڑا بہت منافع جو کچھ بھی ملے گا۔ اسی پر قناعت کریگا۔ یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ اگر آجر کے کاروبار میں منافع کی گنجائش ہی بہت کم ہو یعنی زمین اور کل اصل مستعار ہو تو کساد بازاری کا وہ بہت کم متحمل ہو سکے گا اور جلد تباہ ہو جائے گا پس جبکہ عملاً منافع میں شرح اجرت وسود اس قدر تغیر پذیر ہو تو پھر ایسی شرح کا بازاری شرح سے اعلیٰ ہونا کیوں ضروری بتایا جاتا ہے اس سے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ کن وجوہات پر

حصہ سوم باب پنجم

کاروبار جاری کرتے وقت آجر لازماً اعلیٰ شرح کی امید باندھتا ہی اور بحالت کامیابی کس بنا پر آپ کو اعلیٰ شرح کا مستحق قرار دلیسکتا ہی۔

منافع حام کو مقابلہ کا آلہ اس وجہ سے کہا گیا کہ چونکہ وہ آجر کی جیب میں جاتا ہی اور کسی دوسرے کو ادا نہیں کیا جاتا۔ چند روز اس سے دست بردار ہوکر ایسے حریف کو میدان مقابلہ سے بہگانا دشوار نہیں کہ جس کو منافع حام کا کچھ سہارا نہ ہو اور کل مصارف پیدائش اس کو جیب سے نقد ادا کرنے پڑیں لیکن صاف ظاہر ہی کہ منافع خام کی عرصہ تک بار مقابلہ کا تحمل کو نہیں ہوسکتا زیادہ سے زیادہ ایک آدہ برس تک تو تلافی مستقبل کی امید پر منافع حام کوئی صبر کرسکتا ہی۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہی کہ سالہا سال کے واسطے کوئی اس سے ہاتھ دہو بیٹھے اس کا نتیجہ تو سراسر تباہی ہوگا مقابلہ جاری رکھہ سکنے کے عرصہ کا دار مدار بار مقابلہ اور مقدار منافع کی باہمی نسبت پر منحصر ہی اگر مقابلہ میں کم نقصان اٹھانا پڑے اور مقدار منافع حام کثیر ہو تو زیادہ عرصہ تک مقابلہ جاری رکھا جاسکتا ہی۔ ورنہ اسکا جلد خاتمہ کرنا ناگزیر ہوگا۔ ولیکن واضح ہو کہ ایسے مقابلہ کا منشا ہمیشہ حریف کی تباہی ہوتا ہی دوران مقابلہ میں تخفیف نرخ سے خریداروں کو جو کچھہ نفع ہو مقابلہ ختم ہونے کے بعد ممکن ہے کہ کامیاب کارخانہ کچھہ اجارہ کے زعم میں جس کی خاطر مقابلہ کیا گیا اور کچھہ نقصان مقابلہ کی تلافی کرنے کے واسطے نرخ بڑہا کر خریداروں سے کل منافع تلف شدہ مع سود وصول کر ڈالے۔ مقابلہ اور اجارہ سے ہم مبادلہ دولت کے تحت میں مفصل بحث کرینگے اسوقت منافع حام کا جداگانہ وجود تسلیم کرنے کی عملی سہولت اور علمی ضرورت واضح کرنے کے بعد منافع خالص پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جبکہ منافع حام کی مقدار غیر معین ہو اور اس میں بحد تخفیف ہوسکتی ہو تو منافع خالص کا ملنا معلوم چنانچہ اکثر علما معیشت کا خیال ہی کہ مقابلہ کے دباؤ سے نرخ گھٹتے گھٹتے مصارف پیدائش کے برابر آلگا ہی۔

کہ اگر زوجہ کو اپنے بلد مین لیجائے تو پانچسو روپیہ مہر دیگا اور اگر نہ لیجائے تو تین سو روپیہ دیگا بعدہ بلد شرک مین اوسکے لیجانے کا قصد کرے تو زوجہ پر اسکا قبول کرنا واجب نہوگا اور مہر زائد کے پانے کی مستحق ہوگی اور اگر بلاد اسلام مین لیجانیکا قصد کرے تو شرط لازم ہوگی اور اسمین تردد ہی نوان مسئلہ اگر کوئی شخص اپنی زوجہ پر طلاق باین واقع کرے بعد ازان اثناء عدہ مین اس سے عقد کرلے اور پھر قبل دخول طلاق دے تو زوجہ کو نصف مہر کا استحقاق ہوگا دسوان مسئلہ اگر زوجہ اپنے مہر کا نصف مشاع (غیر معین) شوہر کو ہبہ کرے پھر شوہر اوسکو قبل دخول طلاق دے تو شوہر کو نصف باقی کا استحقاق ہوگا اور زوجہ پر رجوع صحیح نہوگی خواہ مال مہر دین ہو یا عین اسلیے کہ زوجہ کا ہبہ اوسکے حق کیطرف منصرف ہوگا یعنے اوسی کے حق مین نافذ ہوگا) گیارھوان مسئلہ اگر کسی عورت سے دو غلامون پر عقد کرے بعد ازان اون دونون مین سے ایک غلام مرجائے تو شوہر کو زوجہ سے نصف غلام زندہ اور نصف قیمت غلام مردہ کا مطالبہ کرنا صحیح ہوگا بارھوان مسئلہ اگر نکاح مین خیار شرط کرلیا جائے تو عقد باطل ہوگا اور اسمین تردد ہی جسکا منشاء یہ ہو کہ زوجیت محقق ہونی چاہیے اسلیے کہ اوسکا مقتضی موجود ہوا اور خیار اوسمین متطرق (جاری) نہین ہوتا کیونکہ نکاح مین شائبہ عبادت ہے اور محض معاوضہ نہین ہے لہذا عقد صحیح ہونا چاہیے اور چونکہ بدون شرط مذکور عقد پر رضا نہین ہوئی اسواسطے باطل ہونا چاہیے اور اگر مہر مین خیار شرط ہو تو عقد و مہر و شرط صحیح ہوگی تیرھوان مسئلہ مال مہر محض عقد کیوجہ سے مملوک زوجہ ہو جاتا ہے پس اوسکو علی الاشہر قبل دخول بھی مہر مین تصرف کرنا صحیح ہے پس اگر قبل دخول طلاق واقع ہو تو نصف مہر شوہر کیطرف رجوع کریگا اور اگر زوجہ نے اپنا حق شوہر کو عفو کردیا ہو تو تمام مہر شوہر کا مال ہوگا اور اسیطرح

اجرت میں مزید تخفیف کرنے کے بجائے محنت کے ماحصل زاید کا ایک جزو اپنی طرف سے مزدوروں میں تقسیم کرے۔ چنانچہ شرکت منافع کے تحت میں اس تجویز کی تفصیل کیجا چکی ہے اور کہیں کہیں تجربتاً اس پر عملدرآمد بھی ہورہا ہے اور آجر و مزدوروں کے حق میں مفید ثابت ہوا ہے رہی شرح سود وہ بھی اصل کی پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے لیکن اگر اس سے بھی کم ہوسکے تو ایسی تخفیف صرف اضافہ اصل کی رفتار گھٹانے کے لحاظ سے قابل توجہ ہے اور بس مزید براں واقعات شاہد ہیں کہ معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ پس اندازی کی قابلیت و عادت بڑھنے سے اصل کا اضافہ سود کے لالچ سے روز بروز مستغنی ہوتا جاتا ہے۔ گویا تخفیف اُجرت کے برعکس تخفیف شرح سود سے کسی بڑی مضرت کا اندیشہ نہیں۔ اور منافع خالص کا جو حصہ پیداوار اصل کے ماحصل زاید سے مرکب ہو وہ معاشی لحاظ سے قطعاً بے ضرر اور ناقابل اعتراض ہے۔

اوپر کی کل بحث سے مترشح ہوتا ہے کہ ہم کاروباری دنیا میں دیرپا سکون فرض کرکے تمام اسباب پیدائش متعین قرار دے رہے ہیں۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ اوّل تو ایسے مفروضات بغیر کسی معاشی مسئلہ کی تحقیق محال ہے دوم کاروبار کے روزانہ ماہانہ اور سالانہ تغیرات نظر انداز کرکے جب ہم کسی طویل زمانہ مثلاً چالیس پچاس سال پر نظر ڈالتے ہیں تو کسی حد تک سکون و تعین کے مفروضات ضرور قرین حقیقت معلوم ہوتے ہیں لیکن جلد جلد جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ بھی اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلاف امید کبھی کاروبار کی حالت ایسی ابتر ہوجاتی ہے کہ منافع خام تک غائب ہوجاتا ہے۔ اور کبھی گرم بازاری کا یہ رورنبہ ہتا ہے کہ منافع خام سے بڑھکر منافع خالص نمودار ہونے لگتا ہے۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ منافع خالص اگر نمودار بھی ہو تو آجر کے ہاتھ کب آسکتا ہے

حصہ سوم
باب یکم

اُس وقت جبکہ آجر کو کسی نہ کسی شکل پر اجارہ حاصل ہو یعنی صرف وہی یا چند اور آجر بھی کوئی کاروبار چلاویں لیکن باہمی اتفاق سے پیداوار کی من مانی قیمت مقرر کریں۔ ایسی حالت میں مصارف پیدائش کی کل مدیں قیمت میں شامل کر کے اصل و محنت کی پیداوار کا ماحصل زاید یعنی منافع خالص بچا سکیں گے بلکہ مصارف پیدائش سے بھی قیمت بڑھا کر اگر منافع خالص میں اضافہ کر لیں تو عجب نہیں لیکن واضح ہو کہ ایسا اضافہ از حد مذموم اور عوام کے حق میں مضر ہوگا علاوہ بیش قیمت تعیشات کے جن کی خریدار دولتمندوں کی مختصر جماعت ہوتی ہے مایحتاج زندگی کی ارزانی و گرانی کا اثر کل لوگوں پر پڑتا ہے جن کی تعداد کثیر مزدوری پیشہ ہے اور جن میں سے اکثر غریب اور بہت سے متوسط الحال ہیں پس آجروں کا باہمی اتفاق کر کے اضافہ و منافع کی ہوس میں بیجا طور پر مصارف پیدائش سے زیادہ قیمت بڑھانا۔ جبر و تعدی نہیں تو اور کیا ہے۔ بہر حال اگر بیشی قیمت سے منافع میں ایسا اضافہ نہ بھی کیا جاوے تو بحالت اجارہ منافع خالص جو اصل و محنت کی پیداوار کے ماحصل زاید سے نمودار ہو بآسانی اپنی جیب میں رکھا جا سکتا ہے اسکے برعکس اگر آجروں میں مقابلہ ہو تو ہر ایک اپنے ہاں کی بکری بڑھاتے اور حریف کو زک دینے کی غرض سے قیمت میں یہانتک تخفیف کریگا کہ اگر منافع خالص نمودار ہوا بھی ہوگا تو تخفیف کی نذر ہو جائے گا اور قیمت مصارف پیدائش کے سطح پر آ رہی گی۔ آجر منافع خام پر قناعت کریگا بلکہ کبھی مقابلہ کے جوش میں بجوشی اسے بھی تخفیف کے ریلے میں بہادے تو عجب نہیں۔ چونکہ آج کل مقابلہ کا زور شور خیال کیا جاتا ہے لہذا نتیجہ منافع محض صفر قرار دیجاتی ہے

المختصر منافع کا مفہوم اس کی دو قسمیں اور منافع خالص نمودار ہونے اور آجر کے قبضہ میں آنے کی صورتیں یہ سب نکات حتی الوسع سلیس طور پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے

لیکن فی نفسہ منافع کے مفہوم اور ماہیت پر اسقدر جزوی اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ مبتدی حیران رہجاتا ہے حصہ سوم

(۳) اگرچہ اصل مستعار کا سود منافع سے خارج ہوتا ہے اور ذاتی اصل کے سود کے علاوہ جو باب ہشتم
بیشتر اجرت تنظیم از معاشی لگان ہوا اور پیر منافع خالص یعنی اصل و محنت کا ماحصل زاید شرح منافع
کل داخل منافع ہوتے ہیں۔ لیکن عام قاعدہ ہے کہ منافع کی شرح اس کل اصل کی نسبت سے
شمار کی جاتی ہے جو کاروبار میں لگا ہو خواہ وہ اصل مستعار ہو یا ذاتی یا ہر دو قسم کا
مثلاً اگر اصل کی مقدار ایک لاکھ ہو اور منافع کی پانچہزار تو شرح منافع ۵ فیصدی شمار
ہوگا۔ ذاتی اصل و زمین کا سود اور کرایہ اور اجرت تنظیم تو ایک خاص شرح سے تجاوز
نہیں کرسکتی منافع خالص کی بھی ایک حد ہے جو کاروبار میں ایک بلکہ نصف فیصدی سے
لیکر سو اور دو سو فیصدی تک شرح منافع میں حیران کن فرق پایا جاتا ہے اس کے درحقیقت
دو باعث ہیں اول اجرت تنظیم اور مقدار اصل کی باہمی نسبت دوم اصل کا مستعار ہونا
فرض کرو کہ ایک شخص بذریعہ ملازمت ۱ روپیہ ماہوار کما سکتا ہے اب اگر وہ بشرط
امکان کوئی ایسا کاروبار جاری کرے کہ جس میں ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ مستقل اصل
کی گنجائیش ہی نہو تو ظاہر ہے کہ جب اس کا گذر اسی کاروبار پر ٹھیرا تو علاوہ سود اصل وہ
۱۰۰ روپیہ ماہوار کی بچت بھی اسی کاروبار کے منافع سے نکالیگا۔ اس حالت میں علاوہ
سود۔ صرف اجرت تنظیم کی شرح اصل کی نسبت سے ۱۲ فیصدی پڑے گی۔ اب اگر
شرح سود ۵ فیصدی ہو اور اصل ذاتی ہو تو شرح منافع ۱۲۵ فیصدی ہوجائے گی اور
اگر اصل مستعار ہے تو سود منافع میں شمار نہوگا اور شرح منافع ۱۲۰ برقرار رہیگی اور اگر کچھ
منافع خالص ہے تو اسکے شامل ہونیکے بعد منافع خام کی شرح اور بھی بڑھ جائے گی۔
مشہور بات ہے کہ قصبات کے بساطی عطار نیواڑی اور پنساری جیسے دوکاندار
جو صبح سے شام تک دو دو چار چار پیسہ کا ہلکا سودا فروخت کرکے بمشکل چند روپیہ

حصہ سوم
باب پنجم

روں کا کاروبار چلاتے ہیں تھوک فروشی کے نرخ کے مقابلہ میں بھی بہت زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں اور کہنے کو شرح منافع بھی بہت اعلیٰ پاتے ہیں لیکن ایسا ہونا نہ کچھ عجیب نہ کاروبار والوں کے حق میں خاص طور پر مفید۔ ان کو درحقیقت منافع کی مجموعی مقدار سے غرض ہے۔ شرح خواہ کچھ ہی کیوں نہو اور اوپر کی مثال سے صاف ظاہر ہے کہ باوجود شرح اس قدر اعلیٰ ہونے کے مقدار منافع معمول سے زیادہ نہیں ہوتی اب یہ سمجھنا دشوار نہوگا کہ حلوائی نان بائی نقال جیسے خردہ فروشوں کی دکانیں اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں تو ہر ایک دکان کی مقدار فروخت گھٹنے سے نرخ اتنا بڑھ جائے گا اور باوجود اضافہ شرح اگر مقدار منافع میں تخفیف ہوجائے تو عجب نہیں دوکانداروں کے باہمی مقابلہ کا نتیجہ بالعموم تو تخفیف نرخ ہوتا ہے لیکن بعض صورتوں میں خود مقابلہ کا م اضافۂ نرخ کا باعث بنجاتا ہے۔ مقابلہ کی اس خلاف توقع خاصہ سے ہم مبادلہ دولت کے تحت میں مفصل بحث کرینگے ۔ جو چیزیں قیمتی ہوں اور باآسانی تھوک فروشوں کے ہاں سے منگائی جاسکیں انکی قیمت میں تو اضافہ دشوار ہے اور نہ ایسی چیزوں کی تجارت میں خردہ فروشی سرسبز ہوسکتی ہے لیکن جو چیزیں کم قیمت ہوں یا باسانی باہر سے نہ منگائی جاسکیں اُن کی تجارت میں چھوٹے چھوٹے دوکانداروں کی چڑھ بنتی ہے۔ خریدار یا تو بوجہ قلت مقدار اضافہ قیمت کی پروا نہیں کرتے یا بوجہ مجبوری اس کو گوارا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں خردہ فروشونکی دکانیں جس قدر بڑھیں گی قیمت بھی چڑھے گی اور گو فرداً فرداً بوجہ قلت مقدار اضافہ محسوس نہو لیکن بحیثیت مجموعی خریدار ضرور زیر بار ہوں گے اس توضیح کی روشنی میں اب صاف معلوم ہوجائے گا کہ بعض تجارتوں میں خردہ فروشی اس قدر کیوں مروج ہے اور بعض میں بہت کم اور کسی کاروبار میں ضرورت سے زیادہ لوگوں کی شرکت کسطرح حصہ شرکا اور عوام دونوں کے حق میں یکساں مضر ہے۔

مذکورالصدر مثال کے مقابلہ میں فرض کرو کہ جو شخص ۱۰۰ روپیہ ماہوار کی ملازمت پا سکتا ہو ایسا کاروبار جاری کرے کہ جس میں ۲۴ ہزار روپیہ سالانہ شغل اصل کی گنجائش ہو اس میں بھی وہ ۱۰۰ روپیہ ماہوار کاروبار کے منافع میں سے نکالیگا لیکن یہی اجرت تنظیم کی شرح اصل کی نسبت سے مثال اول الذکر میں ۱۲۰ فیصدی قرار پائی تھی اور یہاں صرف ۵ فیصدی یہ شرح میں تو زمین آسمان کا فرق ہے لیکن مقدار مجموعی وہی ایک ہے یعنی ۱۰ روپیہ ماہوار یا ۱۲۰ روپیہ سالانہ اور آجر کے حق میں نتیجہ یکساں۔ نیز فرض کرو کہ شرح سود ۵ فیصدی ہو اب اگر اصل مستعار ہے ہو تو منافع جس میں صرف اجرت تنظیم شامل ہو ۵ فیصدی رہیگا اور اگر ذاتی ہو۔ تو سود بھی شامل منافع ہو کر شرح تا مقدار ۱۰ فیصدی بڑھا دیگا۔ منافع خالص اسکے علاوہ رہا۔ چھوٹے چھوٹے کاروبار تو ذاتی سرمایہ سے چلتے ہیں۔ لیکن آج کل کے بڑے بڑے کارخانوں میں اور تجارتوں میں بالعموم کروڑہا روپیہ قیمتی اصل قرض لیکر لگاتے ہیں بالفاظ دیگر کہیں سود جزو منافع شمار ہوتا ہو کہیں نہیں ہوتا ہر دو مذکورہ بالا مثالوں پر غور کرنے سے یہ سمجھنا دشوار نہو گا کہ بالعموم بڑے کاروباروں میں مقابلہ چھوٹوں کے شرح منافع کیوں ادنیٰ ہوتی ہو شرح میں اس قدر فرق کیونکر ممکن ہو اور وہ کس طرح پر اجرت تنظیم اور اصل کی مقدار کی باہمی نسبت اور نیز اصل کے ذاتی یا مستعار ہونے سے متعلق ہو۔

اسی سلسلہ میں یہ نکتہ جتانا بھی ضروری ہو کہ آجر کو تو منافع کی مجموعی مقدار سے غرض ہو شرح جو دیگر اسباب پر منحصر ہو۔ خواہ اعلیٰ پڑے یا ادنیٰ۔ لیکن عوام یعنی خریداروں کا حال مختلف ہو۔ اصل ذاتی یا مستعار ہونے کے مطابق سود کے شامل یا خارج ہونے سے جو بیشی و کمی شرح منافع میں نمودار ہو اس کا نرخ اشیاء پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور

اسی لیے وہ خریداروں کے حق میں مفید نہ مضر۔ اس کے برعکس اگر اجرت تنظیم اور مقدار اصل کی موافق و ناموافق نسبت سے شرح میں تخفیف یا اضافہ ہو تو اس کا اثر بذریعہ ارزانی و گرانی نرخ اشیا عوام کے مالی مفاد پر اچھا خاصا پڑے گا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یوں تو اصل کی نسبت سے شرح منافع فیصدی سالانہ شمار کیا جاتا ہے لیکن شرح کی ایک اور قسم بھی قرار دی گئی ہے جو عملی لحاظ سے بہت قابل توجہ ہے اصل قائم تو عرصہ دراز تک عمل پیدائش سرانجام دیکر بشکل مطالبات زسود گی قسط وار واپس آسکتا ہے۔ لیکن اصل دائر جلد جلد بشکل قیمت پیداوار وصول ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر کسی کاروبار میں اصل دائر کی مقدار بہت زیادہ ہو اور وہ تیزی سے گھومتا رہے تو فی گردش شرح منافع ادنیٰ ہونے پر شرح سالانہ اعلیٰ ہوتی ممکن ہے۔ اور مقدار منافع بھی بہت زیادہ ہو سکتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص ۲۰ ہزار کا مال صرف ۱ فیصدی منافع پر ہر مہینہ ارزاں فروخت کرتا رہے تو گو شرح منافع فی گردش نہایت ادنیٰ ہے شرح سالانہ ۱۲ فیصدی آپڑے گی۔ اور مقدار منافع جو اصل مقصود ہے ۲۰ روپیہ ماہوار یا ۲۴۰ روپیہ سال ہوگی اس کے برعکس اگر کوئی کوتہ نظر تاجر زیادہ منافع کی ہوس میں صرف ۵ ہزار کا مال ۳ فیصدی کے منافع سے سال میں صرف دو مرتبہ فروخت کرے تو گو شرح منافع فی گردش ۳ فیصدی نظر آئے لیکن شرح سالانہ صرف ۶ فیصدی ہوگی اور مقدار منافع صرف ۲۵ روپیہ ماہوار یا ۳۰۰ روپیہ سالانہ۔ شرح فی گردش شرح سالانہ اور مقدار منافع کے مذکورہ تعلق سے ایک نہایت اہم اصول تحقیق ہوتا ہے کاروبار میں کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ قیمت گھٹا گھٹا کر بہت بہت سامال جلد جلد بسطر حیر فروخت کرے کہ نہایت ادنیٰ شرح فی گردش سے نہ صرف اعلیٰ شرح سالانہ ملے بلکہ منافع کی بڑی سے بڑی مقدار ہاتھ آوے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک کے کارخانے

سال میں کئی بار ½ بلکہ ¼ فیصدی منافع فی گردش کی شرح سے کروڑ ہا روپیہ قیمتی پیداوار فروخت کر کے لاکھوں روپیہ منافع اٹھا رہے ہیں لیکن معاشی پس ماندگی اور ناواقفیت کی بدولت ہمارے اکثر ہموطن کاروباری لوگ اس کے بالکل برعکس کوشاں رہتے ہیں یعنی شرح فی گردش اس قدر اعلیٰ چاہتے ہیں کہ بوجہ تاخیر فروخت شرح سالانہ بہت ادنیٰ رہجاتی ہے اور بوجہ قلت فروخت مقدار منافع اور بھی کچھ نہیں رہتی۔ گویا خود اپنے ہاتوں اپنے پیر میں کلہاڑی مار لیتے ہیں خریداروں کی آگاہی کے واسطے قیمت نقد کا نوٹس تو اکثر جلی حروف میں دکان پر آویزاں رہتا ہے لیکن کیا اچھا ہو کہ "منافع کم" کا زریں اصول دوکاندار اپنے دلوں پر نقش کر لیں۔ البتہ جہاں کمی منافع سے اضافہ فروخت کی گنجائش ہو وہاں تخفیف سے سراسر نقصان ہوگا لیکن ایسا شاذونادر ہوتا ہے بالعموم تخفیف منافع سے ارزانی پڑ جانے کا وہی نتیجہ ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

صاف ظاہر ہے کہ منافع کی شرح فی گردش بحوالہ اصل دائر شمار کی جاتی ہے اس شرح کا تجارت میں اس وجہ سے خاص طور پر رواج ہے کہ اس میں اصل کی بیشتر مقدار بشکل دائر ہوتی ہے چنانچہ تجارت کا مشہور گر منافع کم اور بکری زیادہ اسی شرح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ رہی صنعت و حرفت۔ اگرچہ اس میں اصل کی بڑی مقدار بشکل قائم ہوتی ہے لیکن تاہم شرح منافع فی گردش بحوالہ پیداوار اس میں بھی قرار پا سکتی ہے اور پاتی ہے۔

باب ششم
ترکیب عاملین پیدائش

تجزیہ (۱) تقسیم دولت کا خلاصہ (۲) قانون تقلیل حاصل (۳) قانون تقلیل و تکثیر و استقرار حاصل کا تعلق (۴) ترکیب عاملین کا اصول (۵) تنظیم کا ہر سہ عاملین سے تعلق (۶) ضروری نتائج

تقسیم دولت کا خلاصہ

(۱) ہر سہ عاملین پیدائش زمین محنت و اصل اور نیز محنت کی ایک خاص الخاص قسم تنظیم جس کی حیثیت کم و بیش ایک جداگانہ عامل پیدائش کی سی ہے۔ جو کچھ پیدائش دولت میں حصہ لیتے ہیں اور اُن کی کارگزاری کا جو معاوضہ ملتا ہے اوپر لگان۔ اجرت سود اور منافع کے تحت میں مفصل بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ تحقیق درپیش ہے کہ آیا ان عاملین کے ملکر کام کرنے کا کوئی اصول بھی ہے اور اگر ہے تو کیا۔ اس غرض کے لیے ہم اول ہر سہ قوانین پیدائش یعنی قانون تقلیل و تکثیر و استقرار حاصل کے مفہوم اور باہمی تعلق کی تشریح کر کے عمل پیدائش میں عاملین کی ترکیب مذکور الصدر قوانین سے متعلق ثابت کریں گے۔ علاوہ ازیں چند ضروری نتائج بھی اخذ کیے جاویں گے پس موجودہ بیان کو تقسیم دولت کے کل مذکور الصدر مباحث کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا بیجا نہ ہوگا۔

قانون تقلیل حاصل

(۲) زراعت کی بحث میں قانون تقلیل حاصل کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے لیکن

جیسا کہ ہم آگے چلکر واضح کریں گے اس قانون کا عملدرآمد پیدائیش کے کل شعبوں میں عام ہے اور زراعت تک محدود نہیں۔ اس قانون سے مراد یہ ہے کہ کسی کھیت میں محنت و اصل کے جرعے بڑہانے شروع کرو۔ اگر ابتک بیجذ نا کافی جرعے مستعمل تھے تو چند جدید جرعوں کی پیداوار سابق جرعوں کی پیداوار سے نسبتاً زیادہ ہونی ممکن بلکہ اغلب ہے اور اس حد تک زراعت قانون تکثیر حاصل کے تابع کھلائے گی لیکن جرعے بڑہاتے بڑہاتے بالآخر ایک ایسا جرعہ آئے گا کہ اُس کے مابعد جرعوں کی پیداوار نسبتاً گھٹتی چلی جاوے گی۔ گویا قانون تقلیل حاصل کا عمل شروع ہوگا۔ ایک مثال لو۔ بغرض سہولت ہم اوّل محنت و اصل کے جرعوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے فرض کرو کہ دس بیگہ زمین میں صرف ایک جرعہ لگایا جائے غالباً کچھ بھی پیدا نہو سکے گا اور جرعہ بھی اکارت جائیگا ۵ جرعوں سے کچھ تھوڑا بہت پیدا ہوگا۔ غالباً ۱۰ جرعوں کی پیداوار ۵ کی دوگنی سے بھی زیادہ ہوگی۔ اور اگر ۲۰ جرعوں کی پیداوار ۵ کی چوگنی یا دس کی دوگنی سے بھی زیادہ ہو تو عجب نہیں لیکن جدید جرعوں کی پیداوار میں اضافہ نسبتی کی بھی ایک حد ہے۔ غالباً چالیس جرعوں کی پیداوار بیس کی پیداوار سے دوگنی نہو سکے گی۔ ۸۰ جرعوں کی پیداوار بیس کی سے تقریباً سہ گنی رہے گی اور ۲۰۰ جرعوں کی پیداوار تو ۲۰ کی دس گنی سے بہت ہی کم غالباً ۶-۷ گنی ہوگی۔ ایسی حالت میں ۲۰ جرعوں تک تو قانون تکثیر حاصل کا اور بعدہ قانون تقلیل حاصل کا عملدرآمد شمار ہوگا۔ دس بیگہ زمین اور ۲۰ جرعوں کی نسبت جس کے بعد ہی قانون تقلیل حاصل کا عمل نمودار ہوتا ہے اصطلاحاً **نسبت اصلی** کہلائے گی۔

واضح ہو کہ اگرچہ قانون تقلیل حاصل کا ذکر بیشتر زراعت کے بیان میں آیا ہے اس کا عمل زراعت سے مخصوص نہیں۔ بلکہ صنعت و حرفت اور تجارت بھی

بھی یکساں اس کے تابع ہیں جس طرح پر کہ کسی کھیت میں محنت و اصل کے جرعوں کی ایک محدود تعداد استعمال کی جا سکتی ہے اور نسبت اعلیٰ سے تجاوز کرنے کا نتیجہ مزید حاصل میں بسبتاً بیش افزوں تخفیف ہوتا ہے بعینہ صنعت و حرفت اور تجارت میں کسی قطعہ اراضی پر محنت و اصل کے لاتعداد جرعے فراہم نہیں کیے جا سکتے۔ ہر کسی کارخانہ یا دوکان میں جس قدر آلات و مزدور سے کام لیا جا سکے یا مال رکھا جا سکے اس کی مقدار کم و بیش معین ہے اور مزید اضافہ کی حالت میں قانون تقلیل حاصل کا عملدرآمد یقینی فرق ہے تو صرف اس قدر کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت اور تجارت میں محنت و اصل کے بہت زیادہ جرعے ایک ہی رقبہ زمین پر کام کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسا فرق تو خود زراعت میں بھی بلحاظ فصل کم و بیش موجود ہے بعض چیزوں مثلاً تماکو آلو اور نیشکر کی کاشت میں بمقابلہ جوار باجرہ مکا جیسی فصلوں کی کاشت کے کہیں زیادہ جرعے لگتے ہیں علیٰ ہذا کم و بیش جرعے استعمال ہو سکنے کی گنجائش کا فرق صنعت و تجارت میں بھی عام ہے مثلاً بمقابلہ غلہ و آہن موتی جواہرات اور چاندی سونے کی تجارت میں ایک ہی قطعہ زمین پر صدہا گنا زیادہ اصل کے جرعے فراہم ہوتے ہیں۔ یہی حال بیش قیمت کلوں والے کارخانوں کا ہے۔ علیٰ ہذا بمقابلہ جولاہوں یا رنگریزوں کے بہت زیادہ موچی یا زرگر ایک ہی کارخانہ میں ملکر کام کر سکتے ہیں۔ یعنی کام کے مطابق ایک ہی قطعہ اراضی پر محنت کے جرعوں کی بھی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ لیکن جرعوں کی مقدار کا عاملین کی باہمی نسبت پر اثر پڑتا ہے قانون تقلیل حاصل کے عملدرآمد میں جرعوں کی کمی بیشی کسی طرح پر مارج نہیں ہوتی۔ پس ثابت ہوا کہ عاملین کی باہمی نسبت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور جیسا کہ ابھی بتا چکے ہیں ہر شعبہ پیدائش میں اس کی نسبت اعلیٰ ضرور مختلف ہوگی لیکن قانون تقلیل حاصل کا عملدرآمد پیدائش کے کل شعبوں پر

مسلط ہے۔ اب تک ہمنے زمین کا ایک مقرر قطعہ لے کر ماقی دو عاملین یعنی محنت و اصل کو قانون تقلیل حاصل کا پابند ثابت کیا۔ لیکن اگر محنت و اصل کے جرعوں کی مقدار معین فرض کر لی جائے تو زمین بھی اسی طرح مذکورالصدر قانون کے تابع نظر آئے گی فرض کرو کہ عاملین کی نسبت اعلیٰ حسب ذیل ہے۔

الف بیگہ زمین اور ب جرعہ محنت و اصل کی پیداوار = ی

ہدا ذیل میں چونکہ نسبت اعلیٰ میں تغیر ہو گیا۔

الف بیگہ زمین اور ب ل جرعہ محنت و اصل کی پیداوار ی سے زیادہ مگر ی ل سے کم

مگر ذیل میں چونکہ نسبت اعلیٰ برقرار ہے :۔

الف ل بیگہ زمین اور ب ل جرعہ محنت و اصل کی پیداوار = ی ل

آخری دو مثالوں کے مقابلہ سے واضح ہوگا کہ جبکہ مقدار جرعہ یکساں ب ل ہوا ور زمین الف بیگہ سے بڑھ کر الف ل بیگہ ہو جائے تو پیداوار میں ی سے زیادہ اور ی ل سے کم کوئی مقدار بڑھ کر ی ل ہو جائے گی۔ پس چوتھا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر مطابق نسبت اعلیٰ :۔

الف بیگہ زمین اور ب جرعہ محنت و اصل کی پیداوار = ی

تو :۔

الف ل بیگہ زمین اور ب جرعہ محنت و اصل کی پیداوار = ی سے زیادہ مگر ی ل سے کم

گویا جس طرح پر کہ محنت و اصل کے جرعے ایک قطعہ اراضی پر نسبت اعلیٰ کے بعد قانون تقلیل حاصل کی متابعت کرتے ہیں بعینہ زمین کے جرعے بھی محنت و اصل کے معین جرعوں کے ساتھ نسبت اعلیٰ کے بعد اسی قانون کے پیرو بجاتے ہیں محنت و اصل کی طرح زمین کے جرعوں کا پابند قانون تقلیل حاصل ہونا ہم ایک دوسری مثال سے بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک دس بیگہ والے کھیت میں اضافہ جرعونکا نتیجہ حسب ذیل ہے۔

جرعے	مقدار پیداوار
۱	×
۵	۵۰ من
۱۰	۱۵۰ من
۱۵	۲۷۰ من
۲۰	۳۸۰ من
۲۵	۴۵۰ من

۲۰ جرعوں کی دس بیگہ زمین میں پیداوار ۳۸۰ من اور اوسط پیداوار فی بیگہ ۳۸ من ہے اب اگر ۲۵ جرعے ۱۲½ بیگہ زمین میں لگائے جاویں تو چونکہ ۲۰ جرعہ اور دس بیگہ کھیت۔ اور ۲۵ جرعے اور ۱۲½ بیگہ کھیت میں نسبت یکساں ۲ اور ۱ کی ہے۔ دونوں حالت میں اوسط پیداوار فی بیگہ برابر ہوگا۔ اور وہ اوسط جبکہ ۲۰ جرعہ اور دس بیگہ کی پیداوار ۳۸۰ من ہے ۳۸ من فی بیگہ ہوا لہذا ۲۵ جرعے اور ۱۲½ بیگہ کی پیداوار ۴۷۵ من ہوگی لیکن ۲۵ جرعوں اور ۱۰ بیگہ کی پیداوار ۴۵۰ من ہے لہذا جدید ۲½ بیگہ کی پیداوار صرف ۲۵ من ہے۔ گویا جبکہ مقدار جرعہ وہی ۲۵ رہے۔ سابق ۱۰ بیگوں کا اوسط پیداوار ۴۵ من اور جدید ۲½ بیگہ کا صرف ۱۰ من بیگہ ہے گویا محنت واصل کی مانند زمین کے جرعے بھی قانون تقلیل حاصل کے تابع ہیں۔

اب تک ہم نے بغرض سہولت جرعوں میں محنت واصل کو یکجا شمار کیا لیکن درحقیقت یہ دونوں عامل جدا جدا بھی قانون مذکور کے اسی طرح پابند ہیں مثلاً اگر کاشت میں صرف محنت یا صرف اصل کے جرعے بڑھائے جائیں۔ تب بھی قانون تقلیل حاصل کا عمل نمودار

ہوگا۔ پس جبکہ ہر عامل اس قانون کا تابع ٹھیرا تو قانون مذکور کا ماحصل یہ نکلا کہ عمل پیدائش میں جبکہ عاملین کے باہم نسبت اعلیٰ قرار پا جائے ان میں سے کسی ایک یا دو کو بحال رکھکر اور باقی دو ایک میں اضافہ کرکے نسبت اعلیٰ متغیر کردیجائے تو جدید جرعوں اور اُنکی پیداوار کی نسبت بمقابلہ سابق جرعوں اور اُن کی پیداوار کے ادنیٰ ہوگی۔

حاصل کلام یہ کہ اگر نسبت اعلیٰ کے مطابق :-

الف زمین ب محنت اور ج اصل کی پیداوار = ی

تو :-

الف ل زمین ب محنت اور ج اصل کی پیداوار
الف زمین ب ل محنت اور ج اصل کی پیداوار
الف زمین ب محنت اور ج ل اصل کی پیداوار
الف ل زمین ب ل محنت اور ج اصل کی پیداوار
الف زمین ب ل محنت اور ج ل اصل کی پیداوار
الف ل زمین ب محنت اور ج ل اصل کی پیداوار

= ی سے زیادہ مگر ی ل سے کم

اوپر کی کل بحث سے ایک نتیجہ خیز واقعہ کا پتہ چلتا ہے۔ عمل پیدایش میں اگرچہ ہر سہ عاملین مختلف نسبتوں سے ملکر کام کرسکتے ہیں لیکن ان سب میں کوئی نسبت بلحاظ نسبت پیداوار بطور حد فاصل واقع ہوتی ہے اگر عاملین میں سے کسی ایک یا دو میں تخفیف یا اضافہ کرکے نسبت ردوبدل کردی جائے تو قانون تقلیل حاصل کے عمل جاری ہونے سے پیداوار میں باقی جرعوں کی پیداوار سے نسبتاً کمتر اضافہ ہوگا۔ نیز یہ بھی تحقیق ہوا کہ ہر عامل کی پیدا آوری سب کی باہمی نسبت پر منحصر ہے۔ جداگانہ معین نہیں ہوسکتی۔ علیٰ ہذا پیداوار کی نسبت بھی عاملین

حد سوم باب ششم قانون تقلیل وتکثیر واستقرار حاصل کا تعلق

کی باہمی نسبت کے ساتھ ساتھ متبدل ہوتی رہتی ہے اس کو کسی عامل سے نسبت مستقیم حاصل نہیں

(۳) قانون تقلیل حاصل کی جداگانہ تشریح کے بعد اب ہم اس کا باقی دو قانون تکثیر واستقرار حاصل سے تعلق دکھانا چاہتے ہیں فرض کرو کہ نسبت اعلیٰ کے مطابق :-

الف زمین ب محنت اور ج اصل کی پیداوار = ی

اب اگر ان کل عاملین میں برابر اضافہ کیا جائے مثلاً دوگنا سہ گنا۔ چہار گنا تاکہ صرف مقدار بڑھ جائے اور نسبت اعلیٰ برقرار رہے تو دو نتیجے ممکن ہیں :

الف ل زمین ب ل محنت اور ج ل اصل کی پیداوار = ی ل
یا
= ی ل سے زیادہ

نتیجہ اوّل جو بالعموم زراعت میں نمودار ہوتا ہے قانون استقرار حاصل کہلاتا ہے یعنی اگر نسبت صحیح یا اعلیٰ برقرار رکھتے ہوئے صرف عاملین کی مقدار بڑھائی جائے۔ تو پیداوار بھی اسی نسبت سے بڑھے گی۔ اور ہر صورت جزعوں اور پیداوار میں ایک ہی نسبت قائم رہے گی ۔

نتیجہ دوم جسکو قانون تکثیر حاصل کہتے ہیں عموماً صنعت وحرفت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اسکے اسباب استعمال مشین تقسیم کار اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کے تحت میں واضح کر چکے ہیں اس کا ماحصل یہی ہے کہ ہر سہ عاملین کی مقدار جس قدر بڑھے گی مزید پیداوار ماسبق جزعوں کی پیداوار کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ بڑھے گی ۔

پس صاف ظاہر ہے کہ قانون تقلیل حاصل عاملین کی **نسبت** سے متعلق ہے اور قانون استقرار وتکثیر حاصل عاملین کی **مقدار** سے یہاں یہ نکتہ جتانا ضروری ہے کہ قانون استقرار حاصل میں تو سابق نسبت اعلیٰ برابر قائم رہتی ہے۔ صرف عاملین کی مقدار میں بیشی ہوتی ہے۔ لیکن قانون تکثیر حاصل میں علاوہ اضافہ مقدار عاملین اُن کی سابق نسبت اعلیٰ

میں بھی ردوبدل ہونا ممکن بلکہ اغلب ہی مثلاً

الف زمین ب محنت اور ج اصل کی پیداوار = ی

اب اگر پیدایش قانون تکثیر حاصل کی پابند ہو تو ۔

الف ل زمین ب ل محنت اور ج ل اصل کی پیداوار = ی ل سے زیادہ لہذا : ۔

الف ل زمین ب ل محنت اور ج ل اصل کی پیداوار سے کچھہ کم = ی ل

آخری نتیجہ پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ بحالت قانون تقلیل حاصل وبحالت قانون تکثیر حاصل سابق نسبت اعلیٰ میں جو ردوبدل ہوتا ہی اُن میں ایک بین فرق ہے وہ یہہ کہ قانون تقلیل حاصل میں جو نسبت بدلتی ہی وہ صرف ایک یا دو عامل کے اضافہ سے لیکن قانون تکثیر حاصل میں جو نسبت بدلے گی وہ ہرسہ عاملین کے کم وبیش اضافہ سے یہاں یہہ نکتہ بھی جتاتا ضروری ہی کہ کبھی صرف ایک یا دو عامل کے اضافہ سے نسبت بدلنے کے باوجود بھی قانون تکثیر حاصل نمودار ہوتا ہی۔ چنانچہ کاشت میں اس کی مثال بیان ہوچکی ہی۔ لیکن یہہ وہ حالت ہی جبکہ نسبت اعلیٰ قائم نہوچکی ہو اس کے قیام کے بعد اگر قانون تکثیر حاصل ظہور پذیر ہوگا تو ہرسہ عاملین کے اضافہ سے۔ خواہ سابق نسبت اعلیٰ برقرار رہی یا جیسا کہ اکثر ہوتا ہی متبدل ہوجائے

حاصل کلام یہہ کہ نسبت اعلیٰ قائم ہونے سے قبل تو صرف ایک یا دو عامل کا اضافہ بھی قانون تکثیر حاصل نمایاں کرسکتا ہی لیکن ایسی نسبت قائم ہوجانے کے بعد صرف ایک یا دو عامل کے اضافہ سے قانون تقلیل حاصل نمودار ہوگا۔ لیکن ہرسہ عامل کے اضافہ سے قانون تکثیر حاصل پیدا ہوسکتا ہی اور عاملین کی جدید مقدار کی نسبت سابق نسبت اعلیٰ سے مختلف ہوسکتی ہی اور ہوتی ہی۔ لیکن جدید نسبت میں بھی ایک ایسی نسبت اعلیٰ قرار پاسکتی ہی کہ حسب سابق محض ایک یا دو عامل کے اضافہ سے

حد سوم / مابعد تیتم

اب بھی ویسے ہی ما قانون تقلیل حاصل نمودار ہو رہا قانون استقرار حاصل اس میں ایک ہی نسبت اعلیٰ برابر قائم رہتی ہے۔ صرف عاملین کی مقدار بڑھتی ہے اور پیداوار کی نسبت بھی بہر صورت برقرار رہتی ہے۔

واضح ہو کہ مقدار عاملین کے اضافہ سے ہمیشہ قانون تکثیر حاصل یا استقرار حاصل کا عمل لازمی نہیں۔ جیسا کہ ہم تنظیم اور دیگر عاملین کے تعلق کے تحت میں ظاہر کریں گے اضافہ مقدار کی بھی ایک حد ہے جس سے تجاوز کرنے کا نتیجہ قانون تقلیل حاصل کا ظہور ہو گا۔ گویا جس طرح کہ ہر سہ عامل کے باہم نسبت اعلیٰ ہوتی ہے تینوں عامل اور تنظیم کے درمیان بھی ایک ایسی ہی نسبت اعلیٰ پائی جاتی ہے۔

المختصر ہر سہ قوانین پیدائش کے باہمی تعلق کی مذکور الصدر بحث میں عاملین کی باہمی نسبت اور مقدار کے ردوبدل کی مختلف صورتیں اور نتائج واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اب ہم تقرر نسبت کے اصول دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

ترکیب عاملین کا اصول

(۴) ہر سہ عاملین مل جلکر جو عمل پیدائش میں حصہ لیتے ہیں۔ ان کی ترکیب کیونکر قرار پاتی ہے یا بالفاظ دیگر کس اصول کے مطابق عاملین کی باہمی نسبت قائم ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل واضح کیا جا چکا ہے نسبت اعلیٰ سے مراد عاملین کی ایسی ترکیب ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک یا دو میں اضافہ کیا جائے تو ان کی مزید پیداوار اور قانون تقلیل حاصل کے تابع ہو لیکن لگان کی بحث میں صاف بتا چکے ہیں کہ قانون مذکور کا عمل **مقدار** پیداوار کے معیار سے دریافت کرتے ہیں۔ اس کو قیمت پیداوار سے کوئی تعلق نہیں البتہ جرعہ مختتم ہمیشہ قیمت سے قرار پاتا ہے۔ قیمت جس قدر زیادہ ہو گی جرعہ مختتم قانون تقلیل حاصل کی حد سے آگے بڑھے گا۔ اگر قیمت گھٹے گی نتیجہ اس کے برعکس ہو گا جرعہ مختتم کو قیمت پیداوار مثل فٹ بال قانون مذکور کی حد کے کبھی اس طرف اور

کبھی اس طرف جھلکتی رہتی ہے۔ دراصل تو ماحصل زاید کی بڑی سے بڑی مقدار مطلوب ہوتی ہے نہ کہ صرف اعلیٰ سے اعلیٰ شرح۔ اور اس کی وجہ منافع کی بحث میں واضح کر چکے ہیں اور آیندہ بھی تنظیم کے سلسلہ میں بیان کریں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ ماحصل زاید کی سب سے اعلیٰ شرح تو قانون تقلیل حاصل کی ابتدائی حد پر قرار پاتی ہے لیکن ماحصل زاید کی سب سے بڑی مقدار جرعہ مختتم کی حد پر حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر سہ عاملین کو اُن کے جرعہ مختتم کی حد تک یکجا کر کے کام لینے میں سب سے زیادہ ماحصل زاید ہاتھ آئے گا۔ پس بلحاظ مقدار ماحصل زاید عاملین کی بہترین ترکیب وہ ہے کہ ہر ایک عامل اپنے جرعہ مختتم تک شامل ہو یعنی اُن میں سے ہر ایک کے آخری جرعہ کی پیداوار اس کی لاگت کے برابر ہو نہ کم نہ زیادہ۔ ایسی ترکیب میں عاملین کی جو نسبت قائم ہو وہ اصطلاحاً **نسبت مفید** کہلائے گی۔

جبکہ جرعہ مختتم کی لاگت اس کی پیداوار کی قیمت کے مساوی ٹھہری تو صاف ظاہر ہے کہ کوئی عامل جسقدر ارزاں ہوگا اس کا جرعہ مختتم بھی قانون تقلیل حاصل کی حد سے آگے بڑھا ہوگا اور جس قدر گراں ہوگا نتیجہ اس کے برعکس ہوگا چنانچہ ترکیب عاملین کا یہ عام قاعدہ ہے کہ ارزاں عامل کے حتی الوسع بیشتر جرعے اور گراں کے حتی الامکان کمتر استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً سو من غلہ دو طرح پر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ تھوڑی سی زمین پہ محنت و اصل کے بہت سے جرعے لگائے جاویں یا بہت سی زمین پر تھوڑے جرعے استعمال ہوں۔ اگر مقابلتہً زمین گراں ہے اور محنت و اصل ارزاں تو کاشت دقیق مفید ثابت ہوگی جس میں شرح پیداوار بمعیار زمین بہت اعلیٰ اور بمعیار محنت و اصل متوسط یا ادنیٰ ہوگی۔ لیکن اگر محنت و اصل مقابلتہً گراں ہو اور زمین ارزاں تو کاشت وسیع سے زیادہ منافع ہوگا جس میں شرح پیداوار بمعیار محنت و اصل بہت اعلیٰ اور بمعیار

حصہ سوم باب ششم

زمین متوسط یا ادنیٰ ہوگی۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی دس بیگہ کھیت کی کاشت کے نتائج حسب ذیل دریافت ہوں:-

جرعے	پیداوار	اوسطی جرعہ	اوسطی بیگہ
۵	۵ من	۱۰ من	۵ من
۱۰	۱۵ من	۱۵ من	۱۵ من
۱۵	۲۷۰ من	۱۸ من	۲۷ من
۲	۳۸۰ من	۱۹ من	۳۸ من
۲۵	۴۵۰ من	۱۸ من	۴۵ من
۳۰	۵۱۰ من	۱۷ من	۵۱ من
۳۵	۵۶۰ من	۱۶ من	۵۶ من
۴۰	۶۰۰ من	۱۵ من	۶۰ من
۴۵	۶۳۰ من	۱۴ من	۶۳ من
۵۰	۶۵۰ من	۱۳ من	۶۵ من

اب بعرض مثال اگر زمین کی اس قدر کثرت ہو کہ حسب ضرورت مفت مل سکے تو گویا صرف جرعوں کی لاگت مصارف کاشت میں شمار ہوگی۔ ایسی حالت میں اس دس بیگہ زمین پر ۲۰-۲۰ جرعے لگانے سے ماحصل زاید کی بیشترین مقدار ہاتھ آئے گی اور شرح پیداوار بمعیار جرعہ اعلیٰ ترین و بمعیار زمین ادنیٰ ہوگی۔ اس کے برعکس اگر جرعے مفت میسر آسکیں اور صرف زمین کا کرایہ مصارف کاشت میں شامل ہو تو دس بیگہ زمین پر بجائے ۲۰ کے ۵۰ جرعے یا بالفاظ دیگر ۲۵ بیگہ کے بجائے ایک بیگہ پر ۵ جرعے استعمال کرنے سے بیشترین ماحصل زاید حاصل ہوگا۔ شرح پیداوار بمعیار زمین نہایت اعلیٰ و بمعیار جرعہ ادنیٰ ہوگی لیکن

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو زمین مفت مل سکتی ہے نہ جرعے بالکل بے قیمت ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ مقابلتاً کہیں زمین گراں ہوتی ہے اور کہیں محنت و اصل۔ اسکے مطابق علی الترتیب کاشت دقیق و وسیع رواج پاتی ہے۔ مذکورالصدر مثال میں اگر قیمت جرعہ ۱۵ من ہو تو ۲۰ جرعے۔ ۱۳ من ہو تو ۲۵ جرعے۔ ۱۱ من ہو تو ۳۰ جرعے ۹ من ہو تو ۳۵ جرعے۔ ۷ من ہو تو ۴ جرعے۔ ۵ من ہو تو ۴۵ جرعے اور ۳ من ہو تو ۵۰ جرعے۔ استعمال کریںگے جن سے فزوں حاصل زاید ملے گا اس واقعہ سے دو نتیجے ثابت ہوتے ہیں اوّل یہ کہ ارزانی کے ساتھ عامل کی مقدار مستعمل بھی بڑھتی ہے دوم یہ کہ سرمایہ عاملین کو ان کے جرعہ مختتم تک استعمال کرنے سے بیشتریں ماحصل زاید حاصل ہوتا ہے۔

اب تک ہمنے زمین کی ایک معین مقدار یعنی دس بیگہ فرض کر کے قیمت جرعہ اصل و محنت کی کمی بیشی کا اثر جرعوں کی مقدار مستعمل پر ظاہر کیا۔ اب ان جرعوں کی ایک مقدار معین لو فرض کرو کہ کسی کاشتکار کے پاس ۵ جرعے ہیں جن کو وہ زراعت میں لگانا چاہتا ہے اب سوال یہ ہے کہ وہ کتنی زمین پر کاشت پھیلاوے گا۔ واضح ہو کہ ارزانی و گرانی حاصل کے مذکورالصدر اصول کے مطابق اس کے کھیت کا رقبہ کرایہ زمین کی کمی بیشی کے حساب سے وسیع اور مختصر ہوگا مذکورالصدر مثال میں ۴۵ جرعوں اور ۱۰ بیگہ زمین سے ۶۳۰ من پیداوار حاصل ہوئی۔ پس چونکہ ۴۵ جرعوں اور ۱۰ بیگہ میں نسبت وہی ہے جو ۵۰ جرعہ اور ۱۱ ۱/۹ بیگہ میں۔ لہٰذا اسی اوسط سے ۵۰ جرعوں اور ۱۱ ۱/۹ بیگہ کی پیداوار ۷۰۰ من ہوگی۔ لیکن ۵۰ جرعہ اور ۱۰ بیگہ کی پیداوار ۶۵۰ من ہے۔ لہٰذا جدید ۱ ۱/۹ بیگہ کی مزید پیداوار کل ۵۰ من یا ۴۵ من فی بیگہ ہوئی اب اگر کرایہ زمین ۴۵ من بیگہ سے زیادہ ہو تو ۱۰ بیگہ کی کاشت زیادہ مفید ہوگی۔ اور اگر ۴۵ من بیگہ سے کم تو ۱۱ ۱/۹ بیگہ کی۔ اب اگر کرایہ زمین گھٹتے گھٹتے ۴۰ من بیگہ سے بھی کم رہ جائے تو ۱۱ ۱/۹ بیگہ کے مقابلہ میں

۱۲ ½ بیگہ کی کاشت زیادہ مفید ثابت ہوگی ۴۰ جرعہ اور ۱۰ بیگہ و ۵۰ جرعہ اور ۱۲ ½ بیگہ کی نسبت مساوی ہے جبکہ ۴۰ جرعہ اور ۱۰ بیگہ کی پیداوار ۶۰۰ من ہے تو اسی حساب سے ۵۰ جرعہ اور ۱۲ ½ بیگہ کی پیداوار ۷۵۰ من ہوگی لیکن ۵۰ جرعہ اور ۱۰ بیگہ زمین سے ۶۵۰ من پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ لہذا جدید ۲ ½ بیگہ کی مزید پیداوار کل ۱۰۰ من یا ۴۰ من فی بیگہ ہوئی۔ کرایہ ۴۰ من بیگہ سے جسقدر گھٹے گا ۱۲ ½ بیگہ کی کاشت سے بیشتر ماحصل زاید ملے گا مندرجہ بالا مثال سے ایک نقشہ بنا کر درج ذیل کرتے ہیں جس سے واضح ہوگا کہ ۱۰ من سے لیکر ۴۵ من بیگہ کرایہ زمین تک ۵۰ جرعے زیادہ سے زیادہ کس قدر زمین پر استعمال ہوسکیں گے۔

تعداد بیگہ	مقدار پیداوار	مقدار اضافہ زمین	ماحصل مختتم فی بیگہ
۱۰	۶۵۰ من	۱ ۱/۹ بیگہ	۴۵ من
۱۱ ۱/۹	۷۰۰	۱ ۷/۱۸	۳۶
۱۲ ½	۷۵۰	۱ ۱۱/۱۴	۲۸
۱۴ ۲/۷	۸۰۰	۲ ۵/۲	۲۱
۱۶ ۲/۳	۸۵۰	۳ ۱/۳	۱۵
۲۰	۹۰۰	۵	۱۰
۲۵	۹۵۰		

اس نقشہ کے بنانے کا طریق مذکور الصدر دو مثالوں سے بخوبی واضح ہوگا جہاں بمقابلہ ۱۰ بیگہ کے ۱۱ ۱/۹ اور ۱۲ ½ بیگہ پر ۵۰ جرعہ استعمال کرنا۔ کرایہ زمین کی تخفیف کے ساتھ ساتھ زیادہ مفید ثابت کیا گیا ہے۔

بغرض سہولت ہم نے زراعت کی مثال پیش کی۔ لیکن واضح ہو کہ صنعت وحرفت کا

حصہ دوم
باب ہشتم

کی یہی حال ہے اگر محنت و اصل کے بجائے زمین و اصل کے جزے یکجا کرکے محنت سے مقابلہ کیا جاوے اور باری باری سے محنت کی مقدار او جزعوں کی مقدار معین فرض کرکے حسب طریق بالا کمی وبیشی قیمت جزعہ و محنت کا اثر اُن کی مقدار پر تحقیق کیا جائے تو بعینہ وہی نتیجہ برآمد ہوگا۔ علی ہذا تجارت میں بھی زمین و محنت کے جزعوں کا اصل سے مقابلہ کرنے پر یہی کیفیت نظر آئے گی۔ یہاں یہ نکتہ جتانا بے محل نہ ہوگا کہ زراعت میں زمین صنعت و حرفت میں محنت اور تجارت میں اصل کی کارگزاری مقابلۃً باقی عاملین سے عموماً بڑھی چڑھی ہوتی ہے اور پیدائش کے ان تینوں اہم شعبوں میں ان کے مخصوص عامل کے مقابل علی الترتیب محنت و اصل۔ زمین و اصل اور زمین و محنت کے جزے یکجا شمار کرنے سے بیان میں صفائی اور سہولت ہوتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عاملین کی ترکیب محض اتفاقی نہیں بلکہ ایک اصول کی پابند ہوتی ہے نسبت مفید میں ہر ایک عامل جزعہ مختتم کی حد تک شامل ہوتا ہے۔ اور مقابلۃً جو عامل جسقدر ارزاں ہوگا اس کی مقدار زیادہ اور جس قدر گراں ہوگا اس کی مقدار کمتر استعمال ہوگی لہذا کل پیداوار کی شرح ارزاں عامل کے معیار سے ادنیٰ اور گراں کے معیار سے اعلیٰ ہوگی۔

تنظیم کا ہرسہ عاملین سے تعلق

(۵) خواہ زراعت ہو خواہ صنعت و حرفت یا تجارت ہر شخص کسی کاروبار کی ایک خاص مقدار کا اہتمام اور نگرانی بطریق احسن کرسکتا ہے اور عمل پیدائش میں تنظیم کا جو رتبہ ہے اور پیداوار پر اس کا جس قدر اثر پڑتا ہے منافع کے تحت میں واضح ہو چکا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقدار عاملین اور تنظیم میں بھی نسبت اعلیٰ اور نسبت مفید قائم ہے نسبت اعلیٰ کی حد پہ عاملین کی ایسی ترکیب ہونی قانون تکثیر حاصل یا استقرار حاصل کا اثر درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے اس کے بعد نقص تنظیم بتدریج اس اثر کو زایل کرتا ہے حتیٰ کہ گویا ہرسہ عاملین کا مجموعی

حصہ سوم باب ششم

جزءِ مختتم بھی کاروبار میں لگجاتا ہے۔ یہی نسبت مفید کی حد ہے۔ اس کے بعد یا تو کاروبار کی توسیع روک دی جاتی ہے۔ یا نسبت مفید برقرار رکھنے کی غرض سے تنظیم میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ کاروبار ایک حد تک تو موجودہ تنظیم میں بڑھ سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر مقدار تنظیم میں بھی مناسب اضافہ نہ کیا جائے تو کاروبار میں بوجہ قلتِ اہتمام و نگرانی ابتری پھیلکر بجائے نفع کے نقصان ہونے لگتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ترکیب عاملین میں ان کی مقدار کا اضافہ لامحدود ہو کر قانون تکثیر حاصل یا استقرار حاصل کا تابع نہیں ہوسکتا بلکہ اس اضافہ پر بھی مقدار عاملین اور تنظیم کی نسبت نے ایک حد قائم کردی ہے جس سے تجاوز کرنے پر قانون تقلیل حاصل پھر نمودار ہوتا ہے حتی کہ عاملین کا مجموعی جزءِ مختتم مزید اضافہ کو قطعاً بند کر دیتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے جبکہ کوئی کاشتکار، آجر یا تاجر مزید کاروبار سنبھال نہ سکنے کے خوف سے اس کی توسیع روکدے اور موجودہ مقدار پر قناعت کرنا اپنے حق میں سب سے بہتر سمجھے

یہاں نکتے قابل توجہ معلوم ہوتے ہیں اول یہ کہ حسب طرح حسب شعبہ پیدائش عاملین کی مختلف مقداریں یکجا ہوتی ممکن ہیں مثلاً بمقابلہ زراعت کے صنعت میں محنت و اصل کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور زمین کی کم۔ تجارت میں اصل کی مقدار سب پر غالب ہوتی ہے۔ اسی طرح پر بلحاظ نوعیت کاروبار عاملین اور تنظیم بھی مختلف مقداروں میں ترکیب پاتے ہیں بالعموم ایک ہی مقدار تنظیم کے ساتھ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں عاملین کی بیشتر مجموعی مقدار مل سکتی ہے اور تجارت میں سب سے زیادہ۔ لیکن جیسا کہ عاملین کی باہمی نسبت کے سلسلہ میں سمجھایا جاچکا ہے مقدار کی کمی بیشی کا صرف نسبت پر اثر پڑتا ہے اس سے قانون تقلیل حاصل کے عمل میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس سے قبل قانون تقلیل حاصل کا ہر سہ عاملین کی نسبت اعلیٰ

حصہ سوم باب ششم

کے بعد ایک یا دو عامل کے اضافہ سے نمودار ہونا بیان کیا گیا تھا لیکن یہاں پر معلوم ہوا کہ ہر سہ عاملین اور تنظیم کی نسبت اعلےٰ کے بعد تینوں عاملوں کے اضافہ سے بھی قانون مذکور ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ پس تحقیق ہوا کہ قانون تقلیل و تکثیر حاصل حسب حالات یکساں دو طرح پر نمودار ہو سکتے ہیں کبھی صرف ایک یا دو اور کبھی تینوں عاملوں کے اضافہ سے۔

تنظیم ایک اور لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے۔ اس سے قبل جتایا جا چکا ہے کہ کاروبار میں حاصل زاید کی اعلیٰ شرح اس قدر مطلوب نہیں ہوتی ہے جتنی کہ اس کی مقدار کلی کی زیادتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نسبت اعلیٰ کے بجائے نسبت مفید۔ عاملین کی ترکیب میں قائم کی جاتی ہے اور قانون تقلیل حاصل کی ابتدائی حد کے بجائے جرعہ مختتم پر کاروبار کی توسیع روکی جاتی ہے اس واقعہ کی بنا ہی تنظیم ہے۔ مثلاً کسی کھیت میں نسبت اعلےٰ کے مطابق ۱۰۰ روپیہ قیمتی جرعے استعمال ہونے سے ۴۰۰ روپیہ قیمتی پیداوار حاصل ہو اور نسبت مفید کے مطابق ۳۰۰ روپیہ قیمتی جرعوں سے صرف ۷۰۰ روپیہ قیمتی پیداوار ملے شرح حاصل زاید تو بحالت اوّل اعلیٰ ہے۔ یعنی سہ گنی لیکن مقدار حاصل زاید بحالت دوم زیادہ ہے۔ یعنی اوّل سے دوگنی (۴۰۰ - ۱۰۰) کے مقابل میں (۷۰۰ - ۳۰۰) گویا جبکہ **شرح** حاصل زاید بمعیار جرعہ اعلیٰ ہے تو اجرت تنظیم اور منافع صرف ۲۰۰ روپیہ ہے اور جبکہ **مقدار** زیادہ ہے تو ۴۰۰ روپیہ تنظیم اور عاملین پیدائش کی کمی بیشی کا تعلق منافع کے تحت میں بھی واضح کر چکے ہیں۔ عاملین کی کثرت اجرت تنظیم اور منافع کے حق میں بہت مفید ہے اور اُنکی قلت بیحد مضر۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی عاملین کی مقدار بڑھانے اور جرعہ مختتم تک کاروبار جاری رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب ہو کر اعلیٰ اجرت تنظیم اور بہت سا منافع پاتا ہے۔

پس واضح ہوا کہ مقدار عاملین کے اضافہ اور جرعہ مختتم کے استعمال کا حقیقی باعث اجرت تنظیم اور منافع ہے۔

حصہ سوم باب ستم حد درجی نتائج

(۶) زمین کی مقدار تو ہر ملک میں محدود ہے اضافہ اصل بھی چند خاص حالتوں میں ممکن ہے لیکن آبادی برابر بڑھتی رہتی ہے اور اضافہ محنت کی ہر ملک میں بہت گنجائش ہے۔ اب اگر آبادی بڑہے اور اصل نہ بڑہے یا کم بڑہے تو کاروبار کا بیشتر بار زراعت پر آپڑیگا اور قانون تقلیل حاصل زراعت میں محنت کی پیداوار گھٹاتے گھٹاتے شرح اجرت نہایت نیچے ادنی کر کے مزدوروں کو مفلس و خستہ حال بنا دیگا۔ چنانچہ اکثر پس ماندہ ممالک اور ہندوستان بعض دور افتادہ حصص میں یہی کیفیت نظر آتی ہے۔

لیکن اگر صرف اصل بڑہے یا آبادی و اصل ساتھ ساتھ بڑہیں تو زراعت ترک ہو کر صنعت و حرفت کا زیادہ رواج ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ زمین جو زراعت کی بنا ہے رقبہ میں محدود ہے اس پر طرہ یہ کہ زراعت میں قانون تقلیل حاصل کا عملدرآمد جلد شروع ہو جاتا ہے اور اس میں قانون تکثیر حاصل سے بہت کم فایدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اسی وجہ سے بہت زیادہ محنت و اصل کی اس میں کھپت نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اصل جو صنعت و حرفت کی روح رواں ہے انسانی کوشش سے بہت کچھ بڑہ سکتا ہے اور بڑہ رہا ہے مزید براں صنعت و حرفت میں اول تو قانون تقلیل حاصل کی ابتدائی حد دور واقع ہوتی ہے۔ پھر قانون تکثیر حاصل بھی موقع بموقع اس کا زور توڑتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں محنت و اصل کی بہت زیادہ مقدار شریک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ یورپ و امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں جہاں آبادی بھی گھنی ہے اور اصل کی بھی کثرت ہے زراعت کے مقابل صنعت و حرفت بہت عروج پا رہی ہے۔ آج کل کے پس ماندہ اور ترقی یافتہ ممالک کا سب سے بڑا امتیازی فرق اصل کی قلت و کثرت ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ پیداوار خام کی بہم رسانی اور خصوصاً زراعت پس ماندہ ممالک کے سپرد ہے اور مصنوعات کی تیاری اور بالخصوص صنعت و حرفت ترقی یافتہ ممالک نے

سنگوارکھی ہے۔ اوّل الذکر ممالک میں مزدور مفلس اور آخر الذکر میں مقابلۃً خوشحال ہے۔ امید ہے کہ مندرجہ بالا مباحث سے مختلف ممالک کے معاشی حالات سمجھنے اور اُن کی توجیہ کرنے میں ضرور مدد ملے گی۔

حصّہ سوم
باب ششم

ترکیب عاملین کا مضمون درحقیقت نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے۔ اعلیٰ درجہ کے انگریزی مصنفین میں سے بھی بہت کم نے اس کو واضح کرنے اور سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ تازہ ترین تحقیق کا ماحصل ہے۔

باب ہفتم

دولتمندی و افلاس

تحریہ (۱) سوشیلزم یا اشتراک کا مفہوم (۲) اشتراک کی تشریح و تنقید (۳) تقسیم دولت کی موجودہ حالت (۴) تجاویز اصلاح (۵) اشتراک سرکاری

سوشیلزم یا اشتراک کا مفہوم

(۱) کچھ عرصہ سے ایک تحریک کا کل ترقی یافتہ ممالک میں بہت چرچا ہورہا ہے اور اُس کے حامیوں کی جماعت اور سرگرمی بھی روز بروز بڑھ رہی ہے اس کا مشہور عالم نام سوشیلزم ہے جس کو ہم **اشتراک** سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ محض ایک اخلاقی اور معاشی مسئلہ مانا جاتا تھا لیکن اب اس پر سیاسیات کا بھی گہرا رنگ چڑھ رہا ہے حتیٰ کہ نیابتی حکومتوں کے انتخابات میں بھی اس کا اثر دخل پانے لگا ہے۔ بحث یہ ہے کہ موجودہ معاشی ترقیات کا بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کی مالی حالت پر کیا اثر پڑا۔ ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ ان ترقیات کی بدولت زمیندار، اصل دار اور آجروں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تو بیجا طور پر ازحد دولتمند بن گئیں اور انسانوں کا سب سے بڑا گروہ یعنی مزدور لوگ اور بھی مفلس اور خستہ حال ہوگئے۔ گویا جماعت قلیل کی مرفع الحالی اور گروہ کثیر کی تنگدستی ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہے موجودہ معاشی ترقیات کو ایک نہایت موٹی آہنی میخ سے تشبیہ دیجاتی ہے جو کسی چوبی ستون کی چوٹی کے قریب اندر ٹھونکنے سے چھوٹے بالائی حصہ کو اوپر اٹھائے اور نیچے والے بڑے حصہ کو اور بھی دبائے اور جتنی ہی زیادہ اندر گھسے ان دونوں حصوں میں بُعد اور علیحدگی بڑھا دے حضرت اکبر نے بھی اس دعوے کو یوں پیش کیا ہے۔

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے   اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہونگا

حصہ سوم باب ہشتم

اس دعوے کی علمی توجیہ و تائید میں یہ بھی ثابت کیا جاتا ہے کہ زمیندار، اصل دار اور آجر کی مختصر جماعتوں کی آمدنی نہ صرف از حد زیادہ بلکہ سراسر غیر مکتسب اور ناجائز بھی ہے۔ یعنی وہ آمدنی غریب مزدوروں کے گروہ کثیر کی کمائی میں سے غصب کر لی جاتی ہے۔ گویا تقسیم دولت کے مروجہ طریق کے مطابق ایک لوٹ اور اندھیر مچا ہوا ہے۔ دولت مندوں کی مختصر جماعت غریبوں کی کمائی کا بڑا حصہ غصب کر کے خود تو لطف و عیش اڑاتی ہے اور باقی سب کی زندگی تلخ اور ناقابل برداشت بنا رہی ہے۔ اس افسوسناک حالت کی اصلاح کے واسطے گوناگوں تدابیر و تجاویز پیش کی جاتی ہیں جن میں سے بعض انتہائی قسم کی ہیں مثلاً یہ کہ جو موجودہ مالکوں سے کل زمین اور اصل چھین کر کل قوم کی مشترک ملک قرار دیئے جاویں اور ہر شخص صرف اجرت کما کر زندگی بسر کرے گویا سب مزدور بن جاویں۔ زمیندار، اصل دار اور آجر کوئی باقی نہ رہے۔ اور بعض معتدل ہیں۔ مثلاً سرکاری قوانین کی مدد سے بیجا آمدنیوں کو روکا جائے۔ تقسیم دولت میں حتی الامکان مساوات پیدا کی جاوے اور مزدوروں کو ہر قسم کی دست برد سے محفوظ رکھا جاوے۔ تجاویز اصلاح کے اختلافات کی بنا پر یوں تو اس تحریک کی متعدد انواع قرار پا چکی ہیں۔ لیکن دو قسمیں بہت مشہور اور ممتاز ہیں **اشتراک انقلابی** جس میں انتہائی قسم کی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا جائے اور **اشتراک ارتقائی** جس میں معتدل تدابیر کے ذریعہ سے بتدریج اشتراک کے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاوے۔ مسئلہ سوشیلزم یعنی اشتراک کی تفصیل نہایت طویل اور پیچیدہ ہے جس کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے یہاں پر ہم اس کے خاص خاص اور اہم نکات مختصراً بیان کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اس تحریک کا عام مفہوم تو اوپر بیان ہو چکا اب اس کی مزید تشریح ضروری تنقید کے ساتھ پیش کی جاتی ہے تاکہ اگر کامل استحضار حاصل نہ ہو سکے تو ایک سادہ خاکہ ہی

حصہ سوم
مات ہفتم
اشتراک
کی
تشریح
و تنقید

پیش نظر ہو جاوے اور امید ہی کہ اتنی معلومات بھی اشتراکی بحث مباحثہ سمجھنے میں قابل قدر حد تک مفید ثابت ہو گی ۔

(۳) اول اشتراکین کے ان معاشی اصول کو لیجیے جن کی رو سے زمیندار اصل دار اور آجر کی آمدنی یعنی لگان سود اور منافع غیر مکتسب اور مزدور کی اجرت کا غصب شدہ حصہ ثابت کیا جاتا ہی وہ اصول دو ہیں اوّل یہ کہ صرف محنت ہی قدر و قیمت کی بنا ہی یعنی ہر چیز میں قدر و قیمت محض اس محنت سے پیدا ہوتی ہی جو اس کی تیاری میں صرف ہو کسی چیز کی قدر و قیمت میں زمین اصل اور تنظیم کا کوئی حصہ نہیں ہوتا ۔ جو کچھہ ہوتا ہی وہ مزدور کا کرا دھرا ہوتا ہی اور وہی کل پیداوار یا یوں کہئے کہ پیداوار کی کل قدر و قیمت کا مستحق ہوتا ہی ۔ زمیندار اصل دار اور آجر کو نہ اپنا حصہ بانٹیں دوم اجرت جو مزدور کو ملتی ہی لازماً تاگزیر ما یحتاج زندگی کے مساوی ہوتی ہی ۔ دوسرے چیرہ دست طبقے جو مزدوروں پر حاوی ہو گئے ہیں اُن کو اس سے زیادہ اجرت نہیں دیتے ۔ نتیجہ یہ ہی کہ پیداوار یا اس کی قدر و قیمت کا ایک قلیل جزو پر تو مزدور کو قناعت کرنی پڑتی ہی اور باقی پیداوار یا اس کی قدر و قیمت کو جو اصطلاحاً **قدر زاید** کہلاتی ہی قابو یافتہ طبقے بطور لگان سود اور منافع خود ہتیا لیتے ہیں ۔ غریب مزدور جو سب کچھہ پیدا کرتا ہی منہ تکتا رہ جاتا ہی ۔ حاصل کلام یہ کہ تنہا مزدور سب کچھہ پیدا کرتا ہی ۔ لیکن پیداوار میں دوسرے طبقہ بھی شریک ہو جاتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ غریب مزدور کو بہت تھوڑا حصہ دیتے ہیں ہر دو اصول اصطلاحاً حسب ترتیب مسئلہ **قدر زاید** اور مسئلہ **اجرت فنڈ** کہلاتے ہیں ۔ تو ان کی بہت زور شور سے منادی کی گئی اور پر جوش مویدوں کے رعب میں آکر لوگوں نے ان اصولوں کی صحت میں بھی چون و چرا نہیں کیا لیکن بالآخر طلسم ٹوٹ گیا اور لطف یہ ہی کہ جن علمائے معیشت نے عمر بھر نہایت شد و مد سے ان اصولوں کی

تلقین کی۔ خود اُن پر جب نقص و خامی نمایاں ہوئی تو نہایت اخلاقی جرأت سے کام لیکر ان میں سے بعض نے خود اُن کی عدم صحت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ اپنی طرف سے اعلان بھی کرا دیا۔ اس معاملہ میں مشہور عالم فلاسفر **مل** کا طرزِ عمل خاص طور پر قابل ستائش و یادگار ہے کہ مدتوں مسئلہ اجرت فنڈ کا سخت حامی رہا اور جب لکتہ معروف ہمعصروں نے اس مسئلہ کی خامیاں واضح کیں تو نہایت صداقت پسندی سے اس مسئلہ سے اپنی دست برداری کا صاف اعلان کر دیا مسئلہ **قدر زائد** کا بھی اس کے اکثر مویدوں کے ہاتھوں یہی حشر ہوا اور اب یہ مسائل صرف معیشت اور بالخصوص تحریک اشتراک کی تاریخ میں دلچسپ و سبق آموز یادگار مانے جاتے ہیں بلحاظ صحت و استدلال وہ تقریباً از کار رفتہ ہیں۔

تقسیم دولت کے اصول اس سے قبل بالتفصیل بیان ہو چکے ہیں مسئلہ قدر و قیمت سے مبادلہ دولت کے تحت میں بحث کی جائے گی۔ ان بیانات سے مقابلہ کرنے پر اشتراکیین کے ہر دو مذکورہ بالا اصول کی خامی اور تنگی کا خوب اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ بھی بخوبی ثابت ہو جائیگا کہ پیدائش دولت کے واسطے زمین، اصل اور نیز تنظیم اسی قدر ضروری ہیں جتنی کہ محنت۔ کسی کا کسی پر فوقیت کا دعوی کرنا بے معنی ہے۔ سب ناگزیر ہیں اور یہ دعوی کہ کل پیداوار صرف محنت کا نتیجہ ہے اگرچہ تائید کے جوش میں معقول نظر آیا ہو لیکن درحقیقت مضحکہ خیز ہے۔ جہانتک جواز کا تعلق ہے لگان، سود اور منافع پیداوار کے ایسے ہی جائز حصے ہیں جیسے کہ اجرت۔ وہ کسی طرح پر اجرت کے غصب شدہ حصے نہیں شمار ہو سکتے۔ اب رہا یہ سوال کہ لگان سود اور منافع کے مالک کون بنے چاہئیں آیا خود مزدور ہی زمیندار اصل دار اور آجر بھی ہوں یا آخر الذکر طبقے مزدوروں سے جداگانہ رہیں۔ اور بہر دو صورت عام مرفع الحالی پر کیا اثر پڑیگا اور بلحاظ بہبودی کافتہ الناس کون صورت بہتر اور قابل ترجیح ہونی چاہیئے۔ یہ ایک دوسری بحث ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے۔

حصہ سوم باب ہشتم

زمینداروں ۔ اصل داروں اور آجروں کی دولتمندی تو ہر کسی کو تسلیم ہے اور اشتراکیئن کو اسی کا قلق اور شکایت ہے۔ فیصل طلب امر یہ ہے کہ مزدوروں کی مالی حالت بمقابلہ سابق کے اب کیسی ہے آیا وہ بقول اشتراکیئن روز افزوں افلاس کا شکار ہو رہے ہیں یا وہ بھی بہ نسبت اپنے آباؤ اجداد کے زیادہ آسودہ اور خوشحال بن گئے ہیں۔ یہاں پر افلاس و خوشحالی کی مختصر تشریح ضروری اور برمحل معلوم ہوتی ہے کسی طبقہ کے مفلس ہو جانے کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو بہ نسبت سابق کمتر ضروریات میسر آئیں اس کے کمتر افراد کو سابق کی کل ضروریات حاصل ہوں اس کے برعکس خوشحالی سے مراد یہ ہے کہ بہ نسبت سابق بہت زیادہ ضروریات پر دسترس ہو یا زیادہ بڑی جماعت کو سابق کی ضروریات حاصل ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مالی حالت کے وہ کیا قابل عمل معیار ہو سکتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم کو کسی طبقہ کے خوشحال یا مفلس ہونے کا بآسانی پتہ چل سکے۔ دولت مندی و افلاس کے مذکور الصدر مفہوم سے معیار کا صاف پتہ چلتا ہے اول کسی طبقہ کی تعداد دوم اس کی ضروریات۔ اگر دونوں میں اضافہ ہو تو خوشحالی یقینی ہے اگر کمی ہو تو افلاس میں کچھ شک نہیں ہو سکتا۔ نیز تعداد میں تخفیف اور ضروریات میں سکون یا تعداد میں سکون اور ضروریات میں کمی۔ دونوں افلاس کی علامت ہیں۔ اسی طرح پر تعداد کے اضافہ اور ضروریات کے سکون یا تعداد کے سکون اور ضروریات کے اضافہ سے خوشحالی کا پتہ چلتا ہے

علاوہ ازیں کسی طبقہ کے اوسط اموات (ور اوسط عمر سے بھی اس کی مالی حالت پر قابل لحاظ روشنی پڑتی ہے۔ انگلستان جیسا ملک اس فیصلہ طلب امر کی تحقیق کیواسطے کہ آیا معاشی ترقیات سے طبقہ مزدوران میں افلاس بڑھ رہا ہے یا مرفعہ الحالی دو وجہ سے نہایت موزوں ہے۔ اول تو وہاں جدید معاشی ترقیات کا خوب دور دورہ ہے

دوم وہاں ملکی اور غیر ملکی ہر قسم کی پیداوار جو صرف میں آئے بڑے اہتمام سے درج رجسٹر کی
جاتی ہے جس سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی طبقہ کی ضروریات میں تخفیف ہو رہی ہے
یا اضافہ۔ نیز پیدائش فوتی اور صحت کے متعلق وہاں کی سرکاری یادداشت بہت زیادہ
قرین صحت اور مکمل ہوتی ہے اگرچہ اعداد و شمار سراسر درست اور قابل اعتماد بھی نہیں تاہم ان سے
مالی حالت کا مذکورہ بالا اصول کے مطابق ضروری حد تک اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ دوم
ان سے زیادہ معتبر کوئی دوسرا معیار بھی میسر نہیں آسکتا۔ پس ہم کو انہی ذرائع پر قناعت
کر کے اُن سے جو معلومات حاصل ہوں اس پر مالی حالت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنی چاہیے
اعداد و شمار موجود ہیں۔ ان سے صرف یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ بہ نسبت سابق مزدوری
پیشہ عوام کی مالی حالت کہیں بہتر ہے اور روبہ ترقی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا
اشتراکیئن سراسر بیخبر تھے یا اُن کو دھوکہ دہی منظور تھی کہ افزونی افلاس کا انھوں نے
بے بنیاد شور مچا دیا اس کی کئی ایک وجوہات ہیں اوّل تو یہ کہ اتفاق سے اشتراک
کے پرجوش موید معاشی انقلاب کے دوران میں پیدا ہوئے اور عارضی مگر نہایت
قوی اثرات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اُن کو مستقل قرار دیدیا یہ سچ ہے کہ
گزشتہ صدی میں مزدوری پیشہ طبقوں پر بڑا نازک وقت گزر گیا اور زمیندار اصل دار
اور آجروں کے طبقہ نے وہ عروج پایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ نت
نئے انجن اور کلیں ایجاد ہوئیں، کارخانے جاری ہوئے۔ کلوں کی بدولت اصل کا دور
بندھا۔ مزدور آجروں کے دست نگر بن گئے۔ ایک طرف تو ہزارہا مزدور بیکاری
میں مبتلا ہوئے۔ دوسری طرف کارخانے والے دنیا کی دولت سمیٹنے لگے۔ جو مزدور
کام سے بھی لگے تھے سرکاری نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے کارخانوں میں اُن کی صحت
و اخلاق کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کارخانہ دار گویا آقا تھے اور مزدور اُن کے غلام

یہ کمانے اور وہ لطف اُڑاتے تھے۔ مگر آدمی کے جھونکے کی مانند یہ حالات چند روزہ تھے۔ رفتہ رفتہ جب لوحہ ارزانی پیدا وار صنعت و حرفت نے ترقی پائی تو بیکاری کی شکایت بھی بہت کچھ رفع ہونے لگی اور بہ نسبت سابق صدہا گنے مزدور کاروبار سے لگ گئے۔ ایک چھاپہ کی ایجاد کو لو آج کروڑہا لوگ پریسوں میں ملازم ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس ایجاد بغیر موجودہ تعداد کا عشر عشیر بھی کتابت کرکے روٹی کما سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اوّل اوّل کلوں کی ایجاد سے مزدوروں پر ضرور بیکاری کی مصیبت طاری ہوئی ہے۔ لیکن صنعت و حرفت متعلقہ کی مابعد ترقی سے یہ شکایت بتدریج رفع ہو کر بالآخر کلوں ہی کے طفیل سے مزدوروں کی مانگ اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بہت زیادہ لوگ روزی کمانے لگتے ہیں۔ اس سے قبل کلوں کا مزدوروں کی حالت پر موافق اثر واضح کیا جاچکا ہے۔ معاشی انقلابات کے زمانے میں گوناگوں انکشافات و ایجادات کی بدولت مزدوروں کی حالت اکثر ناقابل اطمینان بلکہ افسوسناک ہوجاتی ہے لیکن وہ زمانہ بھی یہی ہوتا ہے جبکہ لوگ حسن اتفاق، خوش قسمتی یا عقلمندی سے غرضکہ کسی نہ کسی طرح بڑی بڑی دولت جمع کرلیتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے مشہور کروڑپتی اصل دار اور آجروں کی حرص اسی زمانہ میں جمی جبکہ ہر طرف معاشی انقلابات کا طوفان برپا تھا۔ سکون قائم ہونے کے بعد مقابلہ کے دباؤ سے سب کاروبار ایک سطح پر آلگتے ہیں اور اس زمانہ میں غیر معمولی ترقی کرنا نہایت دشوار بلکہ اکثر محال ہوجاتا ہے بہت کچھ جدوجہد کرنے کے باوجود بھی معمول سے زیادہ دولت ہاتھ نہیں لگ سکتی۔ ہر کوئی تجربہ کار اور سمجھدار آجر اس واقعہ کی تصدیق کرسکے گا۔ انکم ٹیکس کے اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ترقی یافتہ ملک میں متوسط درجہ کے دولت مندوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے اور اعلیٰ درجہ والے دولتمندوں کے اضافہ کی رفتار روز

مزدور گھٹ رہی ہے انجمن سرمایہ مشترک اور ملکوں کے اعداد وشمار سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دولت اب زیادہ زیادہ پھیل رہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ معاشی انقلابات کے زمانہ میں مزدور پریشان حال اور خوش قسمت اصل دار و آجر بیحد مرفع الحال بن جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا معاشی ترقیات سے ایک مختصر جماعت کی دولتمندی اور نہایت کثیر گروہ کے افلاس میں ساتھ ساتھ اضافہ ہونا لازمی ہے لیکن ما لآخر حالات پلٹہ کھاتے ہیں۔ مزدور کی حالت سدھرنی شروع ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ بہ نسبت سابق بدرجہا بہتر اور عمدہ ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی غیر معمولی خوش قسمتوں کی تعداد گھٹنے لگتی ہے نئے نئے کروڑپتی تو کم پیدا ہوتے ہیں اور اُن کے بجائے بہت سے متوسط درجہ کے دولتمند نمودار ہونے لگتے ہیں اکثر ہمعصر اشتراکیئن پر انقلاب کے عارضی مگر خوفناک اثرات کی ہیبت اس قدر طاری ہوئی کہ وہ گھبرا اُٹھے اور معاشی ترقیات کو عالمگیر تباہی کا آلہ قرار دے ڈالا۔ لیکن جب انقلاب کا طوفان پورے طور پر فرو ہو چکا تو ان خوفناک اثرات نے کم و بیش قابل اطمینان صورت اختیار کر لی یہی وجہ ہے کہ جدید اشتراکیئن کی رائے اور تجاویز میں وہ سخت گیری اور تشدد نہیں پایا جاتا جو اُن کے پیشروؤں میں تھا۔ اور بحیثیت مجموعی یہ تحریک بتدریج اعتدال پسندی کی طرف مائل ہوتی جاتی ہے۔

عہد جدید جس کا باقاعدہ آغاز انقلاب فرانس سے شمار کیا جاتا ہے آزادی مساوات اور عام بیداری کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز رہی۔ رسم غلامی کا خاتمہ ہوا قابو یافتہ طبقوں کا زور ٹوٹا آئینی اور نیابتی حکومتوں نے جڑ پکڑی عوام میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا۔ بطریق نیابت سلطنت کے نظم و نسق میں ان کو بھی دخل ملنے لگا اور بتدریج کل باشندگان کو سیاسی آزادی حاصل ہو گئی تھی ساتھ

حصہ سوم
باب ہفتم

عوام میں تعلیم بھی ہر طرف پھیلی اور حصول تعلیم کے واسطے طرح طرح کی سہولتیں مہیا کر دی گئیں علم کسی خاص طبقہ کی میراث نہیں رہا۔ بلکہ اس کے حاصل کرنے کی ہر شخص کو کامل آزادی ملگئی اور نیز آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ گویا دماغی اور تعلیمی حالت میں بھی بہت کچھ مساوات نمودار ہونے لگی۔ سیاسی آزادی اور اشاعت تعلیم کا لازمی نتیجہ عام بیداری ہوا لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں وہ اپنے حقوق سمجھنے لگے اور اپنی حالت سدھارنے کا اُن میں ولولہ پیدا ہو گیا۔ عوام کے سیاسی حقوق مساوی قرار پا گئے۔ اور تعلیمی حالت بہت کچھ یکساں ہو گئی۔ سوسائٹی میں بھی ذات پات کی تفریق گھٹنے لگی۔ گویا سیاسی دماغی اور نیز سوشیل تفاریق متکثر سب میں مساوات پھیل گئی لیکن مالی حالت میں اب بھی زمین و آسماں کے فرق بکثرت قائم رہے جبکہ ہر طرف مساوات کی رَو بہ رہی ہو تو مالی حالت کے فرق جس قدر بھی ناگوار معلوم ہوں کم ہیں چنانچہ باوجودیکہ مزدوری پیشہ طبقوں کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہو گئی لیکن پھر بھی اُن کو دوسروں کی دولتمندی شاق گذرتی رہی اور اپنی بہتر حالت ان کو افلاس سے بھی بدتر معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض ماہرین نے مزدوروں کی مالی حالت بہ نسبت سابق فی نفسہ بہت بہتر تسلیم کرنے پر اُنکو اس وجہ سے مفلس قرار دیا ہے کہ بعض دیگر طبقے ان سے بہت زیادہ دولتمند بن گئے گویا دوسروں کے مقابل مزدوروں کی کمتر ترقی کو وہ تنزل سے تعبیر کرتے ہیں اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ دو ریل گاڑیاں ایک ہی جانب کو دوڑیں اور اُن میں سے ایک زیادہ تیز رفتار ہو۔ تو چونکہ کمتر رفتار والی گاڑی پیچھے رہ جائے۔ اس لیے نتیجہ نکال لیا جائے کہ وہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ بحیثیت مجموعی مزدوروں کی مالی حالت بہ نسبت سابق ضرور بہتر ہو گئی ہے۔ مفلس ہونے کے بجائے اب وہ مقابلۃً خوشحال ہوتے جاتے ہیں

لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اُن کی ترقی کی رفتار سُست ہے اور باوجود بہتر ہونے کے اُن کی مالی حالت ہرگز قابل اطمینان نہیں۔ دیگر طبقے بہت زیادہ دولت سمیٹ رہے ہیں اور جیسا کہ ہم ابھی اعداد و شمار سے ثابت کریں گے دولت ازحد غیر مساوی حصوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ المختصر اشتراکیین کے بیانات خلاف واقعہ اور مبالغہ آمیز بھی ہوں تب بھی تقسیم دولت کا موجودہ طریق اصلاح طلب ضرور ہے۔

حصہ سوم باب ہشتم

(۳) مروجہ طریق تقسیم دولت کی علمی تشریح و توجیہہ اوپر ہو چکی ہے۔ جس سے واضح ہوا ہوگا کہ منجملہ چہار حصص پیدائش اجرت تو سب سے بڑی جماعت میں تقسیم ہوتی ہے اور لگان سود و منافع زمیندار و اصل دار اور آجروں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں سگوالیتی ہیں آن تینوں حصوں کی مقدار اجرت سے کہیں زیادہ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ افزونی آبادی سہولت آمد و رفت استعمال مشین پیدائش برپیمانہ کبیر تنظیم کاروبار جیسی معاشی ترقیات کی بدولت جس قدر منیجر دخود اضافہ ہوتا ہے اس کا نصف بھی وہ حق تر از حد و جہد اُجرت میں نظر نہیں آتا۔ اس فرق کا باعث عاملین کے خواص میں مضمر ہے جن کی اس سے قبل تشریح کی جا چکی ہے نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً مزدور کو زمیندار اصل دار یا آجر کے مقابلہ میں پیداوار کا بہت کم حصہ ملتا ہے بلکہ یہ قلیل مقدار حاصل کرنے کے واسطے بھی وہ آج کل اصل دار و آجر کی دستگیری کا محتاج ہے۔ پیدائش برپیمانہ کبیر کے رواج نے بطور خود روزی کمانے سے اس کو بالکل معذور کر دیا۔ زمین و پیداوار زمین جو اس کی ضروریات کا جزو اعظم ہے گراں ہو ہو کر زمیندار کو مالا مال اور غریب مزدور کو زیر بار کر رہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ زمیندار اصل دار اور آجروں کی چھوٹی چھوٹی ذی اقتدار اور دولت مند جماعتوں کے مقابلہ میں غریب مزدوروں کا

تقسیم دولت کی موجودہ حالت

حصہ سوم باب ہشتم

سب سے بڑا گروہ بہت کمزور اور بے بس نظر آتا ہی جیسا کہ اوپر جتایا جا چکا ہی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا صحیح نہیں کہ مزدور کی حالت بہ نسبت سابق بدتر ہی۔ صرف یہ جتانا مقصود ہی کہ جدید معاشی ترقیات بھی مزدور کے کمتر موافق ہیں اور مقابلۃً زمینداروں اصل داروں اور آجروں کی از حد معاون بنکر اُنہوں نے مزدوروں کی حالت مستحق اعانت بنا رکھی ہی۔ ہمنے مانا کہ مجموعی طور پر مزدوروں کی مالی حالت بہتر ہی اور اضافہ دولت کے ساتھ ایسا ہونا کون تعجب ہی لیکن دراصل بحث یہ ہی کہ آیا اُن کی مالی حالت قابل اطمینان بھی ہی۔ فرض کرو کہ دولت میں بقدر ۲ فیصدی اضافہ ہوا اور اُن میں سے صرف ۳ ۲ فیصدی تو غریب مزدوروں کے گروہ کثیر کو ملے اور باقی کل چند مختصر طبقے سنگوا بیٹھیں تو کیا مزدوروں کی ایسی ترقی کچھہ ترقی کہلا سکتی ہی؟ البتہ ع

دل کے بھلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہی

مزدوروں کی موجودہ حالت جو کچھہ ہی وہ بہ نسبت سابق بہتر سہی لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کو اب بھی بہت زیادہ بہتر ہونا چاہیئے۔ اور بلا تخصیص اشتراکین سب عالی حوصلہ اور با خبر لوگ اس خیال سے سراسر متفق ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں تقسیم دولت کی عدم مساوات دیکھکر آدمی چونک پڑتا ہی چند قابل لوگوں نے نہایت احتیاط اور عرق ریزی سے تقسیم دولت کے معتبر تخمینے تیار کیئے ہیں جن کے اعداد وشمار حسب ذیل ہیں:- امریکہ میں ۱ ۴/۵ فیصدی آبادی ۷۰ فیصدی سے زیادہ مجموعی دولت کی مالک ہی۔ ۱۲ فیصدی دولت ۹ ۱/۵ فیصدی آبادی کی ملک ہی اور باقی ۱۸ فیصدی دولت ۸۹ ۴/۵ فیصدی آبادی میں منقسم ہی۔ ایک دوسرے تخمینہ کے مطابق صرف ۳/۴ فیصدی آبادی ۴۰ فیصدی دولت ۸ ۹/۱۰ فیصدی آبادی ۵۱ فیصدی دولت اور باقی ۹۱ فیصدی آبادی صرف ۹ ۲ فیصدی دولت کی

مالک ہے۔ تیسرا تخمینہ ہے کہ امریکہ میں کچھ کم نصف خاندانوں کے پلہ تو برائے نام بھی اندوختہ نہیں وہی کنواں کھودنا وہی پانی پینا صرف ⅛ دولت ⅛ خاندانوں کی ملک ہے اور ۱ فیصدی خاندانوں کی دولت باقی ۹۹ فیصدی خاندانوں کی دولت سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ کم نہیں۔ بلحاظ غیر مساوی تقسیم دولت انگلستان کی حالت اور بھی ابتر ہے تین چوتھائی لوگوں کے نام کسی قسم کی ملک و جایداد درج رجسٹر نہیں۔ ان کے مال و اسباب کی مجموعی قیمت بھی ڈیڑھ ارب روپیہ سے زیادہ ہوگی۔ ۹۰ فیصدی آبادی کے پاس تو مشکل ۸ فیصدی دولت ہوگی اور ۲ فیصدی خاندانوں کی ملک باقی ۹۸ فیصدی کے مقابلہ میں ۔۔گنی سے بھی زیادہ ہے سلطنت برطانیہ عظمی کے مرکز لندن کا حال ذرا ملاحظہ ہو جہاں مغربی حصہ میں سر بفلک عمارات اور اسار تعیشات لامحدود دولت کا حیرت انگیز منظر دکھاتے ہیں مشرقی حصہ کے خام وخستہ جھونپڑوں میں خدا کی لاکھوں بے برگ و نوا مخلوق حیوانات سے کچھ ہی بہتر زندگی بسر کرتی ہے جوانی میں فطرتاً جرئت طلب کام کرنے کو دل چاہا کرتا ہے۔ ایک مشہور انگریزی مصنف نے ایسے کاموں کے سلسلہ میں شریر گھوڑا دوڑانے کو دانے، طوفان میں تیز کشتی چلانے اور آتش زدہ مقامات میں گھس پڑنے کے علاوہ لندن کے مشرقی حصہ سے دن دہاڑے گذرنے کا بھی ذکر کیا ہے تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہاں کے غرق نکبت و افلاس باشندے بھوک اور شدت سرما سے جھنجلا کر وحشیوں کی مانند راہ گیر و نپر جھپٹتے اور انکو دق کرتے ہیں۔ دیگر ترقی یافتہ ممالک کا حال بھی کم و بیش امریکہ و انگلستان ہی کا سا ہے جہاں دولت بسرعت بڑھ رہی ہے تقسیم تو وہ سب میں ہوتی ہے اور اسی لیے بہ نسبت سابق مالی حالت سدھرتی جاتی ہے۔ لیکن حصے بہت غیر مساوی ہوتے ہیں بعض قابو یافتہ مختصر جماعتوں کو بہت زیادہ ملتا ہے اور مزدوروں کے گروہ کثیر کو مقابلتہً کم۔ تقسیم دولت کی

حصہ سوم ماتحتم تجاویز اصلاح

عدم مساوات جب تحقیق ہوچکی تو اب اس میں مناسب مساوات پیدا کرنے کی تدابیر پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۴) واضح ہو کہ سوشیلزم کی بحث میں انفرادی املاک پر از حد رد و قدح کیجاتی ہے اس طریق کی ایک خوبی تو مسلم ہے اس سے پیدائش و بیش مداری دولت کا شوق از حد بڑھتا ہے۔ لیکن تقسیم دولت کی روز افزوں عدم مساوات کا خاص الخاص باعث بھی یہی طریق قرار دیا جاتا ہے۔ انفرادی املاک طریق کی ابتدا اور توسیع کا مفصل حال اصول قوانین کی کتابوں میں مذکور ہے یہاں اس کا اعادہ ضروری نہیں اس طریق کے صرف معاشی نتائج واضح کرنا اور تجاویز اصلاح جانچنا ہماری مطلب کے واسطے کافی ہے انفرادی املاک میں چند حقوق وابستہ ہیں جو موجودہ عدم مساوات کے بانی ہیں اور جن کی قانون ہر ملک میں حمایت کرتا ہے ملک انفرادی ذاتی صرف میں آنے کے علاوہ دوسروں کو بطور ورثہ ہبہ یا وقف منتقل کیجا سکتی ہے نیز بلا معاوضہ یا کسی معاوضہ پر عاریتاً دیجا سکتی ہے اور جدید معاشی ترقیات کی بدولت بہ نسبت سابق اب اس سے عمل پیدائش میں کہیں زیادہ کام لیا اور ما حصل زاید کی بڑی بڑی مقدار بشکل لگان سود اور منافع وصول کرنا باآسانی ممکن ہے۔ ان حالات سے دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ بہت سے لوگ بلا محنت مشقت بڑی بڑی دولت کے مالک بنکر نہایت عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں حالانکہ بہت سے کام کرنے والوں کو جائز ضروریات بھی بدقت دستیاب ہوتی ہیں دوسرے محض انفرادی املاک کی بدولت تھوڑے سے لوگ تو بطور زمیندار اصل دار و آجر پیداوار کے بڑے بڑے حصوں کے مالک بن بیٹھے اور باقی کل تہیدست مزدور رہ گئے جو نہایت قلیل معاش کے واسطے اُن کی دستگیری کی محتاج بھی ہیں اور اُن کی آمدنی بڑھانے میں معاون بھی — جو لوگ ہزار ہا روپیہ آمدنی

کی جائداد کے مالک ہوں اُن کی قسمت کا کیا کہنا خود کمانے کی قابلیت ان میں کتنی ہی ادنےٰ کیوں ہو محنتی کاشتکار شب و روز جان کہپانے اور خون پانی کرنے سے جو کچھ کما سکیں اس کا صد ہا گنا وہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر وصول کر لیتے ہیں۔ کارندوں کے ہاتھ سے جو تہوڑا بہت نقصان پہنچے گا اس کی پروا نہو تو انتظام اور نگرانی ریاست کے دردسر سے بھی نجات ممکن ہے۔ اگر ان کی ریاست کے قرب و جوار میں ریل یا نہر نکلے کوئی عدالت دفتر یا مدرسہ قائم ہو منڈی بازار کھلے یا آبادی بڑہے تو خواہ مخواہ اُن کی زمینوں کی قیمت اور آمدنی بھی ضرور بڑہے گی۔ حالانکہ مذکورالصدر تبدیلیوں میں اُن کی برائے نام بھی شرکت نہو اسی طرح پر اگر کسی کے پاس کچھ رقم ہو اور اس کو کسی معتبر بنک میں داخل کردے یا اسٹاک خرید کر سرکاری قرض خواہ بنے یا کسی قابل اعتماد کاروبار کے حصے خرید کر صرف منافع میں شریک ہو جائے۔ اُس کی جسمانی صحت دماغی قابلیت اور اخلاقی چال چلن کی حالت کیسی ہی ابتر کیوں نہو خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں جاکر رہے۔ ہر حالت میں بلاناغہ اس کو آمدنی ملتی رہنی تقریبًا یقینی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنا کل سرمایہ کسی بنک وغیرہ میں داخل کر کے سود کی آمدنی سے عیش و راحت اور سیر و شکار کی قابل رشک زندگی بسر کرتے ہیں آجر اگرچہ بمقابلہ زمیندار و محصل دار بہت زیادہ کام کرتا ہے۔ لیکن وہ انفرادی املاک و معاشی اسباب کی مدد سے اپنی محنت سے کہیں زیادہ معاوضہ پالیتا ہے اور زندگی کا لطف اُٹھاتا ہے لیکن خدا کی کروڑہا عام مخلوق ہے کہ محنت کرتے کرتے صبح سے شام ہو جاتی ہے اور سوائے علالت یا ادیت سال بیکاری کے بچپن سے بڑہاپے تک اُن کو کبھی فراغت سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا اور کچا پکا جھونپڑا موٹا جھوٹا کپڑا اور روکھا پھیکا کھانا اُن کی ضروریات کا منتہیٰ ہے۔ طبقہ مزدوران اور زمیندار محصل دار و آجروں کے گروہ میں سوائے اس کے کوئی عام

حصہ سوم باب ہفتم

اور مستقل فرق نہیں کہ وہ تہیدست ہیں اور اُن کے پاس دولت ہی۔ ہم نے مانا کہ محنت کے علاوہ زمین اصل اور نیز تنظیم پیدائش دولت کے واسطے ناگزیر ہی۔ اور اُن کی پیداوار لگان۔ سود و منافع بجا اور درست ہیں لیکن اُن کو بطور انفرادی املاک کیوں قائم رکھا جائے کہ پیداوار کا جزو کثیر تو مالکوں کے چند طبقے سنگوا لیں اور تھوڑے سے بچے کھچے پر باقی لوگوں کو صبر کرنا پڑے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ زمین اور اصل یہ دونوں عاملین پیدائش عوام ہی قائم مقام یعنی گورنمنٹ کی ملک بنجاویں اور ان کی آمدنی چونکہ بیشتر عام معاشی ترقیات کا نتیجہ ہوتی ہی۔ سرکاری خزانہ میں داخل ہو کر کل ملک کے کام آئے۔ لوگ سرکاری زمینیں جوتیں بوئیں یا سرکاری کارخانوں میں کام کریں بہتر تو یہ ہوتا کہ سب کی کمائی ایک قومی بیت المال میں داخل ہوتی اور اس میں سے ہر کوئی جائز ضروریات کے واسطے خرچ لے لیا کرتا۔ لیکن جب تک خود غرضی کے بجائے انسان ایثار مجسم نہ بنجائے اس طریق پر عملدرآمد خواب وخیال سے بھی باہر ہی۔ پس جو جس قدر محنت کرے اس کی اجرت لے لے۔ جو کچھہ حاصل زاید ہو سرکار کو ملے اور سرکار اپنی طرف سے عام بہبودی پر صرف کرے۔ لوگ بطور اجرت جو کچھ کمائیں کھائیں پئیں یا اڑے وقت کے لیے بچائیں۔ لیکن بطریق انفرادی املاک نہ تو وہ بطور ورثہ یا ہبہ اُس کو مستقل کر سکتے ہیں نہ بطور خود اس سے پیدائش دولت میں کام لے سکیں گویا ان کی کمائی محض ناقابل انتقال دولت ہو اور کچھہ نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ انفرادی املاک کا طریق بند کرکے کل زمین اور اصل سرکاری ملک قرار دیدینا۔ نیز تنظیم کا کام گورنمنٹ کے سپرد کرنا۔ گویا زمینداروں اصل داروں اور آجروں کے گروہ توڑنا لگان سود اور منافع سرکاری تصرف میں دیدینا۔ اور عوام کو سوائے محنت و اجرت کے

حصہ دوم باب ہفتم

کوئی اور ذریعہ معاش باقی نہ چھوڑنا۔ اور تاکہ جدید نظام برقرار رہ سکے۔ کمائی سے تاحین حیات اپنی اور اپنے کنبہ کی پرورش کرنا لیکن نہ اس کو بطور ورثہ پس ماندگان کو منتقل کرسکنا نہ اس سے بطور عامل پیدائش کوئی کام لے سکنا بالفاظ مختصر کمائی کو محض دولت ناقابل انتقال قرار دیدینا یہ سب تجاویز ٹھیٹ سوشیلزم کی پیش کردہ ہیں۔ ان کی غرض واحد انفرادی املاک کا طریق روک کر دولت و آمدنی غیر مکتسب کے ذرائع بند کرنا ہے تاکہ ہر شخص اپنی قوت بازو سے روزی کمائے نہ بذریعہ ورثہ یا ہبہ دوسرے کے اندوختہ پر چین اُڑائے نہ سوائے محنت کے کسی اور عامل پیدائش کی پیداوار سنگوائے تاکہ تقسیم دولت میں جو تشویش ناک عدم مساوات پھیلتی جاتی ہے رفع ہو جائے جبکہ پیداوار صرف بمعیار محنت تقسیم ہوگی تو اوّل تو لوگوں کی مالی حالت میں موجودہ فرق کا عشر عشیر بھی ممکن نہیں۔ اور اس طریق سے اگر دوسروں کے مقابلہ میں کسی کے پاس زیادہ دولت ہوگی بھی تو سراسر جائز اور حق بجانب ہوگی۔ گاڑھے پسینہ کی کمائی ہوگی۔ نہ کہ حسن اتفاق کی آفریدہ۔ واضح ہو کہ بعض نے بحیثیت مجموعی انفرادی املاک کے متعلق اتنی رعایت گوارا کی ہے کہ خالص اجرت کا اندوختہ جو کسی حالت میں بہت زیادہ نہیں ہو سکتا بطور ورثہ یا ہبہ منتقل ہو سکتا ہے لیکن خود مالک یا وارث اس کو بطور عامل پیدائش استعمال کرکے آمدنی غیر مکتسب حاصل نہیں کرسکتے۔ نیز بعض کا خیال ہے کہ چونکہ اضافہ اصل و ترقی کاروبار بغیر انفرادی املاک کے محال ہے لہٰذا اس میں کوئی ردو بدل کرنا خلاف مصلحت ہوگا۔ صرف زمین جو کہ عطیہ قدرت ہے قوم کی مشترک ملک ہونی چاہیے چنانچہ اس تجویز سے ہم لگان کے تحت میں مختصراً بحث کر چکے ہیں۔

مذکورالصدر تجاویز پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اشتراکیین نے مساوات تقسیم کے جوش میں انسانی فطرت اور عام مشاہدت کو بُری طرح سے نظر انداز کیا ہے اور جو خرابیاں رفع کرنی مقصو

حصہ سوم
باب ہشتم

ہیں ان سے بھی بد تر خرابیاں اُن کی پیش کردہ تجاویز کے عملدرآمد سے پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ فیاضی اور بہبودی عامہ کی خواہش۔ مذہب اخلاق اور روشن خیالی کی بدولت خواہ کتنی ہی قوی اور عالمگیر کیوں نہ ہوجائے انانیت اور ذاتی منفعت ہمیشہ سے ترقی کی روح رواں چلی آتی ہے۔ اور رہے گی۔ یہ تو عام قانون فطرت ہے۔ دوسروں کی خاطر جدوجہد گوارا کرنا ہمیشہ عارضی استثنے ثابت ہوا کیا ہے اور ہوتا رہیگا۔ انسانی خلق اور سرشت میں کایا پلٹ ہوجائے تو دوسری بات ہے ورنہ انفرادی املاک کا طریق توڑنے اور اندوختہ کو بطور اصل عمل پیدایش میں لگانے سے روکنے کا یقینی نتیجہ کاروبار کی تنزل اور معاشی زوال ہوگا جبکہ اندوختہ اصل بن سکے نہ ورثہ تو پھر لوگ پس انداز کیوں کرنے لگے۔ اگر کچھ بچائیں گے بھی تو بس اتنا کہ تاحین حیات اڑے وقت کام آئے ورنہ صرف اتنی محنت کرینگے کہ اس کی اجرت سے ضروریات ماحصر حاصل ہوتی رہیں۔ نیز اگر اندوختہ ورثہ بن سکے لیکن بطور اصل استعمال نہ کیا جاسکے تو بھی پس اندازی میں کوئی نمایاں اضافہ ہوگا۔ اب تو جو لوگ پس اندازی کی استطاعت نہیں رکھتے اُن کے سامنے بھی انفرادی املاک کی دلکش منزل مقصود تو موجود ہے جس کی طرف ترقی کی امنگ ان کو کھینچتی رہتی ہے۔ لیکن جب کل دولت یا کم از کم اصل پر سرکاری املاک کی سد سکندری قائم ہوجائے گی تو جو لوگ پس انداز کر رہے ہیں اُن کی بھی امنگیں سرد اور ہمتیں پست ہوجاویں گی محنت کا شوق بھی گھٹ جائے گا اور اضافہ اصل میں سخت رکاوٹ پیش آنی یقینی ہوگی۔ مزید براں جبکہ کاروبار سرکاری ملازمین کے ہاتھ میں ہوگا اور منفعت ذاتی غائب ہونے کی وجہ سے اور کسی کو اس سے ذاتی غرض اور دلچسپی بھی نہ ہوگی تو دیگر عاملین کی قوت پیدائش میں بھی ضعف آنا عجیب نہیں چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ اپنے نج کے

کاروبار کی ترقی میں لوگ جس قدر جان توڑ کوشش کرتے ہیں بحیثیت ملازم دوسرونکے کاروبار کے واسطے نہیں کرتے اور سرکاری انتظامات میں کفایت طلبی کا تو ذکر ہی کیا اکثر فضول خرچی کی شکایت سننے میں آتی رہتی ہے۔ ضابطہ کی تاخیرات جو کہ کارگزاروں کی بے تعلقی کا نتیجہ ہوتی ہیں ضرب المثل ہیں اور ترقی کا جوش سرکاری کاروبار میں مقابلةً ہمیشہ کم پایا جاتا ہے اور اس کا باعث وہی کارکنوں کی ذاتی منفعت کی عدم موجودگی ہوتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ سرکاری کاروبار نجی کاروبار سے ہمیشہ خراب حال ہوتا ہے۔ بلکہ بہت سی مثالیں بالکل اس کے برعکس نظر آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ترقی کی اُمنگ کی کمی تو سرکاری کاروبار میں مسلّم ہے۔ لیکن دیگر لحاظ سے سرکاری کاروبار کو ایسی فوقیت حاصل ہوسکتی ہے کہ وہ اس نقص کی بدرجہ اولی تلافی کردے واضح ہو کہ مذکورہ بالا نقص تو سرکاری کاروبار میں عام ہوتا ہے۔ لیکن فوقیت کا ہونا یا کم وبیش ہونا۔ کاروبار کی نوعیت پر منحصر ہے۔ چنانچہ یہی عمومیت نقص اور خصوصیت فوقیت اس طویل اور کارآمد بحث کی بنا ہے کہ کون کاروبار سرکاری اہتمام کے واسطے موزوں ہیں اور کون ناموزوں یا بلفاظ دیگر سرکار کن کاموں کو کامیابی سے چلاسکتی ہے اور کون کاروبار نجی طور پر چلنے زیادہ مفید ہوں گے اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ جن کاموں میں پیدائش برپیمانہ کبیر کے فوائد بدرجہ اولی حاصل ہوں جن میں بوجہ کمال ایجاد و اختراع کا میدان تنگ ہو جن کے واسطے زر کثیر مطلوب ہو جن کے چلانے کے واسطے مدت دراز درکار ہو یا جن میں بہت زیادہ اعتبار کی ضرورت ہو ایسے کاروبار سرکاری اہتمام کے واسطے خاص طور پر موزوں ہوتے ہیں ڈاکخانہ، تار، نہریں، پختہ سڑکیں جنگلات اور سکہ یہ سب محکمے ہر ملک میں سرکاری قرار پاچکے ہیں اور نجی طور پر انکا چلنا دشوار ہے

حصہ سوم
اہتمام

لیکن زراعت اور نیز مصنوعات کے بیشمار شعبے بوجوہات معکوس نجی طریق کاروبار میں خوب پھولتے پھلتے ہیں اور سرکاری ہاتھوں میں انکا پژمردہ ہوتا یقینی ہی بعض قابل مصنفین نے مع وجوہات سرکاری و نجی کاروبار کی مفصل فہرستیں مرتب کی ہیں جن کے اندراج سے بخوف طوالت ہم معذور ہیں لیکن اس تفریق کے عام اصول وہی ہیں جو ہمنے بیان کیئے۔

حاصل کلام یہ کہ گو بعض شعبے سرکاری اہتمام کے واسطے بھی موزوں سہی۔ لیکن سرکار کو آجر واحد قرار دیکر پیدائش دولت کا کل کاروبار اگر اس کے سپرد کردیا جائے تو چند در چند وجوہات سے جو انسانی فطرت پر مبنی ہیں اس کا مجموعی نتیجہ معاشی تنزل ہوگا پیدائش دولت اور اضافہ اصل کی رفتار ضرور سست پڑجائے گی اور اگر ایسا ہوا تو عوام کی تھوڑی بہت مرفع الحالی جو باوجود عدم مساوات تقسیم حاصل ہی خاک میں ملجاوے گی۔ یہ خیال غلط ہی کہ موجودہ دولتمندوں کی آمدنی غربا میں تقسیم کرنے سے عام مرفع الحالی میں کوئی نمایاں فرق پیدا ہوسکے گا اگر دنیا کے کل پہاڑ مسمار کرکے اُنکی خاک کرہ ارض پر ہموار پھیلائی جاوے تو سطح زمین بمشکل ایک آدہ انچ بلند ہوسکے گی بعینہ یہی حال دنیا کے بڑے بڑے زمینداروں اصل داروں اور آجروں کی آمدنی کا ہی اگر اس کو عوام میں تقسیم کرو تو دو چار حد دس بیس روپیہ فی کس سے زیادہ اضافہ نہ ہوسکے گا۔ اور بحیثیت مجموعی عوام کی مالی حالت میں کوئی بڑی ترقی نہوگی۔ اس سے صاف ظاہر ہی کہ اس وقت تک جو مجموعی آمدنی حاصل ہورہی ہی وہ موجودہ آبادی کی ضروریات کے واسطے سراسر ناکافی ہی اور افلاس رفع کرنے کی لازمی شرط اضافہ پیدائش دولت ہی پس کوئی ایسا طریق جس سے پیدائش میں رکاوٹ پیدا ہو اضافہ افلاس کا یقینی باعث ہوگا۔ ہر چند کہ مساوات تقسیم ضروری ہی ترقی پیدائش

حصہ سوم باب معتمم

اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے اور عام مرفہ الحالی کے واسطے ہر دو لابد۔ بد قسمتی سے ان دونوں میں ایک حد تک تضاد سا پھیلا ہوا ہے اور ایک ایسا طریق کہ جو دونوں غرض پوری کر سکے یعنی اضافہ پیدائش بھی نہ رکے اور تقسیم میں بھی مساوات پیدا ہو جائے اتنک تحقیق نہیں ہو سکا تاہم تھوڑی بہت جس حد تک بھی یہ صفت کسی طریق میں موجود ہو اس کو اتنا ہی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ اور بحالت موجودہ اس لحاظ سے جو طریق بہترین نظر آتا ہے ہم اس کی ذیل میں تفصیل کرتے ہیں۔

اشتراک سرکاری

(۵) نہ تو موجودہ طریق تقسیم بوجہ روز افزوں عدم مساوات قابل برداشت۔ نہ **سوشیلزم** کی انقلاب انگیز تجاویز پوری طور پر قابل عملدرآمد۔ ان دونوں کے بین بین ایک معتدل طریق اختیار کیا گیا ہے۔ اصول غیر مداخلت میں ترمیم کر کے سرکار نے حسب ضرورت ہر مناسب طرح سے معاشی معاملات میں اپنی نگرانی اور شرکت پھر جاری کر دی اوّل تو کاروبار کے اہم شعبوں پر نگرانی قائم کی۔ مثلاً بنک ایکٹ فکٹری ایکٹ و قانون دستاویزات قابل خرید فروخت دوم بعض کاروبار جن کا ملکی بہبودی و ترقی سے قریبی تعلق ہے اپنے واسطے مخصوص کر لیئے اور مثل اصل دار و آجر منافع اٹھانے لگی مثلاً ڈاکخانہ، تار، ریل نہریں شفاخانے سوم افتادہ زمینیں اور جنگل سرکاری ملک قرار دیدیئے گئے اور مثل زمیندار سرکار کو اُن کی پیداوار سے آمدنی ملنے لگی۔ چہارم زمینداروں سے مالگذاری اور اصل دار و آجروں سے طرح طرح کے ٹیکس وصول کر کے سرکار ان کی بڑی بڑی آمدنی کا حصّہ عام مرفہ الحالی پر صرف کرنے لگی گویا ایک دم کل انفرادی املاک ضبط کرنے کے بجائے سرکار نے مختلف طریقوں سے سوشیلزم کی غرض پوری کی۔ کہیں صرف نگرانی پر اکتفا کیا تاکہ کمزور یا نادان فریق جبر تشدد یا دغا فریب سے امن میں رہیں۔ کہیں کاروبار اور نیز زمین پر قبضہ کر کے زمیندار اصل دار اور آجر کی جانشین اور لگان، سود

حصہ سوم
باب ہفتم

وسائل نفع کی مالک بن بیٹھی۔ اور مزید براں دولتمندوں پر ٹیکس لگا کر اُن کی آمدنی میں سے حصہ بانٹا۔ تاکہ وہ عوام کے کام آئے جن میں فریق غالب غریبا ورمتوسط الحال لوگ ہوتے ہیں الختصر نگرانی کاروبار۔ ملکیت زمین وصول اور ٹیکس آمدنی ان سہ گونہ ترکیبوں سے انفرادی املاک کی مضرت گھٹا کر ایک حد تک تقسیم میں مساوات قائم کردی۔

کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ موجودہ طریق تقسیم میں دو بڑے نقص ہیں۔ لوگ بلا محنت مشقت دولت کے مالک بنجاتے ہیں اور اگر محنت کریں بھی تو اُس کی اجرت سے صدہا گنی زیادہ آمدنی حاصل کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی جماعت تو دولت میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے اور باقی خدا کی بیشمار مخلوق کو بمقابلہ اس کی عشر عشیر ترقی بھی نصیب نہیں بلکہ تھوڑی بہت آمدنی کے واسطے بھی آخرالذکر کثیر گروہ اول الذکر مختصر جماعت کی اعانت و دستگیری کا محتاج ہے۔ حالانکہ ان ہی کی محنت اُن کی دولتمندی کی لازمی شرط ہے۔ اس افسوسناک غلبہ اور بے بسی کا حقیقی باعث انفرادی املاک کا رواج ہے۔ عوام کی قائم مقام گورنمنٹ کل زمین وصول ضبط کر کے تنہا زمیندار اصل دار اور آجر تو بن نہیں سکتی اور بن بھی سکے تو بمقابلہ اس نفع کے جو مساوی تر تقسیم دولت سے حاصل ہوگا بشکل معاشی تنزل زیادہ مضرت پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے۔ پس مذکورالصدر اصلاح کی غرض سے ایک اعتدال آمیز طریق برتا جا رہا ہے۔ کہیں بذریعہ سرکاری نگرانی غریبوں کو دولتمندوں کی چیرہ دستی سے محفوظ کیا۔ کہیں بشرط امکان زمین اور کاروبار پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور کہیں بڑی بڑی آمدنیوں میں سے حصہ بانٹ کر غریبوں کے مفید مطلب صرف کر دیا۔ گنوار و مثل ہے سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ مروجہ طریق کو اسی کا مصداق سمجھنا

چاہیئے یہی وہ طریق ہے کہ جس کے رواج سے کمترین مضرت کا اندیشہ ہوسکتا ہے
اور جس سے سوشیلزم کی غرض و غایت ایک معقول حد تک پوری ہو رہی ہے چنانچہ
اسی وجہ سے وہ ہر جگہ روز بروز مقبول ہو رہا ہے اس کو اصطلاحاً **سرکاری**
سوشیلزم کہنا بیجا نہ ہوگا۔ یہ نکتہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایسی تدبیر
کو جو عدم مساوات تقسیم کو گھٹا دے اشتراک ارتقائی کی نوع سمجھنی چاہیئے
چنانچہ سرکاری اشتراک کے علاوہ شرکت منافع اور شراکت کے طریق جو
اجرت کے تحت میں بیان ہو چکے ہیں۔ اشتراک ارتقائی میں شامل ہیں
اب اشتراک کی دو خاص قسم یعنی انقلابی اور ارتقائی کا فرق خوب
واضح ہو گیا۔ اول الذکر تو تشدد پر مائل ہے اس کی تجاویز معدودے چند مگر انقلاب
انگیز اور فطرت انسانی کے منافی ہیں۔ اور اگر ان پر ہزار دقت بالجبر عملدر آمد بھی
کرایا جائے تو جس قدر خرابی رفع کرنے کی امید ہے اس سے دس گنی مضرت پہنچنا سراسر
یقینی ہے اس کے برعکس آخر الذکر انسانی فطرت کا مقتضی بھی مد نظر رکھتا ہے اسی وجہ سے
اس کی تجاویز معتدل اور گوناگوں ہیں اور ان کے عملدر آمد کی منفعت کا پلڑا مضرت سے
بھاری ہے جوں جوں بیجا جوش اور غلط فہمی رفع ہوتی جاتی ہے اشتراک انقلابی کا
زور ٹوٹ رہا ہے اور اشتراک ارتقائی کا اثر ہر طرف پھیل رہا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی جتا چکے ہیں اس تحریک کی بہت سی انواع در انواع
ہیں ہم نے دقیق اختلافات نظر انداز کر کے سیدھا سادہ لب لباب پیش کرنے پر
اکتفا کیا ہے مفصل بحث کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے۔

تجزیہ (۱) مالیات (۲) مفہوم ٹکس (۳) تقرر ٹکس (۴) اصول ٹکس (۵) اقسام ٹکس (۶) انتقال ٹکس (۷) انکم ٹکس (۸) ہاؤس ٹکس (۹) محصول چنگی (۱۰) فیس اسٹامپ و رجسٹری داخل خارج و لیسنس

مالیات (۱) اصطلاح مالیات سے مراد کسی سلطنت کے آمد و خرچ کا انتظام و حساب ہے اس فن کی مفصل بحث کیواسطے تو ایک جدا گانہ کتاب درکار ہے یہاں پر خرچ کی تفصیل نظر انداز کرکے صرف اس قدر بتانا کافی ہے کہ ہر قسم کی ملکی ترقی اور عام بہبودی، عمدہ حکومت کے قیام و استحکام سے وابستہ ہے۔ چنانچہ عمل پیدائش دولت میں سرکار بھی براہ راست یا بالواسطہ حسب حالات شریک مانی جاتی ہے اور حکومت کے واسطے خرچ ناگزیر ہے۔ رہی آمدنی۔ وہ بھی ملک کی پیداواری سے حاصل ہوتی ہے لہذا حکومت بھی بحیثیت مجموعی ایک عامل پیدائش ہے۔ جو پیداوار میں سے حصہ لیکر اپنا کام چلاتی اور بشرط امکان اندوختہ جمع کرتی ہے۔ بحالت ضرورت مثل عوام اس کو قرض بھی لینا پڑتا ہے۔ واضح ہو کہ ازمنہ سالقہ میں حکومت امن و امان قائم رکھکر پیدائش دولت میں محض بواسطہ بعید شریک ہوتی تھی۔ لیکن جیسا کہ اس سے قبل جا بجا بتایا جاچکا ہے۔ ہر مہذب حکومت معاشی معاملات میں روز افزوں دلچسپی لینے لگی ہے اور بشرط موقع عام زمیندار اصل دارا ورآجروں کے مانند کاروبار میں بھی مصروف نظر آتی ہے۔ المختصر حکومت بھی ایک عامل پیدائش ہے اور پیداوار میں سے اس کو جو حصہ ملے وہ **سرکاری محاصل** کہلاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں سرکاری محاصل

حصہ سوم

باب ہشتم

آمدنی کے بالعموم چار وسائل پائے جاتے ہیں:۔

(۱) سرکاری اراضی و جنگلات جن کی پیداوار سے معقول آمدنی ملتی رہتی ہے۔

(ب) معاشی کاروبار مثلاً نہر۔ ریل۔ ڈاکخانہ۔ یا افیوں کی تجارت ہندوستان میں اور تمباکو کی فرانس میں

(ج) قرض جو بمجبوری قلت آمدنی۔ خرچ چلانے کیواسطے یا بغرض حصولِ منافع کاروبار میں لگانے کے واسطے کسی شرح سود پر عوام سے لیا جائے۔

(د) ٹکس

ان چاروں وسائل آمدنی میں سے اوّل تین تو عام کاروبار سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور اگر کچھ فرق ہے بھی تو اس کا بیان مالیات کی جداگانہ بحث میں زیادہ برمحل ہوگا لیکن آمدنی کا چوتھا وسیلہ یعنی ٹکس جو عوام پیداوار کے اپنے حصے میں سے حصہ نکالکر سرکار کو ادا کرتے ہیں براہ راست انفرادی ملک انفرادی آمدنی پر نہایت گہرا اثر ڈالتا ہے اور اس کے عملدرآمد سے ایسے معاشی قوانین و نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں کہ جن کا بیان تقسیم دولت کے تحت میں جداگانہ طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے چنانچہ اکثر تازہ ترین تصانیف میں بھی یہی طریق اختیار کیا گیا ہے۔ اور ہم بھی اس کتاب میں یہی مناسب سمجھتے ہیں۔

مفہوم ٹکس

(۲) ٹکس سے مراد دولت کا وہ حصہ ہے جو لوگ غیر اختیاری طور پر سرکار کو مصارف حکومت کے واسطے ادا کریں اس تعریف میں چند الفاظ غور طلب ہیں۔ اصطلاح دولت اپنے وسیع معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔ گویا مال و جائداد کے علاوہ خدمات بھی اس میں شامل ہیں۔ چنانچہ بیگار بھی ایک ناپسندیدہ قسم کا ٹکس ہے دولت کا انفرادی ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ جب تک وہ کسی کی انفرادی ملک نہو کوئی کیونکر اس میں سے سرکار کو حصہ دلیکتا ہے اور کسی کو دینے کا کیا حق حاصل ہے۔ قومی یا ملکی دولت کی تو سرکار کم و بیش خود ہی مالک ہوتی ہے

حصہ سوم / مالیات عامہ

صرف انفرادی دولت میں سے اس کو عوام سے حصہ لینا پڑتا ہے۔ لفظ حصّہ سے واضح ہوتا ہے کہ ٹیکس انفرادی ملک اور آمدنی میں سے ادا کیا جاتا ہے گویا ٹیکس دہندہ کے واسطے ایثار لازمی ہے۔ اگرچہ اس ایثار کے نتائج ان کے حق میں کہیں زیادہ مفید اور فیض رساں ثابت ہوں۔ غیر اختیاری طور سے مراد خواہ مخواہ جبر یا اکراہ نہیں۔ بلکہ اس واقع کا اظہار ہے کہ ٹیکس کی مقدار اور طریق و وقت ادائیگی۔ سرکار خود مقرر کرتی ہے اور اگرچہ آئینی حکومتوں میں تقرر ٹیکس کا اختیار بہت کچھ عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہے لیکن بحیثیت ادا کنندہ عوام بے بس و لاچار ہیں اور ٹیکس ادا کرنے میں انکی خوشی یا مرضی کو دخل نہیں۔ جو ٹیکس قائم کر دیا جاوے اس کو ادا کرنا انکا قانونی فرض ہوگا۔ لوگ سرکار کو جو کچھ اپنی طرف سے بطیب خاطر دیتے ہیں وہ ٹیکس و مدد رانہ شمار ہوتا ہے سرکار سے مراد لازماً مرکزی حکومت نہیں بلکہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا جز وحتیٰ کہ قصبات کی میونسپلٹی بھی جداگانہ طور پر سرکار شمار ہو سکتی ہے حکومت کے قیام و استحکام کے واسطے بیشمار مصارف ناگزیر ہیں جن میں سے بعض تو سرکاری ملک و کاروبار کی آمدنی اور قرض سے پورے ہوتے ہیں اور باقی عوام اپنی جیب سے بطریق ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

تقرر ٹیکس

(۳) یہ مسئلہ علمی و عملی لحاظ سے نہایت معرکتہ الآرا اور اہم ہے کہ کس اصول کے مطابق لوگوں پر ٹیکس قائم کرنا چاہیئے۔ بالفاظ دیگر کس سے کتنا ٹیکس وصول کیا جاوے اور مقدار ٹیکس کا معیار کیا ہو۔ سب سے قدیم اور سیدھا سادہ مگر از حد ناقابل عمل معیار تو سرکاری خدمات ہیں جو ٹیکس دہندہ کو حاصل ہوں گویا جس طرح کہ مزدور کو محنت کی اجرت دیجاتی ہے ٹیکس بھی سرکار کی خدمات کا معاوضہ ہے اور بس لہذا جو سرکار سے جتنی خدمت لے اسی کے مطابق معاوضہ بشکل ٹیکس ادا کرے واضح ہو کہ سرکاری خدمات اس قدر بیشمار اور اُن کے نتائج اسقدر گوناگوں

ہیں کہ ان میں کسی شخص کے حصہ کا تخمینہ کرنا محال بلکہ ناممکن ہے۔ بیڑوں فوجوں جنگوں فتوحات اور اعلیٰ حکام کی تنخواہوں پر سرکاری آمدنی کا سب سے بڑا حصہ صرف کیا جاتا ہے ہر شخص کو اُن سے جو فائدہ پہنچتا ہے اُس کا حداگانہ تخمینہ کیونکر ممکن ہے؟ اور اگر ہیں تو جو ٹکس ان مصارف کے واسطے طلب کیا جاوے وہ سرکار کی خدمات منفردہ کے کیونکر مساوی مقرر ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو ٹکس شہر کی صفائی روشنی سڑکوں کی درستی اور داٹر ورکس پر صرف کرنے کی غرض سے میونسپلٹی وصول کرتی ہے اس کے تقرر میں معیار خدمات کی تھوڑی سی گنجائش ضرور پائی جاتی ہے لیکن پورا پورا عملدرآمد وہاں بھی ممکن نہیں پس معلوم ہوا کہ معدودے چند حالتوں میں تو ٹکس کسی حد تک معیار خدمات مقرر ہو سکتا ہے۔ لیکن مصارف کی بڑی بڑی مدوں میں جن کے واسطے گراں بار ٹکس قائم کیے جاتے ہیں نہ خدمات منفردہ کا تخمینہ ممکن ہے نہ تقرر ٹکس میں معیار خدمات کا برائے نام بھی لحاظ کیا جا سکتا ہے۔ اول الذکر قسم **لوکل یا مقامی ٹکس** کہلاتی ہے اور آخر الذکر **امپیریل یا ملکی ٹکس** حاصل کلام یہ کہ مقامی ٹکس میں پورا تو ہرگز نہیں مگر تھوڑا بہت لحاظ معیار خدمات کا تقرر ٹکس میں ضرور ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے رہا ملکی ٹکس۔ جبکہ خدمات منفردہ کا برائے نام بھی تخمینہ نہیں کیا جا سکتا تو اس معیار کا لحاظ کیونکر ممکن ہے۔

جبکہ سرکار کی خدمات منفردہ کا نہ تخمینہ ممکن ہوا اور نہ ٹکس ان کے معیار کے مطابق مقرر ہو سکے تو پھر چونکہ تمام ملک ایسی خدمات سے مستفید ہوتا ہے سب سے بلا امتیاز مساوی مقدار ٹکس وصول کرنا بہت آسان ہوگا اور کچھ خلاف انصاف بھی نہیں۔ واضح ہو کہ خدمات منفردہ کا تخمینہ ممکن نہ سہی۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ سب لوگ ایسی خدمات سے یکساں مستفید نہیں ہو سکتے اور بالعموم

حصہ سوم
باب ہشتم

دولتمندوں کو بمقابلہ غربا کے بہت زیادہ فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ مزید براں جن غربا کو اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پالنا بھی دشوار ہو رہا ہو اور بسر اوقات کے واسطے دوسروں کی فیاضی کے دست نگر ہوں تو اُن سے ٹیکس طلب کرنا کہاں تک قرین انصاف اور وصول کرنا کہاں تک ممکن ہے ان کی تو وہی مثل ہے کہ ننگا ندارم دامن از کجا آرم۔ غریب بھلا مانگے میں سے ناگا کیونکر دے سکتے ہیں واضح ہو کہ غربا اور ایسے متوسط الحال لوگوں کی تعداد ہر ملک میں بہت بڑی ہے جو بار ٹیکس کے بالکل متحمل نہیں ہو سکتے اور اُن سے ٹیکس وصول کرنا یا تو محال ہے یا سراسر ظلم۔ لہٰذا مساوی ٹیکس کا یقینی نتیجہ خود ملک کی تباہی و بربادی ہو گا۔

مذکورالصدر دشواریوں کو پیش نظر رکھکر تقرر ٹیکس کا ایک تیسرا اصول تجویز کیا گیا ہے جس پر آج کل بالعموم عملدرآمد بھی ہو رہا ہے یعنی یہ کہ ہر شخص سے اس کی مالی حیثیت کے موافق ٹیکس وصول کرنا چاہیئے۔ دولتمندوں سے زیادہ، متوسط الحال سے کم اور غربا سے کچھ نہیں۔ گویا تقرر ٹیکس کا معیار خدمات معدودہ یا مساوات کے بجائے مالی حیثیت ہونا چاہیئے اب ایک دشوار سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مالی حیثیت سے کیا مراد ہے اور اس کے تخمینے کا کیا اصول ہونا چاہیئے۔ مالی حیثیت کے تین معیار ہو سکتے ہیں۔ مال و جائداد، آمدنی خام یا آمدنی خالص۔ ان میں سے کوئی معیار بھی لیکر ٹیکس دو طریق پر مقرر کیا جا سکتا ہے۔

(ا) ٹیکس اور ملک یا آمدنی کے مابین ایک عام نسبت قرار دیدی جائے مثلاً کچھ فیصدی سالانہ اس کو اصطلاحاً **ٹیکس متناسب** کہتے ہیں

(ب) مقدار ملک یا آمدنی کی کمی بیشی کے مطابق نسبت یعنی شرح ٹیکس میں بھی تخفیف و اضافہ کیا جائے مثلاً ہزار روپیہ تک ۲ فیصدی۔ ایک ہزار کے بعد پانچ ہزار تک

۳½ فیصدی - پانچہزار سے اوپر دس ہزار تک ۴ فیصدی اور دس ہزار سے بالاتر ملک یا آمدنی پر ۵ فیصدی ٹیکس قائم کیا جاوے اس کو اصطلاحاً **ٹیکس متضاید** کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ ان وجوہات کی بنا پر جن کا مساوی ٹیکس کے تحت میں ذکر آچکا ہے۔ ملک یا آمدنی کی کوئی ایسی قلیل مقدار جو قیام حیات کے واسطے ناگزیر ہو۔ ٹیکس سے بہرصورت ضرور مستثنے کردی جاتی ہے۔ گویا غریب لوگوں سے جن کی کمائی صرف ناگزیر ضروریات کیواسطے بھی بمشکل کفایت کرتی ہے کوئی ٹیکس نہ لینا چاہیئے اور نہ لیا جاتا ہے۔ ملک یا آمدنی کی کم سے کم سے قابل ٹیکس مقدار قانوناً مقرر کرنی پڑتی ہے اور کل کمتر مقداریں ٹیکس سے معاف ہوتی ہیں۔

ٹیکس متناسب کا طریق بہت سہل اور سادہ ہے۔ لیکن ٹیکس متضاید زیادہ قرین انصاف و مصلحت ہے۔ فرض کرو کہ عام شرح ٹیکس آمدنی کا دس فیصدی سالانہ ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ا روپیہ ماہوار آمدنی والے کو ا روپیہ ماہوار ٹیکس دینا بہت زیادہ گراں گزریگا بمقابلہ ایک ہزار آمدنی والے کے اسی شرح سے سو روپیہ ٹیکس ادا کرتا ہے۔ دس ہزار آمدنی والے کو ایک ہزار روپیہ ٹیکس اور بھی کم بار معلوم ہوگا۔ اور ایک لاکھ روپیہ آمدنی میں سے دس ہزار دیدینے سے مالی حالت پر مقابلتہً بہت ہی کم اثر پڑسکتا ہے چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ آدمی جس قدر زیادہ دولت مند ہوتا ہے اس کی نظر میں بمقابلہ متوسط الحال اور غریب لوگوں کے روپیہ پیسہ کی قدر و قیمت بھی گھٹ جاتی ہے۔ صدہا بلکہ ہزارہا روپیہ کی وہ اتنی بھی قدر نہیں سمجھتے ہیں جتنی کہ غریب لوگ چند روپیوں بلکہ آنوں کی۔ مبادلہ دولت کے تحت میں اس فطری خاصہ سے بعنوان **تقلیل افادہ** مفصل بحث کرکے بہت

نتیجہ خیز اصول اخذ کیے گئے ہیں جن کی مناسب موقع پر آیندہ ہم تشریح کرینگے یہاں صرف اس قدر جتانا مقصود ہی کہ یکساں شرح سے بمعیار ملک یا آمدنی امیر و غریب سے ٹیکس وصول کرنے کا نتیجہ عدم مساوات ایثار ہوگا اور درحقیقت مقابلہ امرا کے غربا پر ٹیکس کا زیادہ بار آپڑیگا - لیکن اگر ٹیکس متضاید قائم کیا جائے تو مساوات ایثار کے علاوہ ٹیکس میں اضافہ بھی ہوگا اور لطف یہ کہ کسی پر بیجا بار بھی نہ ہوگا - چنانچہ یہی **مساوات ایثار** کا اصول ٹیکس متضاید کی بنا قرار دیا جاتا ہی اور عدم مساوات ایثار کا اعتراض ٹیکس متناسب پر خاص طور سے عائد ہوتا ہی - لیکن ٹیکس متضاید میں بھی کچھ نقص نکالے جاتے ہیں - خصوصاً یہ کہ شرح ٹیکس میں تعین مدارج کے لیے اصول نامعلوم ہوتا ہی نیز لوگ ملک یا آمدنی کے متعلق غلط بیانی پر زیادہ مائل ہوں گے اور سب سے بڑا اندیشہ یہ ہی کہ شرح ٹیکس کی زیادتی کے خوف سے لوگ دولت فراہم کرنے میں کمی کریں گے - غور کرنے سے صاف ظاہر ہوگا کہ بیشتر فقط اعتراض کی خاطر یہ اعتراض کیے جاتے ہیں ورنہ اوّل دو ٹیکس متناسب پر بھی عائد ہوتے ہیں اور تیسرا اس وجہ سے قابل التفات نہیں کہ جب تک زیادتی ملک یا آمدنی سے شرح ٹیکس میں بہت ہی زیادہ اضافہ نہو کوئی ایسا اندیشہ بیجا نہیں اور ٹیکس متضاید میں شرح کا اضافہ ہمیشہ معتدل اور مناسب ہوتا ہی وہ اس درجہ کبھی گراں نہیں بنایا جاتا ہی کہ لوگ اُس کو ناقابل برداشت محسوس کرکے دولت جمع کرنا ہی چھوڑ دیں - اگرچہ دولت مند فرقہ کی طرف سے ابھی تک مخالفت جاری ہی لیکن چونکہ عوام کے حق میں مفید ہی ٹیکس متضاید کا رواج ہر ملک میں پھیلتا جاتا ہی خود ہندوستان میں بھی انکم ٹیکس کا یہی اصول اختیار کیا گیا ہی - جنگی مصارف کی مجبوریوں سے شرح میں کچھ اضافہ بھی ہوا ہی انکم ٹیکس کا موجودہ طریق یہ ہی کہ ایک ہزار

حصہ سوم باب ہشتم

روپیہ سالانہ سے کم آمدنی تو معاف ہے۔ ایک ہزار سے لیکر دو ہزار سے کم تک شرح ٹیکس ۴ پائی فی روپیہ ۲ ہزار سے لیکر پانچہزار سے کم تک ۵ پائی فی روپیہ پانچہزار سے لیکر دس ہزار سے کم تک ۶ پائی فی روپیہ دس ہزار سے لیکر ۲۵ ہزار سے کم تک ۹ پائی فی روپیہ اور ۲۵ ہزار یا اس سے زیادہ آمدنی پر ایک آنہ فی روپیہ انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ٹیکس سرکار کی خدمات منفردہ کے معیار سے مقرر ہو سکتا ہے نہ بمقدار مساوی ہر شخص سے وصول کیا جا سکتا ہے۔ تقرر ٹیکس کا قابل عمل معیار صرف لوگوں کی مالی حالت ہے۔ رہا طریق تقرر بعض لوگ مساوی شرح کے حامی ہیں اور بعض اسکو مساوات ایثار کے منافی ثابت کر کے حسب حیثیت مدارج شرح کے موید ہیں، لیکن بمقابلہ ٹیکس متناسب کے ٹیکس متصاید کا رواج بڑھتا نظر آتا ہے۔

یہاں پر تقرر ٹیکس کے متعلق دو ضروری اصطلاحوں پر توجہ دلانا بے محل نہو گا اوّل معیار ٹیکس۔ جس سے کسی چیز کی جسامت، وسعت، طول، وزن یا قیمت کی وہ مقدار معین مراد ہوتی ہے کہ جس کے حوالہ سے ٹیکس قائم کیا جاوے۔ مثلاً فی مکعب گز پتھر یا لکڑی، فی مربع بیگہ زمین، فی گز کپڑا، فی من غلہ یا فی صدی مال۔ دوم شرح ٹیکس جس سے ٹیکس کی وہ مقدار معین مراد ہے جو فی **معیار** وصول کی جاوے مثلاً ۴ر فی مکعب مربع گز۔ اور من یا اللعہ فی صدی آمدنی۔

صول ٹیکس

(۴) متعدد مصنفین نے چند اصول وضع کیے ہیں جن کو ٹیکس قائم کرنے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور جن کی خلاف ورزی سے عام مرفہ الحالی اور معاشی ترقیات کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ بدیہی ہے ایسے کل مستند اصول بترتیب اہمیت ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:—

حصہ سوم
باب ہشتم

(۱) پیداآوری۔ ٹیکس بدرجۂ اولیٰ پیدا آور ہونا چاہئے۔ یعنی ماحصل ٹیکس کی مقدار بہت معقول ہونی چاہئے۔ ٹیکس قائم کرنے کا منشا مصارف حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنا ہی اور جب ایسی آمدنی کی مقدار قلیل ہو تو گویا ٹیکس ناقص ہی اور حصول آمدنی کی غرض وغایت اس سے صرف بدرجۂ ادنیٰ پوری ہوتی ہی۔ اس میں شک نہیں کہ اجرائے ٹیکس میں اور امور کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہی اور کرنا چاہئے چنانچہ ان میں سے خاص خاص ہم ذیل میں بیان کریں گے۔ لیکن پیدا آوری ہر ٹیکس کی اساسی اور مقدم ترین خوبی ہی جس کا لحاظ باقی سب پر فائق ہونا چاہئے۔ بالفاظ مختصر عمدہ ٹیکس کی خصوصیت اولین ماحصل کی بیشی ہی۔

ٹیکس کے موزوں ذرائع کا انتخاب اول تو وسعت وصحت معلومات پر منحصر ہی دوم اس کے واسطے جرئت واستقلال بھی درکار ہی کہ غیر ہردلعزیزی کا اندیشہ سد راہ ہو سکے نہ مخالفت کا خوف۔ ماہر مالیات ایک نظر میں پیدا آور ذرائع پہچانکر اور بلا تامل ان پر ٹیکس قائم کر کے ملکی آمدنی میں اضافہ کر دکھائے گا۔

(ب) کفایت:۔ ٹیکس حتی الامکان کم خرچ ہونا چاہئے اس کے تین مفہوم ہیں اول یہ کہ جو کچھ فراہمی ٹیکس میں صرف ہو اس کی مقدار بمقابل ماحصل ٹیکس ادنی اسے ادنیٰ ہو۔ مثلاً اگر مصارف ماحصل کے ۱۰ اور ۱۵ فیصدی ہوں تو بلحاظ کفایت ٹیکس اول الذکر بہتر ہی اور ماحصل کے ۵ فیصدی مصارف والا ٹیکس اس سے بھی بہتر شمار ہوگا دوسرے ٹیکس دہندوں کو مقدار ٹیکس سے زیادہ ادا کرنا نہ پڑے۔ اس نکتہ کی تشریح آگے چلکر اقسام ٹیکس کے تحت میں کی جاوے گی۔ تیسرا مفہوم یہ ہی کہ ٹیکس افزونی دولت اور اضافہ مرفہ الحالی میں مانع اور مزاحم نہ ہونا چاہئے۔ بعض ٹیکس بمقابلہ دوسروں کے لوگوں کو زیادہ گراں گزرتے ہیں اور کاروبار پر بھی ان کا مضر اثر

حصہ سوم باب ہشتم

پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سرکار کو جو حاصل ملتا ہے اُس سے کہیں زیادہ عوام کو نقصان پہنچ جاتا ہے اور کاروباری تنزل سے خود ذرائع ٹیکس مسدود اور محدود ہونے لگتے ہیں اور بالآخر مقدار حاصل بھی گھٹ جاتی ہے گویا کفایت ٹیکس کی اولین خوبی پیدا آوری کی لازمی شرط ہے۔

آگے چلکر صرف دولت کے تحت میں بعنوان "نفع المصرف" واضح کیا جائے گا کہ ٹیکس میں صفت کفایت کن کن خاص حالتوں میں موجود ہو سکتی ہے اور کن میں مفقود۔ جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے ٹیکس متضاید پر بھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ افزونی دولت اور ترقی کاروبار میں حارج ہوگا گویا وہ کفایت کے منافی ہے۔

(ج) عدل ٹیکس انصاف سے قائم کرنا چاہیئے اس اصول کی تکمیل کی متعدد تدابیر تقرر ٹیکس کے عنوان سے اوپر بیان ہوئی ہیں۔ یہاں مختصر اعادہ کافی ہونا چاہیئے۔

(۱) ٹیکس معیار خدمات ٹیکس سرکاری خدمات کے مساوی ہونا چاہیئے۔ لیکن ہر شخص کاری خدمات سے جسقدر مستفید ہوتا ہے اس کا بر لئے نام بھی اندازہ دشوار ہے۔

(۲) ٹیکس مساوی ٹیکس سب پر بمقدار مساوی قائم ہونا چاہیئے۔ بیشمار مفلس اور غربا جن کو اپنی جان و بال ہے اور کنبہ پروری محال کیونکر ٹیکس ادا کر سکتے ہیں اور ان سے ٹیکس کا مطالبہ کہاں تک قرین انصاف و رحم ہوگا؟

(۳) ٹیکس متناسب ٹیکس مالی حالت کی نسبت سے بشرح مساوی قائم ہونا چاہیئے بظاہر تو یہ اصول قرین انصاف نظر آتا ہے لیکن درحقیقت اس کا بار امرا پر مقابلتہً کم پڑے گا اور متوسط الحال زیادہ زیر بار ہوں گے

(۴) ٹیکس متضاید ٹیکس بلحاظ فرق مالی حالت بشرح مختلف قائم ہونا چاہیئے۔ یعنی امرا پر بشرح اعلیٰ اور غربا پر بشرح ادنیٰ۔ تاکہ سب ٹیکس دہندے مساوی بار یا ایثار محسوس کریں

حصہ سوم باب ہشتم

مزید براں آگے چلکر اقسام ٹیکس کی بحث سے واضح ہوگا کہ ٹیکس کا بار کبھی ٹیکس دہندہ پر قائم رہتا ہے اور کبھی دوسروں پر بھی منقسم یا سراسر منتقل ہوسکتا ہے ایسی حالت میں حصول عدل کی کوئی تدبیر بھی پورے طور پر قابل عملدرآمد نہیں البتہ جس حد تک بھی عدل کا منشا پورا ہو سکے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔

(۵) تغیر پذیری: ٹیکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحوں سے اس طرح پر قائم کرنا چاہیئے کہ حسب حالات اس کی مقدار ماحصل میں اضافہ و تخفیف کی جا سکے۔ یہ نہیں کہ مصارف حکومت کے واسطے خواہ زیادہ رقم درکار ہو یا کم ہر حالت میں ماحصل ٹیکس کی مقدار وہی ایک ہی۔ اور کبھی خرچ کے واسطے بھی ناکافی ہوا اور کبھی زاید پڑی رہی گھربار کے انتظام میں تو بالعموم مصارف آمدنی کے ماتحت ہوتے ہیں لیکن نظام سلطنت میں آمدنی کو مصارف کا پیرو بنایا جاتا ہے۔ پس ماحصل ٹیکس جس حدتک کمی و بیشی مصارف کی متابعت کرے بہتر ہے بصورت دیگر سلطنت کی مالی حالت ہمیشہ متزلزل رہی گی۔

تعجب ہے کہ امریکہ جیسی ترقی یافتہ سلطنت کی ابتک یہ حالت ہے کہ کبھی سرکاری محاصل مصارف حکومت سے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور کبھی کم جس کی بدولت گاہے گاہے سخت دقتوں کا سامنا آپڑتا ہے اس لحاظ سے ہماری گورنمنٹ کا مالی نظام بہتر ہے۔

(۶) تعین:۔ اول تو یہ نہایت ضروری ہے کہ ٹیکس بشرح معین وصول کیا جاوے اور ٹیکس دہندہ کو بھی صحیح مقدار کا علم ہو تاکہ جبر یا دھوکہ سے کوئی سرکاری مطالبہ سے زیادہ وصول نکر سکے مزید براں شرح یا ذرائع ٹیکس میں جلد جلد رد و بدل نکرنا چاہیئے۔ ورنہ صدہا کاروبار اور معاملات درہم برہم ہوتے رہیں گے۔ معاملہ کرتے وقت لوگ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ موجودہ مالی نظام میں کوئی بہت بڑا تغیر مستقبل قریب میں ہوگا اور جب تک مستقل تغیرات کا اعلان نہو یہ مفروضہ بیجا بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے

کہ یکایک اگر خلاف توقع کوئی تبدیلی کیجاتی ہے تو ہزار ہا سکر ہزار ہا بگڑ جاتے ہیں۔ اگر کسی درآمد یا برآمد کی چیز پر جدید ٹیکس قائم کیا جائے یا صرف شرح میں کمی بیشی کیجاوے تو اس کے نرخ پر نمایاں اثر نمودار ہوگا۔ سرکاری قول کے مطابق شرح مالگذاری ماحصل زاید کا ۵۰ فیصدی ہے اب اگر وہ ۲۵ فیصدی یا ۷۵ فیصدی کر دیجاوے تو بہر صورت قیمت زمین میں بہت کچھ اضافہ و تخفیف ہونا لازمی ہے۔

قدیم ٹیکس کے تو لوگ اسقدر عادی ہو جاتے ہیں کہ کاروبار میں معمولاً اُن کا لحاظ کرتے کرتے کوئی بار محسوس نہیں ہوتا۔ چنانچہ کسی کا مقولہ ہے کہ قدیم ٹیکس کوئی ٹیکس ہی نہیں لیکن جب کوئی نیا ٹیکس قائم ہوتا ہے یا شرح گھٹتی بڑہتی ہے تو کاروباری سمندر میں لہریں پیدا ہو کر بعض کشتیوں کو غرق کر دیتی ہیں اور بعض کو بسرعت ساحل تک پہنچا دیتی ہیں کم از کم کچھ عرصہ کے واسطے سکون غائب ہو کر ہر طرف ابتری پھیل جاتی ہے اور جب تک ٹیکس بخوبی جاگزیں ہولے یہی حالت برپا رہتی ہے۔ لہذا ٹیکس متعین ہونے چاہئیں۔ اور جلد جلد رد و بدل کرنے سے احتراز لازم ہے۔

(۳) سہولت:۔ جہانتک ہو سکے ٹیکس کے ذرائع اور وصولی ٹیکس کے اوقات و طریق ایسے اختیار کیے جاویں کہ ٹیکس دہندوں کو نہ کوئی نقصان یا ہرج ہو نہ کوئی دشواری و دقت محسوس ہو۔ سیاست کا عام اصول ہے کہ اختیارات حکومت اس طرح برتنے چاہئیں کہ لوگوں کو کم سے کم گراں و ناگوار گزریں ٹیکس کا موجودہ اصول بھی اسی کا شائبہ ہے۔

ان چہار کے علاوہ ٹیکس کے اور اصول بھی قرار دیئے گئے ہیں لیکن وہ اکثر فروعات ہیں اور عمومیت سے معرا لہذا اُن کا بیان غیر ضروری طوالت ہوگی۔ واضح ہو کہ جو ٹیکس ان تمام اصول کے پابند ہوں وہ بلاشک نہایت عمدہ ہیں اور جو جس قدر کم پابند ہوں وہ اتنے

حصہ سوم باب ہفتم

ہی ناقص ہوں گے یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے۔ ایسا بھی تو ممکن ہے کہ ان اصول میں اختلاف آپڑا ہے۔ مثلاً کسی ٹیکس میں پیدا آوری ہو لیکن سہولت ہو یا کسی میں سہولت ہو تو عدل ہو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔ جواب صاف ہے۔ کمتر ضروری اصول بیشتر ضروری پر قربان کردیا جائے۔ ہمنے اوپر اصول بہ ترتیب اہمیت بیان کئے ہیں لہذا پیدا آوری عدل و سہولت پر بھی فائق ہے۔ سہولت عدل کے تابع ہونی چاہیئے لیکن ان اصول میں اختلاف کی طرح اتفاق بھی ممکن ہے مثلاً کفایت تعین اور سہولت پیدا آوری کے معاون ہیں اور تغیر پذیری پیدا آوری اور کفایت کی مؤید ہے اور خود پیدا آوری سے دوسرے اصولوں کو تقویت پہنچتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ماہر مالیات کا کمال یہ ہے کہ ان تمام اساسی اصولوں کو ٹیکس میں یکجا کر دکھائے اور اگر ایسا ممکن ہی نہو تو ادنٰے کو قربان کرکے اعلیٰ کو برقرار رکھے۔

اقسام ٹیکس

(۵) اول ٹیکس کے متعلق چند اصطلاحات جاننے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ جو شخص ٹیکس ادا کرے اسکو **ادا کنندہ** اور جس شخص پر ٹیکس کا بار پڑے اسکو **مورد ٹیکس** کہتے ہیں ان دونوں اصطلاحوں سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی یہ ممکن ہے کہ ٹیکس ادا کوئی کرے اور جیب سے کسی کے ادا ہو یعنی ادا کنندہ ٹیکس کا بار کسی اور پر ڈالدے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ ٹیکس کا کل بار ادا کنندہ پر شاذ و نادر ہی قائم رہتا ہے ورنہ اس کا کم و بیش جزو دوسروں پر ضرور منقسم ہوجاتا ہے ٹیکس کے ادا کنندہ سے دوسروں پر منتقل ہونے نہونے کے واقعہ کو اصطلاحاً **تعدیہ ٹیکس** سے تعبیر کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ مسئلہ ٹیکس میں یہی بحث سب سے زیادہ دقیق اور پیچیدہ ہے کہ کونسا ٹیکس ادا کنندہ پر قائم رہتا ہے اور کون کس حد تک دوسروں پر منتقل ہوسکتا ہے۔ اس کا پتہ چلانا نہایت دشوار ہے اور جو نتائج تحقیق ہوتے بھی ہیں بیشتر تخمینی ہیں ان میں تعین کی گنجائش بہت کم ہے تعدیہ ٹیکس کی چند اہم صورتوں سے بعنوان

ہاؤس ٹیکس انکم ٹکس وغیرہ ہم آیندہ جداگانہ بحث کرینگے۔ یہاں صرف اس قدر جتانا مقصود ہی کہ بعض ٹکس کا اداکنندہ اور مورد ایک ہی شخص ہوتا ہی اور بعض کے مختلف اور متعدد۔ جیسا کہ اس سے قبل جتایا جاچکا ہی۔ اگرچہ اس واقعہ کی تحقیق نہایت دشوار ہی تاہم معلومات اور تجربہ کی مدد سے تعدیہ کی بنا پر ٹکس کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ٹکس کا اداکنندہ اور مورد ایک ہی شخص ہو۔ یعنی جو دوسروں پر منتقل نہو سکے دوسرے وہ کہ جس کے اداکنندے اور مورد مختلف اور متعدد لوگ ہوں یعنی جو اداکنندہ سے گذر کر بہت سے لوگوں پر منقسم ہو جاوے اصطلاحاً اول کو **ٹکس بلاواسطہ** اور دوم کو **ٹکس بالواسطہ** کہتے ہیں لیکن ان ہر دو قسم کا امتیاز اسقدر متحقق اور نمایاں نہیں کہ کوئی قطعی حد فاصل ان کے درمیان قائم ہو سکے اور بعض ٹکس کے متعلق تو یہ طے کرنا ہی محال ہی کہ وہ کس قسم میں شمار ہونا چاہیئے۔ مثلاً مالگذاری اور انکم ٹکس قسم اول میں اور محصول چنگی آبکاری اور درآمد و برآمد قسم دوم میں شمار ہوتے ہیں اور فیس جسٹری و فیس اسٹامپ کی قسم کا تعین ہی دشوار ہی۔ بہرحال ٹکس قائم کرنے میں ماہرین مالیات کی دو میں سے ایک غرض ہوتی ہی یا تو یہ کہ جو شخص ٹکس ادا کرے وہی اس کے بار کا متحمل ہو۔ یا یہ کہ اداکنندہ بعد کو ٹکس دوسرے لوگوں سے وصول کر سکے اسی غرض پوری کرنے کے لیے وہ سو سو بیتیں بندیاں کرتے اور تدابیر نکالتے ہیں لیکن پھر بھی ٹکس بلاواسطہ اگر تھوڑا بہت دوسروں پر منتقل ہو جاوے تو عجب نہیں۔ اور اس کے برعکس ٹکس بالواسطہ ہمیشہ اس حد تک اور اس سہولت و سرعت سے دوسروں پر منتقل نہیں ہوتا جتنا کہ مقصود ہوتا ہے ہر دو قسم کے ٹکس کی ماہیت اور ان کی عدم تیقن کی خامی واضح کرنے کے بعد ہم ان کے حسن و قبح کی بھی ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

ٹکس بلاواسطہ۔ لگان۔ سود۔ اجرت یا ملک و جائداد میں سے براہ راست

حصہ سوم
باب ہفتم

و صریحاً بمعیار و بشرح معین حصہ نکالتا ہے۔ یہ ٹیکس سیاسی تربیت کا نہایت کارگر آلہ ہے۔ انسانی خاصہ ہے کہ جس کام میں کسی کا کچھ روپیہ لگتا ہے اس سے خواہ مخواہ تعلق اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ بعض انجمنوں میں تو علاوہ مالی امداد کے دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے بھی ممبروں سے چندہ طلب کیا جاتا ہے جبکہ لوگ حالات لوجھکر مصارف حکومت ادا کرتے ہیں تو اُن کو سیاسی معاملات سے خود بخود زیادہ تعلق محسوس ہونے لگتا ہے اور اُس کا نتیجہ عام سیاسی بیداری ہوتا ہے اس کے برعکس ٹیکس بالواسطہ جو کہ بطور محصول چنگی آبکاری درآمد و برآمد خرید و فروخت کے سامان پر قائم ہوتا ہے اور جس کے ادا کنندہ تو بالعموم آجر و تاجر ہوتے ہیں لیکن جو بذریعہ اضافہ قیمت بالآخر خریداروں سے وصول ہو جاتا ہے مو ردوں کی نظر سے بیشتر چھپا ہوتا ہے اور اُن کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کوئی ٹیکس اُن پر پڑ رہا ہے۔ ادا کنندہ اسوجہ سے زیادہ پرواہ نہیں کرتا کہ اس کو ٹیکس دوسروں سے وصول ہو جاتا ہے۔ پھر ایسا ٹیکس لوگوں کو سیاسی معاملات کی طرف کیونکر متوجہ کر سکتا ہے ٹیکس بلاواسطہ میں غربا زیر باری سے محفوظ رکھے جا سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس ٹیکس بالواسطہ میں بذریعہ گرانی ضروریات غربا پر ہی زیادہ بار پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے جو کہ سراسر عدل کے خلاف ہے۔

مزید براں اوّل تو ٹیکس بلاواسطہ فراہم کرنے کے مصارف مقابلتہً کم ہوتے ہیں نیز وہ کاروبار میں بھی حارج کمتر ہوتا ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ٹیکس دہندہ کو مقدار ٹیکس سے زیادہ ادا کرنا نہیں پڑتا مثلاً ہر شخص ٹیکس بلاواسطہ کی مقدار معلومہ ادا کر کے باضابطہ رسید لے سکتا ہے لیکن اگر ٹیکس بالواسطہ بشرح ڈیڑھ یا دو پائی فی چیز قائم ہو تو خریداروں کو غالباً بمقدار ایک پیسہ فی چیز ادا کرنا پڑیگا اور باہمی فرق ڈیڑھ یا ایک پائی تاجر جیسے درمیانی لوگوں کی گرہ میں رہیگا عام مشاہدہ ہے کہ نرخ اکثر اور خصوصاً خردہ فروشی میں کوئی نہ کوئی سہل رقم ہوتی ہے مثلاً چند پیسے آنے یا روپئے۔ جن رقموں کے حساب میں دقت ہو مثلاً ۲½ پائی یا

حصہ سوم
باب ہشتم

۳ ۴/۵ آنہ یا ایک روپیہ ۱۵ آنہ ، پائی۔ تو ایسی رقموں سے رخ مقرر نہیں کیا جاتا بلکہ کچھ اضافہ کرکے اسکو سہل بنایا جاتا ہے مثلاً ایک پیسہ ۵ آنہ یا ۶۔ نتیجہ یہ کہ جیر یں جسقدر تھوک فروشی سے گذر کر خردہ فروشی کی طرف بڑھتی ہیں ٹیکس بالواسطہ کی مقدار گھٹتی جاتی ہے اور سہل رقم کے اصول پر خریداروں سے مقدار ٹیکس سے زیادہ رقم بشکل اضافہ قیمت وصول کرنا آسان ہوتا ہے یعنی چونکہ فی نفسہ اس کی مقدار اکثر قیمت کا نہایت چھوٹا جزو ہوتی ہے لوگ اس کی پروا کم کرتے ہیں ٹیکس بالواسطہ کی مثال اس سیّال کی سی ہے جس کا ایک حصہ برتن سے رس رس کر صرف مقصود پر پہنچنے تک راستہ ہی میں گر جاوے لیکن سود بلاواسطہ کے چند قطرے بھی بمشکل ضائع ہو سکتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ مقابلتہً ٹیکس بلاواسطہ میں صفت کفایت بدرجہ اعلیٰ پائی جاتی ہے۔

لیکن بعض خوبیوں کے لحاظ سے ٹیکس بلاواسطہ فائق نظر آتا ہے اس میں سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ لوگوں کو گراں نہیں گذرتا حتیٰ کہ کبھی تو اس کی ادائگی کا علم تک نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایسے ٹیکس کا اضافہ بہ آسانی ممکن ہے۔ حالانکہ اگر ٹیکس بلاواسطہ بڑھایا جاوے تو لوگوں کو زیادتی بار فوراً محسوس ہونے لگتا ہے اور اکثر عام ناخوشی اور مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے آئینی سلطنتوں میں عوام کی خوشی ناخوشی تائید مخالفت ازحد باوقعت اور توجہ طلب مانی جاتی ہے اور سیاسی مصالح بھی قسم ٹیکس کے انتخاب کی خاص بنا ہوتی ہیں۔ متوسط الحال اور کم آمدنی والوں کے واسطے ٹیکس بالواسطہ اسوجہ زیادہ موزوں ہے کہ جب وہ ضروریات خریدتے ہیں تو معیار خرید بذریعہ گرانی نرخ اپنے حصہ کا ٹیکس ادا کر دیتے ہیں لیکن ٹیکس بلاواسطہ قائم کرنے میں چند در چند دقتیں پیش آتی ہیں۔

چنانچہ یہ ایک عام خیال ہے اور بڑی حد تک درست ہے کہ ٹیکس بلاواسطہ امرا کے لیے موزوں ہے اور بالواسطہ متوسط الحال اور کم آمدنی والوں کے حق میں مناسب ہے۔

حصہ سوم
باب ہتم

ٹیکس بالواسطہ میں مقابلۃً سہولت بھی زیادہ پائی جاتی ہے اول تو اس کا علم ہی کم ہوتا ہے دوم لوگ اس کو ضروریات خریدنے میں بلا جبر واکراہ حسب وقت چاہے ادا کرتے ہیں۔ حالانکہ ٹیکس بلاواسطہ جبا جبا کر وقت معینہ پر باقاعدہ طلب کیا جاتا ہے اور بصورت عدم ادائگی تعذیر تک نوبت آجاتی ہے۔

ٹیکس بالواسطہ مقابلۃً تغیر پذیر بھی زیادہ ہوتے ہیں یعنی کاروباری حالات کے متعلق ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ بلا ردوبدل ان میں خود بخود اضافہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن ٹیکس بلاواسطہ کم و بیش کچھ عرصہ کے واسطے معین ہوتے ہیں اور بلا مزید کوشش ان میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہاں پر یہ نکتہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکس بالواسطہ کی یہ صفت تغیر پذیری جس قدر بحالت معاشی ترقیات مفید ہے اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ بصورت سرد بازاری کاروبار خطرناک بھی ہے اس کے برعکس اگرچہ ٹیکس بلاواسطہ میں اضافہ خود بخود فوراً نمودار نہیں ہوتا کبھی اس کے تخفیف میں بھی دیر لگتی ہے اور کچھ عرصہ کے واسطے اس کی مقدار مستقل و معین ہوتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اچھے زمانہ میں تو ٹیکس بالواسطہ بھی زیادہ پیدا آور ہے لیکن اڑے وقت ٹیکس بلاواسطہ ہی کام آتا ہے۔ چنانچہ گو محصول چنگی و درآمد و برآمد کی مقدار بڑھتی رہتی ہے لیکن گورنمنٹ ہند کے محاصل کی پشت پناہ مالگذاری ہی مانی جاتی ہے۔

جو ٹیکس بلحاظ قسم مخلوط ہوں یعنی نہ صاف طور پر بلاواسطہ ہوں یا بالواسطہ مثلاً فیس اسٹامپ و رجسٹری ان میں مذکورالصدر خوبیوں اور نقص میں سے کوئی بھی ہونا نہ ہونا ممکن ہے۔

ہر دو قسم ٹیکس کی حسن و قبیح کا لب لباب بحوالہ اصول ٹیکس پیش نظر کرنا مفید ہوگا۔

(۱) ٹیکس بلاواسطہ۔ عدل۔ کفایت۔ تعین۔

حصہ سوم

(ب) ٹیکس بالواسطہ۔ پیدا آوری۔ سہولت تغیر پذیری۔

باب ہفتم

اشکال ٹیکس

(۶) ٹیکس کے اصول و اقسام کی مذکورالصدر بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ ہر شخص سے براہ راست ایک معین رقم بطور ٹیکس لینا نہ ممکن ہے نہ مفید۔ گو بعض لوگ اصولاً **ٹیکس مفرد** کے حامی ہیں لیکن یہ طریق عملاً دقت طلب بلکہ مضر ثابت ہوگا اور آج کل ہر جگہ **ٹیکس مرکب** کا رواج بڑھ رہا ہے ٹیکس کی متعدد شکلیں ہوتی ہیں جن میں سے بعض کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور بعض کو باوجود ادا کرنے کے پہچانتے تک نہیں اور ان سب کے اتفاق عمل کے مجموعی نتائج سے نظام مالیات کے حسن و قبح کا اندازہ کرنا چاہیے اس غرض کے لیے ایک یا دو ٹیکسوں کے نتائج پر اکتفا کرنا بیجا ہوگا۔ پس ٹیکس کی چند مروجہ شکلیں پیش نظر کرنا بے محل نہ ہوگا۔

ٹیکس بلاواسطہ آمدنی یا ملک پر قائم ہوتا ہے۔ لگان اجرت سود اور منافع آمدنی کی چار قسمیں ہیں۔ رہا ٹیکس بر ملک۔ سو ہاؤس ٹیکس اس کی عمدہ مثال ہے ان میں سے مالگذاری پر لگان کے تحت میں بحث ہو چکی ہے۔ آمدنی کے باقی ٹیکس بعنوان انکم ٹیکس اور نیز ہاؤس ٹیکس ابھی واضح کیے جائیں گے محصول بر پیداوار محصول چنگی اور محصول درآمد و برآمد جو ضروریات پر قائم ہوتے ہیں ٹیکس بالواسطہ کی مروج اشکال ہیں ٹیکس بر پیداوار سے بعنوان نفع المصرف اور محصول درآمد و برآمد سے تجارت بین الاقوام کے تحت میں آگے چلکر بحث کریں گے اجارہ کی بحث میں آئندہ بوجہ چند خصوصیات ٹیکس پر جداگانہ غور کیا جائے گا۔ بالواسطہ ٹیکسوں میں سے صرف محصول چنگی یہاں بیان ہوگا۔ رہے وہ چند ٹیکس جن کی قسم غیر محقق ہے مثلاً فیس اسٹامپ۔ رجسٹری و داخل خارج۔ لائسنس۔ پیشہ ان سے بھی مختصراً ہم یہیں بحث کریں گے۔

انکم ٹیکس

(۷) ٹیکس بلاواسطہ کی بہترین مثال **انکم ٹیکس** ہے جس میں اس کی خوبیاں اور نقائص بدرجہ اولیٰ موجود ہیں اس ٹیکس کا بار بکثرت دولتمندوں پر پڑتا ہے اور بوجہ بلاواسطہ ہونے کے بہت

حصہ سوم گراں گزرتا ہے جیساکہ حکومت شخصی یا حکومت امراء کے زمانہ میں ٹیکس رائج ہو سکا لیکن جب سے آئینی

باب ہشتم حکومت میں عوام کا زور بڑھا اس ٹیکس کا رواج بھی پھیلنا شروع ہوا اور آج ہر مہذب ملک میں

یہ رائج پایا جاتا ہے۔ امرا اور دولتمندوں کو تو شاید اب بھی پسند نہ ہو لیکن حکومت میں عوام کے غلبہ کے

ہاتھوں وہ مجبور ہیں۔ اور خواستہ نخواستہ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں غربا تو اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔

متوسط الحال لوگوں پر بھی بشرح ادنیٰ قائم کیا جاتا ہے البتہ بڑی بڑی آمدنی والوں سے یہ ٹیکس

بشرح اعلیٰ وصول ہوتا ہے اس تفریق کی بنا اوّل تو بعنوان تقرر ٹیکس واضح کی جا چکی ہے مزید

برآں ٹیکس بالواسطہ عموماً گرانی نرخ کا باعث ہو کر عوام اور غربا سے وصول ہوتا ہے اور مقابلتہً اس

کا بار امرا پر کمتر پڑتا ہے۔ پس اس عدم مساوات کی اصلاح بھی بذریعہ انکم ٹیکس متصاعد

ہی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں سوشیلزم کی بحث میں بعنوان دولتمندی و افلاس تقسیم دولت میں

مساوات پیدا کرنے کی ایک سبیل یہی انکم ٹیکس تجویز ہو چکا ہے۔ گویا علاوہ سرکاری آمدنی کے

انکم ٹیکس کی ایک غرض موجودہ عدم مساوات تقسیم دولت بھی رفع کرنا ہے یعنی دولتمندوں کی آمدنی

کا ایک مناسب حصہ بذریعہ ٹیکس لیکر غربا اور عوام کی بہبودی پر صرف کرنا۔ اور اگر انکم ٹیکس کا بار

ناقابل برداشت نہ ہو کر افزونی دولت سے مانع نہ ہو تو یہ آخری مقصد بھی بلا کسی اندیشہ اور مضرت

کے حاصل ہو سکتا ہے۔

انکم ٹیکس اگر بشرح مناسب وصول کیا جاوے جیساکہ آج کل ہوتا ہے تو اس کا بار ادا کنندہ

پر ہی رہتا ہے کوئی دوسرا اس کا مورد نہیں بنتا لیکن اگر وہ اس قدر گراں بنا دیا جائے

کہ اجرت سود یا منافع کا جزو اعظم ضبط کر لے تو محنت اصل اور کاروبار کے اضافہ و ترقی کے

رکنے سے اس کا بار کلاً یا جزواً بذریعہ گرانی نرخ عوام پر جا پڑیگا یعنی ادا کنندہ تو دولت مند

ہی رہیں گے لیکن اس کے مورد تھوڑے بہت عوام بھی ہو جائیں گے موجودہ انکم ٹیکس کے

متعلق خیال ہے کہ اس کے ادا کنندہ اور مورد دولت مند لوگ ہی ہیں اور غربا اس کے

بار سے محفوظ ہیں۔

(۸) مکانات پر جو ٹیکس قائم کیا جاتا ہے اُس کا حُسن و قبح معیار اور اس کے تشریح کی کیفیت کے بعد دیگرے ہم ذیل میں بیان کرنا چاہتے ہیں بعض دیگر معاشی مسائل کی طرح ہاوس ٹیکس کی بحث بھی معمول سے زیادہ پیچیدہ اور توجہ طلب ہے۔ بخوف طوالت جیرانی فروعات اور جزوی اختلافات نظرانداز کر کے ہاوس ٹیکس کے سلیس و مختصر مگر جامع بیان پر اکتفا کرنا یہاں زیادہ قرین اصول معلوم ہوتا ہے چنانچہ ہاوس ٹیکس کے کل بحث مباحثہ میں سے صرف چند اہم اور عام پہلو بہ ترتیب موزوں یکجا پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حصہ سوم باب ہشتم ہاوس ٹیکس

یہ اصول تو قرار پا چکا ہے کہ لوگوں سے ٹیکس اُن کی مالی حیثیت کے مطابق لینا چاہیئے۔ امیروں سے زیادہ متوسط الحال سے کم اور غربا سے برائے نام یا کچھ بھی نہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ مکان کی حیثیت اور مکاندار کی مالی حالت میں یک گونہ تناسب ہوتا ہے۔ خوش حال لوگ عالیشان محلات میں رہتے ہیں۔ عوام معمولی مکانات میں اور غربا کچے پکے جھونپڑوں میں گویا بالعموم مکان کی حیثیت سے مکاندار کی مالی حالت کا صحیح پتہ چلتا ہے لہذا مکان کو مالی حالت کا معیار قرار دیکر اسی کے مطابق ٹیکس مقرر کیا جاتا ہے جس کو اصطلاحاً **ہاوس ٹیکس** کہتے ہیں اس ٹیکس میں چند خوبیاں بتلائی جاتی ہیں اول تو مکان زندگی کے ناگزیر ضروریات میں داخل ہے اور لوگ بالعموم اپنی حیثیت کے موافق اچھے سے اچھے مکان میں رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر مکان حسب دلخواہ میسر نہ آسکے تو گویا زندگی دوبھر معلوم ہونے لگتی ہے۔ دوم مکان آدمی کی مالی حالت کا ایسا بین اور واضح ثبوت ہے کہ کوئی اس کو چھپا کر ٹیکس سے بچ نہیں سکتا۔

پس اگر غربا کے مکانات مستثنیٰ بھی کر دیے جائیں تب بھی اس ٹیکس سے معقول مقدار حاصل ہو سکتی ہے۔ گویا اولین صفت پیداآوری اس ٹیکس میں موجود ہے۔ نیز اس میں

حصہ سوم
ما تستم

دوسری صفت کفایت بھی موجود ہے اوّل تو اس کی فراہمی میں زیادہ خرچ درکار نہیں دوم مکاندار کو مقدار ٹیکس سے زیادہ کسی حالت میں ادا کرنا نہیں پڑتا اور اگر وہ مقدار متناسب سے تجاوز نہ کرے تو ترقی دولت و مرفہ الحالی سے بھی مزاحم نہیں ہوتا۔ چونکہ بالعموم مکانات کی حیثیت مکاندار کی مالی حالت کے مطابق ہوتی ہے اس ٹیکس میں عدل بھی ملحوظ رہتا ہے جبکہ معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ مکانات کی قدر و حیثیت بھی بڑھتی ہے تو اس ٹیکس میں صفت تغیر پذیری بھی ہونا عجب نہیں۔ صفت تعین پیدا کرنا خود اختیاری ہے۔ اس کی سہولت بھی صاف ظاہر ہے۔ پس بحیثیت مجموعی ہاؤس ٹیکس کل ضروری اصول کا کم و بیش پابند نظر آتا ہے صرف خاص خاص حالتوں میں وہ بعض اصول کے منافی ہو سکتا ہے جس کی تفصیل ہم آیندہ کریں گے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس ٹیکس کا رواج ہر ملک میں پھیلتا جاتا ہے خود ہندوستان کے اکثر شہر اور قصبوں میں محصول چنگی توڑ کر ہاؤس ٹیکس جاری کیا جا رہا ہے لیکن ہم آگے چلکر واضح کریں گے کہ بعض حالتوں میں کیونکر اس ٹیکس سے سرکار اور عوام کو یکساں نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس اصول کے مطابق مکانات پر ٹیکس قائم کرنا چاہئے۔ کسی زمانہ میں تو یورپ کے اکثر ممالک میں مکان کے دریچے دروازے یا روشندان شمار کر کے اُن کے مطابق ٹیکس وصول کیا جاتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ حیثیت مکان کے یہ قابل اعتماد معیار نہ تھے اور طرز عمارت بدلکر ٹیکس سے کم و بیش بچنا ممکن تھا اسلیئے اول اول تعمیر مکان کی اصلی لاگت اور کچھ عرصہ بعد لاگت تعمیر کا موجودہ تخمینہ تعین ٹیکس کا معیار قرار پایا لیکن عام مشاہدہ ہے کہ مکان کی خوبی و قیمت میں عمارت سے کہیں زیادہ موقع کا دخل ہے چنانچہ اس سے قبل جا بجا لگان و قیمت زمین کی بحث میں موقع کا اثر زرعی اور بالخصوص سکنی اراضیات کی قیمت و آمدنی پر بالتفصیل واضح کیا جا چکا ہے۔ ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں کہ بے موقع عالیشان عمارت پر با موقع معمولی مکانات کو لوگ بہت زیادہ ترجیح دیتے ہیں اول الذکر قسم کی عمارتوں کا کرایہ بمقابلہ آخر الذکر مکانات کے

بہت کم ہوتا ہے اور نیز بصورت فروخت بے موقع عمارات کی لاگت تعمیر کا عشر عشیر بھی ملنا دشوار ہو جاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے کہ فلاں عمارت کے بانی کے دام بھی وصول نہیں ہوئے! اس کے برعکس عمدہ موقع کے مکانات کی قیمت لاگت تعمیر سے دس گنا زیادہ بآسانی بڑھ سکتی ہے۔ پس واضح ہوا کہ اصلی لاگت یا اس کا موجودہ تخمینہ بھی حیثیت مکان کا عمدہ معیار نہیں بلکہ کسی مکان کی حیثیت کا معیار اس کا کرایہ سمجھنا چاہیئے جو کرایہ داروں سے وصول ہو سکے۔ جو جتنے زیادہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہے۔ اسی قدر خوشحال سمجھا جانا چاہیئے بے موقع اور کم کرایہ کے محض عالیشان مکانات میں رہنے سے لوگ امیر شمار نہیں کیے جا سکتے اور نہ ایسے مکانات مالکوں کے حق میں بمقدار لاگت دولت سمجھنے چاہئیں۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ قدیم بے موقع محلات مسمار کرانیکا خرچ ملبہ کی قیمت سے بھی بڑھ جاتا ہے اور صاف کرائے بغیر زمین سے کوئی آمدنی حاصل نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں گویا مکان ایک قسم کی دولت منفی ہے جو آمدنی زمین سے مزاحم ہوتی ہے اور جس سے سبکدوش ہونے کے واسطے خرچ ناگزیر ہے۔

کسی نئی سڑک کے کنارے جہاں صرف دوکانات کی طلب ہو قدیم وضع کی وسیع اور عالیشان مستحکم عمارت جس کا کوئی خواستگار نہ ہو یا ہو تو بہت تھوڑا کرایہ دے یا تو سراسر دولت ہی نہیں یا لاگت تعمیر سے صدہا گنی کم۔ باموقع مکان کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ہاوس ٹکس کا معیار مکان کا کرایہ ہونا چاہیئے نہ کہ اصلی لاگت تعمیر یا اس کا موجودہ تخمینہ معیار کی مذکورالصدر بحث سے ایک عملی نتیجہ واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ قدیم پس ماندہ شہر اور قصبات جو کبھی دولت وحشمت کا مرکز رہ چکے ہوں اور جہاں قدیم عالیشان عمارات کی کثرت ہو لیکن جہاں اب نکبت وافلاس کی ایسی گھٹا چھائی ہو کہ مکینوں کو اپنے آبا واجداد کے مکانات کی مرمت کی بھی توفیق نہ ہو۔ جہاں بوجہ پس ماندگی مکانات کی طلب بھی بہت کم ہو اور محلات سے ترقی یافتہ شہروں کے جھونپڑوں کا بھی کرایہ وصول نہ ہو سکے وہاں

عدسوم ماہیتم

ہاوس ٹکس جاری کرنا عقل و مصلحت دونوں کے خلاف ہے اگر ہاوس ٹکس کا معیار لاگت عمارت قرار پائے تو علاوہ خلاف اصول ہونے کے ہاوس ٹکس مکینوں کو جلد تباہ کر کے خود بھی فنا ہو جائے گا۔ اور اگر کرایہ مکانات معیار ہو تو اول ہی سے کچھ وصول نہ ہوگا۔ بہر صورت ٹکس ناکامیاب ہیگا اور بصورت اوّل مکینوں کی مزید تباہی کا بھی باعث ہوگا۔

بڑی ایسے قصبات جہاں ایک سرے سے عمدہ عمارات بھی نہوں اور غربا جھونپڑوں اور کچے مکانات میں بسے ہوں وہاں پر ہاوس ٹکس کا رواج خارج از بحث ہے پس ہاوس ٹکس صرف جدید خوشحال اور ترقی پذیر شہروں کے واسطے موزوں ہے جہاں مکانات کی بہت مانگ ہو اور کرایہ اعلی ہو۔ ایسی جگہ ٹکس کی مقدار بھی بہت کثیر رہیگی اور لوگوں پر بار بھی نہوگا۔

جو قصبہ بہت سے خوش حال لوگوں کا وطن ہو جہاں انہوں نے عمدہ عمارات بنا رکھی ہوں اور وقتاً فوقتاً آکر رہتے ہوں لیکن جہاں کاروباری مرکز نہونے کی وجہ سے مکانات کی مانگ کم ہو اور زیادہ کرایہ وصول نہو سکے وہاں ہاوس ٹکس بمعیار لاگت قائم کرنا بھی مضائقہ نہوگا لیکن ایسے قصبات شاذ و نادر مل سکتے ہیں۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ ترقی پذیر شہروں اور کاروباری مرکزوں میں جہاں مکانات کی بہت مانگ ہوتی ہے اور کرایہ اعلی ہوتا ہے۔ خوشحال لوگ رہتے ہیں اور پس ماندہ قصبات میں جہاں قدیم عمارات ہوں یا نہوں مکانات کا کرایہ اور اُن کی حیثیت ادنی ہوتی ہے۔ جن میں غریب خاندان رہتے ہیں۔

بڑے شہروں کی دیکھا دیکھی یہ جو ہر قصبہ میں محصول چنگی توڑ کر ہاوس ٹکس جاری کرنے کا خبط ہر طرف پھیل رہا ہے یہ نہایت غیر عاقلانہ نقالی ہے جس کا کبھی کبھی میونسپلٹی اور باشندگان شہر کو سخت خمیازہ اُٹھانا پڑے تو عجب نہیں۔ ہاوس ٹکس فی نفسہ بہت اچھا ہی لیکن اس کے واسطے موقع و محل شرط ہے۔ ایک ہی دوا یا غذا کسی کے حق میں آبحیات اور کسی کے حق میں سم قاتل ہو سکتی ہے۔

حصہ سوم
باب ہشتم

اسی سلسلہ میں یہ نکتہ بھی جتانے کے قابل معلوم ہوتا ہی کہ ہاوس ٹیکس بمعیار لاگت تعمیر وصول کرنے سے یہ اندیشہ ہوسکتا ہی کہ ٹیکس سے بچنے کی خاطر لوگ عمدہ عمارتیں بنانا کم کردیں اور شہروں کی شان و خوبصورتی میں فرق آجائے اکثر خوشحال لوگ تعمیر میں محض شان و خوبصورتی کی خاطر دل کھولکر دولت لگاتے ہیں اور اس بیش خرچی سے کرایہ میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوتا۔ البتہ عمارتیں نہایت مستحکم اور قابل دید ہوتی ہیں ایسی ہی عمارتیں ہر ترقی یافتہ شہر کی آرائش سمجھنی چاہئیں اور ٹیکس بمعیار کرایہ اُن سے کسی طرح مزاحم ہوگا۔ مزید براں ٹیکس بمعیار کرایہ مقابلۃً کم گراں گزرتا ہی وجہ یہ کہ کرایہ حیثیت عمارت سے کہیں زیادہ موقع پر منحصر ہوتا ہی اور عمدگی موقع بالعموم عام ترقیات کا نتیجہ ہوتی ہی مالک مکان کو اپنی گرہ سے بہت کم خرچ کرنا پڑتا ہی لہذا جبکہ کرایہ میں عام ترقیات سے اضافہ ہو تو اس کا ایک جزو بہبودی عامہ کے واسطے بطور ٹیکس دینا مالک مکان کو کیونکر گراں گذر سکتا ہی معیار لاگت کے مقابلہ میں بمعیار کرایہ اگر ٹیکس کی مقدار زیادہ بھی ہی تو دینے والے کو ناگوار اس وجہ سے نہیں گزرنا چاہئے کہ محض موقع کی بدولت جو عام ترقیات کا آفریدہ ہی۔ مکان کی حیثیت سے کہیں زیادہ کرایہ مل رہا ہی اگر اس میں سے حصہ طلب کیا جاوے تو کیا بیجا ہی۔ اس کے برعکس اگر ٹیکس بمعیار لاگت معیار کرایہ کے مقابل میں زیادہ ہو تو مالک مکان اپنے کو دوگونہ بدقسمت سمجھے گا وجہ یہ کہ کرایہ تو مکان کی حیثیت سے کم ملتا ہی اور ٹیکس کرایہ کی حیثیت سے کبھی زیادہ ادا کرنا پڑتا ہی۔ گویا مکان کی عمدگی سے بجائے نفع کے نقصان پہنچتا ہی۔

اگر کوئی چیز درحقیقت وہی ہی تب بھی اکثر محض ظاہری صورت بدلجانے سے اس کا اثر طبیعت پر مختلف پڑسکتا ہی فطرت انسانی کا یہ ایک نہایت نتیجہ خیز خاصہ ہی جس کا لحاظ کرنے نہ کرنے سے بڑے بڑے کام سنورتے اور بگڑتے ہیں۔ ہاوس ٹیکس ادا تو بہر صورت کیا ہی جاتا ہی۔ لیکن محض معیار کا ادا کنندوں کی طبیعت پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہی۔ معیار

حصہ دوم لاگت بظاہر عمدہ عمارت بنانے کا صرمایہ معلوم ہوتا ہی اور معیار کرایہ گویا آمدنی میں سے ایک حصہ کا
باب ششم جائز مطالبہ نظر آتا ہی۔

انکم ٹکس کی طرح ہاؤس ٹکس سے بھی غریب لوگ جو کچے مکانات اور جھونپڑوں میں رہتے ہیں مستثنے کرنے بلحاظ انصاف و مصلحت ضروری ہیں۔ پھر جبکہ معیار کرایہ ہاؤس ٹکس قائم کیا جائے تو مکان کی مرمت اور درستی کے تخمینی مصارف کرایہ میں سے اوّل مُہا کر دینے چاہئیں گویا کرایہ کی خالص آمدنی پر ٹکس قائم ہونا چاہئے یہاں یہ جتانا غیر ضروری ہی کہ جو لوگ خود اپنے مکانات میں رہیں اُن کے مکانوں کے کرایہ کا تخمینہ کیا جا سکتا ہی۔ البتہ جو مکانات غیر معمولی طور پہ وسیع اور عالیشان ہوں کہ گرد نواح میں ان جیسے مکانات کا کوئی کرایہ دار ہی نہ مل سکے اور جن کے کرایہ کا تخمینہ دشوار ہو وہاں بطور خاص معیار لاگت استعمال کیا جا سکتا ہی لیکن ایسی صورتیں بہت کم پیش آتی ہیں اور معیار کرایہ میں شاذ و نادر مزاحم ہوتی ہیں۔

ہاؤس ٹکس کے حُسن و قبح اور اس کے معیار سے بحث کر چکنے کے بعد اب ہم اس کا تعدیہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں یعنی دیکھنا یہ ہی کہ ہاؤس ٹکس کا ادا کنندہ کون ہوتا ہی اور مورد کون عملاً ٹکس کس سے وصول کیا جاتا ہی اور حقیقتاً اس کا بار کس پر پڑتا ہی۔ اس غرض کیواسطے اوّل ٹکس کی چند خصوصیات سمجھانی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

ہاؤس ٹکس سے جو رقم وصول ہو وہ دو طرح پر صرف ہو سکتی ہی یا تو ایسے کاموں میں کہ مکانداروں کو آرام پہنچے مثلاً شہر کے گلی کوچوں کی صفائی اور روشنی۔ نل کا پانی۔ مفت ابتدائی تعلیم یا ایسی مدوں میں کہ ٹکس دہندوں کو کسی قسم کا اس سے نفع پہنچتا معلوم نہو۔ مثلاً ایسے قدیم قرض اور اُس کے سود کی ادائگی جو کسی مفید کام میں لگا ہو مگر بوجہ ناکامیابی ضائع ہو گیا ہو۔ جیسے کہ کسی قصبہ میں صفائی کی زمین دوز نالیاں یا نل کا پانی جاری کرنے میں بہت سا روپیہ صرف کیا جائے مگر بالآخر اسکیم ناقابل عمل ثابت ہوا اور کل لاگت

حصہ سوم باب ہشتم

اکارت جاوے یا مثلاً امراء سے لیے ہوئے ہاؤس ٹیکس کا حرو غرباء کے مفت علاج پر صرف ہو تو اس ٹیکس سے براہ راست امرا کو فائدہ محسوس نہ ہوگا بحالت اول ہاؤس ٹیکس اصطلاحاً **ٹیکس فیض رساں** اور بحالت ثانی **ٹیکس بے فیض** کہلائے گا بلحاظ وسعت حلقہ بھی ٹیکس کی دو قسمیں ہیں **لوکل یا مقامی** وہ کہ کسی خاص شہر تک محدود ہو **امپیریل یا ملکی** جو کہ تمام ملک سے یکساں وصول کیا جائے بیر مقامی اور ملکی کے بین بین ٹیکس کی ایک تیسری قسم **پراونشیل** یا **صوبہ وار** بھی ہے جو ملک کے کسی حصہ یا صوبہ میں رائج ہو اس سے قبل معیار ٹیکس کی بحث میں ابھی واضح ہو چکا ہے کہ کسی مکان کا کرایہ عمارت کی حیثیت اور زمین کے موقع پر منحصر ہے اگر دو یکساں حیثیت والے مکانوں سے جو شہر کے مختلف حصوں میں واقع ہوں ۴۰ اور ۶۰ روپیہ ماہوار کرایہ وصول ہو تو آخر الذکر کرایہ میں (۶۰-۴۰) ۲۰ روپیہ کرایہ موقع زمین شمار ہوگا۔ اگر تعمیر کو بھی ایک قسم کی پیداوار زراعت فرض کریں اور اس کے کرایہ کو زرعی پیداوار تو لگان کی مذکور الصدر بحث کی روشنی میں یہ سمجھنا دشوار ہو گا کہ جو کرایہ بمد عمارت وصول ہو وہ درحقیقت اُس **اصل قائم** کا سود مع مطالبات فرسودگی وغیرہ ہے جو بشکل عمارت منقلب ہے اور جو کرایہ بوجہ موقع زمین ملے وہ زرعی لگان کی مانند حسن اتفاق اور ایسے اسباب کا آفریدہ ہوتا ہے جن پر مالک زمین کو بہت کم قابو حاصل ہو۔ اگر کرایہ پر چلانے کی نیت سے مکانات تعمیر کرائے جائیں تو گویا تعمیر بھی یک گونہ شغل اصل ہے اور عمارات اصل قائم کی ایک شکل ظاہر ہے کہ جب تک عرصہ تک ایسے اصل قائم یعنی عمارات پر بشرح مناسب سود و مطالبات فرسودگی وغیرہ بشکل کرایہ وصول ہونے کی امید ہو کوئی مکانات بنا کر غیر پیداآور کام میں اپنا روپیہ کیوں پھنسانا گوارا کریگا! ور جبکہ مکانات کی مانگ اس قدر ہو کہ بیموقع سے بے موقع مکان کا کرایہ بھی کم از کم اصل قائم کا سود و مطالبات پورے کر سکے تو باقی مکانات کا موقع جس قدر عمدہ ہوگا کرایہ بھی اسی قدر زیادہ ہوگا اور یہ اضافہ کرایہ لگان میں شمار ہوگا۔ لگان کی تفصیل ور موجودہ اجمال پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہوگا کہ زمین خواہ زرعی

ہو یا کسی اس کا معاشی لگان یا کرایہ یکساں اسباب و حالات کا آفریدہ ہی۔ اور بہر صورت وہ نرخ پیداوار یا کرایہ مکانات کے اضافہ کا نتیجہ ہوتا ہی نہ کہ باعث اور کسی حالت میں وہ مصارف پیدائش کا جزو شمار نہیں ہو سکتا۔ المختصر کرایہ مکانات کے دو جزو ہوتے ہیں **کرایہ عمارت** جس کو اصل قائم کا سود اور مطالبات خطر و فرسودگی سمجھنا چاہئے دوم **کرایہ زمین** جو ہر طرح پر معاشی لگان ہوتا ہی۔

ٹکس کی چار قسمیں۔ فیصد رسانی بے فیض اور مقامی و ملکی اور کرایہ مکانات کے دو جزو کرایہ عمارت و کرایہ زمین یہ سب واضح کرنے کے بعد اب ہم تعدیہ ٹکس کی کیفیت پیش کرنا چاہتے ہیں بالعموم تو عمارت و زمین ایک ہی شخص کے ملک ہوتے ہیں اور بہت سے لوگ خود ہی اپنے مکانات میں رہتے ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ تین شخصوں کا ایک ہی مکان سے تعلق ہو سکتا ہی۔ مالک زمین۔ مالک عمارت۔ اور کرایہ دار مکان۔ بغرض صفائی بیان ہم ان تینوں کا مکانات سے تعلق فرض کرتے ہیں اور اسی بحث سے بصورت دیگر جبکہ صرف دو یا ایک شخص کا مکان سے تعلق ہو نتائج اخذ کرنا دشوار نہ ہوگا۔

جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک میں رواج پایا جاتا ہی۔ فرض کرو کہ کوئی شخص کسی ہونہار شہر میں جہاں آبادی بڑھ رہی ہو مکانات کا کاروبار جاری کرے۔ یعنی کوئی کارخانہ یا دکان کھولنے کے بجائے وہ مکانات تعمیر کرائے اور اُن کے کرایہ سے عمارات جیسے اصل قائم کا سود اور مطالبات خطر و فرسودگی وصول کرے۔ عمارات بنواتے وقت انتخاب موقع کا مسئلہ ازحد توجہ طلب ہوگا۔ ایسی بےموقع زمین کہ جہاں مکان بنانے سے بقدر سود اصل بھی کرایہ وصول نہ ہو سکے وہ مفت بھی لینا گوارا نہ کریگا جس زمین پر مکان بنانے سے اصل قائم کے سود اور دیگر واجبی مطالبات کے علاوہ کچھ وصول نہ ہو ایسی زمین بھلا وہ کیوں خریدنے لگا البتہ اگر کوئی ایسی عمدہ موقع کی زمین ہاتھ لگے کہ وہاں پر مکان کا کرایہ سود و مطالبات

سے بھی زیادہ وصول ہو سکے تو بیشک اس کا خواستگار ہوگا۔ اس مزید مقدار کرایہ کی حالت بعینہ معاشی لگان کی سی ہے اب اگر وہ زمین خریدتا ہے تو اس کی قیمت اس لگان کے حساب سے دیگا۔ اگر قیمتِ لگان سے کم پر زمین ملجائے تو کیا کہنا ورنہ زیادہ سے زیادہ اس قیمت تک زمین خرید لیگا اس سے زیادہ ادا ہی وہ جسے نہیں کر سکتا کہ اس کو سراسر نقصان ہوگا۔ پس لگان کی قیمت سے کم یا مساوی رقم تک وہ زمین خرید لیگا لیکن چونکہ زمین کی قیمت گویا لگان کی قیمت ہے۔ یہی معاشی لگان خریدار کے حق میں اس اصل کا سود پہنچا دیگا جو اس نے بطور قیمت زمین ادا کیا ہو۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ آپڑا۔ ہم اپنے مفروضہ پر قائم رہکر خیال کرتے ہیں کہ زمین خریدنے کے بجائے اس نے کچھ مدت کے واسطے کرایہ پر لے لی۔ گویا مالک زمین و مالک مکان دو جداگانہ شخص رہے اس صورت میں بھی صاف ظاہر ہے کہ کرایہ لگان زمین کی مقدار سے کم ہوگا یا اس کے مساوی اس سے زاید نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کی زمین کرایہ پر لیکر مکانات تعمیر کرانا اور اُن کو کرایہ پر چلاکر۔ کرایہ کی آمدنی میں سے زمیندار کو کرایہ زمین ادا کرنا اور خود اپنے اصل قائم کا سود اور مطالبات وصول کرنا ہندوستان میں شاید عجیب معلوم ہو لیکن اکثر ترقی یافتہ ممالک میں اس کا رواج پایا جاتا ہے قاعدہ یہ ہے کہ ۹۹ برس کے واسطے مقررہ کرایہ پر زمین مستعار لیکر اس شرط سے مکانات تعمیر کیئے جاتے ہیں کہ بعد انقضائے میعاد بحصول معاوضہ یا بلا معاوضہ مالک مکان۔ عمارت و زمین سے دست بردار ہو کر۔ اُن کو مالک زمین کے سپرد کر دیگا۔ کرایہ زمین و کرایہ مکان میں ایسی نسبت قائم کرنے کی کوشش کیجاتی ہے کہ مالک مکان کو عرصہ معینہ میں اصل قائم پر بشرح مناسب سود بھی ملتا رہے اور بذریعہ مطالبات فرسودگی اختتام میعاد تک کل اصل قائم واپس بھی آجائے۔ چونکہ اس کاروبار میں بوجہ وسعت زمانہ و غیر اختیاری تغیرات نقصان کا اندیشہ قوی ہے۔ مطالبات خطر کی شرح بھی بہت اعلیٰ ہو تو عجب نہیں۔ نیز ظاہر ہے

کہ بوقت واپسی زمین عمارات کا معاوضہ دینے کی حالت میں۔ کرایہ زمین کسی قدر معاوضہ دینے کی حالت سے کم ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ ایک شخص اپنی لاگت سے کرایہ کی زمین پر مکان تعمیر کراکر کرایہ پر اٹھاتا ہے۔ کرایہ مکان میں سے اپنے اصل کا سود اور مطالبات ضروری وصول کرتا ہے اور نیز زمیندار کو کرایہ زمین ادا کرتا ہے۔ گویا ہمارے سابق مفروضہ کے مطابق مکان سے تین شخصوں کو تعلق ہے۔ مالک زمین۔ مالک عمارت و کرایہ دار مکان ہر دو مالکوں میں کرایہ جس اصول سے منقسم ہوتا ہے ہم ابھی واضح کر چکے ہیں آمدم بر سر مطلب۔ فرض کرو کہ ایسے بہت سے مکانات ہوں اور ان سب پر ایک ٹیکس قائم ہو۔ اب اگر ٹیکس معمولی ہوگا تو کرایہ دار اسکو بخوشی ادا کریں گے بلکہ اس ٹیکس کی خاطر قرب و جوار سے آکر حلقہ ٹیکس میں آباد ہوں تو عجب نہیں وجہ یہ کہ صفائی۔ پانی۔ روشنی جیسی ضروریات حسب پیدائش بر پیمانہ کبیر کے اصول پر باشندگان شہر کو مہیا کی جاتی ہیں تو اکثر نہایت ارزاں پڑتی ہیں۔ اور ان کی جو کچھ قیمت بطور ٹیکس ادا کیجائے وہ بجائے گراں گزرنے کے مفید معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ٹیکس بے فیض ہو تو اس کا تعدیہ بہت ٹیڑھی کھیر ہے تحقیق طور پر معلوم کر لینا کہ ٹیکس کا مورد کون ہوگا از حد دشوار ہے۔ زیادہ سے زیادہ چند ایسے عام اصول قرار دیئے جاسکتے ہیں تعدیہ ٹیکس جنکا کم و بیش پابند ہوا کریں۔ جیسا کہ معاشی لگان اور سرکاری مالگذاری کی مذکور الصدر بحث سے بخوبی واضح ہے ٹیکس کا جو حصہ کرایہ زمین پر پڑیگا۔ اس کا مورد زمیندار ہوگا۔ وہ کسی اور پر منتقل نہیں ہوسکتا حسب قرارداد تا انقضائے میعاد مالک عمارت زمیندار کو مقررہ کرایہ ادا کرتا ہے۔ اور اس دوران میں اگر وہی اس کا متحمل ہو تو عجب نہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ تعین کرایہ میں اس مستقبل خدشہ کا اس نے لحاظ رکھا ہو۔ اور اگر بوقت تعیں یہ ٹیکس جاری ہو تو یقیناً اس نے ٹیکس کی وہ مقدار جو کرایہ زمین پر عائد ہو کرایہ میں سے منہا کر لی ہوگی۔

حصہ سوم باب ہشتم

اب ہاؤس ٹیکس کا وہ جزو جو کرایہ عمارت پر پڑے۔ اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ اگر یہ ٹیکس محض مقامی ہے تاکہ لوگ قرب وجوار میں ہو کر اس سے بچ سکیں تو اس خوف سے کہ مبادا کرایہ دار مکان چھوڑ دیں۔ مالک عمارت اس کا بار کرایہ داروں پر توڑ ڈالنے سے رہی۔ اگر کرایہ عمارت کی مقدار سود و مطالبات سے کچھ زیادہ ہو تو ٹیکس کو خاموشی سے خود برداشت کریں گے اور بصورت دیگر اس کا کم وبیش بار زمیندار پر بھی منتقل ہو جائے گا یعنی کرایہ زمین میں مزید تخفیف ہوگی لیکن اگر یہ ٹیکس مقامی نہیں بلکہ ملکی ہو تاکہ اس سے کرایہ دار کو کہیں بھی مفر نہ ہو تو مالکان عمارت کی حالت قوی ہوگی کرایہ داروں کے چلے جانے کا تو کچھ خوف نہیں جہاں جائیں گے ٹیکس ادا کرنا پڑیگا پھر بھلا وہ ٹیکس سے بچنے کی خاطر کہاں جانے لگے۔ ایسی صورت میں اگر ٹیکس کے مورد کرایہ دار نہیں تو عجب ہوگا۔

چنانچہ مذکورہ بالا وجوہات پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہاؤس ٹیکس فیضرساں کا مورد ہمیشہ کرایہ دار ہوتا ہے۔ رہا ہاؤس ٹیکس بے فیض اگر مقامی ہے تو اس کا مورد زمیندار ہوگا اور اگر ملکی تو کرایہ دار۔ مالک عمارت کو بھی معاہدوں کی مجبوری سے کچھ دنوں ہاؤس ٹیکس کا بار اٹھانا پڑے تو عجب نہیں۔ اس عرصہ میں اغلب ہے کہ اس کو اصل کا سود و مطالبات کافی مقدار میں نہ مل سکیں اور نقصان اٹھانا پڑے لیکن میعاد معاہدہ ختم ہوتے ہی وہ کرایہ دار یا زمیندار پر حسب حالات ٹیکس کا بار منتقل کردیگا معاہدہ سے آزاد ہونے کے بعد وہ مناسب منافع کے بغیر جدید کاروبار ہرگز جاری نہیں کریگا۔

اور چونکہ بحالت مفروضہ اس کا کاروبار یعنی عمارات ہونہار شہروں میں ناگزیر ہیں۔ اس لئے مقامی ٹیکس زمیندار کو دینا پڑے گا۔ اور ملکی ٹیکس کرایہ دار کو۔ اس بحث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ چونکہ کرایہ زمین ومکانات از روے معاہدہ اوقات معینہ کے واسطے مقرر ہوتے ہیں۔ اور حسب دلخواہ ایسی حالت میں ردو بدل ممکن نہیں۔

حصہ سوم
باب ہشتم

ہاؤس ٹیکس کے انتقال میں معاہدات ونیز رسم ورواج عارضی طور پر مزاحم ہوتے ہیں۔ یعنی تعدیۂ ٹیکس میں دیر لگتی ہے فوراً اس کا عملدرآمد نہیں ہوسکتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ادا کنندوں کو موردہوئے بغیر بھی کچھ عرصہ تک ہاؤس ٹیکس کا بار برداشت کرنا پڑتا ہے لہٰذا وصولی ہاؤس ٹیکس میں حتی الامکان اداکنندہ وہی مقرر کرنا چاہئے جس کا موردہونا مقصود ہو۔ تاکہ کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو فضول کچھ دنوں ٹیکس سے زیر بار ہونا نہ پڑے۔

ملک و جائداد غیر منقولہ مثلاً کھیت۔ باغات۔ مکانات ودکانات پر جو ٹیکس قائم کیا جاتا ہے اس کے متعلق یہ نکتہ جتانا مفید وضروری معلوم ہوتا ہے کہ بوقت فروخت ایسی ملک و جائداد کی آمدنی میں سے مقدار ٹیکس منہا کر کے قیمت قرار دیجاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے واسطے ٹیکس کا بار اُس شخص پر قائم رہجاتا ہے جو بوقت تقرر ٹیکس جائداد کا مالک تھا۔ بعد کے خریدار چونکہ ٹیکس آمدنی سے منہا کر کے جائداد کی قیمت ادا کرتے ہیں اُن کو ٹیکس سے صرف اسقدر سروکار ہے کہ ابتدائی مالک کی طرف سے سرکار کو ادا کرتے رہیں۔ البتہ خرید کے بعد اگر ٹیکس بڑھے تو بقدر اضافہ جدید مالک اس کا متحمل ہوگا۔ قدیم ٹیکس کوئی ٹیکس نہیں۔ جو ایک معاشی مقولہ ہے اس کا یہی خاص مفہوم ہے۔ عام طور پر اس مقولہ سے یہ جتانا مقصود ہے کہ جب ٹیکس پرانا ہوجاتا ہے تو کچھ تو لوگ اُس کے عادی ہوجاتے ہیں اور نیز کاروبار میں اس کا پورا لحاظ کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا بار کم محسوس ہونے لگتا ہے۔

واضح ہو کہ ہاؤس ٹیکس اور خصوصاً اس کے تعدیہ کی بحث کی وقت پیچیدگی کا ہر ایک مستند مصنف نے کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔ اس میں تعین تو قطعاً محال ہے۔ چند اغلب نتائج دریافت ہوسکتے ہیں جن کا ہر حالت میں ظہور پذیر ہونا یقینی نہیں۔ تاہم تھوڑی بہت اجو کچھ معلومات بھی مہیا ہوسکی ہے۔ تقرر ٹیکس میں عملاً اس سے از حد مفید مدد لیجاسکتی ہے اور لیجاتی ہے۔

حصہ سوم
باب ہشتم
محصول چنگی

(۹) محصول چنگی بھی ٹیکس بالواسطہ کی ایک قسم ہے اور فرانس - اٹلی اور ہندوستان میں بکثرت رائج ہے اس کی مخالفت اور تائید دونوں جاری ہیں - اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چنگی کی چوکی پر مال رکنے سے ادا کنندہ کا وقت ضائع ہوتا ہے گویا طریق چنگی مال کی آمد و رفت میں تاخیر کا باعث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ تجارت میں وقت بڑی چیز ہے مقدار محصول جس کا تعین بیشتر ملازمان چوکی کے ہاتھ میں ہوتا ہے حسب مرضی کم و بیش کیا جا سکتا ہے - اس کے واسطے خاص طور پر عملہ رکھنا پڑتا ہے جس سے مصارف فراہمی بہت بڑھ جاتے - بیرمال چھپا کر بلا محصول داخل حد چنگی ہو سکتا ہے - اور باوجود ہزار نگرانی یہ نقص کم و بیش ہر جگہ پایا جاتا ہے - تیسرے یہ کہ محصول چنگی کی نسبت سے کہیں زیادہ خردہ فروشی کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چونکہ محصول اکثر ضروریات پر لیا جاتا ہے اس کا بار متوسط الحال اور غربا پر بہت زیادہ پڑتا ہے ساتھ ہی اس کے چند خوبیاں بھی محصول چنگی میں موجود ہیں - مثلاً جہاں صنعت و حرفت اور تجارت کا بازار گرم ہو اس محصول سے بہت معقول آمدنی حاصل ہوتی ہے نیز خردہ فروشی کی قیمت میں کوئی ایسا اضافہ نہیں ہوتا کہ خریدار پر نامناسب بار ہو - بوقت خریداری موردوں کو ٹیکس کا علم تک نہیں ہوتا اور نیز بعض حالتوں میں خود ادا کنندہ کل محصول یا اس کے ایک حصہ کا خود مورد بنتا ہے نہ کہ خریدار - سب سے بڑی خوبی یہ ہے - کہ مقامی ٹیکس کے واسطے اُس کا بدل ہاوس ٹیکس جو پیش کیا جاتا ہے - اس کے اجرا میں اس سے بھی زیادہ اندیشے اور دقتیں لاحق ہوں گی - چنانچہ بہت سے ہندوستانی قصبات میں ابتک محصول چنگی بمقابل ہاوس ٹیکس ہر لحاظ سے قابل ترجیح اور لہذا رائج ہے -

فیس
رجسٹری
اسٹامپ
وداخل

(۱۰) اس فیس کا ایک حصہ تو محض اُن خدمات کا معاوضہ ہوتا ہے جو سرکار قانونی دادرسی اور عدالتوں کے ذریعہ سے سر انجام دیتی ہے - باقی کم و بیش ٹیکس ہوتا ہے جس کا بار حسب حالات یا قرار داد یا تو سب متعلقین پر پڑتا ہے یا بعض خاص پر - ایسے

ٹکسوں کے تعدیہ کا کوئی عام اصول مقرر کرنا دشوار ہے۔

جہاں تک اس کتاب میں گنجائش نظر آئی بحث ٹکس کا ایک سادہ اور مختصر خاکہ پیش کیا گیا۔ لیکن فی نفسہ یہ مسئلہ نہایت اہم اور توجہ طلب ہے اور اس کی تفصیلی بحث کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے۔

حصّہ چہارم

مبادلہ دولت

باب اوّل

قیمت

تجزیہ (۱) بحث مبادلہ کی ہیئت (۲) قانون تقلیل افادہ (۳) قانون طلب (۴) تغیر پذیری طلب (۵) بازار (۶) قدر و قیمت (۷) مسئلہ قیمت (۸) طلب مشترک و طلب مرکب (۹) رسد مشترک و رسد مرکب

بحث مبادلہ کی ہیئت

(۱) مبادلہ کا مفہوم اس کے لوازمات و شرائط اور مبادلہ کی مختلف صورتیں بعنوان استبدال و اشکال دولت با تفصیل بیان ہو چکی ہیں یہاں پر مجملاً اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ مبادلہ سے مراد ہے چیزوں کا ایک دوسری سے ادل بدل کرنا۔ مبادلہ کی بنا افادہ ہے اور قلت یعنی تعین مقدار اور تملیک کلی شرط لابد۔ مبادلہ میں انتقالِ ملک اگرچہ معمول ہے لیکن لازمی ہیں۔

مبادلہ کے متعلق دو جدید نکات کی تشریح یہاں پر ضروری ہے۔ پہلی بات توجہ طلب ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت کسی دو چیز کے مبادلہ کے واسطے ایک خاص تیسری چیز کی وساطت لازمی سی ہوگئی ہے جس کو اصطلاحاً **زر** کہتے ہیں۔ اس چیز سے ہم عنقریب ایک جداگانہ باب میں مفصل بحث کرینگے۔ زر کے سیدھے سادھے مفہوم سے ہر کوئی واقف ہے یعنی کوئی ایسی چیز جس کو ہر شخص بلا عذر اپنی چیز کے مبادلہ میں قبول کرے۔ مثلاً روپیہ

حصہ چہارم باب اول

پیسہ۔ پونڈ۔ شلنگ اور ایسے ہی ہر ملک کے۔ چیزوں کا براہ راست مبادلہ آج کل شاذ ونادر ہی ہوتا ہے۔ پس ماندہ دیہات میں کھانے پینے کی چیزوں کا تو اول بدل ہو جاتا ہے مثلاً غلہ دیکر پھل اور ترکاری لینا۔ دودھ سے تیل بدلنا۔ حجام۔ سقہ کو غلہ بطور فصلانہ دینا۔ لیکن دیہات میں بڑی بڑی چیزوں کا مثلاً ہل۔ بیل۔ کھاد۔ گاڑی اور شہروں میں چھوٹی بڑی ہر قسم کی چیزوں کا مبادلہ ہمیشہ زر کی وساطت سے ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مبادلہ کا عمل واحد خرید فروخت کے دو عمل میں تقسیم ہو گیا ہے۔ جب ہم اپنی چیز کا زر سے مبادلہ کرتے ہیں تو ہماری طرف سے یہ عمل **فروخت** کہلاتا ہے۔ اور مبادلہ میں ملے ہوئے زر کا جب کسی شئے مطلوبہ سے مبادلہ کرتے ہیں تو وہ **خرید** کہلاتا ہے۔ حالانکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فروخت و خرید کے ہر دو عمل کا نتیجہ درحقیقت اپنی چیز کا دوسرے کی شئے مطلوبہ سے مبادلہ ہوتا ہے اور محض ایک درمیانی وسیلہ کا کام دیتا ہے۔ مثلاً آج کل سائکل اور گھوڑے کا براہ راست مبادلہ تو بہت کم ممکن ہے۔ لیکن مبادلہ کا نہایت سہل طریق یہ ہے کہ اول ہم اپنا گھوڑا کسی سوار کے ہاتھ بیچدیں اور اس کی قیمت سے کسی سوداگر کی دکان سے سائکل خرید لیں یعنی اوّل گھوڑے کا زر سے مبادلہ کریں جس کو فروخت کہتے ہیں۔ اور بعدہٗ زر کا سائکل سے جو خرید کہلاتا ہے۔ مگر سچ پوچھو تو خرید و فروخت کے دو عملوں سے بوسیلہ زر صرف گھوڑے اور سائکل کے مبادلہ کا عمل واحد ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس جدید طویل نما طریق میں بڑی بڑی خوبیاں ہیں جن سے ہم آیندہ مفصل بحث کریں گے۔ یہاں صرف اسقدر سمجھ لینا چاہیے کہ معاشی ترقیات نے مبادلہ کے عمل واحد کو خرید و فروخت کے دو عملوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اپنی چیز اور شئے مطلوبہ کا براہ راست مبادلہ کرنے کے بجائے اب ایک تیسری چیز زر کی وساطت سے لوگ عمل مبادلہ پورا کرتے ہیں۔

مبادلہ کے متعلق دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ اب اس کی از حد کثرت ہے۔ کسی زمانہ میں تو ہر خاندان اپنی مختصر ضروریات بیشتر خود ہی پوری کر لیتا تھا اور مبادلہ کی بہت کم نوبت

آتی تھی ناگزیر ضروریات زندگی مثلاً کھانا کپڑا اور مکان۔ سب اہل خاندان مل جلکر مہیا کر لیتے تھے لیکن معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ ایک تو ضروریات میں روزافزوں اضافہ شروع ہوا دوسرے طریق تقسیم عمل کی اشد ضرورت اور اس کے بیش بہا فوائد بھی نمایاں ہونے لگے نوبت بایں جا رسید کہ آج کل نہ صرف ضروریات کی تعداد بہت بڑھی ہوئی ہے اور بڑھ رہی ہے بلکہ اُن کی بہم رسانی کے واسطے ہم عموماً تمام و کمال دوسروں کے محتاج ہیں اور اسی طرح دوسرے ہمارے محتاج ہیں۔ ہر ایک شخص دوسروں کی ضروریات مہیا کرنے میں مصروف ہے اور اپنی ضروریات دوسروں سے حاصل کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنی ضروریات خود اپنے ہاتھ سے براہ راست بہم پہنچانے کے بجائے وہ اپنے حسب حال دوسروں کے واسطے کوئی ایک یا زیادہ ضروریات مہیا کر کے مبادلہ کے ذریعہ سے اپنی کل ضروریات جن کو دوسروں نے اُس کی طرح بہم پہنچایا ہے۔ حاصل کر لیتا ہے۔

کسان غلہ اُگاتا ہے باغبان پھل پھول لگاتا ہے۔ موچی صرف جوتہ بناتا ہے۔ جولاہا صرف کپڑا بنتا ہے۔ لوہار قفل بناتا ہے۔ ڈاکٹر علاج کرتا ہے سوداگر طرح طرح کا مال منگاتا ہے لیکن ہر پیشہ و حرفہ والا بیشتر دوسروں کی ضروریات مہیا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اور صرف ایک یا چند ضروریات بہم پہنچا کر مبادلہ کے طفیل سے اپنی ہر قسم کی کل ضروریات بلا دقت و پریشانی حاصل کر لیتا ہے۔ کیا یہ کچھ کم تعجب انگیز اور دلچسپ بات ہے کہ سہولت و ارزانی آمد و رفت اور قیام امن و امان کی بدولت صنعت و حرفت اور تجارت نے وہ فروغ پایا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے لوگ مدت العمر ایسی چیزیں تیار کرتے رہتے ہیں کہ جنکو وہ برائے نام بھی خود استعمال نہیں کرتے اور جو اُن لوگوں کی ضروریات میں داخل ہیں جو ہزارہا میل دور رہتے ہیں اور جن کی صورت کبھی خواب میں بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ دور افتادہ لوگ بھی اپنی طرف سے ان کے واسطے کوئی نہ کوئی ضرورت بہم پہنچانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک شاعر کا مشہور قول ہے ؎

ہر کسے ناصح برائے دیگراں ناصح خود یافتم کم در جہاں

اگر عامل سے ہم ضروریات بہم پہنچانے والا مراد لیں تو اس شعر کو یوں بدل کر ہم موجودہ معاشی حالات کے مطابق بنا سکتے ہیں۔

ہر کسے عامل برائے دیگراں عامل خود یافتم کم این ماں

یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ اگر طریق تقسیم عمل یوں اختیار نہ کیا جاتا اور ہر ایک شخص جدا جدا خود اپنی ضروریات مہیا کرنے کی کوشش کرتا تو موجودہ حاصل شدہ ضروریات کا عشر عشیر بھی میسر نہ آتا اور معاشی ترقیات خواب و خیال سے بھی باہر ہیں پس صاف ظاہر ہے کہ طریق **مبادلہ** کل معاشی ترقیات کی شرط اولیں ہے۔ اگر غور کیا جاوے تو معاشی جد و جہد کی باقی تین صورتیں یعنی پیدائش تقسیم اور صرف دولت اسی مبادلہ دولت کی خوبیوں اور برکات کی شرح اور تفسیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مبادلہ اور خصوصاً مسئلہ قیمت جس سے ہم ابھی بحث کرینگے بالاتفاق علم المعیشت کا سنگ بنیاد مانا گیا ہے اور ہر ایک مستند مصنف نے اس کی تشریح و توجیہ میں پوری پوری قابلیت صرف کی ہے **مل** کو بھی بخیال خود اپنے اسی بحث کے بیان پر ناز تھا اور انگلستان کے مشہور عالم معیشت پروفیسر **مارشل** نے بھی مسئلہ قیمت میں سب سے زیادہ جدت اور نازک خیالی دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی تصنیف کا یہ جزو بہت زیادہ قابل قدر مانا جاتا ہے۔ اگر مبادلہ کا رواج نہوتا تو دنیا طریق تقسیم عمل پیدائش بر پیمانہ کبیر صنعت و حرفت اور تجارت غرضکہ کل معاشی ترقیات سے بالکل محروم رہ جاتی اور موجودہ گوناگوں تعیشات کا تو ذکر کیا ہے بغیر مبادلہ روکھا پھیکا کھانا۔ موٹا جھوٹا کپڑا اور ٹوٹا پھوٹا مکان جیسی ما یحتاج زندگی بھی محض اپنی قوت بازو سے ہر شخص کو جدا گانہ میسر آنی محال ہوتیں چنانچہ واقعہ ہے کہ مبادلہ کی قلت و کثرت معاشی پس ماندگی و ترقی کا عام معیار ہے۔ مبادلہ کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ معاشی جد و جہد کے ہر شعبہ سے اس کا اساسی تعلق ہے: زمین

حصہ چہارم
باب اوّل

محنت اصل و تنظیم ان ہی چار عاملین کے اتفاق عمل پر پیدائش دولت کا دار مدار ہے۔ اور دولت معاشی زندگی کی روح رواں ہے۔ لگان۔ اجرت۔ سود۔ اور منافع تقسیم دولت کی یہ چاروں شکلیں درحقیقت ان چاروں عاملین کی خدمات کا معاوضہ یعنی قیمت ہیں۔ اسی وقت سے ہم آگے چلکر پھر بحث کریں گے۔ یہاں پر مجملاً یہ دکھانا مقصود ہے کہ تقسیم دولت درحقیقت مبادلہ دولت کی ایک خاص صورت ہے وجہ خصوصیت یہ ہے کہ عام مبادلہ میں تو چیزوں کی قیمت خریدار و فروشندہ کی آزادانہ کھینچ تان سے قرار پاتی ہے۔ لیکن لگان اجرت سود اور منافع جیسی قیمتیں مدتوں تک رسم رواج اور قانون کی آفریدہ ہیں اور صرف چند روز سے اُن کے تعین میں فریقین کو عام قیمت کی سی آزادیٔ مقابلہ حاصل ہوئی ہے پیدائش دولت کا براہ راست و نیز بسلسلہ تقسیم دولت مبادلہ پر انحصار ظاہر ہے۔ رہا صرف دولت سو جب پیدائش و تقسیم دولت مبادلہ پر اس قدر منحصر ہیں تو صرف دولت کا بدرجۂ اولیٰ مبادلہ کے زیر اثر ہونا یقینی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ مبادلہ کا اثر معاشی زندگی کے کل رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور اس کی بحث علم المعیشت کے ہر شعبہ سے علاقہ غالب رکھتی ہے یوں تو اس علم کی کل بحثوں میں باہمی تعلق ہے اور ہونا چاہیے لیکن فرق صرف اسقدر ہے کہ مبادلہ کا تعلق سب سے زیادہ وسیع اور اکثر باقی تعلقات کا باعث و بنا ہے۔

مبادلہ میں سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ قیمت کا ہے یعنی مبادلہ یا خرید فروخت میں کسی چیز کی قیمت کیونکر قرار پاتی ہے تعین و تبدل قیمت کن کن قوانین کا پابند ہے۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم چند دیگر قوانین سمجھانا ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ مسئلہ قیمت کے نکات سمجھنے میں اُن سے بیحد مدد ملے گی۔

قانون
تقلیل افادہ

(۲) معیشت کے اکثر قوانین پر ہم بیخبری میں عمل کرتے رہتے ہیں لیکن ان سے واقف ہوئے بغیر اُن کے نتائج ہماری سمجھ میں نہیں آتے معیشت کے مسائل میں جہاں عدم تعین کی خامی

عام ہی وہاں یہہ خوبی بھی ہی کہ بلا اہتمام معاشی قوانین ہر ایک کے تجربے میں آتے رہتے ہیں اور اکثر واقعت ہونے پر تعجب ہوتا ہی کہ ایسی مبیّن یا افتادہ بات سے ہم ابتک کیوں غافل رہے اور اس کے نتائج پر کیوں غور نہ کیا چنانچہ قانون تقلیل افادہ پر انسان تو درکنار حیوان بھی عامل نظر آتے ہیں اور شیر خوار بچے تک اس کی پابندی کرتے ہیں اگر کسی بھوکے پیاسے جانور کے سامنے دانہ پانی رکھا جائے تو اوّل اوّل وہ کیسی جلدی جلدی کھانا پینا شروع کرتا ہی لیکن بتدریج کھانے پینے کی رفتار گھٹنے لگتی ہی۔ پھر وہ کچھہ ٹھہر ٹھہر کر تھوڑا تھوڑا آہستہ کھاتا ہی حتیٰ کہ سیر ہوکر علحدہ ہوجاتا ہی پھر خواہ دانہ پانی کتنا ہی اُس کے سامنے کیوں نہ رکھا رہے منہ ڈالنا تو درکنار اُدہر نظر بھی نہیں ڈالتا۔ وجہ کیا ہی جبکہ بھوک پیاس جیسی احتیاج کی شدت تھی تو دانہ پانی کے ابتدائی جرعوں میں اس کو افادہ بھی بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا لیکن جوں جوں بھوک پیاس گھٹتی گئی مابعد جرعوں میں افادہ بھی کم پڑتا گیا حتیٰ کہ جب سیری ہوئی یعنی احتیاجات بہ تمام وکمال رفع ہوگئیں تو باقی ماندہ دانہ پانی میں سے اسوقت افادہ بھی غائب ہوگیا جس کی وجہ سے وہ اب اُن کو سونگھتا بھی نہیں البتہ بھوک پیاس کی احتیاجات نمودار ہونے پر پھر حسب سابق ان میں بھی افادہ محسوس ہونا یقینی ہی۔ بھوکا بچہ کسقدر زور سے ماں کا دودھ کھینچتا ہی لیکن کچھہ سیر ہونے پر اُس کی شیر کشی کی سرگرمی بھی گھٹنے لگتی ہی اب وہ لگاتار دودھ نہیں پیتا بلکہ درمیان میں رک رک کر مسکرا لیتا ہی حتیٰ کہ ماں کی چھاتی سے جدا ہوجاتا ہی اور بعد سیری ایک قطرہ دودھ نہیں کھینچتا وجہ یہی ہی کہ گھٹتے گھٹتے دودھ کا افادہ اس وقت بالکل غائب ہوجاتا ہی پھر وہ شیر کشی کی تکلیف کیوں گوارا کرے ان فطری واقعات سے ایک نہایت نتیجہ خیز معاشی قانون کا پتہ چلتا ہی وہ یہہ کہ کسی شے مطلوبہ کی مقدار جس قدر بڑہے گی اُسکے مزید جرعوں کا افادہ مقابلۃً گھٹے گا حتیٰ کہ اگر مقدار بہت بڑہ جائے تو افادہ گھٹتے گھٹتے مابعد جرعوں میں بالکل مفقود ہو جائیگا۔ یا یوں کہئے کہ اضافہ مقدار شے مطلوبہ اور اسکے افادہ کے اضافہ میں نسبت معکوس ہی

مقدار جتنی ہی زیادہ ہوگی مزید مقدار کا افادہ نسبتاً اتنا ہی کم ہوگا حتیٰ کہ مقدار بڑھتے بڑھتے افادہ بالکل غائب ہوجانا ممکن ہی پانی کو لو کیسی ضروری چیز ہی اور جبکہ زندگی کا اس پر اسقدر دارومدار ہو کہ چند گھنٹے اُس کے نہ ملنے سے مرنے کی نوبت آجائے تو اس کے افادہ سے بڑھکر کس کا افادہ ہوسکتا ہی۔ لیکن پانی کی مقدار جس قدر بڑھتی ہی ہمارے نزدیک اس کا افادہ گھٹتا ہی حتیٰ کہ پانی بڑھتے بڑھتے افادہ غائب ہونے سے وہ اُلٹا وبال جان و مال ہوجاتا ہی پیاس کی شدت میں ہر شخص سرد پانی کے ایک گلاس کی خاطر اپنی کل جیب خالی کرنے پر مجبور ہوسکتا ہی اگر دور دور تک کنواں و چشمہ ہو تو ایسے خشک میدان میں پانی دو چار بلکہ دس پانچ روپیہ سیر تک بھی فروخت ہونا ممکن ہی جبتک کسی دَاموں پانی میسر آسکے گا کوئی پیاس سے مرنا کیوں گوارا کریگا۔ لیکن ہر شخص جانتا ہی کہ ایسی اعلیٰ شرح سے ہم صرف اسقدر پانی خرید نا پسند کریں گے جو پیاس کو تسکین دے سکے لیکن اگر قیمت میں کچھہ مناسب تخفیف ہوجائے تو شاید ہم اس قدر پانی خرید لینگے کہ علاوہ پینے کے ہم اس سے منہ ہاتھ بھی دہو سکیں۔ صاف ظاہر ہی کہ پانی کی اس مزید مقدار سے کہ جو منہ ہاتھ دہونے میں کام آئے۔ ہم کو بمقابلہ پینے کے پانی کے کم افادہ محسوس ہوتا ہی جس کی وجہ سے ہم نے اُس کو پینے کے پانی کی شرح سے خریدنا پسند نکیا لیکن قیمت گھٹکر جب اس کے کمتر افادہ کے مساوی ہوگئی تو ہمنے اس کو بھی خرید لیا۔ اب اگر پانی کی قیمت اور بھی گھٹ جاوے تو ہم اس کی اتنی مقدار خرید سکتے ہیں کہ پینے اور منہ ہاتھ دہونے کے علاوہ اس سے نہا دہو بھی لیں لیکن نہانے دہونے کے پانی کا افادہ پینے اور منہ ہاتھ دہونے کے پانی کے افادہ سے کم ہی اسلیے جب تک قیمت میں مزید تخفیف نہ ہوئی ہمنے اس کو نہ خریدا لیکن جب ہم کو اپنی کل ضروریات کے واسطے پانی مل جائیگا تو باقی پانی میں ہمارے نزدیک کوئی افادہ نہیں رہیگا۔ جس کی وجہ سے ہم اس کو کم سے کم قیمت بلکہ حتیٰ کہ مفت بھی لینا گوارا نہ کرینگے کیونکہ وہ غیر ضروری بلکہ تکلیف دہ بار ہوگا

اور کچھ نہیں۔ یعنیہ یہی حال باقی تمام چیزونکا ہی جس قدر مقدار مطلوبہ بڑہے گی ہماری احتیاج متعلقہ کی شدت گھٹے گی اور ساتھ ساتھ مزید اضافونکا افادہ بھی نسبتاً کم ہوتے ہوتے مفقود ہوجائیگا جبکہ مزید اضافہ مفت بھی گوارا نکرینگے گرمی میں برف ہر ایک کو کسقدر مرغوب ہی اگر ہم آنہ سیر فروخت ہو رہا ہو تو ہم صرف پانی سرد کرنے کے واسطے سیر دو سیر خرید لیں گے لیکن اگر نرخ صرف ایک آنہ سیر ہوجائے تو ہم آئس کریم بنانے کی تیاری کرینگے اور اگر صرف آدہ آنہ یا پیسہ سیر ہوجائے تو ہم آم اور دوسرے پھل بھی برف میں لگا کر خنکی کا لطف اُٹھاوینگے۔ صاف ظاہر ہی کہ پانی والے برف سے آئس کریم والے برف کا افادہ ہماری نظر میں کم ہی اور پھل والے کا اس سے بھی کم جب ہی تو قیمت گھٹے بغیر ہمنے اسکو نہیں خریدا اگر ہمارے نزدیک افادہ یکساں ہوتا تو تینوں مقدار کو اول ہی ۲؍ کی شرح سے نہ خرید لیتے لیکن جب ہماری کل احتیاجات رفع ہوجاویں گی تو ہم برف کی اینٹ پتھر برابر بھی قدر نکرینگے اور اگر کوئی مفت بھی دیگا تو نہ لیں گے۔

حاصل کلام یہ کہ قانون تقلیل افادہ سے مراد اس واقعہ کا بیان ہی کہ مقدار شئے مطلوبہ میں جس قدر اضافہ ہوتا ہی مزید مقدار کا افادہ بھی نسبتاً گھٹنے لگتا ہی حتیٰ کہ مقدار بڑہتے بڑہتے افادہ کا اضافہ بالکل بند ہوسکتا ہی اگر احتیاج ایک قطعہ اراضی فرض کرکے شئے مطلوبہ کی مقداریں جرعے قرار دئے جاویں اور افادہ کو پیداوار مان لیں تو قانون تقلیل افادہ بعینہٖ قانون تقلیل حاصل کا مشابہ نظر آئے گا اور اس کی کل تفصیل اس پر بلا کم وکاست عاید ہوگی اور تفصیل کی تطبیق ازحد دلچسپ بھی ثابت ہوگی۔ ذیل کی شکل سے قانون تقلیل افادہ کا مفہوم اور اُس کی قانون تقلیل حاصل سے مشابہت بخوبی واضح ہی۔

حصہ چہارم
باب اول
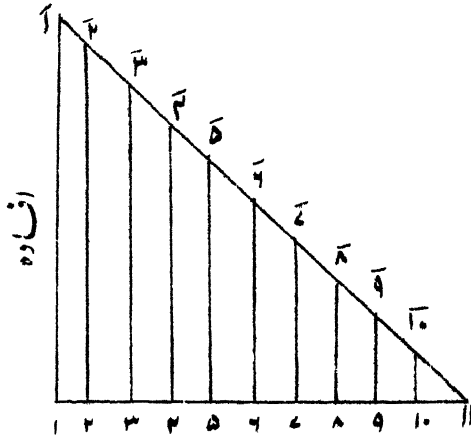
جرعہ رسد

اس شکل میں ا سے لیکر ۱۱ تک برابر برابر رسد کے گیارہ جرعہ دکھائے گئے ہیں اور اآ - ۲-۳ سے ۱۰ آتک علی الترتیب ہر ایک جرعہ کا جداگانہ افادہ جو قانون تقلیل افادہ کے بموجب گھٹتے گھٹتے گیارہویں جرعہ پر غائب ہوجاتا ہے اور یہ وہ حالت ہوگی جبکہ احتیاج مطلوبہ بہ تمام وکمال پوری ہوجائیگی آ سے لیکر ۱ تک کشش اصطلاحاً خط افادہ کہلائے گی۔

اس قانون کا مفہوم بتانے کے بعد اب اس کے متعلق ہم ضروری نکات وضح کرنا چاہتے ہیں اوپر کی بحث سے صاف ظاہر ہے کہ ہم نے افادہ کا معیار وہ قیمت قرار دی ہے جو ہم کسی مقدار کے واسطے ادا کرنے پر آمادہ ہوں مثلاً اگر ہم برف ۸ آنہ سیر تک دو سیر خریدیں تو گویا دوسیر برف کا افادہ ہمارے نزدیک عہ سے زیادہ نہیں۔ قیمت کے اس معیار پر چند نہایت وزن دار اعتراض عاید ہوتے ہیں اور یہ معیار کسی حال میں بھی سراسر قابل اعتماد نہیں مانا جاسکتا لیکن چونکہ اس سے بہتر معیار میسر نہیں آسکا لہذا باہمہ نقائص اسی کو غنیمت سمجھکر اختیار کرلیا اس معیار کے نقائص کی دقیق وپیچیدہ بحث بخوف پراگندگی حیرانی ترک کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ قیمت کے متعلق ایک نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔ عام مقولہ ہے کہ غریب کا

ایک پیسہ اور امیر کا ایک روپیہ برابر ہے یعنی غریب کی نظر میں ایک پیسہ کی وہی قدر ہوتی ہے
جو امیر کی نظر میں ایک روپیہ کی۔ پندرہ روپیہ ماہوار آمدنی والے کو ایک روپیہ جس قدر عزیز
ہوگا ہزار روپیہ ماہوار والے کے نزدیک تیس روپیہ کی بھی اس کے برابر قدر ہوگی اس واقعہ
سے اوّل تو قانون تقلیل افادہ کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ گویا روپیہ کی مقدار میں جسقدر اضافہ ہوتا
ہے ہر مزید اضافہ کا افادہ نسبتاً گھٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ جب آمدنی پندرہ سے بڑھ کر ہزار ہوتی ہے
تو تیس روپیہ کا افادہ گھٹتے گھٹتے بمشکل سابق کے ایک روپیہ کی برابر رہجاتا ہے یعنی جس افادہ کا غریب
آدمی ایک روپیہ معاوضہ تخمینہ کرتا ہے اسی افادہ کا امیر آدمی تیس روپیہ کرسکتا ہے۔ برف پینے کا خصوصاً
گرمیوں کے رمضان میں کس روزہ دار کو اشتیاق نہیں ہوتا لیکن امیر آدمی ۵ روپیہ سیر تک برف
نہیں چھوڑتے۔ متوسط الحال ۴ آنہ ۸ آنہ سیر تک خرید سکتے ہیں اور غریب لوگ ایک آنہ سے
آگے جرأت نہیں کرتے۔ ان تینوں طبقوں کے تخمینہ میں وہی ایک سیر برف کا افادہ ۵ روپیہ ۸ آنہ
اور ایک آنہ کی برابر ہے گویا یہ تینوں قیمتیں ایک ہی مقدار افادہ کے بظاہر جداگانہ معیار معلوم ہوتے
ہیں لیکن قیمت دہندوں کے تخمینہ میں ان قیمتوں کا جو افادہ ہے وہ برابر ہے لہذا یہ تینوں معیار بھی
یکساں ہیں ان کے ظاہری عدم مساوات سے دہوکہ میں نہ پڑنا چاہئیے اگر ۵ روپیہ ۸ آنہ اور
ایک آنہ کا افادہ بالکل برابر بھی نہ ہو تو فرق اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا جو ان مقداروں میں بظاہر
معلوم ہوتا ہے۔ اور سہولت بیان کی غرض سے کوئی قلیل فرق نظرانداز کرکے ان تینوں
رقموں کا ہر طبقہ متعلقہ کی نظر میں یکساں افادہ قرار دینا کچھ بعید از حقیقت نہیں ہے پس قیمت کو معیار
افادہ قرار دینے میں قیمت دہندہ کی مالی حالت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ یہ ممکن بلکہ اغلب ہے
کہ امیر اور غریب اگر ایک ہی چیز ایک روپیہ اور ۴ آنہ کو خریدیں تو غریب کی نظر میں اس چیز کا افادہ
بمقابلہ امیر کے چوگنا ہو۔ اگرچہ صرف مقدار قیمت پر نظر کرتے ہوئے غریب کے نزدیک
اس چیز کا افادہ صرف ایک چوتھائی معلوم ہوگا۔ خوشحالی اور افلاس کے علاوہ معیار

قیمت پر طبیعت کا بھی اثر پڑتا ہی بعض لوگ فراخ حوصلہ اور خرّاچ ہوتے ہیں بعض تنگدل اور خسیس یکساں مالی حالت ہوتے ہوئے بھی آخر الذکر کا ایک روپیہ اول الذکر کے دس روپیہ کے برابر ہو تو عجب نہیں مالی حالت اور طبیعت کے علاوہ شوق اور مذاق کا اختلاف بھی معیار قیمت میں قابل لحاظ ہی چند محتاج زندگی مثلاً کھانا۔ پانی وغیرہ تو ایسی ہیں کہ انکی کم وبیش ہر شخص کو احتیاج ہوتی ہی لیکن بیشمار چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا کسی کو مدرجہ عشق و دیوانگی شوق ہی اور بعض اُن سے نفور وگریزاں ہیں اور بعض کے نزدیک اُن کا ملنا نہ ملنا یکساں

مختلف المذاق لوگ جب کسی ایک ہی چیز کی یکساں قیمت ادا کریں تو قیمتیں باوجود مساوات یقیناً مختلف مقدار افادہ کی معیار ہوں گی اور اگر مختلف قیمتیں ادا کریں تو ان سب کا باوجود عدم مساوات ایک ہی مقدار افادہ کا معیار ہونا اغلب نہیں تو ممکن ضرور ہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ ایک ہی قیمت بیشمار مدارج افادہ کا معیار ہوسکتی ہی اور ایک ہی مقدار افادہ کے بیشمار معیار قیمت قرار پاسکتے ہیں گویا ہر ایک قیمت ایک جداگانہ معیار ہی۔ اس نتیجہ کی صحت سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن کسی ملک کے معاشی حالات کے مطالعہ اور تحقیق میں اتنے دقیق فرق قابل لحاظ نہیں ہوتے اور انکو نظر انداز کرکے عام حالات پر اکتفا کرنے سے بجائے کسی نقص و خامی کے عملی تحقیقات میں بیش بہا اور ناگزیر سہولت پیدا ہوجاتی ہی چنانچہ فرق معیار کے متعلق بھی یہی طریق برتا جاتا ہی اور اس سے کوئی مفر بھی نہیں۔

قانون تقلیل افادہ کے عملدرآمد میں یہ فرض کیا جاتا ہی کہ ہماری احتیاج معیّن ہی۔ اور اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر مقدار شئے مطلوبہ کے اضافہ کے ساتھ ساتھ احتیاج میں بھی اضافہ ہو تو اس قانون کا عمل اگر قطعاً نہ رُکے تو ملتوی ضرور ہوسکتا ہی مثلاً ہم بشرح ۴ آنہ سیر پینے کے واسطے سیر بھر برف روز منگائیں۔ اور اگر نرخ گھٹکر ۲ آنہ

سیر رہ جائے تو ۴ سیر برف اور منگا کر شاید آئس کریم بھی جما ڈالیں لیکن اگر ہمارے ہاں مہمان آجاویں تو ہم سرخ ۴ سیر صرف پیسے کے واسطے ۵ سیر منگالیں تو عجب نہیں گویا جس نرخ سے ہم پہلے صرف ایک سیر برف خریدنا پسند کرتے تھے اسی نرخ سے ہمنے اب وہ مقدار خرید لی جو ہم پہلے کمتر نرخ سے خریدنا پسند کرتے تھے وجہ یہ ہے کہ احتیاج بڑھنے سے قانون تقلیل افادہ کا عمل ملتوی ہوگیا لیکن پینے کے ۵ سیر برف سے زاید برف آئس کریم کے واسطے ہم اب بھی شاید ایک آدھ سیر سے زیادہ خریدنے پر آمادہ نہوں گے گویا قانون کا عمل پہلے ایک سیر بعد شروع ہوجاتا تھا اور اب احتیاج بڑھنے پر ۵ سیر بعد شروع ہوتا ہے۔

اگرچہ قانون تقلیل افادہ سے کوئی مفر نہیں۔ احتیاج کے اضافہ سے اس کے عمل کا التوا البتہ ممکن ہے لیکن یہاں یہ نکتہ سمجھنا خالی از دلچسپی نہوگا کہ کبھی کبھی اس قانون کے عمل سے قبل اس کے برعکس قانون **تکثیر افادہ** کا عمل عارضی طور پر نمودار ہوتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ موجودہ مقدار شئے مطلوبہ موجودہ احتیاج کے واسطے ناکافی ہو ایسی حالت میں مقدار شئے مطلوبہ کا اضافہ اس حد تک کہ موجودہ احتیاج رفع ہوجاوے قانون تکثیر افادہ کا پابند ہوگا۔ مثلاً ہم کو آئس کریم بنانا مقصود ہے اور اس کے واسطے ۵ سیر برف درکار ہے اب اگر صرف ۴ سیر برف دستیاب ہوسکے تو ہم اس کو شاید بہت کم قیمت پر بھی خریدنا پسند نہ کریں کیونکہ اس سے ہماری موجودہ احتیاج پوری نہیں ہوسکتی لیکن اگر مقدار مطلوبہ دستیاب ہو تو ضرور مناسب قیمت پر خریدلیں گے کپڑوں کے ٹکڑے خاص اسی وجہ سے کمتر قیمت پر فروخت ہوتے ہیں کہ اُن سے حسب دلخواہ لباس تیار نہیں ہوسکتا۔ جو کپڑا پورے سوٹ کے واسطے ہم بقدر ۷ گز چار روپیہ کے نرخ سے بخوشی خریدیں اس کا ۳ گز کا ٹکڑا جس سے ایک چھوٹا کوٹ تیار ہوسکے ہم ۳ روپیہ گز کو بھی نہ خریدیں تو کیا عجب اور اگر ٹکڑا اس سے بھی چھوٹا ہو تو کوئی اپنے بچے کے واسطے بہت سستا خریدلیگا۔ علاوہ موقع

کے زمین کی وسعت کا اس کی قیمت پر اثر پڑتا ہی اگر احتیاج سے کم ہی تو بھی قیمت گھٹے گی اور اگر احتیاج سے بہت زیادہ ہی تو بھی قیمت پر مضر اثر پڑیگا البتہ اگر احتیاج کے موافق ہی تو خریدار اپنے تخمینہ کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ شرح صرور پیش کر دیگا مکانات کے کرایہ کا بھی یہی حال ہی غرضکہ قانون تقلیل افادہ اور تکثیر افادہ کا عملدرآمد حسب طریق مالا ہر خرید و فروخت میں مخفی یا نمایاں ہوگا۔

قانون تقلیل افادہ کی ایک سادہ مثال سے مزید تشریح کرکے اس کے متعلق چند ضروری اصطلاحات اور بیان کرنا چاہتے ہیں فرض کرو کہ کوئی خاندان چار کا عادی ہی اب اگر نرخ چار ۳۲ روپیہ فی ڈبہ ہو تو شاید ایک ہی ڈبہ خریدا جائے۔ دوسرا ڈبہ اس وجہ سے نہیں خریدیں گے کہ قانون تقلیل افادہ کے بموجب اس کا افادہ پہلے ڈبہ کے افادہ سے کمتر ہوگا۔ لہٰذا اس کی قیمت پہلے ڈبہ کے برابر نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ اگر نرخ گھٹکر ۲۴ روپیہ ڈبہ رہجائے تو بجائے ایک کے دو ڈبے خریدے جاسکیں گے۔ اس صورت میں ۲۴ روپیہ دوسرے ڈبہ کے افادہ کا معیار ہوگا۔ اور چونکہ پہلا ڈبہ ۳۲ روپیہ تک خرید لیا جاتا اس لیے ۳۲ روپیہ اُس کے افادہ کا معیار ہوا۔ ان دونوں ڈبوں کے مجموعی افادہ کا معیار واحد (۳۲+۲۴) ۵۶ روپیہ ہوا۔ اور ایسے مجموعی افادہ کو اصطلاحاً **افادہ کلی** کہتے ہیں لیکن اگرچہ خریدار کے نزدیک پہلے ڈبہ کا افادہ ۳۲ روپیہ ہی اور دوسرے کا ۲۴ روپیہ سب ڈبے بلا تفریق ایک ہی نرخ سے فروخت ہوتے ہیں اور دونوں ڈبے ۲۴-۲۴ روپیہ کو خریدے گئے صاف ظاہر ہی کہ خریدار کی نظر میں پہلے ڈبہ پر بقدر (۳۲-۲۴) ۸ روپیہ زائد افادہ حاصل ہوا جس کو اصطلاحاً **نفع المصرف** کہتے ہیں نیز واضح ہو کہ ۲۴ روپیہ دوسرے ڈبہ کے افادہ کا معیار ہی اگر ۳۰ یا ۲۸ روپیہ ڈبہ فروخت ہوتا تب بھی ایک ہی ڈبہ خریدا جاتا اور اس پر

حصہ چہارم باب اول

(۳۲-۳۰) ۲ روپیہ یا (۳۲-۲۸) ۴ روپیہ نفع المصرف حاصل ہوتا لیکن دوسرے ڈبہ کے خریدنے کی نوبت نہ آتی کیونکہ اس کا افادہ ۲۴ روپیہ سے زیادہ نہیں ہے لہذا دو ڈبہ خریدنے کی شرط یہ نکلی کہ وہ ۲۴ روپیہ کو فروخت ہوا اور جب ایک ڈبہ ۲۴ روپیہ کو فروخت ہوا تو دوسرا اس سے زائد قیمت پر کیوں فروخت ہونے لگا اس میں کیا لال ٹکے ہیں فروشندہ کی نظر میں ڈبہ ڈبہ سب برابر محض اس وجہ سے کہ خریدار کی نظر میں ڈبوں کے افادہ کی مقدار مختلف ہیں فروشندہ اپنی طرف سے بلحاظ فرق افادہ انکی قیمت میں فرق قرار نہیں دیسکتا۔ اگر اس کو دو ڈبے فروخت کرنے مقصود ہیں تو وہ یہ نہیں کرسکتا کہ ایک ڈبہ ۳۲ کو اور ساتھ ہی اس قسم کا دوسرا ڈبہ ۲۴ روپیہ کو دے بلکہ ایک ساتھ دونوں ڈبے ۲۴-۲۴ کو فروخت کریگا اور دوسرے ڈبہ کا کمتر افادہ جس کا معیار ۲۴ روپیہ ہے اصطلاحاً **افادہ مختتم** کہلائے گا۔ یہاں پر یہ اصول بھی واضح ہوا کہ جب کوئی شخص ایک ہی چیز کے چند عدد یا کوئی مقدار خریدے تو اس کی نظر میں ہر عدد یا جزو مقدار کا افادہ مختلف ہوگا اور جس قدر عدد یا مقدار میں اضافہ ہوگا ایسے اضافہ کے افادہ میں نسبتاً تخفیف ہوتی جاوے گی اور ان تمام عددوں یا مقدار کی قیمت وہ لشرح مساوی اداکریگا تو وہ آخری عدد یا جزو مقدار کے کمترین افادہ کے برابر ہوگی یا الفاظ مختصر کسی چیز کی شرح قیمت اُس کے افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہے جس کی وجہ سے بمقدار افادہ زاید خریدار کو نفع المصرف حاصل ہوتا ہے۔ افادہ کلی۔ افادہ مختتم۔ اور نفع المصرف کا مفہوم اور انکا باہمی تعلق ذیل کی مثال سے بیان بالا کے ساتھ ساتھ اور بھی واضح ہوگا۔ یہاں پر ہم حسب بالا فرض کرتے ہیں کہ کس کس قیمت پر کتنے کتنے چاء کے ڈبے خریدے جاسکتے ہیں اور ہر صورت میں افادہ کلی۔ افادہ مختتم اور نفع المصرف کیا کیا ہوگا۔

اعلیٰ ترین قیمت	تعداد ڈبہ	افادہ کلی	افادہ مختتم	نفع المصرف
۳۲ روپیہ	۱	۳۲	۳۲	۰
۲۴ ،	۲	۵۶ (۲۴ + ۳۲)	۲۴	۸ (۴۸ - ۵۶)
۱۸ ،،	۳	۷۴ (۱۸ + ۵۶)	۱۸	۲۰ (۵۴ - ۷۴)
۱۴ ،،	۴	۸۸ (۱۴ + ۷۴)	۱۴	۳۲ (۵۶ - ۸۸)
۱۲ ،،	۵	۱۰۰ (۱۲ + ۸۸)	۱۲	۴۰ (۶۰ - ۱۰۰)

اعلیٰ ترین قیمت سے مراد وہ قیمت ہی کہ جس سے زاید دینے پر خریدار رضامند نہو اور چونکہ وہ افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہی قانون تقلیل افادہ کے طفیل سے اعلیٰ ترین قیمت ادا کرنے پر بھی خریدار کو کچھہ کچھہ افادہ زاید یعنی نفع المصرف حاصل ہو ہی جاتا ہی۔ لیکن جیسا کہ اکثر واقع ہوتا ہی اگر حسن اتفاق سے خریدار کو اعلیٰ ترین سے کم قیمت پر چیز ملجاوے تو اُسکو دوگونہ نفع المصرف حاصل ہوگا مثلاً مثال بالا میں اگر نرخ جاء ۲۸ روپیہ ڈبہ ہو تو پہلے ڈبہ پر بھی اس کو (۳۲ - ۲۸) ۴ روپیہ نفع المصرف ملے گا اور اگر نرخ بجائے ۲۴ کے ۲۰ روپیہ رہ جائے تو پہلے دو ڈبوں پر بجائے ۸ روپیہ کے {(۲۴ + ۳۲) - ۴۰} ۱۶ روپیہ نفع المصرف دستیاب ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ قیمت ۲۰ روپیہ ہو جانے پر بھی وہ صرف دو ہی ڈبے خریدیگا۔ تیسرا ڈبہ جس کا افادہ اس کی نظر میں زیادہ سے زیادہ ۱۸ روپیہ ہی نہیں خرید سکتا کیونکہ ایسا کرنے میں نفع المصرف ۱۶ روپیہ سے گھٹکر {(۳۲ + ۲۴ + ۱۸) - ۶۰} صرف ۱۴ روپیہ رہ جاتا ہے گویا تیسرا ڈبہ خریدنے میں سراسر نقصان ہی البتہ قیمت ۱۸ روپیہ ہو جانے پر وہ تین ڈبہ ضرور خریدیگا کیونکہ ایسا کرنے سے نفع المصرف ۱۶ روپیہ سے بڑہکر ۲۰ روپیہ ہو جائے گا اور اگر حسن اتفاق سے قیمت گھٹکر ۱۰ روپیہ رہ جائے تو نفع المصرف میں اور بھی اضافہ ہو سکے گا لیکن اسی طرح پر قیمت جب تک ۱۴ روپیہ نہو گی وہ چار ڈبے ہرگز نہ خریدیگا۔

حصہ چہارم
باب اول

مذکورہ بالا بحث سے قیمت کا ایک پہلو بخوبی واضح ہوگیا اور اس توضیح سے آگے چلکر مسئلہ قیمت کی تحقیق میں ہم کو بیش بہا مدد ملے گی۔ خریدار کی طرف سے شرح قیمت ہمیشہ کسی چیز کے افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہے۔ یا اس سے کم افادہ مختتم سے زیادہ اس لیے نہیں ہوسکتی کہ اس میں خریدار کا سراسر نقصان ہے نفع المصرف کی مقدار بجائے بڑہنے کے اُلٹی گھٹ جاتی ہے جو قیمت کہ خریدار کی طرف سے پیش کیجاوے صطلاحاً **قیمت طلب** کہلاتی ہے اور جیسا کہ خوب توضیح ہوچکا ہے وہ افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہے یا اس سے کم۔

قانون طلب

(۲) قانون تقلیل افادہ اس غرض سے یوں بالتفصیل بیان کیا گیا کہ وہ قانون طلب کا سنگ بنیاد ہے اور لہذا مسئلہ قیمت سے بھی اس کا نہایت قریبی تعلق ہے۔ اساسی قوانین اول جدا گانہ توضیح کر دینے سے بعد کو مسائل متعلقہ کے بیان میں بہت صفائی و سہولت پیدا ہوجاتی ہے۔ قوانین کا صرف حوالہ کافی ہوتا ہے اور تمامتر توجہ مسئلہ زیر بحث پر یکجا رہتی ہے۔ قانون طلب کو ہم کئی طرح پر بیان کرسکتے ہیں لیکن وہ سب ایک ہی واقعہ کے مختلف پہلو ہونگے۔

(۱) کسی چیز کی مقدار رسد جسقدر بڑہے گی اُس کی قیمت بھی ضرور گھٹے گی یعنی اگر کوئی چیز زیادہ مقدار میں فروخت کرنا مقصود ہو تو اس کی قیمت گھٹانا لازمی ہوگا۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہر مزید اضافہ کا افادہ گھٹے گا اور قیمت افادہ مختتم سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔

(ب) کسی چیز کی مقدار رسد جسقدر گھٹے گی اس کی قیمت بڑہے گی۔ قانون تقلیل افادہ کا اثر کثرت میں بہت قوی ہوجاتا ہے اور قلت میں اس کے برعکس ضعیف جبکہ شے مطلوبہ کی مقدار برابر گھٹے گی تو افادہ مختتم کی مقدار میں اضافہ ہوگا اور قیمت کو

بھی اس کے ساتھ بڑھنا پڑیگا۔

(ح) کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اُس کی طلب بڑھ جاتی ہی اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹ جاتی ہی

جیسا کہ اس سے قبل بھی جتایا جاچکا ہی یہ بات پیش نظر رکھنی ازحد ضروری ہی کہ قانون تقلیل افادہ نیز قانون طلب میں کسی چیز کی طلب کی حالت معین فرض کرلی جاتی ہی۔ طلب کا دار مدار آبادی رسم و رواج اور لوگوں کے شوق و مذاق پر ہی نیز ایسی چیز ونکا جو شئے زیر بحث کے بدل کے طور پر استعمال ہوسکیں طلب پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہی قانون طلب بیان کرتے وقت ان تمام حالتوں میں سکون فرض کرتے ہیں گویا ان میں کوئی قابل لحاظ تغیر پیدا نہیں ہوتا اور اس لیے شئے زیر بحث کی طلب معین سے مانی جاتی ہی۔ مثلاً چار کا رواج کثرت آبادی۔ ملکی آب و ہوا۔ رسم و رواج عام شوق و مذاق پر منحصر ہی کافی اور قہوہ کے رواج کی کمی بیشی کا بھی چار کے استعمال پر اثر پڑتا ہی اگر ان حالات کے ردو بدل سے چار کی طلب میں معقول اضافہ ہو تو قوانین تقلیل افادہ و طلب کا اثر ضعیف بلکہ قطعاً زائل ہوسکتا ہی اور اگر طلب بھی گھٹے تو ان قوانین کا عمل دس گنا قوی ہوتا آسان ہی گویا طلب میں کوئی قابل لحاظ کمی بیشی ان قوانین کے عمل کی مخالف و معاون ہوتی ہی لیکن قوانین بحالت مخالفت و معاونت اپنا عمل برابر جاری رکھتے ہیں۔ اس سے باز نہیں رکھے جاسکتے۔ ان قوانین کا اثر دریافت کرتے وقت طلب کم و بیش معین فرض کیجاتی ہی اور ایسا مفروضہ کچھ زیادہ خلاف واقعہ بھی نہیں کیونکہ طلب میں بڑے بڑے تغیرات مدتوں میں نمودار ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہی کہ ان ہر دو قوانین کا عملدرآمد ہر طرف نظر آتا ہی۔

کبھی کبھی طلب کی حالت جلد بھی بدل جاتی ہی اور قانون طلب کے عمل میں ضعف آجاتا ہی مثلاً شروع فصل میں جبکہ ہر شخص کو شوق ہوتا ہی خربوزہ اور انبہ جیسے پھلوں کی قیمت بہت اعلیٰ ہوتی ہی اور عین ریز کے زمانہ میں قیمت بہت گھٹ جاتی ہی اس کا باعث قانون تقلیل افادہ اور قانون طلب سے صاف ظاہر ہی لیکن آخر فصل میں جبکہ ان پھلوں کی اتنی ہی کمی ہوجاتی ہی

حصہ چہارم باب اوّل

جتنی کہ شروع فصل میں انکو معمولی قیمت پر بھی لوگ خریدنے کی پروا نہیں کرتے سوال ہوتا ہے کہ مقدار گھٹنے پر قیمت میں اضافہ کیوں نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ حالت طلب بدل گئی لوگونکا کھاتے کھاتے جی بھر گیا طبیعت سیر ہو گئی گویا شروع اور آخر فصل کی طلب میں زمین و آسمان کا فرق پڑ گیا اسی وجہ سے آخر فصل میں قانون طلب کا عمل بھی نمایاں نہیں ہوتا۔

یہ بھی اکثر سننے میں آتا ہے کہ کسی چیز کی طلب بڑھنے سے اس کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے اور طلب گھٹنے سے قیمت گھٹ جاتی ہے یہ مقولہ صرف اس حالت میں صحیح ہے جبکہ مقدار رسد معین فرض کر لیجائے اوّل یہ کہ شے زیر بحث کی مقدار میں جلد اضافہ ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ شے مذکور سریع الزوال ہو اور عرصہ تک اچھی حالت میں نہ رہ سکے۔ مثلاً کچھہ قدیم چیزیں فروخت کیجاویں اگر محققین آثار قدیمہ اُن کے شائق اور خواہاں ہونگے تو زر و جواہر کے ہموزن فروخت ہونا عجب نہیں ورنہ کوئی انکا پرساں حال بھی نہو گا۔ علیٰ ہذا پھل پھول ترکاری مچھلی اور برف جیسی عام استعمال کی چیزیں بھی جبکہ طلب کم ہو کوڑیوں کے مول فروخت ہونے لگتی ہے کیونکہ فروخت نہ کرنے سے وہ جلد خراب ہو جاتی ہیں اور تہوڑی بہت جو کچھہ قیمت ملتی ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے لیکن جب طلب بڑہتی ہے تو یہی چیزیں روپیوں کے حساب سے فروخت ہو جاتی ہیں لیکن ایسی چیزیں کہ جن کی رسد بطور مذکورہ بالا معین ہو کم ہیں۔ بیشمار چیزیں جن کا تعلق زراعت اور صنعت و حرفت سے ہے تہوڑے عرصہ میں گھٹ بڑھ سکتی ہیں اور بطور ذخیرہ بلاخوف و خرابی رکھی جا سکتی ہیں ان کی رسد کے اضافہ و تخفیف میں جس قدر عرصہ لگے تب تک تو مذکورہ بالا مقولہ اُن پر بھی صادق آئے گا لیکن اس کے بعد اُن کی قیمت قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے تابع ہوں گی اور طلب کی کمی بیشی ان قوانین کے عمل کی محرک ہو گی براہ راست قیمت کی کمی بیشی پر اس کا کوئی اثر نہ پڑیگا۔ مثلاً اگر شے زیر بحث قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے تو اضافہ طلب و

اضافہ رسد سے اُس کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس لبت بجائے قانون تکثیر حاصل قیمت میں تخفیف یقینی ہو گی اسی طرح پر جبکہ طلب کی کمی سے رسد بھی گھٹے تو قانون تقلیل حاصل سے قیمت میں تخفیف ہو جانا عجب نہیں لیکن قانون تکثیر حاصل ضرور قیمت میں اضافہ کر دیگا۔

اس بحث سے مجملاً یہ اصول دریافت ہو گیا کہ فروشندہ کی جانب سے قیمت کیونکر قرار پاتی ہی یعنی کوئی چیز کس اصول کے مطابق کم سے کم قیمت پر فروخت ہوتی ہی۔ معلوم ہوا کہ جن چیزوں کی مقدار کم و بیش معین ہو اور ان میں جلد اضافہ نہو سکے یا جو چیزیں جلد خراب ہو جاویں اور بطور ذخیرہ نہ رکھی جا سکیں۔ ان کی قیمت پر تو طلب کی کمی بیشی کا اثر غالب ہوتا ہی یعنی اُنکی قیمت بیشتر صرف قیمت طلب ہوتی ہی لیکن دیگر بیشما چیزیں جو کاشت و صنعت و حرفت سے تیار ہوتی ہیں جن کی مقدار بھی بہت زیادہ تاخیر بغیر بڑھ سکے اور جو کچھ عرصہ بطور ذخیرہ بھی رہ سکیں ان کی قیمت پر مصارف پیدائش کا بھی قابل لحاظ اثر پڑتا ہی اور مصارف پیدائش قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے تابع ہیں پس طلب کی کمی و بیشی کا صرف اتنا تعلق ہی کہ وہ قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے عمل کی محرک ہوتی ہی ورنہ قیمت منجانب فروشندہ براہ راست نہیں ہر دو قوانین کے تابع ہوتی ہی تقسیم دولت میں جا بجا واضح ہو چکا ہی کہ قیمت منجانب فروشندہ براہ راست مصارف مختتم کے مساوی ہوتی ہی اور اس کو اصطلاحاً قیمت رسد کہتے ہیں۔

دراصل زیر بحث یہ مقولہ تھا کہ طلب بڑھنے گھٹنے سے چیز کی قیمت بھی بڑھتی گھٹتی ہی معلوم ہوا کہ یہ مقولہ اسی حالت میں صحیح ہوتا ہی جبکہ مقدار رسد معین فرض کر لیجائے۔ یا چیز سریع الزوال ہو اسی سلسلہ میں ہم قیمت رسد کے اصول بھی مجملاً بیان کر گئے۔ لیکن باوجود خوف طوالت ہم ان اصول سے مسئلہ قیمت کے تحت میں پھر بحث کرینگے کیونکہ انکا صاف طور پر ذہن نشین ہونا نہایت ضروری ہی یہاں پر صرف ایک معمہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کے سلجھانے

میں اسقدر بحث مباحثہ کے بعد کوئی دقت نہیں ہونی چاہئیے ۔ اور وہ یہ ہے کہ
(۱) کسی چیز کی قیمت گھٹتی ہے تو اس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور کسی چیز کی طلب بڑھ جانے سے اُس کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔

یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی چیز کی قیمت بڑہنے سے اس کی طلب گھٹ جاتی ہے لیکن کسی چیز کی طلب گھٹنے سے اُس کی قیمت بھی گھٹ جاتی ہے۔

اِن دونوں مقولوں کا مفہوم وہی ایک ہوتا ظاہراِن میں سے ہر ایک میں تضاد معلوم ہوتا ہے تخفیف و اضافہ قیمت ایک ہی وقت میں اضافہ طلب کا باعث و نتیجہ علی الترتیب کیونکر ہوسکتے ہیں اسی طرح یہ اضافہ و تخفیف قیمت کا بھی علی الترتیب تخفیف طلب کا باعث و نتیجہ ہوسکنا سمجھہ میں نہیں آتا اس معمہ کا حل مذکورالصدر بحث میں بالتفصیل موجود ہے لیکن مزید سہولت کی نظر سے ہم یہاں اتنا اشارہ اور کیئے دیتے ہیں کہ قیمت گھٹنے سے طلب بڑہنے یا قیمت بڑہنے سے طلب گھٹنے میں طلب کی حالت میں سکون فرض کرلیا جاتا ہے اور یہ نتائج قیمت بڑہنے گھٹنے سے قانون تقلیل افادہ و قانون طلب کے تحت میں نمودار ہوتے ہیں لیکن طلب بڑہنے سے قیمت بڑہنے یا طلب گھٹنے سے قیمت گھٹنے میں ہم رسد کو معین یا سریع الزوال خیال کرتے ہوے حالت طلب میں ردوبدل تصور کرتے ہیں بالفاظ دیگر اوّل دو حالتوں میں تغیر طلب کا باعث تغیر قیمت ہے اور آخر دو حالتوں میں خود تغیر قیمت تغیر طلب کا نتیجہ ہے۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اضافہ طلب کے دو مفہوم ہوسکتے ہیں اول جبکہ دیگر حالات کے تغیر سے اضافہ طلب نمودار ہو کر اضافہ قیمت کا باعث ہو دوم جبکہ وہ حسب قانون تقلیل افادہ و قانون طلب تخفیف قیمت کا نتیجہ ہو۔ ان ہر دو جداگانہ قسم کے اضافہ طلب کو علی الترتیب اصطلاحاً **اضافہ طلب** و **کشائش طلب** کہیں گے تخفیف

حصہ چہارم باب اول

طلب کے بھی یہی دو مفہوم ہو سکتے ہیں یعنی یا تو وہ اضافہ قیمت کا نتیجہ ہو یا دیگر حالات سے پیدا ہو کر تخفیف قیمت کا باعث ہو۔ ان ہر دو مفہوم کے لحاظ سے اسکو بھی علی الترتیب **تخفیف طلب و بست طلب** کہنا چاہیئے۔ اسی اصول کے مطابق رسد میں بھی بعینہ چار قسم کی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اضافہ اور تخفیف رسد جو بطور خود پیدا ہو کر کمی و بیشی قیمت کا باعث ہو کشائش و بست رسد جو طلب یا قیمت کی بیشی کمی سے مودار ہو۔

غور کرنے سے واضح ہو گا کہ اضافہ طلب و کشائش رسد اضافہ رسد و کشائش طلب۔ تخفیف طلب و بست رسد تخفیف رسد و بست طلب یہ دو دو تبدیلیاں ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور اول الذکر تبدیلی دوسری کا باعث ہوتی ہے۔

تغیر پذیری طلب

(۴) قانون تقلیل افادہ سے ہم کو یہ قانون طلب دریافت ہوا کہ کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اس کی طلب بڑھتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹ جاتی ہے۔

لیکن واضح ہو کہ قیمت و طلب کی ان معکوس تبدیلیوں میں کوئی نسبت مستقیم نہیں کبھی قیمت کی ذرا سی تبدیلی طلب میں بہت بڑا فرق کر دیتی ہے اور کبھی معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے مثلاً ۲۰۔ ۲۵ فیصدی قیمت گھٹنے سے طلب میں دو چند سہ چند اضافہ ہو سکتا ہے اور کبھی اس کے برعکس قیمت نصف بلکہ چہارم بھی ہو جاوے تو بھی طلب میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑتا۔ علی ہذا کبھی قیمت کے صرف دس بیس فیصدی چڑھنے سے طلب بحد نصف بلکہ چہارم گھٹ جاتی ہے اور گاہے قیمت دو گنی سہ گنی بھی ہو جاوے لیکن طلب میں کوئی قابل لحاظ کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس اختلاف کا باعث یہ ہے کہ قانون تقلیل افادہ کے عمل کی رفتار کبھی سست ہوتی ہے اور کبھی تیز۔ اس سستی اور تیزی کے شرائط تو ہم ابھی بیان کرینگے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر رفتار سست ہے تو بہت زیادہ مقدار خریدی جانے پھر بھی قیمت کم گھٹے گی۔ یا یوں کہو کہ قیمت تھوڑی سی بھی کم ہو جائے تو طلب

بہت بڑھ جائے گی اور اگر رفتار تیز ہی تو تھوڑی سی مقدار بڑھنے پر قیمت بہت زیادہ گر جائیگی
یا بالفاظ دیگر باوجود قیمت میں بہت زیادہ تخفیف ہونے کے طلب میں نمایاں اضافہ نہوگا
اب صاف ظاہر ہی کہ جب قیمت کی تھوڑی سی تخفیف سے طلب میں بہت سا اضافہ ہو
تو اس کے برعکس قیمت کا تھوڑا سا اضافہ طلب کی بہت زیادہ تخفیف کا باعث ہوگا۔ مثلاً
اگر چاء کے ڈبے عہ کی بجائے ۱۵ر کی شرح سے بہت زیادہ فروخت ہوں تو یقیناً ۱۵ر کی بجائے
عہ کی شرح سے بہت کم فروخت ہونگے اب اگر قیمت کی قلیل تخفیف یا اضافہ سے طلب میں کثیر اضافہ
یا تخفیف نمودار ہو تو اس واقعہ کو تغیر پذیری طلب، ایسی طلب کو طلب تغیر پذیر کہینگے علی ہذا اس کی
مثال سے باآسانی سمجھ میں آسکتا ہی کہ اگر قیمت کے کثیر تخفیف سے طلب میں قلیل اضافہ نمودار ہو تو
قیمت کے کثیر اضافہ سے طلب میں قلیل تخفیف ہوگی مثلاً اگر للعہ کے بجائے عہ کے نرخ سے کوئی
چیز صرف دس فیصدی زیادہ فروخت ہو تو عہ کے بجائے للعہ کے نرخ سے صرف تقریباً دس
فیصدی کم فروخت ہوں گی۔ پس اگر قیمت کی کثیر تخفیف یا اضافہ سے طلب میں قلیل اضافہ
یا تخفیف نمودار ہو تو ایسی طلب کو طلب غیر تغیر پذیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

طلب تغیر پذیر و غیر تغیر پذیر کے کچھ معیار مقرر نہیں کہ ان دونوں قسموں میں کوئی عام اور
مستقل تفریق کی جائے۔ واقعہ یہ ہی کہ تغیر پذیری تو طلب کا ایک عام خاصہ ہی اور
اس کے بیشمار مدارج ہیں جتنی ہی تغیر پذیری بدرجہ اعلیٰ پائی جائے گی یعنی قیمت کی تھوڑی
تبدیلی سے طلب میں کوئی بڑا فرق نمودار ہوگا تو وہ طلب تغیر پذیر کھلانے کی زیادہ مستحق ہوگی
اور اگر تغیر پذیری بدرجہ ادنیٰ پائی جائے یعنی قیمت کی بڑی تبدیلی سے بھی طلب میں نہایت
معمولی فرق پیدا ہوا تو وہی طلب غیر تغیر پذیر کھلائے گی۔ حالانکہ ذرا سی تغیر پذیری اس
میں بھی ضرور موجود ہی گویا طلب غیر تغیر پذیر و تغیر پذیر میں صرف تغیر پذیری کی کمی بیشی کا
فرق ہی ورنہ تھوڑی بہت تغیر پذیری دونوں طلبوں میں موجود ضرور ہی۔

پس تغیر پذیری طلب کی مختصر تعریف یہ ہو گی کہ اگر قیمت تھوڑی گھٹنے سے طلب بہت بڑھے یا قیمت تھوڑی بڑھنے سے طلب بہت گھٹے اور ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دونوں حالتیں لازم ملزوم ہیں تو طلب بہت تغیر پذیر کہلائے گی اس کے برعکس اگر قیمت بہت گھٹنے سے طلب کم بڑھے یا قیمت بڑھنے سے طلب کم گھٹے اور یہ حالتیں بھی لازم ملزوم ہیں تو طلب کم تغیر پذیر یا غیر تغیر پذیر شمار ہو گی اسی تعریف کو بدلکر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر قیمت میں کچھ تخفیف ہونے سے طلب زیادہ بڑھے تو تغیر پذیر کہلائے گی اور اگر کم تو غیر تغیر پذیر علیٰ ہذا اگر قیمت میں کچھ اضافہ ہونے پر طلب میں بہت تخفیف ہو تو طلب تغیر پذیر ہے ورنہ غیر تغیر پذیر۔ ہمنے قصداً تغیر پذیری طلب کو کئی کئی طرز سے بیان کیا ہے۔ بظاہر تو اس سے وقت اور پیچیدگی بڑھتی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس طریق سے یہ قانون بہت عمدہ طور پر ذہن نشین ہو گا۔ البتہ ذرا غور و توجہ شرط ہے۔ تغیر پذیری طلب ایک عام مشاہدہ ہے اور اس کے واقع ہونے سے تو کسی کو انکار ہو نہیں سکتا دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ تغیر پذیری کن کن قوانین کی پابند ہے کیا ایسی چیزوں کے جن میں تغیر پذیری زیادہ یا کم ہو چند عام اور مستقل علامات قرار پا سکتے ہیں کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ جس سے تغیر پذیر طلب کا پہلے ہی سے تخمینہ اور اندازہ کیا جا سکے علمی تحقیقات اور عملی تجربہ سے تغیر پذیری طلب کے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکی ہیں پیش کیجاتی ہیں۔

یوں تو دولت مندی و افلاس کے مدارج کا کوئی شمار نہیں لیکن مالی حالت کے بیشمار قلیل فرق نظر انداز کر کے چند طبقے ایسے قرار پا سکتے ہیں کہ ان کی مالی حالت میں مقابلہ یکے ما دیگرے عام فرق نمایاں ہو مثلاً خوشحال۔ متوسط الحال اور تنگدست۔ ان طبقوں میں کوئی مستقل حد فاصل قائم کرنی تو محال ہے۔ بہت سے لوگ طبقہ اوّل کے ادنیٰ زمرہ میں اور طبقہ دوم کے اعلیٰ ممبروں میں یکساں شمار ہو سکیں گے لیکن پھر بھی علاوہ ان لوگوں کے جن کی کسی طبقہ میں شمولیت محقق نہ ہو سکے۔ ہر طبقہ کے گروہ کثیر کی مالی حیثیت

میں مقابلتہً نہایت بیّن فرق نظر آئے گا مالی حالت کی طرح قیمت کے مدارج بھی شمار سے باہر ہیں ایک پائی سے لیکر کروڑہا روپیہ تک کے نرخ سے چیزیں فروخت ہوتی ہیں لیکن قلیل فرق نظر انداز کرکے مالی طبقوں کی طرح قیمت کے بھی ہم تین عام درجے مقرر مقرر کرسکتے ہیں اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ۔ اعلیٰ سے مراد ایسی قیمت ہے کہ جو خریداروں کی حیثیت سے بہت زیادہ ہو لوگ اس قیمت پر چیزیں نہ خرید سکتے ہوں۔ متوسط قیمت وہ ہے کہ لوگوں کو گراں نہ گذرے اور ادنیٰ قیمت سے چیزوں کی بےحد ارزانی مراد ہے کہ ہر کوئی دل بھر کر خرید سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ قیمت کے یہ مدارج محض اضافی ہیں مستقل نہیں ہوسکتے۔ خوشحال طبقہ کی نظر میں جو قیمت ادنیٰ ہے تنگدستوں کے نزدیک وہ ضرور اعلیٰ ہوگی متوسط الحال طبقہ جس قیمت کو اعلیٰ قرار دے۔ خوشحال طبقہ اس قیمت کو متوسط سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح پر تنگدستوں کی متوسط قیمت۔ متوسط الحال کو ادنیٰ معلوم ہوگی۔ غرضکہ ایک ہی قیمت خریداروں کی مالی حیثیت کے مطابق اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ محسوس ہوتی ہے۔ مالی حالت اور قیمت کے مدارج اور ان کے باہمی تعلق تو عام مشاہدہ ہیں ان سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن احتیاطاً اوّل اُن کو ذہن نشین کرکے اب ہم تغیر پذیری طلب پر انکا اثر دریافت کرنا چاہتے ہیں واضح ہو کہ اعلیٰ اور ادنےٰ قیمت والی چیزوں کی طلب عموماً غیر تغیر پذیر ہوتی ہے اور متوسط قیمت والوں کی تغیر پذیر وجہ غور کرنے سے خود سمجھ میں آسکتی ہے۔ اعلیٰ قیمت چونکہ خریداروں کی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتی ہے اس کے اضافہ یا تخفیف کا اُن کی خریداری پر قابل لحاظ اثر نہیں پڑتا ہے۔ وہ چونکہ ایسی چیزیں شاذ و نادر ہی خریدتے ہیں اضافہ قیمت سے اُن کی قلیل طلب میں اور کیا تخفیف ہوسکتی ہے۔ اور چونکہ قیمت اُن کے نزدیک نہایت گراں ہوتی ہے۔ اس کی تخفیف سے بھی طلب میں کوئی نمایاں اضافہ ہونا دشوار ہے۔ اس کے برعکس ادنیٰ قیمت والی

چیزیں اسقدر ارزاں ہوتی ہیں کہ اگر اُن کی قیمت میں اضافہ بھی ہو جائے تو لوگونکو یہ اضافہ بار محسوس نہوگا اور حسب سابق خریداری جاری رکھیں گے ۔ اور چونکہ بوجہ ارزانی ہر کوئی دل بھر کر خرید سکتا ہی۔ مزید ارزانی سے اُن کی طلب میں اضافہ ہونے کی بہت کم گنجائش باقی رہجاتی ہی ۔ حاصل کلام یہ کہ قیمت کی افراط و تفریط کی دونوں حالتوں میں اشیا متعلقہ کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہی قیمت کی تبدیلی سے طلب پر اثر تو ضرور پڑیگا مگر نہ اسقدر کہ طلب تغیر پذیر کہلا سکے پس تحقیق ہوا کہ بالعموم اعلیٰ اور ادنیٰ قیمت والی چیزونکی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہی۔ لیکن متوسط قیمت والی چیزونکا معاملہ اس کے برعکس ہی۔ ایسی چیزیں نہ تو اسقدر گراں ہوتی ہیں کہ لوگ ان سے دستکش رہیں اور قیمت بڑھنے پر اُن کی قلیل طلب میں کوئی تخفیف نہو اور قیمت گھٹنے پر بھی لوگ اس کی مزید خریداری کی ہمت نہ کر سکیں اور نہ اسقدر ارزاں ہوتی ہیں کہ قیمت بڑھنے پر بھی لوگ انکو گراں محسوس نہ کریں اور بقدر سابق خریدے جاویں اور اگر قیمت اور بھی گھٹ جاوے تو زیادہ اسوجہ سے نہ خرید سکیں کہ سابق قیمت پر ہی وہ خوب دل بھر کر خرید رہے تھے اور طلب میں اضافہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی بلکہ متوسط قیمت اسقدر معتدل ہوتی ہی کہ تھوڑے سے اضافہ سے وہ گراں اور تھوڑی سی تخفیف سے ارزاں محسوس ہونے لگتی ہی اور قیمت کی تھوڑی سی تبدیلی کا طلب پر نمایاں اثر پڑتا ہی گویا متوسط قیمت والی چیزونکی طلب تغیر پذیر ہوتی ہی۔ ہر ملک میں کسی چیز کی طلب اس کے باشندوں کے طلب کا مجموعہ ہوتی ہی اور بلحاظ مالی حالت باشندوں کے مختلف طبقے ہوتے ہیں اور ہر طبقہ کا معیار قیمت اعلیٰ و متوسط و ادنیٰ جدا جدا ہی۔ جسقدر زیادہ باشندوں کی نظر میں کسی چیز کی قیمت متوسط ہوگی اتنی اس کی طلب بھی تغیر پذیر ہوگی۔

ابتک ہمنے صرف قیمت کی بیشی اور کمی کا تغیر پذیری طلب پر اثر دریافت کیا۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ چیزونکی نوعیت کا بھی تغیر پذیری طلب سے قوی تعلق ہی۔ واضح ہو کہ

ضروریات کے بھی بلحاظ اہمیت وشدت بیشمار مدارج ہیں۔ ان میں سے بعض از حد لابد اور ناگزیر ہیں مثلاً کھانا۔ پانی۔ لباس۔ مکان کہ محنت و زندگی کا اُن پر سراسر دارمدار ہے اور بہت سی ایسی ہیں کہ اگر ہم اُنکی عادت نہ ڈالیں تو ہم کو اُن کے نہ ملنے سے کوئی قابل لحاظ تکلیف نہو بلکہ اکثر کا وہم وگمان بھی ہمارے دل میں نہ گزرے۔ مصرع اینچہ ما در کار داریم اکثرے درکار نیست + اول الذکر قسم کی چیزوں کو **ضروریات لابد** اور آخر الذکر کو **تعیشات** سے تعبیر کرتے ہیں۔

ضروریات لابد اور تعیشات میں ایک از حد نتیجہ خیز فرق ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ خود قدرت نے مصلحتاً پیدا کیا ہے جو احتیاجات ضروریات لابد سے متعلق ہیں اُن کو رفع کیے بغیر چارہ نہیں اور وہ ایک مقدار معین سے تمام وکمال رفع بھی ہو جاتی ہیں اس کے برعکس تعیشات والی احتیاجات پوری نہ بھی ہو سکیں تو کچھ زیادہ مضائقہ نہیں لیکن پوری کرنیکا جس قدر اہتمام کیا جاتا ہے وہ ہل من مزید پکارتی ہیں احتیاجات اول الذکر اصطلاحاً **سیری پذیر** اور دوم **غیر سیری پذیر** کہلائیں گی مثلاً بھوک پیاس کو لو کہ قحط سالی اور حتک سالی میں جان بچانے کی خاطر جہانتک ستطاعت ہوتی ہے لوگ کھانا پانی خریدتے ہیں نیز غلّہ خواہ کتنا ہی ارزاں ہو جائے اور پانی خواہ کتنا ہی وافر کیوں نہو ایک مقدار معین سے زیادہ آدمی ایک وقت میں کھا پی نہیں سکتا۔ کچھ کھانا اور ایک آدہ گلاس پانی کے بعد آدمی اس وقت اسقدر سیری محسوس کرنے لگتا ہے کہ اگر اس کو مجبور بھی کیجیے تو زیادہ کھا پی نہ سکے غلہ اور پانی کا اگر کچھہ ذخیرہ رکھا جاتا ہے تو آیندہ محض احتیاجات کے خیال سے نوقت سیری اس کی موجودگی وعدم موجودگی یکساں ہے لیکن احتیاجات تعیشات کی حالت بالکل برعکس ہے۔ اگر تعیشات گراں ہوں تو لوگ اُن کی پروا بھی نہیں کرتے لیکن اگر وہ ارزاں ہو جاویں تو خریدتے خریدتے نہیں تھکتے۔ فیشن ایبل جنٹلمین کے پاس

حسب استطاعت درجنوں بوٹ۔ سوٹ ٹائی۔ کالر۔ جراب۔ تصاویر۔ چھڑیاں۔ میز کرسیاں فرش فروش اور ہر قسم کا فرنیچر ہو تب بھی اُنکا دل نہیں بھرتا ہر وقت ان چیزوں کے اضافہ کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کوئی چیز پسند آئی خرید لی۔ یہ سب چیزیں مثل ذخیرہ غلہ ویانی آیندہ احتیاجات کی غرض سے نہیں فراہم کیجاتیں بلکہ ایک ہی وقت میں ان سب کی موجودگی سے لطف آتا ہے۔ لیکن تعیشات کی مقدار کتنی ہی بڑھ جائے احتیاجات متعلقہ کو مثل بھوک و پیاس پوری سیری کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ بلکہ بمصداق آتش شوق تیز تر گردد احتیاجات کی شدت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ امیر خواہ بقول گوار ہزار گھی ہی گھی پئیں اور گڑ ہی گڑ کھائیں لیکن اُن کی احتیاج بھوک و پیاس کی اتنی ہی مقدار بلکہ کم سے رفع ہوجاتی ہے جتنی کہ غریب کی۔ اس کے برعکس اُن کی احتیاجات تعیشات غریب کے مقابلہ میں لاکھوں گنا زیادہ مقدار سے بھی پوری نہیں ہوتیں۔ اسی سلسلہ میں یہ نکتہ جتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر سیری پذیر احتیاجات کی ضروریات تو بالعموم تعیشات ہیں لیکن سیری پذیر احتیاجات کی ضروریات میں سے بھی بعض داخل تعیشات ہوسکتی ہیں کیونکہ وہ ناگزیر نہیں مثلاً شکر دودھ اور میوجات۔ تعیشات کی اس تفریق کی اہمیت آگے چلکر اضافہ طلب کے مختلف مفہوم کے سلسلہ میں واضح ہوگی۔

ضروریات لابد اور تعیشات کی کوئی قطعی طور پر جدا جدا فہرست نہیں بنائی جاسکتی۔ کھانا۔ پینا یہ دو ضروریات تو بیشک دُنیا بھر میں یکساں شدید و ناگزیر ہیں لیکن ان کے علاوہ باقی بیشمار ضروریات شدت و نوعیت کے لحاظ سے ملکی آب و ہوا۔ رسم و رواج اور معالی حالت سے متعلق ہیں وہی ایک چیز کسی کے نزدیک ازحد ناگزیر ضروریات میں شامل ہے اور کوئی اس کو نہایت فضول خرچی تعیشات میں شمار کرتا ہے۔ سرد ممالک میں

حصہ چہارم
مال اول

غریب سے غریب کو بھی چاپینی پڑتی ہے۔ گرم ممالک میں اختیاری ہے۔ یہی حال جوتے اور بیش خرچ ادنی لباس کا ہے اوّل اول تنبا کو یا شراب محض تو قیہ استعمال کیجاتی ہے لیکن چند روز بعد وہ مثل غذا لوازم زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ لباس اور مکان غریب لوگوں کو اگر میسر بھی آتا ہے تو صرف بقدر ضرورت لیکن امرا انکو تعیشات کی حد تک استعمال کرتے ہیں۔ عیش پسند امرا کو آنے جانے میں سواری بغیر چارہ نہیں لیکن محنت پسند عوام اور غریب کو پیدل چلنے پھرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔

اوپر کی جیسی بحث سے بظاہر پڑھنے والے کے دل میں ایک قسم کی بدعقیدگی پیدا ہو جائے تو عجب نہیں اس کو ہر بات غیر معین سی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت کل پہلو دیکھ لینے سے وسعت نظر پیدا ہو کر واقعات سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور بالخصوص علم المعیشت میں یہ مغالطہ ہرگز پیدا ہونے دینا چاہئے کہ علم ہندسہ وطبیعات کی طرح اس کے اصطلاحات اصول و قوانین بالکل قطعی اور معین ہیں ورنہ ایسی خوش عقیدگی کا نتیجہ علم و اقعات میں کامل مطابقت نہ ہونے سے بالآخر سخت مایوسی ہوتا ہے اور اس کے بعد کی بے بنیاد عقیدگی کرا دہرا سب برباد کر دیتی ہے۔ اسی احتیاط سے ہم اکثر جا بجا یہ جتانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ معیشت کے مسائل اصطلاحات میں کامل تعین اور تیقن محال ہے اس کے قوانین تخمینی ہونے سے زیادہ کا دعوی نہیں کر سکتے اور انکا عمل گوناگوں شرائط کا ماتحت ہوتا ہے۔

مقدار قیمت اور تغیر پذیری طلب کے باہمی تعلق کی بابت جو عام اصول ہم نے اوپر دریافت کیے ہیں ان میں ضروریات لابد اور تعیشات کے مذکورہ بالا فرق خواص سے حسب ذیل ترمیم نمودار ہوتی ہے۔

(۹) جبکہ قیمت اعلی ہو ضروریات لابد کی طلب میں بہت کچھ تغیر پذیری ہو سکتی ہے

لیکن تعیشات میں بیحد کم۔ باعث فرق یہ ہی کہ ضرورت زیر بحث بوجہ لابد ہونے کے بحالت قیمت اعلیٰ بھی تعیشات کے مقابلہ میں بہت زیادہ خریدی جاتی ہیں اور لوگوں کو خریدے بغیر کوئی چارہ نہیں جہانتک بھی استطاعت ساتھ دے گی۔ قیمت خواہ کچھہ ہی کیوں ہو وہ شے مذکور ضرور خریدیں گے۔ پس اگر قیمت ایسی انتہائی حد سے آگے بڑہے گی تو طلب میں جبریہ تخفیف نمودار ہوگی اور اگر قیمت میں تخفیف ہوگی تو طلب میں معقول اضافہ ہوگا کیونکہ جو لوگ خریدنے کے بیحد متمنی تھے لیکن بوجہ عدم استطاعت خریدنے سے معذور تھے وہ بھی شے مذکور تخفیف قیمت پر فوراً خریدنے لگیں گے۔ چونکہ ضروریات لابد کی طلب کم و بیش غیر اختیاری اور جبریہ سی ہوتی ہی اور اس کے برعکس تعیشات کی طلب خود اختیاری اور خوشی خواہ ہی۔ بمقابلہ تعیشات کے لوگ ضروریات لابد کی گرانی کے بہت زیادہ حد تک متحمل ہوسکتے ہیں اور یہی وجہ ہی کہ مقابلۃً ضروریات لابد کی طلب تعیشات کی طلب سے بحالت قیمت اعلیٰ زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہی۔

(ب) قیمت متوسط کی حالت میں تعیشات کی طلب مقابلۃً اس وجہ سے زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہی کہ اول تو ان کی احتیاج غیر سیری پذیر ہی گویا تخفیف قیمت سے بہت زیادہ اضافہ طلب کی گنجائش ہوسکتی ہی۔ دوم وہ ناگزیر نہیں یعنی اُن کی طلب اختیاری ہی لہذا اضافہ قیمت سے اُن کی طلب میں بہت کچھہ تخفیف ممکن ہی۔ اس کے برعکس ضروریات لابد کی طلب اس قدر تغیر پذیر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اول تو وہ ناگزیر ہی دوم احتیاجات متعلقہ سیری پذیر ہیں۔ سیری پذیر احتیاجات کی تعیشات میں بھی (مثلاً دودھ۔ گھی۔ شکر) کم و بیش تغیر پذیری سے پائی جاتی ہی کہ وہ ناگزیر نہیں۔ کچھہ ارزاں ہوئیں تو لوگ زیادہ خریدنے لگے اور گراں ہوئیں تو خریدنا چھوڑ دیا۔

(ج) قیمت ادنی میں ہر قسم کی چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہی لیکن پھر بھی مقابلۃً تعیشات کی طلب ضروریات

لابد کی طلب سے کمتر غیر تغیر پذیر ہوگی۔ یا یوں کہو کہ ضروریات لابد کی طلب مقابلۃً بیشتر غیر تغیر پذیر ہوگی۔ اس فرق کا باعث بھی وہی احتیاج کی سیری پذیری و عدم سیری پذیری کا خاصہ ہے جو علی الترتیب ضروریات لابد اور تعیشات سے متعلق ہے۔

تغیر پذیری طلب کے متعلق اب دو نکتے جتانے اور ضروری معلوم ہوتے ہیں اول یہ کہ طریق بدل کا تغیر پذیری طلب پر اثر قابل توجہ ہے۔ بدل سے مراد ہے کسی ایک چیز کے بجائے وہی احتیاج رفع کرنے کی غرض سے دوسری چیز استعمال کرنا مثلاً جوتوں میں بجائے چمڑہ کپڑا استعمال کرنا۔ تعمیر میں بجائے کنکر کے چونہ کے ریل کے کوئلہ کی راکھ لگانا۔ قحط میں بجائے غلہ کے بھوکے جانوروں کا گوشت کھانا۔ درختوں کی چھال۔ پتوں اور گھاس کے ریشے سے روئی اور ریشم کی مانند کپڑا بننا ہے۔ سائنس اور ایجادات کی بدولت شاید کوئی چیز ایسی ہو کہ جس کا بدل دریافت نہ کر لیا گیا ہو ورنہ اکثر چیزوں کے متعدد بدل مستعمل ہیں۔ موجودہ جنگ یورپ میں جرمنی کی لامحدود طاقت کا ایک سب سے بڑا راز اسکا بدل میں کمال قرار دیا گیا ہے صرف آلو سے جو جرمنی میں بافراط پیدا ہوتا ہے کھانے پینے کی ہر قسم کی چیزیں ساٹھ سے اوپر تیار کی جاتی ہیں جو گوشت اور گھی جیسی مختلف چیزوں تک کا بدرجۂ اعلیٰ کام دیتی ہیں۔ طریق بدل کی کثرت بھی معاشی ترقیات کے علامات و لوازم میں سے ہے۔ اسکا طلب کی تغیر پذیری پر اثر یہ پڑتا ہے کہ اگر کسی چیز کی قیمت میں اضافہ ہو تو بطریق بدل دوسری مقابلۃً ارزاں چیزیں استعمال ہونے لگتی ہیں اور شے زیر بحث کی طلب میں بعید تخفیف ہو جاتی ہے اسی طرح پر اگر کسی چیز کی قیمت گھٹے تو وہ خود بطور بدل دوسری مقابلۃً گراں چیزوں کے بجائے استعمال ہونے لگے گی تخفیف قیمت سے بھی اس کی طلب میں بھی بہت زیادہ اضافہ ہوگا گویا طریق بدل ہر دو صورت میں کسی چیز کی طلب میں تغیر پذیری بڑھا دیتا ہے۔

واضح ہو کہ طلب میں اضافہ تین طرح پر ہو سکتا ہے جو لوگ پہلے سے شے زیر بحث کو استعمال کر رہے ہیں اب وہ اسکو زیادہ مقدار میں استعمال کریں۔ تعیشات کیواسطے جن کی احتیاج غیر سیری پذیر ہوتی ہے۔ اضافہ طلب کا یہ طریق نہایت کارگر ہے ضروریات لابد میں بوجہ احتیاج سیری پذیر ہونے کے ایسے اضافہ کی گنجائش بہت کم ہے نیز ہو تعیشات احتیاجات سیری پذیر سے متعلق ہیں مثلاً دودھ یا شکر۔ تمنا کو، وہ بھی اس اضافہ سے زیادہ مستفید نہیں ہو سکتیں۔ دوم جو لوگ پہلے سے شے زیر بحث کو استعمال نہیں کرتے تھے وہ بھی اس کو استعمال کرنے لگیں ضروریات لابد تو صحت و زندگی کی خاطر جہاں تک بھی استطاعت ساتھ دے ہر کوئی حاصل کر سکتا ہے لیکن بہت سے لوگ تعیشات سے بوجہ گرانی دستکش رہتے ہیں پس اضافہ طلب کی یہ صورت بھی مقابلۃً تعیشات کے واسطے زیادہ موافق ہے تیسری صورت اضافۂ طلب کی طریق بدل ہے کہ شے زیر بحث دوسری چیزوں کے بجائے استعمال ہونے لگے یہ صورت ضروریات لابد اور تعیشات کے واسطے یکساں عام ہے۔ بحالت ارزانی جو مزدوری پیشہ لوگ گیہوں گھی اور شکر استعمال کرتے ہیں ان میں سے اکثر گرانی میں جو۔ چنا تیل اور گڑ استعمال کرنے لگتے ہیں قحط میں لوگ کثرت سے بھوکے جانوروں کا گوشت ہی گوشت کھاتے ہیں۔

تخفیف طلب کی بھی تین صورتیں ہیں جو اضافہ طلب کی مذکورہ بالا صورتوں کے بالکل برعکس ہیں یعنی سابق والے لوگ کمتر مقدار میں استعمال کریں یا لوگوں کی کمتر تعداد استعمال کرے یا دوسری چیزیں شے زیر بحث کی بجائے استعمال ہونے لگیں اول دو صورتیں مقابلۃً تعیشات کے واسطے زیادہ موزوں ہیں اور تیسری ضروریات لابد کے واسطے بھی یکساں عام ہے واقعہ یہ ہے کہ اضافہ یا تخفیف طلب کی یہ تینوں شکلیں بالعموم ملی جلی رہتی ہیں لیکن جو شکل سب سے عام ہوگی اس کا اثر بھی غالب رہیگا۔

حصہ چہارم باب اول

تغیر پذیری طلب کے متعلق دوسرا نکتہ قابل توجہ یہ ہے کہ اگر چیزوں سے متعدد احتیاجات پوری ہوتی ہیں مثلاً پانی کہ وہ پینے۔ کھانے۔ نہانے۔ دھونے اور چھڑکاؤ میں استعمال ہوتا ہے مشین چلانے میں بھی اس کی بھاپ سے بہت کام لیا جا رہا ہے۔ ان چند در چند احتیاجات میں سے بلحاظ خورونوش تو پانی قطعاً ضروریات لابد میں داخل ہے لیکن نہانے دھونے اور چھڑکاؤ جیسی احتیاجات کے ہمراہ وہ بتدریج تعیشات میں داخل ہو جاتا ہے نہانا اگر زندگی کے واسطے مہینہ میں ایک مرتبہ ناگزیر ہو تو ہر روز نہانا تعیشات میں شمار ہوگا۔ پھر کپڑے اور مکانات دھونے کا نمبر آتا ہے اور چھڑکاؤ اور مشین میں پانی کا استعمال تو صرف اول الذکر چاروں احتیاجات پوری ہونے کے بعد ممکن ہے۔ غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اگر ایک ہی چیز سے بہت سی ضروریات حاصل ہوں جن میں سے بعض لابد ہوں اور بعض تعیشات تو ایسی چیز کی مجموعی طلب میں ضرور تغیر پذیری ہوگی۔ قیمت بڑھنے سے اس کا استعمال بطور ضروریات لابد تو بحال رہیگا لیکن بطور تعیشات گھٹ جائیگا اور مجموعی نتیجہ تخفیف طلب ہوگا۔ اسی طرح پر قیمت گھٹنے سے اگرچہ بحد ضروریات لابد اس کی طلب وہی رہیگی لیکن بحیثیت تعیشات اس کا استعمال بہت بڑھ جائے گا اور مجموعی نتیجہ اضافۂ طلب ہوگا۔ لیکن جو چیزیں صرف ایک ہی احتیاج پوری کریں مثلاً گیہوں۔ گھی اور شکر دودھ تمباکو کہ صرف کھانے پینے کے کام آئیں وہ ضروریات لابد یا تعیشات میں سے جن میں بھی شمار ہوں انہی کے مذکورہ بالا قوانین کی پابند ہوں گی۔ اول الذکر قسم کی چیزوں کے مقابلہ میں بہر حال ان کی طلب کمتر تغیر پذیر ہوگی۔

تغیر پذیری طلب کی بحث نہ صرف ضروری بلکہ دلچسپ بھی ہے اور بلا لحاظ طوالت ہمنے کل ضروری پہلو پیش نظر کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعات پر غور کرنے سے

اگر سر اسر نہیں تو ایک بڑی حد تک تغیر پذیر طلب مذکورہ بالا اصول کی یا تند نظر آئے گی۔
موتی جواہرات کی طلب تغیر پذیر اسوجہ سے بہت کم ہی کہ جماعت کثیر کے نزدیک وہ انتہا درجہ کے تعیشات میں داخل ہیں اور اُن کی قیمت بھی اعلیٰ ہی۔

شکر کی طلب تغیر پذیر اور نمک کی غیر تغیر پذیر اسوجہ سے ہی کہ شکر کی قیمت متوسط ہی اور وہ داخل تعیشات ہی اور نمک کی قیمت ادنیٰ ہی اور نیز وہ ضروریات لابدیہ سے ہی یہی حال دودھ اور پانی کی طلب کا ہی۔ جن ملکوں میں پانی بہت وافر ہو وہاں اس کی طلب ضرور تغیر پذیر ہوگی۔

تمباکو کی طلب بھی تغیر پذیر ہی کیونکہ اس کی قیمت متوسط ہی۔ اور وہ داخل تعیشات ہی چنانچہ اکثر محض اخلاقی خیال سے نہ کہ آمدنی کی غرض سے ٹیکس قائم کر کے اس کی قیمت بڑھائی جاتی ہی تاکہ اس کا مضر استعمال کم ہو۔

معیشت کے مسائل سلجھانے میں وسعت نظر از حد ضروری ہی اگر کل ضروری پہلو پیش نظر نہ رکھے جائیں تو تحقیقات کا نتیجہ لا تقربوا الصلوٰۃ کا مصداق ہونا تعجب خیز ہوگا اگر صرف چند پہلو حسب مطلب یکجا کر کے کوئی بظاہر قطعی مسئلہ مرتب کر لیا جائے تو تجربہ اور مشاہدات کی ہوا سے مثل حباب ٹوٹ جائے گا مسئلہ بلا سے ادھورا ہو۔ لیکن قرین حقیقت ضرور ہونا چاہیئے۔ نامکمل صحیح مسئلہ مکمل تما غلط مسئلہ سے ہزار درجہ بہتر ہی۔ ہم نے اسی غرض سے بلا لحاظ طوالت ہر مسئلہ کے کل ضروری پہلو وضح کرنے کی کوشش کی ہی اول اول اگر پڑھنے والے کو اس کے سمجھنے میں کچھ محنت بھی کرنی پڑے گی تو اسکے معاوضہ میں اس کو صحیح معلومات حاصل ہوگی۔ لیکن سہل و مکمل تما مسائل سے تو خطرناک مغالطہ کا اندیشہ وابستہ ہی۔

(۵) مسئلہ قیمت کے کل اساسی اصول بیان ہو چکے اب صرف بازار کا مفہوم اور اُس کے

متعلق چند ضروری باتیں سمجھائی جاتی ہیں اس کے بعد ہم مبادلہ کے مرکزی مبحث قیمت پر توجہ کریں گے۔

بازار

بازار سے عرف عام میں تو مراد ایسی جگہ ہے جہاں بہت سے لوگ جمع ہو کر خرید و فروخت کریں شہروں میں تو اس قسم کے مستقل بازار ہیں۔ ہر قسم کے سامان کی دکانیں ہر روز لگی رہتی ہیں اور دکاندار صبح سے شام تک خریداروں کے ہاتھ سودا سلف بیچتے رہتے ہیں دیہات میں ہفتہ وار پینٹھ لگتی ہے۔ نیز شہروں میں سالانہ نمائشیں ہوتی ہیں یہ سب بازار عرفی کی مختلف شکلیں ہیں لیکن علم المعیشت میں بازار کا مفہوم کچھ اور زیادہ ہے۔ اصطلاحاً بازار سے مراد وہ کل خطہ ہے جس کے اندر اندر ایک وقت میں ایک چیز کی قیمت ہر جگہ برابر ہو اگر کچھ فرق ہو تو وہ بمقدار مصارف آمدورفت ہو اور بس ایسا خطہ خواہ تمام روے زمین پر محیط ہو یا چند ملکوں تک وسیع ہو یا کسی ملک یا اس کے حصے یا صرف کسی شہر یا گاؤں تک محدود ہو جن مقامات میں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی فاصلہ پر کیوں نہ ہوں کسی چیز کی ایک ہی وقت میں قیمت مساوی پائی جائے اور اگر فرق ہو تو مقدار مصارف آمدورفت کے برابر ہو تو وہ کل مقامات اس چیز کے ایک ہی بازار میں شامل شمار کیے جاوینگے گویا ان کل مقامات تک وہ بازار وسیع مانا جائے گا مثلاً گیہوں ہندوستان میں ۳ روپیہ من فروخت ہو امریکہ میں ۴ روپیہ من انگلستان میں ۵ روپیہ من اور ہندوستان سے امریکہ اور امریکہ سے ولایت گیہوں لیجانے کا صرفہ ایک ایک روپیہ من ہو اور ہندوستان سے براہ راست ولایت بھیجنے کا صرفہ ۲ روپیہ من ہو تو یہ تینوں ملک گیہوں کا ایک بازار شمار ہوں گے۔ اگر روئی ہندوستان مصر اور امریکہ میں ایک ہی نرخ سے فروخت ہو یا اگر کہیں کم و بیش ہو تو بس اس قدر کہ باہر بھیجنے یا باہر سے منگانے کے صرفہ کے برابر ہو تو یہ تینوں ملک روئی کا ایک بازار

مانے جاوینگے لیکن اگر آم خربوزہ۔ دودھ۔ دہی گاؤں میں ارزاں فروخت ہوں اور شہروں میں گراں اور قیمت کا فرق مصارف آمدورفت سے کم ہو یا زیادہ تو ہر ایک ایسا گاؤں اور شہر باوجود بیحد قریب قریب ہونے کے ان چیزوں کا جدا جدا بازار شمار ہوگا۔ اس کل بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ معاشی بازار کی خصوصیت لابد مساوات قیمت ہے نہ کہ قیام دکانات یا اجتماع خریداران و فروشندگان۔ بازار کا علمی مفہوم بیان کرنے کے بعد اب ہم اس کی وسعت و تنگی کے اصول دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

وسعت بازار کی پہلی شرط آزادیٔ مقابلہ ہے یعنی فروشندگان اور خریداران اپنے کاروبار کی حالت سے پورے طور پر واقف ہوں اُن کو رسد اور طلب کی مقدار کا اندازہ ہو نہ صرف قرب وجوار بلکہ دور دراز مقامات میں بھی اُن کے کاروبار کی جو حالت ہو اس سے ہر وقت باخبر رہیں سودا خواہ کہیں پٹے خریداران کم سے کم اور فروشندگان زیادہ سے زیادہ نرخ پر معاملہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں اس کوشش اور کشمکش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقابلہ کے دباؤ سے ہر جگہ نرخ ہموار ہو جائے گا اور قیمت کی حالت سطح آب کی سی ہوگی۔ عالمگیر امن و اماں معاشی ترقیات اور سہولت آمدورفت و خط وکتابت کی بدولت مقابلہ کا اثر بہت وسیع اور قوی ہو جانے سے بازاروں میں بھی بلا کی وسعت پیدا ہو گئی ہے اور بعض تو تمام دنیا پر مسلط ہیں۔ مساوات قیمت اور توسیع بازار کے واسطے مقابلہ شرط اولین تو ضرور ہے۔ اگر مقابلہ نہ ہو تو دو پاس پاس مقامات میں وہی ایک چیز مختلف نرخ سے فروخت ہوتی رہے اور اگر فرقِ قیمت مصارف آمدورفت سے زیادہ بھی ہو تو نہ خریدار اپنے سے دوسرے مقام کی ارزانی سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور نہ فروشندے اپنے سے دوسرے مقام کی گرانی سے۔ جہاں قیمت کم ہے وہاں کے خریدار نفع میں ہیں اور جہاں قیمت زیادہ ہے وہاں کے فروشندے۔ بحالت مقابلہ

یہ فرق قائم نہ رہ سکتا دونوں جگہ کا نرخ ملکر یوں ہموار ہوجاتا جیسا کہ قلابے سے ملے ہوئے دو حوضوں کا پانی۔

لیکن واضح ہو کہ چیز کی خرید فروخت میں مقابلہ کی یکساں گنجائش نہیں بعض چیزیں تو مقابلہ کے واسطے اسقدر موزوں ہیں کہ ان کے کاروبار میں ہم دنیا کے ہر خطہ سے مقابلہ کر سکتے ہیں اور بعض اسقدر ناموزوں کہ باوجود ہزار کوشش ہم مقابلہ سے معذور ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ بازار کی وسعت و تنگی نہ صرف مقابلہ ہونے نہونے پر منحصر ہی بلکہ اس کا چیزوں کی نوعیت سے بھی اسقدر قریبی تعلق ہی کہ مقابلہ کو بھی اس کا پابند ہونا پڑتا ہی۔

جن چیزوں کی خرید و فروخت میں بیحد مقابلہ کی گنجائش ہی اور لہذا جن کے بازار نہایت وسیع ہو سکتے ہیں ان میں خواص ذیل ہونا لازمی ہی۔ قوت مقابلہ اور وسعت بازار انہی خواص کی نسبت سے ہوگی۔

(۱) **عمومیت طلب** اس چیز کی تقریباً ہر ملک میں مانگ ہونی چاہئے اور یہ جب ہی ممکن ہی جبکہ ہر جگہ اس کا استعمال ہوتا ہو مثلاً سونا چاندی گیہوں شکر اُون روئی۔

(ب) **شناخت پذیری** اس چیز کی خوبی میں ایسا تعین اور یکسانی ہونی چاہیے کہ اسکے مدارج قرار پاسکیں اور تھوڑے نمونے سے چیز کی خوبی کا پتہ چل جاوے۔ مثلاً سونا چاندی کہ ایک ماشہ سے منوں کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہی اور اگر کوئی فرق ہو تو بلا دقت پتہ چل جاتا ہی۔ سونے اور چاندی کے مانند گیہوں اور روئی کے نمونے پورے طور پر قابل اطمینان نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن چونکہ ان دونوں کی مانگ عالمگیر ہی ان کے نمونے بھی ایک عجیب طریق سے بہت کافی حد تک قابل اطمینان بنائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سالہا سال کے تجربہ اور کوشش سے اپنے آپ کو گیہوں روئی جیسی عام طلب

والی چیزوں کا ماہر اور مبصر ہاتے ہیں۔

یہ لوگ ان چیزوںکی خوبی کا درجہ قرار دیتے ہیں مثلاً قسم اول۔ دوم وسوم اِن کی رائے دور پاس نہایت مستند اور قابل اعتماد مانی جاتی ہے۔ لوگ اپنا اپنا مال اُن کے پاس لاتے ہیں اور بلحاظ خوبی یہ مال کا درجہ قرار دیکر مال والوں کو ایک پروانہ دیدیتے ہیں کہ فلاں درجہ کا اسقدر مال مملوکہ فلاں ہماری تحویل میں موجود ہے۔ اور مال اپنے پاس رکھہ لیتے ہیں اس طرح پر بہت سے لوگونکا مال لے لیکر درجہ وار بڑے بڑے ذخیرے فراہم کرلیتے ہیں یکساں درجہ والے مال کی سب مقداریں ملادی جاتی ہیں اور ذخیرہ میں مال کی کوئی تفریق نہیں رہتی مثلاً بیس آدمی اگر درجہ اول کے گیہوں کی مختلف مقداریں لاویں تو وہ سب ملکر درجہ اوّل کا ایک انبار بن جاویں گی مال والے محض ماہرین ومبصرین کے دیے ہوئے پروانے بازار میں پیش کرتے ہیں اور خریدار پروانوں کے بھروسہ پر مال خرید لیتے ہیں اور مال ماہرین کے ہاں سے بھجوا دیا جاتا ہے۔ اس خدمت کے صلہ میں ماہرین کو دستوری ملتی ہے مال ہمیشہ پروانہ کے مطابق نکلتا ہے اگر ایسا نہو تو مبصرین کا اعتبار اُٹھ جاوے اور انکا کاروبار تباہ ہوجائے خود اپنی کاروبار کی ترقی کی خاطر وہ نہایت احتیاط اور توجہ سے مال کی خوبی تشخیص کرکے پروانہ دیتے ہیں تاکہ بازار میں وقعت واعتماد بڑھے نتیجہ یہ ہے کہ لوگ بطور خود مال خریدنے کی بجائے ان کی معرفت خریدنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

نمونے کے قابل اطمینان ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ محض نمونہ دیکھکر دور دراز مقامات سے بلا خدشہ فرمائش بھیج سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہو تو یا خریدار چیز دیکھنے آئے یا کل چیز برائے ملاحظہ اس کے پاس جائے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس طریق سے کاروبار چلنا محال ہے۔

حصہ چہارم باب اول

(ج) انتقال پذیری۔ یعنی چیز اس قابل ہو کہ دور دراز مقامات تک پہنچ جا سکے اس کی دو شرطیں ہیں اول یہ کہ وہ دیرپا ہو اور گل سڑ کر جلد ناکارہ نہو جائے تاکہ دیگر مقامات تک پہنچنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اُس میں وہ صحیح سالم رہے اور خریدار کے پاس عمدہ حالت میں پہنچے دوم یہ کہ اس کے وزن اور جسامت کے مقابلہ میں اس کی قیمت عمدہ ہو تاکہ مصارف آمد و رفت قیمت کا ایک جزو قلیل رہیں۔ سونا چاندی اس لحاظ سے سب سے بہتر ہیں کہ اُنکا وزن و جسامت دونوں نہایت کم اور مقدار قیمت بہت زیادہ گیہوں روئی اور شکر کا وزن و جسامت بھی موافق ہے اور اُن کی قیمت مصارف آمد و رفت کی متحمل ہو سکتی ہے لیکن اگر کوئی معمولی اینٹیں یا پتھر دور بھیجے تو مصارف آمد و رفت اصلی قیمت سے بھی کہیں بڑھ جاویں گے۔ پس جو چیزیں بوجہ زیادہ وزنی جسیم اور کم قیمت ہونے کے دور نہ پہنچ جا سکیں اُن کی قیمت میں مقابلۃً دو جگہ بہت فرق قائم رہ سکتا ہے۔ کیونکہ مصارف آمد و رفت اس فرق سے بھی زاید ہوتے ہیں۔ مصارف آمد و رفت جتنے ہی کم ہونگے قیمت میں فرق کم رہ سکے گا اور چیز جسقدر کم وزن۔ چھوٹی اور بیش قیمت ہو گی مصارف آمد و رفت کم ہونگے گویا ایسی چیزوں کی خرید فروخت میں مقابلہ قوی ہو گا اور انکا بازار وسیع ہو گا۔

قوت مقابلہ اور وسعت بازار کے واسطے کسی چیز میں مذکورہ بالا تینوں خواص کم و بیش موجود ہونے لازمی ہیں پس صاف ظاہر ہے کہ جن چیزوں میں اُن کے برعکس خواص پائے جاویں یعنی اُنکی طلب مخصوص اور محدود ہو ان میں شناخت پذیری و انتقال پذیری مفقود ہو تو انکے کاروبار میں مقابلہ ضعیف ہو گا۔ اور اُنکا بازار تنگ و مختصر۔ مثلاً پھل پھول ترکاری گوشت۔ گویا ایک طرف تو چند عالمگیر بازار ہیں اور دوسری طرف مقامی بازار اور اُن کے بین بین متعدد بازار ہیں جن کی وسعت مختلف ہے۔ مقابلہ کا وسعت بازار پر جو اثر پڑتا ہے مقابلہ میں جو آجکل سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں اور مقابلہ کے واسطے چیز میں جو جو خواص لازمی ہیں یہ سب جاننے

حصہ چہارم
باب اوّل

کے بعد بعض نرخوں کی عالمگیر مساوات اور بعض کے بیشمار اختلافات جو ہر طرف نظر آتے ہیں سمجھنے میں سہولت ہوگی اور واقعات سے مذکورہ بالا اصول کی تطبیق بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

قدر و قیمت

(۶) جب ہم ایک چیز کا دوسری چیز سے براہ راست مبادلہ کریں مثلاً ایک سیر گھی کے معاوضہ میں دس سیر گیہوں۔ یا سیر بھر دودھ کے بدلے میں پاؤ بھر شکر۔ تو یہ چیزیں اصطلاحاً ایک دوسرے کی قدر کہلائیں گی گویا قدر سے مراد دوسری چیزوں کی وہ مقدار ہے جو ہماری چیز کے مبادلہ میں مل سکے لیکن جیسا کہ اہمیت مبادلہ کے تحت میں اوپر بتایا جا چکا ہے اور نیز آیندہ بعنوان زر بالتفصیل بیان کیا جاویگا آجکل چیزوں کا چیزوں سے براہ راست مبادلہ شاذونادر ہی ہوتا ہے بغرض سہولت ایک خاص چیز ایجاد کی گئی ہے جو اصطلاحاً زر کہلاتی ہے۔ ہر شخص اپنی چیز کا بخوشی اُس سے مبادلہ کرنے پر تیار ہوتا ہے۔ گویا مبادلہ میں زر ہر شخص کو قبول ہے زر کا استعمال اسقدر عام ہوگیا ہے کہ کسی دو چیزوں کے مبادلہ میں بطور ثالث اس کی وساطت ناگزیر ہے۔ چنانچہ زر کی وساطت ہی کے باعث مبادلہ کا عمل واحد اب خرید فروخت کے عمل میں منقسم ہو گیا اگرچہ زر بھی خود ایک چیز ہے لیکن دنیا کی باقی تمام چیزوں سے وہ اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ مبادلہ میں دوسری چیزیں تو صرف بشرط احتیاج قبول کی جا سکتی تھیں لیکن اس کی مقبولیت عام ہے مبادلہ میں ہر شخص اس کا خواہاں نظر آتا ہے۔ پس اگر کسی چیز کا ہم زر سے مبادلہ کریں خواہ وہ چیز خریدیں یا فروخت کریں تو زر کی وہ مقدار جو معاوضہ میں دی جاوے اصطلاحاً قیمت کہلاوے گی۔ مثلاً سیر بھر گھی اور دس سیر گیہوں ایک دوسرے کی قدر تھے لیکن ایک ایک روپیہ ان دونوں کی قیمت ہوتی ہے۔

اسی طرح پر سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر شکر جو ایک دوسرے کی قدر تھے ان کی قیمت بھی دو دو آنہ ہوگی۔

آج کل قیمت کا رواج عام ہے لیکن اس کے ذریعہ سے ہم کسی دو یا زیادہ چیزوں کی

باہمی قدر کا اندازہ لگا سکتے ہیں مثلاً دودھ دو آنہ سیر فروخت ہو۔ گھی کا نرخ روپیہ سیر ہو شکر روپیہ کی چار سیر ملے اور نمک ۱۶ سیر تو ایک روپیہ معیار قرار دینے سے معلوم ہوا کہ آٹھ سیر دودھ۔ سیر بھر گھی ۴ سیر شکر اور ۱۶ سیر نمک ایک دوسرے کے ہم قدر ہیں۔ اور ایک ایک روپیہ ان سب کی جداگانہ قیمت۔

صاف ظاہر ہے کہ قیمت قدر کی ایک خاص شکل ہے فرق یہ ہے کہ جو چیز معاوضہ میں بطور قیمت قبول کی جاتی ہے اُس کی مقبولیت عام ہے اور وہ اصطلاحاً زر کہلاتی ہے۔ گویا قیمت وہ قدر ہے جو مبادلہ میں بشکل زر قبول کی جائے۔

مبادلہ میں جو زر دیا جائے وہ تو اس چیز کی قیمت ہوا یا اور وہ چیز اس مقدار زر کی قدر کہلائیگی مثلاً جبکہ ایک سیر روپیہ پر گھی کی قیمت ہے تو سیر بھر گھی ایک روپیہ کی قدر شمار ہوگا۔ صاف ظاہر ہے کہ کسی چیز کی قیمت بڑہنے سے زر کی قدر گھٹتی ہے اور قیمت اترنے سے زر کی قدر چڑہتی ہے مثلاً اگر گھی کا نرخ سیر کے بجائے تین پاؤ فی روپیہ رہجائے یا یوں کہو کہ ایک سیر گھی کی قیمت روپیہ کے بجائے ۱۵ہ ہو جاوے تو روپیہ کی قدر بجائے ایک سیر کے تین پاؤ گھی رہ گئی گویا موجودہ ۱۵ہ کی قدر وہی ہے جو سابق میں ایک روپیہ کی تھی یعنی سیر بھر گھی اسی طرح اگر گھی کا نرخ سیر بھر کی بجائے ڈیڑہ سیر فی روپیہ ہو جائے یا یوں کہو کہ ایک سیر گھی کی قیمت روپیہ کے بجائے دس آنہ رہ جاوے تو روپیہ کی قدر ایک سیر کے بجائے ڈیڑہ سیر گھی ہوگئی۔ گویا موجودہ دس آنہ کی قدر وہی ہے جو پہلے ایک روپیہ کی تھی یعنی سیر بھر گھی

حاصل کلام یہ کہ قیمت اشیا اور قدر زر کی تبدیلیاں بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہوتی ہیں۔ چیزوں کے علاوہ زر کی قلت و کثرت سے بھی ان تبدیلیوں کا نہایت قریبی مگر دقیق اور پیچیدہ تعلق ہے جس کی ہم آئندہ زر کے سلسلہ میں تشریح کریں گے۔

چیزوں کی قدر قیمت اور زر کی قدر کے سلسلہ میں یہاں مختصراً یہ بتانا بھی بے محل نہوگا

کہ زر کی نہ صرف قدر بلکہ قیمت بھی ہوتی ہے۔ البتہ زر کی قیمت کا ایک خاص جداگانہ مفہوم ہے زر کی قیمت سے مراد شرح سود ہے جو زر مستعار پر ملے۔ چنانچہ گرانی زر سے اصطلاحاً مراد یہ ہوتا ہے کہ عام طور پر روپیہ قرض ملنے میں دقت پیش آئے اور شرح سود بہت اعلیٰ طلب کی جائے۔ اسکے برعکس ارزانی زر کے معنی یہ ہیں کہ لوگ بکثرت قرض دینے پر آمادہ ہوں اور شرح سود بھی ادنیٰ ہو ان مسائل سے ہم آیندہ بھی بحث کریں گے۔ زر کی قدر و قیمت کی طرف یہاں صرف اشارہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ زر کا بھی آپس میں مبادلہ ہوتا ہے روپیہ سے روپیہ اور پیسہ سے پیسہ یا گنی سے گنی تو کوئی بدلتا نہیں کیونکہ ان میں کوئی فرق نہیں لیکن روپیہ سے پیسے اور گنی سے روپے ضرور بدلے جاتے ہیں۔ گویا مختلف قسم کے زر کا باہمی مبادلہ ہوتا ہے ایسے مبادلہ کی شرح کے اصول ہم آیندہ زر کے تحت میں بیان کرینگے یہاں صرف اس قدر بتانا مقصود ہے کہ جبکہ زر کا معاوضہ زر دیا جاوے تو وہ بھی اصطلاحاً ایک دوسرے کی قدر کہلاتے ہیں۔ نہ کہ قیمت۔ مثلاً سولہ آنہ روپیہ کی قدر ہیں اور گنی کی قدر پندرہ روپیہ ہیں۔

واضح ہو کہ مبادلہ کی اصلی غرض حصول ضروریات ہے۔ جس چیز کی ہم کو ضرورت نہ ہو یا کم ہو اس کے مبادلہ میں ہم ایسی چیز لینا چاہا کرتے ہیں کہ جس کی ہم کو ضرورت یا بیشتر ضرورت ہے۔ مبادلہ میں زر محض بطور ایک سہولت افزا آلہ یا وسیلہ کے استعمال ہوتا ہے پس درحقیقت توجہ طلب تو چیزوں کی قدر ہونی چاہئے۔ لیکن چونکہ معاوضہ کا مروجہ معیار قیمت ہے۔ لہذا قدر و قیمت کا رشتہ بتانے کے بعد ہم بھی قدر کی بجائے قیمت سے بحث کرینگے نیز قدر و قیمت کے مزید تعلقات زر کے بیان میں واضح کریں گے اور اسی طرح پر مبادلہ کا اساسی مسئلہ صاف ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔

(۷) صاف ظاہر ہے کہ قیمت مبادلہ پر مبنی ہے۔ جب کسی چیز کا مبادلہ ہی ممکن نہ ہو تو اس کی

قیمت کیونکر قرار پاسکتی ہے اور مبادلہ کے واسطے جو شرائط لازمی ہیں وہ مقدمہ میں بعنوان استبدال بالتفصیل بیان ہو چکی ہیں۔ ان کا ماحصل یہ ہے کہ مبادلہ کیواسطے اوّل کسی چیز میں افادہ ہونا شرط ہے دوم اس چیز کی قلت بھی لازمی ہے۔ قلت سے مراد ہے کسی چیز کا مقدار طلب دستیاب نہونا۔ چنانچہ خود قلت میں افادہ کی شرط مضمر ہے۔ اگر کسی چیز میں افادہ ہی نہو تو پھر لوگ اس کو طلب کیوں کرنے لگے اور پھر قلت کے کیا معنی یہاں یہ نکتہ سمجھنا خالی از لطف نہو گا کہ قلت اور ندرت دو جدا گانہ حالتیں ہیں۔ اگر کوئی چیز کتنی ہی کثیر مقدار میں پیدا ہو لیکن پھر بھی بلحاظ طلب ناکافی ہو یعنی اس کی رسد طلب سے کم رہے تو اس کی قلت مانی جائے گی اس کے برعکس اگر کسی چیز کی نہایت تھوڑی مقدار موجود ہو لیکن اس کی طلب نہو تو ایسی حالت قلت شمار نہیں ہو سکتی بلکہ ندرت کہلائے گی ہوا اور دھوپ میں از حد افادہ موجود ہے مگر چونکہ ان کی مقدار لامحدود ہے اور وہ ہر شخص کو میسر ہیں بوجہ قلت ہونے کے اُن کی کوئی قیمت بھی نہیں کم وبیش یہی حال لب دریا پانی اور اندرون جنگل لکڑی کا ہے۔ اگر کل کرۂ ارض سونے کا ہوتا تو سونا مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت ہوتا یا اگر غلہ آسمان سے بکثرت برستا تو پھر کوئی کسی سے نہ خریدتا گیہوں اور روئی جیسی چیزیں جن کی طلب عالمگیر ہے اربوں اور کھربوں ہی من پیدا ہوتی ہیں لیکن پھر بھی ان کی ایسی افراط نہیں کہ لوگوں کو حسب طلب بطور خود دستیاب ہو سکیں بلکہ ان میں بھی تعین مقدار اور ملکیت کی صفات موجود ہیں یعنی باوجود فی نفسہ مقدار بڑی ہونے کے بلحاظ طلب ان کی قلت ہے اور اسی وجہ سے ان کی قیمت اُٹھ آتی ہے۔ بیس برس پرانی صد ہا من شراب میں قلت اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ اس کی رسد طلب سے کم ہے لیکن صرف ایک سیر دودھ جو بیس برس بوتل میں بند رکھا رہا ہو باوجود اس قدر کم مقدار ہونے کے صفت قلت سے مبرا ہے کیونکہ اس کی طلب ہی نہیں جو کچھ ہے اس میں صرف ندرت ہی ندرت ہے علی ہذا اگر وہاں گائے بکریوں کے ہوتے ہوئے اُن کی قلت ہے حالانکہ بعض وحشی جانوروں

میں جن کی تعداد بہت تھوڑی ہو گی صرف ندرت ہو سکتی ہے ان کی کوئی قلت نہیں۔ گلاب چنبیلی اور بہت سے خوشبودار درخت اور بیلیں بکثرت اگائی جاتی ہیں لیکن پھر بھی بحیثیت مجموعی انکی قلت ہے اپنی اپنی قسم کے تھوڑے تھوڑے بہت سے پودے اور گھاس اگتی ہیں جن کی کوئی قلت نہیں محسوس ہوتی ان میں ندرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ندرت سے فی نفسہ کسی چیز کی کمی مراد ہے اور وہ عمومیت کی متضاد ہے۔ لیکن قلت محض ایک صفت اضافی ہے اس سے کسی چیز کی کمی فی نفسہ نہیں بلکہ بلحاظ طلب مراد ہے اور وہ کثرت کی متضاد ہے۔

یہ ایک معاشی مقولہ ہے کہ قیمت کا دارمدار محض قلت پر ہے۔ اگر کسی چیز کی قلت زیادہ ہے قیمت بھی زیادہ ہو گی اور اگر قلت کم ہے تو قیمت بھی کم۔ قلت کا مذکورہ بالا مفہوم کہ اس میں افادہ بھی مضمر ہے اور نیز قلت و ندرت کا فرق سمجھنے کے بعد قانون تقلیل افادہ کو مد نظر رکھکر اس مقولہ کی صحت میں کوئی شک نہیں رہنا چاہیے۔ اگر سچ پوچھو تو اس مقولہ نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ لوازم مبادلہ۔ قانون تقلیل افادہ۔ قانون طلب و رسد اور اصول شرح قیمت یہ سب باتیں اس مقولہ میں داخل ہیں پہلے تین اجزا تو بیان ہو چکے ہیں۔ صرف حوالہ کافی ہونا چاہیے۔ البتہ چوتھے جزو یعنی شرح قیمت سے ہم ذیل میں جداگانہ مفصل بحث کرتے ہیں۔

قیمت مبادلہ پر مبنی ہے اور مبادلہ کے واسطے دو فریق لازمی ہیں چنانچہ خریدار اور بیچنے والے کے باہمی جھگڑنے جھگڑانے سے چیز کی قیمت طے ہوتی ہے خریدار گھٹانے کی کوشش کرتا ہے بیچنے والا حتی الامکان قیمت بڑھانے میں زور لگاتا ہے اور فریقین کی کشمکش سے کوئی ایسی قیمت قرار پا جاتی ہے جس پر دونوں رضامند ہو جاویں اگر دونوں رضامند نہ ہو سکیں تو سودا نہ پٹے گا اور نہ کوئی قیمت قرار پائے گی۔ پس اصول شرح قیمت دریافت کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے خریدار و فروشندہ دونوں فریق کے نقطۂ نظر کی تحقیق لازمی ہے۔

خریدار کا طرز عمل تو صاف ہے۔ خریدنے میں وہ قانون تقلیل افادہ کا پیرو ہوتا ہے اور قیمت طلب یعنی خریدار کی پیش کردہ قیمت کسی مقدار کے افادہ مختتم سے کم یا اس کے مساوی ہوتی ہے اس طرح جو خریدار کو جو زاید افادہ حاصل ہو وہ اصطلاحاً نفع المصرف کہلاتا ہے اس اجمال کی تفصیل بعنوان قانون تقلیل افادہ موجود ہے۔ جس کا اعادہ سراسر بیجا طوالت ہوگا۔

اب رہا دوسرا فریق یعنی بیچنے والا اس کا طرز عمل ذرا پیچیدہ اور تشریح طلب ہے۔ جس کم سے کم قیمت پر فروشندہ مال دینے کو آمادہ ہو جائے وہ اصطلاحاً **قیمت رسد** کہلاتی ہے۔ عام مقولہ ہے کہ قیمت رسد مصارف پیدائش کے مساوی ہوتی ہے اور بظاہر بات بھی صاف ہے مصارف پیدائش سے کم قیمت پر فروخت کرنے سے بیچنے والے کا سراسر نقصان ہے۔ اور لوگ کاروبار نفع کی خاطر کرتے ہیں نہ کہ نقصان برداشت کرنے کو لہذا کاروبار کی شرط اوّل یہی ہے کہ قیمت مصارف پیدائش کی برابر ضرور وصول ہوتی رہے ورنہ چند ہی روز میں کاروبار بند ہو جانا یقینی ہے۔ واضح ہو کہ بحیثیت مجموعی یہ مقولہ ضرور صحیح اور درست ہے۔ لیکن اول تو اس میں دو مستثنیات توجہ طلب ہیں دوم بلحاظ تنگی و وسعت وقت اس مقولہ کے عمل میں اور نیز مصارف پیدائش کے مفہوم میں قابل لحاظ فرق پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ ان نکات کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

اوّل مستثنیات کو لیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیمت کا دار و مدار قلت پر ہے اور قلت کے اسباب مختلف ہیں بعض حالتوں میں قلت محض اتفاقی ہوتی ہے۔ مثلاً قدیم کرم خوردہ کتابیں بوسیدہ نقشے اور تصویریں زنگ آلودہ سکے۔ اگر کوئی انکا طالب نہو تو ان میں ندرت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جب محققین آثار قدیمہ میں اس کی مانگ ہو تو ساتھ ہی قلت نمودار ہوگی اور قیمت کا کتنا ہی بڑھ جانا عجب نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی قیمت قیمت طلب پر منحصر ہے یعنی خریدار جس قدر دینے پر رضامند ہو سکیں۔ جب ان چیزوں کو بنے ہوئے صدیاں بیں

گذر چکے اُن کے موجودہ مالکوں کو یہی معلوم نہیں کہ کتنے کتنے کو خریدی ہوگی۔ ورجبکہ ایسی چیزیں کسی صرفہ سے بھی تیار نہ ہوسکیں تو قیمت رسد ور مصارف پیدائش کا لحاظ خارج از بحث ہی دوم جبکہ کوئی چیز بحالت اجارہ پیدا ہو نہ کہ بحالت مقابلہ تو اس صورت میں بھی قیمت رسد کا مصارف پیدائش کے مساوی ہونا یقینی نہیں اغلب یہ ہی کہ وہ مصارف پیدائش سے زیادہ ہوگی۔ چنانچہ اجارہ دار کے نقطۂ نظر سے اجارہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہی کہ قیمت حسب دلخواہ قرار دیجاسکتی ہی اجارہ میں قیمت رسد کس اصول کے مطابق قرار پاتی ہی یہ بطور خود ایک جداگانہ مسئلہ ہی اور آگے چلکر بعنوان اجارہ ہم اس سے مفصل طور پر بحث کرینگے یہاں صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ اجارہ کی حالت میں بھی قیمت رسد کا مصارف پیدائش کے مساوی ہونا ضروری نہیں بلکہ اس سے زیادہ ہونا اغلب ہی۔ البتہ تیسری حالت میں یعنی جبکہ قلت کا باعث نہ اتفاق ہو نہ اجارہ بلکہ مصارف پیدائش ہوں تو قیمت رسد ضرور مصارف پیدائش کے مساوی ہوگی۔

مذکورالصدر ہر دو مستثنیات سے واضح ہوا کہ اوّل تو یہ مقولہ کہ قیمت رسد مصارف پیدائش کے مساوی ہوتی ہی ان چیزوں سے متعلق ہی جو پیدا کیجاسکیں اور جن کی پیداوار میں اضافہ وتخفیف ممکن ہی۔ دوم اس مقولہ کی صحت صرف بحالت مقابلہ یقینی ہی جبکہ ہر کوئی اپنے حریف کو زک دینے اور اپنے مال کی بکری بڑہانے کی غرض سے قیمت گھٹاتے گھٹاتے مصارف پیدائش تک لے آتا ہی۔ بلکہ مقابلہ کے جوش میں کبھی کبھی حریف مصارف پیدائش سے بھی کم کر گذرتے ہیں۔ اگرچہ ایسی کمی صرف چند روزہ ہوتی ہی بہرحال اجارہ کی طرح مقابلہ میں قیمت رسد کا مصارف پیدائش سے زیادہ ہونا ممکن نہیں۔ اور مساوی ہونا اغلب ہی۔

اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وسعت وقت کا اس قول کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہی اور مصارف پیدائش کے مفہوم میں کیا فرق نمودار ہوتا ہی۔

حصہ چہارم
باب اول

جبکہ وقت اس قدر تنگ ہو کہ چیزوں کی پیداوار میں حسب دلخواہ کمی بیشی نہ کی جا سکے اور چیزیں بھی سریع الزوال ہوں تو ایسے وقت کے اندر قیمت بیشتر قیمت طلب پر منحصر ہوتی ہے قیمت رسد کا اثر بہت ضعیف ہوتا ہے۔ آم امرود بیر وغیرہ پھلوں کی پیداوار باغات کی تعداد پر منحصر ہے اور باغ مدتوں میں تیار ہوتے ہیں اور مدتوں ہی بیکار۔ پس ہر فصل میں جتنے پھل پیدا ہونے ہوئے ہو گئے اور اُن کی قیمت قیمت طلب کے تابع ہوتی ہے۔ اسی طرح پر خربوزے تربوز جب کھیت میں بو دیئے گئے تو پھر اُن میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا اور اُن کی قیمت فصل پر قیمت طلب کے مطابق رہتی ہے۔ خواہ طلب ایک حالت پر برقرار ہے اور ان پھلوں کی بہت کم یا بہت زیادہ مقدار پیدا ہو یا مقدار پیداوار برقرار ہے اور طلب میں بہت زیادہ اضافہ یا تخفیف ہو جائے یا یہ دونوں تبدیلیاں کسی ترکیب سے ایک ساتھ نمودار ہوں ہر حالت میں نتیجہ وہی ایک ہوگا یعنی قیمت طلب سے قیمت قرار پائے گی۔ یوں تو شہروں میں دودھ دہی ایک مقررہ نرخ سے فروخت ہوتے ہیں لیکن فرض کرو کہ ہفتہ بھر کے واسطے بوجہ شادی و تیوہار اُن کی طلب یکایک بڑھ جاوے تو ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے عرصہ میں لوگ نئی گائے بھینس خرید کر دودھ دہی کی مقدار نہیں بڑھا سکتے نتیجہ یہ ہے کہ قیمت بہت چڑھ جاوے گی۔ اسی طرح پر اگر چند روز کے واسطے بوجہ خرابی موسم انکی بکری بہت گھٹ جاوے تو لوگ گائے بھینس جدا نہیں کر سکتے اور دودھ دہی پیسہ سیر بھی بک جائے تو عجب نہیں چونکہ یہ دونوں سریع الزوال ہیں فروخت نہ کرنے میں سراسر نقصان ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی دام اُٹھ آئیں غنیمت ہے۔ اسی طرح پر اگر سوء اتفاق سے گھوسیوں کی بہت سی بھینس گم یا بیمار ہو جاویں یا برائے فروخت چند روز کے واسطے باہر سے بہت سی بھینس آ جائیں تب بھی دودھ کی قیمت علی الترتیب بہت چڑھ اُتر جائے گی۔ گویا خواہ طلب میں تبدیلی ہو یا رسد میں یا دونوں میں نتیجہ وہی ایک ہوگا۔ قیمت طلب کا غلبہ ہیگا

برف کا کارخانہ ہر روز ایک مقدار تیار کرتا ہے اب اگر کسی روز یکایک برف کی مانگ بہت بڑھ جائے یا گھٹ جائے یا برف بہت زیادہ یا کم مقدار میں تیار ہو تو ہر صورت اس کی قیمت قیمت طلب کی تابع ہوگی۔

حصہ چہارم باب اول

اوپر کی مثالوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ علی الترتیب چند سال، ایک فصل دو ایک ماہ دو ایک روز تک اشیائے مذکور کی مقدار پیداوار میں کوئی حسب دلخواہ ردوبدل کرنا دشوار ہے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ طلب بڑھتی دیکھکر اپنی طرف سے پیداوار بڑھا دیں اور گھٹتی دیکھکر گھٹا دیں بلکہ اوقات مذکورہ کے اندر جو مقدار پیدا ہوئی ہے وہ پیدا ہو جاتی ہے اور قیمت محض طلب پر منحصر رہجاتی ہے۔ قیمت طلب جو کچھہ ہو وہی چیز کی قیمت قرار پائے گی۔ قیمت رسد کو دخل دینے کی مجال نہیں ہوتی اب یہہ اتفاق پر منحصر ہے کہ قیمت طلب قیمت رسد سے بڑھ کر فروشندہ کو مالامال کر دے یا گھٹکر اس کا دیوالہ نکالدے۔

حاصل کلام یہہ کہ سریع الزوال چیزوں کی قیمت اتنے تھوڑے عرصہ کے اندر اندر کہ اُن کی مقدار پیداوار میں حسب دلخواہ کوئی کمی بیشی نہ کیجا سکے۔ گویا مقدار پیداوار کم و بیش معین سی ہو قیمت طلب کے ماتحت ہوتی ہے۔ قیمت رسد کا اسوقت کے اندر اندر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ایسے مختصر وقت کے اندر والی قیمت کو اصطلاحاً **بازاری قیمت** کہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ بازاری قیمت قیمت طلب کی پیرو ہوتی ہے اور اس میں بڑے بڑے فرق ممکن ہیں۔ پھل پھول اور ترکاریوں کی فصل بھر قیمت بدلتی رہتی ہے عید تیوہار اور سہالگ کے موقعوں پر دودھ دہی کی قیمت دگنی چوگنی ہو جانا معمولی بات ہے۔ یہی برف پیسہ سے لیکر روپیوں سیر تک بک جاتا ہے۔

تلون مزاجی بازاری قیمت کا خاصّہ ہے۔ لیکن پھر بھی بازاری قیمت کا اوسط قیمت رسد یعنی مصارف پیدائش کے مساوی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر اتنے عرصہ تک کہ مقدار رسد میں کمی بیشی کی جا سکے بازاری قیمت کا اوسط قیمت رسد سے زیادہ رہا تو مقابلہ کے

زور میں لوگ رسد بڑھا دینگے اور بصورت دیگر رسد گھٹا دینگے مثلاً اوپر کی چار مثالوں میں بحالت بیشی اوسطِ بازاری قیمت برقیمت رسد لوگ دس بارہ برس میں نئے نئے باغات لگا دیں گے دو ایک فصل میں باڑیوں کی تعداد دیڑھ جاوے گی - گھوسی اپنا گلہ بڑھائیں گے اور کارخانہ زیادہ برف تیار کرنے لگے گا - اور اگر اوسط کم پڑا تو عمل اس کے برعکس ہوگا -

اب اگر اس دوران میں طلب اپنی سابق حالت پر قائم رہی تو رسد کی بیشی کمی کے بعد بازاری قیمت کا اوسط مصارف پیدائش کے لگ بھگ پڑیگا - اگرچہ قیمت طلب کے زیر اثر بازاری قیمت اب بھی کافی تغیر پذیر رہیگی - اور اگر اصلاح رسد کے بعد طلب میں کوئی اور دیرپا بڑا تغیر ہو جاوے تو نہ معلوم اوسط قیمت اور مصارف پیدائش میں کیا تعلق قائم ہو -

جو چیزیں مقابلۃً زیادہ دیرپا ہیں مثلاً سونا چاندی - لکڑی - غلہ - کپڑا - جوتہ اور بہت سے مصنوعات بازاری قیمت تو اُن کی بھی ہوتی ہے - لیکن وہ قیمتِ طلب کی یوں سراسر پیرو نہیں ہوتی بلکہ قیمت رسد سے بھی تعلق کم وبیش ضرور لگا رکھتی ہے - اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے کچھ مدت تک ٹھیرے رہ سکتے ہیں اور اگر کوئی ردوبدل از حد قوی اور دیرپا ہو تو کمی بیشی طلب و رسد کی زد ذخائر پر پڑتی ہے اور اسقدر پر اثر ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ سریع الزوال چیزوں میں طلب بڑہنے یا رسد گھٹنے سے مقابلۃً بازاری قیمت میں کمتر فرق نمودار ہوتا ہے اور علیٰ ہذا طلب گھٹنے یا رسد بڑہنے سے عام مشاہدہ ہے کہ مذکورالصدر جیسی دیرپا چیزوں کی قیمت میں کہیں مدتوں بعد کوئی بڑا اور دیرپا فرق پیدا ہوتا ہے - ورنہ سالہا سال تک قیمت ایک سطح پر قائم رہتی ہے - بازاری قیمت کے تغیرات بہت ادنیٰ قسم کے ہوتے ہیں اور اگر کوئی غیر معمولی فرق نمودار بھی ہوا تو وہ بہت جلد زائل ہو جاتا ہے - اور قیمت پھر معمولی سطح پر آرہتی ہے - ایک سادہ مثال لو -

مقدار گیہوں	قیمت طلب	قیمت رسد
۱۲۰۰ من	۲ روپیہ من	۴ روپیہ من
۱۰۰ "	۲½ " "	۳½ " "
۷۰۰ "	۳ " "	۳ " "
۵۰۰ "	۴ " "	۲½ " "
۳۰۰ "	۵ " "	۲ " "

قانون تقلیل افادہ اور قانون تقلیل حاصل پیش رکھنے سے بلحاظ مقدار گیہوں قیمت طلب ورسد کے فرق سمجھنے میں دقت نہ ہوگی۔ اوپر کی مثال میں مقدار رسد ۷۰۰ من کے قریب رہیگی اور قیمت تقریباً ۳ روپیہ من۔ اگر مقدار رسد صرف ۵۰۰ من ہوئی تو مقابلہ کے جوش میں اس کو بڑھا کر اور اگر مقدار ۱۰۰ من ہو تو بخوف نقصان اس کو گھٹا کر ۷۰۰ من کر دینگے اور قابل ذخیرہ ہونے کی وجہ سے ایسی چیزوں کی رسد میں کمی بیشی اسقدر دقت طلب نہیں جتنی کہ سریع الزوال چیزوں میں۔ اوپر کی مثال میں یہ حالت کہ مقدار رسد و طلب یعنی ۷۰۰ من ایک ہی قیمت یعنی ۳ روپیہ من پر برابر برابر ہوں اصطلاحاً توازن طلب و رسد کہلاتی ہے۔ اور وہ قیمت کہ جس پر دونوں مقدار مساوی قرار پائیں یعنی ۳ روپیہ اصطلاحاً قیمت متوازن اور خود یہ مقدار مقدار متوازنہ کہلاتی ہے۔ واضح ہو کہ کامل توازن طلب و رسد کم ممکن ہے۔ اگر کبھی نمودار بھی ہوتا ہے تو محض اتفاقی طور پر اور بہت جلد زائل ہو جاتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رسد ۷۰۰ من کے اور قیمت ۳ روپیہ کے قریب قریب رہتی ہے کبھی کچھ زیادہ کبھی کم۔ قانون تقلیل افادہ و تقلیل حاصل ملکر ہر تبدیلی کی اصلاح جلد کر دیتے ہیں اور چیزوں کے دیرپا ہونے کی وجہ سے ایسی اصلاح سہل بھی ہے۔ ان چیزوں کی قیمت کا حال قطب نما کی سوئی کا سا ہے کہ جو ساکن تو بہت کم ہو مگر بالعموم ادھر ادھر ہٹ ہٹ کر جلد جلد مرکز یعنی قیمت متوازن کی طرف لوٹتی رہے۔ ایسی قیمت جس کی تبدیلیاں

حصہ چہارم
باب اوّل

عرصہ تک مختصر حدود کے اندر اندر رہیں اصطلاحاً قیمت معمولی کہلاتی ہی مثلاً چند سال سے گیہوں کی قیمت معمولی ۳ اور ۴ روپیہ من کے درمیان چلی آتی ہی۔

قیمت متوسط اور قیمت معمولی کا فرق صاف ظاہر ہی اگر ۱۰۰ چیزیں ۳ روپیہ کے نرخ سے ۴۰۰ ایک روپیہ بارہ آنہ کے نرخ سے اور ۱۵۰۰ ۱ے کے نرخ سے فروخت ہوں تو قیمت معمول ایک روپیہ کہلائے گی اور قیمت متوسط

$$\left\{\frac{(100\times 3)+(400\times 1\tfrac{3}{4})+(1500\times 1)}{100+400+1500}\right\}=\frac{300+700+1500}{2000}=\frac{2500}{2000}=1\tfrac{1}{4}$$

ہوگی۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوگا کہ دیرپا چیزوں کی ٹھیٹ بازاری قیمت کچھہ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہوتی اُن کی قیمت بیشتر قیمت معمولی ہوتی ہی اس کے برعکس سریع الزوال چیزوں کی قیمت معمولی کم پائی جاتی ہی ان میں بازاری قیمت کا بہت دور دورہ ہی قیمت معمولی تو قیمت متوسط کے آس پاس رہتی ہی اور بازاری قیمت اس سے دور دور لیکن قیمت متوسط ہر حالت میں مصارف پیدائش کے مساوی ہوتی ہی اگر نہیں ہی تو کچھہ عرصہ میں ہو جاتی ہی لیکن حقیقت یہ ہی کہ طلب و رسد میں ہر آن اسقدر بیشمار اور طرح طرح کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ اُن کا احاطہ محال ہی ہم ایسی تبدیلیوں کی مجموعی حالت اور اُن کے اغلب نتائج کا اندازہ کرسکتے ہیں اور بس چنانچہ مذکورہ بالا اصول قیمت اگر ہر جداگانہ تفصیل سے موافقت نکریں تو اس کا باعث خصوصیات حالات ہونگی ورنہ عام حالات کم و بیش ضرور مطابق نکلیں گے اور معاشی اصول و قوانین عام حالات کی مطابقت سے زیادہ کا دعویٰ بھی کم کرسکتے ہیں۔

قیمت طلب یعنی وہ زیادہ سے زیادہ قیمت کہ جس پر لوگ کوئی چیز خریدنا پسند کریں افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہی اور قیمت رسد یعنی وہ کم از کم قیمت کہ جس پر لوگ کوئی چیز پیدا کرنا گوارا کریں مصارف مختتم کے برابر ہوتی چاہئے اس سے قبل بتایا جاچکا ہی کہ جب کسی چیز کی ایک ہی مقدار کا افادہ مختتم مصارف مختتم کے برابر ہو یعنی کسی مقدار کی قیمت طلب اور

رسد بھی ہر دو یکساں ہوں بالفاظ دیگر ایک ہی قیمت پر مقدار رسد وطلب برابر ہو جاوے جیسا کہ اوپر کی مثال میں ملا وہیں کے نرخ سے ۷۰ من گیہوں تو ایسی حالت توازن طلب ورسد اور ایسی قیمت قیمت متوازن اور ایسی مقدار مقدار متوازنہ کہلاتی ہی اب افادہ مختتم اور مصارف مختتم کے تعلقات دریافت کرنا چاہتے ہیں اگر کسی چیز کی پیدائش قانون تقلیل حاصل کی پابند ہو جیسی کہ زرعی پیداوار تو افادہ مختتم اور مصارف مختتم کی حرکت ایک دوسرے کے برعکس ہوگی۔ مقدار رسد کے اضافہ سے افادۂ مختتم گھٹے گا تو مصارف مختتم بڑھینگے۔ بحالت تخفیف مقدار رسد نتیجہ برعکس ہوگا۔ ان معکوس کمی بیشی میں ایک مقام ایسا آئے گا کہ افادۂ مختتم اور مصارف مختتم برابر ہو جائیں گے اور اس کو اصطلاحاً مقام توازن کہتے ہیں توازن طلب رسد قیمت متوازن اور مقدار متوازنہ اسی مقام توازن سے متعلق ہیں اور قیمت معمولی بھی اسی مقام کے قرب وجوار میں گھومتی رہتی ہی اوپر کی مثال میں ہمنے پیداوار کو قانون تقلیل حاصل کے تابع فرض کیا ہی ایسی حالت میں افادہ مختتم ومصارف مختتم کے تعلقات اور معکوس حرکات شکل ذیل سے اور بھی واضح ہونگے۔
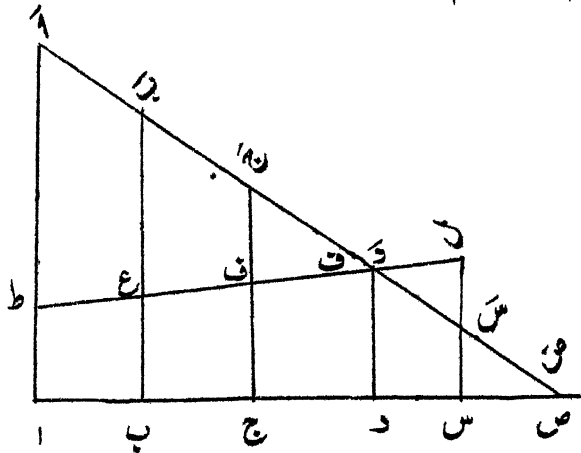
ا سے ص تک رسد کے جرعہ ہیں ا آب ب سے ص ص تک ہر جرعہ کا افادہ ہی جو قانون تقلیل افادہ کے بموجب گھٹکر ص پر غائب ہو جاتا ہی اطب ع سے س ل تک ہر جرعہ کے مصارف

پیدائش ہیں جو قانون تقلیل حاصل کے اثر سے بڑھتے گئے ہیں آ سے لیکر ص تک شش خط افادہ اور ط سے لیکر ل تک خط مصارف کہلائے گی -

شکل سے واضح ہوگا کہ خط افادہ وخط مصارف رسد کے د. جر عہ پر ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں - جس کے معنی یہ ہیں کہ جرعہ د کا افادہ ۲س کے مصارف پیدائش کے برابر ہوں - گویا د قیمت طلب اور دق قیمت رسد ایک دوسرے کے ہموزن ہیں رسد میں جرعہ د مقام توازن ہے ا د مقدار متوازنہ ہے اور دق یا د قیمت متوازن - صاف ظاہر ہے کہ چونکہ جرعہ س کا افادہ س س- ۲س کے مصارف س ل سے کم ہے لہذا مقدار ۲س کی قیمت طلب قیمت رسد سے کم رہی گی اور بخوف نقصان رسد گھٹکر مقدار ا د پر آرہی گی اس کے برعکس جرعہ ج کا افادہ ج ۲س کے مصارف ج ف سے زیادہ ہے - گویا جرعہ ج تک قیمت طلب قیمت رسد سے زیادہ رہیگی لہذا جوش مقابلہ میں مقدار رسد اج سے بڑھ کر اد ہو جائیگی - رسد تو مقدار ا د کے قرب جوار میں رہیگی اور قیمت معمولی دق یا د د کے آس پاس لیکن اگر پیداوار قانون استقرار حاصل کی پابند ہے - اگرچہ ایسا شاذونادر ہوتا ہے تو مصارف ہموار ہوں گے ایسی حالت میں مصارف مختتم خارج از بحث ہیں جس مقدار کا افادہ مختتم مصارف پیدائش کے برابر ہو وہی مقدار رسد قرار پا جائے گی افادہ مختتم کے گھٹنے بڑھنے سے صرف مقدار رسد میں کمی بیشی ہوتی رہی گی - قیمت اپنی جگہ پر قائم رہیگی یہ اصول ذیل کی شکل سے اور بھی بخوبی واضح ہوگا -
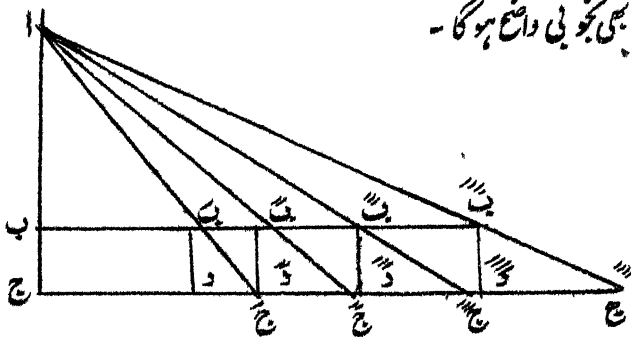
اس شکل میں کشش ب بؔ خط ص س ف ہی جو بوجہ قانون استقرار حاصل تقدر ب ج ہموار چلی گئی ہی اجؔ اجؔ اجؔ رفتار قانون تقلیل افادہ کی تیزی اور سستی کے مطابق مختلف خطوط افادہ ہیں جن کے مطابق علی الترتیب سد مقدار ج د۔ ج دؔ۔ ج دؔ۔ ج دؔ قرار پائے گی۔ گویا قیمت اسی جگہ پر قائم رہی گی۔ افادہ مختتم کے گھٹنے بڑہنے سے مقدار رسد میں کمی بیشی ہوتی رہے گی۔

تیسری حالت یہ ہی کہ پیداوار قانون تکثیر حاصل کی پیرو ہو اس صورت میں افادہ مختتم اور مصارف پیدائش ایک ہی جانب ساتھ ساتھ رجحان کرینگے یعنی مقدار رسد بڑہنے سے افادہ اور مصارف دونوں گھٹیں گے اور مقدار گھٹنے سے نتیجہ برعکس ہوگا بہرحال افادہ اور مصارف کی حرکت کا رُخ ایک ہی جانب ہوگا اب یا تو قانون تقلیل افادہ کی رفتار زیادہ ہونے سے خط افادہ خط مصارف کو کہیں کاٹکر رسد روک دیگا یا طریق پیدائش کی ترقی کرتے کرتے منتہائے کمال کو پہنچ جانے کے بعد مزید پیداوار پر قانون تکثیر حاصل کا عمل گھٹکر قانون تقلیل حاصل کا عمل علیٰحدہ شروع کریگا تو ایسی حالت میں خط مصارف رُخ بدلکر کہیں خط افادہ کو کاٹے گا اور وہیں رسد بھی رک جائے گی یہ دونوں صورتیں علی الترتیب ذیل کی شکلوں سے بخوبی واضح ہوں گی۔
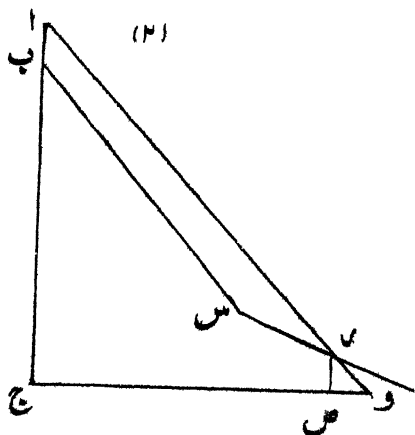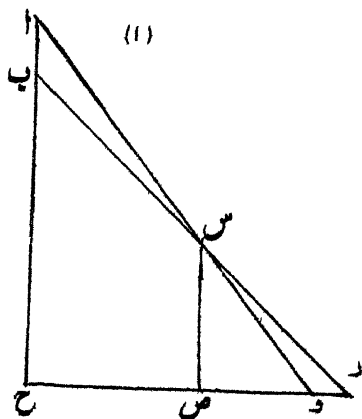
شکل اول میں خط افادہ او خط مصارف ف ر کو بمقام س کاٹکر مقدار رسد ح ص تک محدود کردیگا شکل دوم میں خط مصارف ف بمقام س رح بدلکر خط افادہ او کو مقام ر پر کاٹکر مقدار رسد ح ص تک معین کردیگا۔ تیسری صورت کہ قانون تکثیر حاصل کی رفتار زیادہ تیز رہی یا اس پر قانون تقلیل حاصل کا کبھی غلبہ ہو یعنی خط مصارف کبھی رخ نہ بدلے خلاف تجربہ اور خلاف قیاس ہے اور بفرض محال ایسا ہو بھی سکے تو افادہ بالآخر غائب ہو کر رسد کو ضرور روک دیگا لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ رسد اس درجہ بڑھا کر لوگ اس کی قیمت قطعاً زائل کردیں - بہر حال اس صورت میں کوئی طرز عمل معین نہیں کیا جاسکتا لیکن اتنا یقینی ہے کہ رسد کو اس حالت میں بھی کہیں رکنا ضرور پڑیگا رہا سوال قیمت کا سو اس صورت میں چونکہ قانون تقلیل حاصل پر قانون تکثیر حاصل کا غلبہ ہے اور مقابلہ کا جوش خروش قیمت کا تعین ان بڑے بڑے کارخانہ داروں کے ہاتھ میں ہوگا جو قانون تکثیر حاصل سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مقابلہ کے جوش و خروش میں اپنے مال کی طلب بڑھانے اور کاروبار کو ترقی دینے کی خاطر وہ کم سے کم قیمت پر مال فروخت کرینگے جس قدر قیمت گھٹائینگے ان کا مال زیادہ بکیگا اور جس قدر مال زیادہ بکے گا اسی قدر قیمت گھٹانے کی گنجائش نکلیگی اور ساتھ ہی ساتھ منافع بھی بڑھتا چلا جاویگا - چھوٹے چھوٹے کارخانہ دار جن کو قانون تکثیر حاصل کے فوائد اس درجہ میسر نہوں چند روز نہایت کم منافع پر بلکہ نقصان سے مال فروخت کرینگے اور بالآخر تاب مقابلہ نہ لاکر کاروبار بند کردینگے - چھوٹے کارخانہ دار کو بہ لا وہ تقویت کہاں میسر ہے جو چھوٹے کاشتکار کو حاصل ہے کہ قانون تقلیل حاصل کے طفیل سے وہ بڑے کاشتکاروں کا ہم پلہ ہے اور وہ اس کا کچھ نہیں کرسکتے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ قیمت طلب کا تو بہر صورت افادہ مختتم کے مساوی ہونا یقینی لیکن قیمت رسد کی حالتیں مختلف ہیں - جبکہ پیداوار قانون تقلیل حاصل کی پابند ہو تو قیمت مصارف مختتم کے مساوی ہوگی اگر قانون استقرار حاصل کا عمل ہو تو قیمت معین رہیگی - افادہ مختتم کی

کمی بیشی سے صرف مقدار رسد میں فرق پڑیگا اور اگر قانون تکثیر حاصل کا دور دورہ ہے تو قیمت نہ تو کم سے کم مصارف پیدائش کے مساوی ہوگی اور نہ زیادہ سے زیادہ کے بلکہ ایسے کارخانہ دار جو بڑی مقدار تیار کرتے ہوں اس کی قیمت اپنے ہاں کے مصارف کے مطابق قرار دینگے اور مقابلہ کے جوش میں حتی الامکان اسکو گھٹانے کی تدبیر نکالتے رہیں گے ایسے کارخانوں کو اصطلاحاً کارخانہ ہائے معیاری اور اُن کے مصارف کو مصارف معیاری کہیں گے لیکن وہ مصارف خود اس قدر تغیر پذیر ہونگے کہ اُن کے مطابق کوئی قیمت معمولی قرار پانا دشوار ہے۔ پھر ایسی قیمت جس حد تک بھی ایک درجہ پر قائم رہے اگر اس سے کسی کارخانہ کے مصارف کم ہیں تو چونکہ وہ بازار کی مانگ پوری نہیں کر سکتا۔ قیمت گھٹانے کے بجائے بڑے کارخانوں کی مقررہ قیمت پر خوشی خوشی اپنا مال فروخت کر ڈالیگا اور جس کارخانہ کے مصارف پیدائش قیمت سے زیادہ ہوں تو چونکہ بہت سا مال دوسرے کارخانہ دار اور بھی کم مصارف پر تیار کر سکتے ہیں۔ اس کا مال ناگزیر نہیں ورنہ وہ اپنے مصارف کے لحاظ سے زیادہ قیمت کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ قہر درویش برجان درویش مجبوراً اس کو بھی اپنا مال بڑے کارخانہ داروں کی مقرر کی ہوئی قیمت سے فروخت کرنا پڑیگا۔ چند روز بقا کی سعی لاحاصل کے بعد بالآخر کاروبار ختم کرنا پڑیگا اور میدان چند بڑے بڑے کارخانہ داروں کے ہاتھ میں آجائے گا۔ اب یا تو وہ دور اندیشی سے کام لیکر کاروبار کے متعلق آپس میں کچھ ان سمجھوتا کر لینگے کہ جس میں ان سب کا فائدہ ہو یا جوش مقابلہ میں ایک دوسرے کو زک پہنچاتے پہنچاتے قانون بقائے اصلح کے مطابق صرف ایک دو باقی رہ کر کل کاروبار کے مالک بن بیٹھیں گے نتیجہ دونوں صورتوں میں وہی ایک ہوگا یعنی مقابلہ ٹوٹ کر اجارہ قائم ہو جائیگا۔ اور لطف یہ ہے کہ مقابلہ جو اجارہ کی بیخکنی کا دم بھرتا ہے۔ خود ہی کامیاب ہو کر اجارہ قائم کر دیتا ہے۔ مقابلہ اور اجارہ سے ہم آیندہ جداگانہ بحث کرینگے۔ یہاں مجمل ذکر ضروری اور کافی معلوم ہوا

حصہ چہارم
باب اول

قصہ مختصر یہ کہ قیمت معمولی ایک طرف تو قیمت طلب کے مساوی ہوتی ہے اور قیمت طلب افادہ مختتم کے برابر دوسری طرف وہ قیمت رسد کے بھی ہم پلہ ہوتی ہے بحالت کمی بیشی مقابلہ کی بدولت رسد کے تغیر و تبدل سے یہ فرق خود زائل ہو جائے گا یہی قیمت رسد وہ مصارف پیدائش کے مطابق قرار پاتی ہے۔ ایسے مصارف سے مراد خواہ مصارف مختتم ہوں جیسا کہ قانون تقلیل حاصل کے ساتھ یا مصارف مستقر جیسا کہ قانون استقرار حاصل کے ساتھ یا مصارف معیاری جیسا کہ قانون تکثیر حاصل کے ساتھ قیمت معمولی کا قیمت رسد سے سہ گونہ تعلق واضح کرنے کے بعد اب یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بلحاظ وسعت وقت مصارف پیدائش کی مدیں اور شمار مصارف کی بنا بھی بدل جاتی ہے چنانچہ اسی نکتہ کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

مصارف پیدائش کی دو مدیں مانی جاتی ہیں **مصارف مقدم** اور **مصارف تضمیمی** اور ان دونوں کے مجموعہ کو **مصارف کلی** کہتے ہیں مصارف کی یہ تقسیم بھی اور بہت سے معاشی اصطلاحات کی تقسیم کی مانند غیر مکمل ہے۔ ان کی دو جداگانہ فہرستیں مرتب کرنی دشوار ہیں۔ رسم و رواج کے مطابق اکثر کاروبار میں انکا مفہوم جداگانہ ہے۔ ایک ہی مد کہیں قسم اول میں داخل ہے اور کہیں قسم دوم میں بہر حال باوجود تفصیلی اختلافات کے اس قدر تحقیق ہے کہ ایسے مصارف جو محض شئے زیر بحث کی خاطر برداشت کیے جاویں مثلاً پیداوار خام کی قیمت اور مزدوروں کی اجرت تیل کوئلہ اور مشین چلانے کے دیگر مصارف و نیز مصارف فرسودگی یہ سب مصارف مقدم میں داخل ہیں۔ کیونکہ اگر وہ چیز تیار نہ کی جاتی تو یہ مصارف بھی پیش نہ آتے لیکن ایسے مستقل مصارف جو محض اس چیز کے واسطے مخصوص نہوں اگرچہ اس چیز کی تیاری میں ان سے مدد ملے لیکن یہ چیز تیار نہونے کی حالت میں بھی غالباً وہ برداشت کیے جاتے مثلاً کارخانہ کے منیجر اور دیگر اعلیٰ ملازمین کی تنخواہ۔ جو عام مزدوروں کی طرح روز نہیں بدلے جاتے مشین وغیرہ کے اصل کا سود جو چیز تیار نہونے کی حالت میں

بھی دینا پڑتا مصارف تقسیمی شمار ہوتے ہیں۔ اس تفریق کی ضرورت یہ ہے کہ مصارف مقدم ملے
بغیر تو کوئی کارخانہ دار چیز تیار کر کے دے ہی نہیں سکتا لیکن بے بازاری کی حالت میں مصارف
تقسیمی کا کوئی حصہ چھوڑا جا سکتا ہے اگرچہ ایسا کرنے میں بھی آیندہ نرخ خراب ہو جانے کے اندیشہ
سے کارخانہ دار کو تامل ہوگا بہر حال یہ ممکن ہے اگرچہ غیر اغلب ہے کہ مصارف مقدم کے مساوی
قیمت پر کوئی کارخانہ مال تیار کر دے۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو گاہ گاہ۔ صرف تھوڑے زمانہ
تک ہو سکتا ہے۔ عرصہ دراز تک صرف مصارف مقدم کی مساوی قیمت پر مال فروخت
کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مصارف تقسیمی ناقابل برداشت ہو کر کارخانہ کو بٹھا دینگے۔ جب وہ
مصارف کاروبار سے نکلیں گے ہی نہیں تو کارخانہ دار اپنی گرہ سے کیوں ادا کریگا اور
کب تک بلکہ ہوتا یہ ہے کہ مصارف مقدم تو ہر صورت میں ملتے ہیں رہے مصارف تقسیمی
وہ اگر کہیں کم ملے تو کہیں زیادہ اور اس طرح پر بلحاظ چند ماہ یا سال قیمت کا ایسا اوسط پڑتا
ہے کہ مصارف کل ملجاتے ہیں گویا بلحاظ زمانہ مختصر تو قیمت صرف مصارف مقدم کے مساوی
ہو سکتی ہے لیکن بلحاظ زمانہ وسیع قیمت کا مصارف کل کے برابر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ کاروبار چلنا
محال ہے۔

مصارف کی مدات اوپر واضح ہو چکیں اب مصارف کی بنا لیجئے اس پر بھی وسعت وقت کا
قابل توجہ اثر پڑتا ہے۔

بازاری قیمت یعنی کسی چیز کی قیمت بلحاظ اس قدر تنگ وقت کے کہ اس کی رسد میں
کسی قسم کی کمی بیشی نہ کیجا سکے مصارف پیدائش سے کچھ تعلق نہیں وہ تو قیمت طلب کے سپرد ہے
خواہ قیمت رسد سے کم رہے یا زیادہ دودھ دہی پھل پھول ترکاری اور برف جیسی
سریع الزوال چیزوں میں بازاری قیمت کا خاص زور رہے۔

رہی قیمت معمولی یعنی قیمت بلحاظ اسقدر وسیع وقت کے کہ رسد میں حسب دلخواہ کمی

حصہ چہارم باب اول

بیشی کیجا سکے وہ مصارف پیدائش کا بھی اتباع کرتی ہے۔ قیمت طلب و قیمت رسد دونوں کا اپیر بار پڑتا ہے کبھی ایک کا پلڑا جھک جاتا ہے کبھی دوسرے کا۔ اس صورت میں وسعت وقت کے دو درجہ ہوسکتے ہیں! اول اتنا وقت کہ صرف موجودہ کارخانوں کے کام میں اضافہ یا تخفیف کرکے دوم اتنا عرصہ کہ نئے کارخانے جاری یا موجودہ کارخانے سراسر بند کرکے رسد میں اضافہ یا تخفیف کی جاوے۔ بنظر سہولت صرف اضافۂ رسد کی حالت میں قیمت کے مذکورہ بالا درجوں کا مصارف پیدائش پر اثر مثال سے واضح کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ تحقیق طور پر صرف چھ ماہ یا برس روز کے واسطے جوتوں کی مانگ بہت بڑھ جاوے تو اتنے عرصہ تک نہ تو موجودہ ذخیرہ پر اکتفا کیا جائے گا کہ تعین رسد سے بازاری قیمت نمودار ہو جاوے اور نہ اتنے دنوں کے واسطے نئے کارخانے جاری کیے جا سکتے ہیں۔ بلکہ ہوگا یہ کہ اوقات کار حتی الامکان بڑھ کر موجودہ کارخانوں ہی سے زیادہ مال تیار ہونے لگے گا۔ اور موجودہ ذرائع پیدائش سے زیادہ کام لیکر جو مصارف پڑیں قیمت بھی کم وبیش اس کے مطابق قرار پائے گی۔

لیکن اگر تحقیق طور پر دس بارہ سال کے واسطے جوتوں کی مستقل مانگ بڑھ جائے تو موجودہ کارخانوں سے زیادہ کام لینے پر اکتفا نکرکے نئے نئے کارخانہ جاری کیے جائیں گے اور اُن کے اجرا کے مصارف کے لحاظ سے قیمت قرار پائے گی۔

المختصر بازاری قیمت مصارف پیدائش سے بے سروکار ہوتی ہے اور قیمت معمولی مصارف پیدائش کے مطابق بحالت اضافہ رسد مصارف پیدائش یا تو موجودہ ذرائع پیدائش سے زیادہ کام لینے کے مصارف سے قرار پاتے ہیں یا اگر وقت اور بھی وسیع ہو تو جدید ذرائع پیدائش جاری کرنے کے مصارف سے قرار پائیں گے تخفیف رسد میں عملدرآمد اس کے برعکس ہوگا۔

واضح ہو کہ تعین قیمت کی ان تینوں صورتوں کے علاوہ ایک چوتھی صورت اور بھی ہے وہ

یہ کہ دنیا میں جو بیشمار اور گوناگوں تغیرات اور انقلابات ہوتے رہتے ہیں اُن کا بھی قیمت معمولی پر تبدیج لیکن یقینی طور پر اثر پڑتا رہتا ہی اور بڑھتے بڑھتے ہر ایک دو نسل بعد وہ نہایت واضح طور پر نظر آنے لگتا ہی۔

حاصل کلام یہ کہ وقت کے بلحاظ وسعت چار مدارج ہیں کم۔بیش۔بیشتر۔بیشترین۔اور ہر وقت کے عرصہ کی قیمت جداگانہ ہوگی۔وقت کا قیمت پر اثر ایک نہایت دقیق اور جدید مسئلہ ہی اس کی تحقیقات کا سہرا خاص طور سے مارشل جیسے عالم معیشت کے سر ہی ہم نے بھی حیرانی افزا تفصیل و طوالت ترک کرکے مختصر اور سلیس طور پر قیمت کا یہ پہلو واضح کرنے کی کوشش کی ہی۔

اوپر کی بحث سے اندازہ ہوسکے گا کہ مسئلہ قیمت میں کتنے پہلو توجہ طلب ہیں قانون تقلیل افادہ و قانون طلب کا مفہوم اور مفروضہ مارار کی ضرورت سمجھنا۔کمی بیشی رسد اجارہ و مقابلہ وقت کی تنگی و فراخی — سریع الزوالی و دیرپائی اشیاء اور ہر سہ قوانین پیدائش کا قیمت اور مصارف پیدائش کے تعلق پر اثر دریافت کرنا اور نیز بلحاظ وسعت وقت جو مصارف پیدائش کی مدوں اور اس کے شمار کی بابت میں دو بدل پیش نظر رکھنا قیمت کی عام حالت سمجھنے کے واسطے لابدی ہی ورنہ ہر جداگانہ قیمت تو اس قدر اثرات و اسباب کی آفریدہ ہوگی کہ ان سب کا انحصار محال ہی اکثر جتایا جاچکا ہی کہ جسقدر وسعت نظر سے کام لیا جائے گا مسائل معیشت میں صفت تعین گھٹے گی لیکن اُن کی صحت میں اضافہ ہوگا یعنی معلومات غیر معین معلوم ہونے کے ساتھ زیادہ قرین حقیقت بھی نظر آئے گی۔اس کے برعکس تنگ نظری سے مسائل میں تعین کا محض دہوکا ہونے لگتا ہی اور جلد ہی ایسی معلومات خلاف واقعات اور بعید از حقیقت ثابت ہوتی ہی۔ حاصل کلام یہ کہ قیمت گوناگوں شرائط کی پابندی کے ساتھ طلب و رسد کی کشاکشی سے قرار پاتی ہی ان دونوں کے باہمی اثرات ناقابل تفریق ہیں اور بلحاظ عمل کسی کا تقدم تاخر قرار دینا محال ہی۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جاسکتا ہی کہ بحالت قانون تقلیل حاصل اضافہ

حصہ چہارم باب اول

رسد پر اضافہ طلب مقدم ہی لیکن بحالت قانون تکثیر حاصل اضافۂ رسد کثائش طلب کا باعث بھی ہوسکتا ہی۔

مبادلہ کی اہمیت کے تحت میں ہمنے اشارہ کیا تھا کہ تقسیم دولت بھی مبادلہ کی ایک خاص صورت ہی اور پس چنانچہ دیگر سامان کی طرح محنت اور خدماتِ سرمایہ کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے اور اُن کی قیمت اصطلاحاً اجرت اور سود کھلاتی ہی ان کی بھی بازاری قیمت اور قیمت معمولی دونوں قسم کی ہوتی ہی۔ سحاب خریدار وہ بہر صورت افادہ مختتم کی تابع ہوتی ہی اور منجانب فروشندہ مصارف پیدائش کی پیرو۔ شرح اجرت۔ شرح سود و شرح منافع کی بحث اسی قول کی تفصیل ہی اور اسقدر معاشی معلومات کے بعد غور کرنے سے یوں بھی اس قول کی صحت سمجھہ میں آنی دشوار نہونی چاہیے۔

رہی زمین اس کی خرید فروخت کی حالت اس چیز کی سی ہی کہ جس کی قلت اتفاقی ہو اور جس کی رسد میں کوئی قابل لحاظ تخفیف یا اضافہ نہو سکے۔ اور لگان قدرت کا ایک عطیہ ہی کسی چیز کا معاوضہ یا قیمت نہیں۔

قیمت کے متعلق اب صرف ایک نکتہ بتانا باقی ہی جو دلچسپ بھی ہی اور ضروری بھی۔ وہ یہ کہ مختلف چیزونکی قیمتونکا ایک دوسری پر کیا اثر پڑتا ہی اور کیونکر۔ قیمتوں کے باہمی رشتے اکثر اس قدر وسیع دقیق اور پیچ در پیچ ہوتے ہیں کہ ان سب کا پتہ چلانا محال ہے لیکن چند اصول ذیل میں واضح کیے جاتے ہیں جن سے قیمتوں کے عام تعلقات سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہی۔

طلب مشترک و طلب مرکب

(۸) روٹی کھانے کیواسطے چاہیے گویا روٹی سے براہ راست بھوک کی احتیاج رفع ہوتی ہی۔ لباس پہننے کے واسطے درکار ہی اس سے بھی تحفظ بدن کی احتیاجیں براہ راست پوری ہوتی ہیں۔ مکان رہنے کے واسطے ضروری ہی وہ بھی قیام و آسائش کی احتیاج پوری کرتا ہی۔ کتاب

پڑہنے کے واسطے مطلوب ہوتی ہی ایسی تمام چیزوں کی طلب جن سے براہ راست کوئی احتیاج پوری ہو اصطلاحاً طلب بلاواسطہ کہلاتی ہی۔ لیکن گیہوں۔ آٹا پیسنے کی چکی۔ ایندہن اور روٹی پکانے کے برتن سو روٹی کی تیاری کے واسطے ناگزیر ہیں۔ روئی۔ ریشم اون۔ تاگا کاتنے اور کپڑا بننے کی مشین۔ سوئی قینچی۔ کپڑا سینے کی مشین جو لباس کی تیاری میں ناگزیر مدد دیتی ہی۔ اینٹ۔ چونہ۔ لکڑی۔ لوہا۔ راج۔ بڑہئی۔ لوہار۔ مزدور جو عمارت بنانے میں کام آئیں اور کاغذ۔ روشنائی۔ پریس جو کتاب تیار کرے۔ سب چیزیں خود تو براہ راست کوئی احتیاج رفع نہیں کرتیں لیکن ایسی چیزوں کی تیاری میں ناگزیر مدد دیتی ہیں جس سے براہ راست کوئی احتیاج پوری ہو سکے۔ لہذا یہ سب چیزیں بالواسطہ احتیاج رفع کرتی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کی طلب بھی اصطلاحاً طلب بالواسطہ کہلاتی ہی۔ بالفاظ مختصر جو چیزیں تیار ہو کر براہ راست کوئی احتیاج رفع کریں اُن کی طلب تو بلاواسطہ کہلاتی ہی اور ایسی چیز تیار کرنے میں جو جو پیداوار خام اور ذرائع پیدائش کام آئیں اُن میں سے ہر ایک کی طلب بالواسطہ شمار ہوگی۔ مثلاً چھاتہ کی طلب بلاواسطہ ہی لیکن کپڑا۔ لوہا۔ لکڑی۔ جس سے چھاتہ تیار ہو اُن کی طلب بالواسطہ کہلائے گی اسی طرح پر جوتہ کی طلب بلاواسطہ۔ اور چمڑے۔ ڈورہ۔ کیل۔ پالش اور جوتہ بنانے کے ضروری اوزار کی طلب بالواسطہ ہوتی ہی۔

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ جو جو پیداوار خام اور ذرائع پیدائش کسی چیز کی تیاری میں کام آئیں اُنکا سلسلہ اس قدر وسیع ہی کہ کہیں کہیں نامتناہی سا معلوم ہوتا ہی۔ لیکن عملی اور نیز علمی تحقیقات کے واسطے سلسلہ کے تہوڑے سے قریب ترین حصہ پر اکتفا کرنا ضروری بھی ہی اور مفید بھی۔ سلسلہ کا اتنی دور تک بڑہانا کہ حیرانی کن طوالت پیدا ہو جائے سراسر عبث ہی۔

حصہ چہارم
باب اوّل

جبکہ متعدد چیزیں مل جلکر ایک چیز تیار کریں یعنی جبکہ کسی چیز کی تیاری میں بہت سی چیزوں کی شرکت ہو تو ایسی کل چیزوں کی مجموعی طلب اصطلاحاً طلب مشترک کہلاتی ہے گویا سب چیزوں کی جداگانہ طلب بالواسطہ کو مجموعی طور پر طلب مشترک کہتے ہیں۔ یا یوں کہئے کہ طلب بالواسطہ طلب مشترک کے اجزا ہیں اور طلب بلاواسطہ اُن کا ست یا عطر۔

بالواسطہ طلب والی چیزوں کی قیمت تو عام اصول قیمت کے مطابق قرار پاتی ہے۔ اور یہی حال بلاواسطہ طلب والی چیزوں کا بھی ہے نیز ظاہر ہے کہ آخرالذکر چیز کی قیمت اول الذکر کی قیمتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اب یہ تحقیق کرنا مقصود ہے کہ اگر چند چیزیں مل جلکر ایک چیز تیار کرتی رہیں۔ تو ایسی حالت میں ان میں سے کسی چیز کی قیمت بڑھنا کن صورتوں میں ممکن ہے۔ اضافۂ قیمت کس حد تک قابل برداشت ہو سکتا ہے نیز یہ کہ اس حد سے تجاوز کرنے کا دوسری چیزوں کی قیمت پر کیا اثر پڑیگا۔

بہ شرائط ذیل کسی بالواسطہ طلب والی چیز کی قیمت میں بوجہ تخفیف رسد بہت کچھ اضافہ ممکن ہے۔

(۱) اوّل یہ کہ منجملہ تمام بالواسطہ طلب والی چیزوں کے وہ چیز بلاواسطہ طلب والی چیز کی تیاری کے واسطے سراسر یا تقریباً ناگزیر ہو اور اس کا کوئی بدل بہت زیادہ قیمت پر بھی دستیاب نہو سکے۔

(ب) دوم۔ جس چیز کی تیاری میں چیز معلومہ کام آئے اس کی طلب نیز تغیر پذیر ہونی چاہئے تاکہ قیمت بہت زیادہ بڑھنے پر بھی طلب میں تخفیف کم ہو۔ اس خصوصیت کی ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس چیز کا کوئی بدل بہت قیمت پر بھی میسر نہ آسکے

(ج) سوم چیز معلومہ کی قیمت بلاواسطہ طلب والی چیزوں کی قیمت کا ایک چھوٹا جزو ہو تاکہ اول الذکر قیمت کا بہت زیادہ اضافہ بھی آخرالذکر قیمت میں تھوڑا سا معلوم ہو۔ مثلاً اگر پہلی

قیمت دوسری کی صرف ۵ فیصدی ہو تو اس کے سہ گنا ہونے پر بھی دوسری قیمت میں اضافہ بعدر ۱۰ فیصدی نظر آئے گا جو کچھہ زیادہ نہیں ۔

(د) اگر چیز معلومہ کے علاوہ دوسری چیزیں جو بلا واسطہ طلب والی چیز کی تیاری میں کام آئیں وافر ہوں اور کسی دوسرے کام میں بہت کم آسکیں تاکہ تھوڑی سی تخفیف طلب سے ان کی قیمت بھی گھٹ جائے ۔ تو ایسی تخفیف قیمت میں سے چیز معلومہ کی قیمت میں اضافہ کی اور بھی گنجائش نکل آئے گی ۔

اگر حالات مذکورہ بالا شرائط کے برعکس ہوں یعنی چیز معلومہ ناگزیر نہ ہو یا معمولی قیمت پر اس کا بدل مل سکے یا جس چیز کی تیاری میں وہ کام آئے اُس کی طلب تغیر پذیر ہو یا اسکا معمولی قیمت پر بدل میسر آجائے یا چیز معلومہ کی قیمت تیار شدہ چیز کی قیمت کا بڑا حصہ ہو یا بالواسطہ طلب والی دوسری چیزیں اور کام آسکیں تو باوجود تخفیف رسد چیز معلومہ کی قیمت میں اضافہ نہ ہوسکے گا ۔ نیز واضح ہو کہ مذکورۂ بالا اضافۂ قیمت کچھہ عرصہ تک تو ضرور قائم رہیگا ۔ لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ گوناگوں معاشی تغیرات کے ہاتھوں کچھہ دنوں بعد اس کا کیا حشر ہو ۔

جن جن صورتوں میں اضافہ قیمت ممکن ہے اُن کو دریافت کرنے کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ کس حد تک یہ اضافہ دوسری چیزوں کے حق میں قابل برداشت ہوسکتا ہے تاکہ باوجود اپنے میں سے ایک کی قیمت میں اضافہ ہونے کے وہ مل جلکر چیزوں کی تیاری جاری رکھیں اور کس حالت میں یہ اضافہ اس قدر گراں بار ہو جائے گا کہ وہ چیزیں بلا واسطہ طلب والی چیز کی تیاری چھوڑ کر جدا ہونے پر مجبور ہوجاویں اور یا تو بیکار پڑی رہیں یا نہایت ادنی کاموں میں جالگیں ۔ قابل برداشت اضافۂ قیمت کی حد کے متعلق اصول یہ ہے کہ تیار شدہ چیز کی قیمت دوسری بالواسطہ طلب والی چیزوں کی مجموعی قیمت سے

حصّہ چہارم باب اوّل

جس قدر بڑھ سکے گی اُسی قدر چیز معلومہ کی قیمت میں اضافہ ممکن ہوگا۔ مثلاً تین چیزوں سے جن کی قیمت ۴ر ۸ر اور ۱۲ر آنہ ہو ایک چیز تیار کی جائے اور ایسی سو چیزیں ۸ر کے حساب سے فروخت ہوجاویں۔ اب فرض کرو کہ ۴ر قیمت والی چیز کی رسد میں اسقدر تخفیف ہوجاوے کہ صرف ۵ ۷ چیزیں تیار ہوسکیں اور اُنکا نرخ بڑھ کر ۶ ہوجاوے باقی دو چیزوں کی قیمت تو وہی ۸ر آنہ اور ۱۲ر قائم رہیگی بلکہ بوجہ تخفیف طلب کچھ گھٹ جاوے تو عجب نہیں پس تیار شدہ چیز کی قیمت کا اضافہ (۶ - ۸ر) ۸ر پہلی چیز کی قیمت ۴ر میں شریک ہو کر اس کو ۱۲ر تک بڑھا دیگا۔ وجہ یہ ہے کہ اسی چیز کی رسد کی تخفیف سے تیار شدہ چیز کی رسد میں بھی تخفیف پیدا ہوئی اور اُسی کی بدولت قیمت میں اضافہ ہوا۔ پس وہی چیز اس اضافہ کی مالک بھی بنے گی۔

جس صنعت و حرفت میں جرمن ساخت کے رنگ وغیرہ استعمال ہوتے ہیں اور ان میں مذکورۃ الصدر شرائط بھی کسی حد تک پوری ہوتی ہیں تو بوجہ تخفیف رسد رنگ وغیرہ تیار شدہ چیزوں کی قیمت اور چیز معلومہ کی قیمت کا اضافہ اوپر کے اصول کا پابند نظر آئے گا۔ غور کرنے سے ایسی متعدد موزوں مثالیں نظر آسکتی ہیں۔

اب اگر چیز معلومہ کی قیمت بوجہ از حد تخفیف رسد اس قدر بڑھ جائے کہ کسی تیار شدہ چیز کی قیمت کے اضافہ میں سے اس کا کل اضافہ نہ نکل سکے اور نہ دوسری چیزوں کی تخفیف قیمت سے اس کی تلافی ہو تو اُس چیز کی تیاری بند کرنی پڑے گی اور دوسری چیزیں محض بےبسی کی حالت میں جدا ہو جائیں گی۔ اور جب وہ کسی کام ہی نہ آویں گی تو پھر اُن کی قیمت کہاں سے آئے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی قیمت کا خون چیز معلومہ کی گردن پر ہے جس نے اپنی قیمت بڑھا کر ان سب کو جدا اور بیکار کر دیا اور خود اب بھی چند خاص خاص کاموں میں شریک رہ کر اس قدر اعلیٰ قیمت وصول کر رہی ہے۔

سنا ہے امریکہ میں ہوشیار باورچی کی بہت قلت ہے اور اس کی اجرت بھی نہایت اعلیٰ

ہوتی ہے۔ ماورچی کی تنخواہ زیادہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ اکثر قسم کے گوشت اور ترکاریاں نہایت ارزاں ملتی ہیں کیونکہ اُن کی طلب کم ہوتی ہے اس کے برعکس فرانس میں ہوشیار باورچی مناسب اُجرت پر بکثرت مل سکتے ہیں اور یہیں گوشت اور ترکاریوں کی فرانس میں قیمت بھی خاصی ملتی ہے کیونکہ یہاں پر اُن کی طلب ہے۔ طلب نہونے اور ہونے کا راز اور قیمت کی کمی بیشی کا باعث دراصل باورچی کی اجرت کی بیشی کمی میں مضمر ہے۔ تیار شدہ کھانے کی قیمت کے لحاظ سے امریکہ میں اس کی اجرت گراں بار ہے اور فرانس میں قابل برداشت ہندوستان میں بہت سی کارآمد چیزیں محض اس وجہ سے ناکارہ پڑی ہوئی ہیں کہ اُن سے چیزیں تیار کرنے والوں کی قلت ہے اور اُن کی اجرت اس قدر زیادہ ہے کہ تیار شدہ چیز کی قیمت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی اگر اجرت کم ہوتی تو چیزیں اب کوڑیوں کے مول بھی نہیں بکتیں۔ اُن سے لاکھوں روپیہ قیمتی سامان تیار ہوا کرتا۔ "دمڑی کی گڑیا ٹکا سر منڈائی" یہ مثل اسی واقعہ یعنی چیز معلومہ کی قیمت گراں بار ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

طلب بالواسطہ والی چیزوں کی قیمت میں جو کمی بیشی ہوتی رہتی ہے مذکورالصدر اصول کی روشنی میں اُن کو مطالعہ کرنے سے عجیب و غریب اور نہایت دلچسپ و نتیجہ خیز معلومات حاصل ہوسکتی ہے۔ جو عملی کاروبار میں بھی قابل قدر ثابت ہوگی۔

طلب مشترک سے ایسی کل چیزوں کی طلب بالواسطہ کا مجموعہ مراد ہے جو کسی طلب بلا واسطہ والی چیز کی تیاری میں کام آئیں لیکن جس طرح چند چیزوں سے ملکر ایک چیز تیار ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ایک چیز جداگانہ چیزوں کے بنانے میں کام آتی ہے یعنی چند جدا جدا بلا واسطہ طلب والی چیزوں کے بنانے میں ایک ہی بالواسطہ طلب والی چیز استعمال ہوتی ہے مثلاً چمڑا کئی کام آتا ہے اس سے جوتے ہینڈ بیگ سوٹ کیس بستر بند گھوڑوں کے ساز کاٹھی۔ سپاہیوں کی پیٹیاں اور کل چلانے کی مال اور رسے تیار ہوتے ہیں۔ چمڑے

حصہ چہارم
باب اوّل

کی ان کل طلبوں کے مجموعہ کو اصطلاحاً طلب مرکب کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان طلبوں میں سے اگر کسی میں معقول اضافہ ہو جائے تو باقی شعبوں کی رسد میں تخفیف ہونے سے حسب گنجائش کل شعبوں میں چمڑے کی قیمت بڑھ جائے گی۔ طلب مرکب کا یہ اصول اس قدر صریح اور سادہ ہے کہ مزید تشریح کا محتاج نہیں۔

واضح ہو کہ یہاں بھی عرصۂ وقت مختصر فرض کیا جاتا ہے۔ ورنہ زیادہ وسیع عرصہ میں چمڑے کی قیمت کیا قرار پائے کوئی نہیں بتا سکتا۔

رسد مشترک
و رسد مرکب

(۹) اکثر چند چیزیں ایک ساتھ ملکر پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً چمڑا گوشت اور ہڈی۔ غلہ اور بھوسا ایسی چیزوں کی رسد کے مجموعہ کو جو ایک ہی ساتھ ملکر پیدا ہوں اصطلاحاً رسد مشترک کہتے ہیں اس کی حالت بعینہٖ طلب مشترک کی سی ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ طلب مشترک والی متعدد چیزیں ملکر ایک چیز تیار کرتی ہیں اور رسد مشترک والی متعدد چیزیں ملکر ایک چیز سے پیدا ہوتی ہیں۔

گائے بھینس یا بکری سے گوشت چمڑا اور ہڈی ایک ساتھ ملکر حاصل ہوتے ہیں اب اگر چمڑے کی طلب میں اضافہ ہو اس کی قیمت بڑھے تو زیادہ ڈھور ذبح ہونے لگیں گے گوشت اور ہڈی کی رسد میں ساتھ ساتھ اضافہ ہونے سے اُن کی قیمت گھٹ جاوے گی ایسی صورت میں چمڑے کی قیمت کا اضافہ۔ گوشت اور ہڈی کی قیمت کی مجموعی تخفیف سے زیادہ یا کم از کم اس کے برابر ضروری ہے ورنہ چمڑے کی رسد میں کشائش محال ہے۔

جبکہ قانون غلہ کی رو سے ولایت میں غلہ کی درآمد بند تھی مصارف کاشت بیشتر غلہ سے اور کمتر بودے غلہ کے تنکوں کی قیمت سے حاصل ہوتے تھے لیکن جب قانون مذکور منسوخ ہو کر غلہ کی درآمد شروع ہوئی ولایت میں غلہ کی قیمت گھٹ گئی جس کی وجہ سے رقبہ کاشت بھی تنگ ہو گیا۔ ولایت میں غلہ کے ساتھ تنکوں کی رسد بھی گھٹ گئی اور

تنکے ٹوپیوں اور ٹوکریوں کے بنانے میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غلہ کی قیمت گھٹنے کے ساتھ ساتھ بوجہ تخفیف رسد تنکوں کی قیمت میں اضافہ ہوا جس نے قیمت غلہ کی تخفیف کی تلافی کردی۔ چنانچہ ولایت میں جو کسان غلہ بوتا ہے وہ مصارف کاشت کا ایک معقول حصہ تنکوں کی قیمت سے اور باقی غلہ سے وصول کرتا ہے۔

اس کے برعکس جن ملکوں سے غلہ ولایت جانا شروع ہوا وہاں بوجہ اضافہ رسد ایسے تنکوں کی قیمت گھٹ گئی۔ اور بوجہ اضافہ طلب غلہ کی قیمت میں جو اضافہ ہوا اُس نے تنکوں کی قیمت کی تخفیف پوری کردی۔ جب تک برآمد گوشت کا رواج نہوا آسٹریلیا میں گوشت کوڑیوں کے مول فروخت ہوتا رہا۔ اور بھیڑوں کی کل قیمت اُن کی اُون سے وصول ہوتی رہی جو بمقدار کثیر دیگر ممالک کو بھیجی جاتی تھی۔ جب سے انگلستان میں درآمد اُون شروع ہونے سے مقامی اون کی قیمت گھٹی بھیڑوں کا پالن بھی کم ہوگیا ساتھ ساتھ تازہ گوشت کی رسد میں بھی تخفیف نمودار ہونے سے اُس کی قیمت میں اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب گوشت کی خاطر ولایت میں بھیڑ کو بہت موٹا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے خواہ ایسا کرنے سے اُون کی مقدار اور خوبی میں کچھ کمی اور نقص کیوں نہ آجائے وجہ یہ ہے کہ اب بھیڑ کی قیمت حسب سابق اُون سے اسقدر وصول نہیں ہوتی جتنی کہ گوشت سے۔ ان مثالوں سے واضح ہوا کہ بالعموم رسد مشترک والی چیزوں میں سے کسی ایک یا بعض کی قیمت کی تبدیلی سے باقی کی قیمت میں برعکس تبدیلی نمودار ہوکر تبدیلیوں کے مجموعی اثر کو بہت معتدل بنا دیتی ہے اور قیمت کی ایسی معکوس تبدیلیاں لازم ملزوم سی ہوتی ہیں لہذا جس چیز کی تبدیلی قیمت کا اثر غالب ہوتا ہے رسد اُسی کی پیروی کرتی ہے رہیں دوسری چیزیں اضافہ رسد سے قیمت گھٹتی اور تخفیف سے بڑھ جاتی ہے

طلب مشترک اور رسد مشترک کی طرح طلب مرکب کی بھی ہم پلہ رسد مرکب ہوتی ہے ایک ہی چیز بنانے میں متعدد چیزیں جدا جدا کام آسکتی ہیں۔ مثلاً کاغذ ہے کہ چیتھڑوں

درخت کی چھالوں اور گھاسوں سے تیار ہوتا ہی۔ چمڑا کپڑا بلکہ چند روز سے کاغذ کا ٹھا بھی جوتوں میں لگایا جاتا ہی۔ رسد مرکب الی چیزیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں بطور بدل کام دیکر۔ ان میں ہر ایک کی قیمت کے اضافہ میں مانع ہوتی ہیں اور کسی ایک کی قیمت کی تخفیف دوسروں کی تخفیف کا باعث ہوسکتی ہی۔

گیہوں جو چنا جوار باجرہ اور مکا جیسے غلوں کی قیمت کا ایک دوسرے پر برابر اثر پڑتا ہی۔ ایک کی ارزانی سے باقی بھی کم وبیش ارزاں ہو جاتے ہیں اور کسی ایک یا بعض کے اضافہ قیمت کو باقیوں کی موجودگی کم وبیش روکتی رہتی ہی۔

اس کل باب کا لب لباب یہ ہی کہ اگر چیزوں کی قلت محض غیر اختیاری ہی اور ان کی رسد میں بیشی کمی نہیں ہوسکتی تو اُن کی قیمت قیمت طلب کی مطیع رہی گی ورنہ بصورت دیگر اُن کی قیمت قلیل عرصہ کے واسطے تو محض قیمت طلب کی پابند ہوسکتی ہی مگر زیادہ عرصہ کے اندر وہ مصارف پیدائش کی بھی پیرو ہو جائے گی رہیں وہ چیزیں جن کی رسد میں کمی بیشی بحالت اجارہ ہوتی ہی اُن کی قیمت کے اصول سے ہم اگلے باب میں بحث کرتے ہیں۔

باب دوم

مقابلہ و اجارہ

تجزیہ (۱) مقابلہ (۲) اجارہ (۳) ٹیکس یا امداد کا اجارہ پر اثر

کاروبار چلانے کے دو طریق ہیں مقابلہ یا اجارہ۔ کسی زمانہ میں اجارے کا بہت رواج تھا انقلاب فرانس کے بعد سے مقابلہ کا دور بندھا۔ آج کل حسب حالات ہر دو طریق مروج پائے جاتے ہیں دونوں میں خوبیاں بھی ہیں اور نقص بھی قطعی طور سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا دشوار ہے ان کے خواص کی ہم ذیل میں مختصر تشریح کرتے ہیں

مقابلہ

(۱) مقابلہ سے کسی کاروبار کی ایسی حالت مراد ہے کہ لوگ بلا روک ٹوک اور وقت اس میں شریک ہو کر اپنے ہم پیشوں پر سبقت لیجانے کی کوشش کرسکیں حریفوں کے مقابلہ میں اپنے کاروبار کو چمکانے کی سو سو ترکیبیں نکالی جاتی ہیں اور ترقی کی جدوجہد میں قانون بقائے اصلح کا دور دورہ رہتا ہے۔

مقابلہ کی سب سے بڑی مسلمہ خوبی تو یہ ہے کہ وہ ترقی کا زبردست محرک و معاون ہے۔ میدان کاروبار میں حریفوں پر سبقت لیجانے کی کوشش کا نتیجہ بیشتر معاشی ترقی ہوتا ہے۔ نت نئی ایجاد واختراع اور ارزانی اشیا یہ سب مقابلہ کا عام نتیجہ نظر آتا ہے دوسری خوبی یہ ہے کہ مقابلہ آزادی پر مبنی ہے اور آزادی ایک نہایت بیش قدر نعمت ہے۔ سوم مقابلہ اپنے پاؤں سے خود چلتا ہے اس کو کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں۔ حاصل کلام یہ کہ مقابلہ کاروبار کا قدرتی طریق ہے اس میں ترقی کا جوش اور موقع دونوں پائے جاتے ہیں اور وہ قانون وغیرہ کی عارضی اعانت سے بھی مستغنی ہے۔

جبکہ لوگ طریق اجارہ کی بے عنوانیوں سے تنگ آ گئے تھے اور مقابلہ کا نیا نیا رواج

ہوا تو وہ خوبی مجسم سمجھا جانے لگا۔ لیکن کوئی طریق کیونکر سراسر بے عیب ہو سکتا ہے۔ کچھ عرصہ کے تجربہ سے اس میں بھی نقص نمودار ہو گئے۔ حتیٰ کہ ایک گروہ اس کا اس قدر مخالف ہو گیا کہ اس کو آلۂ تباہی قرار دیا۔ چنانچہ اشتراک کا منشا انفرادی املاک اور کاروبار ختم کرنے سے مقابلہ کو کنا نہیں تو اور کیا ہے۔ سابق مداحوں کی مانند جدید معترض بھی مبالغہ سے کام ضرور لیتے ہیں۔ موافق مطالب پہلو تو دکھائے اور مخالف نظر انداز کر دیئے لیکن اصلیت ہمیشہ غیر جانبدارانہ تحقیق سے دریافت ہوتی ہے۔ خصوصاً معاشی مسائل کی بحث میں بعض مواقع پر بے روک ٹوک "ہرزش نیز بگو" کے اصول پر چلنے کی بیحد ضرورت اور گنجائش ہے۔ مقابلہ کے چند نقائص جو عملی تجربہ سے دریافت ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس میں شک نہیں کہ مقابلہ کے دباؤ سے قیمت اشیاء گھٹتے گھٹتے مصارف پیدائش کے برابر آ رہتی ہے۔ لیکن خود مقابلہ کی خاطر اکثر خاص مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں جو مصارف پیدائش میں شمار ہو کر اُن کی مقدار اور لہذا قیمت پیداوار بڑھا دیتے ہیں۔ خریداروں کو متوجہ کرنے کی خاطر بڑے بڑے حریف کارخانے لاکھوں بلکہ کروڑہا روپیہ صرف اشتہارات و کلینڈروں پر صرف کر دیتے ہیں مزید براں ملکوں ملکوں اُن کے ایجنٹ دورہ لگاتے پھرتے ہیں اور ذاتی طور پر ملکر خریداروں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لپٹن کی چاء۔ پیر کا صابون سٹیفن کی روشنائی۔ حکیم صاحب کی گولیاں اور ایسے ہی بہت سے اشتہارات ہیں جن سے ہر ریلوے سٹیشن کے در و دیوار آراستہ رہتے ہیں، جن کے دلکش کلینڈر ہر دکان پر آویزاں نظر آتے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہے کہ بعض چیزوں کی قیمت میں مصارف اشتہار بقدر ۹۰ فیصدی رقم پائے گئے اور چونکہ اشتہارات سے بکری بڑھتی ہے کارخانے اس میں دل کھول کر دولت لٹاتے ہیں۔

(ب) جیسا کہ منافع کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے خوردہ فروشوں کی دکانیں ایدا ز ضرورت

کا نتیجہ ہمیشہ اضافۂ قیمت ہوتا ہے۔ گویا اس حالت میں مقابلہ سے بجائے ارزانی کے گرانی بڑھتی ہے قصبات کے حلوائی۔ نان بائی۔ بیوپاری۔ پنساری۔ بزاز اور جوتہ فروش جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو خریداری گھٹنے کی وجہ سے اُن کو مجبوراً شرح منافع بڑھانی پڑتی ہے جس کا لازمی نتیجہ گرانی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ چند پیسے آنے یا زیادہ سے زیادہ دس پانچ روپیہ کا فی خریدار کاروبار ہوتا ہے لوگوں کو گرانی کمتر محسوس ہوتی ہے۔

اسی اصول کے لحاظ سے کسی زمانہ میں آبادی کے مطابق حلوائیوں اور نان بائیوں کی دوکانات کی تعداد قانوناً مقرر کردیجاتی تھی۔ آج سے تیس برس قبل فرانس کے دارالسلطنت شہر پیرس میں ایسی دکانوں کا اوسط فی ۱۸۰۰ باشندہ ایک تھا لیکن آج کل فی ۸۰۰ باشندہ ایک ہے حساب سے تخمینہ لگایا گیا ہے کہ محض دکانات کی کثرت کی بدولت کھانا ۴۰ فیصدی زیادہ گران فروخت ہوتا ہے پروفیسر لیرا ؤبیو لو نے اپنی کتاب پولٹیکل اکانمی میں اس واقعہ سے مفصل بحث کی ہے۔

(ج) تخفیف قیمت کی کوشش کا کبھی کبھی چیز کی خوبی پر نہایت ناپسندیدہ اثر پڑتا ہے بہت سستا مال تیار کیا جاتا ہے جو دیکھنے میں تو عمدہ ہے لیکن برتنے میں ناقص ثابت ہوتا ہے چنانچہ مقابلہ کی جنگ میں آمیزش یا ملاوٹ نہایت کارگر آلہ ثابت ہوا ہے۔ گھی کے بجائے تیل اور چربی تنباکو کی بجائے نہایت مضرت رساں گھاس اور پتے۔ چرم کی بجائے گتہ کپڑے بلکہ کاغذ میٹھے ریشم اور اُون کی بجائے درختوں کے ریشے حتیٰ کہ مصنوعی مکھن اور انڈے تک فروخت ہورہے ہیں۔ اگر اصول بدل کی پیروی میں کوئی نئی چیز بنظر ترقی رائج کی جائے تو مضائقہ نہیں لیکن جبکہ محض سستی قیمت سے خریداروں کو للچانے کی نیت سے چیزوں کی خوبی برباد کیجائے تو اول تو خود خریداروں کو وہ ناگوار گزرتی ہے دوم اگر نہ بھی گزرے تو اکثر مضر ہونے کی وجہ سے وہ ہر طرح پر قابل اعتراض ہوتی ہے اور ضرورتاً سرکار کو بذریعہ قانون تعزیری اس کی تبدیش کرنی پڑتی ہے گویا خریدار بھی ہر حالت میں اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتا

کبھی سستی چیز بخوشی خرید کر بھی وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا لیتا ہے اور ایسی صورت میں اس کو سرکاری نگرانی اور اعانت کی ضرورت ہوتی ہے سستی گھڑیوں، سستے جیتموں، سستے سگرٹ میں جنکو لوگ شوق سے خریدتے ہیں ہر سال کروڑہا روپیہ ضائع ہوتا ہے اور مقابلۃً خریداروں کو بہت کم فایدہ پہنچتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ چیزوں کی خوبی برباد کرکے اُن کو ارزاں بنانا اکثر خریدار کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے۔ اور مقابلہ کے جوش میں مذکورہ بالا طرز عمل بہت اختیار کیا جاتا ہے۔

(د) مقابلہ کے جوش میں کبھی ضرورت سے زیادہ مال تیار کرلیا جاتا ہے اور قانون طلب و رسد کے مطابق قیمت پیداوار بہت گھٹ جاتی ہے اور کل حریفوں کو نقصان اُٹھانا پڑتا ہے خوشحال کارخانے تو اس کے متحمل ہو جاتے ہیں مگر کمزور دم توڑ دیتے ہیں اس طرح پر بہت سا اصل ضائع ہوتا رہتا ہے۔

(ر) مقابلہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے کاروبار کو ہر ممکن لحاظ سے ترقی دینے کی کوشش کرے تاکہ حریفوں کے مقابل بہتر مال عمدہ اور ارزاں فروخت کرسکے ایسا مقابلہ ہمیشہ معاشی ترقی کا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے۔ اور ملک کے حق میں نہایت مفید ہے۔ دوسرا مقابلہ جسکا بدقسمتی سے رواج بڑھ رہا ہے اصطلاحاً مقابلہ گلو تراش کہلاتا ہے اس کی خاصیت اس کے نام سے ظاہر ہے۔ ایسے مقابلہ کا منشا ہر ممکن طریق سے حریف کو زک دینا اور تباہ کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ خود بھی نقصان برداشت کرلیا جاتا ہے تاکہ جب حریف سے میدان خالی ہو جائے تو موجودہ نقصان کی تلافی بھی ہوسکے اور حسب دلخواہ منافع حاصل ہو۔

اس مقابلہ کا طریق یہ ہے کہ نئے حریف کو پریشان و برباد کرنے کی خاطر مصارف پیدائش سے بھی کمتر قیمت پر مال فروخت کرتے ہیں۔ بڑے قدیم کارخانوں کو ایسا کرنے میں مقابل نئے کارخانوں کے دو وجہ سے کم مضرت پہنچتی ہے انکا مال دور دراز بازاروں تک فروخت

حصہ چہارم
باب دوم

فروخت ہوتا ہے اور جس بازار میں حریف مقابل ہوتا ہے صرف وہی نرخ گھٹا دیتے ہیں یا اُن کے کارخانوں میں علاوہ سامان زیر مقابلہ کے اور مال بھی تیار ہوتا ہے اور وہ باقی مال کی سابق قیمت برقرار رکھتے ہیں بلکہ بشرط امکان بڑھا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقابلہ کا دباو بہ نسبت نئے حریف پر بہت زیادہ پڑتا ہے اور قدیم پرکم طرح طرح کے دباؤ ڈالکر خردہ فروشوں کو بھی حریف کا مال خریدنے سے روکا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بہ دیگر ریلوے کمپنیوں کے ملازموں سے سازباز کرلی جاتی ہے کہ اُن کا مال بمقابل دوسروں کے جلد روانہ کیا جائے اور تجارت میں وقت ہی تو بہت بڑی چیز ہے چند گھنٹوں کی عجلت اور تاخیر سے کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ مقابلہ گلوتراش اخلاقی سیاسی اور معاشی غرضکہ ہر لحاظ سے مذموم ہے اور سوائے مضرت کے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

(س) مقابلہ جس کا منشا اجارہ کی بیخکنی ہے کامیاب ہونے پر خود اجارہ کی بنا رکھتا ہے جب کمزور حریف پس پا ہو جاتے ہیں تو کل میدان چند طاقتور کارخانوں کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے اور وہ ملکر ایک زبردست جتھا قائم کرتے ہیں اور باہمی صلاح و مشورہ سے کاروبار چلاتے ہیں۔ جبکہ اُنکا اقتدار از حد بڑھ جانے سے اندیشے پیدا ہوتے ہیں تو سرکار کو دست اندازی کرنی پڑتی ہے یا تو اُن کو خاص قانون کا پابند بنایا جاتا ہے یا سرے سے کل ایسے کاروبار کو سرکار اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ گویا کاروباری ارتقا کے تین درجے ہوتے ہیں اوّل کاروبار والوں کا مقابلہ۔ دوم ان میں سے چند کا غلبہ اور تسلط۔ سوم سرکاری نگرانی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر طریق شراکت پر عمل کیا جائے تو سرکاری اشتراک کی بھی ضرورت کم پڑے شراکت کا کچھ ذکر اجرت کے تحت میں آچکا ہے۔ اس سے مفصل طور پر آئندہ صرف دولت کے تحت میں بحث کرینگے۔

مقابلہ کا حسن و قبح تو مختصراً بیان ہوچکا۔ اب ہم ذیل میں اجارہ کے خواص پر نظر

حصہ چہارم ڈالنا چاہتے ہیں۔

باب سوم

اجارہ

(۲) کسی کاروبار کی یہ حالت کہ وہ صرف ایک یا چند کارخانوں کے قبضہ میں ہو اور نئے لوگ اس کاروبار کو جاری کرنے سے کسی وجہ سے معذور ہوں اجارہ کہلاتی ہے اجارہ کی اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ مقدار پیداوار معین کر کے قانون طلب و رسد کے مطابق حسب دلخواہ قیمت وصول کی جائے اجارہ کئی طرح پر حاصل ہو سکتا ہے اول قانون کے ذریعہ سے جبکہ کوئی کاروبار چند مخصوص کارخانوں کے علاوہ سب کے واسطے قانوناً ممنوع ہو۔ ایسے قانونی اجاروں کی ایک زمانہ میں بہت کثرت تھی اور شاہی عنایت و بخشش اکثر یہ شکل اختیار کرتی تھی۔ حق تصنیف و حق ایجاد قانونی اجارہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دوسرے بذریعہ معاشی اقتدار کے جبکہ کوئی کارخانہ اپنی عمدہ تنظیم یا اتفاقی سہولتوں کی بدولت سب سے عمدہ اور ارزاں مال تیار کر کے حریفوں سے بازی لیجائے مثلاً کسی کارخانہ کے قرب و جوار میں عمدہ سے عمدہ پیداوار خام بکثرت ارزاں مل سکے یا کوئی کارخانہ ذرائع آمد و رفت کے قریب واقع ہو اور دیگر حریف کارخانوں کو ایسا عمدہ موقع میسر نہ آسکے یہ سب جائز اجارے کہلاتے ہیں۔ تیسرے ناجائز اجارہ جو اکثر گلو تراش مقابلہ سے حاصل کیا جاتا ہے اور جو معاشی ترقی کے منافی ہے۔

اجارہ میں پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد سے مستفید ہونا بدرجہ اولی ممکن ہے چنانچہ اگر اجارہ میں عالی ہمتی اور بیدار مغزی سے کام لیا جاوے تو بہ نسبت مقابلہ کے مال زیادہ عمدہ اور ارزاں تیار ہو سکتا ہے چونکہ بحالت اجارہ مقدار پیداوار کا تعین ممکن بلکہ اغلب ہے۔ پیداوار کا سچ بہ نسبت مقابلہ کے اجارہ میں بہت زیادہ کارخانوں کے اختیار میں ہوتا ہے۔ گویا مقدار پیداوار گھٹا کر وہ قیمت میں اضافہ کر سکتے ہیں ان دونوں خواص کو مدنظر رکھتے ہوئے اب دیکھنا یہ ہے کہ اجارہ کس حالتوں میں مفید اور کن میں مضر ہونا چاہیئے اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ مصنوعات بالعموم قانون تکثیر حاصل کے تابع ہوتی ہیں۔ گویا پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد ان میں

بہت زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ چونکہ وہ مستر داخل تعیشات ہیں اُن کی طلب بہت کچھ تغیر پذیر ہوتی ہے یعنی قیمت کے تھوڑے اضافہ یا تخفیف سے اُن کی طلب بہت کچھ گھٹ بڑھ جاتی ہے نتیجہ یہ کہ ایسی مصنوعات اجارہ کے واسطے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں اوّل تو قانون تکثیر حاصل کی بدولت مقدار پیداوار بڑھنے سے مصارف پیدائش خود گھٹ جاتے ہیں دوم تغیر پذیری طلب اضافہ قیمت کے بجائے تخفیف کی ترغیب دیتی ہے اس کا باعث وہی اصول ہے "منافع کم اور بکری زیادہ" جو آج کل کے کاروباری ترقی کا بہت بڑا گر ہے اور جس کی منافع کے تحت میں تشریح کی جا چکی ہے۔ گویا اس صورت میں شرح منافع تو ادنیٰ لیکن مقدار منافع بہت اعلیٰ رہتی ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کارخانہ دار کو مقدار سے غرض ہوتی ہے نہ کہ شرح سے چنانچہ حوصلہ مند اجارہ دار نئے نئے سامان اور ان میں نئی نئی خوبیاں پیدا کر کے خریداروں کا دل لبھاتے ہیں اور اپنی چیزوں کے رواج اور استعمال بڑھانے کی خاطر ان کو برائے نام قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور جب اُن کی طلب وسیع اور مستقل ہو جاتی ہے تو ایسے ادنیٰ نرخ سے بڑا بڑا منافع پاتے ہیں اور چونکہ کسی حریف کے حصہ بٹنے کا خوف نہیں ہوتا یہ سب کچھ کرنے میں انہیں بہت سہولت اور اطمینان ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ تعیشات جو بالعموم قانون تکثیر حاصل کے پابند ہوتے اور جن کی طلب تغیر پذیر ہوتی ہے اجارہ کے واسطے بہت موزوں ہیں۔

زراعت میں پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد کی گنجائش بہت کم پائی جاتی ہے اس میں قانون تکثیر حاصل کا عمل ضعیف ہوتا ہے اور اجارہ دار کو مقدار پیداوار بڑھانے سے مصارف پیدائش میں کوئی قابل لحاظ تخفیف نہیں ہوتی۔ اس پر طرہ یہ کہ زرعی پیداوار سے اکثر ناگزیر ضروریات متعلق ہیں جن کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہے یعنی جن کی قیمت بڑھنے گھٹنے سے بھی طلب میں کوئی خاص کمی بیشی نہیں ہوتی۔ پس زرعی پیداوار اور نیز ایسی مصنوعات کہ

حصہ چہارم
باب دوم

جو قانون تکثیر حاصل کی بہت کم تابع ہوں اور جو ناگزیر ضروریات میں داخل ہوں اجارہ کے واسطے از حد ناموزوں ہیں اُن کے اجارہ میں مقدار پیداوار گھٹنے اور قیمت بڑھنے کا سخت اندیشہ لاحق ہے یہی وجہ ہے کہ غلہ اور روئی وغیرہ کے اجارہ کی جب کبھی تجویز سننے میں آتی ہے تو دنیا کے ہر گوشہ سے مخالفت کی آواز بلند ہو جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ تعیشات کے اجارہ میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اکثر فائدہ رہتا ہے مگر ناگزیر ضروریات کا اجارہ سراسر خلاف مصلحت و دوراندیشی ہے اس فرق کا باعث قانون تکثیر حاصل کے عمل و تعطل اور طلب کی تغیر پذیری غیر تغیر پذیری میں مضمر ہے

پیداوار کی مختلف مقداروں کی قیمت رسد و قیمت طلب بھی مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً اگر پیداوار قانون تقلیل حاصل کے تابع ہے تو تھوڑی مقدار کی قیمت رسد ادنیٰ اور بڑی مقدار کی اعلیٰ ہو گی لیکن اگر وہ قانون تکثیر حاصل کی پابند ہو تو معاملہ برعکس ہو گا یعنی کمتر مقدار کی قیمت رسد اعلیٰ اور بیشتر کی ادنیٰ ہو گی۔ رہی قیمت طلب سو اس کا وہی ایک عام اصول ہے کہ مقدار رسد گھٹنے بڑھنے سے قیمت طلب بڑھتی گھٹتی ہے۔ مقابلہ کی حالت میں تو پیداوار کی مقدار متعین کرنا محال ہے۔ ہر کوئی اپنے کاروبار کی ترقی چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ مقدار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے کبھی پیداوار کی اس قدر کثرت ہو جاتی ہے کہ قیمت طلب قیمت رسد سے بھی گھٹ جاتی ہے اور اکثر حریفوں کو خسارہ اٹھانا پڑتا ہے لیکن اجارہ کی سب سے بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ اس میں مقدار پیداوار کا تعین ممکن ہے۔ اور قیمت طلب کا قیمت رسد سے اعلیٰ برقرار رکھنا سہل ہے قیمت رسد میں مصارف پیدائش کی کل مدیں یعنی قیمت پیداوار خام۔ اجرت۔ سود۔ مطالبات فرسودگی و خطر و ضمانت وغیرہ شامل ہوتی ہیں قیمت طلب کی بیشی سے جو صرف بحالت اجارہ ممکن ہے جو کچھ ماحصل زاید ہاتھ لگے وہ اصطلاحاً ماحصل اجارہ کہلاتا ہے بالفاظ دیگر مقابلہ میں تو قیمت طلب

بالعموم قیمت رسد کے برابر رہتی ہی۔ چنانچہ قیمت کے بحث میں اس واقع کی تشریح بھی ہو چکی ہی لیکن اجارہ میں قیمت طلب کا قیمت رسد سے بڑھا چڑھا رہنا ممکن ہی اور ان دونوں کا فرق ماحصل اجارہ سمجھا جاتا ہی۔ مثلاً کسی چیز کی قیمت رسد ۱۵ آنہ ہی اس قیمت میں کل مصارف پیدائش شامل ہیں مقابلہ کے دباؤ سے تو اس کا نرخ ۱۵ آنہ کے قریب قریب ہی گا لیکن بحالت اجارہ اس کا نرخ عہ یا اس سے بھی زیادہ رہنا ممکن ہی۔ قیمت رسد ۱۵ آنہ اور قیمت طلب عہ کا فرق ار جو محض اجارہ کا طفیل سمجھنا چاہئے ماحصل اجارہ ہوا۔ ہر اجارہ دار کی یہی کوشش ہوتی ہی کہ اس کو بیشترین ماحصل اجارہ ملے مختلف مقدار پیدا اور قیمت طلب میں سے قیمت رسد منہا کرنے پر یہ دریافت ہو سکتا ہی کہ کون مقدار پیدا کرلے پر ماحصل اجارہ کی بیشترین مقدار ہاتھ لگے گی۔ ذیل میں ہم بائسکل کے اجارہ دار کارخانہ کی مثال پیش کرتے ہیں بائسکل بوجہ مصنوعات ہونے کے قانون تکثیر حاصل کے ضرور تابع ہو گی اور صرف ایسی ہی چیزیں اجارہ کے واسطے بھی موزوں ہوتی ہیں۔

تعداد بائسکل	قیمت رسد	قیمت طلب	ماحصل اجارہ
۱۰۰	۱۷۰	۲۰۰	۳۰۰۰
۸۰۰	۱۷۱	۱۷۵	۳۲۰۰
۲۰۰۰	۱۶۳	۱۶۵	۴۰۰۰
۳۵۰۰	۱۴۹	۱۵۰	۳۵۰۰

اوپر کی مثال سے واضح ہو گا کہ ۲۰۰۰ بائسکل بنانے میں کارخانہ دار کو سب سے زیادہ ماحصل اجارہ یعنی ۴۰۰۰ روپیہ حاصل ہوتا ہی۔ پس وہ یہی تعداد برقرار رکھیگا نہ اسکو گھٹائے گا نہ بڑھائے گا اور اگر تبدیلی حالات کی بدولت کسی دوسری تعداد سے اور بھی زیادہ ماحصل اجارہ حاصل ہوا تو اسی کو اختیار کرلے گا۔ غرضکہ تجربہ کی مدد سے وہ ایسی تعداد تلاش کرلے گا جو اس کے حق میں

سب سے زیادہ مفید ہو یعنی جس سے بیشتریں مقدار ماحصل اجارہ ہاتھ لگے۔ اوپر کی مثال پر یہ اعتراض بیجا نہو گا کہ اس میں حسب مطلب اعداد لیئے گئے ہیں۔ چاہے کوئی اعداد لیئے جاویں ایک تعداد ضرور ایسی نکلے گی جس سے ماحصل اجارہ کی سب سے بڑی مقدار حاصل ہو۔

سرکار کبھی اس خیال سے کہ اجارہ دار کو بہت کچھ منافع ہوتا ہی اس پر ٹیکس قائم کرتی ہی اور کہیں کسی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی غرض سے اجارہ دار کو اپنی طرف سے مالی امداد دیتی ہی تاکہ اس کی ہمت افزائی ہو اور کاروبار عروج پکڑے جن خوش قسمت ملکوں کو خوداختیاری حکومت حاصل ہی وہاں ایسی امداد کا رواج زیادہ پایا جاتا ہی خصوصاً امریکہ اور جاپان نے اس طریق سے اپنے ہاں کی صنعت وحرفت کو بیحد ترقی دی ہی ایسی امداد کا اگر سرکار پر کچھہ وزن بار بھی پڑتا ہی تو مابعد معاشی ترقی اور عام خوشحالی سے اس کی ہزار گنی تلافی ہو جاتی ہی۔ اس امداد کی مثال بعینہ ایسی ہی کہ کسی نازک اور کمزور پودے کو لکڑی کا سہارا دیا جائے حتیٰ کہ اس کی جڑ مضبوط اور تنہ موٹا ہو جائے اور وہ پھلنے پھولنے لگے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ٹیکس یا سرکاری امداد کا اجارہ کی پیداوار اور اس کی قیمت پر کیا اثر پڑتا ہی۔ واضح ہو کہ تعین ٹیکس یا امداد کے حسب ذیل تین اصول ہو سکتے ہیں

(ا) مقدار ٹیکس یا امداد معین ہو مثلاً دس ہزار روپیہ۔

(ب) ٹیکس یا امداد بحساب ماحصل اجارہ کچھہ فیصدی مقرر ہو مثلاً ۱۰ فیصدی ماحصل اجارہ

(ج) ٹیکس یا امداد بحساب مقدار پیداوار مقرر ہو مثلاً ایک روپیہ فی بائیسکل۔

ان تینوں اصول کے مطابق ٹیکس یا امداد مقرر کرنے سے مذکور الصدر مثال میں حسب ذیل فرق نمودار ہو گا۔

تعداد بائیسکل	۱۰۰	۸۰۰۰۰	۲۰۰۰۰	۳۵۰۰۰
ماحصل اجارہ قبل ٹیکس یا امداد	۳۰۰	۳۲۰۰	۴۰۰۰۰	۳۵۰۰۰

ماحصل اجارہ بعد ٹکس بقدر ۱۰ ہزار	۲۰	۲۲۰	۳۰	۲۵۰۰۰
؍؍ ؍؍ بعد امداد ؍؍ ؍؍	۴۰۰۰	۴۲۰۰	۵۰۰۰	۴۵۰۰
؍؍ ؍؍ بعد ٹکس بشرح ۱۰ فیصدی ماحصل	۲۷۰۰	۲۸۸	۳۶۰	۳۱۵۰
؍؍ ؍؍ بعد امداد بشرح ؍؍ ؍؍ ؍؍	۳۳۰	۳۵۲۰	۴۴۰۰۰	۳۸۵۰
؍؍ ؍؍ بعد ٹکس بشرح ۱ عہ فی بائیسکل	۲۹	۲۴	۲۰۰۰	×
؍؍ ؍؍ بعد امداد ؍؍ ؍؍ ؍؍	۳۱۰۰۰	۴۰۰	۶۰	۷۰۰۰۰

اس دوسری مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اگر پہلے وصول کے مطابق ٹکس یا امداد مقرر کی جاوے تو پیداوار کی مقدار اور قیمت میں کوئی ردوبدل نہوگا جس مقدار سے اجارہ دار کو قبل ٹکس یا امداد سب سے زیادہ ماحصل اجارہ ملتا تھا۔ اسی سے اب بھی بعد ٹکس یا امداد ملے گا یعنی جبکہ ٹکس یا امداد کی مقدار دس ہزار معین ہو تو بیس ہزار بائیسکل کا ماحصل اجارہ چالیس ہزار علی الترتیب گھٹ بڑھ کر تیس ہزار و پچاس ہزار ہو جاوے گا۔ اور جیسا کہ قبل ٹکس یا امداد یہ ماحصل باقی تعدادوں کے ماحصل سے زیادہ تھا۔ ایسا ہی بعد تبدیلی مذکورہ بالا اب بھی مقابلۃً سب سے زیادہ ہے۔ اسی طرح پر اگر ٹکس یا امداد بحساب ماحصل اجارہ ۱۰ فیصدی مقرر ہو تو بیس ہزار بائیسکل کا چالیس ہزار ماحصل اجارہ علی الترتیب گھٹ بڑھ کر ۳۶ ہزار اور ۴۴ ہزار ہو جائے گا لیکن دونوں تبدیلیوں کے بعد بھی وہ دوسرے ماحصلوں سے اس طرح پر بڑھا رہیگا جیسا کہ قبل ٹکس یا امداد بحالت چالیس ہزار تھا۔ چنانچہ دوسری تعدادوں کی تبدیلی شدہ ماحصلوں سے مقابلہ کرنے پر یہ بخوبی واضح ہو جائے گا۔

اب ہا تیسرا اصول یعنی جبکہ ٹکس یا امداد بحساب مقدار پیداوار مقرر ہو اس کا عمل ذرا پیچیدہ ہے اوپر کی مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اس اصول کے مطابق ٹکس قائم کرنے کا نتیجہ مقدار پیداوار میں تخفیف اور قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱ عہ فی بائیسکل ٹکس قائم ہونے پر بجائے

بیس ہزار کے ایک ہزار بائیسکل کا ماحصل اجارہ سب سے بڑھ گیا۔ اس کے برعکس اس اصول کے مطابق امداد دینے سے مقدار پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور قیمت میں تخفیف اوپر کی مثال میں عہ فی بائیسکل امداد دینے سے بیس ہزار کے بجائے ۳۰ ہزار بائیسکل کا ماحصل اجارہ سب سے بڑھ گیا اس اصول سے جو ماحصلوں میں فرق نمودار ہوا ہے انکا مقابلہ کرنے پر آخر الذکر دونوں مقولوں کی صحت بھی بخوبی واضح ہو جائے گی۔

اجارہ پر ٹیکس یا امداد مقرر کرنے کا مقدار پیداوار اور قیمت پر جو اثر پڑتا ہے وہ اوپر کی دو مثالوں سے بالتفصیل واضح کیا جا چکا ہے۔ اس طویل بحث کا لب لباب بغرض یاد دہانی ہم ذیل میں پھر پیش کرتے ہیں۔

آجر کو ہمیشہ ماحصل اجارہ کی بیشترین مقدار مطلوب ہوتی ہے۔ ایسا ماحصل قیمت طلب کی قیمت رسد پر بیشی سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسی بیشی صرف بحالت اجارہ برقرار رہ سکتی ہے ورنہ مقابلہ میں دونوں قیمتیں مساوی ہو جاتی ہیں ٹیکس یا امداد تین اصول پر قرار دیجا سکتی ہے۔

اول مقدار معین مثلاً دس ہزار ٹیکس یا امداد

دوم۔ ماحصل اجارہ کے حساب سے کچھ فیصدی مثلاً ماحصل کا دس فیصدی ٹیکس یا امداد

سوم مقدار پیداوار کے حساب سے کوئی شرح مثلاً عہ فی شے ٹیکس یا امداد۔

جبکہ ٹیکس یا امداد پہلے یا دوسرے اصول کے مطابق مقرر کیجاوے تو جس مقدار پیداوار سے قبل ٹیکس یا امداد۔ بیشترین ماحصل اجارہ ملتا تھا۔ اسی سے اب بھی ملے گا۔ کاروبار اپنی سابق حالت پر قائم رہیگا نہ مقدار پیداوار میں کوئی تبدیلی ہوگی نہ قیمت میں لیکن تیسرے اصول کے عمل کی حالت پہلے دوسے بالکل مختلف ہے اگر اس اصول کے مطابق ٹیکس قائم کیا جائے گا تو بیشترین ماحصل اجارہ حاصل کرنے کے لیے اجارہ دار کو غالباً مقدار پیداوار گھٹا کر قیمت بڑھانی پڑے گی اسکے برعکس اگر امداد دیجائے تو اجارہ دار کو مقدار پیداوار بڑھانے اور قیمت گھٹانے سے بیشترین

ماحصل اجارہ ہاتھ آئے گا۔ المختصر اگر ٹیکس یا امداد کی مقدار معین ہو یا اُس کی شرح بحساب ماحصل اجارہ قرار پائے تو کاروبار میں کوئی تغیر نہ ہوگا لیکن اگر ٹیکس بحساب مقدار پیداوار مقرر ہو تو غالباً پیداوار گھٹکر قیمت بڑھ جائے گی اور اگر امداد بحساب مقدار پیداوار قرار پائے تو پیداوار بڑھ کر قیمت گھٹ جائے گی۔

اب صرف ایک نکتہ کو صحیح کرنا باقی ہے وہ یہ کہ پہلے اور دوسرے اصول کا عملدرآمد تو عام ہے ان کے مطابق ٹیکس یا امداد مقرر کرنے کا نتیجہ ہر حالت میں وہی نکلے گا جو اوپر بیان کیا گیا لیکن تیسرے اصول کا عمل دو شرائط کا پابند ہے اور بعض حالتوں میں اُس کے مطابق ٹیکس یا امداد مقرر کرنے کا نتیجہ وہ نہیں نکل سکتا جو بیان کیا گیا۔ وہ شرائط یہ ہیں۔ اول تو بیشتر یہ ماحصل اجارہ والی مقدار پیداوار اور اس کے ماسبق و مابعد مقداروں میں بہت زیادہ فرق ہو لیکن اُن کے ماحصلوں میں فرق بہت تھوڑا ہو۔ دوم شرح ٹیکس یا امداد درا اعلیٰ ہو۔ اگر حالت ان شرائط کے برعکس ہو۔ یعنی پیداوار کی مقداروں میں تو فرق کم ہو اور ماحصلوں میں زیادہ اور شرح ٹیکس یا امداد بھی ادنیٰ تو تیسرے اصول کے مطابق مقرر کیے ہوئے ٹیکس یا امداد کا وہ نتیجہ نہیں نکلے گا جو اوپر بیان کیا گیا بلکہ وہ بھی اصول اول و دوم کے نتیجہ کے مثل ہوگا۔

ٹیکس یا امداد اور اجارہ کا تعلق درحقیقت ایک دقیق بحث ہے جو حتی الوسع سلاست کے ساتھ بیان کی گئی۔ ناظرین کو چاہیے کہ بطور خود مثالیں بنا بنا کر مذکورہ بالا نتائج کی صحت کو جانچیں اس طرح یہ مسئلہ خوب ذہن نشین ہو سکے گا۔

حصہ چہارم
باب سوم

باب سوم
زر
فصل اوّل
مبادلہ

تجزیہ (۱) مبادلہ کی دقتیں (۲) زر کا مفہوم (۳) زر کے کام

مبادلہ کی دقتیں

(۱) قیمت کی بحث کے شروع میں سمجھایا گیا ہے کہ عمل مبادلہ کیونکر اور کس لیے خرید و فروخت میں منقسم ہوا۔ اسی مسئلہ کی ہم یہاں مزید تشریح کرنا چاہتے ہیں مبادلہ سے مراد ہے دو یا زیادہ چیزوں کا ایک دوسری سے ادل بدل کرنا مثلاً اگر کسی کو گھڑی دیکر اس سے معاوضہ میں کتاب لیجاوے چاقو دیکر چھڑی لیجاوے یا ع دیکر مکان لیا جاوے تو چیزوں کا اس طرح براہ راست ادل بدل اصطلاحاً مبادلہ کہلاتا ہے کسی زمانہ میں جب کہ انسانی ضروریات انگلیوں پر گنی جاسکتی تھیں اور ہر خاندان یا گاؤں بیشتر ضروریات کا خود کفیل تھا کاروبار مبادلہ سے چلا کیا لیکن معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ جوں جوں تجارت کی گرم بازاری ہوئی مبادلہ ناقابل عمل ثابت ہونے لگا خصوصاً تین ایسی لا علاج دقتیں نمودار ہوئیں کہ کاروبار چلنا محال ہو گیا۔

(۱) اول۔ **عدم مطابقت ضروریات** یعنی ایسے مبادلہ خواہوں کا اجتماع شاذ و نادر ممکن ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی چیز دوسرے کو مطلوب ہو۔ یہ تو ممکن ہے کہ جو چیز زید کو درکار ہے وہ عمر مبادلہ میں دینے کو آمادہ ہو لیکن جب تک وہ چیز جو زید معاوضہ میں دینا چاہے عمر کو درکار نہ ہو مبادلہ کیونکر ممکن ہے مبادلہ کے واسطے عمر کی چیز زید کو اور زید کی عمر کو مطلوب ہونا لازمی ہے۔ جب کہ لاتعداد چیزوں کی تجارت یوں عالمگیر ہو تو مبادلہ خواہوں کی مطلوبہ چیزوں کا ایسا اتفاق اگر نا ممکن نہیں ہے

تو بادرالوجود ضرور ہے پس ماندہ ممالک کے باشندوں کی ضروریات گنی چنی ہوتی ہیں اور سیاح اُن کی اکثر مطلوبہ چیزیں اپنے ساتھ رکھتے ہیں لیکن پھر بھی بعض وقت اُن کو مبادلہ میں عجیب بے لطف دقت اٹھانی پڑتی ہے چنانچہ ایک سیاح لفٹننٹ کیمرن نے افریقہ میں ایک کشتی خریدنے کی سرگذ یوں تحریر کی ہے۔ میں سید کی کشتی لینا چاہتا تھا لیکن سید کو اس کے معاوضہ میں ہاتھی دانت مطلو تھا جو کہ میرے پاس نہ تھا پتہ چلا کہ محمد ابن تالب ہاتھی دانت دینا چاہتا ہے مگر اس کو ایک قسم کا کپڑا درکار تھا اور سوء اتفاق سے وہ بھی اس وقت میرے پاس نہ تھا۔ پھر خبر ملی کہ محمد ابن غریب کے پاس وہ کپڑا موجود ہے اور اس کے معاوضہ میں وہ تار چاہتا ہے خوش قسمتی سے تار میرے پاس موجود تھا۔ چنانچہ میں نے محمدؐ ابن غریب کو تار دے دیا۔ اس نے محمدؐ ابن تالب کو کپڑا دیا اس نے سید کو ہاتھی دانت دیا اور سید نے مجکو کشتی دیدی اور یوں حُسن اتفاق سے کام جلد اور باآسانی بن گیا۔ ورنہ اس سے بھی زیادہ طوالت ممکن تھی۔

جہاں ضروریات اسقدر سادہ اور مختصر ہیں جب وہاں مبادلہ میں یہ طوالت و دقت پیش آئی تو ترقی یافتہ ممالک میں جہاں تجارت نہایت سرگرم اور وسیع ہوتی ہے مبادلہ کا سراسر ناقابل عمل ہونا صاف ظاہر ہے۔

(ب) **دوم معیار نرخ کی عدم موجودگی** - جبکہ بہت سی چیزوں کا براہ راست مبادلہ ہو تو مختلف چیزوں کے حساب سے ایک ہی چیز کے کئی نرخ رہ سکتے ہیں اور جس کو اس وقت کا پتہ چل جاوے وہ بہت کچھ نفع کما سکتے ہیں۔ مبادلہ میں کسی ایک چیز کا باقی کل چیزوں کے حساب سے یکساں نرخ قائم کرنا بہت دشوار ہے۔ ہر ایک چیز کا باقی کل چیزوں کے حوالہ سے نرخ دریافت کر کے ایسے کل نرخوں کا مقابلہ کرنا اور اُس میں یکسانی پیدا کرنی کیا کچھ آسان کام ہے؟ حساب سے معلوم ہوگا کہ سو چیزوں کے مبادلہ میں پورے ۴۹۵۰ نرخوں پر غور کر کے ان سب میں مناسبت پیدا کرنے پر کہیں ان چیزوں کے نرخ میں

یکسانی قائم ہوسکتی ہے اور اس پر لطف یہ ہے کہ کسی ایک چیز کے بھی نرخ تبدیل ہونے سے باقی چیزوں کے نرخ کو از سر نو دریافت کرنا ضروری ہے ورنہ پھر وہی فرق پیدا ہو جائے گا یہ بحث ذرا دقیق ہے ایک سادہ مثال سے اس کو واضح کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ چیزوں کے نرخ حسب ذیل ہیں اور کسی معیار کے ہوتے ہوئے نرخوں میں ایسی گڑبڑ نہ صرف ممکن بلکہ اغلب ہے

ایک من گیہوں	= ۴ سیر گھی	ایک سیر گیہوں	=	۳ سیر نمک
ایک سیر شکر	= ۴ سیر نمک	ایک من ،،	=	۲۰ سیر دودھ
ایک سیر گھی	= ۴ سیر شکر	ایک سیر شکر	=	۳ سیر دودھ
ایک من دودھ	= ۵ سیر گھی	ایک سیر گھی	=	۱۲ سیر نمک
ایک سیر شکر	= ۴ سیر گیہوں	ایک سیر دودھ	=	۳ سیر نمک

اس مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ ہر چیز کے کئی کئی نرخ جاری ہیں اور چونکہ کوئی معیار مقرر نہیں جس سے سب نرخوں کا مقابلہ کیا جاسکے۔ نرخوں کا فرق دریافت کرنا دشوار ہے۔

(ج) سوم **دقت تقسیم اشیا** بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ اُن کے چھوٹے حصے ہوسکتے ہیں مثلاً غلہ دودھ یا کپڑے کی کوئی مقدار ایسی چیزوں کا ضروری حصہ مبادلہ میں دینا آسان ہے لیکن بعض چیزیں حصوں میں تقسیم نہیں ہوسکتیں منقسم ہونے سے وہ ناکارہ ہو جاتی ہیں مثلاً جانور۔ سلے ہوئے کپڑے۔ برتن کشتی گاڑی وغیرہ۔ ایسی چیزوں کے مبادلہ میں بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ اُنکا مالک اگر اُن سے کمتر قدر والی چیز معاوضہ میں لے تو اس کو اپنی پوری چیز دینی پڑتی ہے مثلاً اگر ایک گاڑی کے معاوضہ تین گھوڑے ہوں لیکن صرف دو گھوڑے دستیاب ہوسکیں تو اُن کے معاوضہ میں پوری گاڑی دینی ہوگی گاڑی بقدر دو ثلث نہیں دی جاسکتی فرض کرو کہ ہم کو ایک ۱۲ آنہ کا ریلوے ٹکٹ خریدنا ضروری ہے اور اس وقت روپیہ کے دام میسر نہ آسکیں تو ہم کو مجبوراً ایک روپیہ ہی دینا پڑے گا۔ یہ ممکن نہیں

کہ روپیہ تراش کر بقدر یک چہارم ہم بچالیں - چنانچہ بعض ٹکٹ بابو عین عجلت کے وقت دام دینے سے انکار کر دیتے ہیں مصطرب مسافر سے بد ہے روپیہ وصول کرکے رائیدام خود ہضم کر جاتے ہیں اس لیے تجربہ کار مسافر اکثر روپیہ کے دام بھنا کر گھر سے لیجاتے ہیں

(۴) اوپر کی بحث سے ثابت ہوا کہ مبادلہ یعنی چیزوں کا چیزوں سے براہ راست ادل بدل کرنا کاروبار کے واسطے نہایت دقت آمیز اور ناموزوں ہے لہذا مبادلہ کے واسطے ایک تیسری چیز بطور آلہ ایجاد کی گئی جس کو اصطلاحاً زر کہتے ہیں - گویا زر سے مراد وہ کوئی چیز ہے جو بطور آلہ مبادلہ استعمال ہو یعنی جس کو ہر شخص بلا تامل اپنی چیز کے معاوضہ میں قبول کرلے اپنی چیز کو زر کے معاوضہ میں دینا فروخت کہلاتا ہے! اور زر کے معاوضہ میں کوئی چیز لینے کو خرید کہتے ہیں اس طرح پر مبادلہ کا عمل واحد اب خرید فروخت کے دو عملوں میں منقسم ہو گیا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ خرید و فروخت فی نفسہ دو جداگانہ مبادلے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ان مبادلوں میں ایک وہ چیز شامل ہے جس کی مقبولیت عام ہے اور جس کو زر کہتے ہیں - یہاں ایک نکتہ واضح کرنا خالی از لطف ہوگا وہ یہ کہ ہر خرید میں ایک ماسبق فروخت اور ہر فروخت میں ایک مابعد خرید مضمر ہوتی ہے یعنی جس روپیہ سے ہم کوئی چیز خریدتے ہیں وہ کوئی چیز پہلے فروخت کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور جب ہم کوئی چیز فروخت کرتے ہیں تو اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ آئندہ کبھی ہم اس کی قیمت سے کوئی اور چیز خریدیں گے تو ممکن ہے کہ مذکور الصدر ہر دو عملوں کے درمیان بہت زمانہ گزر جائے لیکن بترتیب مال ان کا ظہور یقینی ہے - اس نکتہ سے بھی زر کی اصلیت پر خاص روشنی پڑتی ہے - زر محض ایک آلہ ہے جس نے بغرض سہولت مبادلہ کو خرید و فروخت کے دو جداگانہ عملوں میں تقسیم کر دیا ہے ورنہ درحقیقت کل کاروبار کا منشا صرف مبادلہ ہے اور ہر خرید یا فروخت میں جداگانہ بھی مبادلہ مضمر ہے -

حصہ چہارم باب سوم

(۳)(۱) زر کا اولین کام تو یہ ہی کہ وہ بطور آلہ مبادلہ استعمال ہوتا ہی اسی کی وساطت سے خرید و فروخت ہوتی ہی۔ کاروبار چلتا ہی ایسی چیز کے معاوضہ میں ہر کوئی اس کو اس وجہ سے قبول کر لیتا ہی کہ اس کو معلوم ہی کہ دوسرے لوگ بھی اس کو اسی طرح پر اپنی چیزوں کے معاوضہ میں بلا عذر قبول کریں گے۔ بالفاظ دیگر اپنی چیز لوگ اس وجہ سے بمعاوضہ روپیہ فروخت کر دیتے ہیں کہ اُن کو یقین ہی کہ جب چاہیں گے اس روپیہ سے حسب دلخواہ چیز خرید سکیں گے۔

زر کے کام Functions of Money

(ب) جب زر کثرت سے خرید و فروخت میں استعمال ہونے لگا تو چیزوں کے نرخ کا مقابلہ بحوالہ زر نہایت آسان ہو گیا۔ اور ہر چیز کا ایک نرخ قائم ہو گیا یہ نہیں کہ کسی چیز کے حوالہ سے نرخ کچھ ہو اور کسی سے کچھ جیسا کہ بحالت مبادلہ ممکن بلکہ اغلب تھا مثلاً بعد رواج زر چیزوں کے نرخ حسب ذیل ظاہر کیے جاوینگے۔

ایک روپیہ	=	ایک سیر گھی		ایک روپیہ	=	۱ سیر گیہوں
ایک روپیہ	=	۴ سیر شکر		؍؍ ؍؍	=	۱۶ سیر نمک
؍؍ ؍؍	=	۸ سیر دودھ				

اس مثال میں ایک معیار یعنی روپیہ معین ہونے سے فوراً تحقیق ہو گیا کہ ایک سیر گھی ۴ سیر شکر ۸ سیر دودھ۔ ۱۰ سیر گیہوں اور ۱۶ سیر نمک ایک دوسرے کے ہمقدر ہیں۔ گویا اگر زر کے حوالہ سے چیزوں کا نرخ معین کر کے ان کا مبادلہ بھی کیا جاوے تو فرق نرخ وغیرہ باقی نہیں رہتا۔ حاصل کلام یہ کہ زر کا دوسرا کام یہ ہی کہ وہ بطور معیار قدر استعمال ہوتا ہی۔

(ج) زر خزینۃ القدر بھی کہلاتا ہی اس کے یہ معنی ہیں بہت زیادہ قدر۔ زر کی چھوٹی سی مقدار میں جمع ہو جاتی ہی اور مروجہ زر میں یہ صفت بدرجہ اعلیٰ پائی جاتی ہی۔ مثلاً سوا شرفیاں جن کو بسہولت ہم جیب میں رکھ سکتے ہیں۔ ہزارہا من غلہ یا ہزاروں گز کپڑے کی ہمقدر ہوتی ہیں ان سے اتنا لوہا یا پتھر خریدا جا سکتا ہی کہ اس کے اُٹھانے کے واسطے صدہا چھکڑے درکار ہوں

دوسرے لحاظ سے بھی یہ صفت زر کے واسطے مخصوص ہے۔ مروجہ زر مثل سونا چاندی بمقابلہ
متشمار چیزوں کے بہت سا زیادہ دیرپا ہے۔ گویا سریع الزوال چیزوں میں تو قدر جلد زائل ہو جاتی
ہے۔ لیکن زر جیسی دیرپا چیز میں قدر عرصہ دراز تک برقرار رہتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہیرے جواہرات جیسی قیمتی چیزوں میں بھی ہر دو مذکورہ بالا صفات
پائی جاتی ہیں لیکن زر کو ان پر بھی فوقیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ مبادلہ میں ان کا استعمال سہل نہیں
جتنا کہ زر کا ہوتا ہے۔

آگے چلکر بعنوان قدر زر ہم بالتفصیل وضح کریں گے کہ اگرچہ سونے کی شکل میں زر کی قدر
بہت ثبات پذیر ہے لیکن پھر بھی اس میں نہایت آہستہ آہستہ تغیر یعنی کمی ظہور پذیر ہو رہی ہے
لیکن اگر سونے کی بجائے کوئی اور چیز بطور زر مستعمل ہوتی تو غالباً اس کی قدر اور بھی زیادہ
تغیر پذیر ہوتی۔ اس واقعہ سے زر فلزاتی کے تحت میں بحث کی جائے گی یہاں صرف
اشارہ کافی ہے۔

فصل دوم

زر فلزاتی

تجزیہ (۱) عمدہ زر کے خواص (۲) سکہ (۳) اصول اجرائے سکہ

عمدہ زر کے خواص

(۱) یوں تو بہت سی چیزیں بطور زر استعمال ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں لیکن اس کام کے واسطے وہ چیزیں نہایت موزوں ہیں جن میں خواص ذیل موجود ہوں چنانچہ انہی خواص کی بدولت سونا چاندی اور تانبا کل ترقی یافتہ ممالک میں بالاتفاق زر کے واسطے منتخب کر لیے گئے ہیں اور صرف پس ماندہ ملکوں میں ان کی بجائے اور چیزوں کا زر رائج ہے۔ لیکن معاشی ترقی کے بعد سونے چاندی اور تانبے کے زر کا رواج وہاں بھی یقینی ہے۔

عمدہ زر کے خواص یہ ہیں۔

(۱) قدر ذاتی
(ب) نقل پذیری
(ج) بے زوالی
(د) ثبات قدر
(ہ) یک جنسی
(س) سہم پذیری
(ص) شناخت پذیری

(۱) عمدہ زر کی پہلی خاصیت یہ ہے کہ اس میں قدر ذاتی موجود ہو یعنی جو چیز بطور زر استعمال ہو لوگ اس کے بہت خواہشمند اور طالب ہوں۔ چنانچہ ہر زمانہ اور ملک میں وہی چیزیں بطور زر مستعمل پائی گئی ہیں جو عام طور پر پسند کی جاتی تھیں اور ایسا ہونا کچھ عجب نہیں اگر کوئی چیز عام پسند نہ ہو تو ہر شخص مبادلہ میں اس کو بلا عذر کیوں قبول کرنے لگا اور وہ زر کیونکر قرار پا سکتی تھی خصوصاً اس وقت جبکہ لوگ اول اول باتفاق رائے چیزیں بطور زر رائج کرتے تھے قدر ذاتی کی

Characteristics of good money

صفت ما گر یہ بھی البتہ ایک مرتبہ رائج ہو جانے کے بعد یہ ممکن ہے کہ لوگ اس چیز کی قدر ذاتی کی چنداں پروا نہ کریں حتیٰ کہ قدر ذاتی غائب ہو جانے پر بھی رسم و رواج یا عادت کے اثر سے اسکو بطور زر رائج رکھیں چنانچہ کوڑی کسی زمانہ میں بطور آرائش و زیور استعمال کی جاتی تھی اور پس ماندہ اقوام میں بہت پسندیدہ تھی یہی قدر ذاتی کی بدولت بطور زر اس کا رواج شروع ہوا لیکن جہاں اور جبکہ وہ آرائش اور زیور کے کام نہیں آتی تھی وہ مدتوں زر کے طور پر استعمال ہوا کی - سونے - چاندی اور تانبے نے بھی اپنی چمک دمک اور دوسری خوبیوں کی بدولت عہد قدیم ہی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا - ہر ملک اور ہر زمانہ میں ان کی کم و بیش قدر مانی گئی ہے - اور علاوہ ان خوبیوں کے جن کی وجہ سے وہ زر کے واسطے بعد کو نہایت موزوں ثابت ہوئے ہیں محض اپنی قدر ذاتی کی بدولت وہ قدیم زمانہ ہی سے بطور زر استعمال ہوتے چلے آتے ہیں - آگے چلکر سکہ اور زر کاغذی کے بیان سے واضح ہوگا کہ معاشی ترقیات نے کیونکر قدر ذاتی کی اہمیت گھٹا دی اور زر کو بلا لحاظ قدر ذاتی کیونکر آلہ مبادلہ بنا دیا - لیکن اس حالت میں بھی قدر ذاتی اور زر کے درمیان بذریعہ اعتبار رشتہ ضرور قائم ہے مثلاً سو روپیہ کا نوٹ لو - اس کی قدر ذاتی ردی کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہیں لیکن لوگ بلا تامل اس کو سو روپیہ کا ہم قدر مانتے ہیں کیونکہ ان کو اعتبار ہے کہ اس کے معاوضہ میں سو روپیہ مل سکتے ہیں - گویا اس نوٹ اور سو روپیہ کے درمیان بذریعہ اعتبار قریبی رشتہ قائم ہے اگر اعتبار اٹھ جائے تو نوٹ کی قدر ذاتی دو کوڑی بھی نہیں نکلے گی -

حاصل کلام یہ کہ جب کوئی چیز بطور زر رائج ہو تو اس وقت اس میں قدر ذاتی ہونی یقینی ہے البتہ رائج ہونے کے بعد اگر قدر ذاتی گھٹے یا غائب ہو جائے تب بھی رسم و عادت کے اثر سے اس کا جاری رہنا ممکن ہے - عمدہ زر وہ ہے جس کی قدر ذاتی ہمیشہ قائم رہے جیسا کہ سونا چاندی کہ ہمیشہ اس کی قدر مانی گئی ہے اور مانی جائے گی اور جیسا کہ ابھی واضح ہوگا بمقابلہ دوسری چیزوں کے

اُن کی قدر میں تغیر و تبدل بھی بہت کم ممکن ہے۔ اور یہ جو زر کاغذی رائج ہو چلا ہے اگرچہ اس میں قدر ذاتی نہیں لیکن بتوسط اعتبار اس کی قدر بھی سونے چاندی کے قدر ذاتی پر مبنی ہے

(ب) زر کی دوسری صفت نقل پذیری ہے یعنی یہ کہ اُس کو بآسانی جگہ جگہ لیجا سکیں یہ اس حالت میں ممکن ہے۔ جب کہ بلحاظ قدر۔ زر کا وزن اور جسامت نہایت موزوں اور مناسب ہو۔ جن چیزوں کی بکثرت خرید و فروخت ہوتی ہے اُن کے ہمقدر زر کا وزن اور جسامت نہ تو اس قدر زیادہ ہو اور نہ اتنا کم کہ اس کو ساتھ لیے پھرنے میں دقت ہو۔ صفت نقل پذیری کے لحاظ سے معمولاً تو چاندی نہایت موزوں ثابت ہوتی ہے لیکن جہاں زر کے وزن و جسامت کی زیادتی کا اندیشہ ہوتا ہے وہاں سونا اور جہاں کمی کا خوف ہو وہاں تانبا استعمال کیا جاتا ہے چنانچہ ہندوستان میں عام طور پر تو روپیہ چلتا ہے۔ لیکن اگر زر کی کوئی بڑی مقدار ساتھ رکھنی ہو تو لوگ اشرفیاں لیجاتے ہیں۔ سوا سیر وزن کی اشرفیاں تقریباً ایک من روپیہ کی ہمقدر ہوتی ہیں اور جسامت میں اس سے بھی زیادہ فرق ہوگا۔ آج کل چونکہ خرید و فروخت نہایت کثیر مقدار میں ہوتی ہے اکثر سونا بھی کام نہیں دیتا اور اسی نقل پذیری کی خاطر زر کاغذی جس کی تشریح ہم آیندہ کریں گے بکثرت استعمال ہونے لگا ہے۔ لیکن خدا کے کروڑہا بندے جو رات دن بمشکل سودا سلف خریدتے رہتے ہیں تانبے کے پیسے استعمال کرتے ہیں پیسہ کا ہمقدر چاندی کا سکہ بمشکل چٹکی میں آسکتا ہے اور سونے کا تو بہت سوں کو خوردبین سے بھی نظر نہ آئے

حاصل کلام یہ کہ چند چھوٹی بڑی مقداروں میں سے ہر ایک کے واسطے زر کا وزن و جسامت نہایت موزوں ہونی چاہیے تاکہ نہ [illegible] بہ سہولت [illegible] اور جسامت کی بہت زیادہ برائی [illegible] اور [illegible] وہ ہوتی ہے [illegible] ہوگا کہ نقل پذیری کے لحاظ سے سونے چاندی اور تانبے کو دوسری چیزوں پر فوقیت ضرور حاصل ہے۔

حصہ چہارم
باب سوم

زر کی نقل پذیری ایک اور لحاظ سے بھی اہم اور قابل توجہ ہے۔ اگر زر باسانی ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجا جا سکے تو تمام دنیا میں اس کی قدر یکساں رہے گی۔ کیونکہ جہاں بھی قدر چڑھے گی قانون طلب و رسد کے مطابق دوسرے مقامات سے زر آکر اس کو معمولی سطح پر اُتار دیگا۔ اس کے برعکس اگر زر کا دوسرے ملکوں میں بھیجنا دشوار ہو تو زر کے قدر میں جگہ جگہ بہت فرق ممکن ہے۔ یہاں سہولت و دشواری سے مراد خاص طور پر مصارف آمدورفت کی کمی بیشی ہے۔ اس لحاظ سے سونا بہت زیادہ نقل پذیر ہے اس کا وزن وجسامت تو بہت کم اور مقابلتہً قدر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور دنیا کے دور سے دور حصے میں بھیجنے کے مصارف بھی اس کی قدر کے ۲ یا ۳ فیصدی سے نہیں بڑھ سکتے حالانکہ گیہوں کے مصارف ۵۰ فیصدی قیمت تک بڑھ سکتے ہیں۔ چنانچہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ سونے کی قدریں مساوات پائی جاتی ہے اور زر کی جو کہ معیار قیمت ہے ایسی ہی یکساں قدر ہونی چاہیئے۔

اوپر نقل پذیری کے دو مفہوم بیان ہوئے اول بلحاظ قدر، وزن وجسامت کی موزونی۔ دوم بلحاظ وزن وجسامت قدر کی ارجمندی۔ پہلے کی رو سے تو سونا چاندی اور تانبا تینوں نہایت موزوں ہیں مگر دوسرے کی رو سے صرف سونا عمدہ ہے۔ اول قسم کی نقل پذیری روزمرہ کے کاروبار میں درکار ہے اور قسم دوم کی دور دراز مقامات کی تجارت میں مگر اپنے اپنے طور میں دونوں ضروری اور مفید۔

(ح) بے زوالی زر کی تیسری صفت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زر بعید دیرپا ہونا چاہیئے نہ پانی یا کافور کی طرح وہ ہوا میں اُڑے نہ پھل۔ ترکاری اور گوشت کی طرح سڑے۔ نہ غلہ اور لکڑی کی طرح اس کو کیڑا لگے۔ نہ لوہے کی مانند اس کو زنگ کھاوے وہ برسوں نہیں بلکہ صدیوں قائم رہے ایسے زر کو لوگ جب تک چاہیں گے پاس رکھ سکیں گے اور اس کے خراب ہو جانے کے خوف سے اُن کو خلاف مرضی خرید و فروخت میں عجلت نہیں کرنی پڑیگی

اول تو زر خصوصیۃ القدر کی قرار پاچکا ہے اور اس لحاظ سے اس کو بے دوال ہونا لازمی ہے۔ دوسرے اس صفت کا ثبات قدر سے نہایت قریبی تعلق ہے جس کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں

(د) ثبات قدر کی صفت بھی زر کے حق میں نہایت اہم ہے۔ سود کی بحث میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ زر اگرچہ سب چیزوں کی قیمت کا معیار ہے اور معیار ہمیشہ مقرر و غیر متبدل ہوتا ہے لیکن خود زر کی قدر بھی بحیثیت مجموعی اور چیزوں کی مانند گھٹتی بڑھتی ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ مقابلۃً اس کی قدر میں سب سے کم تغیر و تبدل ہوتا ہے لیکن ہوتا ضرور ہے۔ مگر چونکہ ہم زر کو معیار جانتے ہیں قدر زر کے تغیر و تبدل کو بھی ہم ہمیشہ دوسری چیزوں کی قیمت کی تبدیلی پر محمول کرتے ہیں قدر زر کے تغیر کا مسئلہ فی نفسہ اہم اور دقیق ہے۔ اور اس سے ہم آئندہ جداگانہ بحث کریں گے یہاں صرف اس قدر جتانا مقصود ہے کہ یوں تو جو چیز گراں ہوتی ہے اس کے حوالہ سے زر کی قدر گھٹ جاتی ہے اور جو چیز ارزاں ہوتی ہے اس کے حوالہ سے بڑھ جاتی ہے اور قدر زر کی ایسی تخفیف و اضافہ کا باعث خود دوسری چیز کی قلت و کثرت ہوتی ہے لیکن دوسری چیزوں کی مانند خود زر کی قلت و کثرت کا بھی اس کی قدر پر بعینہ وہی اثر پڑتا ہے یعنی زر کی مقدار بڑھنے سے اس کی قدر گھٹتی ہے اور مقدار گھٹنے سے قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔ گویا قدر زر کی تغیر کے دو اسباب ہوئے یا تو کسی دوسری چیز کی قلت و کثرت یا خود زر کی کمی بیشی ان تغیرات میں لیکن ایک قابل توجہ فرق پایا جاتا ہے۔ بحالت اول زر کی قدر میں فرق صرف بحوالہ اس ایک یا چند چیزوں کے نظر آتا ہے جن کی رسد میں کمی بیشی ہوگئی ہو لیکن بحالت دوم قدر زر کا فرق عام ہوتا ہے اور اکثر چیزوں کے حوالہ سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ حالت اول کو اشیاء متعلقہ کی گرانی و ارزانی سے تعبیر کرتے ہیں اور حالت دوم کو قدر زر کی کمی بیشی سے۔ قدر زر کی ان ہر دو تبدیلیوں کی حالت بعینہ ایسی ہے کہ کسی تالاب میں لہریں دوڑتی رہیں یا خود سطح آب پست یا بلند ہو جائے

آخرالذکر تبدیلی کا پتہ چلانا دشوار ہی اور مہارت طلب - اس کا ایک خاص طریق ہی جس کو انگریزی میں انڈکس نمبر کہتے ہیں - قدر زر کی جداگانہ بحث میں ہم اس کی بھی تشریح کریں گے - تحقیق سے معلوم ہوا ہی کہ مذکورالصدر مفہوم میں زر کی قدر ہر ترقی یافتہ ملک میں گھٹ رہی ہی لیکن نہایت آہستہ آہستہ لوگ یوں کہہ سکتے ہیں زر کی قدر گھٹنے کا باعث صاف ظاہر ہی - ہر سال کانوں سے سونا - چاندی نکلتی ہی اور اس کی جوں جوں مقدار بڑھتی ہی قانون طلب و رسد کے مطابق اُن کی قدر میں کم و بیش تخفیف ہوتی ہی زر کی قدر مدت سے مسلسل طور پر گھٹ رہی ہی مگر نہایت آہستہ آہستہ ان دونوں واقعوں کا باعث سونے کی صفت بے زوالی میں مضمر ہی چونکہ سونا تقریباً سب سے زیادہ دیرپا چیز ہی اس کی جتنی مقدار حاصل ہوتی ہی قائم رہتی ہی سمندر وغیرہ میں کچھ مقدار اگر ضائع ہوتی بھی ہی تو نسبتاً اتنی قلیل کہ قابل لحاظ نہیں - پس سونے کی مقدار برابر بڑھ رہی ہی اور باوجودیکہ اس کی طلب بھی بہ نسبت سابق زیادہ ہی اس کی قدر میں برابر تخفیف ہو رہی ہی تخفیف کی سُست رفتاری کا باعث یہ ہی کہ سونا چونکہ ہزارہا سال سے برابر فراہم ہو رہا ہی اور بہت کم ضائع ہوتا ہی جمع ہوتے ہوتے اس کی مجموعی مقدار اس قدر زیادہ ہو گئی ہی کہ سالانہ اضافوں کا کل مقدار پر بہت کم اثر پڑتا ہی اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ دنیا میں بعض بڑی بڑی جھیلیں ہیں کہ اُن میں دریا کتنے ہی زور شور سے گرے لیکن پھر اُن کی سطح آب بمشکل ایک آدہ انچ بلند ہو سکتی ہی اس کے برعکس اگر سونا بھی مثل غلہ برابر ضائع ہوتا رہتا تو اس کی اسقدر کثیر مقدار فراہم نہ ہو سکتی اور ہر سالانہ پیداوار کا اس کی مقدار اور قدر پر زبردست اثر پڑا کرتا، جیسا کہ گیہوں یا روئی کا حال ہی -

حاصل کلام یہ کہ اگرچہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں سونے کی مقدار بڑھنے سے زر کی قدر میں برابر تخفیف ہو رہی ہی لیکن اس کی رفتار نہایت سست ہی - اسی وجہ سے معمولی کاروبار میں ایسی تخفیف کا کوئی لحاظ نہیں کرتا - دس بیس سال کے عرصہ میں البتہ تخفیف

کا اثر نمایاں ہو جاتا ہے۔ سونے کے بجائے اگر کوئی دوسری چیز استعمال ہو تو زر کی قدر میں اور بھی جلد جلد تغیر و تبدل ہوا کرے اور ایسی حالت میں کاروبار کی حالت جس قدر ابتر او خطرناک ہو ظاہر ہے۔

(۳) یک جنسی سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز اپنی اصلی حالت میں ہمیشہ یکساں ہو۔ اس کی اصلی خوبی میں کوئی فرق ممکن ہو۔ مثلاً سونا خواہ دنیا کی کسی کان سے نکلے اپنی خالص حالت میں ہمیشہ یکساں ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ مختلف کانوں کے خالص سونے کی خوبی میں کوئی فرق ہو۔ اس کے برعکس اور بہت سی بےشمار چیزیں ہیں مثلاً گیہوں، روئی، اون جن کی خوبی میں بہت فرق کی گنجائش ہے اس صفت سے زر میں بڑی خوبی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ کل زر بلا دقت ہمقدر بن سکتا ہے اور اگر آمیزش کر کے زر کی قدر ذاتی گھٹائی جائے تو بآسانی اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً کل روپیوں کی چاندی یا اشرفیوں کا سونا خوبی میں یکساں ہے اور اگر مصنوعی سکے بنا کر اُن کی خوبی اور لہذا قدر ذاتی گھٹائی جائے تو اس کا پتہ چلانا کچھ دشوار نہیں ہوتا

(س) سہم پذیری سے مراد نہ صرف جسمانی تسہیم ہے بلکہ تسہیم قدر بھی۔ مثلاً ایک تولہ سونے کے خواہ کتنے ہی ٹکڑے کیے جائیں ہر ٹکڑے کی قیمت اس کے وزن کی نسبت سے یکساں ہوگی اور کل ٹکڑوں کی مجموعی قدر اصلی بڑے ٹکڑے یعنی تولہ بھر کے برابر رہے گی بہت سے ٹکڑے ہو جانے سے اصلی مقدار کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اور بآسانی کے ساتھ وہ کل ٹکڑے گلکر بڑا ٹکڑا بن سکتے ہیں اس کے برعکس اور قیمتی چیزیں مثلاً ہیرے جواہرات اگر چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیے جائیں تو ان ٹکڑوں کی قدر اُن کے وزن یا جسامت کی نسبت سے بہت گھٹ جائے گی اور کل ٹکڑوں کی مجموعی قیمت اصلی ٹکڑے سے بہت کم ہوگی اور نہ ان ٹکڑوں کو جوڑ کر اصلی ٹکڑا بنانا ممکن ہوگا۔

سہم پذیری سے زر میں یہ خوبی پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی چیز سے مختلف قدر کے

زر یا سانی تیار ہو سکتے ہیں مثلاً اشرفی و نصف اشرفی روپیہ اٹھنی چونی اور دونی مزید برآں ایک اشرفی اور دو نصف اشرفیاں، ایک روپیہ اور دو اٹھنی یا چار چونی یا آٹھ دونی۔ یہ سب ہمقدر بھی ہیں۔

(ص) شناخت پذیری۔ زر کی ساتویں اور آخری صفت ہے۔ جو چیز بطور زر استعمال ہو وہ اپنی چند بدیہی خصوصیات کی وجہ سے اس قدر ممتاز ہو کہ فوراً پہچان لی جاوے اور مصنوعی چیزوں سے بلا دقت اس کی تمیز ہو سکے مثلاً سونے کا رنگ وزن اور جھنکار اس قدر مخصوص ہے کہ اس کے پرکھنے میں عوام کو بھی دقت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی سکہ مصنوعی ہوتا ہے تو ذرا غور سے دیکھنے پر پتہ چل جاتا ہے جب کہ خرید و فروخت میں زر بسرعت دست بدست گھومتا ہے لوگوں کو اتنی مہلت کہاں کہ اس کی شناخت پر وقت صرف کریں شناخت پذیری سے ناقص اور مصنوعی زر کے رواج کا خطرہ بہت کم رہ جاتا ہے۔ چونکہ مصنوعی زر کا رواج روکنے کے لئے زر بالعموم بشکل سکہ استعمال کیا جاتا ہے۔ شناخت پذیری کو بعض نے نقش پذیری سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کسی چیز کی یہ صفت کہ اس کو ڈھالکر یا اس پر نقش ابھار کر اس کا سکہ بنا سکیں۔

سکہ کے متعلق ضروری معلومات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۲) اپنی خاص صفات کی بدولت سونے چاندی نے آج سے مدتوں پہلے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور جہاں کہیں بھی وہ کافی مقدار میں دستیاب ہو سکے زر کے طور پر رائج ہونے لگے لیکن دوران رواج میں انہوں نے کئی شکلیں بدلیں۔ اوّل اوّل ان کے چھوٹے بڑے کھوٹے کھرے ٹکڑے بطور زر استعمال ہوئے۔ ہر خرید فروخت کے وقت ان ٹکڑوں کا وزن اور مال جانچنا پڑتا تھا۔ اس طریق سے کاروبار میں جس قدر تاخیر اور دقت ہوتی ہوگی ظاہر ہے چنانچہ اب تک چین کے بعض حصوں میں جہاں سونا چاندی اسی طرح سے بطور زر رائج ہے تاجر کسوٹی اور کانٹا ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ اور ہر خرید و فروخت میں جانچ تول کر زر کی

حصہ چہارم
باب سوم

قدر دریافت کرنی پڑتی ہے۔ اس طوالت اور وقت سے بچنے کے لیے یہ طریق ایجاد کیا گیا کہ سونے چاندی کے بہت سے ٹکڑے تیار کیے گئے جو لحاظ وزن اور خوبی یکساں تھے گویا یہ سب ٹکڑے مساوی القدر تھے اور شناخت کے لیے اُن پر کچھ مقررہ علامات بھی بنا دیئے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے ٹکڑوں کو خرید و فروخت میں لوگ جانچے تولے بغیر مقررہ قدر کے حساب سے لینے لگے۔ پس ماندہ ممالک میں ان کا اب تک رواج ہے۔ اور عجائب خانوں میں بھی بطور تاریخ سکہ اُن کو دکھایا جاتا ہے۔ یہی بھونڈے ٹکڑے سکہ کی بنا تھے جو معاشی ترقیات کی بدولت آج یوں خوشنما نظر آتے ہیں۔ پس واضح ہوا کہ سکہ سے سونے چاندی تانبے یا کسی دہات کے ایسے ٹکڑے مراد ہیں جن کے مقررہ وزن اور خوبی کی تصدیق ان کی خاص شکل اور ان نقش و نگار کی صفائی سے کی جاوے جو اُن کی سطح پر بنا دیئے جاتے ہیں۔

غور اور تجربہ سے عمدہ زر کی مانند عمدہ سکہ کے بھی چند خواص قرار پا چکے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

(۱) سکہ کی پہلی خوبی یہ ہے کہ اس کی نقل بنانی نہایت دشوار ہو تاکہ مصنوعی سکوں کے رواج کا اندیشہ نہ رہے۔ سکہ پر نقش و نگار حتی الامکان نہایت نازک اور پیچیدہ ہونے چاہئیں جو ارحد بیش قیمت مشین بغیر کسی طرح پر نہ بنائے جا سکیں اور جن کی پوری نقل اُتارنی سخت سے سخت دشوار اور از حد مہارت طلب ہو۔ نقل تو لوگ ملکہ وکٹوریا کے روپیہ کی بھی بنا لیتے تھے مگر اُس کے نقش و نگار پھر بھی دقیق اور اہتمام طلب تھے۔ سب سے ایڈورڈ اور جارج کے سیدھے سادے نقش والے روپیہ چلے مصنوعی روپیہ کا بہت رواج بڑھ رہا ہے۔

(ب) سکہ کی شکل و صورت ایسی ہونی چاہیئے کہ اگر اس کا ذرا سا حصہ بھی کھرچا یا تراشا جائے تو فوراً پتہ چل جائے اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ لوگ اشرفی یا روپیہ میں سے چند چند رتی دہات تراش کر بہت کچھ کما لیں۔ اسی اندیشہ سے اول تو سکوں کی شکل بالعموم گول رکھی جاتی ہے

دوم اس کے ارد گرد کنارہ کنارہ نہایت باریک و یکساں خط ابھار دیے جاتے ہیں اور سطح کی ہر دو جانب کے نقش و نگار بھی اس اندیشہ کو رد کرتے ہیں ۔

(ج) سکہ ایسا ہونا چاہئے کہ استعمال سے بہت کم فرسودہ ہو گول شکل چونکہ بہ نسبت نوکدار کے رگڑ کم کھاتی ہے اس غرض کے لیے مفید ہے ۔ مزید براں سونا چاندی زیادہ نرم ہیں اور اُن کو حسب ضرورت سخت بنانے کی خاطر ان میں کچھ مقررہ حساب سے آمیزش کر دی جاتی ہے تاکہ دوران استعمال میں سکہ موٹے نہیں اور کم گھسے ۔

(د) سکہ کی شکل و جسامت موزوں ہونی چاہئے ۔ اگر موجودہ گول سکوں کی بجائے نوکدار استعمال کیے جاویں تو اُن کو جیب و بیگ میں رکھنا کس قدر تکلیف دہ ہو ۔ اسی طرح یہ اگر تانبے کی دونی یا چونی یا چاندی کا پیسہ بنایا جاوے تو اُن کی جسامت کس قدر ناموزوں ہو گی ۔ خاص جسامت کی موزونیت کی خاطر مختلف مقدار قدر کے واسطے مختلف دھاتوں کے سکے بنائے گئے ہیں ۔

(ہ) دیکھنے میں بھی سکہ ہر لحاظ سے خوشنما ہونا چاہئے تاکہ اس سے ساخت کا کمال ظاہر ہو اس پر ضروری تاریخی معلومات مثلاً سنہ و مقام اجرا و شاہ وقت کا نام درج ہونا ضروری ہے ۔ افسوس ہے کہ بمقابل وکٹوریا کے روپیہ کے ایڈورڈ اور جارج کے روپیہ دیکھنے میں بھدے معلوم ہوتے ہیں نہ معلوم کس مصلحت سے آخر الذکر روپیہ میں یہ طرز اختیار کیا گیا ہے کہ جس سے علاوہ دیگر خواص کے خوشنمائی تک پر حرف آتا ہے ۔

(۳) اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ سکہ سے سونے چاندی وغیرہ کے ایسے ٹکڑے مراد ہیں جن کے مقررہ وزن اور خوبی کی ان کی خاص شکل اور ان نقش و نگار سے تصدیق کی جاوے جو ان کی سطح پر ہر جانب بنا دیئے جاتے ہیں ۔ چند وجوہات کی بنا پر جن کی ہم ابھی تشریح کرینگے سکہ سازی سرکار نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے حتیٰ کہ اس کو دوسروں

حصہ چہارم
باب سوم

کے حق میں تعزیری جرم قرار دیدیا - سرکار خود سکہ بناتی اور اس کی قدر معین کرتی ہے
گویا ہر سکہ کی دو قدر ہوتی ہیں ایک وہ جو مقدار سونے یا چاندی کے مطابق ہو اس کو اصطلاحاً قدر
Legal value
فلزاتی کہتے ہیں دوم وہ جو سرکار کی مقرر کردہ ہو اس کو اصطلاحاً قدر قانونی کہتے ہیں۔
بعض سکوں کی قدر فلزاتی اور قدر قانونی برابر ہوتی ہے. مثلاً اشرفی- ایسے سکے زر مستند
کہلاتے ہیں اور بعض سکوں کی قدر فلزاتی قدر قانونی سے کم ہوتی ہے مثلاً روپیہ کہ اس میں
چاندی دس آنہ سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتی لیکن اس کی قدر قانونی سولہ آنہ مانی جاتی ہے ایسے
سکے زر وضعی کہلاتے ہیں - تیسری صورت یعنی قدر فلزاتی کا قدر قانونی سے زیادہ ہونا
اس وجہ سے قابل لحاظ نہیں کہ ہر دو قدر کا ایسا تعلق سراسر لاحاصل اور لہذا غیر اغلب ہے
اگر کسی سکہ کی قدر فلزاتی قدر قانونی سے زاید ہو تو اس کو لوگ محض ٹکڑے کے طور پر استعمال
کریں گے وہ بطور سکہ اس وجہ سے رائج نہیں ہو سکتا کہ سکہ قدر قانونی کا پابند ہوتا ہے اور
ایسی پابندی سے مالکان سکہ کو نقصان پہنچے گا۔ سکے کے طور پر چلنے کے بجائے سونے چاندی
کے معمولی ٹکڑوں کی مانند ان کی خرید فروخت جاری ہو جائے گی گویا ایسے سکے ہی نہ
رہیں گے - ایک دوسرے اصول کی رو سے بھی زر کی دو قسم قرار دی گئی ہیں اوّل وہ زر جس
کے ذریعہ سے بڑی سے بڑی مقدار قدر ادا ہو سکے اور اس کی ادائیگی و قبولیت فریقین پر
قانوناً لازم ہو مثلاً روپیہ اور اٹھنی کہ قانوناً دو روپیہ سے زاید ہر رقم اُن کے ذریعہ سے ادا
ہونی چاہئے - نہ اُن کے دینے سے کوئی انکار کر سکتا ہے اور نہ لینے سے ایسے سکے جو
قانوناً ہر مقدار قدر کی ادائیگی کے واسطے معین ہوں اصطلاحاً زر قانونی کہلاتے ہیں
تاکہ عوام کو روز مرہ کے پھٹکل سودا سلف خریدنے میں سہولت ہو۔ زر قانونی کے چھوٹے
چھوٹے حصے بھی رائج کر دیئے جاتے ہیں لیکن ایسے حصے صرف قلیل مقدار قدر
کی ادائیگی میں کام آتے ہیں - ازروئے قانون بڑی مقدار کی ادائیگی میں ان کا استعمال

لازم ہیں۔ مثلاً چونی دونی اکنی اور پیسہ یہ سب سکے روپیہ کے چھوٹے حصے ہیں اور ازروئے قانون صرف دو روپیہ تک اُن کے ذریعہ سے ادا اور قبول کیے جا سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں آخرالذکر قسم کے سکے اصطلاحاً محدود زر قانونی کہلاتے ہیں۔

زر قانونی اور محدود زر قانونی کی تفریق کی مصلحت غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ فرض کرو کہ کسی پر ہزار روپیہ قرض ہو اور روپیوں کے بجائے وہ پیسے ادا کرے تو قرض خواہ کو کس قدر دقت اور خسارہ ہوگا۔ اس تفریق کی ضرورت محسوس ہونے کا قصہ بھی عجیب پر لطف ہے۔ سنا ہے کہ انگلستان میں کسی بنک کے مخالفوں اور بدخواہوں نے اس کے دیوالہ نکلنے کا خوف لوگوں میں پھیلا دیا۔ جن کا روپیہ جمع تھا وہ سب ہجوم کرکے بنک پر ٹوٹے اور اپنی اپنی رقم کا مطالبہ کرنے لگے۔ جیسا کہ آگے چلکر واضح کیا جائے گا۔ بنک کا کل کاروبار اعتبار پر مبنی ہے اور یک ساتھ کل رقم جمع شدہ واپس کرنا دنیا کے بہترین بنک کے قابو سے بھی باہر ہے۔ اس موقع پر بنک کو بھی ایک ترکیب خوب سوجھی اُس نے جلد سے جلد تانبے کے سکے فراہم کرکے انبار کے انبار لگا دیئے اور اُن کو گن گن کر لوگوں کو رقمیں ادا کرنی شروع کیں ہفتہ بھر گذر گیا لیکن بمشکل ہزار پونڈ ادا ہو سکے۔ اس عرصہ میں بے اعتباری کا طوفان فرو کر دیا گیا لوگوں پر بدخواہوں کی چال کھُل گئی بنک سے رقموں کا مطالبہ بند ہو گیا اور اس طرح پر بنک کی جان بچی۔ لیکن اس واقعہ سے لوگوں کو بہت عبرت ہوئی اور چند ہی روز بعد زر میں قانوناً مذکورالصدر تفریق قرار دیدی گئی۔

تقریباً ہر ترقی یافتہ اور خود حکمران ملک میں زر قانونی زر مستند پایا جاتا ہے یعنی جو سکہ بڑی رقموں کی ادائگی میں کام آتا ہے اُس کی قدر فلزاتی اور قدر قانونی تقریباً برابر ہوتی ہے حتیٰ کہ عوام سرکاری دارالضرب میں ساخت کے قلیل مصارف ادا کرتے پر اپنے سونے چاندی کے سکے تیار کرا سکتے ہیں۔ اگر سکہ کے ہر دو مذکورہ بالا قدروں میں کچھ فرق ہوتا ہے

تو صرف مصارف ساخت کے برابر۔ یعنی بمقدار مصارف ساخت قدر فلزاتی قدر قانونی سے کم ہوتی ہے۔ عوام کو سرکاری دار الضرب میں سکہ تیار کرانے کی اجازت کا نتیجہ یہ ہے کہ جب قدر فلزاتی قدر قانونی سے کم ہو جاوے (اگرچہ اس قسم کی کوئی قابل لحاظ تبدیلی کمتر ممکن ہے) تو لوگ بکثرت سکہ ڈہلواتے ہیں حتی کہ سونے چاندی کی قلت سے قدر فلزاتی بڑہ کر قدر قانونی کے برابر آ لگتی ہے۔ غرضکہ زر کی بڑی مقدار جو لبشکل زر قانونی رائج ہے اس کی قدر فلزاتی اور قدر قانونی مساوی ہوتی ہے۔ البتہ محدود زر قانونی جس کی مجموعی مقدار بھی مقابلۃً بہت کم ہوتی ہے بشکل زر وضعی جاری ہے اور اس کی خاص غرض صرف وجسامت سکہ کی موزونیت ہوتی ہے۔ لیکن بعض ملکوں میں جن کو ترقی یافتہ اقوام کی سرپرستی حاصل ہے اب تک زر وضعی کو زر قانونی قرار دے رکھا ہے مثلاً ہندوستان کا روپیہ زر وضعی ہے۔ اس کی چاندی دس آنہ سے زیادہ قیمتی نہیں لیکن اس کی قدر قانونی سولہ آنہ ہے اور یہی روپیہ زر قانونی بھی ہے کہ زر کی مقدار کثیر اسی شکل میں موجود ہے۔ علما معیشت زر وضعی کو بطور زر قانونی رائج کرنا سرکار کے حق میں باعث ننگ وعار قرار دیتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ سکہ کی اصلی غرض ومنشا اس امر کی تصدیق ہے کہ اس کے ہمقدر سونا یا چاندی اس میں موجود ہے۔ جب کہ لوگ سرکاری تصدیق پر اعتماد کریں تو کمتر قدر کے سونے یا چاندی کو سکہ کا ہمقدر بنانا سراسر دہوکا دہی اور ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ مقدار فرق قدر قانونی و قدر فلزاتی سرکار کو ایسے سکے بنانے میں نفع ضرور ہوتا ہے مثلاً روپیہ کی ساخت میں تخمیناً ۴۰ فیصدی منافع شامل ہے۔ لیکن روشن خیال حکومتیں ایسے منافع کو جائز نہیں سمجھتیں۔ یہی منافع لوگوں کو مصنوعی سکہ بنانے کی ترغیب دیکر خود اس جرم کا متحرک بنجاتا ہے اور اگر خدانخواستہ سیاسی انقلابات کی بدولت ایسے زر کی قدر قانونی اٹھ جائے تو صرف قدر فلزاتی باقی رہ جانے سے بمقدار فرق ہر دو قدر کل ملک کا مفلس ہو جانا ظاہر ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اخلاقی و نیز معاشی لحاظ سے زر قانونی زر مستند ہونا لازمی ہی البتہ محدود زر قانونی کا زر وضعی ہونا مضائقہ نہیں بلکہ اکثر سہولت افزا ہوتا ہی سکہ کے متعلق اب صرف ایک بحث باقی ہی وہ یہ کہ ہر ملک میں سکہ سازی کا حق سرکار نے اپنے لیے کیوں مخصوص کر رکھا ہی اور چیزوں کے مانند سکہ بنانے کی بھی کارخانوں کو اجازت کیوں نہیں دیجاتی اس تخصیص کا باعث سکہ کے خواص میں مضمر ہی اور بیشمار چیزیں تو برتنے کی خاطر خریدی جاتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہم خریدتے وقت اُن کی خوبی اچھی طرح پر تحقیق کر لیتے ہیں۔ لیکن زر بیشتر ایک آلہ مبادلہ ہی یعنی کہ اس کا استعمال سوائے اس کے کچھہ نہیں کہ دوسروں کو دیکر اس کے معاوضہ میں ہم ضروری سامان خریدیں اور اگر زر کی قدر از روئے قانون مقرر ہو تو سب سکے ہماری نظر میں یکساں ہی۔ خواہ اس کی قدر فلزاتی قدر قانونی سے کم ہو یا زیادہ۔ اور چونکہ خرید میں سب سے کم قیمت دینا خریدار کے حق میں مفید ہی۔ وہ ناقص یعنی کمتر قدر فلزاتی والے سکوں میں قیمت ادا کرے گا۔ اور چونکہ ایسے سکے زر قانونی ہوں گے۔ قدر قانونی کے حساب سے اُن کو قبول کرنا فروختندہ پر لازم ہوگا اور جب اس کی باری آئے گی تو وہ بھی ایسے ہی ناقص سکے دوسروں کو قیمت میں دیگا اور دوسرا اُن کو قبول کرنے پر اسی طرح مجبور ہوگا حتی کہ ناقص سکوں کا رواج بہت پھیل جائے گا۔ عمدہ سکوں کی حالت یعنی جن کی قدر فلزاتی و قدر قانونی برابر ہو۔ اس کے برعکس ہوگی۔ اول تو کاروبار میں چلانے کے بجائے بطور خزینۃ القدر لوگ اُن کو جمع کرکے رکھیں گے۔ یعنی جب کہ عمدہ اور ناقص سکے رائج ہوں تو عمدہ اندوختوں میں جاگزیں ہو جاتے اور ناقص رواج پاتے ہیں۔ دوم لوگ عمدہ سکوں کے ناقص سکے بنا بنا کر بہت منافع کما سکتے ہیں۔ سوم آگے چلکر واضح ہوگا کہ تجارت بین الاقوام میں کسی ملک کے زر کو دوسرے ممالک قدر فلزاتی کے حساب سے قبول کرتے ہیں۔ وہ قدر قانونی کیوں ماننے لگے۔ پس عمدہ سکے چھنٹ

حصہ چہارم
باب سوم

چھنٹ کر بیروں ملک چلے جاتے اور ناقص رہ جاتے ہیں۔ سکوں کا یہ خاصہ کہ ان میں سے عمدہ غائب ہو جاتے اور ناقص رواج پاتے ہیں۔ اس کے اولین محقق کے نام سے تعبیر پاکر قانون گریشم کہلاتا ہے۔ اس قانون کا عملدرآمد عام مشاہدہ ہے۔ جب سرکار نئے نئے روپیوں یا اشرفیوں کی کوئی مقدار جاری کرتی ہے تو وہ سب بہت جلد غائب ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی پورانے پورانے روپیہ زیادہ نظر آنے لگتے ہیں۔ اشرفی چونکہ زر مستند ہے اور روپیہ زر علامتی، ہندوستان میں اشرفیاں اس قدر غائب ہو رہی ہیں کہ دوسرے ملک والوں کو تعجب اور انگلستان والوں کو شکایت ہے۔

آخر یہ اشرفیاں کہاں جاتی ہیں؟ کچھ تو لوگ جمع کرتے ہیں اور جب کہ اشرفی کی قدر فلزاتی بحساب روپیہ اس کی قدر قانونی سے بڑھ جاتی ہے تو لوگ اس کو بطور سونا فروخت کرتے اور گلا گلا کر اس کا زیور تیار کراتے ہیں۔ اشرفی کی قدر قانونی ۱۵ روپیہ ہے لیکن وہ ۱۵ روپیہ سے زیادہ کو فروخت ہوتی رہتی ہے۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ بلحاظ مصنوعات سکہ کی حالت بالکل نرالی ہے۔ عام طور پر جو مال عمدہ ہوتا ہے وہی رواج پاتا ہے اور اسی کے بنانے والے کارخانوں کو عروج و منافع حاصل ہوتا ہے لیکن سکے ناقص ہو کر بہت زیادہ رواج پکڑتے ہیں اور ان کے بنانے والوں کو بہت ترقی اور منافع ملتا ہے۔

۔ عمدہ سکے غائب بھی بہت جلد ہو جاتے ہیں اور ان کے بنانے والے دوسروں کے ہاتھ سراسر احمق بنتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ایسی حالت میں اگر سکہ سازی کی اجازت کارخانوں کو ملجائے تو یقیناً چند ہی روز میں کل زر نہایت ناقص ہو جائیگا اور بعض ممالک میں ایسا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ اگر کہا جائے کہ سرکار کارخانوں کے بنے ہوئے سکوں کی جانچ پڑتال کرتی ہے تو یہ طریق نہایت طوالت و دقت طلب ہوگا اور پھر بھی

ناقص سکوں کا اجرا بند ہونے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اس سے ہزار درجہ بہتر یہ ہے کہ مقررہ وزن اور خوبی کے سکے سرکار خود اپنی نگرانی اور اہتمام سے تیار کرائے اور سکہ سازی عوام کے حق میں تعزیری جرم قرار دیدئیے۔

چنانچہ مدت ہوئی کہ ہر ملک میں سکہ سازی خاص حق شاہی قرار دیدیا گیا۔ اور اب سرکار کے اہتمام سے دارالضرب میں سکے ڈھلتے ہیں۔

جہاں زر مستند رائج ہے سرکاری دارالضرب میں عام لوگ ضروری مصارف ادا کرنے پر اپنے سونے چاندی کے سکے تیار کرا سکتے ہیں لیکن جہاں زر وضعی کا رواج ہے جیسا کہ ہندوستان میں عوام کو سکہ بنانے کی اجازت حاصل نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سکہ سازی سے معقول منافع ہوتا ہے اور اگر اجازت عام ہو جائے تو ملک بھر کا سونا چاندی سکہ ہی سکہ ہو جائے۔ اور کثرت سکہ سے جو دقتیں پیش آئیں وہ آگے چلکر قدر زر کے تحت میں بیان ہونگی۔ عوام کو سرکاری دارالضرب میں سکہ بنوانے کی اجازت ہونے نہونے کا طریق علی الترتیب آزادانہ سکہ سازی اور مخصوص سکہ سازی کہلاتا ہے انگلستان میں پہلا طریق رائج ہے اور ہندوستان میں آخرالذکر۔

فصل سوم

زر کاغذی

تجزیہ (۱) زر کاغذی کا رواج (۲) زر کاغذی کے اقسام (۳) زر کاغذی کی خوبیاں (۴) زر کاغذی کے نقائص

زر کاغذی کا رواج

(۱) بظاہر کس قدر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ دو دو انگل کاغذ کے پرزے اور یوں بکثرت زر کے طور پہ مستعمل ہوں۔ تمام ترقی یافتہ ملکوں میں زر کاغذی کا بہت رواج پایا جاتا ہے چنانچہ ہندوستان میں کئی کروڑہا روپیوں کے ہمقدر سرکاری نوٹ کاروبار میں بلا تکلف چل رہے ہیں اس واقعہ سے زر کی ایک بڑی خاصیت کا پتہ چلتا ہے جس کا اس سے قبل بھی جا بجا حوالہ دیا جا چکا ہے

اگر کاغذ کے ٹکڑوں پر چند من گیہوں، شکر، نمک یا روئی لکھدیں تو کیا کوئی اُن کو ان چیزوں کے بجائے قبول کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں تو کھانے پینے کے کام آتی ہیں اور کاغذ کے ٹکڑے اس لحاظ سے سراسر ناکارہ ہیں نیز اگر سونے چاندی کے سکے محض آرائش میں بطور زیور استعمال ہوتے اور مبادلہ میں اُن سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تو زر مسکوک کے بجائے زر کاغذی کا چلنا جو آرائش کے واسطے ناکارہ ہے محال تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ عام طور پہ کاروبار میں زر محض ایک آلہ مبادلہ شمار کیا جاتا ہے گویا خود زر سے سوائے اس کے اور کوئی کام لینا مقصود نہیں کہ اس کے ذریعہ سے دیگر اشیاء ضروریات حاصل کی جاویں۔ پس زر محض ایک حکمنامہ ہے کہ اس کے پیش کرنے پر ہر قسم کا سامان دستیاب ہو جاتا ہے اور سب لوگوں نے اس حکمنامہ کی تعمیل اپنے اوپر واجب قرار دیدی ہے اور جب زر محض ایک واجب التعمیل حکمنامہ قرار پایا کہ اس کے پیش کرنے والے کو لوگ اشیاء مطلوبہ مہیا کردیں تو خواہ یہ حکمنامہ دہات کے ٹکڑے پر منقوش ہو یا

کاغذ پر تحریر ہو اس کی تعمیل ہر حالت میں یکساں ہونی چاہیئے۔ چنانچہ جب تحقیق ہو گیا کہ سو روپے اور سو روپے والے نوٹ دونوں کا عمل مبادلہ میں یکساں ہے تو ان میں کوئی تفریق نہیں رہی بلکہ بوجہ سہولت نوٹ کو ترجیح حاصل ہو گئی۔ واضح ہو کہ زر کے رواج میں رسم و عادت کو بہت بڑا دخل ہے کسی زمانہ میں جب نوٹ نئے نئے جاری ہوئے تو لوگ ان کو قبول کرنے میں پس و پیش کرتے تھے مگر آج یہ حالت ہے کہ کاروبار میں روپیہ سے کمی بیش بیش نظر آتے ہیں۔ گوناگوں سہولتوں کی بدولت مصارف سفر کے واسطے تو گویا وہ مخصوص ہو گئے ہیں۔ اسی طرح پر کمی خرچ کے خیال سے لوگ منی آرڈر کے بجائے نوٹ رجسٹری یا بیمہ کرا کر زر بھیجنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کثرت استعمال سے لوگ زر کاغذی کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ آلہ مبادلہ کے علاوہ خزینۃ القدر کے طور پر بھی اس کو برتنے لگتے ہیں چنانچہ یورپ و امریکہ میں دولت مندوں کا لاکھوں روپیہ قیمتی اندوختہ اکثر نوٹوں کا ایک چھوٹا سا پلندہ ہوتا ہے جس کو وہ بآسانی اپنے ساتھ منی بیگ میں ہر کہیں لیجا سکتے ہیں ہندوستان میں بھی لوگ زر بشکل نوٹ پس انداز کرنے لگے ہیں۔ المختصر زر کاغذی کے رواج کی کثرت و وسعت دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ لوگ کیسے دھوکہ میں مبتلا ہیں۔ کاغذ کے ذرا ذرا سے بے قیمت ٹکڑوں کے معاوضہ میں خوشی خوشی لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیہ کا قیمتی سامان دیدیتے ہیں اور چند کاغذی پرزوں کے مالک بنکر اپنے آپ کو کروڑ پتی شمار کرنے لگتے ہیں۔ زر کاغذی کا روز افزوں رواج تو مسلم ہے۔ ذیل میں زر کاغذی کے اقسام خوبیاں اور نقص بیان کیے جاتے ہیں۔

(۲) زر کاغذی کے اقسام ذیل سے واضح ہوگا کہ وہ اول اول زر فلزاتی کا محض نمائندہ تھا مگر بتدریج اس کا رواج اور اعتبار اس قدر بڑھا کہ بذات خود زر بن بیٹھا۔

(۱) نیابتی زر کاغذی گویا اس زر فلزاتی کی رسید ہوتی ہے جو کسی بنک میں یا

حصہ چہارم
باب سوم

ساہوکار کے پاس جمع کیا جائے کسی زمانہ میں لوگ اپنا اندوختہ چوری وغیرہ کے خوف سے دوسروں کے پاس رکھ دیتے تھے اور اُن کو کچھ فیس بھی بطور معاوضہ نگرانی دیتے تھے۔ حالانکہ آج کل جو لوگ کچھ زر بنک میں داخل کرتے ہیں اُن کو خود بنک سود دیتا ہے۔ اس فرق کا باعث صاف ظاہر ہے پہلے زمانہ میں جمع شدہ زر کی صرف نگہداشت کیجاتی تھی اور اب اس سے کاروبار چلانا بھی نہایت سہل ہے اس زمانہ میں سونار خاص طور پر دوسروں کے اندوختوں کی نگہداشت کیا کرتے تھے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے مضبوط تہ خانے تیار رکھے تھے اور چوکیداروں کو بھی ملازم رکھتے تھے کل مصارف ادا کرنے پر بھی فیس نگہداشت سے ان کو کچھ ضرور بچ رہتا ہوگا ورنہ ایسی ذمہ داری وہ اپنے سر کیوں لینے لگے۔ جو شخص اس طور پر اپنا زر جمع کرتا تھا اس کو رسید دیجاتی تھی اور یہ رسید بطور نمائندہ زر بلا تکلف مثل زر جاری ہو جاتی تھی بنکوں کا رواج ہونے سے نگہداشت اندوختہ کا کام سناروں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن ایسا نمایندہ زر کاغذی بعض ممالک میں ابتک رائج ہے چنانچہ امریکہ میں لوگ اپنا زر مسکوک سرکاری خزانہ میں داخل کرکے اس کی باضابطہ رسید لے لیتے ہیں۔ اور یہ رسید مثل زر چلتی ہے کسی کو اس کے قبول کرنے میں عذر نہیں ہوتا اس رسید کا پیش کنندہ ہر وقت سرکاری خزانہ سے زر مندرجہ وصول کرنے کا مجاز ہوتا ہے سونے چاندی کے سکوں کی بڑی بڑی مقدار کس قدر وزنی ہوتی ہے اور اُن کے مقابل ان سرکاری رسیدوں کا استعمال کس قدر آسان ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۰۲ء کو امریکہ میں ایسی بیشمار رسیدیں بقدر دو ارب ساڑھے تینتیس کرور روپیہ جاری تھیں ان رسیدوں کو جدا جدا پروانہ طلا و نقرہ اور مجموعی طور پر نیابتی زر کاغذی کہتے ہیں۔

(ب) اعتباری زر کاغذی وہ نوٹ کہلاتے ہیں جن کو سرکار یا کوئی بنک اس وعدہ پر جاری کرے کہ اُن کے پیش کنندہ کو بوقت مطالبہ فوراً زر فلزاتی بقدر مندرجہ نوٹ ادا

کر دیا جائے گا - گویا وہ ادائیگی زر فلزاتی کے تحریری وعدے ہیں اور ان کے پیش کنندہ حسب چاہیں وعدہ کی تکمیل کرالیں - ایسے نوٹوں کے رواج کی بنا نوٹ جاری کرنے والے کا اعتبار ہوتا ہے - اگر عوام کو اس کے وعدہ پر پورا بھروسہ ہوگا تو لوگ بلا تامل ایسے نوٹ مثل زر استعمال کرنے لگیں گے - تکمیل وعدہ کی بھی کسی کو جلدی نہ ہوگی اور بہت سے نوٹ برسوں گھومیں گے اور اُن کو پیش کر کے زر فلزاتی کا مطالبہ کرنے کی نوبت نہ آئے گی - کثرت استعمال سے اول تو لوگ اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اُن کے پاس سالہاسال نوٹ رکھے ہیں مگر اُن کے بھنانے کا دل میں خیال تک نہیں گزرتا - مزید براں لوگ خود آپس میں نوٹوں کا زر فلزاتی ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں - جس طرح کہ روپیہ کے پیسے ملتے ہیں نوٹ کے روپیہ بھی اسی طرح ملنے لگے ہیں - مدتوں تک نوٹ جاری کرنے والے سے ادائیگی زر فلزاتی کا مطالبہ نہ کرنے سے ایک اہم نتیجہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ نوٹ جاری کرنے والے کو کل نوٹوں کے ہمقدر زر فلزاتی موجود رکھنا نہیں پڑتا بلکہ صرف ایک مناسب جزو مثلاً تیس یا چالیس فیصدی کفایت کرتا ہے -

فرض کرو کہ ایک کروڑ روپیہ قیمتی نوٹ جاری کیے جاویں - اب چونکہ یہ کل نوٹ ایک ہی وقت پیش نہیں ہو سکتے اور بہت سے مدتوں واپس نہ آویں گے دس کروڑ کے بجائے تخمیناً تین چار کرور روپیہ موجود رکھنا مطالبات ادائیگی پورے کرنے کے واسطے کافی ہوگا - اس طرح یہ گویا محض اعتبار کی بنا پر تین چار کرور روپیہ سے دس کروڑ کا کام چل سکتا ہے - واضح ہو کہ اعتبار میں اضافہ دولت کی بہت قابلیت ہے - اس واقعہ کی ہم آیندہ بھی تشریح کریں گے یہاں مجمل اشارہ کافی ہے -

بعض ممالک میں تو سرکار نے سکہ کی مانند نوٹ جاری کرنا بھی اپنے واسطے مخصوص کر لیا ہے اور کہیں یہ کام بہ پابندی قوانین بنکوں کے سپرد کر دیا گیا ہے - مثلاً ہندوستان میں

حصہ چہارم
باب سوم

نوٹ سرکار کی طرف سے جاری ہوتے ہیں اور ولایت میں بنک انگلستان نوٹ جاری کرتا ہی البتہ سرکاری قوانین کی پابندی اُس پر لازم ہی۔

زرفلزاتی کی جو مقدار ادائگی نوٹ کے واسطے موجود رکھی جاوے اصطلاحاً سرمایہ محفوظ زر کاغذی کہلاتی ہی۔ زرکاغذی اور اس کے سرمایہ محفوظ کی مقدار میں کیا نسبت رکھی جائے ایک نہایت دشوار اور معرکتہ الآرا مسئلہ ہی اور اس کا جواب ہر ملک کی معاشی حالت سے متعلق ہی۔ یہ طویل بحث بنک اور زرکاغذی کی ایک جداگانہ کتاب کے واسطے موزوں ہی یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

واضح ہو کہ اعتباری زرکاغذی کو بدل پذیر زرکاغذی بھی اس لیے کہتے ہیں کہ مطالبہ کرنے پر زرفلزاتی بقدر مندرجہ نوٹ فوراً مل سکتا ہی حالانکہ بعض زرکاغذی میں یہ صفت مفقود ہوتی ہی چنانچہ ایسی قسم ذیل میں بیان کیجاتی ہی۔

ج) رسمی زرکاغذی سب سے زیادہ عجیب زر ہی۔ نہ تو وہ جمع شدہ زرفلزاتی کی رسید ہوتی ہی اور نہ ادائگی زرفلزاتی کا وعدہ سمجھی جاتی ہی۔ بلکہ دو دو انگل کے بے قیمت پرزے بذات خود زر شمار ہوتے ہیں اور بیش قدر زرفلزاتی کی مانند چلتے ہیں۔ گویا کسی کاغذ کے ٹکڑے پر روپیہ چھاپ دیا اور وہ زرکاغذی بنکر رائج ہو گیا۔ یہی وہ زر ہی جو ٹھیٹ زرکاغذی کہلاتا ہی۔ اس کو انتہائی قسم کا زر وضعی سمجھنا چاہیئے کہ اس کی قدر قانونی قدر کاغذی سے صدہا گنی زیادہ ہو۔ حیرت ہو گی کہ لوگ ایسا زر کیونکر قبول کر لیتے ہیں اس میں شک نہیں کہ آج کل عام بیداری کے زمانہ میں محض قانون کے زور سے ایسے زر کا اجرا بالجبر محال ہی۔ لیکن بعض حالتوں میں عوام برضا و رغبت ایسا زر قبول کر لیتے ہیں جب کہ زرفلزاتی کی قلت ہو اور کاروبار کے واسطے زیادہ زر درکار ہو تو ایسی کمی زرکاغذی سے پوری کی جاسکتی ہی۔ کچھ رسم و عادت کی بدولت اور کچھ قانون گریشم کے عمل سے

اب ایسا زر بلا تکلف مدتوں تک رائج رہ سکتا ہے۔ چنانچہ بعض دور افتادہ مقامات میں وہ ابتک جاری ہے۔ اسی طرح پر اگر کوئی ملک جنگ میں مصروف ہو اور مصارف جنگ میں دیگر ممالک کو زر فلزاتی قدر فلزاتی کے حساب سے ادا کیا جاوے تو اندرون ملک میں زر کی قلت نمودار ہوتی اغلب ہے۔ مزید براں اندرون ملک مصارف جنگ کے واسطے بھی زر درکار ہوگا دریں حالت کچھہ وطن پرستی کے جوش میں اور کچھہ مجبوری کے خیال سے لوگ زر کاغذی قبول کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح پر روس امریکہ اور فرانس میں زر کاغذی رائج ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ انگلستان پر بھی ایسا نازک وقت آن پڑا تھا کہ ۱۷۹۷ء سے ۱۸۱۹ء تک نوٹوں کی ادائگی قانوناً بند کر دی گئی گویا اعتباری زر کاغذی محض رسمی زر کاغذی رہ گیا۔ لیکن چونکہ رسمی زر کاغذی انتہائی درجہ کا زر وصعی اور لہذا بدترین قسم کا زر ہوتا ہے روشن خیال حکومتیں اس کو پسند نہیں کر سکتیں اور اگر بحالت مجبوری اسکو کبھی جاری بھی کرتی ہیں تو مالی حالت بہتر ہونے پر جلد سے جلد اس کو زر فلزاتی میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ بہر حال رسمی زر کاغذی متعدد ممالک میں جاری رہ چکا ہے اور بعض میں ابتک بھی ہے نیز تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اگر زر فلزاتی کی قلت ہو اور زر کاغذی سے صرف یہی کمی پوری ہو اور بس۔ تو زر کاغذی قدر قانونی کے حساب سے چل سکتا ہے۔ لیکن اُس کی مقدار جتنی ہی بڑھے گی اس کی قدر بھی قدر قانونی سے گھٹے گی۔ چنانچہ اسی واقعہ سے ہم ابھی مضرتوں کے تحت میں بحث کریں گے۔

رسمی زر کاغذی کو غیر بدل پذیر زر کاغذی بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے پیش کنندہ سے زر فلزاتی بقدر مندرجہ ادا کرنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا جاتا اور نہ کوئی ایسی ذمہ داری لی جاتی ہے اعتباری زر کاغذی کی مانند رسمی زر کاغذی بھی یا تو سرکار بطور خود جاری کرتی ہے یا بنکوں کے ذریعہ سے۔ نیز واضح ہو کہ رسمی زر کاغذی کبھی تو شروع ہی سے علانیہ اس حیثیت سے

حصہ چہارم
باب سوم

جاری کیا جاتا ہے۔ اور کبھی اعتباری زرکاغذی بھی جاری کنندہ کی مجبوریوں سے غیر بدل پذیر ہوکر مدت دراز یاقلیل کے واسطے اس درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ نیز بعض رسمی زرکاغذی صرف وقت معینہ تک غیر بدل پذیر ہوتا ہے۔ جس کے گذرنے کے بعد سرکار بتدریج اس کو زرفلزی میں تبدیل کرنا شروع کر دیتی ہے اور بعض رسمی زرکاغذی ہمیشہ جاری رکھنا مقصود ہوتا ہے رسمی زرکاغذی میں زروضعی کی خرابیاں بدرجہ اولیٰ موجود ہیں البتہ اگر حالات موزوں میں مناسب مقدار جاری کیجاے تو قدر قانونی کے حساب سے اس کا چلنا دشوار نہیں لیکن بصورت دیگر رسمی زرکاغذی کی قدر اس کی قدر قانونی سے بدرجہا گھٹ جانی یقینی ہے۔

(۴۸) اگرچہ سونا نہایت بیش قیمت دہات ہے لیکن آج کل کاروبار کی مقدار اس قدر بڑہی ہوئی ہے کہ اگر خرید و فروخت میں سونے کے سکے بھی ادا کیے جاویں تو انکا وزن نہایت دقت طلب اور تکلیف دہ ہوگا۔ صرف لندن کے صرافے لمبارڈ اسٹریٹ میں اوسطاً دو کروڑ پونڈ یعنی تیس کرور روپیہ روزانہ کالین دین ہوتا ہے اور ہر ملک کے کاروباری مرکز میں ایسے بہت سے صرافے قائم ہیں اب اگر سونے کے سکہ ادائگی میں استعمال کیے جاویں تو صرف لندن کے صرافہ میں تخمیناً چار ہزار چار سو من وزنی سکے روزانہ درکار ہوں گے اور چاندی کے سکوں کا وزن سترہ ہزار من ہوگا۔ اگر سکوں کے اتنے بڑے بڑے وزن روزانہ منتقل کرنے پڑیں تو کاروبار چل چکا کوئی اور دہات تو ایسی دستیاب نہو سکی جس میں عمدہ زر کے مذکور الصدر خواص بھی موجود ہوتے اور جو اس قدر بیش قیمت ہوتی کہ بڑی بڑی مقدار قدر کی ادائگی میں بھی اُس کا وزن نہایت کم رہتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہیرے جواہرات سونے سے صدہا گنے قیمتی ہوتے ہیں لیکن بوجوہات معلومہ وہ بطور زر استعمال نہیں ہوسکتے بعض دہاتیں بھی مثلاً ریڈیم و پلیڈیم سونے سے بیش قیمت ہاتھ لگی ہیں لیکن چند تولوں سے زیادہ ابتک دستیاب نہیں ہوسکیں اور بحیثیت زر اُن کا حال بھی کم و بیش جواہرات کا سا ہی

پس سکوں کی گراں باری سے بچنے کے لیے چند در چند طریق ایجاد کیے گئے اُن میں سے ایک خاص تو زر کاغذی ہی اور باقی دو یعنی ہنڈی و چک علی الترتیب مبادلات خارجہ اور بنک کے تحت میں آیندہ بیان کیے جاویں گے۔

زر کاغذی کے ہلکے پن کا کیا کہنا۔ دو انگل کے پرزے پر جا ہے جتنی بڑی مقدار زر چھاپ دیجئے۔ دس دس ہزار کے دس ہندوستانی نوٹ لیکر ایک لاکھ روپیہ چھوٹے سے چرمی بٹوے میں رکھ لیجئے اور بلا تکلف ساتھ لیے پھرئیے۔ گویا دس روپیہ بھی بار جسیم ہیں۔ چنانچہ نوٹوں کی رواج کا ایک بڑا باعث اُن کا ہلکا پن ہی۔ ولایت میں سونے کے سکے بیشتر نوٹ بھنانے میں کام آتے ہیں۔ ورنہ اکثر بڑے بڑے لین دین نوٹوں کی شکل میں تکمیل پاتے ہیں حاصل کلام یہ کہ آج کل کے کثیر المقدار کاروبار کے واسطے سونے کے سکے بھی لغایت گراں بار ہیں۔ اور زر کاغذی کا ہلکا پن اس کے رواج کا ایک بڑا باعث ہوا ہی۔

زر کاغذی کی خوبی کے متعلق ایک یہ بحث بھی نہایت دلچسپ و نتیجہ خیز ہی کہ آیا اس سے دولت میں بھی کوئی حقیقی اضافہ ہوتا ہی یا نہیں۔ بظاہر تو یہ خیال کہ کاغذ کے ٹکروں پر زر کی بڑی بڑی مقدار چھاپ کر دولت پیدا کی جاسکتی ہی سراسر لغو اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہی لیکن غور اور مشاہدہ کے بعد معاملہ اس کے برعکس نظر آئے گا۔ زر کاغذی سے دولت میں ایک حد تک اضافہ ضرور ہوسکتا ہی اور ہو رہا ہی۔ لیکن یہ ناممکن ہی کہ زر کاغذی کی کوئی مقدار جاری کرکے ہم دولت میں حسب دلخواہ اضافہ کرسکیں۔ زر کاغذی کا اجرا نہایت دشوار معاشی فن ہی۔ جس میں بہت کم لوگوں کو مہارت تامہ حاصل ہوسکتی ہی۔ اس کے اصول دقیق اور پیچیدہ ہیں۔ اور ان کے عملدرآمد کے واسطے بیحد وسعت معلومات اور باخبری ضروری ہی۔ اجرائے زر کاغذی کے اصول سے یہاں مفصل بحث نہیں کی جاسکتی۔ اس کے واسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہی۔ یہاں صرف چند مثالوں سے یہ بتانا مقصود ہی

کہ زرکاغذی سے دولت میں کیونکر اضافہ ممکن ہی۔ نیز آگے چلکر نقائص کے تحت میں واضح ہوگا کہ کس حالت میں زرکاغذی اضافہ دولت سے معدود ہوسکتا ہی۔

اعتباری زرکاغذی کا رواج آج کل ہر ملک میں بڑھا ہوا ہی اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے، کیونکہ اس میں زرکاغذی کی بیشترین خوبیاں اور کمترین نقص پائے جاتے ہیں۔ ہلکے پن کی خوبی تو سب قسم کے زرکاغذی میں عام ہی۔ رہا اضافۂ دولت۔ نیابتی زرکاغذی سے تو صرف بوجہ ہلکے پن کے لین دین میں سہولت ہوتی ہی۔ دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کے ہمقدر زر مسکوک سرکاری خزانہ میں بیکار پڑا رہتا ہی۔

رسمی زرکاغذی انتہائی درجہ کا زر وضعی ہی اور اس کے کل نقائص بدرجۂ اولیٰ اس میں موجود ہیں۔ اس کے اجرا میں اگر پوری پوری احتیاط برتی جائے جو کہ نہایت دشوار ہی تو بطور زر فلزاتی اس کا رواج ممکن ہی اور اس طرح پر زرکاغذی کی جتنی مقدار رائج ہو وہ گویا دولت میں اضافہ شمار ہوگی۔ لیکن ذراسی بداحتیاطی سے اس کی قدر میں بیحد تخفیف ہوتی اغلب ہی۔ اس واقعہ سے نقائص کے تحت میں ہم ابھی پھر بحث کریں گے۔ یہاں یہ جتانا مقصود ہی کہ رسمی زرکاغذی کا استعمال بہت احتیاط طلب اور خطرناک ہی اس سے اضافہ دولت ممکن ہی لیکن ایسے اضافہ کا ثبات نہایت دشوار ہی۔ اکثر یہ ہوتا ہی کہ کچھ عرصہ بعد زرکاغذی کی قدر میں اس قدر تخفیف ہوتی ہی کہ کل اضافہ غائب ہوجاتا ہی اور عوام طرح طرح کی مالی دقتوں میں مبتلا ہوکر تباہ ہوجاتے ہیں اور ملک کی حالت درست کرنی دشوار پڑجاتی ہی۔ حاصل کلام یہ کہ نیابتی زرکاغذی سے تو دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور رسمی زرکاغذی سے جو اضافہ ہوتا ہی وہ دیرپا کم ہوتا ہی لیکن ان کے برعکس اعتباری زرکاغذی سے دولت میں اضافہ بھی ہوتا ہی اور وہ مقابلۃً دیرپا بھی ہی۔

اعتباری زرکاغذی کے مذکورالصدر خوبی کا باعث درحقیقت وہ میانہ روی ہی

جو اس کے اجرا میں اختیار کی جاتی ہے۔ تو نیابتی زر کاغذی کے مانند اس کا بمقدار زر فلزاتی بغرض ادائگی ہر وقت موجود رکھا جاتا ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ بیکار پڑا رہے اور نہ رسمی زر کاغذی کی طرح وہ بغیر کسی سرمایہ محفوظ کے جاری کیا جاتا ہے کہ زر فلزاتی سے اس کی ادائگی ممکن نہ ہو اور ذرا سی کثرت سے اس کی قدر بیحد گھٹ جائے بلکہ اعتباری زر کاغذی میں بقدر مندرجہ زر فلزاتی بوقت مطالبہ فوراً ادا کرنے کا وعدہ ہوتا ہے اور چونکہ زر کاغذی جاری کرنے والے پر لوگوں کو پورا اعتبار ہوتا ہے تو اس وعدہ کے تکمیل کی کسی کو عجلت نہیں ہوتی مدتوں لوگ نوٹ آپس میں برتتے اور بھناتے رہتے ہیں اور عرصہ بعد سرکاری خزانہ یا بنک میں بغرض ادائگی زر فلزاتی پیش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کل جاری شدہ نوٹوں کی مجموعی قدر کا صرف ایک متناسب حصہ بشکل زر فلزاتی بغرض ادائگی موجود رکھنا کافی ہوتا ہے۔ مثلاً دس کروڑ روپیہ کے نوٹ جاری کیے جاویں تو ان میں سے صرف تھوڑے تھوڑے ایک وقت میں ادائگی زر فلزاتی کے واسطے پیش کیے جاویں گے اور ہر وقت تخمیناً ۲۰۔۳۰۔۴۰ فیصدی زر فلزاتی بطور سرمایہ محفوظ موجود رکھنا ادائگی کے واسطے کافی ہوگا گویا اس طرح پر دو کروڑ روپیہ سے بذریعہ اعتباری زر کاغذی دس کروڑ کا کام نکلے گا۔ اور دولت میں بھی بقدر آٹھ کروڑ اضافہ ہو جائے گا۔ پس جب تک ہر وقت اُن کی ادائگی بشکل زر فلزاتی یقینی ہوگی اُن کی قدر میں تخفیف محال ہوگی۔ البتہ اگر کسی اہم انقلاب کی وجہ سے نوٹ جاری کرنے والے کا اعتبار گھٹ جائے تو قدر میں تخفیف ہونی اغلب ہے۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔

مدتہائے دراز تک اعتباری زر کاغذی مثل زر فلزاتی مقررہ قدر کے حساب سے جاری رہتا ہے اور اس کا باعث وہی اعتبار اور یقینی ادائگی زر فلزاتی ہے۔

۱۸۷۰ء کی مشہور جنگ فرانس و جرمنی میں فرانس بہت زیر بار رہا۔ اوّل تو بہت سا زر فلزاتی دیگر ممالک کو چلا گیا جہاں سے سامان جنگ خریدا جاتا تھا۔ دوم ایک رقم

کسر جزوی کو بطور تاوان دینی پڑی - زر کی بڑی قلت ہو گئی بالآخر فرانس نے بقدر ایک ارب روپیہ کے اندرون ملک زر کاغذی رائج کیا تب کہیں کام چلا اب اگر یہ رقم کثیر فرانس کسی دوسرے ملک سے قرض لیتا تو اس حالت میں اس کو کم از کم ۵ فیصدی کے حساب سے پانچ کروڑ سالانہ سود دینا پڑتا - اول تو زر کی قلت تھی - دوم قوم بیدار تھی اور اپنے نفع نقصان کو خوب سمجھتی تھی زر کاغذی کے اجرا میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور جوں جوں مالی حالت سدھرتی گئی زر کاغذی بھی زر فلزاتی میں تبدیل ہوتا گیا حتیٰ کہ اس کی مقدار گھٹتے گھٹتے رسمی زر کاغذی کے بجائے وہ اعتباری زر کاغذی بن گیا - یعنی زر فلزاتی کی کثرت سے ایسے نوٹوں کی ادائگی پورے طور پر یقینی ہو گئی - فرانس کی طرح دیگر ترقی یافتہ ممالک نے بھی مالی دقتوں کی حالت میں زر کاغذی سے فوری اضافہ دولت کا کام لیا ہے مگر بعد کو حالت بہتر ہوتے ہی زر کاغذی کی مقدار گھٹا کر اور زر فلزاتی کی بڑھا کر ان میں ایسا تناسب قائم کر دیا کہ زر کاغذی بجائے رسمی کے اعتباری بن گیا -

جزیرہ گرنسی کے گورنر نے اس کے شہر سینٹ پیٹرس میں ایک بازار تیار کرانا چاہا لیکن ضروری مصارف کے واسطے زر نہ تھا اس نے ساٹھ ہزار روپیہ کے قیمتی نوٹ تیار کرا کر ان کو زر قانونی قرار دیدیا اور جو لوگ بازار بنانے میں شریک تھے اُن کو اجرت میں وہی نوٹ دیئے - جب بازار تیار ہو گیا تو اس کی آمدنی سے چند ہی سال میں وہ کل نوٹ زر فلزاتی میں ادا کر دیئے اور اس طرح پر بظاہر ایک پیسہ صرف ہوئے بغیر ایک بڑی جائداد بن گئی -

زر کاغذی کا رواج ہر ترقی یافتہ ملک میں پھیلا ہوا ہے - فرانس میں تخمیناً پانچ ارب روپیہ قیمتی زر فلزاتی سے کاروبار چلتا ہے اور انگلستان میں صرف دو ارب سے اور لطف یہ کہ انگلستان کا کاروبار فرانس سے کہیں بڑھا ہوا ہے - علاوہ دیگر کاروباری طریق کے اس

فرق کا باعث زر کاغذی کا رواج بھی ہے۔

حصہ چہارم

باب سوم

اندازہ کیا جاتا ہے کہ صرف اعتباری زر کاغذی کے ذریعہ سے برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ میں زر نقد پچاس کروڑ بڑھا دیا گیا ہے۔ اور اس پر رقم کثیر بطور سود حاصل ہوتی ہے۔

لیکن یہ جتانا بے محل نہ ہوگا کہ زر کاغذی صحیح طور پر رائج کرنا بے حد دشوار کام ہے۔ اس کے اصول و طریق کی تفصیل نہایت پیچیدہ اور طویل ہے۔ خود ماہرین میں بھی بہت اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے۔ ہم نے چند خاص اصولوں کا حسب موقع مجملاً ذکر کردیا ہے۔ مفصل بحث کی موجودہ کتاب میں گنجائش نہیں۔ اس کے واسطے ایک جداگانہ کتاب موزوں ہوگی۔

زر کاغذی کے نقائص

(۴) زر کاغذی کے نقائص کی طرف اس سے قبل بھی جابجا اشارہ کیا جا چکا ہے یہاں اُن کو یکجا پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) زر کاغذی کی قدر از حد ضعیف البنیان ہے اگر سرکار مالی دقتوں میں مبتلا ہو کر نیابتی یا اعتباری زر کاغذی کو زر فلزاتی میں ادا کرنے سے مدت دراز تک معذور ہو جاوے یا حکومت کے انقلاب سے موجودہ زر کاغذی غیر مروج قرار دیدیا جائے تو لوگوں کے پاس دو دو کوڑی کے کاغذی پرزوں کے سوائے اور کیا باقی رہ جائے گا۔ گویا زر کاغذی کی قدر سراسر قانونی ہے اور وہ حکومت کی خوشحالی اور اس کے استحکام پر سرتاپا منحصر ہے۔ زر کاغذی کی قدر کاغذی تو ناقابل لحاظ ہے اس کے برعکس زر فلزاتی میں علاوہ قدر قانونی کے قدر فلزاتی بھی ہوتی ہے۔ زر مستند کے غیر مروج قرار پانے سے تو اس کی قدر میں بہت کم فرق پڑیگا۔ لیکن زر رسمی بھی غیر مروج ہونے کے بعد کچھ نہ کچھ قدر فلزاتی قائم رکھ سکیگا۔ زر کاغذی کی طرح وہ بھی سراسر بے قدر نہ ہو جاویگا سونا چاندی جیسی دھاتیں علاوہ زر کے اور بہت سے مصنوعات میں بھی کام آتی ہیں اور اگر بطور زر ان کا استعمال ترک بھی ہو جائے تو ان کی قدر میں کوئی انتہائی فرق نمودار نہ ہوگا قدر گھٹے گی ضرور مگر بہت زیادہ نہیں

حصہ چہارم
باب سوم

(ب) زر کاغذی کی قدر سراسر محدود اور مقامی ہوتی ہے۔ زر کی قدر قانونی تو صرف سلطنت متعلقہ کے اندر اندر قبول کی جاتی ہے۔ زر فلزاتی دوسرے ممالک میں بجائے قدر قانونی قدر فلزاتی کے حساب سے چلتا ہے۔ لیکن بلا تکلف چل سکتا ہے۔ اس کے برعکس چونکہ زر کاغذی کی قدر سراسر قانونی ہوتی ہے اور قدر کاغذی کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس لیے زر کاغذی دوسرے ممالک میں نہیں چل سکتا۔

واضح ہو کہ بعض زر کاغذی جن کی ادائیگی بشکل زر فلزاتی بغایت یقینی ہو دیگر ممالک میں بھی چند روزہ رواج پا سکتا ہے۔ مثلاً بنک انگلستان کے نوٹ دیگر ممالک میں بھی قبول کر لیے جاتے ہیں۔ لیکن وہ جلد انگلستان پہنچ جاتے ہیں۔ مدت تک اور بکثرت وہ دوسرے ممالک میں رائج نہیں ہو سکتے۔ اور رسمی زر کاغذی تو بیرون ملک محض کاغذی پرزہ رہجاتا ہے۔

(ج) قدر زر کے تحت میں آگے چلکر واضح ہوگا کہ اگر زر فلزاتی خواہ وہ زر مستند ہی کیوں نہو کاروباری ضروریات سے زیادہ مقدار میں جاری کر دیا جاوے تو اس کی قدر میں تخفیف ہو جاوے گی۔ پس جبکہ زر کاغذی جو سراسر زر وضعی ہے ضرورت سے زیادہ مقدار میں جاری کیا جاوے تو اس کی قدر کے اس سے کہیں زیادہ گھٹنے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ زر فلزاتی تو دھاتوں کی رسد پر منحصر ہے اور دھاتوں کی رسد محدود ہے۔ نیابتی زر کاغذی بھی زر فلزاتی کا پورا پابند ہے۔ اور اعتباری زر کاغذی کے اضافہ پر بھی ضروری سرمایۂ محفوظ حد قائم ہے لیکن رسمی زر کاغذی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ گورنمنٹ جس قدر چاہے چھاپ کر جاری کر دے۔ تجربہ سے بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ اگر رسمی زر کاغذی کی بھی مقدار مناسب حدود کے اندر اندر رکھی جاوے تو بلا دقت قدر قانونی کے حساب سے وہ چل سکتا ہے چنانچہ سنہ ۱۷۹۷ء سے سنہ ۱۸۱۹ء تک بنک انگلستان کے نوٹوں کی ادائیگی بشکل زر فلزاتی بند رہی اور بلا تخفیف قدر قانونی اس عرصہ تک وہ بطور رسمی زر کاغذی جاری رہے۔ بنک فرانس

کے نوٹ جو رسمی زر کاغذی ہیں اور قدر قانونی کے حساب سے بلا تکلف جاری ہیں تو وجہ یہ ہی کہ جاری کرنے والے ماہرین مالیات نے اُن کی مقدار نہایت مناسب کہی ہی۔ لیکن رسمی زر کاغذی کی تاریخ نہایت افسوسناک واقعات سے لبریز ہی۔ جس کو پڑھ پڑھ کر آج عبرت و ہدایت حاصل کی جارہی ہی۔ جب کہ رسمی زر کاغذی اوّل اوّل رائج ہوا تو اس کے اصول کا نہ پورا پورا علم تھا اور نہ اس کے عمل کا ٹھیک تجربہ۔ ایسے زر کے اضافہ میں چونکہ سوائے کاغذ چھپوانے کے اور کوئی دقت ہی نہ تھی۔ کبھی تو مالی ضروریات کے دباؤ سے اور کبھی حرص و طمع کے اثر سے رسمی زر کاغذی مقدار مناسب سے بہت زیادہ رائج کر دیا گیا جس کا نتیجہ از حد تخفیف قدر نکلا۔ مثلاً جنگ فرانس و جرمنی سے خستہ حال ہو کر اٹھارویں صدی کے آخر میں فرانس نے رسمی زر کاغذی جاری کیا جو ضرورت سے بیس گنا زیادہ تھا۔ اگر زر فلزاتی کی بھی اتنی زاید از ضرورت مقدار جاری کی جاتی تو اس کی قدر میں یقیناً تخفیف پیدا ہو جاتی اور پھر رسمی زر کاغذی کا تو کہنا ہی کیا ہی۔ اس کی قدر میں اس قدر تخفیف ہوئی کہ فروری ۱۷۹۵ء میں ایک جوڑا جوتہ ڈھائی ہزار روپیہ والے زر کاغذی کو فروخت ہوا۔

جب کہ زر کاغذی کی قدر میں تخفیف نمودار ہوتی ہی اور زر فلزاتی کی سابق قدر بحال رہتی ہی تو دونوں کی قدر قانونی مساوی ہوتی ہی۔ قانون گریشم کے مطابق زر فلزاتی جو کہ بہتر زر ہی غائب ہونا شروع ہوتا ہی اور زر کاغذی کہ جو بدتر زر ہی ہر طرف پھیل جاتا ہی۔ بالآخر کاروبار میں زر فلزاتی اور زر کاغذی کی قدر میں باوجودیکہ وہ مساوی القدر ہیں فرق نمودار ہو جاتا ہی۔ مثلاً بیس روپیہ قدر قانونی والا زر کاغذی دس بلکہ پانچ روپیہ قدر قانونی والے زر فلزاتی کا ہمقدر مانا جانے لگتا ہی۔ ساتھ ہی ساتھ تمام چیزوں کے دو نرخ قرار پا جاتے ہیں۔ بحساب زر کاغذی وہ گراں فروخت ہوتی ہیں اور بحساب

زر فلزاتی نسبتاً ارزاں مثلاً اگر ہم قیمت زر کاغذی میں ادا کریں تو بیس روپیہ قدر قانونی والا زر کاغذی طلب کیا جائے گا اور اگر زر فلزاتی میں تو صرف پانچ روپیہ کافی ہوں گے۔ روس۔ امریکہ اور فرانس کو شروع شروع میں زر کاغذی کی تخفیف قدر کا جو تلخ تجربہ اٹھانا پڑا وہ تاریخ زر کاغذی میں اب تک بطور عبرت وہدایت پیش کیا جاتا ہے۔

جب کہ زر کاغذی کی قدر میں تخفیف نمودار ہو تو ثابت ہوا کہ ضرورت سے زیادہ مقدار رائج ہے۔ پس مزید اجرا کو فوراً بند کر کے زر کاغذی کی مقدار گھٹانے کی فکر کرنی چاہئے اور اس کا آسان طریق یہ ہے کہ زر کاغذی جوں جوں سرکاری خزانہ میں آئے ضائع کر دیا جا حتیٰ کہ زر کاغذی اور زر فلزاتی قدر برابر ہو جائے اس طریق سے زر کاغذی کی مقدار گھٹانے میں سرکار کو فوری نقصان ضرور برداشت کرنا پڑیگا اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ سرکاری مصارف سے زاید ہو۔ اگر ضرورت سے زاید زر کاغذی کا رواج بحال رکھا جائے تو تخفیف قدر کی بدولت ملک ایسے بھنور میں پھنس جاویگا کہ اس سے کاروبار کی کشتی صحیح سلامت نکالنی دشوار ہو جائے گی۔ اور اجرا زر کاغذی سے ملک کو جو فوری نفع پہنچا ہو گا۔ اس سے بدرجہا زیادہ مضرت آخر میں اُٹھانی پڑے گی۔

مقدار زر کا تعین ہر ملک کی ضروریات اور معاشی حالت سے متعلق ہے اس کا کوئی عام اصول قرار دینا محال ہے۔ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مقدار ضرورت کے ہم پلہ ہو زیادہ نہ ہو۔

باب چہارم

تجارت بین الاقوام

تجزیہ (۱) قوم کا معاشی مفہوم (۲) تجارت بین الاقوام اور اُس کی صورتیں (۳) قدر و قیمت بین الاقوام (۴) اقسام تجارت (۵) آزاد تجارت (۶) تجارت ملوں (۷) تفریق اقوام (۸) دولت اور اسباب دولت (۹) زراعت اور صنعت و حرفت (۱۰) قوم کے معاشی وسائل اور اُن کا استعمال (۱۱) طریق تامین کی تعیین (۱۲) محصول تامین و محصول مال

قوم کا معاشی مفہوم

(۱) تجارت بین الاقوام کی بحث میں سب سے اول قوم کا مفہوم تشریح طلب ہے۔ سب جانتے ہیں کہ قوم میں وہ کل گروہ داخل ہے جو کسی خطۂ زمین میں آباد ہو۔ ایک حکومت کے تابع ہو۔ اور اکثر ایک ہی زبان بولتا ہو۔ نیز اُس میں اگرچہ مذہب اور رسم رواج کا یکساں ہونا لازمی نہیں مگر اغلب ضرور ہے۔ اس ملکی۔ سیاسی۔ مذہبی اور معاشرتی یکسانیت کا معاشی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محنت اور اصل قوم کے درمیان آزادانہ انتقال پذیر ہوتا ہے۔ حدود قوم کے اندر اندر تلاش روزگار مزدور بلا دقت گھومتے ہیں اور لوگوں کو شغل اصل میں بھی کوئی تامل نہیں ہوتا۔ قوم کی مذکورۃ الصدر تعریف مثبت ہے اور یہی سے منفی نتائج نکالے گئے ہیں جو قوموں کے مابین حد فاصل کا کام دیتے ہیں یعنی جب کہ دو گروہ میں مذکورہ بالا یکسانیت مفقود ہو مثلاً دور افتادہ خطوں میں آباد ہوں۔ مختلف زبانیں بولیں۔ مختلف حکومتوں کے تابع ہوں اُن کے مذہب اور رسم و رواج بھی جدا ہوں۔ تو اُن کے درمیان محنت و اصل مقابلتہً بڑی حد تک غیر انتقال پذیر ہوں گے۔ لہذا بجائے ایک قوم

کے وہ دو جداگانہ قوم شمار کئے جائیں گے۔ پس واضح ہوا کہ ازروئے معیشت قوم سے مراد انسانوں کے ایسے گروہ ہیں جن کے درمیان ملکی سیاسی۔ مذہبی اور معاشرتی یکسانیت کی بدولت محنت و اصل کافی طور پر انتقال پذیر ہوں۔ گویا ہر قوم کے مقابل باقی دیگر اقوام میں یکسانیت کے بجائے ملکی سیاسی۔ مذہبی یا معاشرتی اختلاف پایا جاتا ہے لہذا مابین اقوام محنت اور اصل بڑی حد تک غیر انتقال پذیر رہتے ہیں واضح ہو کہ محنت و اصل کی انتقال پذیری و غیر انتقال پذیری قوم کی ترکیب اور تفریق کے جو معاشی اصول قرار دیئے جاتے ہیں وہ خود بہت کچھ غیر معین ہیں۔ اور ان دونوں میں صرف کمی بیشی مدارج کا فرق ہے اور بس ورنہ عام بیداری اور ذرائع آمد و رفت کی سہولت کی بدولت محنت و اصل کی انتقال پذیری مابین اقوام بھی نسبتاً بہت بڑھ گئی ہے اور اُن کا قطعاً غیر انتقال پذیر ہونا محال ہے۔ اسی تذبذب کی بدولت بعض حالتوں میں عملی لحاظ سے قوم کی تفریق بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ لیکن اصطلاحات کا عدم تعین تو کل علوم تمدن اور خصوصاً معیشت کی عام کمزوری ہے۔ بہر حال اگرچہ مذکورہ بالا معاشی مفہوم بالکل معین اور قطعی نہیں تب بھی اکثر موجودہ اقوام پر وہ عاید ہوتا ہے اور عملی طور پر شناخت و تفریق اقوام میں قابل قدر مدد دیتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ حدود قوم کے اندر محنت و اصل بلا تکلف ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اُن کی یہی انتقال پذیری گویا قوم کی معاشی شناخت مانی جاتی ہے لیکن اس کے برعکس مابین اقوام محنت و اصل مقابلتہً کمتر نقل پذیر پائے جاتے ہیں۔ جس کو غیر انتقال پذیری سے تعبیر کرتے ہیں اور جو تفریق اقوام کا معاشی اصول قرار پا چکا ہے۔ مثلاً احاطۂ قوم کے اندر اگر اجرت یا شرح سود میں کہیں بقدر دس فیصدی اضافہ نمودار ہو تو اس سے مستفید ہونے کے لیے محنت اور خصوصاً اصل فوراً وہاں جا پہنچتا ہے۔ لیکن اگر حدود قوم کے باہر یعنی دوسری قوم میں اجرت و شرح سود بقدر ۲۰ فیصدی بھی زاید پائی جائے تو اصل اور خصوصاً

محنت کو مذکور الصدر دقت آمیز اختلافات کی وجہ سے وہاں جانے میں تامل ہوگا - اور
ایسی شرح فائدہ اٹھانا دشوار نظر آئے گا - لیکن وضح ہو کہ شاید ۵ فیصدی بیشی کے واسطے خود قوم
کے اندر اندر ہی محنت وصل انتقال گوارا کرے گا اور سو یا پچاس فیصدی اضافہ کی خاطر دوسری
قوم میں بھی پہنچ جائے تو عجب نہیں - پس صاف ظاہر ہی کہ محنت وصل کی اصطلاحی نقل پذیری
وغیر نقل پذیری میں صرف مدارج کا فرق ہی - یہ ہر دو صفات نہ قطعی ہیں نہ جداگانہ -

قوم کے مذکورہ بالا معاشی مفہوم سے واضح ہوا کہ محنت وصل کا آزادانہ مقابلہ بیشتر
ہر قوم کے اندر جدا جدا محدود ہی اگرچہ قیام امن توسیع ذرائع آمد و رفت عام سیلری اور
گوناگوں عام معاشی ترقیات کی بدولت محنت وصل دوسرے ملک اور قوموں میں بھی بہ نسبت
سابق بہت زیادہ دورہ کرنے لگے ہیں - تاہم اُن کی اندرون قوم اور بیرون قوم انتقال پذیری
میں قابل لحاظ فرق قائم ہی اور مابین اقوام محنت وصل کا مقابلہ ابھی تک ضعیف ضرور ہی
مقابلہ کے قوی اور ضعیف ہونے کا نتیجہ جو ہونا چاہیے موجود ہی ہر قوم کے اندر اندر تو آزادانہ
مقابلہ کے دباؤ سے شرح اجرت و سود تقریباً یکساں ہی - لیکن اکثر اقوام میں بمقابل یکدگر
اب تک مختلف شرح جاری ہیں - مقابلہ بین الاقوام اس قدر قوی نہیں کہ ان کو بھی ہموار
کردے -

المختصر ملکوں کے فاصلہ اور آب و ہوا - حکومت - زبان - مذہب اور رسم و رواج
کے اختلافات نے بنی نوع انسان و متعدد اقوام میں تقسیم کر دیا ہی ہر قوم میں محنت و اصل
کے آزادانہ مقابلہ سے شرح اجرت و سود ایک ایک سطح پر قائم رہتے ہیں - لیکن مزاحمت
مقابلہ کی وجہ سے قوموں میں بمقابل یکدگر اب تک مختلف شرحیں جاری ہیں - اس کی
مثال ایسی ہی کہ تالاب کے اندر دیواریں بنا کر پانی کی مختلف پست و بلند سطح قائم کر دی جائیں
حالانکہ دیواروں کے بغیر کل پانی کی سطح ایک ہوتی

حصہ چہارم (۴) ایک زمانہ تھا کہ تجارت ہر گاؤں اور قصبہ تک جدا جدا محدود تھی حتیٰ کہ آس پاس کی
ماحیہارم بستیوں سے بھی چیزیں شاذ و نادر خریدی جاتی تھیں اور علیحدہ مقامی پیداوار کو باھر
تجارت بھیجنے کی بھی نوبت کم آتی تھی جو چیز درکار ہوتی جو اس بستی میں تیار ہوتی اور جو چیز کہیں
بین الاقوام تیار ہوتی وہ کثرت وہیں صرف میں آجاتی تھی۔ آج تجارت کی وسعت کا کیا کہنا تمام دنیا پر
کی صورتیں اس کا جال پھیلا نظر آتا ہے۔ بیشمار قسم کا اربوں من مال و سامان ریل اور جہاز شب و روز لئے
پھرتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک اور بڑے بڑے شہروں کا تو ذکر کیا ہے۔ ہندوستانی دیہات کے کچے جھونپڑے میں بھی ناروے۔ سویڈن یا جاپان کی بنی ہوئی دیا سلائی سے جرمنی یا آسٹریا کی لالٹین میں روس، امریکہ یا برما کا مٹی کا تیل جلتا ہے تب کہیں اجالا ہوتا ہے۔ شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا حصہ ہو جہاں کی کوئی نہ کوئی چیز ہر مہذب اور خوشحال آدمی کے گھر میں موجود نہ ہو چنانچہ ایک معزز میزبان نے اپنی تقریر مابعد دعوت میں موجودہ ترقیات کا ذکر کرتے ہوئے بجا طور پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ دنیا میں کوئی قوم اور ملک ایسا نہ ہوگا جس نے اس دعوت کے اہتمام میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہو۔ گویا وسعت تجارت اور تقسیم عمل کی یہ نوبت آگئی ہے کہ خورد و نوش جیسی لابد ضروریات کی بہم رسانی میں بھی تمام ممالک کو شریک ہونا پڑتا ہے۔ پس بلحاظ ضروریات گوناگوں تجارت کی عالمگیری صاف ظاہر ہے۔

غور اور مشاہدہ سے واضح ہوگا کہ مختلف اقوام کے درمیان جو تجارت قائم ہے اس کی تین صورتیں ہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی صورت ہر ایسے ملک میں ضرور موجود ہوتی ہے جو تجارت بین الاقوام میں شریک ہو۔

(۱) جب کسی ملک میں کوئی ضروری چیز پیدا نہ ہو سکے تو مجبوراً شئے مذکورہ دوسرے ملکوں سے منگانی پڑتی ہے۔ تجارت بین الاقوام کی یہ سب سے مقدم صورت ہے۔ مثلاً یہ طریق اختیار کیے بغیر امریکہ چاء اور کافی سے محروم رہتا۔ انگلستان کو انگور اور سنگترے میسر نہ آتے۔ فرانس

کو تانبا دستیاب نہو سکتا - ہالینڈ کو عمارت کے واسطے پتھر نہ ملتا - غریب نارو ے نمک کو ترستا سوئٹزرلینڈ کوئلہ کو محتاج رہتا اور منطقہ حارہ کے پھل اور مصالحے یورپ بھر کو نصیب نہوتے -

تجارت بین الاقوام کی اگر یہ صورت صرف تعیشات تک محدود ہوتی تو زیادہ مضایقہ نہ تھا لیکن غضب تو یہ ہی کہ ناگزیر ضروریات بھی اس میں داخل ہو رہی ہیں - اکثر یورپین ممالک میں آبادی بلحاظ رقبہ اس قدر بڑھ گئی ہی کہ مقامی زرعی پیداوار کل آبادی کی خوراک کے واسطے سخت ناکافی ہی - اور اس پر طرہ یہ ہی کہ وہ صنعت و حرفت میں اس قدر مہمک ہیں کہ رہی سہی زراعت پر بھی توجہ کم کرتے ہیں - نتیجہ یہ ہی کہ اپنی روٹی کے واسطے وہ دیگر ممالک کی زرعی پیداوار کے محتاج ہیں خود انگلستان کو ہر سال سوا چار ارب روپیہ کا سامان خوراک دیگر ممالک سے خریدنا پڑتا ہی - تب کہیں اس کا گذر ہوتا ہی - اگر سامان خوراک کی درآمد کسی طرح پر رک جائے تو انگلستان کو چند ہی روز میں روٹی کے لالے پڑ جائیں - لیکن چونکہ انگلستان کے مقبوضات تمام دنیا پر پھیلے ہوئے ہیں - تجارت بین الاقوام کا مال بیشتر انگریزی جہازوں میں آتا جاتا ہی اور بیز برطانوی بیڑا دنیا میں کسی دو بڑی بڑی سلطنتوں کے بیڑوں کی مجموعی طاقت سے بھی سلسلہ طور پر بڑھا ہوا رہتا ہی - اس لیے انگلستان کو سامان خوراک کی درآمد بند ہو سکنے کا اندیشہ نہیں ہی - لیکن انگلستان کے علاوہ اور یورپین ممالک بھی مقامی پیداوار سے کل آبادی کو غذا مہیا نہیں کر سکتے اور خوراک درآمد سے کام چلاتے ہیں - اگرچہ یہ حالت فاقہ کشی سے بدرجہا بہتر ہی لیکن فی نفسہ کچھ کم اندیشہ ناک نہیں ہی غذا جیسی اولین ناگزیر ضرورت حتی الامکان مقامی پیداوار سے مہیا کرنی چاہیئے - سامان خوراک کی درآمد مدتوں تک خواہ کتنی ہی سہل اور مفید نظر آئے لیکن مآل اندیشی کے سخت منافی ہی - اور عجب نہیں اگر کبھی نہ کبھی اس کا عبرت آموز خمیازہ بھگتنا پڑے -

(ب) جب کسی ملک میں کوئی چیز پیدا تو ہو سکے مگر مصارف پیدائش بہت زیادہ

پڑیں تو تے مذکورہ ان ممالک سے منگا لی جاتی ہے جہاں پر وہ مقابلتہً ارزاں پیدا ہوتی ہو مثلاً فرانس چاہے تو خود بھی مشین تیار کرسکتا ہے لیکن بیشی مصارف کے خوف سے وہ اپنے واسطے مشین یا تو انگلستان سے خرید لیتا ہے یا امریکہ سے جہاں علاوہ لوہے اور کوئلہ کی کثرت کے مشین بنانے کا خاص اہتمام بھی موجود ہے اور اس لیے مشین ارزاں تیار ہوتی ہیں اس طرح پر امریکہ میں سیسہ کی اس قدر کانیں موجود ہیں کہ ان سے مقامی ضرورت پورے طور پر مہیا ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ کانیں عموماً بہت زیادہ گہری ہیں اور سیسہ کے مصارف پیدائش بہت زیادہ ہونے یقینی ہیں۔ پس امریکہ سیسہ کی بڑی بڑی مقدار دوسرے ملکوں سے خریدنا اپنے حق میں مفید سمجھتا ہے۔

(ج) اوپر کی ہر دو صورتوں میں درآمد والا ملک یعنی جو دوسرے ملک سے سامان منگاتا ہے سامانِ درآمد کو یا تو پیدا کر نہیں سکتا یا اگر کرے بھی تو اس قدر ارزاں نہیں جتنا کہ برآمد والا ملک کرتا ہے۔ ہر صورت بلحاظ پیدائش شے زیر بحث درآمد والا ملک برآمد والے کے مقابلہ میں پس ماندہ ہے بتجارت بین الاقوام کی عام صورتیں تو یہی دو ہیں لیکن کہیں کہیں ایک تیسری صورت بھی پائی جاتی ہے جو بظاہر عجیب بلکہ خلاف عقل معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ کبھی کوئی ملک ایسی چیز بھی دوسرے ملک سے منگانا اپنے حق میں مفید پاتا ہے جس کو برآمد والے ملک کے مقابلہ میں وہ خود ارزاں پیدا کرسکے۔ اس واقعہ کو ہم ایک نہایت سادہ مثال سے سمجھاتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک دن میں عمر چار جوتے یا چھ ٹوپیاں تیار کرسکے اور زید ۲ جوتے یا ۴ ٹوپیاں اس حالت میں اگرچہ عمر ٹوپیاں بھی زیادہ ارزاں تیار کرسکتا ہے مگر بہتر یہ ہوگا کہ وہ خود جوتے بنائے اور ٹوپیاں بنانا زید کے سپرد کردے۔ اس میں اول تو مجموعی پیداوار بڑھ جائے گی۔ مثلاً اگر عمر و زید جدا جدا جوتے اور ٹوپیاں بنادیں تو گویا ان دونوں کی دو روزہ مجموعی پیداوار (۴ جوتے + ۶ ٹوپیاں) + (۲ جوتے + ۴ ٹوپیاں) یعنی ۶ جوتے

اور ۱۰ ٹوپیاں ہوگی اور اگر عمر دو روز تک صرف جوتے بنائے اور زید ٹوپیاں تو مجموعی پیداوار
۸ جوتے اور ۸ ٹوپیاں ہوگی - زید کے ۲ جوتے برابر ہیں ۴ ٹوپی کے لہذا عمر کے ۴ جوتے برابر
ہیں زید کی ٹوپیوں کے اور عمر و زید کی ٹوپیاں یکساں ہیں - پس مذکورہ بالا ۶ جوتے اور ۱۰ ٹوپیاں
برابر ہیں (۱۲ + ۱۰) ۲۲ ٹوپی کے اور ۸ جوتے ۸ ٹوپیاں برابر ہیں (۱۶ + ۸) ۲۴ ٹوپی کے
گویا آخر الذکر پیداوار اول الذکر سے بقدر ۲ ٹوپی کے بیش قدر ہے - پس ثابت ہوا کہ اگر اول عمر و زید جدا
جدا ایک ایک روز جوتے اور ٹوپیاں بنائیں - اور پھر عمر دو روز صرف جوتے بنائے اور زید
صرف ٹوپیاں تو پیداوار بحالت دوم حالت اول سے بقدر دو ٹوپی زیادہ
رہی گی -

مذکورہ بالا تقسیم عمل غالباً ہر دو فریق کے واسطے مفید ہوگا اور مضر کسی کے حق میں نہیں
ہو سکتا - شرح مبادلہ تین طور پر قرار پا سکتا ہے یا تو چونکہ زید کے دو جوتے برابر ہیں ۴ ٹوپی کے
عمر اپنے ۴ جوتے کے مبادلہ میں زید سے ۸ ٹوپی طلب کرے اس حالت میں زید کو نہ نفع ہے
نہ نقصان مگر عمر کو ۲ ٹوپی کا فایدہ ہے کیونکہ ایک روز میں اس نے چار جوتے بنا کر ۸ ٹوپی سے
بدل لیئے - حالانکہ خود صرف ۶ ٹوپی بنا سکتا تھا - دوسری صورت یہ ہے کہ چونکہ عمر کی ۶ ٹوپیاں
برابر ہیں ۴ جوتوں کے - زید اپنی ۸ ٹوپی کے مبادلہ میں عمر سے (۸×۴/۶) ۱۶/۳ جوتے طلب
کرے - اس حالت میں عمر کو تو فائدہ یا نقصان نہیں مگر زید کو ایک جوتے سے کچھہ زیادہ کا فائدہ
ہے - وجہ یہ ہے کہ دو روز میں ۸ ٹوپیاں بنا کر اُس نے ۵⅓ جوتے عمر سے لے لیئے حالانکہ وہ خود
چار ہی جوتے بنا سکتا تھا - لیکن یہ تیسری صورت اغلب ہے کہ منافع کسی نسبت سے باہم تقسیم
کر لیا جائے مثلاً عمر اپنے ۴ جوتوں کے مبادلہ میں بجائے ۸ کے صرف ۷ ٹوپی قبول کرے
اس حالت میں عمر کو ایک ٹوپی کا نفع رہے گا - کیونکہ ۴ جوتوں کے بجائے وہ خود صرف ۶
ٹوپی بنا سکتا تھا - نیز زید کو ایک ٹوپی کی بچت رہی کیونکہ وہ خود آٹھ ٹوپی کے بجائے

حصہ چہارم
باب چہارم

چار جوتے تیار کرسکتا تھا اور عمر سے چار جوتے صرف ،ٹوپی کے عوض میں مل گئے گویا ایک ٹوپی کا نفع دونوں کو حاصل ہوا۔

یہاں پر فریقین کی اس مقدار محنت کے متعلق جس کی پیداوار کا مقابلہ کیا جائے ایک نکتہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کی مثال میں ہم نے عمر اور زید کی ایک ایک دن کی محنت لیکر اس کی پیداوار کا بلحاظ جوتہ اور ٹوپی مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ عمر کی محنت کی پیداوار زید سے بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن واضح ہو کہ عمر اور زید کی محنت مقدار مساوی ہونی ضروری نہیں۔ زید کی محنت کی مقدار خواہ عمر کی محنت کے مساوی ہو یا اس سے بھی زیادہ۔ دونوں حالتوں میں وہی نتیجہ نکلے گا جو اوپر اخذ کیا گیا۔ البتہ زید کی محنت کی مقدار عمر کی محنت سے اس قدر کم ہونی چاہیئے کہ زید کی پیداوار کا اوسط عمر کی پیداوار سے بڑھ جائے اور خود اصلی مفروضہ جس پر موجودہ مثال مبنی ہے کہ عمر بمقابل زید جوتے اور ٹوپی ارزاں بناتا ہے، غائب ہو جائے حاصل کلام یہ کہ ارزاں پیدا کرنے والے فریق کی محنت کی جو مقدار لی جائے فریق ثانی کی مقدار محنت اس کے مساوی ہونی ضروری نہیں۔ خواہ وہ مساوی ہو یا زیادہ۔ اور وہ کم بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن نہ اتنی کہ فریق اوّل کے ارزاں پیدا کرنے کے اساسی مفروضہ کو زائل کردے۔ اس مفروضہ کے بحال رہتے ہوئے فریق ثانی کی مقدار محنت خواہ کچھ لیجئے برابر۔ زیادہ یا کم۔ مذکورہ بالا نتائج ہر حالت میں صادق آئیں گے۔

عمر و زید کی مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ عمر کو جوتہ اور ٹوپی۔ دونوں چیزوں کے بنانے میں زید پر سبقت حاصل ہے۔ ایک روز میں عمر تو ۸ جوتے یا چھ ٹوپی بناتا ہے اور زید صرف دو جوتے یا ۴ ٹوپی لیکن سبقت کے مدارج مختلف ہیں۔ جوتہ میں تو بقدر سو فیصدی سبقت حاصل ہے۔ اور ٹوپی میں صرف بقدر ۵۰ فیصدی۔ یعنی جوتہ تو دو کے مقابل میں چار بناتا ہے

اور ٹوپی ۹ کے مقابل میں جیہ یس مقابلتہً جوتے میں زیادہ سبقت حاصل ہے اور نیز ثابت ہوچکا ہے کہ عمر کا جوتہ بنانا اور زید کا ٹوپی بنانا فریقین کے حق میں بہتر اور مفید ہے۔ ان دونوں واقعات سے ایک اہم معاشی قانون اخذ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب کہ کسی فریق کو خواہ وہ کوئی فرد ہو یا قوم۔ دوسرے فریق پر دو چیزوں کی پیدائش میں سبقت حاصل ہو لیکن مدارج سبقت مختلف ہوں تو جس چیز کی پیدائش میں مقابلتہً زیادہ سبقت حاصل ہو اُس کو تو خود پیدا کرے اور دوسری چیز کی پیدائش باوجود سبقت کے فریق ثانی کے سپرد کر دے اس واقعہ کو **قانون موازنہ مصارف** کہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عمر کی دونوں چیزوں کا مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ عمر کے ۹ جوتے ۸ ٹوپی کے ہمقدر ہو سکتے ہیں حالانکہ اتنی ہی محنت سے خود عمر صرف ۶ ٹوپی تیار کر سکتا ہے پس ثابت ہوا کہ عمر ٹوپی کے مقابلہ میں جوتے زیادہ ارزاں تیار کرتا ہے۔ ایک ہی مقدار محنت سے عمر بشکل جوتہ ٹوپی کے مقابل زیادہ قدر پیدا کرتا ہے۔ پس مقابلتہً عمر کے جوتے کے مصارف ٹوپی کے مصارف سے کم ہوئے اور اس لئے کمتر مصارف والی یعنی ارزاں چیز اس کو تیار کرنی چاہیئے۔ پس قانون موازنہ مصارف کا منشا یہ نکلا کہ جب کوئی دو چیزیں دو جگہ پیدا ہوں تو بطریق بالا اُن کے مصارف دریافت کیئے جاویں اور جو چیز جہاں کمتریں مصارف سے پیدا ہو اس کو وہیں پیدا کیا جائے۔ غور کرنے سے واضح ہوگا کہ جس طرح عمر کے جوتے اور ٹوپی میں مقابلتہً جوتے کے مصارف کم ہیں اسی طرح پر زید کی ٹوپی کے مصارف بمقابل اس کے جوتے کے کم ہیں۔ پس قانون موازنہ مصارف کی رو سے عمر کو جوتہ تیار کرنا چاہیئے اور زید کو ٹوپی۔ اس قانون کا عملدرآمد تو انفرادی مبادلوں میں بھی موجود ہوتا ہے لیکن تجارت بین الاقوام میں وہ بہت زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ کوئی کپڑا سینا اچھا جانے اور کھانا پکانا بھی مگر خود کپڑا سیئے اور باورچی ملازم رکھکر اپنا کھانا پکوائے تو غور کرنے سے واضح ہوگا کہ وہ اسی قانون موازنہ مصارف پر عمل کر رہا ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ

کہ دہلی میں مستورات کھانا پکانے میں وقت صرف کرنے کی بجائے دن بھر صنعت و دستکاری میں لگی رہتی ہیں اور کھانا بازار سے منگا کر گھر بھر کو کھلاتی ہیں ایسے معمولی رواج میں کیسا اہم اور عالمگیر قانون مضمر ہے۔

اوپر کی بحث سے واضح ہو گیا کہ کیونکر کوئی ملک ایسی چیز باہر سے منگانا مفید پاتا ہے جس کو وہ خود زیادہ ارزاں پیدا کر سکتا ہے۔ قانون موازنہ مصارف جو اس حیرت ناک واقعہ کی بنا ہے۔ اس سے ایک ایسا ہی اور عجیب نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے جو کہ موجودہ نتیجہ کا عکس سمجھنا چاہیے یعنی جب کہ کوئی ملک دو چیزوں کی پیدائش میں پس ماندہ ہو لیکن مدارج پس ماندگی مختلف ہوں تو باوجود پس ماندگی اس کے واسطے وہ چیز پیدا کرنی مفید اور ممکن ہو جس میں پس ماندگی سے کم ہو مثلاً اوپر کی مثال میں زید جوتہ بنانے میں عمر سے بقدر ۵۰ فیصدی پس ماندہ تھا۔ یعنی چار کے مقابلہ میں صرف ۲ جوتے بنا سکتا تھا اور ٹوپی بنانے میں بقدر ۳۳ فیصدی پس ماندہ تھا یعنی ۶ کے مقابل صرف چار ٹوپی تیار کر سکتا تھا۔ گویا مقابلتہً ٹوپی بنانے میں پس ماندگی کم تھی اس لیے اس کے حق میں ٹوپی بنانا ممکن اور مفید ثابت ہوا۔ تجارت بین الاقوام کی یہ تیسری صورت جو کہ قانون موازنہ مصارف پر مبنی ہے اگرچہ پہلی دو صورتوں کی مانند عام نہیں لیکن محض علمی اور خیالی بھی نہیں ہے۔ بعض ممالک کی تجارت بین الاقوام میں یہ صورت صاف نظر آتی ہے۔ جزیرہ کیوبا امریکہ کو شکر دیتا ہے اور اس سے گیہوں لیتا ہے۔ اگرچہ گیہوں کی پیدائش میں بھی اس کو امریکہ پر سبقت حاصل ہے۔ اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فرض کرو جس مقدار گیہوں کی پیدائش کے واسطے امریکہ میں چار مزدور کی محنت درکار ہو کیوبا میں دو مزدور کی محنت کافی ہو لیکن شکر کی جو مقدار امریکہ میں چار روز کی محنت سے پیدا ہو کیوبا میں اس کے

واسطے صرف ایک روز کی محنت کافی ہو۔ اس حالت میں کیوبا صرف شکر تیار کرے گا کیونکہ یک روزہ پیداوار شکر کے مبادلہ میں وہ امریکہ کی چار روزہ پیداوار گیہوں حاصل کر سکتا ہی جو خود کیوبا کے دوروزہ پیداوار کے مساوی ہی۔

گویا قانون موازنہ مصارف کے عملدرآمد سے کیوبا بوساطت امریکہ یک روزہ پیداوار شکر کے مبادلہ میں خود اپنی دوروزہ پیداوار گیہوں کی مقدار حاصل کر سکتا ہی۔

اسی طرح برجزیرہ جرسی میں اگرچہ مقابل انگلستان گیہوں ارزاں پیدا ہو سکتے ہیں لیکن آلو اس سے بھی کہیں زیادہ ارزاں پیدا ہوتے ہیں۔ پس جزیرہ مذکور خود آلو پیدا کرتا ہی اور گیہوں انگلستان سے خریدتا ہی۔

آسٹریلیا اور آئرلینڈ کے درمیاں بھی بعض چیزوں کی تجارت میں قانون موازنہ مصارف کا عملدرآمد بہت قوی اور واضح پایا جاتا ہی

اب بخوبی واضح ہو گیا کہ اگرچند ممالک تجارت بین الاقوام میں شریک ہوں تو ان میں سے ہر ایک وہ چیز پیدا کریگا جس کی پیدائش میں اس کو بمقابلہ باقی کل چیزوں کے دیگر ممالک پر سب سے زیادہ سبقت حاصل ہو یا سب سے کم پس ماندگی۔ یا یوں کہئے کہ مقابلتہً جس چیز کو وہ دیگر ممالک سے بحالت سبقت ارزاں ترین تیار کر سکے۔ یا بحالت پس ماندگی کمتر گراں۔

قانون موازنہ مصارف کے متعلق کچھ تشریح اور ضروری معلوم ہوتی ہی اوّل یہ کہ اس کے عملدرآمد میں سیدھا سادا مبادلہ فرض کیا جاتا ہی اور مبادلہ میں ہر فریق دوسرے کے چیز کی قدر کا تخمینہ اس قدر محنت سے کرتا ہی جو اس کو خود وہ چیز بنانے میں صرف کرنی پڑے۔ اور مبادلہ میں اپنی چیز زیادہ سے زیادہ اس قدر دے سکتا جو مذکورہ مقدار محنت سے وہ تیار کرے اگر کوئی فریق اس سے زیادہ چیز یا سامان طلب کرے تو فریق ثانی شے مطلوبہ خود تیار کر لیگا

حصہ چہارم
باب چہارم

پس مصارف پیدائش بحوالہ محنت شمار کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک وزکی محنت۔ بعض نے اس بحث میں مصارف بحوالہ زر بھی شمار کیے ہیں چنانچہ بغرض امتیاز دو جداگانہ اصطلاحیں بھی تجویز ہوگئیں مصارف بحوالہ محنت کو **مصارف پیدائش** اور مصارف بحوالہ زر کو **اخراجات پیدائش** کہتے ہیں۔ چند دقیق وجوہات سے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں طریق اول قابل ترجیح خیال کیا جاتا ہے اور ہم نے بھی یہی اختیار کیا ہے۔ نیز یہ بھی فرض کرلیا جاتا ہے کہ مصارف آمد و رفت اور محصول درآمد و برآمد اگر ادا کرنا بھی پڑے تو وہ اس قدر نہیں کہ فریقین کو قانون موازنہ مصارف پر عمل کرنے سے جو منافع حاصل ہو اس کو وہ غائب کردے خود قانون کے متعلق یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ چند چیزوں کی پیدائش میں دوسرے ملک پر محض سبقت حاصل ہونا کافی نہیں۔ بلکہ اس سبقت میں کمی بیشی بھی ضروری ہے۔ اگر سبقت سب چیزوں میں مساوی ہو تو قانون کا عملدرآمد نہو سکے گا۔ مثلاً ایک وز میں عمر چار جوتے یا چھ ٹوپیاں کرے اور زید ۲ جوتے یا تین ٹوپیاں گویا عمر کو جوتہ اور ٹوپی دونوں کے بنانے میں زید پر بقدر سو فیصدی یکساں سبقت حاصل ہے اس صورت میں عمر اور زید کا جدا جدا علی الترتیب جوتے اور ٹوپیاں بنانا یا ہر ایک کا دونوں چیزیں تیار کرنا یکساں ہے۔ ان کا باہمی مبادلہ نہ ضروری نہ مفید۔

حالانکہ اوپر کی مثال میں جب کہ عمر کو جوتہ بنانے میں بمقابلہ ٹوپی کے زیادہ سبقت حاصل تھی تو عمر کے صرف جوتے اور زید کے ٹوپی بنانے سے فریقین کو فائدہ ہوسکتا تھا اور قانون مصارف متقابل کا پورا عمل نمودار ہوتا۔

اس واقعہ سے بھی قانون موازنہ مصارف کی قابل قدر توضیح ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک ہی مقدار محنت سے ایک ہی ملک میں مختلف چیزوں کی جو مقداریں پیدا ہوسکتی ہیں اُن کی قدر بحوالہ ان ہی چیزوں کے اس مقدار کے جو کسی مقدار محنت سے

حصہ چہارم
باب چہارم

دوسرے ملک میں پیدا ہوں جدا جدا دریافت کرکے مقابلہ کیا جاتا ہے کہ کون چیز سب سے بیش قدر ہے اور چونکہ مقدار محنت مساوی ہے۔ ایسی ہی چیز سب سے ارزاں ہوگی گویا اس کے مصارف پیدائش مقابلتہً سب سے کم پڑیں گے اور یہی چیز پیدا کرنا اس ملک کے حق میں مفید ہوگا۔

پس وضح ہوگیا کہ مصارف جن کا مقابلہ کیا جاتا ہے وہ ہوتے ہیں جو خود اس ملک کی مختلف پیداوار سے متعلق ہوں۔ یہ خیال کرنا کہ ایک ہی چیز کے دو مقامات میں جو مصارف پڑتے ہیں اُن کا مقابلہ کیا جاتا ہے سراسر غلط ہوگا اور مذکورۂ بالا توضیح کے بعد اب اس دقیق مغالطہ کا اندیشہ نہیں جاننے۔

قدر وقیمت
بین الاقوام

(۳) یہ مسئلہ بھی نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے کہ تجارت بین الاقوام میں چیزوں کی قدر کیونکر قرار پاتی ہے۔ کس اصول کے مطابق مختلف چیزوں کی مختلف مقداروں کا باہمی مبادلہ ہوتا ہے۔ بعض مصنفین نے اس کی تحقیق میں بظاہر بہت جانکاہی اور عرق ریزی کی ہے۔ لیکن ان کی کوشش پر کوہ کندن اور کاہ برآوردن کی مثل صادق آتی ہے۔ پہلی دو صورتوں میں تو مبادلہ بیشتر قانون طلب و رسد کا تابع پایا جاتا ہے۔ مگر تیسری صورت میں مبادلہ پر موازنہ مصارف کی حد بھی قائم ہوجاتی ہے یعنی جب کہ ایک وقت میں عمر ۴ جوتے یا چھ ٹوپی اور زید ۴ جوتے یا ۸ ٹوپی تیار کرے تو گویا عمر کے ۴ جوتے برابر ہیں زید کی ۸ ٹوپیوں کے اور جس مقدار محنت سے عمر ۴ جوتے بناتا ہے اسی سے وہ خود ۶ ٹوپی بنا سکتا ہے پس ۴ جوتوں کی قدر کم از کم ۶ ٹوپی اور زیادہ سے زیادہ آٹھ قرار پائے گی۔ بالفاظ دیگر ۴ جوتوں کی قدر میں ۲ ٹوپی کے اندر اندر کمی بیشی ہوتی رہے گی اور یہی دو ٹوپی عمر کے ۴ جوتوں اور ۶ ٹوپی کے موازنہ مصارف کے فرق کی حد ہیں۔ چھ ٹوپی سے کم عمر قبول نہیں کرسکتا کیونکہ ۴ جوتوں کے بجائے اتنی ٹوپیاں وہ خود تیار کرسکتا ہے۔ اور آٹھ ٹوپیوں سے زیادہ زید گوارا نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ۸ ٹوپیوں کے بجائے ۴ جوتے وہ خود بنا سکتا ہے۔ قانون طلب و رسد کے عمل سے

غالباً کوئی ایسی شرح قرار پا جائے گی جس سے فریقین کو نفع ہو مثلاً ۴۸ جوتوں کے مبادلہ میں سات ٹوپیاں اس صورت میں عمر اور زید کو برابر برابر ایک ٹوپی کا فایدہ ہوگا۔

واضح ہو کہ تجارت بین الاقوام میں نہ صرف دو بلکہ بہت سی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے اور نہ صرف دو بلکہ متعدد ممالک کے درمیان مبادلہ ہوتا ہے۔ اس پیچیدگی سے شرح مبادلہ پر جو اثر پڑتا ہے اس کی تفصیل دریافت کرنی تو محال ہے۔ البتہ اس قدر تحقیق ہے کہ شرح مبادلہ ما تحتی قانون طلب و رسد موازنہ مصارف کی حدود کے اندر رہتی ہے اور مبادلہ کی پیچیدگیوں سے شرح میں اعتدال اور استحکام بھی ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ مصارف آمد و رفت اور محصول درآمد و برآمد بھی حسب حالات فریقین پر عاید ہو کر تعین شرح مبادلہ پر قانون موازنہ مصارف کے تحت میں اثر ڈالتے ہیں۔

چند مصنفین نے اس مبحث میں بڑی بڑی موشگافیاں دکھائی ہیں۔ اگرچہ اُن کی تحقیقات پر گونا گوں اعتراض بھی عاید ہوتے ہیں لیکن اگر اس کو بالکل صحیح مان لیا جائے تب بھی وہ کچھ زیادہ بارآور نہیں معلوم ہوتی اور بخوف طوالت و حیرانی اس کو کم از کم اس کتاب میں ترک کرنا ہی مناسب نظر آتا ہے۔

قدر بین الاقوام کی مذکورالصدر بحث میں سیدھا سادھا مبادلہ فرض کیا گیا ہے مروجہ آلہ مبادلہ یعنی زر کے استعمال کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ بالفاظ دیگر اب تک تجارت بین الاقوام میں چیزوں کی قدر قرار پانے کا اصول دریافت کیا گیا۔ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ان چیزوں کی قیمت کیونکر قرار پاتی ہے۔ قیمتِ بین الاقوام کی بحث بھی کچھ کم پیچیدہ اور طویل نہیں۔ یہاں صرف اس کا سیدھا سادھا لب لباب پیش کرنا کافی ہوگا۔ اس سے قبل جتایا جا چکا ہے کہ زر محض ایک آلہ مبادلہ ہے اور خرید و فروخت درحقیقت مبادلہ کا ایک طویل مگر سہولت افزا طریق ہے۔ انسان کو درحقیقت جو چیز مطلوب ہے وہ طرح طرح کا

سامان ہے جس سے احتیاجات رفع ہوں زر کو وہ محض اس لیے قبول کر لیتا ہے کہ اس سے کل ضروریات حاصل ہوتی رہتی ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی گروہ ہمیشہ سامان بیچ بیچ کر زر ہی زر لیتا رہے اور خود کچھ بھی نہ خریدے اور اگر وہ ایسا کر بھی سکے تو دوسرے گروہوں کے پاس اتنا زر کہاں کہ وہ ہمیشہ اس کو دیتے رہیں ہوتا یہ ہے کہ ہر گروہ اپنی پیداوار فروخت کر کے اور دوسروں کی پیداوار خریدتا ہے گویا درحقیقت تو مبادلہ ہی جاری ہے۔ استعمال زر کی وجہ سے وہ خرید و فروخت میں تقسیم ہو کر کبھی کبھی نظر آنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی حال مختلف قوموں کی تجارت کا ہے۔ جب دو ملکوں میں تجارت قائم ہوتی ہے تو وہ اپنی اپنی پیداوار ایک دوسرے کو بھیجتے رہتے ہیں یہ نہیں کہ ایک ملک ہمیشہ سامان بھیجا کرے اور دوسرا ہر قیمت نہ تو درآمد والے ملک کے پاس لاانتہا سونا چاندی ہے کہ وہ یوں قیمت ادا کرتا رہے اور نہ برآمد والے ملک کو سونے چاندی کی ایسی لامحدود ضرورت کہ وہ سوا سونا اور چاندی ہی فراہم کرے۔ ایک زمانہ میں بیشک یہ غلط خیال عام تھا کہ سامان برآمد کے معاوضہ میں جہاں تک ممکن ہو سونا چاندی درآمد والے ملک سے لینا چاہئے۔ لیکن جیسا کہ آگے چلکر واضح ہو گا یہ محض ایک سطحی مغالطہ ہے اس طور سے تجارت بین الاقوام کا قیام نہ تو ممکن نہ مفید۔ جب سے آدم اسمتھ نے اس کی حقیقت کھولی ہے یہ معاشی مغالطہ بھی تاریخ میں ایک دلچسپ یادگار رہ گیا ہے اور کچھ نہیں۔ تجارت بین الاقوام چلنے کا ایک ہی طریق ہے وہ یہ کہ جو ممالک شریک ہونا چاہیں اپنی اپنی پیداوار کا مبادلہ کریں۔ سامان تجارت میں سونا چاندی بھی شامل ہو گا۔ اور مذکورہ بالا اصول کے مطابق نہ تحت قانون طلب و رسد نیز پابندی قانون موازنہ مصارف اس کی قدر قرار پائے گی۔

قدر زر کی بحث سے آگے چلکر واضح ہو گا کہ زر کی قدر بھی مثل دوسری چیزوں کے قانون طلب و رسد کی پابند ہے زر کی مقدار بڑھنے سے اس کی قدر گھٹتی ہے اور مقدار گھٹنے

سے قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔ اب تجارت بین الاقوام میں چیزوں کی قیمت ایسی قرار پاتی ہے کہ اشیا درآمد و برآمد کی قیمت دونوں ملکوں میں برابر ہوجائے قیمت اشیا درآمد یا برآمد میں گاہ گاہ تھوڑا سا فرق ممکن ہے جس کی اصلاح سونے کی وساطت سے ہوسکتی ہے۔ مثلاً قیمت درآمد کی زاید مقدار بذریعہ سونے کے ادا کردے یا قیمت برآمد کی زیادہ مقدار وصول کرلے اور بفرض محال اگر چند سال تک بھی قیمت اشیا، درآمد زاید رہے اور درآمد والا ملک یہ زاید قیمت بشکل طلا وصول کرے تو اضافہ سونے کی بدولت اُس ملک میں زر کی قدر گھٹ جائے گی۔ گویا چیزیں گراں ہوجائیں گی اور سونا ادا کرنے والے ملک میں بوجہ کمی زر کی قدر بڑھ جائے گی یعنی چیزیں ارزاں ہوجائیں گی اور بالآخر ہر دو جانب کی تبدیلیاں ملکر ایسی ترکیب پائیں گی کہ قیمت اشیا، درآمد و برآمد قریب قریب مساوی ہوجانے سے کسی ملک کو سونا بھیجنے کی ضرورت بہت کم واقع ہو۔ چنانچہ آگے چلکر تجارت بین الاقوام کی تفصیل سے واضح ہوگا کہ قیمت درآمد و برآمد میں بالعموم ایسا توازن قائم رہتا ہے کہ سونے کی وصولی یا ادایگی کی نوبت کم آتی ہے۔ اکثر مال کے بدلے مال یا زیادہ سے زیادہ خدمات پیش کی جاتی ہیں زر محض حساب کتاب لکھنے میں بطور معیار قیمت کام دیتا ہے ورنہ قوموں کے درمیان مجموعی بطریق مبادلہ تجارت ہوتی ہے۔

جہاں تک اس کتاب میں گنجایش ہی قدر و قیمت بین الاقوام کے مسائل کا خاکہ پیش کردیا گیا لیکن سچ پوچھیے تو مسائل مذکور اس قدر پیچیدہ ہیں کہ خود ان کے محققین بھی کہیں کہیں حیران رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے علاوہ دیگر ممالک کے بیشتر مصنفین نے یا تو سرے سے ان مسائل کو تسلیم نہیں کیا اور بلحاظ قدر و قیمت تجارت داخلی اور تجارت خارجیہ میں انہوں نے کوئی فرق قرار نہیں دیا۔ بعض نے خود ان مسائل کو غلط و بے بنیاد ثابت کرنا چاہا اور جنہوں نے اُن کو صحیح بھی مانا اُن کو اس وجہ سے

ناقابل التفات قرار دیا کہ وہ اس قدر غیر معمولی مفروضات ہیں۔ ہیں کہ بعید از حقیقت ہو گئے ہیں۔ اس حالت میں کیونکر امید ہو سکتی ہے کہ اس کتاب میں جہاں مختصر بیان سے زیادہ کی گنجائش نہیں یہ مسائل صاف طور پر ذہن نشین کیے جا سکیں طویل تفصیل نظر انداز کر کے صرف ایک سادہ خاکہ محض اس غرض سے پیش کر دیا گیا کہ ار کم ان مسائل کا علم ہی ہو جائے رہا ان کا سمجھنا اور جانچنا اس کے واسطے بہت کوشش اور تفصیلی بحث درکار ہے۔

اقسام تجارت

(۴) تجارت خارجہ کی دو قسمیں ہیں **تجارت داخلہ** جو قوم کے درمیان قائم ہو اور **تجارت خارجہ** جو دیگر اقوام سے جاری ہو۔ پس دو یا زیادہ ملکوں کی تجارت خارجہ کا مجموعی نام تجارت بین الاقوام سمجھنا چاہیئے۔ تجارت خارجہ کی بھی دو مشہور عالم قسم ہیں **آزاد تجارت** اور **تجارت مامون** بحالت اوّل اپنی اور غیر ممالک کی پیداوار میں کوئی فرق اور امتیاز قائم نہیں کیا جاتا اگر کوئی چیز دوسرے ملک سے ارزاں دستیاب ہو سکے تو بلا تکلف اس کو منگا لیا جاتا ہے۔ ٹکس قائم کر کے اس کی درآمد نہیں روکی جاتی اور اگر کوئی چیز اپنے یہاں ارزاں پیدا نہ ہو سکے تو سرکاری امداد سے اُس کو ترقی دینے اور اس کی برآمد کا راستہ نکالنے کی کوشش نہیں کی جاتی حاصل کلام یہ کہ نہ کسی خاص اہتمام سے خارجی پیداوار کی درآمد بند کی جاتی ہے اور نہ ملکی پیداوار کی برآمد بڑھائی جاتی ہے۔ تجارت بین الاقوام کی مذکور الصدر تین صورتوں میں سے کسی نہ کسی کے مطابق تجارت جاری رہتی ہے اور اس سے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی جاتی۔ لیکن تجارت مامون کی حالت بالکل برعکس ہے۔ دیگر ممالک کی ارزاں پیداوار کی درآمد ٹکس کے ذریعہ سے روک کر اپنے ہاں کی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ کچھ عرصہ میں ملکی پیداوار بھی اسی قدر ارزاں ہو جائے اور خارجی پیداوار کی درآمد کی ضرورت ہی نہ رہے محض تامین پر اکتفا نہ کر کے ملکی پیداوار

کو سرکاری امداد بھی دی جاتی ہے تاکہ دیگر ممالک کی پیداوار پر بذریعہ ارزانی غلبہ پانے سے اُس کی برآمد بڑھے اور اپنے ہاں صنعت وحرفت کو اور بھی ترقی ہو۔ گویا ہر ملک حتی الوسع اپنی ہی صنعت وحرفت کو ترقی دیکر ملکی پیداوار سے قومی ضروریات مہیا کرتا ہے اور بشرط امکان دیگر ممالک کی صنعت وحرفت پر سبقت حاصل کرکے اپنی پیداوار کی برآمد بڑھانے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور صرف بحالت مجبوری ایسی چیزیں دوسرے ممالک سے خریدتا ہے جو اپنے ہاں پیدا ہونی بہت ہی دشوار ہوں۔ تجارت آزاد اور ماموں کا یوں فرق سمجھنا چاہیئے کہ بحالت اول مبادلہ کی موجودہ منفعت مقصود ہوتی ہے اور بحالت دوم معاشی ترقیات کے مستقبل فواید مدنظر رہتے ہیں مدت سے مباحثہ جاری ہے کہ ان دونوں میں تجارت خارجہ کی کون سی قسم بہتر ہے تجارت آزاد یا تجارت ماموں۔ اس مسئلہ پر دو زبردست گروہ قائم ہو گئے ہیں اور ہر ایک میں بڑے بڑے معتبر اور مستند علما معیشت شامل ہیں ایک گروہ کا دعوی ہے کہ تجارت آزاد ہر حالت میں ہر ملک کے حق میں مفید ہے دوسرے گروہ کو اس پر اعتراض ہے اُس کے خیال میں تجارت آزاد اول درجہ کے ترقی یافتہ ممالک کے حق میں تو بیشک مفید ہے۔ مگر موجودہ پس ماندہ ممالک کے حق میں بلاشک سخت مضر ہے اور کافی ترقی حاصل کرنے تک ایسے ممالک کو تامین تجارت کی اشد ضرورت ہے۔ علم المعیشت میں کسی دوسرے شعبہ پر اس کی نصف کتابیں بھی نہیں لکھی گئی ہیں جتنی کہ اس مبحث پر۔ اس کے متعلق ہزارہا نہیں توصدہا تصنیفات ضرور موجود ہیں۔ ان سب کا مطالعہ نہ سہل ہے اور نہ ضروری۔ اصول مختلف فیہ تو صرف چند ہیں۔ البتہ حمایت اور مخالفت کے جوش میں حریف کو قائل کرنے کی غرض سے ان پر طرح طرح کے رنگ چڑھائے گئے ہیں۔ بعض کتب ایسی منطقی دلائل سے لبریز ہیں جن کی عملی وقعت کچھ بھی نہیں۔ واقعات کو پس پشت ڈالکر اصول کی عجیب وغریب ترکیب سے کہیں اس طرح پر تائید وتردید نکالی گئی ہے جس طرح سے کہ ذہین

وکیل قانونی باریکیوں سے اپنے کمزور معاملہ کو بھی قوی کر دکھاتا ہے۔ لیکن جس مسئلہ سے قوموں کی ترقی و تباہی وابستہ ہو وہاں منطقی دلائل اور نازک خیالیوں کے بجائے اصلی حالات و واقعات کہیں زیادہ توجہ طلب اور فیصلہ کن ہیں۔ جہاں تک غور کیا حامیان تجارت آزاد اصول کے پردے میں خیالی بحث مباحثہ کی طرف مائل پائے جاتے ہیں اور تجارت ماموں کے طرفدار حقیقت اور واقعات پر زور دیتے ہیں۔ تجارت آزاد کی بہت کچھ معاشی اور منطقی استدلال کے ساتھ منادی اور تلقین کی گئی اور کی جارہی ہے۔ اوّل اوّل تو کچھ ملکوں میں اس کا رواج نکلا مگر چند ہی سال کے تجربہ کے بعد وہ ہر جگہ ترک کر دیا گیا اور ہر بیدار ملک نے تجارت ماموں کا طریق کہیں زیادہ مفید پاکر اسی کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ آج کل امریکہ۔ جاپان اور اکثر یورپین ممالک میں تجارت ماموں قائم ہے۔ جرمنی اور امریکہ اس کے خاص مرکز ہیں اور ان کی صنعت و حرفت کی ترقیات بھی اظہر من الشمس ہے۔ تجارت آزاد آج کل صرف انگلستان اور ہندوستان میں جاری ہے۔ انگلستان کی موجودہ حالت کو تو حامیان تجارت ماموں بھی تجارت آزاد کے واسطے موزوں او مناسب خیال کرتے ہیں۔ رہا ہندوستان بہت سے لوگ اس کی معاشی سست رفتاری کا خاص باعث یہی تجارت آزاد قرار دیتے ہیں۔ اور اُن کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کی تجارت تیس چالیس سال کے واسطے بھی ماموں کر دی جائے تو قدرت نے اس میں اس قدر معاشی ترقیات کے ذرائع ودیعت کر دیئے ہیں کہ صنعت و حرفت کی ترقی میں وہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ لیکن ہندوستان انگلستان کا تابع ہے اور دنیا بھر کے ترقی یافتہ ملک میں صرف انگلستان ہی تجارت آزاد کا حامی اور پابند ہے۔ پس بخیال خود اپنی تجارت کے برکات و فوائد سے ہندوستان کی محرومی وہ گوارا کرنا نہیں چاہتا۔ ہرچہ بر خود نہ پسندی بر دیگران مپسند۔ لیکن جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ ان ہر دو طریق تجارت کی مضرت و منفعت عام اور قطعی نہیں

حصہ چہارم
باب چہارم

بلکہ ہر ملک کے معاشی حالات پر منحصر ہے۔ ایک ہی چیز کسی کے حق میں سم قاتل اور کسی کے حق میں تریاق ہوسکتی ہے اور یہ خاصیت تجارت خارجہ میں بدرجہ اولیٰ پائی جاتی ہے تاہم اس مسئلہ پر سخت اختلاف رائے قائم ہے اور انگلستان کی نیک نیتی پر شک کرنا سراسر بیجا ہوگا۔

تجارت خارجہ کے ہر دو طریق کی جس جس انوکھے طور سے تائید اور تردید کی گئی ہے ان سب کی تفصیل بوجہ طوالت یہاں موزوں نہ ہوگی اور اگر سچ پوچھئے تو اصلی مسئلہ سمجھنے کے واسطے وہ ضروری بھی نہیں بلکہ اُن سے حیرانی کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ حریفوں کو قائل معقول کرنے کے جوش میں عجیب عجیب نکات نکالے گئے ہیں۔ جو گو مخالف کو ساکت کر دیں مگر مطمئن نہیں کر سکتے۔ ان کے مطالعہ میں منطق سے مسلح ہو کر ذہن مصروف بیکار نظر آتے ہیں۔ ذیل میں اس مسئلہ کے صرف کار آمد پہلوؤں پر روشنی ڈالنی مقصود ہے تفصیلی بحث کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے۔

تجارت آزاد

(۵) تجارت آزاد کا مفہوم اوپر بیان ہو چکا ہے نہ تو خارجی پیداوار پر وزنی ٹکس قائم کرکے اُس کی درآمد روکی جائے تاکہ ملکی پیداوار میں ترقی اور ارزانی نمودار ہو سکے اور نہ اس غرض کے لیے ملکی صنعت وحرفت کو سرکاری امداد دیجائے۔ بلکہ تجارت خارجہ میں کسی طرح کی مزاحمت نہ کی جائے اور تجارت بین الاقوام مذکورالصدر تین صورتوں میں سے کسی نہ کسی کے مطابق قائم ہو جائے تو بلا روک ٹوک اس کو جاری رہنے دے جس طرح کہ تجارت داخلہ میں سرکار دخل نہیں دیتی اسی طرح پر تجارت خارجہ میں بھی وہ الگ تھلگ رہے۔ تاجر جہاں سے جو چیز چاہیں خریدیں اور جو قیمت قرار پائے ادا کریں کاروبار میں مقابلہ جاری رہے اسی کے عمل سے خواہ کوئی فریق ترقی کرے۔ خواہ تنزل سرکار نہ اپنے ملک کی صنعت وحرفت کی خاص مالی امداد کرے اور نہ دوسرے ملکوں سے

درآمد روک کر اُن کی صنعت وحرفت کو دبائے سرکار کی ایسی مداخلت سے نفع کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مضرت کا قوی اندیشہ ہے۔ مثلاً سرکار خارجی ارزاں پیداوار پر ایسا وزنی ٹکس قائم کردے کہ اس کی درآمد رک جائے یا بہت گھٹ جائے تو پیداوار مذکور کی قیمت بوجہ قلت رسد بڑھنا یقینی ہے جس کی وجہ سے خریداران پر بہت بار پڑ جائے گا۔ جو چیز نہایت ارزاں فروخت ہوتی تھی وہ نہایت گراں ہو جائے گی۔ رہی اندرونی صنعت وحرفت ممکن ہے کہ باوجود تامین وہ حسب توقع ترقی کرے یا نہ کرے اور اگر کرے بھی تو اس کل نقصان کی تلافی نکر سکے جو دوران تامین میں بوجہ گرانی خریداران کو برداشت کرنا پڑا ہو۔ خود تامین کی ضرورت سے معلوم ہوتا ہے کہ صنعت وحرفت مذکور ملک کے واسطے موزوں نہیں اور جو چیز بحالت مقابلہ پیدا ہوتی تھی وہ کہیں زیادہ مناسب حال تھی غرضکہ درآمد روکنے سے بذریعہ گرانی خریداروں کو تو نقصان پہنچنا یقینی ہے۔ لیکن اول صنعت وحرفت مطلوبہ کی ترقی اور دوم نقصان خریداران کی تلافی اغلب بھی نہیں اس کے علاوہ جیسا کہ قدر وقیمت بین الاقوام کے تحت میں بتایا جا چکا ہے اور آگے بھی واضح کیا جائے گا۔ تجارت بین الاقوام سیدھا سادا مبادلہ ہے یعنی چیزوں کے معاوضہ میں چیزیں دیجاتی ہیں۔ قیمت بشکل زر ادا کرنے کی نوبت کم آتی ہے اور اگر ایسا ہوتا تو اربوں روپیہ سالانہ کی تجارت خارجہ چلنی کیونکر ممکن تھی۔ اگر خریدار ملک کے پاس گنج قارون بھی ہوتا تو ختم ہو جاتا۔ اور فروشندہ ملک اس قدر سونا چاندی لیکر کیا کرتا۔ مقدار زر جس قدر بڑھتی اُن کی قدر وقیمت بھی گھٹتی اور سونا چاندی زیور اور آرائش کی گنی چنی ضروریات مہیا کرتے ہیں ورنہ بیشتر وہ بطور خزینۃ القدر استعمال ہوتے ہیں لہذا اُن کی مقدار جس قدر ضرورت سے زیادہ بڑھتی اُسی قدر وہ کم قدر ہونے لگتے اور فروشندہ ملک کو سراسر نقصان اُٹھانا پڑتا۔ اس انتہائی مثال سے صرف یہ جتانا

مقصود تھا کہ قیمت درآمد بشکل ٹیکس ادا کرنا نہ خریدار ملک کے واسطے ممکن اور نہ فروشندہ ملک کے حق میں مفید۔ بلکہ تجارت بین الاقوام میں پیداوار کا پیداوار سے مبادلہ ہوتا ہے اور جب کہ بذریعہ ٹیکس کسی ملک کی درآمد روکی جائے تو اس ملک کی برآمد بھی گھٹنی یقینی ہے تاکہ درآمد و برآمد میں توازن قائم رہے۔ اس صورت میں اگر ملکی صنعت و حرفت کی ترقی بھی ہوئی تو برآمد گھٹنے سے کہیں زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ رہا دوسرا ملک اُس کی پیداوار کی اِس ملک میں درآمد رکنے سے اور اِس ملک کی پیداوار کی درآمد اُس ملک میں گھٹنے سے دوسرے ملک کا بھی نقصان اُٹھانا یقینی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر خارجی ارزاں پیداوار جس کی درآمد روکی جائے بوجہ موافقت آب وہوا دوسرے ملک کے واسطے خاص طور پر موزوں ہو یا وہ قانون تکثیر حاصل کی پابند ہو تو اس طرز عمل سے فریقین کو نقصان پہنچنا اور بھی یقینی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اوّل تو ملکی صنعت و حرفت کا بذریعہ تامین ترقی پکڑنا ہی بحث طلب ہے دوم باوجود ترقی بھی مضرت کا اندیشہ غالب ہے سوم مضرت اسی ملک تک محدود نہیں بلکہ دوسرا ملک بھی جو شامل تجارت ہے اس کا مورد بنتا ہے۔ پس یوں زبردستی ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینا اور خارجی بیجا مداخلت سے کل کاروبار کو برہم کر کے عوام کو دشواریوں میں مبتلا کرنا کہاں تک جائز اور مفید ہو سکتا ہے علی ہٰذا مالی امداد دے دیگر ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کامیاب ہونا دشوار ہے۔ امداد کا ہر ملک پر بار پڑتا تو بہر صورت یقینی ہے لیکن ممکن ہے کہ سہارا ملنے پر انفرادی کوشش سست پڑ جائے یا ترقی کی گنجائش ہی کم ہو اور امداد کا اصلی مطلب کافی طور پر حاصل ہو سکے مزید براں ایسی امداد سے کاروبار میں رشک و حسد نمودار ہوگا اور امداد کے خاو بیجا مطالبات ہونے اغلب ہیں جن کے پورا کرنے نہ کرنے میں سراسر نقصان ہوگا۔

تجارت بین الاقوام قدرتی حالات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے ہم کو وہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں جن کو یا تو ہم پیدا ہی نہیں کر سکتے یا پیدا بھی کریں تو اتنی ارزاں نہ کر سکیں اور اگر اتنی یا اس سے بڑھ کر بھی ارزاں پیدا کر سکیں تو اس وجہ سے نہ کریں کہ ہم مقابلتہً کمتر مصارف سے اس کے ہمقدر دوسری چیز تیار کر سکتے ہیں جو از روے قانون موازنہ مصارف ہمارے اور نیز فریق ثانی کے حق میں بھی مفید ہے۔ جیسا کہ مبادلہ کا عام خاصہ ہے تجارت سے مجموعی افادہ میں اضافہ ہوتا ہے اور فریقین کو کم و بیش نفع پہنچتا ہے جس کو اصطلاحاً **نفع المصرف** کہتے ہیں۔

پس ہر ایسے طرز عمل سے جو مبادلہ سے مزاحم ہو افادہ کا اضافہ بھی رکتا ہے اور فریقین بھی نفع سے محروم ہوتے ہیں۔ غرضکہ اصولاً مبادلہ میں مزاحمت مضر ہے اور تجارت بین الاقوام مبادلہ کی ایک وسیع شکل ہے۔ اور تامین تجارت مداخلہ کی ایک اہم صورت پھر تجارت ماموں اصولاً کس طرح پر جائز اور عملاً کیونکر مفید ہو سکتی ہے۔ ملکی پیداوار کی مستقبل موہوم ترقی کی خاطر۔ دیدہ و دانستہ موجودہ نفع کے بجائے کل متعلقین پر نقصان عائد کرنا حامیان تجارت آزاد کی نظر میں اس قدر خلاف عقل و دانش ہے کہ وہ فریق ثانی کی سمجھ پر حیرت اور افسوس کرتے ہیں کہ ایسی صاف بات بھی ذہن میں نہیں آتی

تجارت آزاد کی تائید کا ایک سادہ خاکہ پیش کیا گیا۔ اس میں دو نکات قابل توجہ ہیں جن سے ہم ابھی تجارت ماموں کے تحت میں بحث کریں گے اوّل یہ کہ مبادلہ میں فریقین کا کوئی امتیاز نہیں کیا گیا ہے خواہ ایک ہی قوم کے افراد ہوں خواہ مختلف اقوام مبادلہ ہر حالت میں یکساں مفید ہے۔ دوم مبادلہ کا موجودہ نفع تجارت کا مقصود قرار دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے تجارت بین الاقوام میں درآمد کو برآمد پر فوقیت دی جاتی ہے۔ گویا اصل مقصود تو درآمد ہوتی ہے اور برآمد محض بطور معاوضہ دی جاتی ہے

حصہ چہارم
باب چہارم

پس تجارت آزاد کا لب لباب یہ ہے جس طرح دو افراد باہم خرید و فروخت کرتے ہیں ایسے ہی مختلف اقوام آپس میں تجارت کرتی ہیں۔ مبادلہ فریقین کے حق میں بہر دو صورت مفید ہے اور سرکاری مداخلت یکساں ناجائز اور مضر ہوگی۔

تجارت ماموں

(۶) حامیان تجارت آزاد کے اصول اس قدر معقول اور بدیہی معلوم ہوتے ہیں کہ ان سے اختلاف کرنے والوں پر کم از کم کودن ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اول الذکر گروہ نے جھنجھلا کر کہیں اپنے حریفوں کی کم سمجھی پر حیرت و افسوس ظاہر کیا ہے اور کہیں اُن کی تنگدلی اور تاریک خیالی کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے منطقی دلائل اور بحث مباحثہ میں بڑا کمال دکھلایا ہے۔ لیکن جب فریق ثانی اپنی سیدھے سادے دلائل کے ساتھ واقعات کا عبرت ناک مرقع پیش کرتا ہے تو غیر جانبداروں کو ان سے اتفاق رائے کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔

تجارت ماموں کا مفہوم اوپر بھی بیان ہو چکا ہے۔ جو چیزیں بوجہ ارزانی دیگر ممالک سے آتی ہوں اُن پر ٹیکس قائم کر کے اُن کی درآمد روکنا تا کہ بوجہ قلت اُن کی قیمت ملک میں بڑھ جائے اور ملکی صنعت و حرفت جو بحالت موجودہ دیگر ممالک سے مقابلہ نہیں کر سکتی اس تامین کے سہارے سے بتدریج ترقی کر لے حتیٰ کہ تامین سے مستغنی ہو جائے یا نیز صنعت و حرفت کو سرکاری امداد دینا تا کہ بذریعہ ارزانی دوسرے ممالک پر وہ حاوی ہو جائے اور ملکی پیداوار کی برآمد میں اضافہ ہو۔ غرضکہ کسی نہ کسی طرح بر حتی الوسع ملکی پیداوار میں ترقی اور اضافہ ہو۔ درآمد تو صرف بحالت مجبوری گوارا کی جائے اور برآمد بڑھانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی جائے تا کہ معاشی تگ و دو میں اپنا ملک کسی سے پیچھے نظر نہ آئے۔

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ تجارت ماموں کے اغراض و مقاصد تجارت آزاد کے بالکل برعکس ہیں جبکہ ایک ہی قوم کے افراد کے بجائے مختلف اقوام فریق مبادلہ ہوں تو مبادلہ کے عام مسلّمہ فوائد مضرت کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کی ہم

حصہ چہارم
باب چہارم

اکی مزید تشریح کریں گے دوم مبادلہ سے اگر بوقت موجودہ کچھہ فائدہ حاصل ہوتا بھی ہو تو اس کی بجائے مستقبل معاشی ترقی ہزار درجہ قابل ترجیح شمار کی جاتی ہو اور اس ترقی کی خاطر نہ صرف موجودہ فوائد سے دست بردار ہونا پڑتا ہو بلکہ بشکل عارضی گرانی و سرکاری امداد مالی نقصان تک حوشی حوشی برداشت کرلیا جاتا ہو۔ گویا مبادلہ میں جب کہ مختلف اقوام شریک ہوں تو معاشی حالات کے مطابق فریقین کو نفع اور نقصان پہنچنا دونوں ممکن ہیں اور تجارت بین الاقوام میں سرکاری نگرانی اور مداخلت اس لیے ضروری ہو کہ کہیں پس ماندہ ملک ترقی یافتہ فریق کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوکر نہ رہ جائے۔

تجارت مامون کے مفہوم کے علاوہ مجملاً اس کے اغراض و مقاصد بھی بیان کردیے گئے ذیل میں اوّل اس کے اساسی اصول کی تفصیل بیں کی جاتی ہو بعدہ معاشی تاریخ کی شہادت پیش ہوگی تاکہ ناظرین خود فیصلہ کرسکیں کہ کس حالت میں تجارت خارجہ کی کون قسم موزوں اور مفید ہو تجارت آزاد یا تجارت مامون۔

تفریق اقوام

(۷) دنیا میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ ہر قوم کے بیشمار افراد میں طرح طرح کے تعلقات کی بدولت جمعیت قائم ہو وہ ایک ہی خطہ زمین پر رہتے سہتے ہیں۔ ایک حکومت کے تابع ہوتے ہیں۔ نیز اُن کا مذہب اُن کی زبان اُن کے رسم و رواج بالعموم یکساں ہوتے ہیں ورنہ کم از کم مدتوں یکجا رہنے اور ملنے جلنے سے اُن کے خیالات۔ عادات، اخلاق اور طرز معاشرت میں ضرور یکرنگی پھیل جاتی ہو اور باوجود گوناگوں اختلافات کے پھر بھی اُن میں ایک ایسی یگانگت پیدا ہوجاتی ہو جو ان کو ایک جداگانہ قوم کی شکل میں باہم جکڑ دیتی ہے لیکن جس طرح کروڑہا انسان مل ملکر قومیں بن گئے۔ سب قومیں آپس میں متحد ہوکر ایک عالمگیر قوم نہ بن سکیں۔ ہر قوم ایک جداگانہ خطۂ زمیں پر آباد ہو کہ جن کے درمیان پہاڑ، سمندر، بُعد مسافت اور اختلاف آب و ہوا جیسی قدرتی حدود قائم ہیں۔ کہیں زبان۔ مذہب

اور طرز معاشرت کا فرق قوموں کی علیحدگی کا باعث نظر آتا ہے اور کہیں قدیم تنازعات کی بنا پر جداگانہ قومیں بن گئیں جو تنازعات ختم ہونے پر بھی قائم رہیں۔

حاصل کلام یہ کہ افراد میں تو شکل قوم جمعیت پیدا ہو گئی لیکن قوموں میں کوئی ایسا عام اتحاد قائم نہیں ہوا کہ ان کو گھلا ملا کر ایک عالمگیر قوم بنا دیتا۔ ہر قوم اپنا جداگانہ وجود چاہتی ہے اپنے عروج اور ترقی کی فکر میں لگی ہوئی ہے اپنا اقتدار بڑھانے میں مصروف ہے دوسری قوموں پر سبقت حاصل کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہی ہے اور دوسروں کو اپنا ماتحت اور مطیع بنانے کی آرزو سے بیچین رہتی ہے اور موقع ملنے پر کبھی نہیں چوکتی ہر روشن خیال اور حوصلہ مند فرد وطن پرستی اور قوم پرستی کو فرض اولیں قرار دیتا ہے۔ بنی نوع انسان کی بہبودی کے منصوبے بھی تجویز ہوتے رہتے ہیں لیکن قومی منفعت کے مقابلہ میں وہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوتے ہیں۔ ذرائع آمدورفت کی سہولت وکثرت۔ اشاعت تعلیم اور عام بیداری کی بدولت تمام ممالک عالم میں بیگانگی گھٹ رہی ہے بلکہ معاشی ترقیات نے اُن کو نہایت قوی تعلقات سے جکڑ دیا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ بین الاقوام معاشی تعلقات امن کے سب سے معتبر ضامن ہیں لیکن بار بار تجربہ ثابت کر رہا ہے کہ قوموں سے انانیت محو نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کیسے تعجب کی بات ہے کہ جن اسباب سے بیگانگی گھٹتی اور تعلقات بڑھتے ہیں وہی اسباب رنگ بدل کر باہمی تنازعات اور جنگ کی بنا قرار پا جاتے ہیں چنانچہ ترقی یافتہ اقوام میں ملک گیری سے کہیں بڑھکر معاشی تسلط کی جد وجہد جاری ہے اور ذرائع آمدورفت کی سہولت و عام بیداری سمند مقابلہ پر تازیانہ کا کام دے رہی ہے۔

غرضکہ قوموں میں نفسی نفسی پھیلی ہوئی ہے کبھی کبھی دائمی عالمگیر امن وامان کا سبز باغ دکھائی دیا بھی تو بار بار کے تلخ تجربے سے اب وہ نظر سے غائب ہوتا جاتا ہے۔ کچھ

نظام عالم ہی یوں قرار پایا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے افراد مل جلکر بشکل قوم رہیں اور ہر قوم اپنے اپنے قیام اور ترقی میں کوشاں رہے۔ جب کہ قومی وجود اور ترقی نصب العین اول قرار پایا تو حکومت کل افراد قوم کے اعمال پر ضروری پابندی اور نگرانی قائم رکھتی ہے۔ تاکہ نصب العین بدرجہ اولیٰ پورا ہو اور اس کو کسی طرح پر مضرت نہ پہنچ سکے چنانچہ قانون سازی کا عام اصول ہے کہ بہبودی عوام کو بہبودی افراد پر ترجیح دی جاتی ہے پس ہر باخبر اور ذی ہوش قوم اپنے قیام اور ترقی کی فکر کرتی ہے اور اگر اس کے ضمن میں کسی دوسری قوم کو مضرت پہنچے تو پروا نہیں اور کچھہ نفع ہو تو مضایقہ نہیں۔ اس غرض کے واسطے اوّل معاشی استحکام لابدی ہے اور اس کے بعد فوجیں۔ بیڑے اور سامان حرب ضروری۔ جو کہ معاشی استحکام بغیر میسر آنے محال ہیں۔ حاصل کلام یہہ کہ ہر قوم کو اپنا قیام اور عروج مطلوب ہے اور گوناگوں انقلابات کی بدولت معاشی استحکام اس کا سب سے کارگر آلہ ہے۔ موجودہ جنگ یورپ میں جرمنی کے حیرتناک طاقت کے اسباب خواہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں لیکن سب کو معلوم ہے کہ معاشی ترقی ہی کی بدولت اب تک اس کا دم خم باقی ہے۔ ورنہ کب کا گھٹنوں کے بل گر پڑا ہوتا۔ اب سوال ہوتا ہے کہ معاشی استحکام سے آخر کیا مراد ہے۔ خدا نے ہر ملک میں قسم قسم کی چیزیں پیدا کی ہیں اور ہر قوم کو طرح طرح کی قابلیتیں عطا کی ہیں کل قابلیتوں کو صرف کر کے کل خداداد نعمتوں سے بدرجہ اتم مفید ہونا اور اپنی ضروریات کے واسطے دوسری قوموں کا کم سے کم محتاج ہونا اور بشرط امکان خود دوسروں کی ضروریات مہیا کرنا اس کا نام معاشی استحکام ہے۔ ہر قوم ایک جسم ہے۔ اس میں بہت سے اعضا ہیں اور ہر عضو کا نام جداگانہ اور مخصوص۔ جسم کی طاقت اور تندرستی جبھی ممکن ہے کہ ہر عضو صحیح سالم رہ کر اپنا کام بطریق احسن سرانجام دے۔ یہہ کیا کہ ہاتھوں کو تو خوب قوی کر لے اور ٹانگوں کو ایسا بیکار کر ڈے کہ دوسروں کے سہارے بغیر قدم نہ اٹھا سکے

حصہ چہارم
باب چہارم

جسمانی نشو و نما کی ایسی عدم نمائش کا مجموعی نتیجہ ضعف اور بیچارگی ہوگا۔ اگر کسی کو سدا گود میں اٹھائے اٹھائے پھریے اور راستہ چلنے کو جگہ نہ دیجئے تو اس کی ٹانگیں بیکاری سے روز بروز کمزور ہوتی چلی جاویں گی حتیٰ کہ بالآخر وہ چلنے سے قطعی معذور ہو جائے تو عجب نہیں۔ ترقی یافتہ اور پیشرو قومیں اپنے موجودہ نفع کی خاطر اور نیز مستقل رقابت کے اندیشہ سے پس ماندہ مگر ہونہار اقوام کو اس قدر کثرت سے اور اتنی ارزاں چیزیں مہیّا کر دیتی ہیں کہ باوجود ملک صنعت و حرفت کی بیحد گنجائش ہونے کے ان کو اپنی معاشی قوت بڑھانے کی نہ ضرورت محسوس ہو اور نہ صورت نظر آئے کسی ایسی پیداوار خام کی بہم رسانی کہ جو ترقی یافتہ ملک میں دستیاب نہ ہوسکے اس غریب کے سپرد کر دیجاتی ہے اور وہ تیلی کے بیل کی طرح ایک ہی کام میں ہمیشہ چکر لگاتی رہتی ہے صنعت و زراعت کے معاشی ترقیات سے جو تعلقات ہیں اُن کا فرق ہم ابھی مفصل طور پر واضح کریں گے یہاں پر اتنا واضح ہوگیا کہ محض ترقی یافتہ اقوام کی خود غرضی کا شکار ہو کر ایک پس ماندہ مگر ہونہار ملک کو صرف اسی کام پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو دوسری قومیں اس کے سپرد کریں اور قدرت نے دوسرے کاموں کی جو قابلیت اس میں ودیعت کی ہے۔ وہ بیکاری سے بالکل زائل ہو جاتی ہے اور اگر سپرد شدہ کام اُس کے حق میں مفید بھی ہو تو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اُس کی معاشی استحکام کو صدمہ ضرور پہنچتا ہے اگر ترقی یافتہ ممالک کسی وجہ سے وہ خاص چیز اس ملک سے خریدنا چھوڑ دیں تو یہ غریب تو کہیں کا بھی نہ رہے نہ اُس کی پیداوار اس کے کام آئے نہ اس کو دیگر ضروریات میسر آسکیں۔ پس جب کہ کوئی قوم پس ماندہ ہو مگر اُس کے افراد میں صنعت و حرفت کی قابلیت موجود ہو اور ملک میں پیداوار خام بھی ہو تو ترقی یافتہ ممالک سے ارزاں مصنوعات کا سیلاب روکنے کے لیے ٹکس درآمد کی ایک مضبوط اور بلند دیوار قائم کرنی اشد ضروری ہے۔ تاکہ اس ہونہار ملک کی صنعت و حرفت

حصہ چہارم
باب چہارم

جو ابھی عالم طفولیت میں ہی اس طرح محفوظ رہ کر کچھ عرصہ میں اتنی ترقی کرلے کہ دیگر ممالک سے مقابلہ کر سکے اُس وقت دیوار ٹیکس منہدم کر دینے میں کچھ پس و پیش نکرنا چاہیئے اور قیام ٹیکس کے دوران میں بوجہ گرانی اگر افراد قوم کو مالی بار بھی برداشت کرنا پڑے تو کچھ مضائقہ نہیں صنعت و حرفت کی ترقی سے ملک کو جو نفع حاصل ہوگا وہ اُس کی کہیں بڑھ کر تلافی کردے گا اور اگر صنعت و حرفت زیر بحث اس قدر ترقی نکر سکے کہ دیگر ممالک کا مقابلہ برداشت کرے۔ لیکن قومی قیام اور تحفظ کے واسطے اشد ضروری ہو۔ مثلاً آلات و سامان حرب جہاز وغیرہ تو ٹیکس درآمد کی دائمی دیوار قائم رکھکر ایسی مصنوعات خود ہی تیار کرنا چاہیئے ان چیزوں کے واسطے دوسری قوموں کا محتاج ہونا اپنے گلے میں رسی ڈالنا ہے اور قوم حوتی خوشی ایسی گرانی کا بار اُٹھالے گی۔ کیونکہ مال قوم کی حفاظت پر قربان ہے اور ارزانی کے لالچ سے قومی حکومت اور آزادی معرض خطر میں ڈالنا کون بدبخت قوم گوارا کرے گی۔ کسی زمانہ میں یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ تہذیب جدید کی برکت سے جنگ کا خطرہ روز بروز گھٹ رہا ہے لیکن غور اور تجربہ سے معاملہ بالکل اس کے برعکس نظر آرہا ہے۔ جس قدر عالمگیر اور تباہ کن لڑائیاں اب ہو سکتی ہیں اور ہو رہی ہیں تہذیب جدید سے پہلے ان کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب کہ بین الاقوام تعلقات اس قدر معرض خطر میں ہوں تو ان پر اعتماد کرکے اپنی ضروریات کی بہم رسانی دوسروں پر چھوڑ نا اس سے بڑھ کر کون تباہ کن نا عاقبت اندیشی ہو سکتی ہے۔ چند روز مقامی بدامنی کے زمانہ میں افراد بھی حتی الامکان ضروریات فراہم رکھتے ہیں اور قوموں کو تو ہر وقت اپنی مدد آپ کرنے کے قابل رہنا اشد ضروری ہے۔ جو دوسروں کے بھروسہ پر بیٹھے رہتے ہیں۔ اکثر روز بد دیکھتے ہیں۔ اپنی ضروریات مہیا مہیا نکرسکنے کی بدولت ترک جیسی بہادر اور جفاکش قوم پر کیا کیا مصیبتیں پڑیں کیسی

زکیں پہنچیں - جب کہ بعض خوش اقبال قوموں کو جنگ نے خواب غفلت سے بیدار کرکے معاشی استحکام کی طرف متوجہ کردیا تو ایسی جنگ - اگرچہ اس میں بیشمار جان و مال کا نقصان پہنچا ہو اس قوم کے حق میں پیام رحمت ثابت ہوئی ہی - اس کے برعکس جس امن و امان کے ظل عاطفت میں لوگ معاشی استحکام کی پروا نہ کرکے دیگر ممالک کا مال ارزانی کے لالچ سے خریدیں اس کی مثال بعینہ شراب کی سی ہی کہ جس کے پینے سے فوری طاقت و سرور محسوس ہو لیکن خمار کی تکلیف سے سابق لطف کی سب کسر نکل جائے اور تمام جسم مستقل طور پر ضعیف ہو جائے -

حاصل کلام یہ کہ ہر قوم کو اپنا اپنا قیام اور عروج مطلوب ہی جس کی بدولت اقوام عالم میں تنازع للبقا جاری ہی کامیابی کے واسطے معاشی استحکام لابدی ہی اور نو بہار ممالک کو ترقی یافتہ ملک کے مقابل بغیر ٹکس معاشی استحکام میسر آنا محال ہی ٹکس درآمد بعض حالتوں میں صرف چند روزہ ہوں گے اور بعض میں دیرپا - لیکن قوم کے حق میں بہر صورت ناگزیر اور مفید ہیں - گویا قوم کا عروج و اقتدار تامین تجارت سے وابستہ ہی -

اگر کل بنی نوع انسان ایک نئی قوم بن کر رہ سکتے تو اس حالت میں البتہ تامین تجارت کی کوئی ضرورت ہوتی چنانچہ موجودہ اقوام کی تجارت داخلہ میں تامین کہیں بھی مروج نہیں جب شمالی امریکہ کی متعدد ریاستوں نے متحد ہو کر ایک جمہوری حکومت قائم کی تو چونکہ ملک ایک ہی تھا جو لوگ یورپ سے آ آ کر بسے تھے پاس رہتے رہتے اُن میں خاص یک رنگی و یگانگت پیدا ہو چکی تھی کل ریاستیں ملکر ایک قوم بن گئیں اور قبل از اتحاد جو ٹکس درآمد قائم تھے وہ سب ہٹا دیئے گئے اور ریاست ہائے متحدہ کی کل تجارت داخلہ آزاد ہو گئی - جب کہ جرمنی کی ریاستیں ایک سلطنت میں متحد ہوئیں تو وہاں بھی بعینہ یہی واقع ہوا لیکن دیگر اقوام کے مقابلہ میں آج تک ان دونوں ملکوں نے بھاری بھاری ٹکس قائم کر رکھے

ہیں ۔ پس جب تک قوموں میں تفریق قائم ہے اور کل بنی نوع انسان ملکر ایک قوم نہ بن جائیں تجارت آزاد کا عام رواج محال ہے ۔ یہاں یہ نکتہ جتانا خالی از لطف نہو گا کہ جب قوم صرف ایک ہی ہوگی تو تجارت خارجہ غائب ہو جائے گی ۔ رہی تجارت داخلہ سو وہ بحالت موجودہ بھی آزاد ہے ۔ پس نتیجہ نکلا کہ تجارت خارجہ لازماً کم و بیش ماموں رہے گی ۔

واضح ہو کہ تجارت آزاد کے سرگرم حامی خاص طور پر اہالی انگلستان ہیں ۔ جیسا کہ آگے چلکر تجارت بین الاقوام کی تاریخ سے واضح ہوگا ۔ غیر معمولی جد و جہد حُسن اتفاقات اور نیز چند صدیوں تک طریق تامین تجارت سے مدد لیکر انگلستان نے اپنا معاشی استحکام درجہ کمال کو پہنچا لیا ہے اس کی مصنوعات نہ صرف ملکی ضروریات مہیا کرتی ہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی بکثرت جاتی ہیں ۔ خاص طور پر اسی درآمد کو روکنے کے لیے اوّل اوّل اکثر ممالک کو تامین تجارت کی ضرورت محسوس ہوئی خالباً اب تعجب نہو گا کہ تجارت آزاد کے حامی ایسی تامین تجارت پر تو ناک بہوں سکوڑتے ہیں اور طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں جو مقامی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی خاطر سے جاری کی جائے ۔ لیکن جن مصنوعات کا جنگ سے قریبی تعلق ہے مثلاً آلات و سامان حرب و جہاز وغیرہ اور نیز جن کی خود اُن کو بھی ضرورت ہے اُن کے واسطے تامین تجارت نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں اور اس پر خود بھی عمل کرتے رہے ہیں ۔

انگلستان کے متعلق اکثر حریف ممالک کو شکایت ہے کہ جس راستہ سے وہ خود معاشی ترقی کے میدان میں اس قدر آگے نکل گیا ۔ اس راستہ پر چلنے سے دوسروں کو منع کرتا ہے ۔ شاید اس اندیشہ سے کہ مبادا دوسرے اس کے برابر آ جائیں اور دوسروں کی رفتار بڑھنے سے اس کی رفتار سست پڑ جائے ۔ تجارت بین الاقوام کی تاریخ سے آگے چلکر معلوم ہوگا کہ اگرچہ طعن کسی قدر مبالغہ آمیز ہے لیکن سر سے بے بنیاد بھی نہیں ۔

حصہ چہارم
باب چہارم
دولت اور
اسباب دولت

(۸) دولت اور اسباب دولت میں بڑا فرق ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس بہت سی دولت موجود ہو۔ لیکن وہ دولت پیدا کرنا نہ جانتا ہو یا اس قدر پیدا نہ کر سکے جتنی کہ صرف کرتا ہے تو کچھ عرصہ میں اس کی کل موجودہ دولت خرچ ہو جائے گی اور وہ افلاس میں گرفتار نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اگر کسی کے پاس دولت بہت کم موجود ہو۔ لیکن اس کو دولت پیدا کرنی آتی ہو اور صرف سے زیادہ دولت پیدا کرتا ہے تو اس کی دولت روز بروز بڑھے گی اور بالآخر وہ دولت مند بن جائے گا۔ آج کل مسلمان رئیس زادوں کی تباہی اور ہندو تاجروں کی ترقی سے دولت اور اسباب دولت کا فرق خوب واضح ہو رہا ہے ایک پانچ برس کے بچے اور پچاس برس کے شخص کو لو بحالت موجودہ شخص مذکور اس بچے سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ لیکن آج سے بیس سال بعد ان دونوں کا مقابلہ کر دیکھیے تو ایک توانا تندرست جوان رعنا نظر آئے گا اور اس شخص کو ضعف پیری کے ہاتھوں نشست و برخاست میں بھی تکلف ہو گا۔ آخر اس انقلاب کا باعث کیا ہے۔ بچہ کے پاس اگرچہ طاقت کم تھی لیکن کل اسباب طاقت موجود تھے۔ اس کے برعکس اس شخص کے پاس طاقت ہی طاقت تھی اسباب طاقت زائل ہو چکے تھے۔ اسی طرح پر اگر کوئی جوان بیمار پڑے تو صحت یاب ہونے پر اس کا ضعف بہت جلد رفع ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی بوڑھے کی طبیعت برائے نام بھی ناساز ہو جائے تو عرصہ تک اضمحلال محسوس ہوتا رہتا ہے۔ نیز اگر کوئی جوان اپنی نادانی اور حماقت سے صحت بگاڑ کر اسباب طاقت زائل کر دے تو اس کی حالت بوڑھوں سے بھی بدتر ہو جائے گی۔ غرضکہ کسی چیز کی ملک سے اس کے اسباب پیدائش موجود ہونے کہیں زیادہ ضروری ہیں۔ دولت اور اسباب دولت کا فرق قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ میں صاف نظر آتا ہے جرمنی اور اسپین کی سابق اور موجودہ حالت کا مقابلہ کرو۔ آگے چلکر تجارت بین الاقوام کی تاریخ سے واضح ہو گا کہ

سولھویں صدی میں بلحاظ دولت مندی یورپ بھر میں اسپین کا کوئی ہمپلہ نہ تھا اور جرمنی بیچارہ کی
تو اس کے سامنے حقیقت کیا تھی امریکہ میں بڑی بڑی سونے کی کانیں اسپین کے ہاتھ لگی تھیں
لیکن اسپین نے اسباب دولت پیدا کرنے کے بجائے اس خدا داد دولت کو مسرف رئیس
زادوں کی طرح اُڑانا شروع کردیا ۔ ملکی صنعت و حرفت کو کس میرسی میں چھوڑکر دوسرے
ممالک کی مصنوعات بکثرت خریدنی شروع کردیں اس کے برعکس جرمنی نہایت احتیاط
اور جانفشانی سے بتدریج اسباب دولت پیدا اور قوی کرتا رہا ۔ باوجود ہزار دقتوں کے
اپنی صنعت و حرفت کو زندہ اور بحال رکھا ۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ اسپین کو مدتوں سے امن و
امان میسر ہے مگر اسباب دولت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی دولت و اقتدار روز بروز گھٹتا
گیا حتیٰ کہ اب وہ ایک غریب اور ادنیٰ حیثیت کی سلطنت نظر آتا ہے ۔ اس کے برعکس
جرمنی کو متعدد مرتبہ قحط ۔ وبا ۔ خانہ جنگی اور جنگ خارجہ کی سخت سخت ردیں پہنچیں مگر
اسباب دولت کم و بیش محفوظ رہے جن کی بدولت ہر تباہی کے بعد اس کی سابق خوشحالی
عود کرتی رہی حتیٰ کہ آج دنیا کی سلطنتوں میں بلحاظ دولت و اقتدار جو رتبہ اس کو حاصل ہے محتاج
بیان نہیں ۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جب انگلستان سے جنگ آزادی شروع کی تو وہ
زیادہ دولت مند نہ تھیں اور مزید براں مصارف جنگ کا بار عظیم اُن کے گلے پڑا ۔ لیکن
چونکہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد امریکہ کے اسباب دولت بہت قوی ہو گئے چند
ہی سال میں وہ اس قدر مالا مال ہو گیا کہ قدیم دولت مند سلطنتیں بھی رشک کرنے لگیں

سنہ ۱۸۰۹ سے لیکر سنہ ۱۸۳۹ تک تیس سال کے دوران میں فرانس کو بڑے بڑے صدمے
پہنچے ملک کے ایک بڑے حصہ پر سے اُس کی حکومت اُٹھ گئی دو نہایت بیش خرچ جنگوں
میں بڑے بڑے تاوان ادا کرنے پڑے خیال تھا کہ فرانس کا ہیکو پنپیے گا مگر اسباب دولت
ہاتھ سے نہ گئے تھے اور نصف صدی کے اندر اندر اس کی مالی حالت پہلے سے بدرجہا

حصہ چہارم
باب چہارم

بہتر ہو گئی ۔ ذرا جاپان کی مثال ملاحظہ ہو۔ بلحاظ رقبہ اُس کی کیا بساط ہے جو ایک اعلیٰ درجہ کی سلطنت شمار ہو اس میں سونے چاندی کی کانیں بھی نہیں کہ خدا نے زمین پھاڑ کر ان کو دولت مند بنا دیا ہو۔ لیکن اسباب دولت نے وہاں وہ نشو ونما پایا ہے کہ دنیا حیران ہے اور اقصائے عالم کی دولت وہاں کھنچی چلی جا رہی ہے۔

اسباب دولت کی کارگذاریاں تو بیان ہو چکیں لیکن ابھی خود اُن کی تشریح باقی ہے آخر یہ اسباب دولت کیا ہیں اور کیونکر حاصل ہوتے ہیں۔ اسباب دولت دو ہیں لوگوں میں اعلیٰ کارکردگی یعنی محنت کرنے کی قابلیت اور ملک میں کارآمد پیداوار خام کی کثرت۔ لیکن ان اسباب کے عمل پیرا ہونے کی بھی دو شرطیں ہیں اوّل لوگوں میں قابلیت کے علاوہ محنت کرنے کا شوق بھی ہو دوم اُن کو پیداوار خام پر محنت صرف کرنے کا پورا پورا موقع اور آزادی حاصل ہو۔ غور کرنے سے واضح ہو گا کہ شرط اوّل قوم کی اخلاقی اور معاشرتی حالت سے بہت کچھ متعلق ہے اور شرط دوم بیشتر سیاسی حالت پر منحصر ہے۔

اگر لوگ قدرتاً ذہین اور سمجھ دار ہوں ملک میں طرح طرح کی پیداوار خام دستیاب ہو سکے لیکن سب پر عیش پرستی کاہلی اور پست ہمتی طاری ہو یا ترقی یافتہ ممالک اُس پر مقابلہ کا بارڈالیں اور اوّل اوّل وہ تاب نہ لا سکے تو باوجود موجودگی اسباب وہ ملک حسب امکان ہرگز ترقی نہیں کر سکتا اگر وہ کچھ ترقی کرے بھی تو صرف اس شعبہ پیدائش میں جس کا ترقی یافتہ حریف ممالک اپنے نفع کی خاطر اُس کو موقع دیں ایک حد تک وہ دوسروں کی مرضی کا پابند رہتا ہے۔ اور یہ سزا اس کو اس قصور کی بھگتنی پڑتی ہے کہ اس نے اسباب دولت سے کام لینے میں اس قدر تاخیر کیوں کی کہ دوسرے ممالک اس سے کہیں آگے بڑھ گئے اور اب اس کی معاشی ترقی کے بعض اہم شعبے اُن کے سدراہ ہو کر اُن کو سخت ناگوار گذرتے ہیں چنانچہ ہر خود مختار اور بیدار ملک قومی عروج اور اقتدار کی خاطر خود

تو زراعت صنعت و حرفت - تجارت اور جہاز رانی غرضکہ اپنے کل اسبابِ دولت کو حتی الوسع قوی کرنے میں منہمک ہیں - لیکن پس ماندہ ممالک کے ذمہ صرف پیدا وار خام کی بہم رسانی عائد کر دی گئی ہے - گویا اُن کے حق میں بالعموم زراعت سے بڑھ کر موزوں اور مفید کوئی کام نہیں اور صنعت میں خدا نے اُن کا کوئی حصہ ہی نہیں رکھا - لیکن اگر سچ پوچھیے تو یہ بڑی ہٹ دھرمی اور ظلم ہے اوّل تو صرف ایک یا چند پیشوں پر قناعت کرنا اور اکثر ضروریات کے واسطے دیگر ممالک کا دست نگر رہنا قومیت کے اغراض و مقاصد کے سخت خلاف ہے - دوم ترقی صنعت و حرفت کی بہت کچھ گنجائش ہونے کے باوجود اس کو کس مپرسی میں چھوڑ دینا نہ صرف کفرانِ نعمت ہے بلکہ خریداران مصنوعات یعنی عوام الناس پر ظلم ہے - سوم یہ خیال غلط ہے کہ پیشے پیشے سب برابر ہیں اور بحیثیت ذرائع معاش زراعت اور صنعت و حرفت یکساں ہیں - بلکہ ہم ابھی آگے چلکر واضح کریں گے کہ قومی ترقی اور مالی منفعت پر ان کا اثر بالکل مختلف پڑتا ہے اور صنعت و حرفت کو زراعت پر قابل لحاظ فوقیت حاصل ہے - اور ان دونوں کا اجتماع سب سے بہتر ہے -

مخالفین تامین تجارت کا ایک عام اعتراض ہے کہ اس طریق سے چیزیں گراں ہو جاتی ہیں اور خریداروں پر بیجا بار پڑتا ہے گویا دولت کا نقصان ہوتا ہے - لیکن وہ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اس طریق سے اسباب دولت بھی تو ہاتھ آ جاتے ہیں اور اسباب دولت کو وہ ترجیح حاصل ہے کہ ان پر جتنی دولت بھی نثار کرنی پڑے مضائقہ نہیں اگر قوم کو اپنا قیام اور احترام منظور ہے اور دیرپا خوشحالی کی تمنا ہے تو معاشی استحکام اور اسبابِ دولت حاصل کرنے کے لیے اس کو ہر قسم کے ایثار کے واسطے تیار رہنا چاہیے۔ پھر گرانی اشیاء کی شکایت مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے - ہر قوم نے اپنے عروج کا پودا جان و مال کے ایثار سے سینچا ہے - ایثار کی تاب نہ لائے وہ عروج کی تمنا

ہی کیوں کرے جب کہ قدرت نے لوگوں کو صنعت وحرفت کے واسطے ذہن اور موزوں طبیعت ادا کی ہو۔ ضروری پیداوار خام بھی ملک میں مہیا ہو۔ اور لوگ صنعت وحرفت کو ترقی دینے پر آمادہ بلکہ مصر ہوں۔ اور پھر بھی تامین تجارت کے ذریعہ سے اُن کو مقابلہ سے اتنی مہلت نہ دینا کہ ذرا سنبھل سکیں اور عذر یہ کرنا کہ عارضی گرانی سے ایسے لوگوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے گا کہاں تک قرین انصاف وخیر طلبی ہوسکتا ہے۔ تجارت آزاد کی جو خوبی بہت شد ومد سے بتائی جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ چیزیں ارزاں ملتی ہیں اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن جس چیز کی درآمد ملکی صنعت وحرفت کی ترقی سے مانع ہو۔ ارزاں تو درکنار اسے مفت بھی قبول کرنا سراسر ناعاقبت اندیشی ہوگا۔ کیا کوئی کم کرایہ دیکر۔ یا بلا کرایہ۔ بلکہ الٹا انعام لیکر بھی ایسے گھوڑے پر چڑھنا گوارا کرے گا۔ جس کی سواری سے خود ٹانگیں ضعیف اور ناکارہ ہوجائیں۔ اور کیا باقی جسم صحیح سالم رہنے سے ٹانگوں کی خرابی خرابی شمار نہ ہوگی البتہ جب خدا نے ٹانگیں دی ہی نہ ہوں تو اس کو وہ گھوڑا بہت غنیمت معلوم ہوگا اور حسب ضرورت کرایہ بھی ادا کریگا چنانچہ تجارت ماموں میں بھی ان چیزوں کی درآمد گوارا کی جاتی ہے جو خود ملک میں پیدا نہیں ہوسکتیں

یہاں پر یہ نکتہ جتانا ضروری ہے کہ جن وجوہ سے ہونہار صنعت وحرفت کو تامین جائز اور مفید ہے ان ہی وجوہات پر ایسی صنعت وحرفت کو بھی تامین ناگزیر ہے جو ناساعدت حالات سے عارضی طور پر ضعیف اور خستہ حال ہوگئی ہوں بحالت اوّل تامین گویا بچوں کی پرورش ہے اور بحالت دوم مریض کی دوا اور تیمارداری۔ البتہ جب کوئی صنعت وحرفت کسی انقلاب کی بدولت ایسی برباد ہوجائے کہ اس کی دوبارہ سرسبزی کی کوئی امید نہ ہو تو اس کی تامین ایسی ہی لاحاصل بلکہ زیر بار کن ثابت ہوگی جیسا کہ نہ بچنے والے مریض کا علاج۔

حصہ چہارم
باب چہارم

پس تامین تجارت کی ضرورت کا خلاصہ یہ ہے کہ قوم کا قیام اور عروج جو اس قدر مطلوب ہے معاشی استحکام پر منحصر ہے اور دیرپا مرفع الحالی کے دولت کے بجائے اسباب دولت سے حاصل ہوتی ہے۔ بحالت موجودہ کسی ہونہار ملک کو معاشی استحکام اور اسباب دولت بلا تامین تجارت میسر آنے محال ہیں۔ اس طریق سے بوجہ گرانی اشیا خریداروں یعنی عوام پر دیرپا چند روزہ مالی بار ضرور پڑتا ہے۔ جو مصنوعات جنگ میں کام آئیں اُن کی گرانی کا بار اگر مستقل طور پر بھی اُٹھانا پڑے تو قومی تحفظ کی خاطر کچھ مضایقہ نہیں۔ ایسی مصنوعات جو ابھی صرف ہونہار ہیں یا جو اس وقت عارضی طور پر خستہ حال ہو رہی ہیں چند سال میں ترقی کر کے جب دیگر ممالک سے وہ مقابلہ کر سکیں گی تو اُن کی گرانی کا بار خود ہی کچھ عرصہ میں رفع ہو جائے گا۔ رہیں تیسری قسم کی چیزیں جو ملک میں پیدا ہی نہ ہو سکیں یا بدقت پیدا ہوں بذریعہ ٹکس اُن کی درآمد روکنا سراسر خلاف عقل ہے ایسی چیزیں تجارت ماموں والے ملک میں بھی بلا روک ٹوک جاتی ہیں۔

معاشی استحکام اور اسباب دولت کی اہمیت تو واضح ہو چکی۔ تامین تجارت کی مزید ضرورت واضح کرنے کے لیے ابھی زراعت اور صنعت و حرفت کے عام مرفع الحالی اور ترقیات پر جدا جدا اثر اور اُن کے اجتماع کے فواید بیان کرنے باقی ہیں۔ اسی سلسلہ میں ملکوں کے معاشی وسائل کا فرق جتلا کر بعد کو ترقی یافتہ ممالک کی تجارت خارجہ کی تاریخ پیش کریں گے تاکہ اصول اور عمل کا مقابلہ ہونے سے حقیقت منکشف ہو جائے۔

زراعت اور صنعت و حرفت

(۹) اسباب دولت کی بحث میں اس خیال کو غلط قرار دیا تھا کہ پیشے پیشے سب برابر ہیں۔ بحیثیت ذرائع معاش زراعت اور صنعت و حرفت میں کوئی فرق نہیں گویا ان میں سے کسی ایک پر اکتفا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور نہ اُن کو یکجا

بیدارم کرنے کی کوئی ضرورت۔ چنانچہ اس عاقلانہ مشورہ پر کاربند ہونے کے واسطے پس ماندہ ممالک سے بدرجہ جبر اصرار کیا جاتا ہے۔ ترقی زراعت کے واسطے طرح طرح کی امداد وسہولت مرحمت ہوتی ہیں لیکن ترقی صنعت وحرفت کی تحریک اُن کے حق میں خیالِ خام سعی لاحاصل بلکہ سم قاتل تک قرار دیجاتی ہے۔ پس ماندہ مگر ہونہار ملک بجائے مشکور ہونے کے ایسی صلاح مشورہ اور اصرار سے تنگ اور ناخوش نظر آتے ہیں گویا ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح * کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

اگر اُن کے دل میں بھی یہی صنعت وحرفت کی ترقی کا ولولہ موجزن ہو تو اُن کی یہ اُمنگ بے لوث نظر سے ضرور قابل ہمدردی واعانت دکھائی دے گی۔ ذیل کی بحث سے ظاہر ہوگا کہ زراعت اور صنعت وحرفت کا اثر قومی ترقی پر بالکل مختلف پڑتا ہے۔ صنعت و حرفت کو زراعت پر از حد فوقیت حاصل ہے اور ان دونوں کا اجتماع سب سے بہتر ہے

اوّل زراعت کو لو اور غور کرو کہ فی نفسہٖ اس سے قوم کی دماغی۔ معاشرتی سیاسی اور معاشی ترقی کیونکر متاثر ہوتی ہے۔ اوپر کے فقرہ میں لفظ فی نفسہٖ قابل توجہ ہے۔ گویا یہ فرض کر کے کہ عام پیشہ زراعت ہے اور صنعت وحرفت نے رواج بہت کم پایا ہے کسی قوم کی حالت ہر ضروری پہلو سے دیکھنی مقصود ہے۔ دماغی قوتوں کو زراعت میں کام کرنے اور لہذا نشو ونما پانے کا بہت کم موقع حاصل ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ زمین جوتنا۔ بوتا۔ کھیت کو پانی دینا۔ نلانا۔ فصل کی دیکھ بھال رکھنا۔ تیاری پر کاٹنا اور سنگوانا۔ یہی سب زراعت کے کام ہیں۔ ان میں دماغی قابلیت اس قدر کم درکار ہے کہ جاہل اقوام بھی بطریق احسن اُن کو سرانجام دے لیتی ہیں۔ زراعت میں جو آلات مستعمل ہیں۔ مثلاً ہل۔ چرس۔ کسلہ کھرپا۔ نہ اُن کے بنانے میں بڑی ذہانت اور نہ برتنے میں خاص مہارت درکار۔ غرضکہ زراعت کا پیشہ دماغی قابلیتوں سے

اس قدر مستغنی ہے اور اس قدر کم مہارت طلب ہے کہ ایک جاہل مزدور بہت جلد اس کو سرانجام دینے کے قابل ہنجاتا ہے اس پیشے میں جدت کا میدان بھی تنگ ہے۔ سب لوگ وہی چند غلّے ترکاریاں اور پھل جو کھانے میں کام آئیں اُسی ایک طریق پر جو مدت سے رائج چلا آتا ہے اسی ایک ماند میں جو قدرت نے مقرر کر دیا ہے بوتے اور تیار کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے عادت اور رواج کا اثر طبیعتوں پر اس قدر غالب آجاتا ہے کہ زراعت میں بغرض ترقی کوئی ردوبدل کرنے کا اُن کے دل میں خیال تک نہیں گزرتا وہی تیلی کے بیل کی طرح ایک چکر میں سدا گھومنا اور پرانی لکیر کے فقیر بنے رہنا اُنکا رویہ قرار پا جاتا ہے چنانچہ واقع ہے کہ مزارعین سے بڑھ کر کوئی طبقہ رسم و رواج کا پابند اور قدامت پرست نہیں ہوتا۔ المختصر اس پیشے کے چلانے میں بہت معمولی سمجھ درکار ہے اور اعلےٰ دماغی قابلیتیں بیکاری کے ہاتھوں از کار رفتہ ہو جاتی ہیں۔

جس ملک میں عام پیشہ زراعت ہو اور صنعت و حرفت نے رواج نہ پایا ہو وہاں کی معاشرت ابتدائی اور ادنےٰ حالت سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتی۔ لوگ چھوٹے چھوٹے دیہات میں منتشر رہتے ہیں۔ صرف چند لوگ ملکر کام کرتے ہیں۔ کھیتوں پر ہی صبح سے شام ہو جاتی ہے اور انسانوں کی کسی بڑی جماعت کے ساتھ کام کرنے یا اُن کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے کا موقع شاذ و نادر ملتا ہے۔ جب کہ زراعت عام پیشہ ہو تو پیداوار مقامی صرف میں آتی ہے۔ خود باہر جانے یا مال بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ذرائع آمد و رفت بھی محدود اور تکلیف دہ رہتے ہیں ہمیشہ ایک ہی جگہ پڑے پڑے یا ایک کام کرتے رہنے سے بلند خیالی اور علو حوصلگی یکسر سلب ہو جاتی ہے۔ زراعت کے پیشہ میں قدرت کو بہت زیادہ دخل ہے۔ حسب اقتضائے وقت بارش ہونا نہ ہونا۔ سردی گرمی پڑنا۔ آندھی۔ اولے ٹڈی کا نہ آنا۔ یہ سب باتیں تیاری فصل کی

شرط اولین ہیں۔ اور اُن کی تکمیل سراسر قدرت کے ہاتھ میں ہے نتیجہ یہ ہے کہ مجبوراً کاشتکار قدرتی اسباب پر بہت بھروسہ کرتا ہے۔ ذاتی جدوجہد کا موقع اور پہل کا فی نہیں ملتا پس اُس کی عادت میں ا‌ِتّکال توکل۔ قناعت سہل انکاری اور بہتر ترقی کی طرف سے سرد مہری پیدا ہوجاتی ہے۔ ضرورتیں بیشتر مایحتاج زندگی تک محدود رہتی ہیں نہ زیادہ ضرورتیں محسوس ہوسکیں نہ مہیا۔ بڑے بڑے شہر اعلےٰ عمارات۔ بیشمار سامان اور عوام میں ترقی کی اتھک کوشش یہ سب باتیں وہم وگمان میں بھی نہیں گذریں دیہات کے کچے جھونپڑے چند سادہ ضروریات۔ خیالات میں سکون اور ارادوں میں پستی زرعی ممالک کی معاشرت کی یہی نمایاں خصوصیات نظر آتی ہیں۔

جس قوم کی دماغی قوتیں مضمحل بلکہ مردہ ہوجائیں جن کی کوششوں کا دارومدار محض ہاتھ پیر کی طاقت پر رہ جائے۔ پشت ہا پشت سے ایک حالت پر قائم رہنے سے رسم ورواج کی بیڑیاں دل ودماغ کو جکڑ دیں۔ قدامت پسندی حوصلے پست کردے۔ لوگ محض مایحتاج زندگی پر قناعت کر بیٹھیں۔ دلوں سے ترقی کی امنگ محو ہوجائے کل آبادی چھوٹے چھوٹے دیہات میں منتشر رہے۔ لوگ سیر وسیاحت سے محترز رہ کر جہاں پیدا ہوں وہیں کل عمر بسر کردیں ہر شخص اپنی قسمت پر توکل کرے۔ کوششوں کی کامیابی بیشتر اسباب قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ تنازع للبقا سست ہونے کی وجہ سے انانیت جو کہ ترقی کا اصلی منبع ہے ضعیف ہوجائے۔ بالخصوص جہاں بیشتر زمین ایک مختصر گروہ زمینداران کی ملک ہو کاشتکاروں کا گروہ کثیر جن کو زراعت سے کوئی مفر نہیں زمینداروں کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہوجائے کہ اُن کو اپنا ان داتا سمجھنے لگے۔ اُن کی اطاعت اور نازبرداری کرتے کرتے اُن کی سختی اور چیرہ دستی سہتے سہتے آزادی اور خودداری کے جذبات سرد پڑجائیں۔ حقوق کا احساس زائل

ہو جائے خود اپنی نظر سے گر جائیں اور اس حالت پر افسوس کرنے کا خیال تک دل میں نہ گذر سکے ہو کہ اپنی پیدائش کا مقصد دوسروں کی اطاعت اور خدمت گزاری میں ایک ادنے قسم کی زندگی بسر کرنا سمجھ بیٹھیں - چنانچہ مشرقی بنگال میں جہاں عام پیشہ اب تک زراعت ہی کاشتکار بجائے سلام کے زمیندار کے آگے زمین پر اور پیر اس کے قدموں پر سر رکھکر سجدہ کرنا تعظیم کا ایک نہایت مناسب طریق خیال کرتا ہے - غرضیکہ دماغ کی اعلے قابلیتیں ناکارہ اور دلوں کے پاکیزہ جذبات زائل ہو جائیں اور عوام پر سہل انکاری اور خود فراموشی کی ایک گہری نیند طاری ہو تو ایسے ملک میں تعدی اور غلامی کا دور دورہ رہتا ہے آزادی کی برکتیں اس کو حاصل ہونا نہایت دشوار ہے جب کہ انسانی حقوق کا احساس ہی نہ رہی تو انکا لحاظ اور وقعت کیا معنی - حاصل کلام یہ کہ جس ملک کا عام پیشہ زراعت ہی زراعت ہو وہاں آزادی کو راہ کم ملتی ہے اور سیاسی حالت نہایت ابتر رہتی ہے -

ایسی قوم کی معاشی حالت جس قدر پس ماندہ ہو گی اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں زراعت میں بہتر جسمانی طاقت درکار ہے سب کام گنے چنے اور سیدھے سادھے ہوتے ہیں جو آلات مستعمل ہیں اُن کا بھی یہی حال ہے - ایک توانا تندرست جاہل شخص جو معمولی سمجھہ رکھتا ہے اس پیشہ میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے ایسی حالت میں بڑے بڑے عالم محقق موجد صناع جن کی قسمیں اور تعداد شمار سے باہر ہیں جنہوں نے طرح طرح کی خداداد دماغی قابلیتوں سے اپنے اپنے ملک کو عظیم الشان فایدے پہنچائے ہیں محض نکمے ثابت ہو سکتے ہیں - اگر چاہیں تو زراعت میں صرف اپنی جسمانی طاقت اور معمولی سمجھہ سے کام لیکر روزی کما سکتے ہیں قدرت نے جو بڑی بڑی کارگذار قابلیتیں اُن میں ودلیعت کی ہیں وہ سب بیکار رہیں - اُن سے مستفید ہونے کا کوئی موقع نہیں مل سکتا - گویا قوم کی خداداد قابلیتوں کا بیش قدر ذخیرہ سوائے جسمانی طاقت اور

اور معمولی سمجھ کے بیکار رہ کر ضائع ہوجاتا ہے۔ اس نقصان کا اندازہ کسی قوم کے زراعت اور صنعت و حرفت کے زمانہ کی جدا جدا حالتوں کے مقابلہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ زمین اور آسمان سے بڑھ کر فرق نظر آئے تو عجب نہیں۔ لیکن نقصان یہاں پر ختم نہیں ہوتا۔ جس طرح پر کہ انسانوں کی بیشمار خداداد قابلیتیں بوجہ بیکاری ضائع ہوتی ہیں اسی طرح پر زمینوں کی بیشمار پیداوار بھی رہ جاتی ہیں۔ زراعت میں تو صرف وہی چند غلے پھل اور ترکاریاں پیدا کی جاتی ہیں جو خورد و نوش میں کام آئیں یا جن سے دیگر ناگزیر ضروریات حاصل ہوں بہت سی قسم کی لکڑیاں جن سے نہایت بیش قدر سامان تیار ہو سکتا ہے یا تو جلانے کے کام آتی ہیں یا پڑی پڑی گل جاتی ہیں۔ طرح طرح کے پھل اور ترکاریاں جن سے نہایت لذیذ غذا اور مفید ادویات تیار ہو سکتی ہیں۔ اُن کو لوگ جانتے تک نہیں۔ صدہا قسم کے معدنیات دہاتیں اور پتھریوں ہی کس مپرسی میں پڑے رہتے ہیں کوئی اُن کو نظر اٹھا کر دیکھتا بھی نہیں۔ آبشاروں سے بجلی پیدا ہو سکتی ہے۔ جس کی کارگزاریاں کسی سے پوشیدہ نہیں پانی اور ہوا کی قوت محرکہ سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں لیکن زراعت میں اُن سے صنعت و حرفت کی مدد بغیر آب پاشی کا کام بھی لینا دشوار ہے حاصل کلام یہ کہ انسان کی بیشمار قابلیتیں اور زمین کی لاتعداد پیداوار اور قدرت کی بڑی بڑی قوتیں کہ جن سب سے اگر کام لیا جائے تو ملک تختۂ عدن بنجائے یوں ہی کس مپرسی میں بیکار پڑے پڑے ضائع ہوتی رہتی ہیں اور کاشتکار اپنی جسمانی قوت سے چند مایحتاج زندگی پیدا کر کے معاشی لحاظ سے از حد پس ماندگی میں عمر بسر کرتے ہیں۔

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ صنعت و حرفت کا اثر قوم کی دماغی۔ معاشرتی۔ سیاسی معاشی حالت پر بالکل اس کے برعکس پڑتا ہے۔ اوّل تو صنعت و حرفت کی ترقی کا

دارومدار غور تحقیق اور ایجاد پر ہے۔ نت نئی چیزیں تیار کرنا بغیر اعلیٰ دماغی قابلیتوں کے کس طرح ممکن ہے۔ اس کام میں علوم سے جتنی مدد لیجائے کم ہے۔ صناعوں کی کامیابی بیشتر اُن کی وقت شناسی۔ معاملہ فہمی۔ جرات اور استقلال پر منحصر ہے۔ قدرتی اسباب کے ہاتھوں وہ اس قدر بے بس ہیں جتنا کہ کاشتکار وہ اپنی محنت اور کوشش کا کامیابی میں زیادہ دخل دیکھتا ہے۔ اسی وجہ سے صناعوں میں مقابلہ کا جوش زوروں پر رہتا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی امیدیں قوی حوصلے بلند اور کوششیں سرگرم رہتی ہیں دیہاتی کاشتکار گھنٹوں حقہ پینے اور گپ شپ اڑانے میں صرف کردے۔ لیکن قصباتی صناع دن بھر سر اُٹھانے کی مہلت نہیں چاہتا۔ عام مشاہدہ ہے کہ صنعت وحرفت کے مرکزوں میں لمحہ لمحہ جان برابر عزیز ہوتا ہے۔ لیکن زراعت والے گھنٹوں بلکہ دنوں کی بھی اتنی قدر نہیں کرتے اور نہ اُن کو قدر کرنے کی ضرورت۔ صناع مل جلکر قصبات میں رہتے اور بازاروں میں برابر دکانوں کے اندر کام کرتے ہیں کبھی ایک ہی دوکان یا کارخانہ میں چند یا بہت سے جمع ہوکر چیزیں تیار کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی بیشتر انسانی مجمع اور صحبت میں بسر ہوتی ہے اُن کو ہر وقت انسانوں ہی سے سابقہ پڑتا۔ اُن کی بستیاں ترقی کرتے کرتے بڑے بڑے شہر بنجاتی ہیں وہ ہزارہا قسم کا سامان تیار کرکے ضروریات میں اضافہ کرتے ہیں اس اضافہ کی بدولت لوگوں کے دلوں میں محنت کا شوق اور ترقی کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ہر کوئی اچھی اچھی چیزوں کا لطف اٹھانا چاہتا ہے اُن کے حصول کی غرض سے محنت کرتا ہے۔ غرضیکہ ہر طرف بیداری۔ چہل۔ پہل۔ ترقی کی کوشش اور رونق پھیل جاتی ہے۔ شہروں میں کیسی کیسی عالیشان عمارات کیسے کیسے بیش قیمت سامان۔ انسانی کامیابیوں کے کیا ہی ہمت افزا نمونہ نظر آتے ہیں جن کی بدولت کاشتکاروں کے دیہات اور صناعوں کے قصبات کی معاشرت میں زمین وآسمان کا فرق نمودار ہوجاتا

حصہ چہارم
باب چہارم

ہے۔ صناع ذہین اور باخبر ہوتا ہے اُس کے خیالات میں وسعت اور ارادوں میں بلندی ہوتی ہے وہ اپنی کوشش پر اعتماد کرتا ہے۔ اس کی کامیابی عام خریداروں کی توجہ پر منحصر ہے وہ اپنے پیشے کے واسطے کسی چیرہ دست زمیندار کے رحم و انصاف کا محتاج نہیں وہ جہاں فائدہ دیکھے اپنا کام جاری کر سکتا ہے۔ کامیابی کی تلاش میں وہ جابجا پھر سکتا ہے۔ سفر سے اس کی ہمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہم پیشوں سے مقابلہ کرتے کرتے اس میں جراءت و استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑی بڑی جماعتوں میں رہنے سے خودداری کا احساس تیز ہو جاتا ہے۔ لوگوں سے طرح طرح کے معاملات کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے حقوق کی نگہداشت کی اکثر ضرورت پیش آتے آتے اس میں انانیت بھی بڑھ جاتی ہے بیجا دباؤ اور تابعداری اُس کو ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ خودداری اور آزادی کا اس کو چسکا پڑ جاتا ہے۔ چونکہ بڑی بڑی جماعتیں یکجا رہتی ہیں۔ خربوزہ کو دیکھکر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ عوام میں ایک جان پر جاتی ہے سب کو آزادی کی ہوا لگی کہ سیاسی حالت کا رنگ بدلنا شروع ہوا۔ حقوق کا لحاظ اور ادب ہونے لگا۔ عوام کے جائز مطالبات پیش اور منظور ہوئے حتیٰ کہ حکومت نے بھی بتدریج آئینی ڈہنگ اختیار کر لیا۔ حریت کی صدا ہمیشہ شہروں سے نکلکر قصبات ہوتی ہوئی دیہات تک اسی طرح پہنچتی ہے جیسے کہ ایک ہی مرکز سے لہریں سطح آب پر چاروں طرف پھیلتی ہیں۔

صنعت و حرفت کا معاشی حالت پر جو اثر پڑتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ یورپ کے کسی ملک کا ایشیا کے کسی ملک سے مقابلہ کرنا کافی ہے اور فرق کی وجہ صاف ظاہر ہے صنعت و حرفت میں اس قدر چیزیں اتنے طریقوں سے تیار ہوتی ہیں کہ ہر قسم کی قابلیت اور مذاق کا آدمی اپنے حسب حال کوئی شعبہ منتخب کر کے اس میں کما حقہ کمال پیدا کر سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ زراعت کی طرح جسمانی طاقت اور معمولی سمجھ کے علاوہ اور

قابلیتوں کی کوئی پرستش ہی نہو گویا صنعت و حرفت میں انسانوں کی بیشمار خدا داد قابلیتیں بطریق احسن کام آسکتی ہیں۔ اس کا پیداوار پر جو اثر پڑتا ہے ظاہر ہے۔ خصوصاً کلوں کی بدولت جو صنعت و حرفت کا سبب بھی ہیں اور نتیجہ بھی قوت پیدا آوری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ایک کمزور سا کل چلانے والا اصناع دس طاقتور ہل چلانے والے کاشتکاروں سے زیادہ پیدا کرتا ہے۔

جس طرح انسانوں کی خداداد قابلیتیں صنعت و حرفت میں رنگ دکھاتی ہیں۔ زمین کی بیشمار قسم کی پیداوار بھی صنعت و حرفت ہی میں کام آسکتیں ہیں۔ کاشتکاروں کی ضروریات اور پیداوار تو مایحتاج زندگی تک محدود تھیں لیکن جب صنعت و حرفت کا دور دورہ ہوا تو نہ ضروریات کی شمار رہی نہ پیداوار کی۔ جو چیزیں صدیوں نامعلوم رہیں آج اُن سے دنیا واقف ہے جو چیزیں قدموں میں روندی جاتی تھیں آگ میں جلائی جاتی تھیں کوڑیوں پھینکدی جاتی تھیں آج لوگ اُن سے طرح طرح کے کام لیتے اور آرام پاتے ہیں جو چیزیں مدتوں پامال جان بنی رہیں آج اُن سے ملک مالامال بن رہے ہیں حاصل کلام یہ کہ صنعت و حرفت میں کل خداداد نعمتیں۔ خواہ وہ انسانی قابلیتیں ہوں خواہ زمین کی پیداوار بدرجہ اولی کام آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ صناع قومیں دنیا کی سرتاج بنی ہوئی ہیں۔

قوم کی پستی اور عروج بیشمار اسباب پر منحصر ہے اور بیشتر اہم اسباب دماغی معاشرتی سیاسی اور معاشی حالت سے وابستہ ہیں۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ جس قوم کا عام پیشہ زراعت ہی زراعت ہو وہ کم از کم بحالت موجودہ ان ترقی یافتہ اقوام کا رتبہ نہیں پاسکتی۔ جن کی فوقیت صنعت و حرفت کی خوبیوں پر مبنی ہے۔ اس بحث سے زراعت کو فضول یا ناقابل التفات قرار دینا مقصود نہیں بلکہ ایک اہم فرق

جتانا منظور ہو جس کی صحت پر عالمگیر مشاہدات شاہد ہیں اس سے کون انکار کر سکتا ہو کہ زراعت سب سے قدیم پیشہ ہو صنعت و حرفت اسی سے پیدا ہوئی اور اب بھی بیشتر اسی پر قائم ہو زراعت سے ناگزیر ضروریات حاصل ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے وہ سب پیشوں پر اب بھی مقدم ہو۔ حتی الوسع ہر قوم کو اپنی زراعت بحال رکھنی چاہیے تاکہ زرعی پیداوار خام کے واسطے جو کہ صنعت و حرفت کی بنا ہو وہ دوسری قوموں کی محتاج نہ رہے۔ زراعت کی یہ خوبیاں اور ضرورتیں سب تسلیم ہیں لیکن پھر بھی صنعت و حرفت کو دیگر لحاظ سے اس پر فوقیت حاصل ہونا عجب نہیں۔

پس اب غور طلب امر یہ ہو کہ زراعت اور صنعت و حرفت کے جداگانہ خواص و اہمیت کو پیش نظر رکھکر ان دونوں پیشوں میں کیا تعلق قائم کرنا چاہیے کہ قوم کو ہر گونہ ترقی اور عروج بدرجہ اُولی حاصل ہو۔ آیا محض زراعت پر اکتفا کرنا مفید ہو سکتا ہو یا محض صنعت و حرفت پر کل کوشش صرف کرنی چاہیے یا ان دونوں کو پہلو بہ پہلو قائم رکھنا قوم کے حق میں سب سے بہتر ہوگا۔

اول فرض کرو کہ زراعت قوم کا عام پیشہ ہو صنعت و حرفت کی طرف عدم توجہی رہے اور تجارت خارجہ بھی دیگر ممالک سے قائم ہو کہ مصنوعات کی درآمد ہو سکے ایسی قوم کی وہی حالت ہوگی جو ایشیا اور افریقہ کے بعض پس ماندہ حصص میں پائی جاتی ہو۔ جہالت قدامت پرستی۔ تنگ خیالی۔ پست حوصلگی۔ غلامی اور افلاس ایک سے ایک نمایاں نظر آئے گا۔

اب فرض کرو کہ قوم کا تو عام پیشہ زراعت ہو لیکن تجارت خارجہ کی بدولت دوسرے ممالک سے مصنوعات کی درآمد ہوتی رہے اور یہاں سے زرعی پیداوار کی برآمد تو اول اول اس ترکیب سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ مصنوعات کے آنے سے ملک میں بیداری اور ترقی کا

ولولہ پیدا ہوگا لوگوں کو نئی نئی چیزوں کا علم اور شوق ہوگا اور اُن کے حصول کے لیے وہ محنت اور کوشش بھی شروع کریں گے۔ زرعی پیداوار کی برآمد سے زراعت کو بھی ترقی ہوگی نہ صرف جو پیداوار مقامی ضروریات سے زاید تھی اس کی قیمت وصول ہونے لگے گی بلکہ نئی نئی چیزوں کی کاشت جاری ہونے سے بھی قوم کو فائدہ پہنچے گا۔ نیز ملک کی دیگر پیداوار مثل معدنیات وغیرہ جو اب تک ناکارہ پڑی رہیں ملک سے باہر فروخت ہونے لگیں گی۔ رفتہ رفتہ لوگوں کو ایک طرف تو مصنوعات کی درآمد سے نئی نئی ضروریات کی عادت پڑے گی۔ دوم زرعی پیداوار کی برآمد سے مالی حالت سدھرے گی۔ اور اس طرح اپنے ملک میں پیداوار خام سے مصنوعات تیار کرنے کا خیال اور قابلیت پیدا ہونی شروع ہوگی۔ اس حد تک مصنوعات کی درآمد چراغ ہدایت اور تجارت خارجہ پیام ترقی ثابت ہوگی۔ چنانچہ اکثر زراعتی ممالک میں معاشی بیداری کی ابتدا یوں ہی تجارت خارجہ سے ہوئی ہے۔

لیکن جب کہ تجارت خارجہ سے کچھ عرصہ میں بہبودی کی اُمنگ پیدا ہولے۔ زراعت کافی ترقی کرلے۔ مالی حالت سدھر جانے سے اصل فراہم ہونے لگے بہت سی ضروریات کی عادت پڑجائے اور نیز اُن کی بہم رسانی کے طریق کا پتہ چلنے لگے۔ مصنوعات کے واسطے پیداوار خام ملک میں دستیاب ہوسکے اور لوگوں کو صنعت و حرفت کا شوق پیدا ہو۔ غرضکہ جب قوم میں بلحاظ بہم رسانی ضروریات اپنی مدد آپ کرنے اور ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کا خیال قوت پکڑے تو یہ وقت اس کے حق میں بہت نازک ہوتا ہے۔ اس حالت میں جتنے زیادہ عرصہ تک پیداوار خام کی برآمد اور مصنوعات کی درآمد جاری رہے گی اور ملکی صنعت و حرفت جاری کرنے میں تاخیر ہوگی ملک کو نقصان پہنچے گا۔ زراعت قانون تقلیل حاصل کی پابند ہے۔ اوّل اوّل تو زاید پیداوار کی فروخت سے بذریعہ تجارت خارجہ بہت فائدہ نمودار

حصہ چہارم

باب چہارم

ہوگا۔ لیکن جب زراعت خوب ترقی کر چکے گی اور بوجہ کثرت طلب کاشت دقیق اور ادنے زمینوں کی کاشت شروع ہو گی تو قانون تقلیل حاصل بھی اپنا عمل جاری کریگا۔ گویا برآمد کی بدولت زرعی پیداوار جس پر عوام کی مایحتاج زندگی کا بیشتر دارمدار ہے۔ گراں ہونی شروع ہو گی۔ خورد ونوش کی چیزوں کی قیمت چڑھ جائے گی۔ گرانی غلہ کا بار ہر کسی پر پڑے گا۔ البتہ زمیندار کے لگان میں اضافہ ہوگا۔ اور اگر کاشتکار بھی مالک نہیں بھی ہوں تو اُن کی مالی حالت بہتر ہونے لگے گی عوام کو غلہ اور ترکاری کی گرانی سے جس قدر زیر باری ہوگی اس کی تلافی کم وبیش دیگر ممالک سے آئی ہوئی مصنوعات کی ارزانی سے ہوتی رہے گی۔ چنانچہ اس وقت ہندوستان میں یہی واقع ہو رہا ہے برآمد کی وجہ سے سامان خوراک گراں ہو رہا ہے اور درآمد نے مصنوعات میں بیحد ارزانی بڑھا رکھی ہے۔ اس ارزانی کا باعث قانون تکثیر حاصل کا عملدرآمد ہے درآمد میں جس قدر اضافہ ہوگا مصنوعات ارزاں ہونگی اور چونکہ ان کی طلب تغیر پذیر ہے جس قدر ارزاں ہوں گی اُن کی درآمد بڑھے گی غرضکہ ارزانی اور درآمد کا ایک عجیب دور بندھتا ہے۔ جس میں زراعتی ملک اس طرح گھر جاتا ہے جیسے کہ مکڑی کے جالے میں مکھی پھنستی ہے۔ زراعتی ملک کے ذمہ پیداوار خام کی بہم رسانی آپڑتی ہے۔ برآمد کی بدولت خورد ونوش کا سامان گراں ہو ہو کر عوام کو زیر بار کرتا ہے البتہ لگان میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن نہ اس قدر جتنا کہ عوام پر بار پڑتا ہے کہنے کے لیئے عوام کی زیرباری کی تلافی مصنوعات کی ارزانی سے ہو جاتی ہے۔ لیکن یہی ارزانی قوم کے حق میں وبال جان ہو جاتی ہے۔ اسی کی بدولت ملک میں صنعت وحرفت جاری کرنا دشوار بلکہ محال ہو جاتا ہے۔ ارزانی کی اسی مضرت سے بچنے کے لیے تامین تجارت کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ملکی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی ضرورت ہی کیا ہے

اس میں کیا قباحت ہے کہ زراعت پر پوری کوشش صرف کرکے پیداوار خام دیگر ممالک کو بھیجی جاوے اور اس کے معاوضہ میں دیگر ممالک سے مصنوعات آتی رہیں۔ اس اعتراض کا جواب اوپر کی بحث سے بآسانی اخذ ہوسکتا ہے۔ تاہم بغرض صفائی ہم اس کا اعادہ کرتے ہیں۔ جب کہ عام پیشہ زراعت ہی رہے اور برآمد پیداوار خام کے معاوضہ میں دیگر ممالک سے مصنوعات کی درآمد جاری ہو تو اوّل اوّل بیشک اس طریق سے نفع ہوتا ہے۔ زراعت کی ترقی سے ملکی دولت میں بھی اضافہ ہوتا ہے مصنوعات کی درآمد سے معاشی ترقی کی امنگ پیدا ہوتی ہے لیکن جب کہ عرصہ دراز تک پیداوار خام کی برآمد او مصنوعات کی درآمد جاری رہتی ہے تو زراعت ہمیشہ کے واسطے اُس ملک کے گلے پڑ جاتی ہے اور ارزان مصنوعات کی درآمد ملکی صنعت و حرفت کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ جب کہ زراعت عام پیشہ ہو اور صنعت و حرفت سے مغائرت رہے تو قوم کی دماغی معاشرتی اور سیاسی حالت جس قدر ابتر ہوگی محتاج بیان نہیں اور قوم کے قیام اور عروج سے اِن تمہائے ترقی کا جس قدر قریبی تعلق ہے وہ بھی اظہر من الشمس ہے اس معاملہ میں انگلستان اور پولینڈ کی حالت کا موازنہ نہایت سبق آموز ہے ایک زمانہ تھا کہ یہ دونوں ملک اکثر لحاظ سے ہم پلہ تھے۔ ان کی معاشرتی سیاسی اور معاشی حالت میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ زراعت دونوں ملکوں کا عام پیشہ تھی لیکن بعد کو اُنھوں نے جدا جدا طرز عمل اختیار کیا۔ انگلستان نے تو دیگر ممالک سے صناع بلا بلا کر اپنے ہاں آباد کیے اور قوانین تجارت کے ذریعہ سے ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی سرگرم کوشش کئی صدی تک جاری رکھی حتیٰ کہ آج وہ معاشی میدان میں سب سے پیش پیش نظر آتا ہے اور اس کی قومی عظمت کا سکہ تمام عالم بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے برعکس اہل پولینڈ نے صرف پیداوار خام کی برآمد پر اکتفا کیا اور ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے بجائے وہ عرصہ تک دیگر ممالک سے ارزان مصنوعات بکثرت خریدا کیے حتیٰ کہ وہ صرف زراعت میں پھنس گئے

حصہ چہارم
باب پنجم

رہ گئے اور صنعت و حرفت سے محروم رہنے کا جو خمیازہ اٹھانا پڑا وہ سب کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے
دوم زراعت اور صنعت و حرفت کا قومی زندگی کے مختلف شعبوں اور عام ترقی پر جو اثر پڑتا ہے اس
کو نظر انداز بھی کر دو اور صرف معاشی حیثیت سے پیداوار خام کی برآمد اور مصنوعات کی درآمد پر غور کرو
تو یہ انتظام عاقبت اندیشی کے منافی نظر آئے گا۔ تجارت آزاد کے حامی فخریہ زور دیتے ہیں کہ تجارت
خارجہ زراعتی ممالک کے حق میں اس لیے از حد مفید ہے کہ زرعی پیداوار کی قیمت بڑھنے سے ملک کی دولت
میں اضافہ ہوتا ہے اور مصنوعات کی درآمد سے معاشی ترقی کی بنا پڑتی ہے لیکن جب کہ خود انہی کے قول کے
کے مطابق دیگر ممالک سے آئے ہوئے مصنوعات اس قدر فیض رساں ثابت ہوتے ہیں تو گھر کی پیداوار خام سے
گھر ہی کے تیار شدہ مصنوعات ملک کے حق میں کس قدر مفید ثابت ہوں گے مثلاً ہندوستان سے روئی اور چمڑہ ولایت
جاتا ہے اسی وجہ سے ان دونوں کی قیمت ہندوستان میں بڑھی ہوئی ہے گویا ان کی برآمد سے ہندوستان کی
دولت میں اضافہ ہوتا ہے ان چیزوں کا کپڑا اور چرمی سامان تیار ہو کر بشکل مصنوعات پھر ہندوستان آتا ہے
اب اگر ولایت کے جیسے کارخانے ہندوستان میں قائم ہوتے تو روئی اور چمڑے کی قیمت بھی ویسی ہی
اعلیٰ رہتی اور ملک میں مصنوعات تیار ہونے سے جو زر بشکل کرایہ آمد و رفت اور مال بشکل اجرت و سود
و منافع ہندوستان کی جیب سے باہر جاتا ہے وہ بھی ملک میں محفوظ رہ کر عام مرفع الحالی میں اضافہ کرتا۔
زراعت پر پچھتر فیصدی آبادی کی روزی کا دارمدار ہے جس کی وجہ سے شخصی آمدنی یا تو گھٹ رہی ہے
یا کم از کم اضافہ کی رفتار نہایت سست ہے۔ یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔ لاکھوں مزدور
کارخانوں میں کام سے لگ جاتے۔ گویا کاروبار کی بیشی کی وجہ سے محنت کی طلب یا مزدور کی
مانگ بڑھتی اور ان کی اجرت میں اضافہ ہونے سے عوام کی مالی حالت سدھرنے لگتی اور چند ہی سال میں زراعت
اور صنعت و حرفت کے پہلو بہ پہلو ترقی کرنے سے ملک کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی۔
قطع نظر ان گراں قدر فوائد کے یہ امر بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں کہ تجارت خارجہ کا قیام بہت سے اسباب پر منحصر ہے
اگر فریق ثانی کسی وجہ سے پیداوار خام زراعتی ملک سے لینا ترک کر دے یا کوئی جنگ چھڑ جائے جس کے خطرے اور

یشمند ہی کسی پیداوار مال پیش قوم کو غافل رہنا چاہئے تو زرعی ملک کی حالت کس قدر قابل رحم ہوگی نہ تو اس کو اپنی اس پیداوار خام کا کوئی مصرف نظر آئے گا جو دوسرے ملک کو جاتی تھی اور نہ اس کو وہ مصنوعات میسر آئیں گی جن کا وہ بیحد عادی ہو چکا ہے۔ چنانچہ کئی مرتبہ ایسا واقع ہو چکا ہے کہ دو ملکوں میں جنگ چھڑی جو ملک صرف پیداوار خام مہیا کرتا اور مصنوعات دیگر ممالک سے خریدتا تھا اس کی کم بختی آگئی۔ سوئی۔ پنسل اور دیا سلائی تک کو محتاج ہو گیا۔ ایسی پس ماندہ قوم بھلا جنگ میں کیا عہدہ برا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے نازک وقت گذر گئے مصیبتیں آئیں۔ کیں پڑیں۔ لیکن اس گوشمالی سے ہمیشہ کے واسطے ایسی عبرت ہوئی کہ جنگ پیام بیداری وعروج ثابت ہوئی۔ فوراً ملکی صنعت وحرفت کو حتی الوسع ترقی دینے کی دھن لگ گئی۔ سو سو طرح کے ایثار کئے تکلیفیں اٹھائیں لیکن جب تک ملکی صنعت و حرفت کو زندہ نہ کر لیا دم نہ لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی دنیا کی زندہ اور معزز قوموں میں شمار ہونے لگیں آگے چلکر تجارت خارجہ کی تاریخ میں ایسے واقعات اکثر نظر سے گزریں گے۔

مصنوعات کی درآمد پر اکتفا کرنے سے ایک عظیم الشان نقصان یہ بھی پہنچتا ہے کہ بعض اشیاء قسم کی پیداوار خام جو بوجہ وزندار یا سریع الزوال ہونے کے زیادہ مقدار میں دیگر ممالک بھی نہ جا سکے۔ مثلاً لوہا۔ پتھر۔ لکڑی۔ خوشبودار پھول یا ایسے قدرتی اسباب جن سے صنعت وحرفت میں بڑے بڑے کام نکل سکیں۔ مثلاً آبشار۔ دریا۔ پہاڑیاں یہ سب بیکار رہ جاتے ہیں اور زرعی قوم ایسے لوگوں کی خدمات سے محروم رہ جاتی ہے جن میں قدرت نے اس قدر قابلیت ودیعت کی تھی کہ اگر موقع ملتا تو وہ اپنے کو بڑے سے بڑے موجد اور صناع کا پلہ ثابت کر کے ملک کو مالا مال کر دکھاتے۔ چنانچہ ہم مقدمہ اور کارکردگی کے تحت میں جتا چکے ہیں کہ ملک میں صنعت وحرفت کی پس ماندگی اور صنعتی تعلیم کی قلت سے بہت سی بیش بہا پیداوار خام اور لاجواب خداداد استعداد کس مپرسی کے ہاتھوں ضائع اور

حصہ چہارم — برباد ہو رہی ہے۔

باب چہارم — پیدا وار خام کی برآمد کے متعلق ایک اور نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں وہ کچھ اہم نہیں معلوم ہوتا بعض پیدا وار خام ایسی ہیں کہ عام طور پر صنعت و حرفت کی ترقی کے واسطے لابدی ہیں مثلاً لوہا پیتل۔ تانبا جن سے مشین بنتے کوئلہ اور مٹی کا تیل جس سے انجن چلے۔ خاص قسم کی لکڑیاں جس سے اعلےٰ درجے کا فرنیچر بنے۔ یہ چیزیں دیرپا بھی ہیں ان کو خاص طور پر محفوظ اور مصئون رکھنا چاہیئے تاکہ خدا اگر کبھی دن پھیرے تو ان سے پورا پورا کام لیا جا سکے اور دوسروں کا محتاج بننا نہ پڑے اُن کی مقدار خواہ کتنی ہی کثیر ہو پھر بھی محدود ہوتی ہے۔ اور قومی معاملات میں برسوں نہیں بلکہ صدیوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ پس ایسی پیدا وار خام کے بدلے میں مصنوعات لینا ایسا ہے جیسا کہ پارس پتھری کے بدلے میں سونا لینا۔

قیمتی دہاتوں مثلاً سونا چاندی کی کانوں کا دوسرے ممالک کو ٹھیکہ دینے میں بھی اکثر قابل لحاظ خسارہ رہتا ہے اگر اس وقت تک جبکہ خود کان کنی میں مہارت تامہ حاصل ہو صبر کیا جاوے تو قیمتی دہاتیں خود نکالنے میں جس قدر زیادہ منافع ہوگا اس سے تاخیر حصول منفعت کی بدرجہ اولی تلافی ہو جانی اغلب ہے۔ رہی ایسی زرعی پیدا وار جس سے سامان خوراک حاصل ہوتا ہے کون نہیں جانتا کہ زمین کی قوت پیدا آوری محدود ہے۔ کاشت کی کثرت سے قوت جلد زائل ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ تو چند فصل کے بعد ایک آدھ فصل زمین کو بلا کاشت اس طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے کہ کوئی مزدور کو آرام لینے کے لیے چھٹی دیتا ہے اور اس ترکیب سے زمین کی قوت کم زایل ہوتی ہے۔ ضایع شدہ قوت کی تلافی کے واسطے وقتاً فوقتاً کھاد بھی دیا جاتا ہے۔ اور خود کھاد بھی بیشتر زمین ہی کی پیداوار سے بنتا ہے۔ پس برآمد کی خاطر مدتوں تک زمین پر کاشت کی شدت کرنے سے اس کی زرخیزی کو مستقل صدمہ پہنچے تو عجب نہیں اور جب پیدا وار کا کوئی جزو کثیر ملک سے باہر جائے گا تو گویا اس قدر کھاد میں بھی کمی ہوتی ہوگی

پس مدت دراز کے لیے قومی بہبودی مد نظر رکھتے ہوئے زراعت میں احتیاط شرط ہے پیداوار خام کی برآمد میں اس قدر کثرت اتنے عرصہ تک جاری نہ رکھنی چاہیئے کہ ذرائع پیداوار مستقل طور پر مضمحل ہو جائیں۔

برآمد پیداوار خام اور درآمد مصنوعات کے متعلق صرف ایک دو نکتہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ زراعت قانون تقلیل حاصل کی پیرو ہے۔ اور زرعی پیداوار جس سے خوراک حاصل ہو۔ اس کی طلب بھی غیر تغیر پذیر ہے اس کے برعکس مصنوعات قانون تکثیر حاصل کے پابند ہوتے ہیں اور اُن کی طلب تغیر پذیر ہوتی ہے جس ملک سے سامان خوراک کی برآمد ہو وہاں اس کی گرانی کا مار سب پر پڑنا لابد ہے۔ حالانکہ ملک کو نفع بشکل لگان متقابلۃً بہت کم ہوتا ہے اور جن مصنوعات کی درآمد ہوتی ہے وہ اکثر داخل تعیشات ہیں یعنی اُن سے اس قدر عام اور ناگزیر ضروریات مہیا نہیں ہوتیں جتنی کہ سامان خوراک سے۔ گویا خوراک کی گرانی کا مار تو بلا استثنا سب پر پڑتا ہے۔ لیکن اضافہ لگان ایک خاص گروہ کی جیب میں جاتا ہے اور ارزانی مصنوعات کا لطف بھی وہی اُٹھا سکتے ہیں جن کے پلہ چار پیسے ہوں نتیجہ یہ ہے کہ ہزارہا غریبوں کو برآمد سامان خوراک کی بدولت پیٹ پالنا دشوار ہو جاتا ہے جو ملک سامان خوراک لے اور مصنوعات دے اس کی حالت برعکس ہے اوّل تو قانون موازنہ مصارف کی رو سے اس کو سامان خوراک ارزاں پڑتا ہے اور سامان خوراک کا ناگزیر ضروریات میں نمبر اوّل ہے گویا اس کی ارزانی سے تمام لوگ بلا استثنا مستفید ہوتے ہیں اور مصنوعات کی ارزانی کا جدا لطف اُٹھاتے ہیں۔ گویا جس ملک سے سامان خوراک کی برآمد ہو وہاں ایک بڑی جماعت کو گرانی خوراک سے زیر بار ہونا پڑتا ہے اور خاص خاص گروہ اضافہ لگان اور ارزانی مصنوعات کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ حالانکہ جس ملک سے مصنوعات کی برآمد ہو۔ وہاں خوراک اور مصنوعات دونوں کی ارزانی سب کے واسطے عام ہوتی ہے۔

اس سے قبل واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر کوئی زراعت پر قناعت کرے اور تجارت خارجہ جاری نہ کرے یا اگر جاری کرے تو وقت مناسب پر مصنوعات کی درآمد نہ روکے اور ملکی صنعت وحرفت کو ترقی نہ دے تو اس کا کیا کیا حشر ہوگا ماسبق بحث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر کوئی ملک صرف صنعت وحرفت میں مصروف رہے اور دوسرے ملکوں سے پیداوار خام اور سامان خوراک لے تو اس کی حالت زراعت والے ملک سے بہتر ہوگی لیکن اس ملک کو بھی ایک بڑا خطرہ باقی رہیگا جس کا لحاظ بہت ضروری ہے پیداوار خام تو کل صنعت و حرفت کی بنا ٹہیری اور خوراک کا لوازمات زندگی میں سب سے اوّل نمبر ہے۔ جب اگر خدانخواستہ جنگ یا اور کسی اسباب سے ان چیزوں کی درآمد رک جائے تو پھر ایسے ملک کی حالت نہایت اندیشناک ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انگلستان کی بیشتر معاشی حالت اُسی ملک کی سی ہے اور انہیں خطروں کے لحاظ سے اوّل تو اس نے اپنا بیڑا نہایت زبردست تیار رکھا ہے۔ دوم راستوں پر اکثر موقع کے بندرگاہ اور آبنائے اپنے قبضہ میں کر رکھی ہیں۔ سوم اکثر زرعی ممالک پر اپنی حکومت یا کم از کم اپنا اثر اور رسوخ قائم کر رکھا ہے اور ان بندوبستوں کے ہوتے ہوئے کسی وقت پیداوار خام اور سامان خوراک کی درآمد رکنے کا خطرہ خیال موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لیکن دیگر ممالک اس قدر جرات نہیں کر سکتے پیداوار خام وہ دیگر ممالک سے لیتے ضرور ہیں لیکن ملکی ذرائع کو بھی بخطر احتیاط برقرار اور محفوظ رکھتے ہیں۔

اوپر کی تفصیلی بحث سے تجارت خارجہ کے کل ضروری پہلو واضح ہونے کے بعد اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ کسی قوم کے واسطے اس سے بڑھ کر کوئی خوش قسمتی نہیں کہ وہ اپنی بیشتر ضروریات خود مہیا کر سکے۔ ملک میں پیداوار خام کی بھی کثرت ہو اور صنعت وحرفت بھی اتنی ترقی یافتہ ہو کہ بآسانی مصنوعات دستیاب ہو جائیں۔ اس قوم کی حالت ایک نہایت توانا تندرست اور قابل شخص کی سی ہوگی جو اپنے قوت بازو پر ہمیشہ بھروسہ کرتے

حصہ چہارم
باب چہارم

اور لازماً کسی کا دست نگر نہو۔ بلکہ آڑے وقت خود دوسروں کی دست گیری کر سکے اور لوگوں میں عزت وقعت کی زندگی بسر کرے۔

قوم کے معاشی وسائل اور اُن کا استعمال

(۱۰) **قومی وجود**۔ خود مختاری اور عروج کا نصب العین جو ہم نے اوپر پیش کیا اور اس کے حصول کے جو جو معاشی طریق بتائے اُن کا فی نفسہ بجا اور درست ہونا دنیا بھر میں مسلم ہی اس راہ پر چلکر بعض قومیں منزل مقصود تک پہنچ چکی ہیں۔ مثلاً سب سے اول انگلستان اس کے بعد امریکہ جرمنی اور فرانس۔ بعض آزاد اور مآل اندیش قومیں اب بھی اس راہ سے منزل مقصود کی طرف بڑہ رہی ہیں بالخصوص جاپان جہاں ملکی صنعت وحرفت کی ترقی کا خیال بسرعت قوت پکڑ رہا اور ہر طرف پھیل رہا ہی۔ لیکن یہ خیال سراسر غلط ہوگا کہ ہر کوئی قوم اس راہ پر چلکر قومیت کا نصب العین حاصل کر سکتی ہی۔ اس کامیابی کے واسطے چند شرائط لازمی ہیں۔ جن کی تکمیل صرف بعض قوموں کی کوشش کی منتظر ہی۔ اور بعض قوموں کی قدرت سے تقریباً باہر ہی یعنی قدرتاً وہ شرائط مذکور پورا کرنے سے معذور ہیں۔ لہذا قومی نصب العین اُن کو صرف بدرجہ ادنی میسر آسکتا ہی دنیا کے ملکوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ بعض کا رقبہ مختصر ہی۔ آبادی تھوڑی ہی۔ پیداوار خام کی قلت ہی یا جو کچھ پیداوار خام ہی وہ صرف معدودے چند قسم کی ہی۔ مثلاً ڈنمارک۔ بلجیم۔ سوئسرلینڈ۔ پرتگال۔ یونان۔ ہالینڈ ناروے اور سوئیڈن۔ اگر یہ ملک۔ اپنی کل ضروریات خود مہیا کرنے کی کوشش کریں تو نتیجہ نقصان اور ناکامی ہوگا اِن کے حق بہت سے مصنوعات کی مستقل درآمد اور پیداوار خام کی برآمد ناگزیر ہو تو کیا عجب ہی۔ لیکن اس پر بھی جب صنعت وحرفت کی ترقی کا موقع دیکھتے ہیں بذریعہ تامین تجارت اس کی غور وپرداخت میں جان کھپا رہے ہیں اور جس قدر مصنوعات خود تیار کر سکیں۔ اُن کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ لیکن بعض ملک ایسے بھی نظر آتے جن کو بجائے خود ایک دنیا سمجھنا بیجا نہوگا۔ مثلاً امریکہ یا ہندوستان کیسے کیسے وسیع قطعے

کتنی بڑی بڑی آبادیاں پیداوار خام کی بیشمار قسمیں اور کثیر مقدار - دریا - پہاڑ - میدان مختلف آب و ہوا غرضکہ طرح طرح کے قدرتی اسباب موجود - یہ وہ ملک ہیں کہ جن کو قومیں نصب العین حاصل کرنے کے واسطے معاشی اسباب خاطر خواہ میسر ہیں - امریکہ کی معاشی ترقی ہر طرف ضرب المثل ہے اور ہندوستان صرف موقع کا منتظر ہے متوسط درجہ کے ملک بھی حتی الوسع معاشی استحکام اور صنعت و حرفت کی ترقی میں برابر مصروف ہیں جرمنی اور فرانس نے باوجود چھوٹے چھوٹے ملک ہونے کے کیا کچھ نہیں کر دکھایا خطہ حارہ کے زرخیز مگر غیر آباد ملک مثلاً افریقہ کے حق میں تجارت آزاد بہت زیادہ مفید ہے ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے اسباب مہیا ہونے میں وہاں ابھی وقت درکار ہے اور اس دوران میں پیداوار خام جس کی کثرت ہے - باہر بھیجکر دولت بڑھانا اور مصنوعات منگا کر ترقی کی امنگ پیدا کرنا اس کے لیے سب سے بہتر ہے - رہے غیر آباد ریگستان اور برفستان وہاں معاشی ترقیات کا خیال ہی عبث ہے -

اگرچہ جا بجا توجہ دلا چکے ہیں لیکن بغرض یاددہانی یہاں پھر اعادہ کرتے ہیں کہ اگر کسی ملک کا عام پیشہ زراعت ہو اور پیداوار خام کی کثرت ہو تو اول اول مصنوعات کی درآمد اور پیداوار خام کی برآمد ایسے ملک کے حق میں پیام رحمت اور تازیانہ ترقیات ہو گی ایسی حالت میں تجارت آزاد نہ صرف جائز بلکہ ناگزیر ہے - کچھ عرصہ بعد ملک میں عام حرکت نمودار ہو گی اور وہ اپنے قدموں پر خود کھڑا ہونے کی کوشش شروع کرے تو عجب نہیں - اس دوران میں آمد پیداوار خام کی بدولت کچھ اصل پس انداز ہو چکا ہو گا مصنوعات کے استعمال سے معاشی ترقی ضرورت محسوس ہونے لگے گی - غور اور دشواری سے زراعت کے ساتھ صنعت و حرفت کو بھی ملک میں ترقی دینے کے فائدہ کچھ کچھ نظر آنے لگے ہوں گے اور مصنوعات تیار کرنے کے برے بھلے آلات اور تھوڑی بہت

مہارت بھی حاصل ہوگئی ہوگی - یہی وہ وقت ہے جب کہ اس کو تامین تجارت سے روکنا سراسر نادانی یا ظلم ہوگا - یہ وقت آجانے کے بعد جتنی ہی تاخیر ہوگی ترقی کی دقتیں بڑھیں گی - چنانچہ بعض قوموں کو تو ہر قسم کے لامحدود ایثار کرنے پڑے تب کہیں یہ موقع نصیب ہوا - البتہ منفعت مابعد نے اس ایثار کی تلافی بدرجہ اولی ضرور کردی اور بلد کردی -

اب صرف یہ سوال باقی ہے کہ تامین تجارت کب تک قائم رکھنی چاہئے - جواب صاف ہے - جب تک کہ تجارت آزاد سے تامین کی غرض و غایت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ باقی رہے خواہ دوران تامین مختصر ہو یا وسیع اس کو اس وقت تک ہرگز ترک نہ کرنا چاہئے جب تک اصلی اغراض و مقاصد اجازت نہ دیں اور اُن کی ہم اس قدر مفصل تشریح کر چکے ہیں کہ یہاں اعادہ غیر ضروری ہے -

طریق تامین کی تفصیل

(۱۱) تامین کی ضرورت اب خوب واضح ہوگئی ترقی یافتہ ممالک کے مصنوعات ترقی طلب ممالک میں داخل ہوکر نہایت ارزاں بکثرت فروخت ہوتے ہیں اور آخرالذکر ممالک بوجہ موجودہ پس ماندگی کے اس قدر ارزاں مصنوعات تیار کرنے سے معذور ہیں - عوام سے اس قدر مآل اندیشی کی توقع عبث ہے کہ وہ خود بخود ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی خاطر مستقل طور پر ارزاں مصنوعات کے مقابل گراں خریدیں اور جب ملکی مصنوعات فروخت ہو سکنے کی بوجہ موجودہ گرانی سر دست کوئی امید نہ ہو تو لوگ صنعت و حرفت جاری کرکے اپنا اصل معرض خطر میں ڈالنا کیوں گوارا کرنے لگے - گویا ارزاں مصنوعات کی درآمد ملکی صنعت و حرفت کے قیام و ترقی سے مزاحم ہوتی ہے - پس گورنمنٹ کو جو کہ عوام کی نمایندہ اور ملکی بہبودی کی محافظ ہے کوئی ایسا طریق اختیار کرنا پڑتا ہے کہ درآمد مصنوعات کا تباہ کن اثر زائل ہو جاوے - پہلا طریق تو یہ ہے کہ مصنوعات کی درآمد پر محصول قائم کر دیا جاوے تاکہ اُن کی قیمت میں اسی قدر

اضافہ ہو سکے کہ ملکی مصنوعات ان کا لیے بازار میں مقابلہ کر سکیں یعنی وہ بھی ملکی مصنوعات کی برابر گراں ہو جائیں تاکہ لوگ اپنے ملک کی چیزیں خریدنے میں تامل نکریں اور صنعت و حرفت قائم کرنے والوں کو بھی کاروبار نہ چلنے اور اصل ضائع ہونے کا اندیشہ نرہے اس ٹکس کا لامحالہ گرانی مصنوعات عوام پر بار ضرور پڑے گا۔ لیکن اول تو ملکی صنعت وحرفت کچھ عرصہ میں ترقی کریں گی تو مصنوعات خود ارزاں ہو جائیں گی۔ نہ دیگر ممالک کے مقابلہ کا خوف رہیگا اور نہ ٹکس کی ضرورت۔ گویا ٹکس محض ایک عارضی بار ہوگا جس کے معاوضہ میں صنعت و حرفت کے قیام سے دائمی مرفہ الحالی ہاتھ آئے گی اور اگر ٹکس کا بار مدت دراز تک بھی برداشت کرنا پڑے اور مصنوعات قومی تحفظ کے واسطے ضروری ہوں تو اُن کو بخوشی برداشت کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ فوج اور بیڑوں کے مصارف برداشت کیئے جاتے ہیں قیام ٹکس کے متعلق اس قدر ہدایت ضروری ہے کہ اس کو کم مقدار میں جاری کر کے تدریج بڑہانا چاہیے تاکہ مصنوعات کی درآمد رکنے یا یکایک گرانی بڑہ جانے سے لوگ گھبرا نہ اٹھیں اور ٹکس ناقابل برداشت محسوس نہونے لگے جوں جوں درآمد بتدریج رُکے گی ملکی مصنوعات بازار پر قبضہ کریں گے اور لوگ گرانی بھی کم محسوس کریں گے حتیٰ کہ ملکی صنعت و حرفت کو کافی تامین حاصل ہو جانے کے بعد ملکی ضروریات مہیا کر سکنے کی قابلیت بھی پیدا ہو جائیگی قیام صنعت و حرفت کے چند در چند فوائد جب لوگ آنکھوں سے دیکھیں گے تو گرانی کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ کریں گے اور کچھ عرصہ بعد ارزانی خود بخود عود کر آئے گی۔ یا نہ بھی کرے گی تو صنعت و حرفت زیر بحث سے دوسرے قسم کے اہم فوائد حاصل ہوں گے جو بار گرانی کی بدرجہ اولیٰ تلافی کر دیں گے۔

ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کا دوسرا طریق یہ بھی ہے کہ سرکار کی طرف سے کسی مقررہ اصول کے مطابق مالی امداد ملے۔ چنانچہ امریکہ فرانس جرمنی آسٹریا

اور جاپان میں آج کل یہ طریق بھی رائج ہے۔ مثلاً کسی صنعت و حرفت جاری کرنے والوں کو ایک معین شرح منافع کی سرکار کی جانب سے ضمانت مل جاوے کہ اگر کاروباری منافع شرح معین سے کم رہے تو سرکار اپنی طرف سے اس کمی کو پورا کر دے گی۔ اس کو اصطلاحاً **طریق ضمانت منافع** کہتے ہیں خود ہماری سرکار نے جب ولایت کی کمپنیوں کو ہندوستان میں ریل بنانے کے ٹھیکے دئیے تو علاوہ اور طرح طرح کی رعایتوں کے طریق مذکور کے مطابق بالعموم ۵ فیصدی منافع کی اپنی طرف سے ضمانت کی تھی اور کروڑہا روپیہ اس مد میں مدتوں ادا کرنا پڑا تب کہیں ریلیں جاری ہوئیں۔ امریکہ اور میکسیکو میں بھی یہ طریق مروج ہے۔ کہیں کہیں مثلاً رومانیا اور ہنگری میں صنعت و حرفت کی دست گیری کی نیت سے اُن کو ٹکس سے مستثنےٰ کر دیا جاتا ہے یا کم از کم شرح ٹکس میں معقول تخفیف کر دی جاتی ہے۔ سوم مصنوعات کی برآمد بڑھانے کی غرض سے کرایہ آمد و رفت مال میں خاص رعائت کی جاتی ہے اور چہارم برآمد پھر علانیہ کسی شرح معین سے سرکاری امداد ملتی ہے مثلاً اگر ایک لاکھ مصنوعات یا ایک لاکھ من پیداوار کی برآمد ہو تو کارخانوں کو سرکار کی طرف سے ۳ ر فی چیز یا ۲ ر فی من کے حساب سے امداد ملے گی تاکہ دوسرے ملکوں کے بازار میں وہاں کی مصنوعات و پیداوار سے مقابلہ کرنے میں مدد ملے گویا یہ دوسرے ملکوں پر حملہ کرنے کا طریق ہے اور برآمد کی بدولت ملکی صنعت و حرفت کو جو ترقی ہوتی ہے اُس سے سرکاری صرف کی بدرجہا ولی تلافی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جرمنی فرانس اور آسٹریا نے یوں ہی برآمد پر امداد دے دے کر اپنے ملک میں شکر سازی کو اس قدر ترقی دی کہ اب تمام دنیا کا بازار انہیں تین ملکوں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اچھی سے اچھی نیشکر پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن ان ملکوں کی شکر کے سامنے ہندوستانی شکر کا ٹھہرنا محال نظر آ رہا ہے۔

حامیان تجارت آزاد ٹکس درآمد اور سرکاری امداد صنعت و حرفت کے مذکورہ بالا

نتائج سے اصولاً تو متفق ہیں یعنی ایسے نتائج کا ظہور پذیر ہونا تسلیم کرتے ہیں لیکن ٹکس اور امداد کے عملاً پھر بھی مخالف ہیں۔ مخالفت کی وجہ یہ قرار دی جاتی ہے کہ اصولاً طریق تامین جیسا ہونا چاہیے عملاً ویسا قائم کرنا نہ صرف دشوار بلکہ محال اور ناممکن ہے۔ کسی صنعت و حرفت کی موجودہ حالت سے مستقبل قریب و بعید کا صحیح اندازہ کرنا تامین کے نقصانات اور منفعت کا ٹھیک ٹھیک موازنہ کرنا اس قدر دشوار ہے کہ اس میں ہمیشہ غلطی ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ جب کہ حکومت اور کاروبار میں ایسے قریبی تعلقات ہوں گے تو خوف ہے کہ سیاست پر انفرادی اغراض و مقاصد کا رنگ چڑھے ہر طرف سے جا بیجا تامین کا مطالبہ شروع ہو اور رعایت و جانداری سے حکمرانی میں ابتری نمودار ہو۔ چنانچہ مثال کے طور پر امریکہ کی حالت پیش کی جاتی ہے جہاں آئے دن مختلف طبقے اپنی غرض کے موافق تامین کی تائید اور مخالفت کرتے اور بعض وقت گورنمنٹ کو حیرانی میں ڈال دیتے ہیں خصوصاً جمہوری حکومتوں کو جو عوام کی تائید پر قائم ہوتی ہیں اس معاملہ میں خاص دقت پیش آتی ہے۔ سب کے مطالبات پورے کر کے سب کو خوش کرنا تو محال ہے۔ لیکن فریق غالب کے خلاف رائے عمل کرنے کی بھی جرات کم کی جاتی ہے اور کاروبار میں ذاتی منفعت کو عوام کی بہبودی پر قربان کرنا معلوم۔ پس اگر تامین کی آڑ میں قابو یافتہ فرقے اپنے اپنے مطالب براری کی کوشش کریں جس سے عوام کو بجائے کسی نفع کے نقصان پہنچے تو عجب نہیں۔ حامیان تامین کے خیال میں یہ خطرہ اگر سراسر بے بنیاد نہیں تو مبالغہ آمیز ضرور ہے۔ تجربہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ باوجود مختلف فرقوں کی خود غرضانہ کوششوں کے عام بیداری کی بدولت صحیح اصول پر قائم رہ کر تامین جاری کرنا ممکن ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ اس طریق سے ملکوں کو نفع پہنچ رہا ہے۔

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ تامین روشن خیالی کے منافی ہے۔ اس میں بہت خود غرضی اور تنگ ... پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کا حقیقی منشا قومی قیام اور ترقی ہے اور یہ قدرت کے عالمگیر قانون

تنازعہ للبقا کے عین مطابق ہے اپنے وجود کا تحفظ اور ترقی کی کوشش خود قدرت نے ہر ایک پر عائد کردی ہے اپنی ہستی دوسروں کی خاطر خاک میں ملاتا انفرادی طور پر عمدہ ایثار سہی لیکن من حیث القوم اس پر عملدرآمد ہونا ممکن نہ مفید۔

محصول تامینی
محصول مال

(۱۲) جو ملک تامین تجارت کے پابند ہیں ان میں درآمد اور برآمد پر ٹیکس قائم ہونا تو ضروری ہے۔ لیکن تعجب ہوگا جن ممالک میں تجارت آزاد کا رواج ہے وہاں بھی ایسے ٹیکس موجود ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے کیا اس سے آخر الذکر ممالک کے قول و فعل میں تضاد لازم آتا ہے۔ نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ٹیکس درآمد و برآمد کی دو دو قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا فعل جداگانہ اور مختلف ہے درآمد پر ٹیکس قائم کرنے سے کبھی تو گرانی بڑھا کر درآمد کا روکنا مقصود ہوتا ہے تاکہ ملکی صنعت و حرفت کو زیادہ ترقی یافتہ حریفوں کے مقابلہ سے امان ملے اور ٹیکس کی آڑ میں وہ اپنی حالت سنبھالکر آزادانہ مقابلہ کے قابل ہو جائے یا اس قابل نہ بھی بن سکے تو ملکی مصالح کی خاطر اپنا وجود قائم رکھ سکے۔ یہ ٹیکس گویا تامین تجارت کا آلہ ہوتا ہے۔ اس کو اصطلاحاً **محصول تامین** کہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ درآمد جس قدر زیادہ بند ہوگی اُسی قدر محصول تامین کامیاب شمار کیا جائے گا۔ کیونکہ اُس کا مقصد ہی درآمد روکنا ہے اور بس۔ لیکن درآمد پر ٹیکس قائم کرنے کا مقصد کبھی محض آمدنی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ آمدنی جس قدر زیادہ ہوگی اُسی قدر ایسا ٹیکس کامیاب قرار پائے گا اور ٹیکس کی مزاحمت سے درآمد جس قدر کم رکے گی اُسی قدر آمدنی زیادہ حاصل ہوگی۔ پس ایسے ٹیکس کی بڑی کامیابی یہ ہوگی کہ حتی الامکان درآمد نہ رُکے اور آمدنی بہت زیادہ رہے۔ یہی وہ ٹیکس ہے جو آزاد تجارت والے ممالک میں بھی رائج ہے اس کو اصطلاحاً **محصول مال** کہتے ہیں غور کرنے سے ظاہر ہوگا کہ محصول تامین اور محصول مال کی غرض مختلف اور ان کے معیار کامیابی بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہیں۔ قسم اول کی غرض ملکی صنعت و حرفت کو ترقی

دیا ہے درآمد جس قدر زیادہ بند ہو اور آمدنی جس قدر کم ہاتھ آئے اتنا ہی محصول تامین کامیاب سمجھنا چاہیئے۔ اس کے برخلاف قسم دوم کا مقصد محض مالی منفعت ہے۔ درآمد جس قدر کم رکے اور آمدنی جس قدر کثیر رہے اتنا ہی محصول مال زیادہ کامیاب مانا جاتا ہے۔ گویا وہی نتیجہ ایک کی کامیابی اور دوسرے کی ناکامیابی شمار ہوتا ہے۔

محصول تامین کی ضرورت اور مواقع اوپر کی بحث سے اظہر من الشمس ہیں۔ محصول مال کی غرض خود اس کے نام سے ترشح ہوتی ہے۔ یعنی آمدنی حاصل کرنا۔ اب صرف غور طلب امر یہ ہے کہ کن صورتوں میں محصول مال قائم کرنا چاہیئے اور اس کی کامیابی کن شرائط کی پابند ہے اول تو جس چیز کی درآمد پر محصول قائم کیا جائے اس کی طلب تغیر پذیر ہوتی چاہیئے تاکہ قیمت کے اضافے سے طلب بہت زیادہ گھٹ جانے کا اندیشہ برآمد والے ملک کو دامنگیر رہے اور تخفیف طلب کے خوف سے وہ حتی الوسع قیمت بڑھانے سے محترز رہے اور کاروبار جاری رکھنے کی خاطر بشرط امکان محصول کا بار خود ہی برداشت کرے۔ بذریعہ اضافہ قیمت اس کا بار خریداران پر منتقل کر کے اپنے کاروبار کو معرض خطر میں نہ ڈالے دوم یہی ملک جو محصول قائم کرے اشیائے زیر بحث کا اکیلا یا سب سے بڑا خریدار ہو تاکہ برآمد والے ملک کا کاروبار اس ملک کی درآمد پر بیشتر منحصر ہو اور دیگر ممالک کی طلب کاروبار کو موجودہ پیمانہ پر جاری نہ رکھ سکے ایسی حالت میں برآمد والا ملک درآمد والے کا پاس خاطر بلکہ نازبرداری جس قدر بھی کرے عجب نہیں۔

جب کہ ہر دو مذکورہ بالا صورتیں یکجا ہوں تو درآمد پر محصول مال بدرجہ اعلیٰ کامیاب ہوسکتا ہے۔ یعنی درآمد بھی کم رکے گی آمدنی بھی زیادہ ملے گی اور لطف یہ کہ محصول کا جزو اعظم دوسرے ملک کی جیب سے ادا ہوگا اور قیمت نہ بڑھ سکنے کی وجہ سے اپنے ملک پر اس کا بار بہت کم پڑے گا۔ لیکن اگر شرط اول پوری نہ ہو یعنی طلب تغیر پذیر ہونے کے بجائے غیر تغیر پذیر ہو یا اضافہ قیمت پر بھی اس میں کوئی قابل لحاظ تخفیف نہ ہو تو برآمد والے ملک کی جرات بڑھ جائے گی اور وہ قیمت میں اضافہ کر کے محصول

کا بیشتر بار جو محصول قائم کرنے والے ملک پر ڈالدے تو عجب نہیں ۔ درآمد والے ملک کو آمدنی تو اب بھی حاصل ہو گی لیکن خود اپنی جیب سے ۔ اسی طرح اگر دوسری شرط غائب ہو یعنی محصول قائم کرنے والا ملک شے زیر بحث کا سب سے بڑا خریدار نہو بلکہ اور ممالک میں بھی اس کی کافی مانگ ہو اور اگر ملک اول الذکر خریداری ترک کردے تب بھی کاروبار کو کوئی مضرت نہ پہنچے تو اس صورت میں شے زیر بحث کی درآمد محصول والے ملک میں بند ہو جائے گی اور دیگر ممالک میں جاری رہے گی ۔ جب درآمد رکی تو پھر آمدنی کیسی گویا محصول مال کی غرض و غائت فوت ہو جائے گی اور اگر ہر دو شرائط ایک ساتھ مفقود ہوں تو پھر برآمد والے ملک کی چیرہ بنے گی اس کو فروخت کی طرف سے پورا اطمینان حاصل ہو گا اور شرط اوّل پوری نہونے کی حالت میں وہ قیمت جس قدر بڑھا سکتا تھا اس سے بھی زیادہ بڑھا تا اب اُس کے واسطے سہل ہو گا ۔

کون نہیں جانتا کہ اب ہر دو شرائط کا بہ تمام و کمال پورا ہونا غیر غالب ہے واقعہ یہ ہے کہ محصول مال برآمد اور درآمد والے دونوں ملک ملکر ادا کرتے ہیں ۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ کبھی ایک ملک پر زیادہ بار پڑتا ہے ۔ کبھی دوسرے پر ۔ بار کی کمی بیشی گوناگوں اسباب و حالات کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن دو خاص اسباب وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے ۔ یعنی طلب کی تغیر پذیری یا غیر تغیر پذیری اور طلب کا محصول والے ملک تک محدود ہونا ۔ یا عام ہونا ۔

جب کہ محصول مال کا بار دونوں ملکوں پر پڑے تو درآمد والے ملک میں وہ جس قدر قیمت میں اضافہ کرے گا اُسی قدر محصول تامین کا کام دے گا ۔ مثلاً فرض کرو کہ ولایت کے کپڑے پر ہندوستان میں دس فیصدی محصول درآمد قائم کیا جائے ۔ غالبًا نہ تو کپڑے کی قیمت میں پورا دس فیصدی اضافہ ہو گا اور نہ قیمت سابق برقرار رہے گی ۔ اضافہ ضرور ہو گا مگر تخفیف طلب کے خوف سے دس فیصدی سے کم ۔ فرض کرو کہ قیمت میں پانچ فیصدی اضافہ نمودار ہو تو گویا محصول کا بار دونوں ملکوں پر مساوی آپڑے گا ۔ اور کپڑا بننے والے ہندوستانی کارخانوں کو

حصہ چہارم باب چہارم

تقسیاً پانچ فیصدی سہارا مل جائے گا۔ اس اضافہ شدہ قیمت پر کپڑا تیار کرنے کا اُن کے واسطے زیادہ دشوار نہ ہوگا۔ بتدریج اُن کا کام چلے گا۔ اور ہندوستان کے بازار میں بہ نسبت سابق سودیشی کپڑے کو ولایتی سے مقابلہ کرنا آسان ہوگا اور بمصداق ہم خرما و ہم ثواب ایک ہی محصول سے مال اور تامین کی دونوں غرضیں، ایک ایک حد تک حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی کارخانوں پر بھی اگر ۵ فیصدی ٹکس قائم کر دیا جائے تو تامین کی آڑ غائب ہو جائے گی۔ اور ولایتی کپڑے سے مقابلہ کرنے میں پھر وہی زک اُٹھانی پڑے گی اور سودیشی کپڑے کی ترقی امید موہوم ہو کر رہ جائے گی واضح ہو کہ محصول درآمد کی برابر کسی چیز کی ملکی پیداوار پر بھی محصول قائم کر دیا جائے تاکہ محصول درآمد سے ملک کو تامین حاصل نہ ہو سکے تو محصول آخر الذکر اصطلاحاً **محصول متوازن** کہلائے گا چنانچہ ہندوستان میں سودیشی کپڑے پر ایسا محصول مدت سے قائم ہے

جیسا کہ ہم آگے چل کر تجارت خارجہ کی سرگذشت میں لکھ رہے ہیں گے واقعہ یہ ہے کہ ولایتی کپڑا ہندوستانی سے سلطانی غریب و امیر بلا تکلف اس کو پہنتے ہیں۔ کثرت استعمال مشین اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کی بدولت کپڑا نہایت ارزاں تیار ہوتا ہے۔ ارزانی نے طلب کی تغیر پذیری گھٹا رکھی ہے۔ یعنی قیمت بڑھنے پر بھی طلب میں کمی نہیں ہوتی۔ ولایتی کپڑے پر محصول درآمد سب سے کم یعنی صرف ۳½ فیصدی رکھا گیا ہے اور وہ بھی بصد اصرار و بادل نخواستہ بحالت موجودہ اس قلیل محصول کو خریداروں پر منتقل کرنے میں کوئی وقت پیش نہیں آتی اور خریدار بھی اضافۂ قیمت کا کوئی قابل لحاظ بار محسوس نہیں کرتے۔ خیر قیمت میں جو کچھ بھی تھوڑا بہت اضافہ ہوتا ہے اس سے کپڑا بننے والے ہندوستانی کارخانوں کو کچھ تو سہارا مل ہی سکتا تھا نہ ملنے سے تو بقدر ایک فیصدی تامین ملنی بھی غنیمت ہے لیکن اتنا موقع بھی گوارا نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ سودیشی کپڑے پر بھی ۳½ فیصدی محصول متوازن وصول کیا جاتا ہے۔ اگر سودیشی کپڑا اس بار ہی سے سبکدوش کر دیا جاتا تب بھی وہ اپنے پیروں پر سنبھل سکتا اور یوں قدم قدم پر لڑکھڑا کر نہ گرتا۔ لیکن جب کہ حکومت عوام کے ہاتھ میں ہو اور وزرا ذی اقتدار تجار کے آوردہ ہوں

تو ہندوستانی تجارت خارجہ کی کنجی لنکا شائر، منچسٹر اور لورپول والوں کے ہاتھ میں ہونا کیا عجب ہے
اور ہندوستان کا اپنی صنعت و حرفت میں انگلستان سے مدد چاہنا ظاہر ہا تھی کے دانت ہیں جو سبے
ہتیں تو اور کیا ہے۔ لیکن ترقی صنعت و حرفت کا مسئلہ آج کل سرکار ہند کے زیر غور ہے اور امید ہے کہ نتیجہ بہتر ہوگا

خیر ہندوستان کی تجارت خارجہ تو ایک ضمنی بحث تھی۔ ع۔

ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپنے چھیڑا ہم کو

محض مثال سے واقعات کا ذکر چھڑ گیا۔ دراصل بحث یہ تھی کہ محصول کی دو قسمیں ہیں۔ محصول تامین اور محصول مال۔ بالعموم محصول دوم ایک حد تک محصول اوّل کا بھی کام دیتا ہے۔ تجارت آزاد کے حامی محصول تامین اور ہر جو محصول مال بڑی حد تک تامین کا کام دے اس کے سخت مخالف ہیں۔ البتہ خاص خاص حالتوں میں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ایسا محصول مال جو بدرجہ اعلیٰ اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہو سکے گوارا کرتے ہیں۔ لیکن اصولاً اس کو بھی خالی از خطر نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ان کو قومی اندیشہ لگا رہتا ہے کہ خدا جانے کن پیچیدہ اسباب کے ذریعہ سے جن کے سلجھانے سے وہ خود بھی اپنے کو معذور قرار دیتے ہیں محصول قائم کرنے والے ملک کو نقصان پہنچ جاوے۔ جس خطرہ کا پتہ چل سکتا ہے وہ یہ ہے کہ شاید اس ملک کی برآمد گھٹ جاوے۔ یہ نتیجہ ممکن ضرور ہے لیکن اس قدر یقینی نہیں کہ قطعاً محصول مال سے دست کشی اختیار کر لی جائے۔

جس طرح کہ محصول درآمد پر قائم کیا جاتا ہے اسی طرح برآمد پر بھی جاری ہو سکتا ہے۔ برآمد پر محصول تامین قائم کرنے کی ہم نے یہ غرض قرار دی تھی کہ ایسی پیداوار خام جس کا ترقی صنعت و حرفت سے نہایت قریبی اور عام تعلق ہو۔ عرصہ تک محفوظ رہ سکے اور تجارت کی رو میں جلد نہ بہہ جائے چنانچہ اسی مصلحت سے سنہ ۱۹ء سے انگلستان میں کوئلہ کی برآمد پر محصول جاری ہے۔ لیکن محصول مال کا مقصد واہی منفعت ہوتا ہے یہاں پر یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ درآمد کی مانند برآمد پر محصول مال کن کن حالتوں میں کامیاب ثابت ہو سکتا ہے اور کب اس کے قائم کرنے سے احتراز مناسب ہے

حصہ چہارم باب چہارم

کامیابی کی دو شرط ہیں اول یہ کہ جس چیز پر محصول برآمد قائم کیا جائے اس کی طلب غیر تغیر پذیر ہو تاکہ اضافہ قیمت سے اُس کی طلب میں تخفیف ہو اور محصول کا بار خریداروں پر منتقل ہو سکے دوم یہ کہ شے زیر بحث سوائے محصول والے ملک کے کہیں اور پیدا نہ ہوتی ہو تاکہ سب ملک اس سے خریدنے پر مجبور ہوں اور بحالت اضافہ قیمت اس سے خریداری ترک نہ کر سکیں۔

ہندوستانی پیداوار میں مشرقی بنگال کا جوٹ جو کہ ایک اعلیٰ قسم کا سن ہوتا ہے ان شرائط کو بڑی حد تک پورا کرتا ہے۔ اس پر محصول برآمد قائم کیا جائے تو ضرور مالی منفعت ہو سکتی ہے جوٹ کے بعد چاول کا نمبر ہے اور اس پر کچھ محصول برآمد قائم بھی ہے۔

غور کرنے سے واضح ہو گا کہ درآمد کے محصول مال کی دو شرائط برآمد والی کی دو شرائط کے بالکل برعکس ہیں بحالت اوّل تو طلب تغیر پذیر ہونی چاہیئے اور خریدار صرف وہی ملک واحد جو محصول درآمد قائم کرے۔ بحالت دوم طلب غیر تغیر پذیر ہونی چاہیئے اور پیدائش صرف اس ملک کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے جو محصول برآمد جاری کرے۔

محصول تجارت خارجہ کی قسمیں اُن کے نتائج واضح کرنے کے بعد اب ہم اکثر ممالک کی تجارت خارجہ کی سرگذشت پیش کرتے ہیں تاکہ اصول اور عمل کے مقابلہ سے حقیقت منکشف ہو جائے۔

مغربی تجارت خارجہ کی سرگذشت

(**تجزیہ**) (۱) یورپ کی معاشی ترقی کی ابتدا اور اٹلی کا عروج (۲) ایک جرمن تجارتی کمپنی کے کارنامے (۳) انگلستان کی معاشی ترقیات کے اسباب (۴) اسپین کی عبرتناک کوتہ اندیشی (۵) پرتگال کا تلخ تجربہ (۶) جنگ نپولین کے معاشی نتائج اور فرانس و جرمن کی صنعتی ترقی (۷) امریکہ کی سبق آموز معاشی سرگذشت۔

یورپ کی معاشی ترقی کی ابتدا اور اٹلی کا عروج

(۱) بیت المقدس واپس لینے کی غرض سے جو مدتوں عیسائیوں نے مسلمانوں سے مذہبی لڑائیاں لڑیں۔ اگرچہ ان کو شکست اٹھانی پڑی اور بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ بحال رہا لیکن پھر بھی یہ جنگ ان کے حق میں سرچشمہ رحمت ثابت ہوئی۔ یورپ اس وقت تک مقابلۃً بہت پس ماندہ حالت میں تھا اور مسلمانوں کی ترقیات دیکھکر عیسائیوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان میں بھی بیداری اور ترقی کا شوق پیدا ہوا۔ حالات نے مساعدت کی۔ رفتہ رفتہ وہی قومیں جو چند صدی قبل تہذیب و ترقی میں مسلمانوں کو اپنا استاد اور رہنما مانتی تھیں آج مسلمانوں کی اتالیق بلکہ آقا نظر آتی ہیں۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تابکجا
بہرحال یورپ کے موجودہ عروج و اقتدار کی ابتدا انھی مذہبی جنگوں سے شمار کی جاتی ہے اور مسلمانوں کے رتبہ استادی میں کسی باخبر یوروپین کو کلام نہیں۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی واقعہ

حصہ چہارم ہے جس کی تفصیل سے تاریخیں بھری پڑی ہیں جس کو شوق ہو مطالعہ کرکے اپنا اطمینان کرلے

باب پنجم **اٹلی** چونکہ اسلامی ممالک کے بہت قریب تھا اور یورپ کی قومیں لڑائیوں کے دوران میں اسی ملک سے ہوکر آتی جاتی رہیں ترقی کے آثار بھی سب سے اول اسی ملک میں نمودار ہوئے اور اسی راہ سے اسلامی تہذیب کی روشنی یورپ میں پھیلی۔ چنانچہ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں اٹلی کیا بلحاظ سیاست کیا بلحاظ معیشت یورپ بھر میں سب سے پیش پیش نظر آتی تھی آئینی حکومت کے اصول پر شہروں میں میونسپلٹیاں اور صوبوں میں حکمراں انجمنیں قائم ہوئیں اٹلی کی زراعت اور صنعت وحرفت کا تو کہنا ہی کیا ہے دُور دُور تک قومیں رشک کرتی تھیں۔ ملک میں ذرائع آمد و رفت بکثرت عمدہ حالتیں تھے۔ ایشیا اور یورپ کے درمیان جو کچھ تجارت جاری تھی وہ بیشتر اٹلی والوں کے ہاتھ میں تھی انہی کے جہازوں میں مال آتا جاتا تھا مبادلات خارجہ اور بنک چلانے کے طریق بھی یورپ میں انہی نے رائج کئے خود جہازسازی کو انہوں نے بڑی ترقی دی اور طرح طرح کے معاشی قوانین وضوابط جو اب یورپ میں بکثرت رائج اول اول انہوں ہی نے مقرر کئے۔ حاصل کلام یہ کہ کیا بلحاظ زراعت اور صنعت وحرفت اور کیا بلحاظ تجارت وعام معاشی ترقیات۔ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں اٹلی یورپ کا سرتاج بنی ہوئی تھی اور جو اسباب ترقی عیسائیوں نے مسلمانوں سے سیکھے ان پر اٹلی میں تجربہ کیا گیا اور کامیاب ثابت ہونے پر یورپ کے دیگر ممالک نے اسی کا اتباع کیا عروج و ترقی کے لہلہاتے اسلامی چمن پر اس دوران میں خزاں چھاگئی اور اس چمن سے لیکر جو پودے یورپ میں بوئے گئے وہاں کاموری کے پھل پھول سے لدے ہوئے باغات رشک ارم بنے ہوئے ہیں اس زمانہ میں اٹلی کو ترقی کے وہ تمام اسباب حاصل تھے جن کی بدولت بعد کو انگلستان نے یہ عروج پایا۔ مگر ایک فرق بہت بڑا تھا وہ یہ کہ انگلستان میں قوم ہمیشہ متفق رہی۔ اگر کبھی اس میں لڑائی کٹی تو بھی قومی بہبودی کے خیال سے نہ کہ ذاتی اغراض سے اور غیر کے مقابل تو ہمیشہ ایک ہوگئی

حصہ چہارم
باب پنجم

اس کے برعکس اٹلی میں قومی اتفاق مفقود تھا۔ ہر صوبہ دوسروں کو مغلوب اور پامال کرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا اور اپنوں کے خلاف غیروں کا ساتھ دینے کو تیار تھا۔ آپس کی نااتفاقی کے ہاتھوں جو جو نقصان پہنچے اس کا قصہ طویل ہے۔ یہاں صرف اسقدر کہنا مقصود ہے کہ آپس کی بدخواہیوں کی بدولت ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت کو صدمہ پہنچا اور تیرھویں ہی صدی میں معاشی ترقیات نے اٹلی چھوڑ شمالی جرمنی میں پڑاؤ جا ڈالا۔

ایک جرمن تجارتی کمپنی ہنسا کے کارنامے

(۲) ۱۲۴۱ء میں ایک تجارتی کمپنی قایم ہوئی جس میں **شمالی جرمنی** کے رہنے والے اکثر تاجر شریک تھے جرمن زمان میں اس کو ہنسا کہتے تھے جس کے معنے ہی انجمن کے ہیں اسی صدی کے اندر اندر ہنسا کو وہ عروج ہوا کہ اکثر ممالک یورپ کی تجارت اس کے ہاتھ میں آگئی انگلستان فرانس۔ روس۔ جرمنی میں جا بجا اس کے مرکز قائم تھے اپنے ہی جہازوں میں ایک ملک کی پیداوار دوسرے ملکوں کو لیجاتی اور اس طرح یورپ بھر میں اس نے تجارت بین الاقوام کا سلسلہ پھیلا رکھا تھا۔ کچھ عرصہ میں ہنسا کا رسوخ اسقدر بڑھا کہ بادشاہ بھی ان کا لحاظ کرتے اور بلا بلا کر اپنے ملک میں اس کا کاروبار قائم کراتے تھے۔ اصول تجارت خارجہ کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے اول اول معاشی پس ماندگی کی حالت میں تجارت آزاد کچھ عرصہ تک نہایت مفید ثابت ہوتی ہے پیداوار خام کی مقدار اور قدر بڑھ جاتی ہے مزید مقدار کی قیمت اٹھنے لگتی ہے اپنے سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک کے مصنوعات دیکھ دیکھکر معاشی ترقی کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن جب لوگ صنعت حرفت سیکھنا شروع کر دیں اور کچھ اصل بھی مہیا ہو جاوے تو اپنے ہی ملک میں مصنوعات تیار کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ خیال نہایت مبارک ہے۔ اس موقع پر ملک کی تجارت خارجہ کو تامیں ناگزیر ہے حتیٰ کہ صنعت و حرفت ترقی کر کے دوسرے ملکوں کا مقابلہ برداشت کرنے کے قابل ہو جاوے بعض صنعتیں جن پر ملکی تحفظ اور قومی آزادی کا دار و مدار ہو مثلاً آلات حرب۔ جہاز سازی۔ اگر دیگر ممالک کی برابری کر سکنے کی قطعی امید نہو

تب بھی بدریعہ تا ہیں ان کو اپنے ملک میں قائم رکھنا مآل اندیشی کا اولین مقتضیٰ ہے۔ تیرھویں صدی میں انگلستان کی تجارت خارجہ ہسا کمپنی کے ہاتھ میں بہ تمام وکمال اس طرح تھی جیسے کہ کل اٹھارھویں صدی تک ہندوستان کی تجارت خارجہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں رہی۔ اس وقت تک انگلستان میں صنعت وحرفت کی حالت نہایت ردی تھی۔ پیداوار خام مثلاً اون ٹین۔ چمڑا مکھن اور غلہ انگلستان سے باہر جاتا تھا اور دیگر ممالک کی مصنوعات معاوضہ میں آتی تھیں اس زمانہ میں بلجیم صنعت وحرفت کا خاص مرکز تھا وہاں کپڑا اور طرح طرح کا سامان تیار ہوتا تھا مزید براں اٹلی کی راہ ایشیا کی مصنوعات منگا منگا کر بھی یورپ میں فروخت کرتی تھی۔

حاصل کلام یہ کہ کل تیرھویں صدی انگلستان کی تجارت خارجہ بلا روک ٹوک ہسا کمپنی کے ہاتھ میں رہی پیداوار خام انگلستان کی برآمد اور مصنوعات درآمد تھی لیکن **اڈورڈ سوم** جیسے بیدار مغز بادشاہ انگلستان نے سمجھ لیا کہ پیداوار خام پر اکتفا کرکے اس کے معاوضہ میں دیگر ممالک کی مصنوعات لیتے رہنے سے ملک کی آیندہ ترقی میں بہت دقتیں پیش آئیں گی چنانچہ موجودہ طریق کہ اون دیگر انگلستان دوسرے ملکوں سے کپڑا لیتا تھا اس کو بہت ناگوار گذرا۔ ایک طرف تو اس نے طرح طرح کی قابل قدر رعایت مراعات کے لالچ سے دوسرے ملکوں کے مشاق اور ماہر جامہ بافوں کو اپنے یہاں بلا کر آباد کرنا شروع کیا انگلستان کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں قرب وجوار کے ممالک خصوصاً فلانڈرس اور برابنٹ میں جہاں پارچہ بافوں کی آبادی بہت زیادہ تھی ان پر حکومت کی طرف سے طرح طرح کا ظلم وتشدد ہورہا تھا۔ پس جامہ باف اپنے وطن سے دور کر انگلستان اس طرح پہنچے جیسے کہ کوئی پرند بے رحم صیاد کے قفس سے چمن کی طرف اڑتا ہے اور جب ان کی کافی تعداد آپہنچی تو فوراً دیگر ممالک کے کپڑے کی درآمد روک دی گئی تاکہ لوگ اپنے ملک کا کپڑا پہنیں اور صنعت پارچہ بافی خود انگلستان میں جاگزیں

حصہ چہارم باب پنجم

ہو جاوے - تامین کا خیال ملک میں برابر قوی ہوتا گیا۔ چنانچہ مورخ ہیوم لکھتا ہے کہ پندرھویں صدی کے شروع میں سودیشی چیزیں استعمال کرنے کا شوق بہت پھیلا ہوا تھا بدیسی چیزوں سے لوگ پرہیز کرتے تھے - اوّل اوّل تو درآمد مصنوعات کے متعلق یہ شرط لگائی گئی کہ بدیسی مصنوعات کی فروخت سے جو قیمت ملے اس کل سے سودیشی مصنوعات خریدنا لازمی تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر مصنوعات کی درآمد ہے تو اُن کے معاوضہ میں برآمد بھی مصنوعات ہی کی ہو لیکن سودیشی تحریک کا جوش اس درجہ بڑھا کہ اڈورڈ چہارم کے عہد میں بدیسی کپڑے اور دیگر مصنوعات کی درآمد کی قطعاً ممانعت کر دی گئی اس تامین کی بدولت ملک میں اونی کپڑا بکثرت تیار ہونے لگا اور ایک ایسی صنعت کی بنیاد قائم ہو گئی جو اب تک انگلستان کی عظمت کی سنگ بنیاد مانی جاتی ہے -

اڈورڈ چہارم کے بعد سے جو بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ پھر ہنسا کمپنی کی باتوں میں آنے لگے - چنانچہ تجارت خارجہ میں اس کو آزادی مل گئی - مگر انگلستان کا اقبال زبردست تھا - ملکہ الزبتھ جیسی ہوشمند اور اولوالعزم حکمراں نے ہنسا کو پھر قابو میں لانا چاہا اور جب اس نے سرکشی کی تو اُس کو ملک سے خارج کر دیا - اس کے بدلہ میں انگریزی تاجر بھی جرمنی سے نکال دیے گئے اور انگلستان کو بحری تجارت میں حیران و پریشان کرنے کی دھمکی بھی دی گئی - مگر ملکہ نے ذرّہ برابر پرواہ نہ کی اور انگلستان کی صنعت وحرفت اور تجارت کے راہ ترقی سے ایک بڑی رکاوٹ مٹا دی -

انگریزی مثل ہے بدقسمتی تنہا نہیں آتی - دوسرے ملک بھی ہنسا کے تسلط سے خائف تھے اور اس کی رعونت سے تنگ آرہے تھے - ہوا اُکھڑتی دیکھکر اور سب نے ہی حملہ بول دیا - روس نے اُس سے چھین کر تجارتی حقوق انگریزی کمپنی کو دیدیے - سویڈن اور ڈنمارک نے بھی اسکو نکال باہر کیا اور انگریز اور ڈچ یعنی ہالینڈ والوں نے تجارت میں ان کا قافیہ تنگ کر دیا

حصہ چہارم باب پنجم

نشۂ دولت سے ہنسا کو پہلے ہی سُست و پست ہمت بنا دیا تھا نہ وہ اُلو العزمی باقی رہی تھی نہ وہ جفاکشی۔ بالآخر وہ جرمن کمپنی جس نے دو صدی کل یورپ کو اپنی مٹھی میں رکھا بادشاہ تک جس کا خوف اور ادب کرتے تھے ۱۶۳۰ء میں اپنے تابع ملکوں کے ہاتھوں مغلوب ہو کر عالم کاروبار سے رخصت ہوئی اور اس مہیب و کامراں رقیب پر سب سے پہلا وار انگلستان کا پڑا۔

اس کمپنی کے زوال کا ایک بڑا باعث یہ بھی تھا کہ اس میں قومیت اور وطن پرستی کی روح بالکل غائب تھی۔ اپنی دولت و ثروت کے زعم میں نہ تو وہ جرمن حکومت کو کبھی خاطر میں لائی نہ اُس سے میل ملاپ رکھا اور نہ اپنے ملک کی زراعت یا صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی کوشش کی بلکہ جو مال جہاں سستا ملا وہیں سے خریدا اور جہاں گراں دیکھا وہیں فروخت کر دیا اُس کو اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ اپنے ملک کی زراعت اور صنعت و حرفت پر کیا اثر پڑے گا اور یہ کہ ان کو ترقی دینا مقتضائے دور اندیشی ہے اُس کو تو اپنے نفع سے غرض تھی۔ جس کام میں سب سے زیادہ نفع نظر آتا اُسی کو کر گذرتی نتیجہ یہ ہوا کہ دولت کی خاطر وہ اپنے ملک کے اسباب و دولت کھو بیٹھی اور جب دوسرے ملکوں نے اپنی اپنی حالت سنبھالی تو اپنے ملک کی پس ماندگی کے ہاتھوں لاچار رہ گئی۔ یہ واقعہ اس امر کی ایک عبرت ناک مثال ہے کہ اگر تجارت خارجہ عوام کے اختیار پر چھوڑ دی جائے تو لوگ ذاتی نفع کی خاطر تجارت آزاد سے ملک کے بہترین اغراض و مقاصد پامال کر کے خود اپنے اوپر تباہی بلا سکتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ حکومت تجارت خارجہ پر مناسب نگرانی رکھے اور درآمد و برآمد پر حسب اقتضائے وقت ایسی شرایط قائم کرتی رہے کہ ملک کی سیاسی اور معاشی ترقیات میں خلل پڑنے کے بجائے اضافہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام دشوار ہے لیکن آخر دوسری قومیں اسکو سرانجام دے ہی رہی ہیں اور ان کو کس قدر بیش بہا جواہر حاصل ہوئے اور ہو رہے ہیں ع دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا میکرد۔

انگلستان کی معاشی ترقیات کی ابتدا۔

(۳) جرمنی کی ہنسا کمپنی پر زوال آیا تو انگلستان کا عروج شروع ہوا اور انگریزوں نے

اپنی معاشی ترقیات نہایت مآل اندیشی کے ساتھ ایسی مستحکم بنیاد پر قائم کیں کہ وہ ابتک جاری ہیں اوران کا تزلزل بہت غیر اغلب نظر آتا ہے اس پائداری کا راز یہ ہے کہ حکومت وتجارت میں بجائے مغائرت کے نہایت قومی تعلق رہا دونوں طبقوں کا مقصد وہی ایک تھا یعنی قومی بہبودی کاروبار میں بھی قومیت اور وطن پرستی برابر ملحوظ رہی تجارت خارجہ افراد کے ہاتھ میں محض دولت کمانیکا آلہ نہیں بنے دیگئی۔ فوری نفع کی خاطر مستقبل بہبودی قربان نہیں کی گئی دولت کی طمع میں اسباب دولت سے دست برداری نہیں دی گئی بلکہ اسی قومی خیر طلبی کے جوش میں اول اول مضر و نامورزوں مگر کچھ تجربہ کے بعد نہایت مفید و کارگر قیود و تجارت خارجہ پر عائد کی گئیں۔ جن کی بدولت اوّل زراعت اور بعدہٗ صنعت وحرفت نے کماحقہ ترقی کرکے معاشی ترقی کے سرچشمے مدّت ہائے دراز کے واسطے کھول دیے جن سے سیراب ہو ہو کر انگلستان کسقدر سرسبز اور شاداب نظر آرہا ہے۔

انگلستان کے اکثر بادشاہوں کو اپنے ملک میں صنعت وحرفت قائم کرنے اور اُن کو ترقی دینے کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ اسی غرض سے وہ نہایت سیرچشمی کیساتھ طرح طرح کی رعایات و انعامات کا لالچ دے دے کر دوسرے ملکوں سے صناع بلاکر اپنے ہاں آباد کرتے رہتے تھے مزید براں ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ صناع دیگر ممالک سے خود بخود دوڑ دوڑ کر انگلستان پہنچنے لگے عین اُس زمانہ میں جبکہ دیگر ممالک میں قومی نا اتفاقی۔ مذہبی تعصب اور حکومت کی ناقدردانی کے ہاتھوں کاریگر اور صناع بری طرح پامال ہورہے تھے۔ انگلستان میں ہر قسم کا امن و آزادی پھیلی ہوئی تھی اور اس پرطرہ یہ کہ ان نووارد صناعوں کی حکومت کی طرف سے آؤ بھگت اور دلجوئی بھی کیجاتی تھی چنانچہ بارھویں صدی سے لیکر اٹھارھویں صدی تک صناعوں اور کاروباری لوگوں کے بڑے بڑے جرگے وقتاً فوقتاً ملک ملک سے آکر انگلستان میں بستے رہے اوراُن کی صناعی اور اندوختوں سے ملک کی دولت میں جو اضافہ ہوا اُس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ سیاسی حالات نے

تنگ آکر اول پارچہ بافوں کی ایک بڑی جماعت بارھویں صدی میں فرانس سے نکلکر ویلز میں آباد ہوئی۔ پھر جو لوگ اٹلی سے جلاوطن ہوئے وہ بھی لندن میں آرہے اور لین دین کا مہاجنی کام جاری کیا۔ کئی مرتبہ فرانس سے مختلف پیشہ ور آآکر انگلستان میں رہ پڑے اسپین۔ پرتگال جرمن اور وینس سے جلاوطن کئے ہوئے یہودی بھی انگلستان ہی میں آکر پناہ گزیں ہوئے اور اپنے ہمراہ نہ صرف بہت سا مال و اسباب اور جہاز لائے بلکہ ملک میں کاروبار کا شوق اور طریق بھی انھی نے پھیلایا۔ اکثر ممالک یورپ میں جو مذہبی تعصب سے لوگوں پر بیجا جبر و تشدد کیا گیا تو سخت گیری سے تنگ آکر بہت لوگ خود اپنے وطنوں کو خیرباد کہکر انگلستان آرہے اور اپنے ساتھ بڑے بڑے اندوختے اور عجیب و غریب صنعتیں لائے یورپ کے ملک آپس میں وقتاً فوقتاً جنگ و پیکار کرتے رہتے تھے مزید براں خانہ جنگیاں نے رہا سہا امن بھی غارت کر رکھا تھا اس کے برعکس انگلستان کا جزیرہ سب سے الگ تھلگ تھا وہاں پر امن و آزادی کا دور دورہ مدتوں سے جاری تھا۔ اگر دیگر ممالک سے اس کی کچھ چلی بھی تو اندرون ملک ہمیشہ محفوظ و مصئون رہا۔ امن و آزادی کی تلاش میں بھی لوگ جوق جوق دوسرے ملکوں سے آکر یہاں بس پڑے۔ یہ نو وارد لوگ بکثرت کاروبار پیشہ اور صناع تھے اس طرح پر امن و آزادی اور قدردانی کی بدولت دوسرے ملکوں کا بہت سا اندوختہ اور بہت سی صنعتیں بلا منت انگلستان کے ہاتھ آگئیں اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صنعت و حرفت کا چمن امن و آزادی میں ہی پھلتا پھولتا ہے۔ بدامنی و تشدد سے وہ جلد اُجڑ کر خاک میں ملجاتا ہے۔

انگلستان کے حکمرانوں نے جس طرح اپنے ملک میں صناع بڑھائے اسی طرح اُن کی صنعت و حرفت قائم کرنے اور اُس کو ترقی دینے میں بھی نہایت استقلال سے کوشش کی اُنھوں نے ملکی مصنوعات کی اس طرح پر دستگیری کی جیسے کہ مہربان ماں اپنے چھوٹے بچے کی غور و پرداخت کرتی ہے اوّل اوّل جب ہنسا کمپنی تیرھویں صدی کے درمیان انگلستان

آئی تو اس وقت تک صنعت و حرفت کا تو ذکر کیا ہے۔ زراعت بھی نہایت ابتر حالت میں تھی پس ملکی ضرورت کے قابل غلہ بڑی بھلی طرح پیدا کر لیا جاتا تھا۔ ورنہ بہت سے زرخیز قطعات تو محض جنگل تھے جس میں امرا شکار کے واسطے ہرن۔ لومڑی جیسے جانور محفوظ رکھتے تھے۔ یا غیر مزروعہ کھیت تھے جن میں سور بکثرت پالے جاتے تھے وجہ یہ تھی کہ اس جانور کو بہت کم غور و پرواخت کی ضرورت ہے اس کی غذا بھی ویراں زمینوں اور جنگلوں میں بکثرت دستیاب ہو سکتی ہے۔ اس کی نسل بہت جلد بڑھتی ہے اور اس کا گوشت خوراک میں کام آتا ہے بیں بیشتر لوگ اسی جانور کے گلے پالتے تھے۔ مصنوعات کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خشک گھاس پھوس سے فرش و بستر کا کام لیا جاتا تھا۔ لیکن جونہی ہنسا نے آکر تجارت خارجہ کا دروازہ کھولا۔ ملک کی حالت میں کایا پلٹ ہو گئی برآمد کے واسطے غلہ اور اون کی طلب بڑھی تو ہر طرف زراعت پھیل گئی اور سور کی بجائے اب لوگ بکثرت بھیڑ پالنے لگے خصوصاً اون کی برآمد سے اس قدر نفع ہوا کہ امرا جو شکار کے واسطے ہرن اور لومڑی کی نسل بڑھانا اپنے حق میں سب سے زیادہ مفید سمجھتے تھے بھیڑوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک ایک کے یہاں دس دس ہزار سے لیکر پچیس پچیس ہزار تک کا گلہ رہنے لگا غلہ اور اون کے بدلے دوسرے ملکوں سے اونی کپڑا اور قسم قسم کی مصنوعات آنے لگیں جن سے ملک میں معاشی ترقی کا شوق پھیلا لیکن انگلستان کے دور اندیش بادشاہ جلد تاڑ گئے کہ اون و دیگر کپڑا لینے کے بجائے خود اپنے ملک میں کپڑا تیار کرنا بہت زیادہ مفید ہوگا۔ چنانچہ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ سب سے اول اڈورڈ سوم نے صنعت پارچہ بافی کو ترقی دینے کے لئے بدیسی کپڑا پہننے کی ممانعت کر دی۔ اس کے جانشینوں نے بھی تا این کی پالیسی جاری رکھی حتیٰ کہ وسط پندرھویں صدی کے قریب جب اڈورڈ چہارم تخت نشین ہوا تو یہ صنعت ملک میں خوب جاگزیں ہو چکی تھی۔ اونی کپڑے کی ترقی دیکھ کر اڈورڈ نے چند دوسری چیزوں کی درآمد بھی روک دی تاکہ اسی طرح وہ بھی ملک میں تیار ہونے لگیں۔ ہنسا کمپنی کی باتوں اور دباؤ میں آکر اس کے بعد انگلستان کے بادشاہوں

حصہ چہارم باب پنجم

نے ملکی صنعت وحرفت کی ترقی کا کچھ خیال نہ کرکے تجارت خارجہ میں کچھ عرصہ کے واسطے آزادی دیدی لیکن، ملکہ الزبتہ نے سولھویں صدی کے آخری نصف میں ہنسا کمپنی کا باپ ہی کاٹ دیا اس کو یکقلم ملک سے خارج کرکے تجارت خود اپنے ہاتھ میں لینے کا سرگرمی سے اہتمام شروع کیا ایک طرف تو ملکی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے خیال سے علاوہ اونی کپڑے کے چرمی اور فلزاتی سامان اور نیز دیگر مصنوعات کی درآمد روکدی اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے ملکوں سے ان چیزوں کے کاریگر بلا بلا کر آباد کئے۔ ابتک جہاز ہنسا کمپنی سے خریدے جاتے ہی تھے لیکن اس نے جہاز بھی بطور خود تیار کرانے شروع کئے اور ملکہ کے بعد سے آج کے دن تک حکومت برطانیہ نے جہاز سازی پر اسقدر توجہ رکھی اور عجیب عجیب ترکیبوں سے اپنے جہازوں کا استعمال تجارت بین الاقوام میں اسقدر بڑھایا کہ آج انگلستان کا بیڑا سب سے افضل واعلیٰ مانا جاتا ہے اس سلسلہ میں پیشہ ماہی گیری اور خود اپنی جہازرانی جو انگلستان کی معاشی تاریخ میں قابل یادگار واقعات ہیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ بوجہ قلت گنجائش یہاں پر ان کی تفصیل سے معذور ہیں اور صرف حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ انگلستان میں تامین تجارت کا طریقہ مستقل طور سے ملکہ الزبتہ کے زمانہ سے شروع ہوا اور اُس وقت تک برابر جاری رہا جب تک کہ انگلستان کی صنعت وحرفت پوری نشوونما پاکر بیرونی مقابلہ کے قابل نہ ہوگئی۔ وسط تیرھویں صدی کے قریب جب ہنسا کمپنی انگلستان میں وارد ہوئی تو وہاں بھیڑ بھی لوگ کم پالتے تھے جب اون کی برآمد شروع ہوئی تو ملک میں ہر طرف بھیڑوں کے گلے ہی گلے نظر آنے لگے۔ ایک صدی بعد اڈورڈ سوم نے بذریعہ تامین تجارت صنعت جامہ بافی کو خود ملک میں قائم کرنا شروع کیا باستثنائے چند کل جانشینوں نے اس پالیسی کو برقرار رکھا حتیٰ کہ ملکہ الزبتہ نے سولھویں صدی کے آخری نصف میں ہنسا کو ملک سے خارج کرکے ملک میں قسم قسم کی صنعت وحرفت پھیلانے اور تجارت خارجہ بالکل

اپنے قابو میں رکھنے کا اہتمام کر ڈالا خود ملکہ کے عہد میں اسی انگلستان سے جو کچھ عرصہ قبل اون کے بدلے بدیسی کپڑا خریدا کرتا تھا۔ ۲ لاکھ تھان اونی کپڑا سالانہ دوسرے ملکوں کو جانے لگا۔

جیمس اول جانشین ملکہ الزبتہ کے عہد میں سترھویں صدی کے شروع میں اونی کپڑے کی وہ کثرت ہوئی کہ انگلستان کی برآمد میں بقدر ۹/۱۰ حصہ شامل تھا اور اس کی سالانہ قیمت تین کروڑ روپیہ تخمینہ کی جاتی تھی انگلستان کا اونی کپڑا۔ روس۔ سوئڈن۔ ناروے اور ڈنمارک میں بکثرت فروخت ہونے لگا اور انگریزی تاجروں نے غریب ہنسا کے وہاں سے بھی قدم اکھاڑ دیے جیمس اوّل کے زمانہ تک انگلستان کا اونی کپڑا رنگائی اور آراستگی کے واسطے بلجیم آیا کرتا تھا۔ لیکن دوسروں کی محتاجی اتنی بھی گوارا نہ ہوئی اور چارلس اول کے زمانہ تک یہ کام بھی خود سیکھ لیا اور نہایت صاف خوش رنگ کپڑے ولایت میں تیار ہو کر باہر جانے لگے۔

انگلستان میں صنعت و حرفت کی ترقی اونی کپڑے سے شروع ہوئی لیکن انگریزوں نے اس پر قناعت کرنا عالی ہمتی کے خلاف سمجھا۔ دوسرے ملکوں کے صناع اپنے ہاں بلا خاطر تواضع آباد کیے۔ جو ملک ملک پھر کر طرح طرح کی صنعت دیکھی اور سیکھی اور جس طرح شہد کی مکھی پھول پھول کا مٹھاس چوس کر اپنے چھتے میں شہد جمع کرتی ہے اس قوم نے اپنے ملک میں دنیا بھر کی صناعی جمع کی اور جس طرح کہ ہوشیار مالی نازک پودوں کو ہوا کی تندی اور دھوپ کی تیزی سے بچا کر پرورش کرتا ہے نئی نئی صنعتوں کو انہوں نے بھی تامیں کی آڑ میں بیرونی مقابلہ کی زد سے محفوظ رکھکر ترقی دی۔ حتیٰ کہ وہ خوب جاگزیں ہو گئیں ہندوستان سے سوتی۔ ریشمی کپڑا اور چرمی سامان فارس سے قالین۔ وینس سے شیشہ آلات اور اسی طرح دوسرے ملکوں سے کاغذ۔ سن کا کپڑا گھڑیاں اور قسم قسم کی مصنوعات لے لے کر نقل کرنی شروع کی اور وہ کمال پیدا کیا کہ اصل مصنوعات بھی ماند پڑ گئیں صنعت و حرفت کی ترقی کی خاطر اب انگلستان کو دو اہتمام پیش آئے۔ اوّل یہ کہ ہر قسم کی پیداوار خام بافراط دستیاب ہوتی رہے۔ دوم یہ کہ کل مصنوعات فروخت ہوتے رہیں۔ کچھ

عرصہ تک تو بوجہ غفلت وحالتِ جنگی کے ممالک یورپ سے بھی یہ مقصد پورے ہوتے رہے لیکن وہ سنبھل گئے اور اُنھوں نے خود انگلستان کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا جیسا کہ آگے چلکر واضح ہوگا۔ انگلستان نے اپنے دو عظیم الشان مقبوضات سے مذکورہ بالا کام نکالنے کا پورا پورا بندوبست کیا۔ امریکہ تو قابو میں نہ آیا مگر ہندوستان بلاچون وچرا تعمیل ارشاد میں مُدّت سے مصروف ہے اور اس اطاعت شعاری کے صلہ میں اب خود انگلستان اُس کی صنعت وحرفت کو از سرِ نو ترقی دینے پر مائل ہوتا جا رہا ہے اور ہر وقت شناس کو پوری امید ہے کہ انگلستان ہی کے سہارے سے اور اسی کے ظلِ عاطفت میں ہندوستان کے دن پھرنے والے ہیں اور اِس وقت تک بھی برٹش حکومت سے ہندوستان کو جو فوائد پہنچ چکے ہیں وہ ضرور قابل قدر ہیں۔

یہ خیال سراسر غلط ہوگا کہ انگلستان کی کل معاشی ترقیات کا راز محض تامین تجارت ہے گویا کہ وہ پارس پتھر تھی۔ جو چیز چھوئی سونا ہوگئی۔ انگلستان کی عظمت وجہانبانی کے بہت سے اسباب ہیں اور بالخصوص وطن پرستی۔ ایثار۔ عدل۔ مساوات اور آزادی کے زبردست جذبات۔ اُولوالعزمی اور جفاکشی۔ حکمرانوں کی بیدار مغزی۔ امرا کی روشن خیالی۔ آئینی حکومت کا طریق۔ عوام کی بیداری تعلیم کی کثرت۔ سائنس کی تحقیقات۔ گوناگوں علمی ترقیات۔ ملک کا خداداد ایسا عمدہ جغرافیائی موقع۔ ملک میں کوئلہ اور لوہے کی کانوں کی کثرت اور سب سے بڑھ کر حسنِ اتفاق۔ مساعدِ حالات اور اقبال جو مدتوں سے انگلستان کے رفیق چلے آتے ہیں۔ اِن سب نے مل ملاکر انگلستان کو موجودہ رتبہ عطا کیا ہے البتہ تامین تجارت کے طریق سے ملک کے معاشی عروج کو اوّل اوّل ناگزیر مدد ضرور ملی ہے۔ اگر تجارت آزاد کے حامیوں کی ہدایت پر عمل کر کے انگلستان ارزانی کے لالچ سے دوسرے ملکوں کی مصنوعات خریدتا رہتا۔ اور اُن کی درآمد روک کر گراں اور گھٹیا سودیشی چیزیں استعمال کرنا گوارا نکرتا تو اِس میں کس کو شک ہوسکتا کہ اُس حالت کو موجودہ حالت سے زمین وآسمان کی بھی نسبت نہوتی اور انگلستان ہی کیا۔ اس واقعہ پر

تو ہر ملک کی صنعت و حرفت کی ترقی شاہد ہے۔

اسپین کی عبرتناک کوتہ اندیشی

(۴) **اسپین** کی معاشی سرگذشت بھی کس قدر عبرت آموز ہے مسلمانوں کے عہد حکومت میں اسپین کو وہ عروج حاصل ہوا جو صدیوں بعد تک بھی یورپ کے دوسرے ملکوں کو نصیب نہ ہو سکا۔ دسویں صدی عیسوی میں جبکہ تمام یورپ پر جہالت اور پس ماندگی مسلط تھی اسپین تہذیب و ترقی کا چمن بنا ہوا تھا۔ عبدالرحمن **ثالث** کے عہد میں ۹۱۲ء مسلمانوں نے اس زرخیز ملک کو روئی، شکر اور چاول کی کاشت سے تختہ عدن بنا رکھا تھا۔ ریشم کے کیڑے بھی بہ تعداد کثیر پالے جاتے تھے بھیڑوں کے بے شمار بڑے بڑے گلے موجود تھے قرطبہ اور غرناطہ میں سوتی اور ریشمی کپڑوں کے بڑے بڑے کارخانے تھے دیگر مقامات میں اونی کپڑا بکثرت بنا جاتا تھا۔ اسپین کا کپڑا دُور دُور جاتا تھا۔ علاوہ ازیں دیگر مصنوعات خصوصاً ہتیار اور کاغذ خاص طور پر مشہور عالم تھے۔ اسپین کے بندرگاہ جہاں سے بکثرت تجارت خارجہ جاری تھی بہت پررونق اور آباد تھے۔ اسپین کا بیڑا **فلپ ثانی** کے عہد تک یورپ بھر میں سب سے اوّل مانا جاتا تھا۔ غرضیکہ قومی عظمت اور معاشی ترقیات کے کل اسباب موجود تھے۔ مگر مسلمانو کے جانشین عیسائی بادشاہوں کی خودسری، سخت گیری اور مذہبی تعصب نے اس لہلہاتے چمن کو جھلس کر ہمیشہ کے واسطے برباد کر دیا۔ سب سے اوّل یہودی اور ان کے بعد مسلمان جلاوطن کئے گئے اس حماقت کا یہ نتیجہ ہوا کہ تقریباً بیس لاکھ نہایت اُلوالعزم تاجر اور زراعت ماہر اور ہوشیار صناع معہ اپنے اندوختوں کے اسپین چھوڑ کر چلدیے۔ گویا کہ معاشی ترقی کی روح نکل گئی۔ اس کے بعد جو خدا نے چھپر پھاڑ دولت دی یعنی امریکہ دریافت ہوئی اور سونا چاندی بکثرت ہاتھ لگا تو بجائے اپنے ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے ہالینڈ اور انگلستان سے مصنوعات بکثرت خریدنے لگے جس کی بدولت ان دونوں ملکوں کو بہت فائدہ ہوا۔ ان کی صنعت و حرفت کہیں سے کہیں ترقی کر گئی، بحری طاقت بھی بڑھ گئی اور

حصہ چہارم باب سوم

بالآخر انھی دونوں نے اسپین کو کال اس کے مقبوضات پر قبضہ کرلیا۔ اور تشدّد و بیکاری کے ہاتھوں اسپین کے عوام اسقدر نکمے ہوگئے کہ آج تک اسپین کو سنبھلنا نصیب نہوا۔ اور اب جبکہ حریف اسقدر غلبہ پا چکے ہوں اُس کے سنبھلنے کی امید بھی کیا ہوسکتی ہے۔ ایک زمانہ میں اسکو وہ اقتدار حاصل تھا کہ اگر اس سے کام لیا جاتا تو کیا سیاسی اور کیا معاشی ترقی میں آج کسی کو اس کا ہم پلہ ہونا دشوار تھا لیکن اس کے عیسائی حکمرانوں کا طرز عمل بعینہ ایسا رہا جیسے کہ کوئی بدنصیب رئیس زادہ ظلم اور فضول خرچیوں سے ریاست برباد کرتا ہے۔

پرتگال کا تلخ تجربہ

(۵) اب **پرتگال** کا حال سنیئے۔ اسپین کی طرح مطلق العنانی اور مذہبی تعصب کا وہاں بھی دور دورہ تھا جس کی بدولت ہزار یہودی صناع ملک سے نکالدیے گئے اور صنعت و حرفت کو سخت نقصان پہنچا زراعت تک زوال میں آگئی لیکن کچھ ہی عرصہ میں اس نے اپنی حالت سدھارنے کی تدبیر شروع کردی۔ ملک میں بھیڑوں کے گلے بڑھائے گئے۔ ۱۶۸۱ء میں سودیشی اونی کپڑا تیار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اسی غرض سے کچھ پارچہ باف انگلستان سے بلائے گئے اور چار سال ہی کے مختصر عرصہ میں اسقدر کپڑا تیار ہونیکا سامان ہوگیا کہ ۱۶۸۴ء میں بدیسی کپڑے کی درآمد کی ممانعت ہوگئی اور نہ صرف پرتگال بلکہ اُس کے بیرونی مقبوضات میں بھی سودیشی کپڑا رائج ہوگیا اور بیس سال کے اندر اندر صنعت پارچہ بافی نے ایسی ترقی حاصل کی کہ وہم و گمان سے بھی باہر تھی۔ لیکن انگلستان نے دیکھا کہ پرتگال اونی کپڑے کی تجارت میں زبردست مقابل بنا چاہتا ہے۔ پس ایسی حکمت عملی سے جو انگلستان کا ہمیشہ حصہ رہی ہے اُسکو قابو میں کیا کہ وہ پھر سر نہ اُٹھا سکا۔ ۱۷۰۳ء میں پرتگال سے ایک تجارتی معاہدہ کیا کہ پرتگال کی شراب پر بمقابلہ دوسرے ملکوں کی شراب کے محصول درآمد بقدر ایک ثلث انگلستان میں کم لیا جاوے اور پرتگال میں انگریزی اونی کپڑے پر ۲۳ فیصدی محصول درآمد لیا جاوے جیسا کہ ۱۶۸۴ء کی ممانعت درآمد سے قبل لیا جاتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ پرتگال کی حکومت کو تو محصولِ درآمد کی آمدنی کا لالچ ہوا اور زمینداروں نے خیال کیا کہ شراب کی برآمد بڑھنے سے اُن کی زمینوں کے لگان میں اضافہ ہوگا۔ لیکن معاہدہ ہوتے ہی پرتگال میں انگریزی کپڑوں کا ایسا سیلاب آیا کہ مقامی جامہ بافی بالکل جڑ سے اُکھڑ گئی اور تمام ملک میں بدیسی سستا کپڑا فروخت ہونے لگا۔ خود ایک انگریزی ہمعصر مورخ **اَنڈرسن** کا بیان ہے کہ انگریزی تاجر ایسی ترکیبیں چل چلا کر مقررہ شرح محصول درآمد یعنی ۲۳ فیصدی کے بجائے صرف اس کی نصف کے قریب ادا کرتے تھے۔ بہت سا سونا چاندی امریکہ میں پرتگال کے ہاتھ آیا تھا۔ انگلستان نے اسقدر کثرت سے مال بھیجا شروع کیا کہ پرتگال میں قیمت درآمد بقدر ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ برآمد سے بڑھ گئی۔ یہ بڑی رقم انگلستان کو بشکل نقرہ و طلا وصول ہونی شروع ہوئی حتیٰ کہ خود بقول انگریز مورخین ان قیمتی دھاتوں کی بڑی مقدار انگلستان کھنچ آئی۔ گویا معاہدہ **میتھین** نے پرتگال کا کچومر نکالدیا صنعت جامہ بافی الگ تباہ ہوئی اور ملک کی دولت الگ پانی کی طرح بہ گئی۔ رہا انگلستان اس کا کیا کہنا۔ معاہدہ سے مالامال ہوگیا ہر ایک تاجر ہر ایک مدبر اس معاہدہ پر پھولا نہیں سماتا۔ ہر ایک عالم معیشت اور مورخ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور کیوں نہو صنعت جامہ بافی کو وہ عروج ہوا کہ دیکھا چاہیے اور جو سونا چاندی ہاتھ آیا وہ عجیب ترکیب سے تجارت میں استعمال کیا گیا۔ ہندوستان میں ان قیمتی دھاتوں کی گو بہت مانگ تھی لیکن ساتھ ہی یہاں سوتی اور ریشمی کپڑے کے سوا اور کچھ برآمد کے واسطے نہ تھا۔ انگلستان نے بکمال ہوشیاری اپنے ہاں تو ان ہندوستانی مصنوعات کی درآمد بند کردی۔ حتی الوسع پیداوار خام مثل روئی و ریشم لاتے رہے اور ہندوستانی ارزاں اور نفیس کپڑوں پر انگریزی گراں اور موٹے جھوٹے کپڑے کو ہزار درجہ ترجیح دی حتیٰ کہ خود انگلستان میں صنعت پارچہ بافی جاگزیں ہوگئی لیکن جب تک یہ صنعت ہندوستان میں تباہ نہیں ہوئی۔ ہندوستانی کپڑا سونے چاندی کے معاوضہ میں خرید کر انگریزی تاجر یورپ کے دوسرے

ملکوں میں پہنچاتے رہے اور تجارت سے خوب نفع کمایا کئے۔ تجارت آزاد کے حامیوں کی نظر میں تو یہ انگریزی تاجر بڑے احمق تھے کہ عمدہ اور سستا کپڑا ملتے ہوئے محض سودیشی کے خبط سے موٹا جھوٹا اور گراں کپڑا خریدتے تھے اور اس کے برعکس دوسرے ملک جہاں ہندوستانی کپڑا جاتا تھا بڑے نفع میں تھے۔ لیکن واقعات ان کی رائے کے خلاف شہادت دیتے ہیں انگلستان نے فوری نفع کا لالچ ترک کرکے ان اسباب دولت پر قبضہ کیا کہ کچھ عرصہ بعد ملک میں ہُن برسنے لگا اور گوشہ گوشہ میں مرفہ الحالی پھیل گئی۔ اس کے برعکس جو ملک عرصہ تک سستی اور عمدہ بدیسی چیزیں خریدتے رہے۔ ان کی صنعت و حرفت خستہ حال رہی حتیٰ کہ انگلستان کی کی حکمت سمجھ کر اُنہوں نے بھی وہی طریق تامین جاری کیا اور فائدہ اُٹھایا۔ حامیان تجارت آزاد ہزار ہزار ترکیب سے ان واقعات پر رنگ چڑھائیں لیکن اصلیت کا چھپنا دشوار ہے۔ اُن کے ذہنی دلائل ایک طرف۔ اور عملی تجربہ ایک طرف۔ اوّل اوّل لوگ ان کی باتوں میں آئے بھی تھے۔ لیکن اب تو سب تامین تجارت کے طریق پر جمے ہوئے ہیں۔

جنگ نپولین کے معاشی نتائج اور فرانس اور جرمنی کی صنعتی ترقی

(۶) تمام یورپ میں ۱۷۸۹ء سے لیکر ۱۸۱۵ء تک ۲۶ سال عجیب حشر برپا رہا جسکی مثال تاریخ عالم میں ملنی دشوار ہے۔ یہ وہ قابل یادگار زمانہ ہی جبکہ انقلاب فرانس کا سیلاب اُٹھا ہوتے ہوتے فرانس کی تمام ممالک یورپ سے جنگ چھڑ گئی نپولین اعظم نے تن تنہا یورپ بھر کو ہلا ڈالا۔ یکے بعد دیگرے سوائے انگلستان کے تقریباً کل ممالک کو زیر دست کیا۔ چاہا انگلستان کو بھی پامال کرے۔ مگر اس کا اقبال زبردست تھا۔ ایسے اتفاقات پیش آئے کہ کچھ بس نہ چل سکا۔ بعدہ انگلستان سے ہندوستان چھیننے کی نیت سے ایشیا کی طرف چلا اور راستہ میں مصر پر بھی قابض ہو گیا۔ لیکن پھر انگلستان کے اقبال نے یاوری کی۔ یورپ میں پھر ایسی حالت نمودار ہوئی کہ نپولین کو مجبوراً مصر سے واپس جانا پڑا۔ نپولین کی حالت شیر ببر کی سی تھی جس طرف جھپٹتا تھا۔ میدان صاف نظر آتا تھا۔ لیکن مشیت ایزدی کچھ اور تھی باوجودیکہ اکثر ملکوں

کو بار بار مغلوب کیا مگر وہ مفتوح نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ خود فرانس جس کی خاطر اسنے ایک عالم تہ و بالا کر رکھا تھا۔ اس کی اُلوالعزمیوں سے تنگ آکر اس کا ساتھ دینے سے جان چرانے لگا۔ اپنی فوجوں تک نے سرکشی کی۔ مگر واہ رے استقلال ہمت نہ ہارنی تھی پر نہ ہاری سولہ سولہ برس کے لڑکوں کی قلیل فوج تک سے بڑے بڑے میدان جیتے۔ مگر تقدیر کے سامنے تدبیر کی کچھ نہ چلی جنگ واٹرلو میں فیصلہ کن شکست کھائی اور اُس کا اصلی باعث بھی ایک سوء اتفاق ہی خیال کیا جاتا ہے۔ بالآخر جو حریف اس کے نام سے لرزتے تھے اُنھی کے ہاتھوں وہ گرفتار ہوا اور جس طرح شیر کو کٹگھرے میں بند کرتے ہیں سب سلاطین یورپ نے اتفاق رائے کرکے اس کو سینٹ ہیلنا کے دور اُفتادہ اور غیر آباد جزیرہ میں پہنچا دیا۔ جہاں وہ چھ سال بعد ۱۸۲۱ء میں دنیا سے نامراد رخصت ہوا۔ مگر ہر فراخ دل اُس کی لاثانی عظمت کا معترف ہے اور رہیگا۔

اس پر آشوب زمانہ میں انگلستان کو نقصان تو سب سے کم پہنچا۔ لیکن جو فوائد حاصل ہوئے اُن کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔ نپولین نے تمام براعظم یورپ کو کھوند مارا مگر سرزمین انگلستان پر اس کو قدم دھرنا نصیب نہ ہوا۔ یہ ملک اس کی دست برد سے قطعاً محفوظ رہا اور اس پر طرّہ یہ کہ اُسی زمانہ میں انگلستان کی صنعت و حرفت کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوئی حتیٰ کہ مورخین کا قول ہے کہ انگلستان کو دنیا پر جو بحری اور معاشی تسلط آج حاصل ہے اس کی بنیاد اسی خوفناک زمانہ میں پڑی اور اسی جنگ نے انگلستان کو انگلستان بنا دیا۔ اوّل تو اس جنگ کے خطرہ نے قوم میں بیحد اتحاد اور مستعدی اور حب وطن بڑھا دی اور ہر کوئی ملک پر جان قربان کرنے کو تیار ہو گیا اور لطف یہ کہ ایثار کی بہت کم نوبت آئی اور یہ حیات بخش جوش قوم میں محفوظ رہا جس سے آئندہ رفتار ترقی اور بھی بڑھ گئی۔ دوم ساری دنیا کی تجارت انگلستان کے ہاتھ میں آگئی۔ جب یورپ میں جنگ چھڑی تو ہر ملک کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔

حصہ چہارم
باب پنجم

بھلا تجارت خارجہ کا کس کو ہوش تھا۔ مگر انگلستان برابر محفوظ رہا اور اس کا بیڑا بھی کچھ کم زبردست نہ تھا۔ ایشیا اور امریکہ کی کل تجارت بلاشرکت غیرے انگلستان کے قبضہ میں آگئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ طرح طرح کی کلیں اور انجن ایجاد ہو ہو کر صنعت و حرفت میں نئی روح پھونک رہے تھے شروع شروع میں انگلستان نے مصروف جنگ ممالک کو بھی ہر قسم کا سامان پہنچایا اور جبکہ دیگر ممالک مصیبت میں مبتلا تھے انگلستان تجارت خارجہ کے نفع سے مالا مال ہو رہا تھا۔ عام مرفہ الحالی میں اسقدر اضافہ ہو گیا کہ مصارف جنگ کی کثیر رقم جس کا چند سال قبل برداشت کرنا دشوار ہوتا لوگوں نے ہنسی خوشی ادا کر دی۔ حاصل کلام یہ اس جنگ سے جہاں دوسرے ملک بہت کچھ برباد ہوئے انگلستان کی قسمت جاگ اٹھی اور اس کی ترقی کے نئے نئے راستے نکل آئے اور اسی واقعہ پر کیا منحصر ہے۔ انگلستان کی کل تاریخ پڑھ جاؤ۔ اس پر نازک سے نازک وقت آئے۔ لیکن اس نے اول تو ہمیشہ اپنے ہوش و حواس برقرار رکھے اور کوشش ترک نہ کی۔ دوم حسن اتفاق و اقبال نے ہمیشہ اڑے وقت اس کا ساتھ دیا اور بڑے سے بڑا خطرہ اس طرح رفع ہو گیا جیسے چاند پر سے سیاہ بادل گذرتا ہے۔

اس زمانہ کے متعلق ابھی ایک واقعہ بتانا باقی ہے جو ہمارے واسطے سب سے زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ شروع جنگ میں تو انگریزی مصنوعات ممالک یورپ میں بکثرت پہنچا کئے۔ لیکن جب نپولین ان پر قابض ہوا تو اس نے انگلستان کی صنعت و حرفت کو نقصان پہنچانے کی نیت سے انگریزی مصنوعات کی درآمد ۱۸۰۶ء میں قطعاً روک دی۔ اگرچہ وہ عالم معیشت نہ تھا۔ لیکن معاملہ فہم بہت بڑا تھا۔ چنانچہ اس نے صاف تاڑ لیا کہ ملکی ترقی کے واسطے زراعت کافی نہیں بلکہ صنعت و حرفت بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھنی چاہیے اس کا مقولہ تھا کہ بحالت موجودہ جو ملک تجارت آزاد کے طریق پر عمل کرے گا ایک نہ ایک دن ضرور منہ کے بل گرے گا۔ اس زمانہ میں دوسرے ملکوں کی صنعت و حرفت بہت پس ماندہ حالت میں

تھی اور انگریزی مصنوعات کے مقابلہ کی زد میں رہ کر ان کا پنپنا محال تھا۔ لیکن جب ۱۸۰۶ء میں پرتگال سے لیکر روس تک یورپ کے شمالی ساحل پر انگریزی مصنوعات کی درآمد رک گئی تو ملکوں کو مصنوعات خود تیار کرنے کی ضرورت پڑی۔ فرانس اور جرمنی اگرچہ جنگ سے خستہ حال ہو رہے تھے لیکن وہاں پہلے سے موافق اسباب موجود تھے صرف تامین کی دیر تھی۔ درآمد رکتے ہی وہاں کی صنعت و حرفت میں جان پڑنی شروع ہوئی اور صرف دس سال کے اندر اندر اچھی خاصی ترقی کرلی لیکن جب ۱۸۱۵ء میں نپولین گرفتار ہوا اور یورپ میں جنگ ختم ہوئی تو یکایک انگلستان سے مصنوعات کا سیلاب آنا شروع ہوا۔ گویا کہ مقامی صنعت و حرفت کی بیخکنی مقصود تھی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں پارلیمنٹ کے ایک صاف گو ممبر لارڈ بروگھم نے اپنی تقریر میں انگلستان کی حکمت عملی کا راز افشا بھی کر دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہمکو انگریزی مصنوعات کی برآمد پر نقصان بھی برداشت کرنا سراسر مفید ہے تاکہ دوسرے ملکوں کی صنعت و حرفت ایام طفولیت ہی میں دم گھٹ کر مرجاویں ایک دوسرے ممتاز ممبر مسٹر ہیوم نے بھی کھلے الفاظ اس ہی خیال کا اپنی تقریر میں اعادہ کیا۔ باوجود ہزار ترقی فرانس اور جرمنی کی صنعت و حرفت مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتی تھی۔ درآمد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی صنعت و حرفت پھر پس پا ہونی شروع ہوئی۔ بیکاری کے پھیلنے سے صناعوں میں ہر طرف شور برپا ہوگیا۔ اب تو دوسرے ملکوں کی بھی آنکھیں کھلیں۔ مقابلہ کی تباہی اور تامین کی قدر اور ضرورت پورے طور پر محسوس ہونے لگی اگرچہ قبل جنگ ان ملکوں کو تجارت آزاد کا اشتیاق پیدا ہوچلا تھا۔ مگر اس تلخ تجربہ کے بعد انھوں نے تامین کا ایسا دامن پکڑا کہ آج تک اس کو نہیں چھوڑا۔ اور اسی کے ظل عاطفت میں صنعت و حرفت کو موجودہ ترقی حاصل ہوئی۔ جو ملک باقی تھے انھوں نے بھی دیکھا دیکھی طریق تامین جاری کیا اور اب تک اسی کو وہ اپنے حق میں مفید سمجھتے ہیں۔ اسی جنگ کے بعد سے انگلستان نے تجارت آزاد کی تلقین شروع کی جو اب تک بڑے شدومد سے جاری ہے

حصہ چہارم باب پنجم

اور اسی وقت سے وہ اس طریق پر کار بند بھی ہے۔ لیکن دوسرے ملک بوجہ فرق حالات اب تک تامین ہی اپنے حق میں سب سے بہتر خیال کرتے ہیں اور اگر ترقی یافتہ ممالک سراسر نادان اور احمق نہیں تو یہی طریق درحقیقت ان کے واسطے مفید ہوگا۔ ان کی صنعت وحرفت کی ترقیاں اور مرفہ الحالی اظہر من الشمس ہے۔ اگر تامین مضر ہوتی تو یہ حالت کیونکر ہو سکتی تھی بہرحال اسوقت صرف انگلستان اور اس کا شاگرد رشید ہندوستان تجارت آزاد کے طریق پر عامل ہے۔ ورنہ سب ترقی یافتہ ممالک میں کم وبیش تامین قائم ہے۔ انگلستان نے تو صدیوں تامین کی آڑ میں رہ کر اپنی صنعت وحرفت کو اس قدر ترقی دے لی کہ اب اس کو بیرونی مقابلہ کا کوئی ڈر نہیں رہا۔ اور اس کے واسطے تجارت آزاد موزوں ہے۔ تاکہ سامان درآمد ارزاں رہے اور بیرونی مقابلہ کے خوف سے ترقی بھی برقرار رہے لیکن دوسرے ملک جنھوں نے حال ہی میں تامین کا سہارا لیا ہے اور جن کی صنعت وحرفت بیرونی مقابلہ کی تاب ابھی نہیں لا سکتی۔ وہ تو موجودہ طریق پر ہی قائم رہینگے حتیٰ کہ ان کی حالت بھی انگلستان کی سی ہو جاوے اور بیرونی مقابلہ سے نڈر ہو کر تجارت آزاد جاری کردیں اور اگر ان کو یہ رتبہ نہ بھی حاصل ہو سکے تو بھی بحیثیت مجموعی بہ نسبت تجارت آزاد کے طریق تامین ہی زیادہ مفید ثابت ہوگا۔

امریکہ کی سبق آموز معاشی سرگذشت

(۷) سب کو معلوم ہے کہ اسپین کے مشہور عالم سیاح کولمبس نے سب سے پہلے ۱۴۹۲ء میں امریکہ کا پتہ لگایا اور اوّل اوّل اس کل براعظم پر اسپین قابض ہوگیا۔ یہاں پر سونا چاندی بکثرت دستیاب ہوا گویا کہ بلا مبالغہ زمین نے دولت اُگل دی۔ اتنی دولت دیکھکر اسپین کی آنکھیں پھٹ گئیں اور بجائے اپنے ہاں صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لگا دوسرے ملکوں سے مصنوعات خریدنے۔ اسپین کی خریداری کی بدولت انگلستان میں صنعت وحرفت نے بہت عروج پایا اور سونے چاندی کی مقدار کثیر کھنچکر وہاں چلی گئی جس سے

بڑے بڑے کام نکلے - کچھ عرصہ میں جب اسپین سب دولت لٹا چکا تو اس کو حقیقت معلوم ہوئی مقابلہ اور کس مپرسی کے ہاتھوں اس کی صنعت و حرفت سب خاک میں مل چکی تھی - اب نہ دولت باقی رہی اور نہ اسباب دولت - اس دوران میں حریف اسقدر غلبہ پا چکے تھے کہ اُس کو سر اُٹھانیکا کوئی موقع نہیں دیا اور جو اسپین مسلمانوں کے عہد میں یورپ کا سرتاج تھا وہ ناعاقبت اندیشی کی بدولت آج کس قدر خستہ حال نظر آتا ہے -

جب دولت لُٹ چکی تو اب اسپین کی ہوا اُکھڑی اور مقبوضات بھی ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے - اُس کے بیڑے کی بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن ملکہ الزبتھ کے عہد میں جو انگلستان سے بحری جنگ ہوئی تو پاش پاش ہو کر بیڑے کا بھی خاتمہ ہو گیا - اب کیا تھا اسپین کو اپنا آپا سنبھالنا دوبھر ہو گیا - انگلستان اور فرانس نے چند ہی سال میں اسپین کو خارج کر کل شمالی امریکہ کا آپس میں حصہ بخرہ کر ڈالا - سترھویں صدی کے شروع سے اٹھارھویں صدی کے نصف تک انگلستان اور فرانس اپنے اپنے ملکی مقبوضات بڑھانے میں بسر گرمی تمام کوشاں رہے بالآخر جوشش رقابت میں ذرا سے بہانہ پر ان دونوں ملکوں کے درمیان ۱۷۵۶ء میں مشہور جنگ ہفت سالہ چھڑ گئی - یورپ - ہندوستان اور امریکہ تین میدان کارزار قرار پائے - اول اول انگلستان کو نہایت مایوس کن زکیں پہنچیں معلوم ہوتا تھا کہ خدانخواستہ اس کا وقت آن پہنچا - مگر واہ رے اقبال و استقلال یکایک پانسہ پلٹا اور ایسا پلٹا کہ ہر طرف انگلستان کی فتح و نصرت کا ڈنکا بجنے لگا - انگلستان کے معاون **فریڈرک اعظم** نے ۱۷۵۸ء میں فرانس کو ایک ایسی زبردست شکست دی کہ یورپ بھر میں اس کی ہوا اُکھڑ گئی اور اسی فتح سے سلطنت جرمنی کی موجودہ عظمت کی بنا پڑی - اسی سال یعنی ۱۷۵۷ء میں کلائیو نے ہندوستان میں **پلاسی** کی مشہور لڑائی جیتی جس سے کل صوبہ بنگال پر انگلستان کا قبضہ ہو گیا اور **آئرکوٹ** نے فرانسیسیوں کا

پچھا کرتے کرتے ۱۷۶۱ء تک ہندوستان کو اُن سے صاف کردیا۔ امریکہ میں ۱۷۵۹ء میں **جنرل وُلف** نے **کوئبک** کی لڑائی میں فرانسیسیوں کی ایسی خبر لی کہ ان کے اس ملک سے قدم اُکھڑ گئے اور سنہ ۱۷۶۰ء تک کل شمالی امریکہ پر انگلستان کا پھریرا لہرانے لگا۔ حاصل کلام یہ کہ اس جنگ ہفت سالہ میں انگلستان کا خوفناک رقیب فرانس۔ یورپ میں ضعیف و حقیر ہوا اور ہندوستان و امریکہ سے سراسر خارج ۔ سنہ ۱۷۵۶ء سے لیکر سنہ ۱۷۶۱ء تک پانچ سال کے اندر اندر انگلستان کی عالمگیر سلطنت اور تجارت کی بنیاد باستحکام تمام قائم ہوگئی۔

ہم کو یہاں انگلستان اور امریکہ کے ان تعلقات پر نظر ڈالنا ہے جو کامل قبضہ کے بعد سنہ ۱۷۶۳ء سے جاری ہوئے۔ اب تک امریکہ میں تمام پیشہ زراعت ہی زراعت تھا۔ اوّل ہی سے انگلستان کو بیرونی مقبوضات پر حکمرانی کرنے کا اسقدر فکر نہیں ہوا جتنا کہ وہاں پر اپنی تجارت بڑھانیکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ترقی تجارت اصلی غرض و غایت ہوتی تھی ۔ اور ملکی قبضہ و حکومت غرض پوری کرنے کا محض ایک ذریعہ ۔ چنانچہ آدم اسمتھ نے انگریزوں کے اس قومی خاصہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محض خریدار بڑھانے کی نیت سے بڑی سلطنت قائم کرنا بادی النظر میں ایک ایسا منصوبہ معلوم ہوتا ہے جو دکانداروں کی قوم کے واسطے موزوں ہوگا۔ اسی حوالہ سے لوگ انگریزوں کو طنزاً **قوم دکانداران** کہتے ہیں لیکن یہ اُن کی غلطی ہے اگر سچ پوچھو تو اسی حکمت عملی نے سلطنت برطانیہ کو وہ استحکام بخشا ہے کہ کسی کے ہلائے نہیں ہل سکتی۔ اور آج اسی عاقل قوم کے سامنے بڑے سے بڑے سیاہ جرار اور جنگجو طبقے سر جھکاتے ہیں۔

تجارت کے متعلق انگلستان کا جو اصول ہے وہ بار بار بیان ہو چکا ہے۔ دوسرے ملکوں سے پیداوار خام لیکر ان کو اپنی مصنوعات دینا۔ آج تو ہر ترقی یافتہ ملک اسی اصول پر

کاربند ہونے کی کوشش کر رہا ہے لیکن انگریزوں نے صدیوں قبل اس پر عملدرآمد شروع کر دیا تھا۔ چودھویں صدی سے وہاں پر صنعت و حرفت کو قائم کرنے اور ترقی دینے کی مسلسل کوشش جاری تھی۔ اور جب دیگر مقامات پر قبضہ شروع ہوا تو وہاں صرف پیداوار خام بڑھانے میں پوری کوشش صرف کر دی۔ نئی صنعت و حرفت کو تو جاری نہیں ہونے دیا۔ اور قدیم صنعت و حرفت کو طرح طرح سے زیر بار کر کے ختم کر دیا۔ تاکہ انگلستان اور اُسکے مقبوضات میں مذکورہ بالا اصول کے مطابق تجارتی تعلقات قائم ہوسکیں جیسا کہ ابھی واضح ہوگا صنعت و حرفت کے بارے میں طریق اوّل تو امریکہ کے ساتھ برتا گیا اور طریق دوم ہندوستان کے ساتھ۔ اوّل ہم امریکہ کو لیتے ہیں۔

امریکہ پر قبضہ ہوتے ہی وہاں کے باشندوں کو جو یورپ سے آ آکر آباد ہوگئے تھے نہایت شفقت و اخلاص کے ساتھ مشورہ دیا گیا کہ خدا نے تم کو کیسا وسیع اور زرخیز ملک دیا ہے۔ خود قدرت کا منشاء ہے کہ یہاں زراعت ہو۔ پس تم اس پیشہ کے سوا سے کسی دوسرے پیشہ کا نام بھی نہ لو۔ اسی سے تم مالامال ہوجاؤ گے۔ رہی صنعت و حرفت وہ تمہارے واسطے ناموزوں ہے۔ جتنی مصنوعات درکار ہوں۔ عمدہ سے عمدہ اور ارزاں سے ارزاں ہم سے خریدتے رہو۔ زراعت تم کرو۔ اور صنعت و حرفت ہم چلاویں۔ پیداوار خام کا مصنوعات سے مبادلہ ہوتا رہے گا۔ اور یہ تقسیم عمل فریقین کے حق میں نہایت موزوں اور ازحد مفید ثابت ہوگی تاکہ امریکہ انگلستان کی مصنوعات کا ایک بڑا بازار بنجائے ایک طرف تو دیگر ممالک سے امریکہ میں درآمد قطعاً روک دی۔ دوم جس صنعت نے بھی امریکہ میں ذرا سر اُٹھایا اُسی کو دبا دیا۔ اوّل امریکہ والوں نے اونی کپڑا بننا شروع کیا تو اُن کو روک دیا۔ پھر انھوں نے ٹوپیاں بنانی شروع کیں لیکن اپنے مقام تا ہر اُن کو ٹوپیاں بھیجنے کی ممانعت کردی گئی۔ لوہا اور کوئلہ بکثرت موجود تھا اور لوہے کا سامان

حصہ چہارم
باب پنجم

بنانے کے واسطے کل حالات نہایت موافق تھے۔ لیکن **ولیم پٹ** جیسے فخر انگلستان روشن خیال مدبر نے صاف حکم دیدیا کہ امریکہ کے مقبوضات میں گھوڑے کے نعل کی ایک کیل تک نہیں بننے دینی چاہئے۔ اوّل تو امریکہ والے خود انگریزوں کے عزیز و قریب تھے انگلستان کی ترکیبوں کو خوب سمجھتے تھے۔ دوم جبر و استبداد سے اس قدر تنگ ہوگئے کہ انگلستان کے اختیارات توڑنے کا عزم بالجزم کرلیا۔ صرف موقع کے منتظر رہے اور وہ بھی جلد ہاتھ آگیا۔

۱۷۶۵ء میں انگلستان نے امریکہ میں ایک **اسٹامپ ایکٹ** جاری کیا جس کا منشاء یہ تھا کہ قانونی دستاویزات پر کچھ فیس وصول کی جاوے۔ امریکہ والوں نے اس کی مخالفت کی اور صاف کہہ دیا کہ چونکہ ہمارے نمایندے برٹش پارلیمینٹ میں موجود نہیں۔ انگلستان کو ہمارے اوپر ٹیکس عائد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قضیہ مٹانے کے لئے ایکٹ مذکور تو خارج کردیا گیا۔ مگر ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ وہ یہ کہ آیا انگلستان کو مقبوضات پر ٹیکس مقرر کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ انگلستان نے اپنا یہ حق تسلیم کرانے کی غرض سے صرف چاء پر ایک برائے نام ٹیکس پھر جاری کرنا چاہا۔ لیکن امریکہ والے آپے سے باہر ہوگئے۔ اور لگے ملک بھر میں فساد اور بلوے کرنے۔ انھوں نے بڑے بڑے جلسہ کرکے عہد کیا کہ انگریزی مصنوعات کو ہم ہاتھ نہ لگائیں گے اور کسی حالت میں بھی مادر انگلستان کا ہم پر محصول قائم کرنے کا حق تسلیم نہ کریں گے لیکن انگلستان سے جدا ہونے کا خیال ان کے دل میں ابتک نہ تھا۔ چنانچہ مصالحت و تصفیہ کی غرض سے انھوں نے انگلستان کو ایک عرضداشت بھیجی۔ جس میں ان کی کل شکایات برائے دادرسی درج تھیں۔ لیکن حکومت برطانیہ نے اُس کو بلاجواب یہ کہہ کر واپس کردیا کہ از روے قانون تم کو ایسی کارروائیوں کا کوئی منصب حاصل نہیں

اور یہ تمہاری عرضداشت قابل توجہ ہوسکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کی سرزنش کے واسطے فوجیں جمع کرنی شروع کردیں۔ انگلستان کی چیرہ دستی دیکھکر پھر تو اُن کے خیالات بھی بدلے۔ دل میں لڑائی کی ٹھان لی اور ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو ایک عظیم الشان جلسہ کرکے اپنی آزادی کا اعلان کردیا۔ بعد کو جنگ چھڑی تو اُس میں انگلستان کو زک ہوئی اور بالآخر اپریل ۱۷۸۳ء میں انگلستان کو بھی امریکہ کی آزادی باقاعدہ تسلیم کرنی پڑی۔

آزاد ہوتے ہی امریکہ والوں نے اوّل اپنی زنجیر صنعت وحرفت کو رہا کرکے اُس کو ترقی دینے کی فکر کی۔ امریکہ کا سب سے پہلا پریزیڈنٹ **واشنگٹن** جس نے بحیثیت سپہ سالار لڑکر امریکہ کو انگلستان سے آزاد کرایا جب پہلی مرتبہ امریکہ کی کانگریس میں نمودار ہوا تو سودیشی کپڑے کا لباس زیب تن کئے ہوئے تھا تاکہ اچھی طرح پر قوم کے ذہن نشین ہوجاوے کہ ملکی صنعت وحرفت کو ترقی دینا ہر ایک کا کسقدر اہم فرض ہے۔

۱۷۸۹ء میں محصول درآمد و برآمد کا قانون پورے طور پر جاری ہوا۔ اس کا بنیادی اصول کم وبیش تابیں تجارت ہی تھا۔ امریکہ کی صنعت وحرفت نے یہ زور پکڑا کہ تیسرے ہی سال **واشنگٹن** نے اپنی قوم کو عام مرفہ الحالی کی نمایاں ترقی پر مبارک باد دی۔ ۱۸۰۳ء میں سوت کاتنے کے صرف چار کارخانے جاری تھے پانچ سال کے عرصہ میں ان کی تعداد پندرہ ہوگئی۔ جن میں آٹھ ہزار تکلے موجود تھے۔ ۱۸۱۱ء میں تکلوں کی تعداد اسی ہزار اور ۱۸۱۵ء میں پانچ لاکھ تھی۔ کپڑا بننے میں ایسی حیرت انگیز ترقی ہوئی کہ ۱۸۰۰ء میں صرف پانسو گٹھے روئی سودیشی کپڑا بننے میں کام آئی لیکن ۱۸۱۵ء میں ایسے گٹھوں کی تعداد نوّے ہزار تھی۔ ۱۷۸۹ء سے لیکر ۱۹۰۹ء تک محصول درآمد وبرآمد

کے قانون میں طرح طرح کی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ کبھی تامین ضعیف بھی کر کر دی۔ لیکن بحیثیت مجموعی اُس وقت سے لیکر آج تک امریکہ میں تامین برابر قائم ہے اب چونکہ امریکہ کی صنعت و حرفت بہت عروج کو پہنچ گئی ہے۔ موجودہ پریذیڈنٹ مسٹر ولسن کا خیال ہے کہ محصول درآمد گھٹانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور چند محصول گھٹ بھی چکے ہیں تامین کے نتائج جس قدر امریکہ کی مختصر تاریخ میں واضح طور پر نمایاں ہیں۔ کسی اور ملک کی تاریخ میں نہیں۔ ایک ملک جس کو زراعت کے سوا کچھ نہیں آتا تھا جو کہ ایک زبردست سلطنت کا ماتحت تھا۔ مگر جس کو خدا نے ترقی کے وسائل اور اُمنگ ضرور عطا کی تھی۔ آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے۔ ایک خودمختار و ذی اقتدار سلطنت اور دولت و صنعت کا مخزن بن گیا۔

یورپ اور امریکہ کا حال تو بیان ہو چکا اب ذرا غور و توجہ سے مادر ہند کی سرگذشت سنیئے جو اگلے باب میں مختصراً مذکور ہے۔

ہندوستان کی تجارت خارجہ کی سرگذشت

تجزیہ (۱) ذرائع معلومات (۲) ہندوستان اور یورپ کے قدیم تجارتی تعلقات (۳) انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں ورود اور مابعد ملکی تسلط (۴) ہندوستان کا سلطنت برطانیہ سے الحاق (۵) ہندوستان اور انگلستان کے قدیم تعلقات کا خلاصہ (۶) اٹھارویں صدی میں ہندوستان کی صنعت وحرفت (۷) ہندوستانی صنعت وحرفت کی تباہی کی عبرتناک داستان (۸) ہندوستان میں صنعت خارجہ کا حاضر و مستقبل (۹) ہندوستان کا ماضی و مستقبل۔

ذرائع معلومات

(۱) گذشتہ تین صدی میں یعنی سنہ ۱۶۰۰ء سے لیکر آج کے دن تک ہندوستان کی تجارت خارجہ جن اصول پر جاری رکھی گئی اور جو جو نتائج ظہور پذیر ہوئے۔ اُن کا سادہ خاکہ دکھانا مقصود ہے۔ جو کہ اس درجہ عبرت آموز اور افسوسناک ہے کہ لوگ نہ صرف اُسکو پیش کرتے ہوئے جھجکتے ہیں بلکہ عجیب وغریب توجیہات سے بزعم خود اُس کی مصلحت آمیز پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر علمی تحقیق کے طور پر کوئی واقعات دریافت بھی کرے تو وہ جھٹلایا جاتا ہے اسکی تاریک خیالی اور تنگ نظری کا مضحکہ اڑتا ہے لیکن اصلیت پر کبتک پردہ پڑا رہ سکتا ہے اور خصوصًا ع نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا۔ علاوہ مورخوں اور سیاحوں کے بیانات کے خود ہندوستان کے اعلیٰ

حصہ چہارم
باب ششم

عہدہ دار انگریزوں کی تحریرات اور انگلستان کی پارلیمنٹ اور کمیشنوں کی رپوٹیں موجود ہیں جن سے اصلی حالات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ البتہ یہ ذرائع معلومات ہر کسی کو دستیاب ہونے دشوار ہیں۔ چنانچہ ہم بھی ہندوستان کے سرمایہ ناز مصنف رومیش چندر دت کی تصانیف کے خاص طور پر ممنون ہیں۔ ورنہ اکثر انگریزی کتابوں میں ان کا حوالہ ملنا تو درکنار درپردہ تردید نظر آتی ہے اور کہیں کہیں تو واقعات اور بیانات کے اختلاف پر بیساختہ وہی مثل صادق آتی ہے **شعر**

مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی
اُنھیں مرنیکا بھی ابتک نہیں اعتبار ہوتا

حضرت اکبر بھی بعید از حقیقت بیان کا مروجہ طریق یوں جتاتے ہیں

گھر سے آئی ہے خبر آج ہے جہلم اُس کا
پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

ہندوستان اور یورپ کے قدیم تجارتی تعلقات

(۲) اس بحث کی طرف رجوع کرنے سے قبل مختصراً یہ وضح کرنا بے محل نہو گا کہ اوّل اوّل ہندوستان اور یورپ میں تعلقات تجارت کس طرح قائم ہوئے اور بالآخر ہندوستان اور انگلستان کے درمیان موجودہ رشتہ کب اور کیونکر قرار پایا ایک اپنی مختصر اور مقبول عام تاریخ ہند میں مارسڈن صاحب نے ہندوستان اور ممالک یورپ کے ابتدائی تعلقات کا بہت صاف نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں ہندوستان کا مال یورپ کو اونٹ اور خچروں پر لد کر جایا کرتا تھا۔ ہندوستان سے جو کارواں یورپ کو روانہ ہوتے وہ افغانستان۔ فارس اور ایشیاے کوچک میں ہوکر گذرتے تھے۔ جب عربوں نے ان ممالک کو فتح کر لیا تو یہ تجارت بہت کچھ بند ہو گئی۔ سینکڑوں برس تک اہل عرب اور عیسائیوں میں جنگ و

حصۂ چہارم
مات ہشتم

حدال رہی۔ اس سبب سے سوداگر پرانے راستے سے مال نہیں لیجا سکتے تھے۔ جب خشکی کے ذرائع آمدورفت یوں مسدود ہوئے تو یورپ والوں کو فکر پڑی کہ کوئی سمندر کا راستہ نکالنا چاہیئے۔

ایک زمانہ تھا کہ اولوالعزمی اور جہازرانی میں پرتگال والے یورپ بھر میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور کوئی دوسری قوم اُن سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی چنانچہ ہندوستان اور یورپ کے درمیان بحری راستہ سب سے پہلے انہی پرتگیزوں نے دریافت کیا۔ انھوں نے سمندر میں جہاز چھوڑکر افریقہ کے ساحل کے برابر برابر چلنا شروع کیا حتیٰ کہ جنوب میں پہنچکر جو مڑے تو بحر ہند میں آنکلے۔ ہوتے ہوتے ایک مشہور پرتگیز کپتان **واسکوڈے گاما** چند جہاز لیکر ۱۴۹۸ع میں ہند کے مغربی ساحل پر آیا اور شہر کالیکٹ میں وارد ہوا وہاں کا راجہ **زمورن** کہلاتا تھا اُس نے واسکوڈے گاما کو شاہ پرتگال کے نام ایک خط دیا جس میں تحریر تھا کہ میرے ملک میں دارچینی۔ لونگ کالی مرچ اور ادرک کثرت سے ہوتے ہیں۔ میں تمھارے ملک سے سونا چاندی مونگا اور قرمزی مخمل چاہتا ہوں۔ اُس وقت سے سو برس بعد یعنی ۱۶۰۰ع تک ہند کی بحری تجارت بالکل پرتگیزوں کے ہاتھ میں رہی انھوں نے مقام گوآ میں ایک مضبوط قلعہ بنا لیا تھا۔ آج تک یہ مقام پرتگیزوں کے قبضہ میں چلا آتا ہے۔

یورپ کی باقی قوموں نے جو دیکھا کہ ہندوستان کی تجارت سے پرتگال والے مالامال ہوگئے ہیں تو اُن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور شوق ہوا کہ کسی نہ کسی طرح اس تجارت میں شریک ہونا چاہیئے۔ پس **ہالینڈ۔ انگلستان۔ فرانس۔ ڈنمارک جرمنی** اور **سوئیڈن** کے تاجروں نے اپنے اپنے جہاز بھیجنے شروع کیے۔ مگر کچھ کامیابی حاصل ہوئی تو صرف ہالینڈ۔ انگلستان اور فرانس والوں کو۔ باقی کو کچھ نفع

حصہ چہارم باب ششم

نہ ہوا۔ چنانچہ صرف انھی تینوں نے رفتہ رفتہ ہندوستان کے ساتھ تجارت بڑھانی شروع کی۔ باقی سب برداشتہ خاطر ہو کر گھر بیٹھ رہے۔

پرتگیزوں کے بعد ہندوستان میں ڈچ آئے یہ یورپ کے اُس چھوٹے سے ملک کے باشندے تھے جسے ہالینڈ کہتے ہیں اب تو ان کی طاقت و ثروت بہت کم ہے مگر تین سو برس گذرے جب یہ یورپ کی تمام جہازراں قوموں میں نمبر اول مانے جاتے تھے اور جہاز بھی انھی کے سب سے اچھے تھے۔ چونکہ ڈچ پرتگیزوں سے زبردست تھے انھوں نے جلد ہی ان کو گوآ کے سوا تمام مقامات سے نکال باہر کیا۔ اور ۱۶۰۰ء سے لیکر ۱۸۰۰ء تک ہندوستان کی تجارت خارجہ خاص طور سے ان کے ہاتھ میں رہی۔ انھوں نے جزائر سیلون۔ جاوا اور سماترا میں بھی اپنے تجارتی مرکز قائم کر رکھے تھے۔

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں ورود اور ماعد ملکی تسلط

(۳) ۱۶۰۰ء میں لندن کے کوئی سو تاجروں نے ہندوستان کے ساتھ تجارت قائم کرنے کا منصوبہ باندھا۔ چنانچہ اس غرض سے اُنھوں نے ایک کمپنی بنائی جس کا نام **انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی** تھا کمپنی نے الزبتھ ملکہ انگلستان سے ہندوستان کو جہاز روانہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔ اس زمانہ میں اکبر ہندوستان کا شہنشاہ تھا ۱۶۱۲ء میں کمپنی نے سورت میں جو سلطنت مغلیہ کا سب سے بڑا بندرگاہ تھا ایک تجارتی کوٹھی بنائی کمپنی کے گماشتے سال بھر ہندوستان کا مال خرید خرید کر کوٹھی میں جمع کرتے اور جب انگلستان سے جہاز مال لیکر آتے تو اُس مال کو اپنی کوٹھی میں اُتار لیتے اور انھی جہازوں میں ہندوستان سے مال یورپ کو روانہ کر دیتے تھے۔ کالی مرچ چاول۔ روئی۔ نیل۔ ادرک۔ گرم مصالحہ۔ ناریل۔ پوست۔ نیشکر وغیرہ چیزیں انگلستان جیسے سرد ملک میں پیدا نہیں ہوتی تھیں قدیم زمانہ میں ہندوستان میں روئی۔ ریشم اور اون کے کپڑے خصوصاً ململ اور شال انگلستان کے مقابل بلکہ دنیا بھر

میں نہایت عمدہ بنتی تھیں - انگریزی سوداگر یہ چیزیں یہاں سے ولایت لے جاتے تھے اور ولایت سے لوہے۔ تانبے۔ پارے اور فولاد کا بہت سا مال لاتے تھے جو یہاں کم و سنیاب ہو سکتا تھا۔ انگریز تاجروں نے جان و مال کی حفاظت کے لئے سورت میں اپنی کوٹھی کے گرداگرد مضبوط فصیل بنا لی تھی اور اس پر بڑی بڑی توپیں لگا رکھی تھیں

انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کو اسقدر منافع ہوا کہ انگریزوں نے کئی اور کمپنیاں بنا ڈالیں اور ہندوستان کے ساتھ تجارت شروع کر دی۔ آخرکار سو سال کے بعد ۱۷۰۸ء میں یہ سب کمپنیاں ملا کر ایک کر دی گئیں۔ اس بڑی کمپنی کا نام **متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی** قرار پایا اور بادشاہ انگلستان نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا اختیار بہ تمام و کمال بلا شرکت غیرے اس کمپنی کو دیدیا۔

۱۶۳۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے چندرگری کے راجہ سے جو کرناٹک میں ایک چھوٹے سے پہاڑی قلعہ کا حاکم تھا مدراس کا مقام خرید لیا۔ یہ مچھیروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ انگریزوں نے یہاں ایک بڑا مضبوط قلعہ تعمیر کیا جس کا نام قلعہ سینٹ جارج رکھا۔ بدامنی سے تنگ آ کر بہت سے ہندو یہاں انگریزوں کی پناہ میں آباد ہو گئے اور اُن کے ساتھ لین دین کرنے لگے۔

بمبئی اوّل اوّل پرتگیزوں کے قبضہ میں تھا۔ انگلستان کے بادشاہ **چارلس دوم** نے شاہ پرتگال کی لڑکی سے شادی کی۔ اُس نے ۱۶۶۲ء میں اپنی لڑکی کے جہیز میں جزیرہ بمبئی شاہ انگلستان کو دیدیا۔ اس کے چھ سال بعد چارلس دوم نے یہ مقام ایسٹ انڈیا کمپنی کو دس پونڈ یعنی ڈیڑھ سو روپیہ سالانہ کرایہ پر دیدیا۔ بمبئی بہت عمدہ بندرگاہ تھا۔ اس وجہ سے وہ بہت جلد وسعت پا کر ایک پر رونق شہر بن گیا۔ بہت سے ہندو تاجر یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انگریز اپنا کل کارخانہ سورت سے اٹھا کر

حصہ چہارم
مات ستم

بمبئی میں سے آئے۔

شاہجہاں کے عہد میں مدراس خریدنے کے ایک سال بعد یعنی ۱۶۴۰ء میں انگریزوں نے دریائے گنگا کے دہانے پر ہگلی کے پاس ایک کوٹھی قائم کی۔ اورنگ زیب کے عہد میں اُنھوں نے تین گاؤں خریدے جو ہگلی کی نسبت دریائے گنگا کے دہانے سے اور بھی قریب تھے۔ ان میں سے ایک کا نام **کالی گھاٹ** تھا۔ یہ وہی مقام تھا جو اب کلکتہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ۱۶۹۰ء میں انگریزوں نے ایک قلعہ تعمیر کیا اور **فورٹ ولیم** اس کا نام رکھا۔

اِن کے علاوہ انگریزوں کی اور کوٹھیاں بھی تھیں مشرقی ساحل پر مدراس کے جنوب میں ایک کوٹھی تھی جو قلعہ **سینٹ ڈیوڈ** کے نام سے مشہور تھی۔ ایک کوٹھی مدراس کے شمال میں **مسولی پٹم** ایک پٹنہ اور ایک ڈھاکہ میں تھی اور ایک بنگال کے پایہ تخت مرشد آباد کے قریب قاسم بازار میں۔

فرانسیسی بھی ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہی آئے تھے۔ اُنھوں نے بھی اپنے مقامات تجارت بنا رکھے تھے۔ انہیں سے بڑے بڑے یہ تھے۔ **ماہی** مغربی ساحل پر **پانڈیچیری** مدراس کے جنوب میں مشرقی ساحل پر **چندر نگر** بنگالہ میں کلکتے سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر۔ یہ مقامات اب بھی فرانس کے قبضہ میں ہیں۔

ڈچوں کے اپنے مقامات تجارت جدا تھے **کوچن** مغربی ساحل پر۔ **پولی کٹ** مدراس کے شمال میں مشرقی ساحل پر اور **چنسرا** چندر نگر کے قریب بنگالے میں۔ یہ کل مقامات بعد کو انکے ہاتھ سے نکل گئے ہندوستان کے مغربی ساحل پر تین مقام **گوآ**۔ **ڈاسن** اور **ڈیو** ابتک پرتگالی مقبوضات ہیں۔

ہندوستان میں انگریزوں نے کس طرح پیر پھیلائے۔ یورپ کی دوسری قوموں کے ہندوستان سے تعلقات کیونکر منقطع کئے۔ خصوصًا دکھن میں انگریز اور فرانسیسیوں میں کیسی جنگ وجدل ہوئی اور باوجود ابتدائی کامیابی کے فرانسیسی بالآخر مغلوب ہوئے اور بلا شرکت غیرے انگریز کن کن ترکیبوں سے ہندوستان کے مختلف حصوں پر قابض ہوئے۔ حتیٰ کہ وہ ایک زبردست حکمراں طاقت بن گئے۔ ہندوستان بالکل ان کی مٹھی میں آگیا اور رہے سہے ہندوستانی راجوں نوابوں کو ان کا مطیع وباجگزار بننا پڑا یہ ایک طولانی مگر سبق آموز قصہ ہے جس کی تفصیل سے بڑی بڑی ضخیم تواریخ ہند لبریز ہیں۔ یہاں صرف وہ چند اہم تبدیلیاں جتانی مقصود ہیں جو انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات میں نمودار ہوئیں۔ اوّل یہ کہ انگریزوں کی متعدد کمپنیوں نے جو ہندوستان سے تجارت کرتی تھیں سنہ ۱۷۰۰ء میں باہم ملکر ایک کمپنی بنام متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور شاہ انگلستان سے اجازت لی کہ سوائے اس کے کوئی دوسری کمپنی ہندوستان سے تجارت نکرے۔ سو برس بعد ۱۸۱۳ء میں بلاشرکت غیرے ہندوستان سے تجارت کرنے کا حق جو اس کمپنی کو حاصل تھا۔ وہ توڑ دیا گیا اور ہندوستان سے تجارت کرنے کی ہر کسی کو آزادی مل گئی۔ اگرچہ کمپنی نے ایک قاعدہ بنا رکھا تھا کہ اُس کی اجازت بغیر کوئی انگریز تاجر اُس کے مقبوضات اور تجارت گاہوں میں قیام پذیر نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم باوجود اس مزاحمت کے عام تاجروں کی تجارت بمقابلہ کمپنی کے جلد دوچند بلکہ سہ چند ہوگئی خاص وجہ یہ تھی کہ اب کمپنی نے اپنی توجہ اور کوشش بیشتر ملکی تسلّط پر صرف کرنی شروع کردی۔ اور تجارت کے بجائے جنگ وسیاسی معاملات میں مصروف رہنے لگی۔ چنانچہ ۱۸۱۳ء تک مدراس بنگال کے موجودہ صوبوں اور اودھ کے سوا باقی کل صوبہ متحدہ پر کمپنی قابض ہوچکی تھی۔ بالآخر موقع پاکر انگریزی تاجروں نے یہ مسئلہ چھیڑ دیا کہ کمپنی چونکہ ایک بڑی حکمراں جماعت

حصۂ چہارم
باب ششم

بن گئی ہے اور اس کو متعدد مقبوضات ہندوستان میں ہاتھ لگ گئے ہیں۔ تجارت سے اب اُس کو کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس میں دوسروں کا حق تلف ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ کمپنی اپنی تمام تر توجہ اور کوشش ملکی فتوحات اور سیاسی تسلط پر صرف کرکے بحیثیت حکمران ہندوستان میں اپنا اقتدار بڑھائے اور تجارت سے دست بردار ہوکر اُس کو عام تجار پر چھوڑ دے۔ کمپنی خود بھی ملکی معاملات میں پھنس جانے کی وجہ سے تجارت کی پرواہ کم کرنے لگی تھی۔ چنانچہ ۱۸۳۳ء میں یہ قرار پاگیا کہ کمپنی محض ایک حکمراں جماعت کی حیثیت سے ہندوستان میں رہے اور اپنے مقبوضات بڑھانے کی کوشش جاری رکھے تجارت سے اس کو کچھ سروکار نہ ہو اور انگلستان کے عام تاجر کمپنی کی جگہہ ہندوستان سے تجارت کریں۔ اسوقت تک مدراس۔ بمبئی۔ بنگال اور صوبہ متحدہ کے موجودہ صوبے کمپنی کے قبضے میں آچکے تھے۔

۱۸۳۳ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک بائیس سال کمپنی ہندوستان میں اپنے مقبوضات پر حکمراں رہی تمام نظام سلطنت خود اُس کے ہاتھ میں تھا۔ برٹش پارلیمنٹ البتہ کچھ معمولی نگرانی رکھتی تھی اس عرصہ میں مدراس۔ بمبئی۔ بنگال اور صوبہ متحدہ کے موجودہ صوبوں کے علاوہ برما۔ ممالک متوسط۔ پنجاب اور سندھ پر بھی کمپنی کا قبضہ ہوچکا تھا۔

ہندوستان کا سلطنت برطانیہ سے الحاق

(۴) ۱۸۵۷ء میں مشہور عالم غدر برپا ہوا جو کہ چند ہی ماہ میں فرو ہوگیا اور کمپنی کا تسلط بحال رہا۔ لیکن اب سلطنت اسقدر وسیع ہوچکی تھی کہ اس کا انتظام تاجروں کے کمپنی کے ہاتھ میں چھوڑنا خلاف مصلحت معلوم ہوا۔ علاوہ ازیں کمپنی کے روز افزوں اقتدار سے عوام وخواص کو رشک بھی پیدا ہوگیا تھا بالآخر ۱۸۵۸ء میں یہ طے ہوا کہ کمپنی کی ہندوستانی سلطنت سرکار برطانیہ کے تحت میں دیدی جائے۔ چنانچہ کمپنی دست بردار ہوگئی اور ملکہ وکٹوریہ جو اُس زمانہ میں انگلستان میں حکمراں تھیں ملکۂ ہند کہلائیں۔ گورنر جنرل کا خطاب

حصہ چہارم باب ششم

بھی اسی سال سے وایسرائے یعنی نائب شہنشاہ قرار پایا ۱۸۷۷ء میں دلّی میں ایک شاہی دربار ہوا جبکہ ملکہ وکٹوریہ نے قیصرِ ہند کا خطاب اختیار فرمایا۔ اس کے بعد سے آج کے دن تک انگلستان کا بادشاہ شہنشاہ ہند کہلاتا ہے۔ ہندوستان کے نواب اور راجہ اُسکے مطیع اور باجگذار ہیں سلطنت کا انتظام زیر نگرانی پارلیمنٹ۔ وزیر ہند اور وایسرائے کے ہاتھ میں ہے۔ ہندوستان بھی اپنی قسمت پر راضی نظر آتا ہے۔ خدا نے جو یوں عجیب طریق سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان تعلقات قائم کر دیے ان کو ترک کرنے کی ہندوستان کو ہرگز کوئی تمنا نہیں بلکہ ان کا بحال رہنا ہی وہ ہر لحاظ سے اپنے حق میں مفید سمجھتا ہے۔ البتہ حسب تغیرات زمانہ و اقتضاے وقت وہ اُن تعلقات میں ترمیم کی ضرورت محسوس کرنے لگا ہے۔ انگلستان کے دُوراندیش و بیدار مغز مدبّر بھی اسکے معروضات پر توجہ کر رہے ہیں۔ اس کے احساسات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے مطالبات کسی نہ کسی حد تک پورے کرتے جاتے ہیں۔ اس عاقلانہ طرز عمل کی چند تازہ ترین مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔ ہندوستان کے حق میں یہ فال نیک ہے ہر کوئی اس التفات کی قدر کرتا ہے اب اگر کچھ گلہ ہے تو یہ کہ غیر ضروری التوا اور تاخیر عمل میں آ رہی ہے۔ لیکن اگر ہندوستان ایثار اور جفاکشی پر کچھ عرصہ کے واسطے مستقل طور سے کمر باندھ لے تو اس کی سب امیدیں برآ سکتی ہیں جیسا کہ اس سے قبل بہت سے دیگر ممالک کی برآ چکی ہیں۔ **شعر**

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ علاج ہست

ہندوستان اور انگلستان کے تعلقات کا خلاصہ

(۵) اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ ۱۶۰۰ء میں کچھ انگریز بطور تاجروں کی کمپنی کے ہندوستان آئے۔ ۱۷۰۸ء میں ایسی متعدد کمپنیاں ملکر ایک متحدہ کمپنی بن گئیں۔ حسن اتفاق

حصہ چہارم باب ششم

اور مساعدت حالات سے وہ رفتہ رفتہ ملک پر قابض ہوتے گئے ۱۸۱۳ء تک ہندوستان سے تجارت کرنے کا حق اسی متحدہ کمپنی کے واسطے مخصوص رہا۔ اس کے بعد ہر کسی کو ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت ملگئی۔ اسی عرصہ میں کمپنی کے مقبوضات ہندوستان میں اسقدر بڑھ گئے کہ اُس کو اپنی تمام تر کوشش اور محنت ان کے انتظام میں صرف کرنی پڑی۔ چنانچہ اُس نے تجارت بالکل ترک کردی اور ۱۸۳۳ء سے لیکر ۱۸۵۷ء تک وہ محض بحیثیت حکمران ہندوستان میں مصروف رہی۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا۔ اس کے بعد فوراً ہی ۱۸۵۸ء میں کمپنی کے ہندوستانی مقبوضات سلطنت برطانیہ میں شامل کرلئے گئے اور کل انتظام برٹش پارلیمنٹ کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے بعد انگریزی مقبوضات میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ کہ آج کل ملک انگریزوں کی مٹھی میں نظر آتا ہے۔

کمپنی کے متعلق صرف ایک بات بتانی اور ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جب ۱۸۵۸ء میں اسکے ہندوستانی مقبوضات سرکار برطانیہ نے اپنے تحت میں لئے تو اُس کو معاوضہ کیا دیا اور کیونکر دیا۔ کمپنی کا ہندوستان میں جسقدر روپیہ صرف ہوا تھا۔ وہ سب قرض لیکر ادا کردیا گیا اور یہ قرض ہندوستان کے نام لکھا گیا۔ جس پر ابتک ہندوستانی محاصل میں سے منجانب ہندوستان سود ادا کیا جارہا ہے۔ گویا سرکار برطانیہ نے انگریزی کمپنی سے سلطنت ہند خریدی اور زر قیمت ہندوستانیوں نے ادا کیا۔ ایسی خرید و فروخت کی دوسری مثال تاریخ عالم میں ملنا دشوار ہے۔ ابھی حال میں یعنی سنہ ۱۹۰۰ء میں اسی طرح ایک انگریزی کمپنی سے سرکار برطانیہ نے نائیگیریا خریدا۔ مگر قیمت خود اپنی جیب سے ادا کی۔ ہندوستان کی طرح اس کا بار نائیگیریا پر نہیں ڈالا۔ جنوبی افریقہ میں جو برطانیوی مقبوضات حاصل کئے گئے تو وہاں بھی یہی آخرالذکر اصول برتا گیا۔ لیکن ہندوستان کی تو تمام دنیا سے بات ہی نرالی ہے۔ جو کچھ بھی ہو کم ہے۔ خیر۔ گذشت آنچہ گذشت۔

حصہ چہارم
باب ششم

اب ہم ہندوستان کی گذشتہ تین صدی کے متعلق تجارت خارجہ کی سرگذشت اور اس کے نتائج صرف مختصراً بیان کریں گے مفصل بحث کے واسطے ایک جداگانہ کتاب معیشت الہند زیادہ موزوں ہوگی۔

اس کتاب میں باوجود بیحد اختصار کے تجارت بین الاقوام کی بحث طویل معلوم ہوتی ہے لیکن اس سے کم بیان کرنا بحث کو تشنہ چھوڑنا تھا اور یہ نقص کتاب میں کہیں بھی گوارا نہیں کیا گیا۔

اٹھارویں صدی میں ہندستان کی صنعت و حرفت

(۷) اگر ہندوستانیوں کی تصانیف سے ہندوستان کی معاشی حالات اخذ کئے جاتے تو ان پر اگر سراسر غلط نہیں تو از حد مبالغہ آمیز ہونیکا اعتراض کرنا دشوار ہوتا۔ لیکن اوّل تو ہمیشہ سے ہندوستانی مورخوں نے معاشی معاملات سے بے اعتنائی برتی۔ اگر ان کی تصانیف میں کوئی ایسی جھلک نظر آتی بھی ہے تو وہ اتفاقی ہوتی ہے۔ دوم جس زمانہ سے ہم بحث کرنا چاہتے ہیں اُس کے متعلق کوئی کارآمد ہندوستانی تاریخ موجود نہیں لیکن خوش قسمتی سے انگریزی زبان میں ایسے تاریخی ذخائر وافر موجود ہیں کہ جن سے ہندوستان کے معاشی حالات کا پورا پورا حال معلوم ہو سکتا ہے اور انگریز سیاحوں کے چشم دید بیانات خود کمپنی کی باضابطہ تحریرات۔ معزز کمیٹیوں اور برٹش پارلیمنٹ کی رپوٹوں کے مستند اور معتبر ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے اور یہی سب ہمارے ذرائع معلومات ہیں پس جو کچھ بیاں کیا جاتا ہے اس کا ماخذ خود انگریزوں کی تحقیقات و تحریرات ہیں۔ قیاس کو کہیں دخل نہیں دیا گیا ہے۔

۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے جو کہ اس وقت ہندوستان میں گورنر جنرل تھے ڈاکٹر فرانسس بوچانن کو جو کہ کمپنی کی ملازمت میں ایک طبی افسر تھے۔ خاص طور سے اس کام پر متعین کیا کہ وہ کل جنوبی ہندوستان میں دورہ کریں اور ذاتی تحقیقات و معائنہ کے بعد

ملک کی معاشی حالت پر رپورٹ تیار کرکے پیش کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تمام دکن میں گھوم کر وہاں کی تجارت زراعت اور صنعت و حرفت کے چشم دید حالات لکھے جو کہ ۱۸۰۷ء میں کمپنی کی طرف سے تین ضخیم جلدوں میں انگریزوں کی عام اطلاع کے واسطے لندن میں شایع کر دیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ معاشی تحقیقات اسقدر مقبول اور مفید ثابت ہوئی کہ کمپنی کی طرف سے وہ پھر اسی طرح شمالی ہندوستان میں دورہ کرکے معاشی حالات قلمبند کرنے کے واسطے بطور خاص مقرر کئے گئے چنانچہ ۱۸۰۷ء سے لیکر ۱۸۱۴ء تک برابر سات سال ڈاکٹر صاحب شمالی ہندوستان میں پھر کر معاشی معلومات فراہم کرتے رہے۔ سنا ہے اس تحقیقات میں کوئی ساڑھے چار لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ دکن کی طرح شمالی ہندوستان کے حالات بھی تین جلدوں میں شایع کیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیقات کی یادگار یہ چھوں جلدیں موجود ہیں۔ جو چاہے ان کو دیکھکر اپنا اطمینان کر لے۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ کا معاشی حال   میں نہایت تفصیل سے مذکور ہے اور اس سے بڑھکر قابل اعتماد ذریعہ معلومات اور کیا ہوسکتا ہے۔

یہ خیال غلط ہے کہ سدا سے ہندوستان کا عام پیشہ زراعت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی زمین اور آب و ہوا کاشت کے واسطے بیحد موزوں ہے اور ہمیشہ سے ہندوستان میں کاشتکاروں کی ایک بڑی جماعت چلی آتی ہے لیکن جیسا کہ یقین دلایا جاتا ہے۔ یہ بیان خلاف واقعہ ہے کہ من حیث القوم ہندوستانیوں کا ذریعہ معاش زراعت ہی رہا ہے بلکہ جو جماعت طرح طرح کی صنعت و حرفت سے اپنی روزی کماتی تھی وہ اگر کاشتکاروں سے زیادہ نہ تھی تو بہت کم بھی نہ تھی۔ ڈاکٹر بوچانن کا قول ہے کہ جامہ بافی کی صنعت و حرفت کا ہندوستان میں اسقدر رواج اور عروج ہے کہ زراعت کی مانند اسکو بھی عام ملکی پیشہ قرار دینا بیجا نہو گا۔ کروڑہا بندگان خدا اسی پیشہ پر بسر اوقات کرتے تھے۔ ادنیٰ سے لیکر

اعلیٰ سے اعلیٰ قسم تک روئی اور ریشم کا کپڑا یہاں پر بکثرت تیار ہوتا اور مقامی صرف کے علاوہ دور دراز ممالک تک جاتا تھا۔ سنہری۔ روپہلی کلابتوں بٹ کر صدہا قسم کے زربفت تیار کرتے تھے جس سے بادشاہوں کے جسم و محلات کی زینت و آرایش ہوتی تھی۔ اون سے غریبوں کے واسطے کمبل اور امرا کے واسطے شال تیار ہوتے جو اب تک عجائبات مصنوعات میں نمبر اول شمار ہوتے ہیں۔ ہندوستانی ململ۔ اطلس۔ کمخواب۔ جامہ وار۔ چکن۔ چھینٹ نفاست و خوبی میں اب تک بطور ضرب المثل زبان زد ہیں۔ ان کی پائداری ہر کسی کو مسلم ہے۔ کپڑوں پر اس غضب کی سوزن کاری ہوتی تھی کہ پُر انے کشیدے دیکھکر عقل دنگ رہجاتی ہے۔ فرش فروش کا کل سامان چادریں شطرنجیاں۔ دریاں بکثرت تیار ہوتی تھیں۔ تانبے۔ پیتل کے خوش نما ظروف۔ سونے۔ چاندی کے نظر فریب زیورات گوناگوں رنگ۔ اعلیٰ درجہ کے تیل و عطر۔ ہر قسم کا چرمی سامان۔ طرح طرح کے ہتیار۔ لکڑی پر نقاشی اور ہاتھی دانت کا عجیب و غریب کام اور نہایت پائدار کاغذ۔ غرضیکہ ناگزیر ضروریات کی کل چیزیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی بہت سی تعیشات ایک صدی کی بات ہے ہندوستان میں اس کثرت سے تیار ہوتی تھیں کہ دیگر ممالک یہاں سے سامان منگا منگا کر استعمال کرتے تھے صنعت و حرفت کا ہر طرف چرچا تھا۔ مصنوعات کی دور و پاس شہرت تھی۔ باوجودیکہ کافی امن میسر نہ تھا۔ لوگوں کو کس قدر ذرائع معاش حاصل تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پیدائش کے دونوں اہم صیغے یعنی زراعت اور صنعت و حرفت اپنے ہی ہاتھ میں تھے اور اگر حالات مساعدت کرتے اور مزاحمتیں سدراہ نہوتیں تو جس قوم نے آج سے ایک صدی پہلے مصنوعات میں اسقدر ترقی کرلی تھی۔ معاشی ترقیات میں آج اس کا کیا درجہ ہوتا۔ لیکن ہندوستان کچھ ایسے جال میں پھنسا کہ اس کی صنعت و حرفت تھوڑے ہی عرصہ میں دم توڑنے لگی اور اب تک

حصہ چہارم
باب ستم

حالت نزع میں گرفتار ہے ۵۰ فی صدی آبادی کی وجہ معاش کا بار زراعت پر آپڑا باقی ماندہ ملازمت معمولی صنعت و حرفت اور بیکاری میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ زراعت ہندوستان کے سر منڈھی گئی اور اکثر صنعت و حرفت ممالک یورپ نے سنگوا لی ۔ اس تقسیم عمل سے ہندوستان کا جو نفع نقصان ہو رہا ہے۔ اس سے قبل تجارت بین الاقوام کے تحت میں واضح کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ دکھانا باقی ہے کہ یہ کایا پلٹ آخر کیونکر ظہور پذیر ہوئی۔

ہندوستانی صنعت و حرفت کی تباہی کی عبرتناک داستان

(۴) اٹھارہویں صدی کے نصف تک ہندوستانی مصنوعات بلا تکلف انگلستان جاتی رہیں لیکن انگریز جیسی معاملہ فہم اور وقت شناس قوم فوراً تاڑ گئی کہ اگر یہی لیل و نہار ہیں اور ہندوستانی مصنوعات یونہی بلا روک ٹوک بکثرت ملک میں آتے رہے تو ملکی صنعت و حرفت کا پنپنا محال ہے۔ بلکہ رہی سہی جو کچھ ہے وہ بھی خاک میں ملجائیگی اور ہمیشہ کے واسطے ہندوستان کا دست نگر بننا پڑے گا۔ عام مرفہ الحالی اور ملکی ترقی پر صنعت و حرفت کے زوال کا جو تباہ کن اثر پڑتا وہ اس بیدار مغز اور مآل اندیش قوم سے مخفی نہ تھا۔ چنانچہ جونہی دیکھا کہ ہندوستانی مصنوعات کا ملک پر تسلط ہوتا جاتا ہے فوراً چونک اٹھی اور ہر قسم کی پیش بندی شروع کر دی۔ جیسا کہ قبل بتایا جا چکا ہے سوتی۔ اونی۔ اور ریشمیں۔ زریں۔ غرضیکہ ہر قسم کے کپڑا تیار کرنے میں ہندوستان نے وہ کمال حاصل کیا تھا کہ اگر صریح ثبوت موجود نہوتے تو اس کا یقین کرنا دشوار ہوتا اور جامہ بافی کا ملک بھر میں اسقدر کاروبار پھیلا ہوا تھا کہ زراعت کی مانند وہ بھی قومی صنعت کہلاتا تھا۔ نہ صرف غربا اور متوسط الحال لوگوں کی مستورات بوقت فرصت سوت کاتکر نفع اٹھاتی تھیں۔ بلکہ اچھے سے اچھے گھر کی بہو بیٹیاں چکن اور کشیدے کاڑھنا اور طرح طرح کی سوزن کاری باعث فخر و امتیاز خیال کرتی تھیں۔ کروڑہا بندگان خدا کی روزی

اسی صنعت وحرفت سے وابستہ تھی - دیگر ممالک کو کپڑا بھی بکثرت بھیجا جاتا ہے - چنانچہ ہندوستان میں پارچہ بافی کی صنعت کا عروج دیکھکر انگلستان والوں کے منہ میں پانی بھر آیا - اور بنظر دور اندیشی رقابت کے جوش میں اُنھوں نے سب سے اول ہندوستان کی اسی صنعت پر وار کیا اور وہ ایسا کاری پڑا کہ کچھ ہی عرصہ میں ہندوستانی پارچہ بافی کا حال زار و نزار ہوگیا - اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ولایت کے کپڑا بُننے والوں نے محسوس کیا کہ وہ نہ کپڑے کی عمدگی میں ہندوستان والوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور نہ اُنکی ارزانی میں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستانی کپڑا انگلستان میں خود وہاں کے کپڑے پر غلبہ پا رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ انگلستان کی یہ صنعت کسی روز بالکل بیجان ہوجائیگی - تو انھوں نے شور مچانا شروع کیا حکومت قوم کے ہاتھ میں تھی - حکمراں طبقہ مستعد اور بیدار مغز تھا - صناعوں کی معروضات پر فوراً توجہ کی اُنکی شکایات کو معقول پاکر اختیارات حکومت سے کام لیا اور نہ صرف ملک کو تباہی سے بچالیا بلکہ اُس کی مستقل عظمت و طاقت کی بھی بنیاد قائم کردی یعنی جامہ بافی کی صنعت کو بذریعہ قانون مامون کردیا اور کون نہیں جانتا کہ انگلستان کی مرفہ الحالی و اقتدار کو لنکا شائر مینچسٹر اور لورپول کی کپڑے کی ملوں نے شروع سے آج تک کس قدر سیراب و شاداب بنا رکھا ہے -

۱۷ / مارچ ۱۷۶۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ولایت سے اپنے اعلی عہدہ داروں کے نام بنگال کو ایک عام خط بھیجا جس میں بتاکید تحریر تھا کہ ہر طرح سے بنگال میں ریشم خام کی پیداوار بڑھانیکی کوشش کرنی چاہیئے اور ساتھ ہی ساتھ ریشمی کپڑوں کی تیاری گھٹانی بلکہ روکنی چاہیئے تاکہ ریشم خام ہندوستان سے ولایت آئے اور ریشمی کپڑا یہاں سے تیار ہوکر ہندوستان جائے اس غرض کو پورا کرنے کا ایک یہ طریق بھی بتایا گیا تھا کہ کپڑا بننے والوں کو کسی نہ کسی طرح خود کمپنی کے کارخانوں میں

حصۂ چہارم باب ششم

کام کرنے پر مجبور کیا جاوے اور بطور خود کام کرنے سے ان کو روکا جاوے تاکہ کل کاروبار کمپنی کے ہاتھ میں آجائے اور وہ اس میں جیسی ردوبدل مناسب سمجھے بآسانی کرسکے۔

انگلستان کے دارالعوام کی طرف سے جو ایک منتخب کمیٹی ہندوستان کے حالات پر غور کرنے کے واسطے مقرر کی گئی تھی اُس نے اپنی رپورٹ میں جو ۱۷۸۳ء میں شائع ہوئی ڈائرکٹران کمپنی کے مذکورہ بالا خط کی تعریف اور تائید کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اس خط میں ہندوستانی پیداوار خام کی ترقی اور مصنوعات کی مزاحمت کے بارہ میں جو پالسی صاف صاف بیان کی گئی ہے۔ اس سے بنگال کی صنعت وحرفت کو ضرور صدمہ پہنچے گا۔ گر اس خط کی ہدایات پر عمل ہو سکا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان جیسے صنعت وحرفت والے ملک میں ایسا انقلاب نمودار ہوگا کہ اس میں نری پیداوار خام پیدا ہونے لگے گی جو انگلستان کے مصنوعات میں کام آئیگی۔ سب سے عمدہ اثر جو ظاہر ہو چکا وہ یہ ہے کہ ریشیم بننے والے اب کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے لگے۔ اگر اب وہ لوگ بطور خود کام کرنا چاہیں بھی ان کو روکنا چاہیئے اور اگر نہ مانیں تو سرکار اُن کو سخت سزا دے اور بطور خود کام کرنے کی قطعاً ممانعت کر دے۔

سنہ ۱۸۱۳ء میں پارلیمنٹ نے پھر ہندوستان کے حالات کے متعلق تحقیقات جاری کی اور جو انگریز مدتوں ہندوستان رہ چکے تھے ان سے سوالات کرکے مفید مطلب معلومات حاصل کی۔ یہ وہ نازک وقت تھا جبکہ نپولین نے انگلستان کی مصنوعات کی درآمد تمام یورپ کے ممالک میں بند رکھی تھی اور سامان فروخت نہ ہو سکنے کی حالتیں انگلستان کے صناع اور کارخانہ داروں کو برباد ہو جانے کا خطرہ لاحق تھا۔ انگریزی مصنوعات کی فروخت کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالنی اشد ضروری تھی۔ چنانچہ یہ خدمت ہندوستان کے سپرد ہوئی کہ وہ انگریزی سامان بکثرت خریدے۔ چونکہ یورپ کے

ممالک میں انگریزی مصنوعات کی درآمد بند تھی۔ انگریزی کارخانہ دار مال نہ بکنے سے بدحواس ہو رہے تھے اور بالآخران کی نظر بھی ہندوستان ہی پر پڑی اور انھوں نے بہت شور و واویلا مچاکر کمپنی کا ہندوستان سے تجارت کرنے کا جو اجارہ تھا اس کو توڑوا دیا اور اب ہندوستان سے تجارت کرنے کی اجازت عام ہوگئی۔ پارلیمنٹ نے ۱۸۱۳ء میں جو تحقیقات کی اس کا منشا بھی یہی معلوم کرنا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی مصنوعات کیونکر رواج پاسکتے ہیں۔ چنانچہ جب ہندوستان میں رہے ہوئے انگریزوں سے حالات دریافت کئے گئے ان سب سے بلا استثناء یہ سوال کیا گیا کہ تم ہندوستانیوں کے عادات اور رسم و رواج سے پوری طرح پر واقف ہو بھلا یہ تو بتاؤ کہ کس ترکیب سے وہ انگریزی مصنوعات استعمال کرنے پر مائل ہوسکتے ہیں۔ **لارڈ وارن ہسٹنگس سر جان ملکم مسٹر ٹامس منرو** جیسے سربرآوردہ انگریزوں کے جوابات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہندوستانی مصنوعات اسقدر عمدہ اور مقابلۃً ارزاں تھیں کہ اُنکے سامنے انگریزی سامان کا فروغ پانا دشوار تھا بلکہ اندیشہ تھا کہ روک تھام نہ کی گئی تو خود انگلستان کے بازاروں میں ہندوستانی مصنوعات چھاپہ مارتی رہیں تھیں۔ چنانچہ یہی حالات دیکھ کر کمپنی نے نہایت کارگر تدابیر اختیار کرنی شروع کردیں ایک طرف تو نمائشیں قائم کرکے اور ہندوستانی میلوں ٹھیلوں میں جاجا کر بڑے بڑے انگریز۔ ولایتی چیزیں دکھاتے پھرتے تھے کہ لوگ ان کی خریداری پر مائل ہوں اور دوم انگلستان میں ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر تیس فیصدی سے لیکر اسیّ فیصدی تک محصول قائم کردیا۔ تاکہ انگلستان کی صنعت و حرفت ہندوستان کے مقابلہ سے بالکل مامون ہوجائے۔ چنانچہ ہندوستان کا ہمعصر مورخ **ولسن** جس کا پاکیزہ دل ہندوستان کی ہمدردی سے لبریز معلوم ہوتا ہے ہندوستان و انگلستان کے تجارتی تعلقات پر رقمطراز

حصہ چہارم
باب ششم

ہے کہ موجودہ طریق تجارت اُس بے اتفاقی کی ایک افسوسناک مثال ہے جو ہندوستان کے ساتھ وہ ملک برت رہا ہے جس کی اطاعت ہندوستان نے قبول کرلی ہے۔

سنہ ۱۸۱۳ء کی تحقیقات میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمیں کپڑے۔ انگریزی کپڑوں سے پچاس ساٹھ فی صدی کمتر نرخ پر ولایت کے بازاروں میں نفع کے ساتھ فروخت ہوسکتے تھے۔ چنانچہ مجبور ہوکر ہندوستانی کپڑونکی درآمد پر ستتر و اسی فی صدی محصول قائم کردیا نیز بعض کی قطعاً ممانعت کردی۔ اگر یہ طریق اختیار نہ کیا جاتا تو انگلستان میں کپڑے کے کارخانے بند ہوجاتے بلکہ کلوں کے زور سے بھی ان کا بعد کو چلنا دشوار ہوجاتا۔ لیکن ہندوستان کو دبا کر ولایت کے کارخانوں کو ترقی دی گئی۔ کاش اگر ہندوستان کا بس چلتا تو وہ بھی بدلہ لیتا انگریزی مصنوعات کی درآمد پر بھاری بھاری محصول لگا کر ان کو ملک میں آنے سے روکتا اور اپنی صنعت و حرفت کے میدان کو بچاتا۔ لیکن اس کو اپنی حفاظت کرنے کا اختیار نہ تھا وہ غیروں کی اجازت کا محتاج تھا۔ انگریزی مال تو کوئی محصول درآمد لئے بغیر ہندوستان میں ٹھونسا گیا اور ہندوستانی مال کی درآمد ولایت میں روکدی گئی۔ اور پھر بھی چونکہ ہندوستان سے مقابلہ دشوار نظر آتا تھا۔ رقابت کے جوش میں حکومت کے اختیارات سے اپنے مفید مطلب اور ہندوستان کے خلاف کام لیا جاتا رہا۔

مسٹر ولسن مورخ کا مذکورالصدر چشم دید بیان پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کے تنزل اور انگلستان میں اس کی ترقی کے کافی اسباب فراہم ہوچکے تھے۔ مگر دو خاص واقعات جو مذکورہ بالا نتیجہ کے زبردست باعث تھے ابھی جتانے باقی ہیں۔ اوّل تو وہ زمانہ آپہونچا تھا جبکہ ولایت میں نت نئے دخانی انجن اور کلوں کی ایجادات کی بدولت صنعت و حرفت میں نئی روح پھیل رہی تھی۔ بڑے

بڑے کارخانے جاری ہونے سے تقسیم عمل اور پیدایش برپیمانہ کبیر کے بیش بہا فوائد نمودار ہونے لگے تھے۔ مزید براں سائنس کی ترقی اور تعلیم عامہ کا رواج معاشی عروج کے حق میں سونے پر سہاگہ کا کام دے رہے تھے اس کے برعکس ہندوستان میں وہی قدیم دستی آلات و اوزار مستعمل تھے عوام پر جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی بدامنی کا ہر طرف دَور دَورہ تھا۔ لیکن بایں ہمہ ہندوستانی صنعت وحرفت اس وقت تک اس قدر سبقت پا چکی تھی کہ بہت سوں کا خیال ہے کہ اس کی دستی محنت کا بھی ولایت کی کلوں سے مغلوب ہونا آسان نہ تھا اور جیسا کہ جاپان کر رہا ہے اگر حسب موقع ہندوستان بھی کلیں جاری کرتا رہتا تو پھر انگلستان کی صنعت وحرفت کی موجودہ ترقی وہم وگمان سے بھی باہر تھی۔ لیکن نہیں ہندوستانی صناع ایک اور ہی آفت میں مبتلا تھے۔ ۱۷ مارچ ۱۷۶۹ء کی چھٹی میں کمپنی کے ڈائرکٹر ولایت سے اپنے عہدہ داروں کو بنگال میں بتاکید تمام ایک عام ہدایت لکھ چکے تھے اور ۱۷۸۳ء کی نویں رپورٹ میں پارلیمنٹ کی منتخب کمیٹی نے یہ ہدایت انگلستان کے حق میں نہایت مفید اور ضروری قرار دی تھی کہ بنگال میں ریشم بننے والوں کو کمپنی کے زیر نگرانی اس کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جاوے اور اگر وہ لوگ بطور خود کام کرنے پر اصرار کریں تو از روے قانون ان کی سرزنش کرنے میں مضائقہ نہیں۔ اس بندش کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ اول یہ کہ ریشمی کپڑے کی پیداوار اپنے قابو میں کر کے حسب ہدایات ڈائرکٹر صاحبان اس کی مقدار گھٹائی جاوے۔ دوم جس قدر کپڑا بھی تیار کرایا جاوے من مانی اجرت دیکر ارزاں تیار کرایا جاوے بعین ریشمی کپڑوں کی خوبی ونفاست نے دنیا کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔ ان کے بنانے والوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا تھا مسٹر ورمیٹ صاحب کے بیان سے بخوبی واضح ہوتا ہے

حصہ چہارم
باب ستم

جو ۱۸۱۳ء کی تحقیقات میں اُنھوں نے پارلیمنٹ کی منتخب کمیٹی کے روبرو پیش کیا وہ فرماتے ہیں کہ ملازمان کمپنی نے خاص خاص نوربافوں کو ایک عمارت بارہ محل میں جمع کرکے اُن پر پہرہ بٹھا دیا اور اس وقت تک رہا کیا جبکہ انھوں نے معاہدہ نہ کیا کہ سوائے کمپنی کے وہ اپنا مال کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کریں گے۔ جبکہ نرخ پر نوربافوں کی طرف سے اعتراض ہوتا تو کمپنی کی ایک کمیٹی اپنے رائے کے موافق نرخ قرار دیتی اور نوربافوں کو قبول کرنا پڑتا۔ اُن کو کچھ رقم پیشگی دیدی جاتی ہے جس کی ادائیگی سے ان کو عمر بھر سبکدوش ہونا محال تھا۔ اگر کوئی نورباف معاہدہ کی پوری پابندی نہ کرتا تو اس پر نگرانی کے واسطے ایک شہنہ تعینات کردیا جاتا تھا جس کا طلبانہ ایک آنہ روزانہ اسی نورباف سے وصول کیا جاتا۔ شہنہ کے پاس ایک سونٹا بھی ہوتا تھا۔ جس سے وہ بلا تکلف تنبیہ الغافلین کا کام لے سکتا اور لیتا تھا۔ مزید براں نوربافوں پر جرمانہ کیا جاتا جو کہ ان کے تانبے پیتل کے برتن نیلام کرنے سے وصول ہوتا تھا۔ اس طرح سے کپڑا بننے والی جماعت بالکل کمپنی کے پنجے میں دبی رہتی تھی۔ اور ایک صاحب **مسٹر کاکس** کا بیان ہے کہ صرف اس ایک کارخانہ میں جس کے وہ نگراں تھے ڈیڑھ ہزار نورباف کام کیا کرتے تھے۔ نوربافوں کے ساتھ جو کچھ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ وہ کوئی بے ضابطہ کارروائی نہ تھی۔ بلکہ قوانین کی رو سے اُس کو جائز قرار دیدیا گیا تھا۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء کے ریگولیشن نمبر ۳۱ میں یہ سب حالات مذکور ہیں اور نیز ہندوستانی زمینداروں کو تنبیہ ہے کہ کمپنی کے تجارتی افسروں کو نوربافوں سے معاملہ کرنے میں وہ کبھی نہ روکیں۔ نہ اور کسی طرح کی مزاحمت کریں اور ہمیشہ ادب سے پیش آئیں۔ جبکہ ہندوستان کے سرمایہ ناز صناعوں کے ساتھ میں من حیث الجماعت ایسا برتاؤ کیا جائے جیسے کہ کوئی صیاد پرندوں کو پنجرے میں بند کرے تو صنعت و

حرفت کا جو کچھ حشر ہو گا اور ہوا محتاج بیان نہیں۔ یہ چمن تو آزادی کی آب و ہوا میں لہلہاتا ہے۔ غلامی اس کے حق میں حزاں کا حکم رکھتی ہے۔

تعجب ہو گا کہ آخر انگریزوں نے ایسی چیرہ دستی ہندوستانی صناعوں پر کیوں کی اور کس طرح کی۔ کاروباری لوگوں کی منفعت طلبی اور خود غرضی ضرب المثل ہے انگریز اسوقت آجکل کی طرح تو حکمراں تھے نہیں۔ گو بعض حصے انکے قبضے میں آنے شروع ہو گئے تھے لیکن ابتک وہ اپنا خاص کام تجارت سمجھتے تھے نہ کہ حکومت پس ان کو تو اپنے نفع سے غرض تھی۔ رعایا کی آسایش اور بہبودی سے ان کو کیا سروکار۔ رہی حکومت مغلیہ اس میں ہاتھ پیر ہلانے تک کی سکت باقی نہ تھی اور وہ صرف برائے نام جاری تھی پھر کون تھا جو غریب اطاعت شعار ہندوستانی صناعوں کو من چلے انگریزی تاجروں کی دست برد سے بچاتا۔ خود **وارن ہسٹنگس** جو کمپنی کی طرف سے ہندوستانیں گورنر رہ چکا ہے اور جو سلطنت ہند کے بانیوں میں نمبر اوّل شمار ہوتا ہے کہتا ہے کہ انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بجاتا ہے۔ جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرات کر ہی نہیں سکتا۔ ہندوستان میں اُن کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اسکو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک دوسرے صاحب **ٹامس سٹرہنسھم** فرماتے ہیں کہ میں ہمیشہ سے دیکھتا ہوں بمقابلہ اور قوموں کے انگریز ممالک غیر میں سب سے زیادہ چیرہ دستی کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی یہی واقعہ پیش آرہا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اُس زمانے میں انگریز اپنے کو محض تاجر خیال کرتے تھے اور آزاد ملک کے باشندہ ہونے کی وجہ سے نڈر اور من چلے تھے صدیوں کی اطاعت و فرماں برداری کرتے کرتے ہندوستان کے لوگ پست ہمت اور ذلیل ہو چکے تھے ملک میں کوئی ایسی حکومت قائم نہ تھی جو حقوق و انصاف

حصہ چہارم
باب ششم

کی نگہداشت کرسکتی۔ پس انگریزوں کا جو کچھ بھی طرز عمل تھا وہ کچھ عجیب نہ تھا۔

اس اُکھاڑ پچھاڑ اور جوڑ توڑ کا نتیجہ کمپنی کے ایک معزز افسر **ہنری سنٹ جارج ٹکر** جنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان میں بسر کیا اور جو بعد واپسی انگلستان میں کمپنی کے ڈائرکٹروں میں داخل کرلیے گئے۔ ۱۸۲۳ء میں مختصراً یوں بیان فرماتے ہیں ہم نے ہندوستان کے ساتھ کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں؟ اس کے ریشمی کپڑے اور بیر دہ کپڑے جو سوت اور ریشم سے ملکر بنے جاتے ہیں۔ کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے خارج کردیے گئے ہیں اور حال میں کچھ تو ۷۶ فی صدی محصول درآمد کی بدولت اور کچھ کلوں کی ایجاد کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے تھے نہ صرف اس ملک میں آنے بند ہوگئے بلکہ ہم اُلٹے انگلستان سے سوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں اور اس طرح پر ہندوستان تجارتی ملک سے تنزل کرکے اب محض زراعتی ملک رہ گیا۔

ایک دوسرے صاحب **مونٹگمری مارٹن** جنھوں نے ہندوستان کے متعلق اپنی کتاب ۱۸۳۵ء میں شایع کی تھی۔ ارقام فرماتے ہیں کہ اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ضلاع زیر بحث میں کسقدر لوگ پارچہ بافی کی صنعت پر اپنی گذران کرتے تھے اور اس میں کیسے ماہر اور کامل تھے لیکن تجارت آزاد کے بہانے سے انگلستان ہندوستانیوں کو لنکاشائر۔ یارک شائر اور گلاسگو کی کلوں کے بنے ہوئے کپڑے خریدنے پر مجبور کررہا ہے اور بنگال و بہار کے دستی بنے ہوئے کپڑے کیسے مضبوط اور کیسے خوش نما۔ بھاری بھاری محصول درآمد قائم کرکے اپنے ہاں آنے سے روکتا ہے۔

یہاں ایک نکتہ یہ بھی بتانے کے قابل ہے کہ اول اول جبکہ انگلستان کی صنعت و حرفت بمقابلہ ہندوستان کے پس ماندہ حالت میں تھی تو ہندوستانی مصنوعات بھاری بھاری

محصول درآمد کے ذریعہ سے صرف انگلستان میں آنے سے روکا جاتا تھا۔ یہی انگریزی تاجر ہندوستانی مصنوعات دیگر ممالک میں لیجاکر فروخت کرتے اور تجارت سے نفع اُٹھاتے تھے۔ مگر اپنے ملک میں صنعت وحرفت کی ترقی کو تجارت کے نفع پر ترجیح دینے اور ہندوستانی ارزاں مال کے بجائے ملک کا گراں مال خریدنا بہتر سمجھتے تھے۔ جب اوّل اوّل اس تامین کی آڑ میں بعدہٗ کلوں کی ایجادات سائنس کی تحقیقات اور تعلیم عامہ کی بدولت اپنے ہاں کی صنعت وحرفت خوب ترقی کر چکی تو دیگر ممالک میں بھی انگریزی مصنوعات پھیلانے شروع کئے۔ علاوہ ازیں یورپ کے دیگر ممالک اور امریکہ نے بھی اپنی اپنی صنعت وحرفت پھیلانے کی خاطر انگلستان کی دیکھا دیکھی ہندوستانی مصنوعات کے ویسا ہی برتاؤ شروع کیا یعنی بھاری محصول قائم کرکے ان کی درآمد روک دی۔ انگلستان کی طرح اُنہوں نے اپنی کلوں کی ایجادات اور سائنس کی تحقیقات میں پوری کوشش کی۔ عوام میں تعلیم پھیلائی اور بہت جلد اُن کی معاشی حالت بھی روبترقی ہوگئی لیکن ہندوستان نہ صرف ایجادات اور سائنس کی تحقیقات اور تعلیم عامہ کی برکت سے محروم رہا بلکہ اس کی ان پڑھ جگہ اپنے فن کے بڑے بڑے کامل صناع کو اپنے کاروبار میں تباہ کن مزاحمتیں پیش آئیں۔ نہ صرف دیگر ممالک نے ہندوستانی مصنوعات کی درآمد روک دی بلکہ اس کے برعکس بلا تحاشا اپنی مصنوعات لالاکر ہندوستان میں انبار لگانے شروع کئے۔ اور اس طرح پر کچھ عرصہ میں ہندوستانی مصنوعات نہ صرف دیگر ممالک سے خارج ہوگئے بلکہ خود اپنے ملک میں بھی اُن کو پناہ نہ مل سکی اور عارضی بندشوں میں نامساعد حالات میں گھر کر بے بس اور کاررفتہ ہوگئے۔ صرف زراعت اور پیداوار خام کی بہم رسانی اس کے ذمہ ڈالدی گئی۔ صنعت وحرفت کی خاص برکات میں اس کا کوئی حصہ نہیں رہا۔

جبکہ اس تحریک کا زور شور تھا کہ کمپنی محض حکمراں بنکر ہندوستان میں رہے اور تجارت سے کچھ سروکار نہ رکھے۔ اُس عام تجار پر چھوڑ دے۔ جو ۳۲-۱۸۳۱ء میں پارلیمنٹ کی طرف سے ہندوستان کے متعلق ایک منتخب کمیٹی نے تحقیقات شروع کی اور کل معلومات

چھ نہایت ضخیم جلدوں میں شائع کی گئی۔ اس موقعہ پر بھی معاشی تحقیقات کا تمام رجحان یہی نظر آتا ہے کہ انگریزی مصنوعات ہندوستان میں کیونکر رواج پاسکتی ہیں اور انگریزوں کو ہندوستان میں کاروبار جاری کرنے کے کیا کیا موقعے حاصل ہیں۔ اس تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ کمپنی کی تدابیر کارگر ہو چلی تھیں پارچہ بافی کی صنعت کو گھن لگنا شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے سوتی کپڑے کی درآمد انگلستان میں بہت گھٹ گئی۔ ریشمی کپڑا ہندوستان میں ناکام ہو گیا۔ حتیٰ کہ الٹی انگلستان سے اس کی درآمد جاری ہو گئی اور طرح طرح کی کل اور انجنوں کی ایجادات سے انگلستان کی صنعت و حرفت تو دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی اور ہندوستان کی حالت بالکل اس کے برعکس ہو گئی۔ چنانچہ مذکورہ بالا تحقیقات سے واقعات ذیل کا پتہ چلتا ہے۔ کلکتہ میں انگریزی مصنوعات کی درآمد پر ۲½ فی صدی محصول لیا جاتا تھا بمقابلہ اس کے ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر لندن میں محصول بشرح ذیل وصول کیا جاتا تھا۔

ہندوستانی مصنوعات	فیصدی قیمت		
	۱۸۱۲	۱۸۲۴	۱۸۳۲
ریشمی کپڑے	قطعی ممانعت	قطعی ممانعت	۲ فیصدی
زربفت	″	″	۳۰ ″
شالی چادر	۷۱ فی صدی	۶۷½ فی صدی	۳۰ ″
چھینٹ	۷۱⅔ ″	۶۷½ ″	۱۰ ″
قالین	۶۸⅓ ″	۵۰ ″	۲۰ ″
بنت کا آرائشی سامان	۷۱ ″	۵۰ ″	۳۰ ″
سوتی کپڑا	۶۷⅓ ″	۵۰ ″	۲۰ ″

مگر ریشم خام کی حالت بالکل برعکس تھی۔ ۱۸۱۲ء میں اس کی درآمد پر محصول ۳ فی صدی

حصہ چہارم باب ششم

قیمت و ۳ روپیہ فی پونڈ کی مجموعی شرح سے وصول کیا جاتا تھا۔ ۱۸۲۴ء میں وہ صرف ۳ روپیہ فی پونڈ ہو گیا۔ اور انگریزی مصنوعات کو مزید ترقی دینے کی خاطر ۱۸۳۲ء میں محصول درآمد برائے نام ایک آنہ فی پونڈ رہ گیا۔

دوسرے ملک بھی ہندوستانی مصنوعات خصوصاً کپڑا بکثرت خریدتے تھے لیکن انگلستان کی طرح انھوں نے بھی اپنی اپنی صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی خاطر بھاری بھاری محصول قائم کرکے درآمد روک دی۔ یا اگر کچھ عرصہ کہیں درآمد جاری بھی رہی تو انگریزی تجار نے اپنے مصنوعات کو وہاں بھرنا شروع کردیا۔ چنانچہ دیگر ممالک میں ہندوستان کے سوتی کپڑے کی درآمد جسقدر گھٹ گئی وہ اعداد ذیل سے بخوبی روشن ہے۔

ممالک درآمد	مقدار درآمد		
انگلستان	سنہ ۱۸۰۳ء	۱۴۸۱۷	گٹھ کپڑا
	سنہ ۱۸۲۹ء	۴۳۳	″
امریکہ	سنہ ۱۸۰۱ء	۱۳۶۳۳	″
	سنہ ۱۸۲۹ء	۲۵۸	″
ڈنمارک	سنہ ۱۸۰۰ء	۱۴۵۷	″
	سنہ ۱۸۲۰ء	۱۵۰	″
پرتگال	سنہ ۱۷۹۹ء	۹۷۱۴	″
	سنہ ۱۸۲۵ء	۱۰	″
عرب وفارس	سنہ ۱۸۰۱ء	۶۰۰۰	″
	سنہ ۱۸۲۵ء	۲۰۰۰	″

حاصل کلام یہ کہ اپنی اپنی صنعت وحرفت کی ترقی کی خاطر ہر خریدار ملک نے ہندوستانی

مصنوعات کی درآمد روکدی کچھ ہی عرصہ بعد ان میں سے اکثر ممالک نے طرح طرح کی کلیں ایجاد کر کے صنعت و حرفت میں ایک نئی روح پھونکدی اور پھر غضب یہ کہ ہندوستان فروخت مصنوعات کے واسطے بڑا بازار تجویز ہوا اور دیگر ممالک کے برعکس یہاں درآمد مصنوعات کا باب کھولدیا گیا ۱۸۱۳ء میں صرف کلکتہ سے لندن کو ۳ کروڑ روپیہ قیمتی کپڑا روانہ ہوا تھا مگر ۱۸۳۰ء میں ۳ کروڑ روپیہ قیمتی کپڑا الٹا انگلستان سے ہندوستان بھیجا۔ ۱۸۲۴ء میں انگریزی کپڑا ہندوستان میں بقدر ۸ لاکھ ۱۸ ہزار گز آیا۔ اور ۱۸۳۵ء میں سالانہ درآمد کی مقدار تقریباً ۵ کروڑ ۸۰ لاکھ گز تھی علاوہ ازیں اونی کپڑا تانبے سیسے لوہے شیشے اور چینی کا سامان بھی آنا شروع ہوا دیگر بیدار اور خود مختار ممالک سے بھی ہندوستان کو ایسا ہی سابقہ پڑا۔ اکیلا ہندوستان ممالک عالم کے ان داؤ پیچ اور زور آزمائیوں کی تاب کہاں تک لاسکتا تھا۔ بے بس ہو کر گھٹنے ٹیک دیئے۔ صنعت و حرفت یوں برباد ہوئی جیسے کہ سرسبز و شاداب چمن کو سیلاب بہادے یا اندھی اکھاڑ ڈالے۔ لے دے کر ایک زراعت ہی ذریعہ معاش باقی رہ گیا اور دیگر ممالک کی مصنوعات کا وہ تسلط ہوا کہ سوئی تا گا تک باہر سے آنے لگا۔ ایسے ملک کا کسی نہ کسی دن جو حشر ہونا چاہیئے وہ محتاج بیان نہیں۔ رہی وہ مصیبت جو صنعت و حرفت برباد ہونے سے کروڑہا بندگان خدا پر بیکاری کے ہاتھوں اسوقت تاری ہوئی۔ خود کمپنی اُس کی معترف ہے۔ چنانچہ **لارڈ ولیم بینٹنگ** گورنر جنرل ہند کی ایک تحریر مورخہ ۳۰ مئی ۱۸۲۹ء میں ڈائرکٹران کمپنی کا ہمدردی آمیز نوٹ درج ہے۔ وہ یہ کہ تجارت کے موجودہ انقلاب سے ہندوستان کے بیشمار صناع طبقوں میں جو سخت تکلیف و مصیبت پھیلی ہوئی ہے اور جس کی مثال تاریخ تجارت میں کہیں نظر آنی دشوار ہے اسکی بھیانک تصویر جو تجارتی بورڈ نے اپنی رپورٹ میں پیش کی ہے اسکو دیکھ کر ڈائرکٹروں کے دلوں میں بے حد ہمدردی موجزن ہے۔ اگر ۱۸۳۲ء کی تحقیقات میں ہندوستان سے واپس شدہ معزز انگریزوں کے بیانات پر نظر ڈالے تو سب ہم زبان ہیں

کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کو زبردستی پامال کرکے ہندوستان پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے
مگر اس شکایت کا دبی زبان سے جواب یہی دیا جاتا تھا کہ آخر انگلستان کی صنعت و حرفت کو
ترقی دینا بھی تو سب باتوں پر مقدم ہے اور اسی غرض سے جیسا کہ سر جان ملکم گورنر بمبئی
کی تحریر مورخہ ۳۰ نومبر ۱۸۳۱ء سے واضح ہوتا ہے۔ ڈائرکٹران کمپنی نے قطعی طور پر طے کرلیا تھا
کہ ہندوستان بیشتر پیداوار خام مہیا کیا کرے جو کہ انگلستان کی بیش بہا مصنوعات کے واسطے
درکار ہو تاکہ انگلستان دیگر ممالک سے مستغنی ہو جائے۔ ہندوستان سے پیداوار خام لے اور
اس کو اپنی مصنوعات بھی دے۔ چنانچہ آج کے دن تک ہندوستان کے محصول درآمد و برآمد
قائم کرنے میں اس اصول کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن عام رائے میں بتدریج انقلاب ہو رہا ہے
اور خود سرکار اب ہندوستانی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی طرف مائل ہوتی جاتی ہے۔

ہندوستانی صنعت پارچہ بافی کا حاصل مستقل

(۸) ۱۸۳۳ء سے لیکر آج کے دن تک ہندوستان کے محصول درآمد و برآمد میں حسب
حالات وقتاً فوقتاً بہت کچھ ردوبدل ہوتا رہا ہے جس کی تفصیل کی نہ یہاں ضرورت اور نہ گنجائش۔
البتہ اتنا جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام دوران میں سب سے زیادہ بحث مباحثہ اور
کشمکش فقط سوتی کپڑے کے محصول پر جاری رہی اور اب تک ہے باوجود ہزار بس ماندگی کے
جب سوتی کپڑا بننے والے کارخانے کلکتہ بمبئی جیسے مقامات میں ابھرنے لگے اور بتدریج
کپڑے کی ملیں جاری ہو چلیں تو انگلستان کے کارخانہ داروں کو فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں یہ
پرانا رقیب پھر سر نہ اٹھائے اور بنا بنایا کام بگاڑ دے ۳½ فی صدی محصول درآمد جو انگریزی
کپڑے پر ہندوستان میں ادا کیا جاتا ہے اور جس کی مجموعی تعداد اب سرکار ہند کی کل آمدنی
کا ۱۵ فیصدی حصہ ہے اس سے تو بچنا آسان نہ تھا۔ پس انگریزی کارخانہ داروں نے شور مچانا
شروع کیا کہ یہ محصول درآمد یعنی ۳½ فیصدی محصول مال نہیں بلکہ محصول تامین ہے۔ یعنی
اس سے ہندوستانی کارخانوں کو امان ملتی ہے اور اس میں نہ صرف انگریزی کارخانوں کا

حصۂ چہارم نقصان ہی بلکہ ایسا محصول انگلستان کے قومی طریق تجارت آزاد کے منافی ہے پس اگر محصول درآمد
باب ششم مالی نقصان کے خوف سے ترک نہیں کیا جا سکتا تو ہندوستانی کارخانوں پر بھی بقدر ۳½ فی
صدی محصول پیداوار قائم کر دینا چاہیے تاکہ ان کو انگریزی کارخانوں پر موجودہ فوقیت حاصل
نہ رہے۔ سب جانتے ہیں کہ انگلستان میں لنکاشائر اور منچسٹر کے کارخانہ داروں کا حکومت
میں رسوخ بہت قوی ہے۔ ان کے اثر میں اسقدر ووٹ ہیں کہ زبردست سے زبردست
وزارت بھی ان سے بے اعتنائی کرنے کی جرأت کم کر سکتی ہے۔ ہم کو مشکور ہونا چاہیے کہ
بالعموم ہندوستان کے اعلیٰ عہدہ دار انگریز کپڑے کے محصول کے معاملہ میں ہندوستان
کے جانب دار رہے اور لنکاشائر کے بیجا مطالبات مسترد کرنے میں پوری کوشش صرف
کیا کئے۔ چنانچہ **لارڈ نارتھ برک** وائسرائے ہند اور **لارڈ سالسبری** وزیر ہند
کی اس معاملہ میں گرما گرم خط و کتابت کا حال سب کو معلوم ہے۔ وزیر ہند لنکاشائر کے موئید تھے
اور وائسرائے ہندوستان کا حامی۔ جب اختلاف رائے رفع نہ ہو سکا تو وائسرائے علاوہ دیگر
وجوہات کے اس بنا پر بھی اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ اعلیٰ عہدہ دار انگریزوں نے ہمت
پھر بھی نہ ہاری اور اپنی سی کوشش برابر کئے گئے مگر کہاں تک بالآخر **لارڈ ایلجن** کے
عہد میں محصول روئی کے متعلق ۱۸۹۶ء میں ایک ایکٹ پاس ہوا جو اب تک جاری ہے اسکی
دفعہ ۶ کی رو سے ایسے کل سوتی کپڑے پر جو ہندوستانی کارخانوں میں تیار ہو ۳½ فیصدی
محصول پیداوار اسی طرح قائم کر دیا گیا جس طرح سے انگلستان کے کارخانہ دار ہندوستان میں ۳½
فی صدی محصول درآمد دیتے ہیں۔ اس ایکٹ پر دو بڑے اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ
ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت عارضی تامین کی مستحق ہے اگر بیرونی مقابلہ سے اس کو
چندروز بھی اماں مل جاوے تو وہ بہت جلد ترقی کر کے سرچشمہ مرفہ الحالی ثابت ہو سکتی
ہے اور ایسی ہونہار صنعت و حرفت کی عارضی تامین تو **مل** جیسے تجارت آزاد کے حامی تک

ے جائز قرار دی ہے۔ اور ہر ترقی یافتہ ملک اس طریق سے بیش بہا فوائد حاصل کر چکا ہے۔ دوم بحالت موجودہ ہندوستانی کارخانے موٹے قسم کا کپڑا تیار کرتے ہیں جو عوام اور غربا کے کام آتا ہے۔ اس کے برعکس ولایت سے اعلیٰ اور نفیس قسم کا کپڑا امرا کے واسطے آتا ہے۔ گویا ہندوستان کے کارخانوں کا انگلستان والوں سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ان کے گاہک جدا جدا ہیں پھر ہندوستان کے بنے کپڑے سے ولایتی کپڑے کو کیا نقصان کا اندیشہ ہوسکتا ہے اور ہندوستانی کپڑے پر ۳½ فی صدی محصول قائم کر کے غربا کو زیر کرنے سے کیا حاصل ہندوستان میں اب یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ اگر ہندوستانی کپڑے پر ۳½ فی صدی محصول پیداوار بحال بھی رہے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن کپڑے پر محصول درآمد ضرور بڑھنا چاہیے کچھ دنوں کی بات ہے کپڑے کی درآمد بقدر ۹۸ فیصدی انگلستان کے ہاتھ میں تھی لیکن چند روز سے اسی محصول درآمد کی کمی کی بدولت جاپان بھی کپڑے کی تجارت میں شریک ہو رہا ہے اور انگلستان کی تجارت گھٹ کر اب صرف ۹۰ فی صدی رہ گئی۔ جو حصّہ جاپان نے اڑایا اگر وہ ہندوستان ہی کے پلہ پڑ سکتا تو کیا برا ہوتا۔ غیروں کو شریک ہوتے دیکھکر اغلب ہے کہ ولایت کے کارخانہ دار اس مسئلہ پر اپنے رویہ میں ترمیم کریں اور اس سے ہندوستان کا بھی کچھ بھلا ہو جاوے۔

امسال یعنی ۱۹۱۶ء سر ولیم میر مبرنال نے ہندوستان کا سالانہ بجٹ پیش کرتے ہوئے۔ سوتی کپڑے کے محصول کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرکار ہند بھی اب اس مسئلہ کو ہندوستان کے حق میں کافی اہم سمجھتی ہے اور اس کو اس طرح پر طے کرنے کو آمادہ ہے کہ قدیم شکایت رفع ہو جائے اور ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی میں دوبارہ جان پڑ سکے۔ بات یہ تھی کہ مصارف جنگ کے خیال سے جن چیزوں پر محصول درآمد ۵ فی صدی تھا وہ بڑھا کر ۷½ فی صدی کر دیا گیا۔ لیکن سوتی کپڑا جو ہندوستان کی سب سے

حصہ چہارم
باب ستم

بڑی درآمد ہے اس پر وہی ۳½ فی صدی محصول درآمد بحال رکھا گیا مبادا کہ اضافہ محصول سے ولایت کے کارخانہ داروں میں برہمی پھیل جاوے اور کہا یہ بھی جاتا ہے کہ ہندوستان میں کپڑا گراں بنانا منظور نہیں۔ وجہ جو کچھ بھی سہی۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ کم ازکم موجودہ حالت میں کپڑے پر محصول درآمد نہ بڑھانا بے محل اور نامناسب رعایت ہے۔ اس عام خیال کی اصلاح ممبر مال کو اپنی تقریر میں ضروری معلوم ہوئی اور ان کی صاف بیانی و ہمدردی ضرور قابل ستائش و شکریہ ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

قدرتی طور پر کونسل سوال کرے گی کہ ایسے وقت جبکہ مالی ضروریات ہم کو ہر قسم کے محصول درآمد میں اضافہ کرنے پر مجبور کر رہی ہے کیا وجہ کہ روئی مستثنیٰ کرکے سابق حالت پر چھوڑ دی جائے۔ واضح ہو کہ سرکار ہند اپنی یہ رائے پیش کرنے میں قاصر نہیں رہی کہ سوتی کپڑے کے محصول درآمد میں معقول اضافہ ہونا چاہیے اور سوتی کپڑے کے محصول پیداوار میں جس پر اس ملک میں بکثرت نکتہ چینی ہو رہی ہے کوئی اضافہ نہ کیا جائے اور جس وقت بھی مالی حالت کافی حد تک بہتر ہو جائے۔ آخرالذکر محصول قطعاً منسوخ ہو جانا دائرہ امکان میں شمار کرنا چاہیے۔ لیکن سرکار برطانیہ نے جس کو معاملات پر غور کرنے میں بیشتر وسیع النظری سے کام لینا پڑتا ہے محسوس کیا کہ اس وقت اس سوال کا اٹھانا نہایت بدقسمتی کی بات ہوگی کیونکہ ایسے وقت میں جبکہ بحث طلب مسائل سے یہاں اور نیز انگلستان میں احتراز کرنا چاہیے اس سوال سے پھر ایک پرانا قصہ چھڑ جائیگا اور ممکن ہے کہ جنگ سے جو اہم تر معاملات وابستہ ہیں ان کے طے ہونے پر اس قضیہ کا مضر اثر پڑے پس شہنشاہ معظم کی سرکار محسوس کرتی ہے کہ حصص سلطنت برطانیہ کے آپس میں اور باقی ممالک کے ساتھ جو مالی تعلقات ہونے چاہئیں۔ ان پر بعد جنگ ازسرنو غور کیا جائے اور روئی کے محصول کا مسئلہ بھی اس وقت پر ملتوی رکھا جائے اور وہ اس پالیسی کے مطابق طے ہوگا جو بحیثیت مجموعی کل سلطنت کے

حصہ چہارم باب ششم

حق میں سب سے زیادہ مفید قرار پائیگی۔ شہنشاہ معظم کی حکومت کو معلوم ہے کہ اس مسئلہ پر ہندوستان میں بہت دلچسپی پیدا ہورہی ہے اور نئے ٹکس قائم کرنے کا جب سوال چھڑے گا تو اس محصول کا ذکر ضرور کیا جائیگا۔ لیکن حکومت مذکور کو یقین ہے کہ جو کچھ تجویز پیش کی گئی ہے وہ ہندوستان کے حق میں سب سے بہتر ہے اور اس مسئلہ کی قبل از وقت بحث ضرور مضرت رساں ثابت ہوگی چنانچہ ممبر مال فرماتے ہیں کہ ایسے نازک زمانہ میں مذکورہ بالا وجوہات کی اہمیت و معقولیت محسوس کرکے ہم مجبور ہیں اور بادل ناخواستہ محصول روئی میں ترمیم کرنے سے دست بردار ہوتے ہیں۔

ہندوستان کا ماضی و مستقبل

(۹) ممبر مال کی عاقلانہ رویہ سے ہر سمجھدار ہندوستانی کو پورا اتفاق ہے اور ہونا چاہیئے۔ یہ وقت جان و مال سے سلطنت کی مدد کرنے کا ہے تاکہ جب حکومت بحسن و خوبی جنگ کو سرانجام دے چکے تو پھر جائز حقوق ملنے میں سہولت ہو۔ ہندوستان تو اپنی قسمت کا پانسہ انگلستان کے ساتھ ڈال چکا ہے۔ انگلستان کے اقتدار اور عروج کے ساتھ اب اسکی بہبودی بھی وابستہ ہے۔ ہندوستان کی تجارت خارجہ کی مذکورالصدر تاریخ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ ہندوستان کو غیر متوقعہ حالات پیش آئے اور سراسر نقصان پہنچا۔ اوّل تو ایسے لاوارث ملک اور پامال قوم میں آزاد ملک کے جری تاجروں کی منفعت طلبی سب باتوں پر مقدم ہوتی ہے۔ اپنے نفع کی خاطر جو کچھ بھی کر گذرتے کم تھا۔ انگریز کچھ فرشتے نہ تھے اُن کا ابتدائی طرز عمل کچھ عجیب نہ تھا۔ ایسی حالت میں کسی قوم سے بہتر توقع کرنی عبث ہے۔ لیکن جوں جوں انگریزوں کو ہندوستان میں رہتے زمانہ گذرتا گیا۔ جوں جوں ان کا ملک پر قبضہ پھیلتا گیا جو بعض حالتوں میں محض اتفاقی بلکہ سراسر خلاف مرضی تھا ان کے دل میں ہندوستان کے ساتھ ہمدردی بلکہ محبت پیدا ہوتی رہی۔ جب کبھی انگلستان والوں نے خود غرضی یا نادانی سے ہندوستان پر بیجا بار ڈالنا چاہا۔ اکثر ہندوستان میں رہے اعلیٰ عہدہ دار انگریزوں سے

حصہ چہارم باب ششم

ہندوستان کی پوری طرفداری کرکے اس کو بچانے کی کوشش کی ہے اور کبھی بچا بھی لیا ہے چنانچہ گذشتہ تین صدی کی معاشی تاریخ میں ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں۔ انگلستان کی تجارت سے اگر ہندوستان کی صنعت و حرفت کو صدمہ پہنچا اور ضرور پہنچا۔ تو ساتھ ہی ساتھ انگلستان کے تعلقات سے اسکو بہت سے فوائد بھی حاصل ہوئے جو بصورت دیگر حاصل ہونے بہت دشوار تھے۔ حکومت برطانیہ کی گوناگوں برکات جو ہندوستان پر نازل ہوئیں ان کی تفصیل کے واسطے ایک جداگانہ کتاب موزوں ہوگی اور وہ اسقدر بدیہی ہیں کہ کوئی انکار نہیں کرسکتا قطع نظر بہت سے فوائد کے اگر صرف یہی غور کیا جائے کہ صدیوں کی غفلت اور جمود کے بعد یہ عام بیداری اور جد و جہد اور یہ قومیت کا احساس پیدا کرنے میں حکومت انگریزی کی آزادی و تعلیم نے کسقدر حصہ لیا ہے۔ تو باوجود مالی نقصان کے انگریزوں کا شکر گزار ہونا پڑتا ہے اگر سچ پوچھئے تو انھوں نے ہندوستان کے نیم مردہ جسم میں نئی جان ڈالدی اور جان پڑگئی تو خدا طاقت و توانائی بھی دیگا۔ ایسا طبیب جو کچھ بھی فیس وصول کرے مضائقہ نہیں اور اب تو اسنے جان ڈالنے کے بعد اپنے مجرب نسخوں سے جسم میں بتدریج طاقت بڑھانی بھی شروع کردی۔ مدتوں کے میل ملاپ سے مریض و طبیب میں ایک قدرتی انس پیدا ہوگیا ہے۔ تندرستی حاصل ہونے کے بعد بھی دوستانہ بلکہ نیازمندانہ تعلقات برقرار رکھنا نہایت مناسب اور مفید ہوگا۔ چنانچہ کل تعلیم یافتہ ہندوستان کا عقیدہ ہو چلا ہے کہ اگر ہندوستان کے دن پھرینگے تو انگلستان کے ظل عاطفت میں۔ اور سب کی خواہش ہے کہ مدت ہائے دراز تک ان دونوں ملکوں میں تعلقات برقرار رہیں البتہ موجودہ تعلقات گوناگوں اصلاح اور ترمیم کی ضرورت ہر کوئی محسوس کرنے لگا ہے اور ممکن نہیں کہ روشن خیال اور زمانہ شناس حکومت برطانیہ عام جذبات اور احساسات کے ساتھ بے اعتنائی برتے۔ عام مطالبات پر توجہ ہوگی اور ضرور ہوگی مطمئن رہنا چاہیے۔

باب ہفتم

مبادلات خارجہ

Foreign Exchanges

تجزیہ (۱) دادوستد بین الاقوام کی مدیں (۲) توازن درآمد برآمد اور توازن دادوستد (۳) ہنڈی کی تشریح (۴) ہنڈی کے نرخ کے اصول (۵) ہنڈی دلال (۶) مطالبات خارجہ کی ادائگی کے طریق

دادوستد میں الاقوام کی مدیں

(۱) آج کل ذرائع آمدورفت کی سہولت قیام امن و امان عام بیداری اور ترقیات کاروبار کی بدولت دور دراز ملکوں میں بھی مغائرت اور کشیدگی گھٹکر بہت زیادہ میل جول پیدا ہوگیا ہے اور اسی وجہ سے آپس میں طرح طرح کا لین دین جاری ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ملکوں میں سے ہر ایک کا دوسروں پر اور ہر ایک پر دوسروں کا کچھہ نہ کچھ مطالبہ عاید ہوتا رہتا ہے۔ ملکوں کے باہم جو مطالبات نمودار ہوتے ہیں اس کی چند صورتیں ہیں جن کی ذیل میں مختصر تشریح کی جاتی ہے۔

(۱) **تجارت** یعنی سامان کی درآمد و برآمد اگرچہ انگلستان اور ہندوستان کے سوا کل ترقی یافتہ ممالک میں تجارت خارجہ طریق تامین پر جاری ہے۔ جو پیداوار خام ملکی مصنوعات کی ضرورت سے زاید ہو اور دوسرے ملکوں میں درکار ہو یا جو مصنوعات غیر اختیاری دشواریوں کی وجہسے ملک میں تیار ہو ہی نہ سکیں اور جن کو دوسرے ملکوں سے منگائے بغیر چارہ نہو اُن کی برآمد و درآمد بکثرت جاری رہتی ہے۔ مزید براں محصول تامین عائد کرنے سے اکثر مصنوعات متعلقہ کی درآمد گھٹانا مقصود ہوتا ہے۔ شاذونادر درآمد قطعاً بند کی جاتی ہے تاکہ بیرونی مقابلہ کے حدشہ سے ترقی کا جوش بحال رہے۔ حاصل کلام یہہ کہ اگرچہ تامین تجارت اکثر ملکوں کا مسلک بنا ہوا ہے۔ پھر بھی قوموں کے درمیان بہت کچھہ تجارت جاری ہے اور رہے گی۔ ہر ملک کی برآمد سے اس کے مطالبات دوسرے خریدار ملکوں پر عائد

ہوتے ہیں اور درآمد سے دوسرے فروخت کنندہ ممالک کے اس پر قوموں کے درمیان لین دین کا سب سے عام اور اہم سلسلہ یہی برآمد و درآمد اشیار سمجھا چاہئے۔

(ب) **قرض خارجہ**۔ ترقی یافتہ ملک آپس میں قرض بھی دیتے لیتے رہتے ہیں فرض کرو سرکار ہند کو سر دست پچیس کروڑ روپیہ درکار ہے۔ یہ رقم بطور قرضہ عوام سے وصول کیجا سکتی ہے۔ اس کا طریق یہ ہے کہ غالباً پانچ پانچ سو یا ہزار ہزار روپیہ کے بہت سے رقعے بقدر پچیس کرور روپیہ چھپوائے جائیں گے چونکہ اکثر مہذب ملکوں کو وقتاً فوقتاً مختلف کاموں کے واسطے عوام سے قرض لینا پڑتا ہے۔ بغرض سہولت وصفائی حساب کتاب ایسے رقعوں کے متعدد نام قرار دیئے گئے ہیں کوئی **پونڈ** کہلاتے ہیں کوئی **اسٹاک** کوئی **ڈبنچر** کوئی **سیکیورٹی** وغیرہ وغیرہ مگر اصلیت سب کی ایک ہے۔

جو کوئی سرکار کو قرض دینا چاہے وہ بطور رسیدات رقعوں کو لیکر سرکار کو روپیہ دیسکتا ہے رقم مندرجہ رقعہ پر اس کے پیش کنندہ کو ہر سال سرکاری خزانہ سے بشرح معین سود ملتا رہتا ہے۔ ادائگی قرض کے واسطے سرکار وقت مقرر کرے یا نکرے یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ لوگ اس بات کی زیادہ پروا بھی نہیں کرتے جب تک رقعہ اُن کے پاس ہے اُن کو اس طرح پر سود ملتا رہیگا جیسے کہ کسی ریاست یا تجارت سے آمدنی حاصل ہوتی ہے اور جب رقعہ والا اپنا روپیہ واپس لینا چاہے تو وہ اس کو دوسرے کے ہاتھ اس طرح پر فروخت کرسکتا ہے جیسے کہ کوئی ملک و جائداد۔ اب گویا نیا خریدار سرکار کا قرض خواہ بن جائے گا اور سود اس کو ملنے لگے گا۔ رقم مندرجہ رقعہ **قیمت متعارف** کہلاتی ہے لیکن بعد کو خرید و فروخت میں ایسے رقعوں کی قیمت اون کی بازاری شرح سود کی نسبت سے قرار پاتی ہے۔ فرض کرو کہ پانسو روپیہ کے رقعہ پر سود بشرح ۴ فیصدی وصول ہو۔ اب اگر سود کی بازاری شرح ۵ فیصدی ہے تو اس رقعہ کی قیمت گھٹکر صرف چارسو روپیہ رہ جائے گی اور اگر شرح بازاری

صرف ۳ فیصدی ہو تو اس کی قیمت بڑھ کر تقریباً ۱۶۶ ہو جائے گی۔ بہر حال قیمت جو کچھ بھی قرار پائے لیکن رقعہ دار چاہے تو اپنا روپیہ کم و بیش وصول کر سکتا ہے پھر کسی کو کیا فکر کہ سرکار کب قرض ادا کرے گی رقعوں کی حقیقت بالکل ایک ایسی جائیداد کی ہے جس سے بلا درد سر ایک مستقل آمدنی وصول ہوتی رہے۔ جب تک حکومت قائم ہے رقعہ دار کی آمدنی بھی بحال ہے چونکہ اس صورت میں آمدنی مستقل ہے اور اس کی وصولیابی میں برائے نام بھی دقت نہیں اٹھانی پڑتی بہت سے لوگ ریاست یا کاروبار کے بکھیڑے سے بچنے کے لیے ایسے رقعے خرید کر سرکار کے قرض خواہ بن جاتے ہیں وقت معینہ پر سرکاری خزانہ گئے اور اپنا سود وصول کر لائے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ اگر اصل روپیہ واپس لینا مقصود ہوا تو خود یا کسی دلال کی معرفت حسب دلخواہ رقعے دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دئے۔ یا تو قیمت کچھ کم ملی یا زیادہ۔ یہ اس وقت کے حالات پر منحصر ہے اور وہ کون سی چیز ہے جس کی قیمت میں کمی بیشی نہیں ہوتی رہتی۔ یہ تغیر قیمت کچھ رقعہ ہی کا خاصہ نہیں ہے بلکہ سب چیزوں کے واسطے عام ہے رفتہ رفتہ حکومتوں کا اعتبار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ نہ صرف اس کی رعایا بلکہ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی ایسے رقعے خرید کر غیر حکومتوں کے قرض خواہ بننے میں کوئی تامل نہیں کرتے چنانچہ سرکار ہند کو ایسے **قرض عامہ** بیشتر انگلستان سے وصول ہوتے رہے ہیں ہندوستان میں بہت سوں کے پاس تو روپیہ نہیں اور جس کے پاس ہے وہ ان جدید طریق و قواعد سے ناواقف بتانے بھی تو ان کے دل میں سو سو طرح کے شکوک اور اندیشے پیدا ہوں یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے قرض عامہ میں ہندوستانیوں کا حصہ بہت کم ہے اور اس کے سود کی بڑی مقدار بیرون ملک رقعہ داروں کی جیب میں مدت سے جا رہی ہے۔ اب لوگوں میں کچھ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ سرکار کو قرض دینا شغل اصل کی ایک عمدہ ترکیب ہے اور ہندوستانی رقعہ داروں کی تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے قرض عامہ کی مجموعی مقدار

حصہ چہارم
باب ہفتم

۴ارب ۱۴½ کروڑ روپیہ کے قریب تھی۔ جس میں سے صرف ایک ارب ۴ کروڑ ہندوستان سے وصول ہوا اور باقی انگلستان سے۔

حاصل کلام یہ کہ سرکار کو قرض دینے کا رواج ہر ترقی یافتہ ملک میں بکثرت رائج ہے۔ حتیٰ کہ اپنے ملک کے علاوہ دوسرے ملکوں کے قرض عامہ میں بھی لوگ بشوق شریک ہوتے ہیں اور معتبر حکومتوں کے رقعے اب ہر کہیں فروخت ہو سکتے ہیں۔ لوگ ایسے رقعے خرید کر غیر حکومتوں کے قرض خواہ بننے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ رہا یہ سوال کہ سرکار قرض کیوں لیتی ہے۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے جس کی تفصیل **مالیات** میں پیش ہو سکتی ہے لیکن اس قدر صاف ظاہر ہے کہ سرکار اسی وقت قرض لے گی جب کہ اس کو اندرون ملک یا بیرون ملک کوئی ضرورت پیش آئے اور کافی روپیہ اس کے پاس موجود نہو ایسی ضرورت کا باعث خواہ کچھ ہی کیوں نہو۔ قلت محاصل۔ ملکی اصلاح و ترقی یا جنگ۔ بالعموم ادائگی قرض کا پہلے سے وقت معین نہیں کیا جاتا۔ جب سرکار کی مالی حالت سدھر سے۔ اس کو قرض ادا کرنے کا اختیار ہے اور اس سے قبل قرض خواہ کو وہ صرف سود ادا کرنے کی ذمہ دار ہے اور بس۔ بعض بعض ممالک میں قرض عامہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب اس کی ادائگی مدتوں ممکن نظر نہیں آتی اور مقدار سود بجائے خود ایک کثیر رقم بن گئی ہے۔ خصوصاً موجودہ جنگ میں جو سلطنتیں شریک ہیں اُن کا قرض عامہ حد شمار سے باہر نکل جائے تو عجب نہیں اور اس قرض کا سود بجائے خود سرکاری خزانہ پر ایک بڑا بار ہوگا۔ ۱۲-۱۹۱۱ء میں کل سلطنتوں کے قرض عامہ کی مجموعی مقدار ۱۹۶ ارب تخمینہ کی گئی تھی جس میں سے خاص خاص کی مقدار حسب ذیل ہے۔

روس ۱۴ ارب ۴ کروڑ	
فرانس ۱۹ ارب ۸۰ کروڑ	آسٹریا ۱۱ ارب ۴۰ ”
جرمنی ۱۵ ارب	انگلستان ۱۰ ارب ۸۰ کروڑ

اٹلی ۸ ارب ۴۰ کروڑ ہندوستان ۱۴ ارب ۱۲ کروڑ

امریکہ ۱۸ ارب ۴ کروڑ

محض اس خیال سے کہ اب تک ہمارے ملک میں **قرض عامہ** سے لوگ کم واقف ہیں اس کے متعلق چند ابتدائی باتیں سیدھی سادی طور پر بیان کر دی گئیں ورنہ فی نفسہٖ یہ ایک نہایت دقیق اور بحث طلب مسئلہ ہے جس کی تفصیل سے مالیات کی ضخیم کتابیں لبریز ہیں۔ لیکن ہم کو درحقیقت قرض عامہ کا مبادلات خارجہ سے تعلق دکھانا مقصود ہے۔ جس کو اب پیش کرتے ہیں۔ جب کوئی ملک قرض عامہ حاصل کرنے کی غرض سے رقعے جاری کرے اور دوسرا ملک ایسے رقعے خرید خرید کر ملک اول کو قرض دے تو **اس وقت** اس کارروائی کا اثر بعینہ ایسا نظر آئے گا کہ گویا رقعات کوئی مصنوعات ہیں جن کی قرض گیر ملک سے برآمد ہو کر قرض دہندہ ملک میں درآمد ہوتی ہے اور زر قرض گویا ان مصنوعات کی قیمت ہے جو ملک آخر الذکر اول الذکر کو ادا کرتا ہے۔ گویا جب کہ قرض عامہ کی کوئی مقدار دوسرے ملک سے وصول ہو تو اس کا فوری اثر قرض گیر ملک کے حق میں قیمت برآمد اور قرض دہندہ کے حق میں قیمت درآمد کا سا ہوتا ہے رقعات گویا مصنوعات تجارت ہیں اور قرض اُن کی قیمت۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء کی مشہور جنگ فرانس و جرمنی میں جب فرانس کو رقم کثیر بطور تاوان جنگ جرمنی کو ادا کرنی پڑی تو ایسے ہی رقعے جاری کر کے بہت سا قرض عامہ خود جرمنی سے حاصل کر کے تاوان ادا کر دیا۔

(ج) **قرض عامہ کا سود** جو دوسرے ملکوں کو ادا کرنا پڑے۔ اب اس کو لیجئے یہ رقم البتہ قرض گیر ملک قرض دہندہ ملک کو سال بسال ادا کرتا ہے گویا کہ یہ خراج ہے جو اول الذکر ملک آخر الذکر کو پیش کرتا ہے۔ اس خراج کی بنا وہی قرض ہے جو دوسرے ملک نے پہلے کو دے رکھا ہے۔ ہندوستان کے قرض عامہ کا جزو اعظم انگریزوں سے

وصول ہوا - چنانچہ ۱۰ کروڑ ۵۱ لاکھ سے زاید روپیہ صرف ایک سال ۱۲-۱۹۱۱ء میں ہندوستان نے انگلستان کو محض بطور سود قرض عامہ ادا کیا - ہندوستانی قرض عامہ کی بنیاد ۱۸۵۸ء سے پڑی جبکہ کمپنی سے ہندوستان خریدنے کی قیمت اور غدر فرو کرنے کے کل مصارف ہندوستان سے وصول کرنے قرار پائے یہ کل رقم بطور قرض عامہ انگلستان میں لیکر ہندوستان کے نام لکھدی گئی - اور اس روز سے آج کے دن تک ایک رقم کثیر بطور سود ہندوستان سے انگلستان وصول کر رہا ہے ذرا خیال تو کرو کہ گزشتہ نصف صدی میں ہندوستان کتنی رقم بطور سود انگلستان کو ادا کر چکا ہوگا - یورپ اور امریکہ میں چونکہ دولت کی کثرت ہے وہاں کے باشندے اولوالعزم ہیں اور وہاں کی سلطنتوں کا رعب داب بھی دنیا پر قائم ہے یہ ملک قرض عامہ دینے میں بڑے مرد ہیں - اس کے برعکس ترکی - مصر - فارس خاص طور سے قرض لینے پر مجبور ہیں اور قرض دہندہ ملکوں کے ہاتھ میں ایسے ہی بے بس ہو رہے ہیں جیسے کہ ہمارے یہاں مہاجن کے پنجہ میں مسلمان زمیندار سود نہ صرف مالی بار ہے بلکہ قرض کا دباؤ ان کی طاقت و اقتدار کو اس طرح سلب کر رہا ہے جیسے کہ جونک کسی کا خون چوس چوس کر اس کو حال بیحال کر دیتی ہے -

(د) **ادائگی قرض عامہ** - اگر کوئی حکومت چاہے کہ قرض عامہ جو دوسرے ملک سے وصول ہوا ہے ادا کر دے تاکہ اس کو سود نہ دینا پڑے تو ادائگی قرض کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں خواہ سرکار اپنے خزانہ سے رقم ادا کر کے دوسرے ملک سے اپنے کل رقعے خرید لے یا اس ملک کے عوام ایسا کریں - بہر صورت جب قرض عامہ دوسرے ملک کو ادا کیا جاوے گا تو اس کا اثر قرض دار اور قرض خواہ ملک پر بعینہ وہی پڑے گا جو اس کے سود کا پڑتا تھا - یعنی قرض کی رقم اول الذکر ملک اپنی جیب سے آخر الذکر ملک کو اس طرح ادا کریگا کہ گویا خراج پیش کیا - حالانکہ قرض لیتے وقت یہ رقم قرض گیر ملک کے حق میں

قیمت برآمد جیسی نظر آتی تھی۔

(۳) **شغل اصل خارجہ** قرض عامہ میں شریک ہونا توشغل اصل کی ایک خاص صورت ہی اس کے علاوہ اور طرح طرح کے کاروبار میں بھی یورپ والے دور دراز ملکوں میں بیشمار دولت لگائے بیٹھے ہیں اور بہت کچھ منافع اُٹھا رہی ہیں۔ ایشیا میں جہاں کہیں بھی معاشی ترقیات نظر آتی ہی وہ بیشتر یورپ کے اصل سے قائم ہیں اور اُن کے منافع سے سونے چاندی کے دریا ایشیا سے یورپ کو بہہ رہی ہیں۔ ایک انگلستان کو لو اس کا اصل تمام صفحہ عالم پر پھیلا ہوا ہی اور منافع کمانے میں مصروف ہی۔ اس اصل کے طفیل انگلستان تقریباً ۲ ارب چالیس کروڑ روپیہ بطور سود و منافع دوسرے ملکوں سے ہر سال وصول کر رہا ہی۔

(س) **کرایہ باربرداری** ملکوں ملکوں سامان لیئے پھرنے کا کرایہ اس ملک کو وصول ہوتا ہی جس کے جہاز باربرداری میں کام آئیں اور اس ملک سے وصول ہوتا ہی جہاں سامان جائے۔ دنیا کی تمام سلطنتوں میں اس وقت خواہ جنگی خواہ تجارتی۔ سب سے زیادہ جہاز انگلستان کے پاس ہیں۔ چنانچہ اس کا بیڑا بھی سب سے زیادہ طاقتور مانا جاتا ہی اور تجارت بین الاقوام میں بیشتر مال و سامان انگلستان ہی کے جہاز جگہ بہ جگہ لیجاتے ہیں۔ چنانچہ تجارتی مال لیجانے کے صلہ میں انگلستان دوسرے ملکوں سے ایک ارب ۲۰ کروڑ روپیہ ہر سال وصول کرتا ہی۔ امریکہ اور فرانس کے پاس تجارت خارجہ کے واسطے کافی جہاز نہیں اُن کے مال کا ایک معقول حصہ دوسرے ملکوں کے جہاز میں آتا جاتا ہی اور بطور کرایہ اُن کو علی الترتیب تقریباً ۶۲ کروڑ اور ۲۲ کروڑ روپیہ سالانہ دوسرے ملکوں کو ادا کرنا پڑتا ہی۔

یہاں پر درآمد و برآمد کے متعلق ایک نکتہ جتانا ضروری ہی جو بظاہر معمہ سا معلوم ہوتا ہی کہ اگر تمام

حصہ چہارم باب ہفتم

دنیا کی تجارت خارجہ میں نظر رکھی جائے تو بظاہر درآمد و برآمد کی مقدار اور نیز اُن کی قیمت برابر برابر ہونی چاہئے۔ کیونکہ بحیثیت مجموعی ملکوں کی جو کچھ برآمد ہے وہی اُن کی درآمد ہے۔ یہ آسمان سے سامان برسے نہ زمین اس کو نگلے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آمدورفت میں حرابی اور گم ہونے سے درآمد کی مقدار برآمد سے کچھ کم رہتی ہے۔ یعنی جتنا مال روانہ ہوتا ہے اس سے کم منزل مقصود تک پہنچتا ہے۔ کچھ راستہ میں ضائع ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے برعکس درآمد کی قیمت برآمد سے ہمیشہ بڑھی رہتی ہے چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ء میں تمام ممالک کے برآمد کی مجموعی قیمت ۴۰ ارب ۸۰ کروڑ اور درآمد کی قیمت چالیس ارب بیس کروڑ روپیہ تخمینہ کی گئی تھی آخر برآمد کے مقابل درآمد کی قیمت میں ۲ ارب چالیس کروڑ روپیہ کا اضافہ کہاں سے نمودار ہوا بات یہ ہے کہ مقام برآمد میں صرف مال کی قیمت شمار کی جاتی ہے اور مقام درآمد پر پہنچکر قیمت میں کرایہ بار برداری بھی شامل ہو جاتا ہے اور ۲ ارب ۴ کروڑ کی زائد رقم بھی کرایہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔

(ص) **ملازمت و محنت خارجہ** اگر کسی ملک کے باشندے دوسرے ملکوں میں جا جاکر محنت مزدوری اور ملازمت کریں لیکن جو کچھ کمائیں اس کا کوئی حصہ اپنے ملک کو بھیجتے رہیں یہ بھی آمدنی ملک کی ایک صورت ہے۔ مثلاً سلطنت برطانیہ میں بیش تنخواہ اور معزز عہدے زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں اور انگریز ایشیا اور افریقہ میں چند در چند مصلحتوں اور مجبوریوں سے توطن اختیار نہیں کرتے اور انگلستان کو اپنا ملجا و ماوا مانتے ہیں چنانچہ صرف ہندوستان سے انگریزی عہدہ داروں کو کچھ کم بارہ کروڑ روپیہ سنہ ۱۹۱۲-۱۳ء میں بطور تنخواہ و پنشن وغیرہ ادا کیا گیا ہے۔ جس کا ایک معقول حصہ ولایت پہنچا جہاں اُن کا خاندان مقیم ہے۔ اسی طرح پر آئرلینڈ کے باشندے جو امریکہ میں محنت مزدوری کرتے ہیں اگرچہ وہاں توطن اختیار کر چکے ہیں پھر بھی اپنے اعزا اور قدیم وطن کے واسطے بہت کچھ آئرلینڈ کو

بھیجتے رہتے ہیں ۔

(ط) **قیام خارجہ**۔ مذکورہ بالا طریق کے برعکس اگر کسی ملک کے باشندے دوسرے ملک میں جا جا کر رہیں اور اپنے ملک سے منگا منگا کر روپیہ خرچ کریں تو آخر الذکر ملک کو اس طرح پر بھی معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔ دولت مند لوگ سیر و سیاحت اور تفریح کی خاطر پر فضا مقامات میں جا کر مہینوں اور برسوں رہتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں گھر سے منگاتے ہیں اس ذریعہ سے فرانس۔ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کو باہر والوں خصوصاً انگلستان ۔ روس اور امریکہ کے باشندوں سے بہت کچھ وصول ہوتا رہتا ہے۔ دیگر ممالک کے سیاح تخمیناً ۱۲ کروڑ روپیہ سوئٹزرلینڈ میں ۱۲ کروڑ اٹلی میں اور ۲۴ کروڑ فرانس میں گھر سے لا کر صرف کر جاتے ہیں ۔ صرف امریکہ کے باشندے تقریباً ۲۰ کروڑ روپیہ ہر سال گھر سے لیکر سیر و سیاحت میں اُڑا آتے ہیں ۔ لیکن یہ خیال غلط ہوگا کہ یورپ اور امریکہ کے سیاحوں کا روپیہ ضائع جاتا ہے۔ سیر و سیاحت سے وہ بڑے بڑے کام نکالتے ہیں جن کے سامنے ان مصارف کی کچھ حقیقت نہیں ۔

(ع) **تاوان جنگ** آمدنی کی ایک غیر معمولی مد تاوان جنگ بھی ہے مثلاً ۱۸۷۰ء کی مشہور جنگ میں فرانس نے ۲۰ ارب روپیہ جرمنی کو بطور تاوان ادا کیا اتنی رقم کثیر کا سونا دینا تو آسان نہ تھا اور اگر فرانس دیتا بھی تو خود نرا کھوکھلا رہ جاتا ہے اس نے رقعے جاری کر کے یہ رقم خود جرمنی کے باشندوں سے مقررہ شرح سود پر قرض لی اور جرمنی حکومت کو ادا کر دی گویا خود جرمنی کے باشندوں نے اپنی حکومت کو فرانس کی طرف سے تاوان ادا کر دیا ۔ اور خود فرانس کے قرض خواہ بنکر اس سے سود کی رقم کثیر وصول کرنے لگے ۔ حتیٰ کہ فرانس نے رقعے خرید خرید کر قرض چکا دیا ۔ اس سے پہلے بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ دوسرے ملک سے قرض لینے کا فوری اثر وہی ہوتا ہے

جو کہ برآمد کی قیمت وصول کرنے کا۔ جب فرانس نے مذکورہ بالا طریق سے تاوان ادا کیا تو اُس نے گویا جرمنوں کے ہاتھ اپنے رقعے فروخت کرکے اُن کی قیمت جرمن حکومت کے حوالے کردی البتہ بعد کو قرض کا سودا اور بوقت ادائگی خود قرض مالی بارضرور ثابت ہوگا

(۲) مذکورہ بالا بیان سے وضح ہوا کہ قوموں کے درمیان دادوستد کی متعدد مدیں جاری ہیں اور بین الاقوام لین دین اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب کہ ہر ملک کی مجموعی مقدار دادوستد میں توازن برقرار رہے یعنی جس قدر دوسرے ملکوں کا اس پر مطالبہ ہو اُتنی قدر اس کا دوسرے ملکوں پر بھی ہو۔ البتہ ہر دو مطالبات کی مدوں کا مختلف ہونا ممکن بلکہ اغلب ہے اگر دادوستد کی مقداروں میں توازن نہ رہے تو دو حالتیں ممکن ہیں اول یہ کہ مقدار مطالبہ مقدار واجب الادا سے کم ہو یا بالفاظ دیگر مقدار دوم اول سے زاید ہو ملک کی حالت بعینہ ایسی ہوگی کہ جیسے کسی کا خرچ زیادہ ہو اور آمدنی کم اگر دوالہ آج نہ نکلے تو کل ضرور نکل جائے گا اس صورت میں یا تو مطالبات بڑہانے کی کوشش کرنی چاہیئے یا مقدار واجب الادا گھٹائی جائے۔ یا ہر دو تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں تاکہ دادوستد میں توازن قائم ہو جاوے ورنہ نہ ایک نہ ایک روز دیوالہ نکلنے سے بین الاقوام لین دین خود بہت کم ہو جائے گا۔

مذکورہ بالا تبدیلیاں درآمد برآمد کی مدوں میں خارجی طور سے بآسانی نمودار ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ دوسری حالت یہ کہ مقدار مطالبہ مقدار واجب الادا سے زیادہ ہو۔ گو مفید سہی۔ لیکن چند روز سے زیادہ قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ اس حالت میں فریق ثانی جس پر اُس کا مطالبہ زیادہ ہے اور جس کا مطالبہ اُس پر کم ہے۔ حسب طریق بالا یا تو جلد اپنے لین دین میں اصلاح کرکے دادوستد میں توازن قائم کردے گا۔ یا اس کے دیوالہ نکل جانے سے خود بخود اصلاح

ہوجائے گی۔

حاصل کلام یہ کہ کسی ملک کے دادوستد میں عرصہ تک کوئی تفاوت قائم رہنا ممکن نہیں یہاں ایک اور نکتہ صاف کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ تجارت بین الاقوام کی لڑی میں سب ترقی یافتہ ملک اس طرح سے گندھے ہوئے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا باقی کل سے لین دین جاری ہے اور ہر ایک کے ساتھ دادوستد کی حالت مختلف ہے ایک ملک کا دوسرے پر مقابلہ رقم واجب الادا کے مطالبہ کم ہے اور تیسرے پر زیادہ۔ پس ملک اول ملک سوم پر اپنا زاید مطالبہ ملک دوم کے حق میں منتقل کرکے اپنے دادوستد میں توازن قائم کرلے گا اور اگر کہیں ملک دوم پر ملک سوم کا زاید مطالبہ ہوا تو اس ترکیب سے ان دونوں کے مابین بھی دادوستد میں توازن نمودار ہوجائے گا۔ اس فرضی مثال سے ایک ایسا طریق ذہن نشین ہوتا ہے جس پر ہر طرف عملدرآمد جاری ہے۔ یوں ہی مطالبات اور رقوم واجب الادا کے ملک بملک منتقل ہونے سے دادوستد میں توازن بحال ہوتا رہتا ہے۔ ہم نے بغرض سہولت تین فریق شمار کیے۔ یہی طریق زیادہ فریقوں کے درمیان بھی جاری ہوسکتا ہے اور ہے۔ صرف اس کا عملدرآمد زیادہ پیچیدہ ہوگا۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ کسی ملک کے دادوستد کی صحیح حالت دریافت کرنے کے واسطے اول خرچ اور آمدنی خارجہ کی بہت سی مدیں دوم کل دیگر ممالک سے لین دین کے تعلقات پیش رکھنے ضروری ہیں ورنہ اگر صرف ایک ملک سے لین دین کے تعلقات مدنظر رکھے جاویں تو آمد و خرچ کی کل مدیں شمار کرنے پر بھی دادوستد کے متعلق صحیح اندازہ ہونا محال ہے اور اگر مزید براں سب مدیں نظرانداز کرکے صرف ایک قدیم اور اہم مد یعنی مد آمد و برآمد پر اکتفا کیا جائے تو دادوستد کی حالت یقیناً خلاف واقعہ نظر آئے گی۔ ایسی تنگ نظری میں بہت ممکن ہے کہ جس ملک کا مطالبہ زیادہ معلوم ہو درحقیقت

اس کی رقم واجب الادا زیادہ ہو یا جس کی رقم واجب الادا زیادہ معلوم ہو۔ درحقیقت اس کے مطالبات بڑھے ہوئے ہوں۔

حاصل کلام یہ کہ ملک کی داد و ستد کی حالت سمجھنے کے لیے بہت احتیاط اور وسعت نظر درکار ہے۔ ذیل کی چند مثالوں سے مذکورہ بالا اصول کی بخوبی تصدیق ہو جائے گی اول انگلستان کی درآمد برآمد کو لیجئے۔ اس کے سہ سالہ اعداد حسب ذیل ہیں۔

سنہ	درآمد	برآمد
۱۹۱۰	۸ ارب ۱۶ کروڑ	۶ ارب ۵۴ کروڑ
۱۹۱۱	۸ ارب ۶۵ کروڑ	۶ ارب ۸۱ کروڑ
۱۹۱۲	۹ ارب ۴۸ کروڑ	۷ ارب ۳۰ کروڑ
	۲۶ ارب ۴۷ کروڑ	۲۰ ارب ۵۶ کروڑ

اعداد بالا سے واضح ہوگا کہ صرف تین سال کے اندر انگلستان کی درآمد برآمد سے بقدر ۶ ارب ۸۱ کروڑ روپیہ زیادہ رہی۔ تو کوئی یہ خیال کر سکتا ہے کہ یہ رقم زاید انگلستان نے بشکل زرفلزاتی ادا کی ہوگی۔ حالانکہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ انگلستان میں کل زرفلزاتی بقدر ۲ ارب روپیہ کے ہے۔ اگر زر نہیں تو اس کے بجائے سونا دیا ہوگا۔ لیکن اس دوران میں سونے کی درآمد بھی برآمد سے بڑھی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ علاوہ تجارت کے جو متعدد مدیں لین دین کی اوپر بیان کی گئی ہیں اُن ہی کے ذریعہ سے انگلستان درآمد کی زاید قیمت ادا کرتا ہے یہی حال فرانس کا ہے۔ اس کی درآمد بھی برآمد سے گذشتہ پانچ سال میں اوسطاً ۶۰ کروڑ سالانہ بڑھی رہی اور لطف یہ ہے کہ پھر بھی ہر سال دوسرے ملکوں سے بقدر ۶۰ کروڑ روپیہ وصول ہوتا رہا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علاوہ برآمد کے دیگر مدوں سے فرانس کا مطالبہ دوسرے ملکوں پر تقریباً ۸۰ کروڑ روپیہ سالانہ رہا۔ خود ہندوستان کی تجارت خارجہ

حصہ چہارم
باب ششم

غور کیجئے کہ کچھ عرصہ سے ہندوستان کی برآمد درآمد سے اوسطاً بقدر ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ سالانہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہے۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہوگا کہ ہندوستان کو یہ رقم زاید وصول بھی ہوتی ہے۔ دوسری مدوں کے ذریعہ سے جو انگلستان کے مطالبات ہندوستان پر عاید ہوتے ہیں مثلاً سود و قرض عامہ انگریزی عہدہ داروں کی تنخواہ اور پنشن یہ سب مل ملاکر ۲۸ کروڑ روپیہ سالانہ سے زاید ہو جاتے ہیں انگریز ان مطالبات کو اصطلاحاً **مطالبات وطن** (انگلستان) کہتے ہیں۔ ہندوستان کی برآمد کی زاید قیمت ان ہی مطالبات کی ادائگی میں صرف ہو جاتی ہے بلکہ زاید ۶ کروڑ جو واجب الادا رہتا ہے خود انگلستان سے قرض عامہ لے لیکر ادا کیا گیا ہے اس طریق ادائگی کی ہم اس سے قبل دو مرتبہ تشریح بھی کر چکے ہیں سنہ ۱۹۰۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۲ء تک تخمیناً بقدر ۹ کروڑ روپیہ سالانہ ہندوستان کے قرض عامہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ کچھ تو مطالبات وطن کی ادائگی میں کام آیا اور باقی ہندوستان کو وصول ہوتا رہا۔ ممکن ہے کہ لوگ اُس کو برآمد کی زاید قیمت سمجھتے رہے ہوں۔ حالانکہ یہ قرض تھا جس کا سود برابر دیا جا رہا ہے اور بوقت ادائگی یہ قرض خود بھی بار ثابت ہوگا۔ یہ ہندوستان والوں کی عام شکایت ہے کہ مطالبات وطن ہندوستان پر بیجا بار ہیں۔ اس معرکۃ الآرا مسئلہ کی مفصل بحث ایک جداگانہ کتاب معیشۃ الہند میں زیادہ موزوں ہوگی۔ یہاں صرف اس قدر جتانا کافی ہے کہ یہ شکایت مبالغہ آمیز بھی اور ہے لیکن سراسر بے بنیاد بھی نہیں۔ بار ضرور ہے لیکن نہ اس قدر جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔

اب ایک ایسی مثال لیجئے کہ کئی ملک مطالبات اور رقوم واجب الادا آپس میں منتقل کرکے داد و ستد میں توازن پیدا کرلیں۔ امریکہ۔ چین اور انگلستان کے باہم خاص طور سے یہ طریق مستعمل ہے۔ امریکہ چین سے بہت ریشم اور چا خریدتا ہے۔ لیکن خود اس کے ہاتھ بہت کم

سامان فروخت کرتا ہے۔ گویا چین اور امریکہ کے درمیان چین کا مطالبہ رقم واجب الادا سے بہت بڑھا رہتا ہے۔ اس طرح پر امریکہ اور انگلستان کے درمیان امریکہ کا مطالبہ رقم واجب الادا سے زیادہ ہوتا ہے اور بعینہ یہی حال انگلستان کا چین کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کا مطالبہ رقم واجب الادا پر غالب ہے۔ پس امریکہ اپنا زاید مطالبہ انگلستان سے چین منتقل کر دیتا ہے جو انگلستان کے زاید مطالبہ کی تلافی کر کے تینوں کی دادوستد میں کم وبیش توازن پیدا کر دیتا ہے۔ یہ تو ایک مشہور مثال ہے۔ لیکن یہ طریق اور ملکوں کے درمیان بھی جاری ہے۔

کسی زمانہ میں جب کہ تجارت ہی قوموں کے درمیان لین دین کا ذریعہ تھا اور دوسری مدیں غیر مستعمل تھیں درآمد برآمد دادوستد کے مترادف خیال کی جاتی تھی اور **توازن درآمد وبرآمد** کی وہی اہمیت تھی جو اب **توازن دادوستد** سے منسوب کی جاتی ہے بلکہ توازن دادوستد کی اصطلاح ہی رائج نہ تھی ایک زمانہ تک یہ اصول درست رہا لیکن جب دادوستد کے جدید ذرائع جاری ہوئے تو درآمد وبرآمد اور دادوستد میں فرق نمودار ہو گیا اور مد اول الذکر آخر الذکر کا صرف ایک جزو قرار پائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درآمد وبرآمد کا توازن تو کچھ قابل لحاظ نہیں رہا۔ بلکہ اس مد میں تو فرق عام ہو گیا البتہ دادوستد کا توازن بہت اہم قرار پا گیا واضح ہو کہ توازن درآمد وبرآمد اور توازن دادوستد کو علی الترتیب **توازن تجارت** اور **توازن حسابات** بھی کہتے ہیں۔

(۲۲) اوپر کے بیان سے یہ تو واضح ہو گیا کہ قوموں کے درمیان لین دین کی مدیں کیا کیا ہیں۔ کیونکہ ایک قوم کے مطالبات دوسری قوم پر قائم ہوتے ہیں یا رقوم واجب الادا کسی قوم کے ذمہ کس طرح پر عاید ہوتی ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ ہر قوم کی دادوستد یعنی رقوم واجب الادا اور مطالبات میں کم وبیش توازن قائم رہنا ضروری ہے ورنہ کچھ عرصہ میں لین دین کے تعلقات منقطع ہو جانے یقینی ہیں۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے

کہ قوموں کے درمیان حساب چکانے کا طریق کیا ہی۔ کوئی قوم اپنے مطالبات دوسروں سے کیونکر وصول کرتی ہی! ور قوم واجب الادا دوسروں کو کس طرح ادا کی جاتی ہی۔ گویا بین الاقوام لین دین کی کل کیونکر چلتی ہی۔ یہ بحث چھیڑنے سے قبل ہنڈی کی تشریح ضروری ہی جس کو طریق مذکور کا رکن اعظم قرار دینا بیجا نہوگا۔

فرض کرو کہ کوئی سوداگر ہندوستان سے روئی انگلستان کے کسی تاجر کو روانہ کرے۔ انگلستان کا تاجر روئی کی قیمت پیشگی تو بھیجنے سے رہا بلکہ روئی وصول ہونے کے وقت بھی وہ قیمت ادا کرے تو عجب نہیں اس کی خواہش یہ ہوگی کہ اپنی گرہ سے ادا کرنے کے بجائے وہ خود روئی فروخت کرکے اُس کی قیمت میں سے ہندوستانی سوداگر کی رقم ادا کرے۔ لیکن ہندوستانی سوداگر یہ کیونکر گوارا کریگا۔ کہ مال بھیجنے کے بعد وہ قیمت سے مہینوں محروم رہی آخر اس کو بھی تو کاروبار چلانے کے واسطے روپیہ کی ضرورت ہی۔ مگر اتنا سب تاجر کوبی سمجھتے ہیں کہ قیمت کی پیشگی ادائگی تو درکنار اگر مال وصول ہوتے ہی قیمت طلب کی جاوے تو بھی تجارت میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور زوال تجارت سے سب تاجروں کو نقصان پہنچنا صاف ظاہر ہی خصوصاً تجارت بین الاقوام کی ترقی کے واسطے خریدار کو اتنی مہلت ملنی ضروری ہی کہ مال فروخت کرکے قیمت ادا کرسکے۔ لیکن پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہی کہ اگر فروشندہ قیمت ملنے کا مہینوں انتظار کرکے تو اپنا کاروبار چلانے کے واسطے روپیہ کس گھر سے لائے۔ بظاہر تو یہ مسئلہ لاینحل سا معلوم ہوتا ہی لیکن ایک نہایت سادہ طریق سے فروشندہ اور خریدار دونوں کے مقصد پورے ہوجاتے ہیں۔

جب ہندوستانی سوداگر روئی جہاز پر لادیگا تو مالکان جہاز کی طرف سے اُس کو ایک باضابطہ رسید ملے گی کہ اس قدر مال انگلستان کے فلاں تاجر کے نام وصول پایا۔ یہ رسید اصطلاحاً حوالہ نامہ کہلاتی ہی۔ مبادا راستہ میں جہاز کو کوئی حادثہ پیش آئے

حصہ چہارم
باب ہفتم

اور روئی ضائع ہو جائے۔ سوداگر کسی معتبر بیمہ کمپنی کے ہاتھوں اس کی ضمانت بھی کرا دیگا بطور اقرار نامہ ورسید فیس ضمانت سوداگر کو کمپنی مذکور کی طرف سے باضابطہ **پروانہ ضمانت** دیدیا جائے گا۔ سوداگر مذکور انگلستان کے تاجر کے نام ایک **ہنڈی** لکھے گا کہ میں نے جو فلاں چیز تمہارے ہاتھ فروخت کی ہے اس کی اس قدر قیمت تم کو فلاں تاریخ کو مجھے ادا کرنی ہو گی۔ اس ہنڈی کے ساتھ حوالہ نامہ اور پروانہ ضمانت منسلک کرکے بذریعہ ڈاک انگلستان کے تاجر کے پاس بھیجدے گا۔ جو حوالہ نامہ اور پروانہ ضمانت سے اپنا اطمینان کرکے ہنڈی پر لفظ **قبول** اور اپنے دستخط لکھکر اس کو ہندوستانی سوداگر کے پاس واپس کر دیگا۔ جب ہنڈی قبول ہو کر انگلستان سے واپس آجائے گی تو ہندوستانی سوداگر اس کو آسانی دوسروں کے ہاتھ فروخت کرکے اپنی قیمت جلد وصول کرلے گا۔ دوسرے لوگ اس ہنڈی کو کیوں خریدیں گے اس کی وجہ ابھی آگے چلکر واضح ہو گی۔ ہنڈی فروخت کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کی پشت پر خریدار کا نام لکھکر فروشندہ اپنے دستخط ثبت کر دیگا نئے خریدار کو انگلستان کے تاجر سے رقم مندرجہ وصول کرنے کا ایسا ہی حق ہو گا جیسا کہ ہنڈی لکھنے والے کو ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہنڈی لکھنے والے کے بعد بہت سے ہاتھوں میں گذر کر آخری لینے والے کے پاس تک پہنچتی ہے۔ ہنڈی گویا کہ ایک رقم وصول کرنے کا حق ہے۔ جو کہ اسی طرح پر خرید و فروخت ہوتا رہتا ہے جیسے کہ اور ملک یا جایداد حتی کہ اس کی ادائگی کا وقت آپہونچے اور وہ ختم ہو جائے۔ اگر وہ شخص جس کے نام ہنڈی لکھی گئی ہو وقت معینہ پر رقم مندرجہ ادا کرنے سے انکار کرے تو قانوناً ہنڈی مذکور کا ہر ایک خریدار اپنے ماسبق فروشندہ سے رقم وصول کرنے کا مستحق ہے۔ حتی کہ خود ہنڈی لکھنے والے سے رقم وصول ہو جائے۔ لیکن اگر ہنڈی ادائگی کے واسطے وقت معینہ کے بعد پیش کی جاوے اور جس کے نام ہنڈی ہو وہ اس کے ادا کرنے سے انکار

حصہ چہارم
مات معتم

کرے تو کل ماسبق فریق بری الذمہ شمار ہوں گے۔ ورنہ تاخیر کنندہ کو نقصان اُٹھانا پڑے گا۔
ہنڈی کے متعلق چند اصطلاحات بتانی بے محل ہوں گی۔ جو شخص ہنڈی جاری کرے وہ **لکھنے والا** جو اس کو خریدے وہ **رکھنے والا** اور جس کے نام ہنڈی لکھی گئی وہ **لینے والا** کہلاتا ہے۔ ہنڈی کی خرید و فروخت میں جو فریقین کے نام پشت پر لکھے جاتے ہیں اس طریق کو اصطلاحاً **توقیع** کہتے ہیں۔ ہنڈی لینے والا جو بطور اقرار پہلے پہل لفظ **قبول** اور اپنے دستخط لکھتا ہے اس کو اصطلاحاً **قبولیت** یا **قبولنا** کہتے ہیں بوقت پیشی ہنڈی کی رقم ادا کرنا **ہنڈی پٹانا** اور ادائگی سے انکار کرنا **ہنڈی لوٹانا** کہلاتا ہے۔

بالعموم ہنڈی تاریخ تحریر یا تاریخ قبولیت کے کچھ عرصہ مثلاً ۳۔ یا ۶ ماہ بعد وقت معینہ پر واجب الادا ہوتی ہیں۔ اُن کو **میعادی ہنڈی** کہتے ہیں۔ اور بلحاظ شمار ابتداء میعاد اُن کی دو قسمیں ہیں **بعد تحریر** اور **بعد قبولیت** مثلاً ہنڈی ۳ ماہ بعد تحریر یا ۶ ماہ بعد قبولیت گویا ان ہنڈیوں کے نام میں سے بنظر اختصار لفظ واجب الادا قبل لفظ بعد حذف کر دیا جاتا ہے بعض بعض ہنڈیاں بلا تعین وقت پیش ہوتے ہی ادا کرنی پڑتی ہیں اُن کو **درشنی ہنڈی** یا **عندالطلب ہنڈی** کہتے ہیں اور یہ بہت کچھ **چک** کے مشابہ ہوتی ہیں لیکن از روے رسم و رواج کاروبار ہر قسم کی ہنڈی پٹانے کے واسطے وقت معینہ کے بعد تین روز کی مہلت ضرور ملتی ہے جو اصطلاحاً **رعایتی دن** کہلاتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ جب عمر زید کے ہاتھ کچھ مال فروخت کرتا ہے تو اس کے نام ایک ہنڈی لکھتا ہے کہ بابت خرید فلاں مال کے میری اس قدر رقم تمہارے ذمہ فلاں تاریخ کو واجب الادا ہے۔ زید اس پر لفظ قبول اور اپنے دستخط لکھکر ادائگی کا اقرار کر لیتا ہے عمر اس ہنڈی کو بکر کے ہاتھ فروخت کر کے اپنا روپیہ تو جلد وصول کر لیتا ہے مگر زید روپیہ وہی معینہ وقت پر ادا کرتا ہے دونوں کو بھی اس ہنڈی کے خریدنے سے خاص فائدہ اور سہولت ہوتی ہے جس کی ابھی

تشریح کی جاتی ہے۔

فرض کرو کہ ہندوستان کے سوداگر انگلستان والوں کو ایک کروڑ کا غلہ فروخت کریں اور انگلستان کے تاجر ہندوستان والوں ایک کروڑ روپیہ کا قیمتی سامان بھیجیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان اور انگلستان میں فروشندہ اور خریدار تاجر وہی ایک نہیں ہو سکتے یقیناً ہر ملک میں دو دو جداگانہ گروہ ہوں گے یعنی فروشندہ جدا اور خریدار جدا۔ تو کیا ہندوستان کے غلہ فروش انگلستان کے خریداروں سے اور انگلستان کے سامان فروش ہندوستان کے خریداروں سے اپنا اپنا ایک ایک کروڑ مطالبہ بشکل زر جہاز میں لدوا کر منگائیں گے۔ گویا ایک کروڑ روپیہ ہندوستان سے ولایت جائے اور ایک کروڑ ولایت سے ہندوستان آئے اس میں تو بہت طوالت۔ وقت اور صرف ہو گا اس کے برعکس یہ طریق کس قدر سہل اور کم خرچ ہے کہ ہندوستان کے فروشندوں نے جو ہنڈیاں انگلستان کے خریداروں کے نام لکھی ہیں۔ ہندوستان کے خریدار اپنے ہموطن فروشندوں کو اُن کی قیمت ادا کر کے خرید لیں اور وہی ہنڈیاں بذریعہ ڈاک انگلستان کے فروشندوں کے نام بھیج دیں تاکہ وہ اپنے ہموطن خریداروں سے اپنی رقم وصول کر لیں گویا ہندوستان اور انگلستان کے خریدار ایک دوسرے کی طرف سے علی الترتیب ہندوستان اور انگلستان کے فروشندوں کے مطالبات ادا کر دیں اس طرح پر چاروں فریق کا حساب بھی صاف ہو جائے گا اور دونوں ملکوں میں سے کسی کو بھی ایک پیسہ بھیجنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔
اس کی سادہ مثال یوں سمجھو کہ عمر زید کا اور بکر خالد کا بقدر مساوی قرض دار ہو اور عمر بکر کی جانب سے خالد کو قرض ادا کر دے اور بکر عمر کی طرف سے زید کو روپیہ دیدے۔

ایک دوسری مثال لو۔ فرض کرو امریکہ چین سے دس لاکھ روپیہ کی چاء خریدے اور خود اس کے ہاتھ کچھ فروخت نہ کرے۔ اب تو غالباً اس کو ۱۰ لاکھ قیمت جہاز میں لاد کر بھیجنی ہوگی مگر نہیں۔ غالباً انگلستان نے

حصہ چہارم مات معیشت

چین کو مصنوعات بھیجی ہوں گی اور امریکہ انگلستان سے چین کے نام ہنڈیاں خرید کر بھیجدے گا۔ تاکہ جن لوگوں نے امریکہ کے ہاتھ چار فروخت کی تھی وہ اُس کی قیمت اُن لوگوں سے وصول کریں جنہوں نے انگلستان کے مصنوعات منگائے ہیں۔ اب ہا یہ سوال کہ امریکہ انگلستان کو ہنڈیوں کی قیمت کیونکر ادا کرے گا۔ کیا اس کو بجائے چین کے اب انگلستان کو دس لاکھ روپیہ روانہ کرنا نہ پڑے گا۔ اس کا جواب صاف ہی۔ امریکہ اور انگلستان کے درمیان بکثرت درآمد و برآمد جاری ہی اور ان ہنڈیوں کی قیمت امریکہ باسانی بذریعہ سامان ادا کر سکے گا جو انگلستان جاتا رہتا ہی۔ اس طرح پر ایک پیسہ استعمال کیے بغیر لاکھوں روپیہ کا حساب تینوں ملک میں بے باق ہو جائے گا۔

بغرض سہولت ہم نے نہایت سادہ مثالیں پیش کی ہیں۔ مگر تعلقات داد و ستد کتنے ہی گوناگوں اور عمل ادائگی کیسا ہی پیچ در پیچ کیوں نہو۔ بین الاقوام حسابات اسی طریق سے صاف ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں بیان کیا گیا۔

اگر ہنڈی کا رواج نہوتا تو ہر ملک سے درآمد کی قیمت جاتی اور برآمد کی آتی رہتی اور جبکہ تجارت کی مقدار کروڑ ہا نہیں بلکہ اربوں روپیہ ہو تو قیمت کی ایسی آمد و رفت میں جو دقتیں اور نقصانات اُٹھانے پڑتے ہیں محتاج بیان نہیں۔ ہنڈی کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ تجارت بین الاقوام بظاہر تو خرید و فروخت میں منقسم معلوم ہوتی ہی مگر درحقیقت بحیثیت مجموعی وہ مبادلہ پر مبنی ہی اور زر محض بطور معیار قیمت استعمال ہوتا ہی نہ کہ بطور آلہ مبادلہ کھنے کو تو درآمد برآمد کی قیمت بہت کچھ ہی۔ لیکن غور کیجیے تو مال کا مال سے براہ راست مبادلہ جاری ہی۔ بطور آلہ مبادلہ زر استعمال کرنے کی نوبت شاذ و نادر آتی ہی یعنی عملاً قیمت بہت کم ادا کرنی پڑتی ہی۔

ہنڈی کے نرخ کے اصول

(۴) ہنڈی کے نرخ کے اصول نہایت پیچیدہ اور تفصیل طلب ہیں اسی وجہ سے ہنڈی

حصہ چہارم باب ہفتم کا کاروبار ارحد دشوار فن خیال کیا جاتا ہی ہنڈی کے اصول و فن پر جداگانہ ضخیم کتابیں موجود ہیں اور پھر بھی اُن کو جامعیت حاصل نہیں۔ اس کتاب میں شرح ہنڈی کے متعلق نہایت ابتدائی اور سلیس اصول مختصراً درج کرنا کافی ہوگا مفصل بیان کے واسطے ایک جداگانہ کتاب ناگزیر ہی۔ اس سے قبل بتایا جا چکا ہی کہ زر کی قدر قانونی صرف ملک کے اندر اندر مانی جاتی ہی۔ ملک سے باہر زر قدر فلزاتی کے حساب سے چلتا ہی۔ چنانچہ مختلف ممالک میں جو طلائی سکے بطور زر قانونی رائج ہیں اُن کے سونے کا حساب کرکے شرح مبادلہ قرار دیجاتی ہی۔ مثلاً ایک ملک کے سکے میں ایک تولہ دوسرے کے میں ۲ ماشہ تیسرے اور چوتھے کے میں ۳ اور ۴ ماشہ سونا ہو تو ان چاروں ملکوں کے سکوں میں شرح مبادلہ ایک۔ دو تین اور چار ہوگی۔ طلائی زر استعمال کرنے والے ملکوں کے باہم تو زر قانونی کی شرح مبادلہ مستقل طور پر مقرر ہوسکتی ہی اور ہی لیکن جن ملکوں میں نقرئی سکے بطور زر قانونی رائج ہیں۔ مثلاً ہندوستان و چین اُن کے اور اول الذکر ملکوں کے درمیان زر قانونی کی مستقل شرح مبادلہ قائم کرنی دشوار ہی۔ ایک طرف تو سونا مستعمل ہی اور دوسری طرف چاندی۔ اور ان دونوں دہاتوں کی قیمت گھٹتی بڑہتی ہی۔ مدت سے چاندی روز بروز ارزاں ہو رہی ہی اور بمعیار چاندی سونے کی قدر میں معقول اضافہ ہو رہا ہی۔ مثلاً اگر کبھی ۲۴ تولہ چاندی ایک تولہ سونے کی ہمقدر تھی تو اب ۳۰ تولہ ہمقدر نظر آتی ہی پس اگر ایک ملک میں طلائی سکہ رائج ہوا اور دوسرے میں نقرئی تو ایسے دو ملکوں کے درمیان زر قانونی کی شرح مبادلہ ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہی چنانچہ وسط انیسویں صدی تک شرح مبادلہ دس روپیہ اور ایک پونڈ تھی۔ لیکن چاندی ارزاں ہونے کی بدولت اُنیسویں صدی کے آخر میں شرح اُنیس روپیہ اور ایک پونڈ ہوگئی بڑے عجیب و غریب اہتمام سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اوائل بیسویں صدی سے آج تک ۱۵ روپیہ اور ایک پونڈ کی شرح مبادلہ قائم رکھی گئی اس اہتمام کی تفصیل

ایک جداگانہ کتاب معیشت الہند میں زیادہ موزوں ہوگی۔ لیکن چین کے ساتھ زر قانونی کی شرح مبادلہ ابتک غیر معین ہی اور سونے چاندی کی قدر میں بحوالہ یک دگر جو تغیر ہوتا ہے شرح بھی اُسی کی مطابقت کرتی ہی۔ البتہ چین وہندوستان کے درمیان شرح مبادلہ اسی طرح پر مقرر ہو سکتا ہی جیسا کہ ممالک یورپ میں۔ وجہ صاف ظاہر ہی۔ دونوں جگہ نقرئی سکہ بطور زر قانونی رائج ہیں اور اُن کی قدر فلزاتی کی نسبت سے باہمی قدر اسی طرح قرار پاتی ہی جیسے کہ آخر الذکر ملکوں میں طلائی سکوں کی۔

یہ تو معلوم ہوگیا کہ مختلف ملک کے زر قانونی میں جبکہ وہ طلائی ہوں یا اُن میں سے ایک نقرئی ہو۔ شرح مبادلہ کیونکر قرار پاتی ہی۔ یہاں پر مفصل بحث کی توگنجایش نہیں۔ ہم صرف ایک سادہ خاکہ ان اصول کا پیش کرتے ہیں جن کی رو سے شرح مبادلہ یعنی ہنڈی کی قیمت میں کمی بیشی نمودار ہوسکتی ہی۔ ہنڈی کی قیمت میں بھی جو اضافہ وتخفیف ہوتی رہتی ہی اس کے عام باعث تین ہیں اوّل ہنڈی کی طلب ورسد کی حالت دوم ہنڈی کا وقت ادائگی سوم ملک ثانی کے زر قانونی کا نقرئی ہونا۔ چوتھا باعث یعنی خطرہ جنگ نہایت قوی الاثر مگر بہت غیر معمولی شمار کیا جاتا ہی۔

تغیر قیمت ہنڈی کے پہلے باعث۔ طلب ورسد ہنڈی کو لیجئے اگر ہندوستان کے صرافہ میں انگلستان کے نام دس لاکھ روپیہ کی ہنڈی برائے فروخت موجود ہیں اور خریدار بھی صرف دس لاکھ روپیہ کی ہنڈیوں کے خواہاں ہیں تو ہنڈیوں کی قیمت زر قانونی کی مقررہ شرح مبادلہ کے مطابق قرار پائے گی۔ ۱۵ روپیہ اور ایک پونڈ کی شرح سے ۱۰۰ پونڈ کی ہنڈی ۱۵۰۰ سو روپیہ کو فروخت ہوگی۔ ہنڈی کی قیمت بشرح مبادلہ زر قانونی قرار پاتا اصطلاحاً مساوات مبادلہ کہلاتا ہی اور یہی قیمت کو قیمت مساوات کہہ سکتے ہیں لیکن مساوات طلب ورسد کے علاوہ دو اور حالتیں بھی ممکن ہیں یعنی یا تو ہنڈیوں کی رسد

حصہ چہارم باب ہشتم

طلب سے کم ہو یا زیادہ مثلاً لوگ دس لاکھ روپیہ کی ہنڈیوں کے خریدار ہوں لیکن صرف نو لاکھ کی ہنڈیاں دستیاب ہوں ایسی صورت میں ہنڈیوں کے خریداروں میں مقابلہ آپڑے گا اور ہر کوئی ہنڈیوں کی خرید میں عجلت کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہنڈی سے محروم رہیں گے اُن کو زر واجب الادا بشکل طلا روانہ کرنا پڑے گا اور کرایہ جہاز و فیس ضمانت وغیرہ سے زیرباری ہوگی۔ فرض کرو کہ بقدر سو پونڈ طلا انگلستان بھیجنے کے مصارف پچاس روپیہ ہیں۔ جبکہ طلا بھیجنے کی دقت و مصارف سے بچنے کے لیے ہر خریدار ہنڈی خریدنے کی کوشش کریگا تو ۱۰۰ پونڈ کی ہنڈی کی قیمت ۱۵ سو روپیہ سے بڑھ کر پندرہ سو پچاس کے قریب قریب آجائے گی۔ لیکن اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی ورنہ پھر لوگ سونا بھیجنا شروع کردیں گے اور ہنڈی کو کوئی بھی نہ خریگا ہنڈی تو اسی وقت تک خریدنا مفید ہے جب کہ اس کی قیمت ۱۵ سو پچاس سے کم ہو۔ اگر قیمت ۱۵ سو پچاس تک بڑھ جاوے تو سونا خرید کر بھیجنا۔ یا ہنڈی۔ دونوں برابر ہیں اور بفرض محال قیمت اگر اس سے زیادہ بڑھے تو پھر لوگ سونا خرید کر بھیجدیں گے۔ ہنڈی کو کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے گا۔ ہنڈی کی خرید و فروخت کا خاص مطلب آمد و رفت زر کے مصارف بچانا ہوتا ہے اور جب بٹہ یا بڑھوتری مقامات زر سے تجاوز کرے تو زر کی آمد و رفت خودبخود جاری ہوجائے گی پس ثابت ہوا کہ بحالت قلت رسد ہنڈی کی قیمت میں بمقدار سونا بھیجنے کے مصارف کی برابر اضافہ ممکن ہے۔ اس کے برعکس اگر دس لاکھ کی ہنڈیاں موجود ہوں لیکن لوگ صرف نو لاکھ کی خریدنا چاہیں تو ہنڈی بیچنے والوں میں مقابلہ نمودار ہوگا جن کی ہنڈی نہ بکے گی اُن کو بہت دقت اور مصارف برداشت کرکے سونا منگانا پڑے گا اور چونکہ ۱۰۰ پونڈ کے بمقدار سونا منگانے کے مصارف بھی ۵۰ روپیہ ہوں گے وہ دقت سے بچنے کی لحاظ ۱۰۰ پونڈ کی ہنڈی بجائے ۱۵ سو کے پچاس روپیہ کم پر ۱۴ ۵ تک فروخت کرنا

قیمت سمجھیں گے لیکن اس سے بھی کم قیمت پر ہنڈی بیچنے کے مقابل سونا منگانا زیادہ مفید ہوگا اس لیے قیمت میں مزید تخفیف کی گنجائش نہیں گویا بحالت کثرت رسد بھی ہنڈی کی قیمت میں بمقدر سونا منگانے کے مصارف کی برابر تخفیف ممکن ہے۔

ہنڈی کی قیمت میں رسد کی کمی بیشی یا طلب کے غلبہ او رضعف سے جو اضافہ اور تخفیف نمودار ہو اس کو اصطلاحاً **بڑھوتری** اور **بٹہ** سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کی مذکورہ بالا حدود یعنی مصارف آمد ورفت طلا اصطلاحاً **مقامات زر** کہلاتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بڑھوتری اور بٹہ حدود بالا کے اندر اندر رہتا ہے۔ ان تک پہنچے کے بعد سونے کی درآمد برآمد شروع ہو جاتی ہے المختصر رسد وطلب کی تغیرات سے ہنڈی کی قیمت میں مقامات زر تک بڑھوتری یا بٹہ قائم رہ سکتا ہے صاف ظاہر ہے کہ بڑھوتری اور بٹہ یہ دونوں تبدیلیاں مساوات مبادلہ زایل ہونے سے قیمت مساوات میں نمودار ہوتی ہیں۔ حالت اوّل کو اصطلاحاً **مبادلہ فوق مساوات** اور دوم کو **مبادلہ تحت مساوات** بھی کہتے ہیں۔

جبکہ کثرت رسد کی وجہ سے ہندوستان کی ہنڈی انگلستان کے نام بٹہ سے فروخت ہو تو یہ علامت انگلستان سے ہندوستان سونا آنے کی سمجھی جاتی ہے اور ایسی حالت ہندوستان کے حق میں اصطلاحاً **مبادلہ موافق** سے تعبیر کی جاتی ہے اس کے برعکس اگر قلت رسد کی وجہ سے ہندوستان کی ہنڈی انگلستان کے نام بڑھوتری سے بکے تو یہ علامت ہندوستان سے انگلستان سونا جانے کی ہے اس حالت کو اصطلاحاً ہندوستان کے حق میں **مبادلہ ناموافق** کہتے ہیں۔ مبادلہ موافق اس امر کی دلیل ہے کہ اس ملک کے مطالبات رقوم واجب الادا سے زیادہ ہیں اور مبادلہ ناموافق سے رقوم واجب الادا کی زیادتی ثابت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بحالت اوّل سونے کی درآمد ہوتی ہے اور بحالت ثانی برآمد۔ غور کرنے سے

واضح ہوگا کہ جن دو ملکوں کے درمیان مبادلہ جاری ہو اگر ان میں سے کسی ایک کے حق میں مبادلہ موافق ہوگا تو لازماً دوسرے کے حق میں ناموافق ہوگا - یا ایک کے حق میں ناموافق ہو تو دوسرے کے حق میں موافق ضرور ہوگا - فریقین کے مبادلہ کی حالت ترازو کے دو پلڑوں کی سی سمجھنی چاہیے ایک پلڑے کے جھکنے سے دوسرا اُٹھتا اور اُٹھنے سے جھکتا ہے - ہر دو تبدیلیاں لازم ملزوم ہیں

ہنڈی کی قیمت پر طلب و رسد کا اثر تو دریافت کر چکے اب دیکھنا یہ ہے کہ وقت ادائگی کے قریب و بعید ہونے سے قیمت میں کیا فرق نمودار ہوتا ہے -

بلحاظ وقت ادائگی ہنڈی کی دو قسمیں بیان ہو چکی ہیں - ان میں سے درشنی یا عندالطلب ہنڈی تو ایک قسم کا چیک سمجھنی چاہیے - اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ چیک صرف بنک کے نام لکھا جاتا ہے اور ایسی ہنڈی تاجر کے نام - دوسرے چیک فوراً ادا کر دیا جاتا ہے اور ہنڈی کے لینے والے کو اس کے پٹانے میں کاروباری رواج کے بموجب تین رعایتی دن کی مہلت ملتی ہے - لیکن ہنڈی کا اصلی منشا یہ ہے کہ لینے والے کو ادائگی روپیہ میں چند ماہ کی مہلت ملے اور لکھنے والا اس کو جب چاہے فروخت کر کے روپیہ وصول کر لے پس اکثر ہنڈیاں میعادی ہوتی ہیں اور اسی کو ٹھیٹ ہنڈی سمجھنا چاہیے -

طلب و رسد کی مذکورالصدر بحث میں ہنڈیاں عندالطلب فرض کی گئیں - اب دیکھنا یہ ہے کہ ہنڈی کے میعادی ہونے سے اس کی قیمت پر کیا اثر پڑتا ہے - یہاں پر یہ نکتہ جتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہنڈی اسی وقت تک میعادی شمار ہوگی جب تک کہ اُس کی ادائگی کا وقت کچھ دور ہو - مثلاً دو تین ماہ - جب میعادی ہنڈی پٹانے کا وقت قریب آ پہنچے تو اس کی حیثیت بھی درشنی یا عندالطلب ہنڈی کی سی ہو جائے گی -

فرض کرو کہ ہندوستان میں انگلستان کے نام سو پونڈ کی ہنڈی میعادی تین ماہ برائے فروخت موجود ہے گویا لکھنے والا یا رکھنے والا آج سے تین ماہ بعد لینے والے سے

پٹاسکے گا ہنڈی اس صورت میں اگر ہنڈی فروخت کی جائے تو خریدار اس شرح سود سے جو اس وقت انگلستان میں مروج ہے۔ اس کی قیمت پر بٹہ کاٹ لے گا۔ مثلاً وہاں شرح سود ۴ فیصدی ہو تو سو پونڈ پر تین ماہ کا سود ایک پونڈ ہوا۔ پس وہ سو پونڈ کی ہنڈی میعادی تین ماہ کی قیمت جبکہ انگلستان میں شرح سود ۴ فیصدی ہے اس وقت ۹۹ پونڈ قرار دے گا ۔ اور لہٰذا اس کی قیمت بجائے پندرہ سو روپیہ دینے کے ۱۵ روپیہ بمقدار ایک پونڈ منہا کر کے صرف ۱۴ سو ۸۵ روپیہ دے گا۔ فروشندہ اس قیمت کو اس وجہ سے قبول کر لے گا کہ اس کو روپیہ نقد مل رہا ہے۔ ورنہ تین ماہ اور انتظار کرنا پڑتا۔ اور بحالت انتظار اگر ایک پونڈ موجودہ قیمت سے زاید بھی ملتا تو وہ وہی سود ہوتا جو خریدار اس وقت منہا کرتا ہے۔ خریدار کا بھی عذر یہی ہے کہ وہ تو قیمت اس وقت ادا کر رہا ہے اور اس کو ہنڈی کہیں تین ماہ بعد پٹے گی۔ پس اس دوران میں رکھنے والے کو کچھ سود ضرور ملنا چاہیئے ۔ اور اس کی شرح وہ ہوگی جو لینے والے کے ملک میں رائج ہو۔ کیونکہ فرض کرو کہ خریدار ایسی ہنڈی اپنے قرض خواہ کو بھیجے اور ہنڈی خریدنے کا مقصد بھی بالعموم یہی ہوتا ہے۔ تو قرض خواہ کو کہیں تین ماہ بعد ہنڈی پٹے گی۔ حالانکہ قرض اسی وقت ادا ہونا چاہیئے پس قرض خواہ اس دوران تاخیر میں بشرح مروجہ قرض پر سود لگائے گا اگر ہنڈی عند الطلب ہوتی تو قرض فوراً ادا ہو جاتا۔ تو گویا ہنڈی کے میعادی ہونے سے اُس کے خریدار کو کچھ زاید رقم بطور سود ادا کرنا پڑے۔ پس یہ رقم ہنڈی کی قیمت سے منہا ہونی چاہیئے ۔ اور چونکہ قرض خواہ جو ہنڈی لینے والے کے ملک میں مقیم ہے اپنے ہاں کی شرح سے سود لگائے گا خریدار بھی وہیں کی شرح سود سے بٹہ کاٹے گا۔

حاصل کلام یہ کہ اگر مبادلہ میں مساوات ہو یعنی طلب و رسد کے برابر ہونے سے بٹہ کٹے نہ بڑھوتری ملے۔ تو ۱۰۰ پونڈ کی عند الطلب ہنڈی ۱۵ سو روپیہ کو اور تین ماہ میعادی ہنڈی جبکہ لینے والے کے ملک میں شرح سود ۴ فیصدی ہو۔ بعد منہائی پندرہ روپیہ

بمقدار ایک پونڈ ۱۴ سو ۸۵ روپیہ کو فروخت ہو گی۔ پس واضح ہوا کہ میعادی ہنڈی کی قیمت سے اس ملک کی شرح سود سے جہاں وہ واجب الادا ہو کیونکر اور کس لیے بٹہ کاٹا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ میعادی ہنڈی کی قیمت میں ایک اور تخفیف ہونی بھی یقینی ہے۔ میعادی ہنڈی تو کچھ مدت میں پٹتی ہے۔ اگر اس دوران میں لکھنے والے یا لینے والے کا دیوالہ نکل جائے تو رکھنے والے پھر رقم کس سے وصول کرے گا۔ وہ تو کہیں کا بھی نہ رہے گا۔ گویا میعادی ہنڈی میں روپیہ ضائع ہونے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے۔ پس کچھ فیصدی بطور مطالبات خطر قیمت میں سے ضرور منہا کیا جائے گا۔ مثلاً اوپر کی مثال میں سو پونڈ کی میعادی ہنڈی بٹہ کٹنے پر ۱۴ سو ۸۵ روپیہ کی ہوئی ۱۵ روپیہ بطور مطالبات خطر منہا ہونے پر اس کی قیمت صرف ۱۴ سو ۷۰ روپیہ رہ جائے تو عجب نہیں۔ اگر ہنڈی لکھنے والے یا لینے والے یا دونوں کا اعتبار بڑھا ہوا ہے تو مطالبات خطر کی شرح بہت ادنیٰ ہو گی اور اگر اعتبار گھٹا ہوا ہے تو بہت اعلیٰ۔ یہی وجہ ہے کہ مستند تاجروں کی ہنڈیاں بمقابلہ دوسروں کے زیادہ قیمت کو فروخت ہوتی ہیں اور اگر ایسی ہنڈی کی رسد و طلب میں بھی کمی بیشی ہو تو حسب حالات بڑھوتری یا مزید بٹہ سے شرح مبادلہ میں مزید تبدیلی نمودار ہو گی۔ طلب و رسد اور میعادی ہنڈی سے شرح مبادلہ میں جو جو فرق نمودار ہوتے ہیں اُن کو ہنڈی کے کاروبار کے ماہر بآسانی جدا جدا دریافت کر لیتے ہیں لیکن یہاں پر اس کی تشریح کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ قیمت ہنڈی یا شرح مبادلہ میں جو تغیرات نمودار ہوتے رہتے ہیں اُن کے دو باعث تو بیان ہو چکے۔ یعنی ہنڈی کی طلب و رسد اور اس کی میعاد ادائگی۔ اب تیسرا باعث ایسے دو ملکوں سے متعلق ہے جن میں سے ایک کا زر قانونی طلائی ہو اور دوسرے کا نقرئی۔ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ اگر دونوں ملکوں میں زر قانونی طلائی ہو تو سکوں کی مقدار طلا کے حساب سے ان کی شرح مبادلہ مستقل طور پر مقرر ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ چاندی سونے کی قدر بمعیار یکدگر گھٹتی بڑھتی ہے۔ اس لیے

نقرئی اور طلائی سکوں کی شرح مبادلہ مستقل نہیں رہ سکتی بلکہ قدر فلزاتی کے بموجب اس میں تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخری نصف دوران میں روپیہ اور پونڈ کی شرح مبادلہ بہت تغیر پذیر رہی ۱۲-۱۳ روپیہ پونڈ سے لیکر ۱۸-۱۹ روپیہ پونڈ تک مبادلہ ہوتا رہا ہے بالآخر بیسویں صدی کے شروع میں ایک ایسا عجیب وغریب بندوبست کیا گیا کہ جس کی بدولت آج تک شرح مبادلہ ۱۵ روپیہ پونڈ قائم ہے اور امید ہے کہ مدت تک قائم رہے گی۔ مگر چین اور یورپ یا امریکہ کے درمیان اب تک زر قانونی کے علی الترتیب نقرئی اور طلائی ہونے سے شرح مبادلہ بہت غیر معین رہتی ہے اور اس عدم تعین سے کاروبار میں گوناگوں ہرج واقع ہوتا ہے جس کی تشریح کی یہاں پر گنجائش نہیں۔

اب تغیر قیمت کا چوتھا باعث لیجئے اگر کہیں جنگ چھڑنے کی کان میں بھنک بھی پڑجائے تو فرقہ تجار میں عجیب سراسیمگی پھیل جاتی ہے ہر ایک ہنڈی لکھنے والا یا رکھنے والا اس کو جلد سے جلد فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کچھ قیمت بھی ہاتھ لگ جائے غنیمت سمجھتا ہے اس کے برعکس قرضدار مطمئن ہوجاتے ہیں۔ اُن کو ادائگی قرض سے بچنے کے لیے اچھا موقع نظر آنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے وقت میں لوگ بکثرت ہنڈی فروخت کرنا چاہتے ہیں اور خریدار عنقا ہوجاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہنڈی کی قیمت بہت گھٹ جاتی ہے۔ اگر دس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ فیصدی بٹہ لگ جائے تو عجب نہیں۔

بعض لوگ اس امید پر کہ جنگ ٹل جائے گی ہمت کرکے سستی سستی ہنڈیاں خرید ڈالتے ہیں اور اگر خوش قسمتی سے جنگ رفت گذشت ہوجائے تو پھر اُن کے کھرے ہیں ہنڈی کی پوری پوری قیمت وصول کرکے خوب نفع اُٹھاتے ہیں۔ لیکن اگر جنگ چھڑ جائے اور اُن کا روپیہ سب خاک میں ملجائے تو عجب نہیں۔ ایسے وقت ہنڈیاں خریدنے میں بیحد منافع ملنا ممکن ہے لیکن کل رقم ضائع ہوجانے کا اندیشہ بھی کافی قوی ہے۔ اور منافع

حصہ چہارم
باب ہشتم

کی بڑی مقدار گویا محض مطالبات خطر شمار ہوتی ہے اور کچھ نہیں ۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ہنڈی کیا چیز ہے ۔ مختلف اقوام کے زر قانونی کی شرح مبادلہ کیونکر قرار پاتی ہے ۔ ہنڈی کی قیمت یا شرح مبادلہ میں جو بلا توقف تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اس کے چار باعث ہو سکتے ہیں جو کبھی تنہا اور کبھی مل جلکر اپنا اپنا اثر دکھاتے ہیں ۔

دلال ہنڈی

(۵) ہنڈیوں کی خرید و فروخت بذات خود نہایت تخصیص طلب تجارت ہے ۔ بڑے بڑے ذہین لوگ عمریں صرف کر کے کہیں اس کاروبار میں مہارت اور تجربہ حاصل کرتے ہیں اُن کو اصطلاحاً **ہنڈی دلال** کہتے ہیں ۔ ہم نے ہنڈی کی بہترین قسم تمثیلاً پیش کی ہے ۔ اس کے علاوہ ہنڈی کی قسمیں اور بھی ہیں جن میں سے بعض بری دہوکے کی ٹٹی ہوتی ہیں دلالوں کے علاوہ بہت کم لوگ بھلی بری ہنڈی میں تمیز کر سکتے ہیں ۔ مزید براں ہنڈی کا نرخ دریافت کرنا بہت دشوار ہے یہ کام بھی دلالوں کے ہی بس کا ہے ۔ یہ لوگ بالعموم اپنی دیانتداری کے واسطے مشہور ہوتے ہیں ۔ اور یہی شہرت اُن کے کاروبار کی ترقی کا باعث ہوتی ہے ۔ وہ اپنے گاہکوں کو دہوکا بہت کم دیتے ہیں ۔ ترقی یافتہ ممالک میں ہنڈی کی تجارت کے بڑے بڑے بازار ہیں جن کو اصطلاحاً **صرافہ** کہتے ہیں ۔ یہاں پر کروڑہا روپیہ کی خرید و فروخت ہر روز ہوتی ہے ۔ دلال ایک ہاتھ سے ہنڈی خریدتے اور دوسرے سے فروخت کرتے ہیں ۔ ہنڈی کے کاروبار میں یہ لوگ بشکل بٹہ و بڑھوتری بہت کچھ کما لیتے ہیں جس کو اصطلاحاً **پھروتہ** بھی کہتے ہیں ۔

خارجہ کی ادائگی کے طریق

(۶) قوموں کے درمیان حساب چکانے میں ہنڈی بہت کام آتی ہے ۔ اسی وجہ سے ہمنے اول اس کی تشریح ضروری سمجھی ۔ اب ہم بین الاقوام دادوستد کی تکمیل کے مروجہ طریقوں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں ۔ تاکہ بصراحت معلوم ہو جائے کہ قوموں کے درمیان مطالبات کیونکر وصول ہوتے ہیں اور رقوم واجب الادا کیونکر ادا کی جاتی ہیں ۔

(۸) جیسا کہ اوپر کے بیان سے بخوبی ظاہر ہے قوموں کے باہم وصولیابی مطالبات و ادائگی قرض کے واسطے ہنڈی بہت مستعمل ہے ترقی یافتہ ممالک میں شاید ہی کوئی چیز اس قدر جلد بک سکتی ہو جتنی کہ ہنڈی کروڑہا روپیہ کی ہنڈیاں تجارتی مرکزوں کے صرافوں میں ہر ہفتہ معمولاً خرید و فروخت ہوتی رہتی ہیں۔

صرافوں میں علاوہ ہنڈی کے اور بھی طرح طرح کے حصے اور رقعے بکتے ہیں۔ لندن کا صرافہ دنیا میں سب سے بڑا مانا جاتا ہے وہاں ایک تاریخ میں جو ہنڈیاں حصہ اور رقعے برائے فروخت موجود تھے اُن کی قیمت متعارف ایک کھرب ۷۵۸ ارب اور ۲ کرور روپیہ سے بھی زیادہ تھی اور بہت سے صرافے دنیا بھر میں قائم ہیں۔ خدا جانے ان کے کاروبار کی مجموعی مقدار کیا ہوگی

(ب) اگر دو ملکوں میں سے ایک کے نام ہنڈیاں نہ مل سکیں تو دوسرے ملک کے قرض دار کسی تیسرے ملک کے نام کی ہنڈیاں خرید کر دوسرے ملک کو دیدیں گے تاکہ وہ تیسرے ملک سے ہنڈیاں بٹا کر اپنا مطالبہ جو دوسرے ملک پر عائد ہے وصول کرلے۔ انگلستان امریکہ اور چین کی تجارت بین الاقوام میں وصولیابی و ادائگی کا یہی طریق بیشتر مروج ہے۔ اس مثال کی تشریح اس سے قبل بھی دو جگہ کی جاچکی ہے۔ اصطلاحاً یہ طریق **ادائگی مثلث** بھی کہلاتا ہے۔

(ج) اگر ہنڈی دستیاب نہ ہو یا خرید نا منظور نہ ہو تو دوسرے ملک کو رقم بھیجنے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ کسی بنک کو جو ایسا کاروبار کرتا ہو رقم مذکور مع کمیشن ادا کردی جائے اور وہ دوسرے بنک یا اپنی ہی شاخ کے نام جو دوسرے ملک میں قائم ہو چٹھی لکھدے کہ فلاں شخص کی طرف سے فلاں شخص یا حامل چٹھی ہذا کو اس قدر روپیہ ادا کردیا جائے اس کاروبار کی حالت بہت کچھ منی آرڈر سے ملتی جلتی ہے۔ **ٹامس کُک اینڈ سنز کنگ کنگ اینڈ کو۔ گرنڈلے اینڈ کو** ان کمپیوں نے دنیا کے اکثر ممالک میں

حصہ چہارم
باب ہفتم

یا تو اپنی شاخیں قائم رکھی ہیں یا وہاں کے بنکوں سے حساب رکھتے ہیں جو لوگ خرید و فروخت ہنڈی کے بکھیڑے میں پڑنا پسند نہیں کرتے انہیں کی معرفت ہندوستان سے دوسرے ملکوں کو روپیہ بھیجتے رہتے ہیں خصوصاً جو ہندوستانی طلبا انگلستان میں مقیم ہیں اُن کو خرچ اسی طرح بھیجا جاتا ہے۔

بنک کی چیٹھی تو ڈاک میں جاتی ہے۔ اگر روپیہ بہت جلد بھیجنا مقصود ہو تو بنک کی چٹھی خریدنے کے بجائے **انتقال تار برقی** خریدنا چاہئیے یعنی کچھ زیادہ کمیشن ادا کرنے پر ادائگی زر کی ہدایت ڈاک کی بجائے بذریعہ تار بھیجدی جائے گی۔

جب کہ کسی ملک کی برآمد زرعی پیداوار ہو اور درآمد مصنوعات ہوں تو باوجود ہنڈیاں مستعمل ہونے کے مذکورہ بالا طریق کے مطابق سکوں کی اعانت ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مصنوعات تو بارہوں مہینہ آتی رہتی ہیں۔ لوگوں کو اُن کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ہنڈی کے جویاں رہتے ہیں۔ لیکن زرعی پیداوار کی برآمد بیشتر سال میں دو مرتبہ فصل کے موقعہ پر ہوتی ہے اور اسی وقت ہنڈیاں لکھی جاتی ہیں۔ گویا ہنڈیوں کی طلب تو سال بھر رہتی ہے اور رسد دو موقعوں پر نمودار ہوتی ہے۔ پس ایسے وقت جب کہ لوگ ہنڈی کے متلاشی ہوں اور وہ دستیاب نہ ہوسکیں تو کوئی بنک جو ایسا کاروبار کرے دوسرے ملک کے کسی بنک کے نام جس سے وہ حساب کتاب رکھتا ہے چٹھی لکھدے گا جس کو اصطلاحاً سادہ ہنڈی یا اعتباری ہنڈی بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہنڈی کسی مال کی خرید و فروخت پر مبنی نہیں۔ لوگ بنک سے سادہ ہنڈی خرید خرید کر اپنے قرض خواہوں کے پاس بھیجتے رہیں گے۔ جو کہ اُن کو اس بنک سے پٹالیں گے جن کے نام وہ لکھی گئی ہیں۔ بنک آخرالذکر ان ہنڈیوں کی رقم اول الذکر نام بطور قرض لکھتا رہے گا۔ جب فصل کے موقعہ پر ہنڈیوں کی کثرت ہوگی تو بنک اول

اُن کو خرید کر بنک دوم کے پاس بھیجدے گا۔ جو کہ اُن کی مندرجہ رقم ہنڈی کے لیے والوں سے وصول کرلے گا۔ بنک اوّل سادہ ہنڈی پر ٹہ ہونڈی لگائے گا اور خریدتے وقت ہنڈیوں پر بٹہ کاٹے گا۔ جو کچھہ اس طرح پر منافع حاصل ہوگا اس میں دونوں بنک شریک رہیں گے۔

(د) اگر ہنڈی۔ بنک کی چٹھی یا سادہ ہنڈی کچھہ بھی نہ ملے اور رقم کی مقدار بہت زیادہ ہو تو مجبوراً سونا یا زر قانونی بشرح مبادلہ معین بھیجا جاسکتا ہی البتہ مصارف کچھہ زیادہ پڑیں گے اور تیاری و روانگی پارسل کا دردسر بھی اُٹھانا پڑیگا۔

(س) اگر رقم واجب الادا بہت زیادہ ہو اور ہنڈی وغیرہ نہ مل سکے تو اس صورت میں سونا بھیجنے کے بجائے بہتر یہہ ہوگا کہ قرض خواہ ملک ہی سے قرض عامہ وصول کیا جائے اس طرح پر قرض کے سود سے تو زیربار ہونا پڑیگا لیکن ادائگی قرض سے کچھہ عرصہ کے واسطے مہلت ضرور مل جائے گی۔ چنانچہ جرمنی کو تاوان جنگ ادا کرنے میں فرانس نے یہی طریق اختیار کیا تھا۔ اور سونا بھیجنے کے مقابلہ میں مفید بھی یہی ہی۔

سچ پوچھئے تو مبادلات خارجہ کی بحث بہت پیچیدہ اور طوالت طلب ہی اس پر عبور کرنا آسان نہیں۔ انگریزی میں اس مبحث پر ابتک معدودے چند کتابیں لکھی جاسکی ہیں اور جو کچھہ بھی ہیں ان میں جابجا سقم نظر آتے ہیں۔ مبادلہ خارجہ کی گتھی سلجھانے کے لیے اصولی معلومات کافی نہیں اس کے واسطے عملی تجربہ کے ناخن درکار ہیں۔ اور کیوں نہوں خود یہہ بحث اصولی کے بجائے عملی معیشت سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہی۔ کل تفصیل و نکات ایک جداگانہ کتاب میں بیان ہوسکتے ہیں ہم نے یہاں سادہ خاکہ پیش کردیا اور بس۔

بنک Bank

تجزیہ (۱) بنک کا ماضی و حاضر (۲) چیک کی تشریح (۳) بنک کا جیٹھہ (۴)

نوٹ۔ چیک ہنڈی یا سرکاری رقعے اور کارخانوں کے حصے۔

بنک کا ماضی و حاضر

(۱) بنکوں نے کہیں دو صدی کے اندر معاشی ترقیات کے زیر اثر نشوونما پاکر موجودہ شکل اختیار کی ہے کسی زمانہ میں لوگ اپنا اندوختہ زمین میں دبا دیا کرتے تھے یا زیادہ سے زیادہ کوئی ملک جائداد خرید لیتے تھے تاجر بطور خود کاروبار میں روپیہ لگاتے تھے محض روپیہ دیکر تجارت میں شریک ہونے کا رواج تقریباً معدوم تھا۔ گویا عوام کا اندوختہ بیشتر محض دولت تھا جس کو آڑے وقت کے خیال سے محفوظ رکھا جاتا تھا آج کل کی طرح بطور اصل اس سے کام لینے کا موقع اگر حاصل بھی تھا لیکن بہت کم یہی حال قرض کا تھا اکثر نادار یا فضول خرچ لوگ کھانے اڑانے کے لیے قرض لیا کرتے تھے قرض لیکر کاروبار جاری کرنے کا رواج بھی کم تھا دولت مند ساہوکار بطور خود قرض دیا کرتے تھے۔ اگرچہ اُن کا روپیہ مارا بھی جاتا تھا۔ مگر جس پر قابو چلتا اس سے سود بھی اس قدر بے شمار لیتے کہ سب نقصانات کی تلافی ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرض ذلت و افلاس کا پیام شمار ہوتا تھا۔ جبکہ لوگوں کا اندوختہ کثیر بیکار زمین میں دفن پڑا رہے اور شرح سود اس قدر اعلیٰ ہو کہ جب تک کسی کی جان پر نہ بن گئے یا کوئی دیدہ ودانستہ اپنی تباہی نہ چاہے قرض لینے کا نام نہ لے تو پھر ایسی حالت میں بھلا کیا معاشی ترقی کی امید ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر عوام کے اندوختے جن کی مجموعی مقدار کروروں بلکہ اربوں روپیہ سے کم نہیں۔ بطور اصل کاروبار میں کام آئیں اور شرح

سود اس قدر معتدل ہو کہ قرض کے روپیہ سے کاروبار چلانے میں بھی منافع مل سکے۔ تو پھر دیکھئے کہ چند ہی روز میں ملک کی حالت کیا سے کیا ہو جاتی ہے ہر طرف کاروبار کی چہل پہل، ترقی کی امنگ اور مرفہ الحالی کا سماں نظر آنے لگے گا۔

کسی زمانہ میں لوگ اپنا اندوختہ بشکل طلا امانتاً سناروں کے پاس رکھدیا کرتے تھے اور نگہداشت کے معاوضہ کے طور پر اس کو کچھہ ماہانہ یا سالانہ فیس بھی دیا کرتے تھے۔ لیکن جب سناروں نے دیکھا کہ مدتوں لوگوں کا اندوختہ پڑا رہتا ہے اور اس کے مطالبہ کی نوبت نہیں آتی تو اُن کو خیال ہوا کہ اگر ایسے اندوختوں کے ایک حصہ کو محفوظ رکھکر باقی سے کچھہ کام لیا جائے یعنی کم از کم معتبر لوگوں کو قرض دیدیا جائے تو جمع کنندوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے وہ سب ایک ساتھ تو اپنا اندوختہ مانگنے سے رہے۔ گاہے گاہے جب کوئی کچھہ واپس مانگے گا تو حصہ محفوظ میں سے اس کو ادا کرنا مشکل نہو گا۔ پس جب کہ بحالت موجودہ جمع کنندوں کو اُن کا اندوختہ بوقت مطالبہ ایک کمتر مقدار محفوظ میں سے ادا کرنا ممکن ہے تو پھر ان کو اس سے کیا سروکار کہ کل اندوختے ہر وقت موجود رہتے ہیں یا اُن کی مجموعی مقدار کا صرف ایک جزو محفوظ ہے اور باقی قرض پر دیا ہوا ہے۔ بلکہ جب قرض پر سود ملے گا تو جمع کنندوں سے فیس نگہداشت لینے کی بھی ضرورت نہ رہے گی اور بلا معاوضہ اُن کے اندوختوں کی نگرانی ہو سکے گی بلکہ اگر وہ صبر سے کام لیں تو سود قرض میں سے ایک حصہ اُلٹا اُن کو دینا بھی ممکن ہے گویا اگر اندوختوں کا ایک حصّہ قرض پر دیا جانے لگے تو جمع کنندہ باقی ماندہ حصہ محفوظ میں سے اپنا اندوختہ جب چاہیں واپس لے سکتے ہیں اور فریقین کا اس میں فائدہ بھی ہے۔ قرض کا سود کچھہ سونار لیں اور کچھہ جمع کنندوں کو دیں۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ اُن کو اندوختہ روز روز درکار نہیں تو پھر اس کو بخیال واپسی مدتوں بیکار پڑا رکھنا اُنہیں غیر ضروری بلکہ باعث نقصان نظر آیا۔ تجربہ سے ثابت ہوا کہ اگر ایک مناسب مقدار محفوظ رکھی جائے

توجمع کنندوں کے مطالبات بلا دقت پورے ہو سکتے ہیں۔ پس سب کو یہ تجویز پسند آئی اور زر
کے کاروبار کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ بنکوں کا رواج نکلا ایک طرف لوگ ان میں خوشی خوشی
آمدنی جمع کرنے لگے دوسری طرف مناسب شرح سود پر معتبر لوگوں کو قرض ملنا شروع ہوا۔ روپیہ
کی کثرت سے کاروبار میں جان پڑی منافع میں تین فریق حصہ دار بن گئے۔ یعنی اول وہ جنہوں نے
قرض لیکر کاروبار چلایا۔ دوم بنک جس نے روپیہ فراہم کرکے قرض دیا۔ سوم جمع کنندے جنہوں نے
اپنے اندوختے بنک میں جمع کیے۔ یہ تین فریق ملے تب کہیں عوام کے اندوختے کام آئے۔ اس
تثلیث کا ہر فریق ناگزیر ہے۔ اسی وجہ سے تقسیم منافع کا کسی کو افسوس یا حسد نہیں ہوتا بلکہ موجودہ
تقسیم عمل سب کو اپنے اپنے حق میں مفید نظر آتا ہے۔ یہی بنکوں کے لین دین کی ابتدا ہے جس میں
اب اس قدر باریکیاں اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ بنکوں کا حساب کتاب سمجھنا بھی ایک
جداگانہ معاشی فن مانا جاتا ہے اور بہت کم لوگوں کو اس میں مہارت اور تبحر حاصل ہوتا ہے۔ یہ جو
اخباروں میں ہر روز بڑے بڑے صرافوں کی طرف سے زر کے مختصر نرخ نامے شائع ہوتے
ہیں دیکھنے میں تو ان میں صرف بنکوں کے سود مبادلات خارجہ اور سرکاری رقعوں کی شرح
درج ہوتی ہے لیکن ان کا سمجھنا کیا کوئی آسان کام ہے اچھے اچھے چکرا جاتے ہیں اور لطف یہ کہ اس
چھوٹے سے نرخ نامہ میں دنیا بھر کی مالی حالت جھلکتی ہے جس کے سمجھنے نہ سمجھنے پر کروڑہا روپیہ
کے وارے نیارے ہو جائیں تو عجب نہیں۔ عوام کو تو یہ نرخ نامہ محض ایک معمہ یا بیکار اندراج
نظر آتا ہے۔ لیکن جو لوگ زر کا کاروبار کرتے ہیں وہ ہر صبح کو اس نرخ نامہ کا ایسی ہی بے چینی سے
انتظار کرتے ہیں جیسے کہ رؤسا فہرست خطابات کا یا امیدواران کونسل اعلان نتیجہ انتخابات کا
زر کا کاروبار چلانے میں یہ نرخنامے اسی قدر مفید اور ناگزیر ہیں جیسے کہ جہازرانی میں
قطب نما اور مقیاس الہوا جن سے جہاز کے رخ اور موسم کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ بنک کا
کام چلانے کے واسطے اس قدر مہارت اور قابلیت مخصوص درکار ہے کہ کارگزار

حصہ چہارم
باب ہفتم

ڈائرکٹر کی تلاش و جستجو بلکہ خوش قسمتی سے ملتا ہے۔ انگلستان بنک کا ڈائرکٹر اپنے عہدہ کی اہمیت اور ذمہ داری کے لحاظ سے برطانیہ عظمیٰ کے وزیر اعظم کے ہم پلّہ مانا جاتا ہے۔ اس بنک کا کاروبار سمجھانے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے لیکن اتنا جان لینا ضروری ہے کہ تمام دنیا کے کاروبار زر کی کل میں اس بنک کی حیثیت اس بائلر کی سی ہے جو انجن کے ذریعہ سے تمام کل کو چلائے یوں تو دنیا میں بنک اور بھی بڑے بڑے ہیں مگر کاروبار زر میں اس کا سا اقتدار اور اثر کسی کو بھی نصیب نہیں امریکہ والوں کو خاص طور سے رشک ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ کاروبار زر کا مرکز لندن کے بجائے نیویارک ہو جائے لیکن جو قدرتی اور اکتسابی فوقیتیں انگلستان کو حاصل ہیں وہ امریکہ میں مہیا کرنی بہت دشوار نظر آتی ہیں اور مدتوں لندن کو کسی رقیب سے اندیشہ نہیں۔

بنک کا طریق کاروبار سمجھنا جس قدر دشوار ہے اتنا ہی آسان بھی ہے۔ اگر تفصیل سنیئے تو حیران رہ جائیے۔ اور اگر اجمال پر نظر کیجئے تو بات نہایت صاف ہے۔ جس طرح کہ لوگ اور اشیاء چیزوں کی تجارت کرتے ہیں۔ بنک زر کی بھی تجارت کرتے ہیں۔ تاجر تو چیزیں خرید خرید کر بیچتے ہیں اور بنک زر مانگ مانگ لے کر قرض دیتے ہیں۔ تاجروں کا فائدہ اس میں ہے کہ چیزیں ارزاں خریدیں اور گراں فروخت کریں۔ بنکوں کا منافع یہ ہے کہ زر کم شرح سود پر مانگ لیں اور زیادہ شرح سود پر قرض دیں بہت سی چیزوں کی مدتوں سے خرید جاری ہے۔ لیکن معاشی ترقیات کی بدولت آج کل زر کی گرم بازاری سب سے بڑھی ہوئی ہے اگر کل چیزوں کی تجارت جسم ہے تو زر کو اس کا خون بلکہ روح سمجھنا چاہیئے اور جب کاروبار میں تاجر ناگزیر ہیں تو پھر بنک بغیر کیونکر کام چل سکتا ہے بنک کا کاروبار میں آج وہ رتبہ ہے کہ اس کی حالت ملک کی معاشی حالت کا آئینہ سمجھی جاتی ہے

(۲) زر کاغذی کے تحت میں مختصراً نوٹ سے بحث کی جا چکی ہے جس سے واضح ہو گا کہ اجرا نوٹ کے اصول کیا ہیں اور نوٹ کے ذریعہ سے دولت میں کیونکر اضافہ ممکن ہے۔ نوٹ کا کاروبار یا تو خود سرکار اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے جیسا کہ ہندوستان کا حال ہے یا بطور خاص کسی بنک کے

حصہ چہارم باب ہشتم۔

سپرد کر دیتی ہے اور اس پر قوانین وضوابط کی پابندی عائد کرکے اپنی نگرانی قائم رکھتی ہے۔ مثلاً انگلستان بنک کو نوٹ جاری کرنے کی خاص اجازت حاصل ہے۔

لیکن عام بنکوں میں چک کا کاروبار ہوتا ہے جو کہ کسی طرح نوٹ سے کم نہیں چک سے بھی انتقال رقوم میں بیحد سہولت ہوتی ہے اور اس سے بھی دولت میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے اور ہو رہا ہے۔

بنک کے حساب کتاب کی تفصیل سے تو ہم آگے چلکر بحث کریں گے یہاں صرف چک کی نوعیت اور اس کا کام سمجھانے کے لیے ہم ایک سادہ مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ کچھ لوگ اپنا روپیہ لاکر بنک میں جمع کریں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ لوگ اپنا کل روپیہ ایک ساتھ اور یکلخت واپس نہیں لیں گے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہے کہ زر جمع شدہ کی دو مدیں ہوتی ہیں امانت اور رواں امانت واپس لینے کے واسطے حسب قرارداد ایک ہفتہ یا ایک ماہ یا تین یا چھ ماہ قبل واپس لینے کی بنک کو اطلاع دینی پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بنک زر امانت با طمینان کاروبار میں لگائے رکھتا ہے اور اطلاع ملنے پر ضروری مقدار کاروبار سے نکالکر واپسی کے واسطے مہیا کر لیتا ہے اور وقت آنے پر ادا کر دیتا ہے۔ زر امانت واپس لینے کے واسطے چونکہ کچھ عرصہ قبل اطلاع دینی شرط ہے۔ اس سے بطور شغل اصل کاروبار میں خوب کام لیا جاتا ہے۔ جو کچھ بطور سود بنک کو حاصل ہو اس کا ایک حصہ زر امانت جمع کرنے والے کو بھی دیا جاتا ہے اور اطلاع میعاد جس قدر وسیع ہو زر امانت زیادہ مستقل کاروبار میں لگ سکتا ہے سود بھی زیادہ ہاتھ آئے گا اور جمع کنندہ کو بھی مقابلتہً بشرح اعلے دیا جائے گا۔ مثلاً زر امانت یک ہفتہ پر جمع کنندوں کو اگر بشرح نصف فیصدی سود دیا جائے تو زر امانت یک ماہہ یا سہ ماہہ یا ششماہہ پر ایک ڈیڑھ اور ۲ فیصدی تک دیا جائے گا۔ روپیہ جمع کرنے کی دوسری مد رواں کہلاتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زر جمع شدہ واپس لینے کے واسطے پہلے سے کوئی اطلاع

دینی ضروری ہیں جس وقت جتنا چاہیں روپیہ لے سکتے ہیں چونکہ زر رواں کی مقدار کثیر ادائگی کے واسطے ہر وقت تیار رکھنی پڑتی ہی اور اس کو کاروبار میں لگانا خلاف احتیاط ہی۔ جمع کنندوں کو بھی اس پر کوئی سود نہیں دیا جاتا ۔ مد امانت میں تو جمع کنندوں کو سود کا بھی لالچ ہوتا ہی لیکن مد رواں میں بھی لوگ بکثرت روپیہ اس وجہ سے جمع کرتے ہیں کہ اول تو اس کی نگہداشت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ دوم بنک مفت خزانچی کا کام دیتا ہی اور روپیہ کے لین دین میں بڑی سہولت ہوتی ہی۔

روپیہ واپس لینے کا قاعدہ یہ ہی کہ جمع کنندوں کو بنک سے مطبوعہ فارموں کی کتابیں ملتی ہیں جن کی باقاعدہ خانہ پوری کر کے حسب ضرورت رقم واپس لی جا سکتی ہی یہی فارم چک کہلاتے ہیں گویا چک جمع کنندہ کی طرف سے بنک کے نام ایک حکم ہوتا ہی کہ ہمارے حساب میں سے فلاں رقم ہم کو یا فلاں شخص کو یا حامل ہذا کو ادا کردو ۔ بنک چک لکھنے والے کی تحریر اور دستخط سے اس کی صحت کا اطمینان کر کے اور چک کی پشت پر روپیہ لینے والے کے دستخط کرا کر رقم مندرجہ ادا کرتا اور چک بطور رسید رکھ لیتا ہی ۔ اب جمع کنندہ کی سہولت کا اندازہ کیجیے اس کو صرف ایک چکوں کی کتاب رکھنی پڑتی ہی اور جب جتنا روپیہ لینا یا کسی کو دینا منظور ہوا فوراً بنک کے نام چک لکھدیا اور کام بن گیا۔

اب سوال یہ ہوتا ہی کہ بنک زر امانت تو اس لالچ سے لیتے ہیں کہ اس سے کاروبار چلا کر سود پاتے ہیں جس کا ایک حصہ جمع کنندہ کو دیکر باقی خود اڑاتے ہیں مگر زر رواں تو سوا بیکار پڑے رہنے یا واپس ہونے کے اور کسی کام آتا ہی نہیں ورنہ اس پر بنک کو کچھ سود ملے پھر وہ اس کا درد سر اپنے ذمہ کیوں لیتا ہی ۔ ذیل کی تفصیل سے واضح ہوگا کہ زر رواں بھی کل کا کل نقد نہیں رکھنا پڑتا بلکہ اس کا کوئی حصہ مطالبات واپسی پوری کرنے کے واسطے کافی ثابت ہوتا ہی اور باقی کو بطور اصل کاروبار میں لگا کر سود پانا ممکن ہی اور چونکہ زر رواں

حصہ چہارم
باب ہشتم

یہ جمع کنندہ کو سود نہیں ملتا۔ کل بنک کی گرہ میں رہتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ کل زر امانت زیادہ مستقل کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور اس پر سود بھی بشرح اعلیٰ ملتا ہے لیکن اس کا ایک حصہ جمع کنندہ کو مل جاتا ہے اور زر رواں کا صرف ایک حصہ کام میں آسکتا ہے اور اس کی شرح سود بھی ادنیٰ ہوتی ہے لیکن جمع کنندہ کو کوئی حصہ نہیں ملتا۔

حاصل کلام یہ کہ بنک کو زر امانت کی طرح زر رواں سے بھی کچھ نہ کچھ سود ملتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جمع کنندہ سے کوئی معاوضہ لیے بغیر وہ زر رواں کی نگہداشت کرتا ہے اور بطور خزانچی وصول و ادائگی کی خدمت سرانجام دیتا ہے۔

زر امانت کا بطور اصل کاروبار میں لگانا تو سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ اس کی واپسی کے واسطے کچھ مہلت دی جاتی ہے لیکن زر رواں جس کا جمع کنندہ کی طرف سے ہر وقت مطالبہ ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے کس طرح کاروبار میں پھنسایا جا سکتا ہے اس کو تو ہمیشہ نقد تیار رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ زر رواں کا صرف ایک حصہ بشکل نقد ہر وقت موجود رہتا ہے اور باقی کاروبار میں لگا دیا جاتا ہے البتہ لگاتے ایسے کاروبار میں ہیں کہ زر کی علیحدگی جلد سے جلد ممکن ہو۔ چنانچہ اس واقعہ کو ہم بنک کے چٹھے کے تحت میں مزید تشریح کریں گے۔ یہاں پر صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ زر حساب رواں کا صرف ایک حصہ کیونکر مطالبات واپسی پورے کر سکتا اور کرتا ہے۔

کسی ملک میں بنک کا رواج ہونے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنا اپنا اندوختہ بنک میں رکھیں۔ جن لوگوں کو بطور خود کاروبار چلانا منظور نہ ہو وہ تو اپنا روپیہ بطور امانت جمع کرتے ہیں تاکہ سود بھی ملتا رہے مگر جو لوگ کاروبار میں مصروف ہیں وہ بھی اپنا نقد بنک ہی میں رواں رکھتے ہیں۔ بنک بلا معاوضہ اُن کا خزانچی بنجاتا ہے اور بذریعہ چیک ادائے گی وصول یابی رقوم میں بیحد سہولت ہوتی ہے۔ اول ایک سادہ مثال لو۔ فرض کرو کہ کسی شہر میں صرف

ایک بنک ہی اور وہاں کے تاجر بمد رواں اپنی اپنی طرف سے کافی رقمیں جمع کر دیں اب اُن میں سے کوئی اپنے پاس سے کسی کو نقد رقم ادا نہیں کریگا - بلکہ جب کوئی کسی کو کچھہ دینا چاہی گا اس کے لیے چک لکھدے گا جس کے پیش کرنے پر رقم مندرجہ بنک ادا کر دیگا - لیکن بنک سے زر نقد لینے کی نوبت کم آئے گی - ان تاجروں میں سے جن کی بنک میں مد رواں قائم ہی جب کوئی کسی کے لیے چک لکھے گا تو رقم مندرجہ ایک کے حساب سے دوسرے کے حساب میں منتقل کر دی جائے گی - لیکن چک لکھنے والے کی طرف سے ادائگی اور چک پانے والے کی طرف سے وصولیابی بنک کے حساب و کتاب میں درج کر دی جائے گی اور یہہ سب تحریری کارروائی ہو گی - بنک کے زر نقد پر کوئی اثر نہ پڑے گا - صرف رقم مندرجہ چک اس کے لکھنے والے کے حساب سے خارج ہو کر اس کے پانے والے کے حساب میں درج ہو جائیگی اس طرح پر یہہ کل تاجر آپس میں لاکھوں روپیہ کی تجارت کرتے رہیں مگر بہت کم زر نقد استعمال کرنے کی نوبت آئے گی صرف چکوں کی رقمیں بنک کے رجسٹروں میں ادھر سے ادھر گھومتی رہیں گی -

اب اگر بنک بجائے ایک کے دو ہوں الف اور ب اور کچھہ تاجر اپنا حساب ایک بنک میں رکھیں اور کچھہ دوسرے میں مگر سب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کاروبار کریں تو ایک ہی بنک والوں کی چکیں تو حسب تفصیل بالا ادا اور وصول ہوتی رہیں گی لیکن اگر ایک بنک کا گاہک دوسرے بنک والے کے لیے چک لکھے تب بھی وہی طریق برتا جائے گا الف بنک کے گاہک دوسرے بنک والوں کے لیے اپنے بنک الف کے نام چک لکھیں گے جن کو پانے والے یعنی ب بنک کے گاہک براہ راست الف بنک کو بھیجنے کے بجائے اپنے ب بنک کے پاس بھیجدیں گے - اسی طرح پر ب بنک کے گاہک اپنے بنک ب کے نام الف بنک والوں کے لیے چک لکھیں گے جن کو پانے والے الف بنک کے گاہک ب بنک کے پاس بھیجنے کے بجائے اپنے بنک الف کو بھیجدیں گے - گویا الف بنک کے پاس ب بنک کے نام اور

حصہ چہارم
باب ہشتم

ب بنک کے پاس الف بنک کے نام بہت سی چکیں جمع ہو جائیں گی تب ان چکوں کی مجموعی رقموں کا موازنہ ہو کر جس بنک کی جتنی رقم زاید نکلے گی وہ دوسرے بنک سے لے سکتا ہے لیکن چونکہ بنکوں کا باہمی حساب کتاب برابر جاری رہتا ہے۔ کبھی ایک کی رقم زاید نکلتی ہے کبھی دوسرے کی۔ بغرض صفائی حساب تو م واجب الوصول اور واجب الادا کا مقابلہ تو وقتاً فوقتاً اوقات معینہ پر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ادائگی زر نقد کی نوبت سکوں کے باہم بھی کم آتی ہے۔ ایسی رقمیں بھی آپس کے حساب کتاب میں درج ہو ہو کر خود بخود زائل ہوتی رہتی ہیں البتہ اگر کبھی کسی بنک کا مطالبہ معمول سے زیادہ بڑھ جائے اور دوسرے بنک کو اس میں کچھ ادا کرنا پڑے تو عجب نہیں لیکن ایسا بہت کم واقع ہوتا ہے۔ ہاں چک لکھنے والوں اور پانے والوں کا حساب ہر ایک کی طرف سے جتنے چک ادا ہوتے ہیں اور اس کو جتنے وصول ہوتے ہیں سب اس کے حساب میں درج ہوتے رہتے ہیں اور ادائگی وصولیابی کا موازنہ کرنے پر فوراً بتایا جاسکتا ہے کہ فلاں گاہک کا اتنا روپیہ مدرواں میں باقی ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں بیسیوں بنک جاری ہیں دو بنکوں کا آپس میں چک کا کاروبار چلانا تو خیر آسان تھا مگر جب بنکوں کی تعداد زیادہ ہو تو ایسے کاروبار میں بڑی گڑبڑ کا اندیشہ ہوسکتا ہے چودہ بنکوں کے درمیان $\frac{13 \times 14}{2}$ یعنی ۹۱ لین دین کے تعلقات قائم ہو سکتے ہیں اور پچاس بنکوں کے باہم ۱۲۲۵ تعلقات ممکن ہیں اتنے تعلقات کا جدا جدا حساب کس قدر دشوار اور طوالت طلب ہوگا۔ لیکن اگر افراد کی طرح متعدد بنک بھی اپنا ایک مرکزی بنک قائم کرلیں تو اُن کے لین دین میں بھی بذریعہ چک وہی سہولت ہوسکتی ہے۔ جو کہ ایک ہی بنک کے حساب داروں کو آپس کے لین دین میں حاصل ہے۔ چکوں کا حساب کرنے پر جو بنک جس دوسرے بنک کو جس قدر ادا کرنا چاہیے اس کے لیے مرکزی بنک کے نام چک لکھ دے اور جس طرح عوام کی طرف سے معمولی بنک چک کا حساب و کتاب اپنے رجسٹروں میں درج کرتے ہیں مرکزی بنک

معمولی بنکوں کی طرف سے اپنے ہاں درست کریگا۔ عمل وہی ایک ہوگا فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ وہاں چیک لکھنے والے اور پانے والے عوام ہیں۔ اور یہاں بنک۔ بلحاظ طریق کاروبار معمولی بنک اور مرکزی بنک میں کوئی فرق نہیں۔

سنہ چہارم ماہ ستمبر

جیسا کہ لندن کی مشہور سڑک لمبارڈ اسٹریٹ میں ایک مکان ہے جہاں ہر روز ۲۶ بڑے بڑے بنکوں کے گماشتے جمع ہوکر بنکوں کا باہمی حساب کتاب طے کرتے ہیں ایسے مقامات اصطلاحاً حساب گھر کہلاتے ہیں ہر ترقی یافتہ ملک کے کاروباری مرکزوں میں ایسے حساب گھر قائم ہیں اور بنکوں کا کاروبار ان بغیر چلنا محال ہے۔ خود انگلستان میں لندن کے علاوہ منچسٹر میں دوسرا حساب گھر موجود ہے۔

مذکورہ بالا چھبیس بنکوں میں سے ہر بنک کے گماشتے باقی پچیس بنکوں کے نام جتنے چیک ہوتے ہیں پہلے ہی پلندے بنا کر لاتے ہیں۔ چیکوں کے نمبر تاریخ رقوم وغیرہ کی یادداشت علٰحدہ تیار کرکے اپنے ساتھ رکھتے ہیں ہر بنک کو باقی پچیس بنکوں سے اپنے نام کی چیک کے پچیس[25] پلندے ملجاتے ہیں اپنے دیئے ہوئے پلندوں کی رقموں کا لیئے ہوئے پلندوں کی رقموں سے مقابلہ کرنے پر آسانی دریافت ہوجاتا ہے کہ کس بنک کو کس قدر دینا ہے اور کس سے کس قدر لینا اسی کے مطابق برابری قوم کے چیک انگلستان بنک کے نام لکھدیئے جاتے ہیں جو کہ ان سب بنکوں کے واسطے بطور مرکزی بنک کام کرتا ہے اس طریق سے تخمیناً ساٹھ کروڑ روپیہ کا لین دین ایک پیسہ دیئے لیئے بغیر ہر روز سر انجام پاتا ہے۔ جس سرعت اور سہولت سے حساب گھر میں کام ہوتا ہے وہ بجائے خود دیکھنے کم عجیب نہیں اور اس کام میں شریک ہونے کے واسطے بہت محنت اور مہارت درکار ہے۔ گماشتوں کو اس قدر محنت کرنی پڑتی ہے کہ اکثر ضعف دماغ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان چھبیس کے علاوہ جو باقی بنک ہیں وہ انہیں کو اپنا ایجنٹ بنا کر حساب گھر میں اپنا کاروبار چلاتے ہیں لیکن تجویز ہے کہ ان کو بھی بطور خود شریک ہونے کی اجازت

ملنی چاہیئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس سہولت سے محروم رکھے جائیں ۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ زر رواں کا اگرچہ اصلی مقصد تو چک ادا کرنا ہے لیکن چونکہ ہر کوئی اپنا زر رواں بنک ہی میں رکھنا پسند کرتا ہے۔ ادائگی زر کی نوبت کم آتی ہے بیشتر رقوم مندرجہ چک صرف بنک کے رجسٹروں میں لکھنے والوں کے حساب سے خارج ہوکر پانے والوں کے حساب میں درج ہو جاتی ہیں اور چونکہ ہر کوئی چک لکھتا اور پاتا ہے۔ رقوم مندرجہ خودبخود زائل ہوتی رہتی ہیں ۔ اگر زر رواں میں سے کبھی نقد ادا کرنا پڑتا ہے تو اس وقت جب کہ جمع کنندہ خود لینا چاہے۔ یا کسی ایسے شخص کے لیئے چک لکھے جس کو نقد درکار ہو یا جو بنک میں حساب نہ رکھتا ہو۔ لیکن چونکہ ایسے موقع کم پیش آتے ہیں لہذا زر رواں کا صرف ایک حصہ مطالبات ادائگی پوری کرنے کے واسطے کافی ہوتا ہے اور باقی بطور اصل کاروبار میں لگا دیا جاتا ہے مگر اس شرط پر کہ اس کے کاروبار سے علیحدگی جلد سے جلد ممکن ہو تاکہ اگر کوئی ایسا وقت آن پڑے کہ بہت سے چکوں کی رقمیں نقد طلب کی جاویں تو زر رواں کا یہ حصہ کاروبار سے ہٹ کر فوراً ادائگی کے واسطے آموجود ہو ورنہ اگر خدانخواستہ بنک چک ادا کرنے سے معذور رہے تو فوراً اس کو دیوالیہ قرار دیدیا جائے گا۔ اور دیوالہ نکلتے ہی سب کھیل بگڑ جائے گا۔

معلوم ہوا کہ بنک لوگوں سے بمد امانت و بمد رواں روپیہ لیتا ہے۔ مد اول میں جمع کرنے والوں کو کچھ سود بھی ملتا ہے۔ مد دوم میں جمع کرنے والوں کو یہ فایدہ ہے کہ بنک بطور اُن کے خزانچی کے کام کرتا ہے اور ادائگی وصول بابی رقوم میں بنک کے ذریعہ سے بیحد سہولت ہوتی ہے۔ بنک امانت کا کل اندوختہ اور نیز مد رواں کا ایک جز طرح طرح کے کاروبار میں لگا کر خوب سود وصول کرتا ہے۔ لیکن چونکہ دوسروں کا روپیہ ہے اور محض معتبر سمجھکر لوگوں نے بنک کو دیا ہے شغل اصل میں بیحد احتیاط شرط ہے۔ نہ تو روپیہ مارے جانے کا اندیشہ ہونا چاہیئے

اور نہ اس کے کاروبار سے جدا ہونے میں زیادہ دیر لگنی چاہیئے۔ حصہ چہارم

باب ہشتم چک کی صرف ہم کو ایک کارگزاری اور دکھانی باقی ہے جو کہ عالم معیشت کے عجائبات میں کسی سے کم نہیں۔ شغل اصل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مال و جائداد کی ضمانت پر معتبر لوگوں کو روپیہ قرض دیا جائے۔ لیکن اکثر لوگ بنک سے قرض لیکر اس کو مدرواں میں جمع رکھتے ہیں یعنی بنک کے قرض داروں کو مقدار قرض تک بنک کے نام چک لکھنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے گویا کہ انھوں نے بنک کی مدرواں میں اس قدر روپیہ جمع کر دیا ہے ایسی ترکیب سے دوگونہ تعلقات نمودار ہو جاتے ہیں۔ اوّل تو بنک اس شخص کو قرض دیتا ہے دوم وہ شخص زر قرض بنک ہی کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کو بطور سرمایہ کی رکھے گویا جو قرض دینے والا ہے زر قرض کا محافظ قرار پاتا ہے۔ اب قرض دار اگر اپنے ہی نام چک لکھکر کوئی رقم وصول کرنا چاہے یا کسی ایسے شخص کے نام لکھے جس کو زر نقد درکار ہو یا جو کسی بنک میں حساب نہ رکھتا ہو تب تو بنک کو کچھ زر نقد ادا کرنا پڑے گا ورنہ اکثر ہوتا یہ ہے کہ چک یا تو ان لوگوں کے لئے لکھے جاتے ہیں جن کا خود اس بنک سے حساب ہو یا جو کسی دوسرے بنک سے حساب رکھتے ہوں۔ بصورت اول چک سراہ راست اسی بنک کے پاس پہنچ جاتا ہے جس نے قرض دیا اور زر نقد ادا کرنے کی نوبت کم آتی ہے صرف رقم کا رجسٹروں میں اندراج ہو جاتا ہے بصورت دیگر چک مذکور بنکوں کے باہمی لین دین کے حساب میں شامل ہو جائے گا۔ جیسا کہ معمول ہے اگر دوسرے بنک کے نام ایسا ہی اس کے قرضدار کا لکھا ہوا چک پہلے بنک کے پاس پہنچے تو یہ دونوں ایک دوسرے کو ترائل کر دیں گے۔ کوئی بنک بھی دوسرے کو کچھ ادا نہ کرے گا۔ صرف اپنے اپنے رجسٹروں میں اپنے نام چک کی رقم قرضدار کے حساب سے خارج کر کے دوسرے بنک کے نام چک کی رقم اپنے گاہک کے حساب میں درج کر لیں گے اور اگر دوسرے بنک کے نام ایسی چک پہلے بنک کو نہ ملتی تو بھی لین دین کی مجموعی رقموں میں اس چک کی قیمت

حصہ چہارم
باب ہفتم

ایسی ہوگی جیسی کہ جہاز ڈوبیں ایک سیپک دو بہت ممکن ہے کہ پہلے بنک کی دوسرے پر زائد رقم نکلے جس سے اس چک کی ادائگی ہو جائے اور اگر بفرض محال اس چک کی رقم دوسرے بنک کو ادا کرنی بھی ضروری ہوئی تو مرکزی بنک رقم مندرجہ چک بنک اول حساب سے خارج کرکے بنک دوم کے حساب میں درج کردیگا - زرنقد کے ادا کرنے کی پھر بھی نوبت نہ آئے گی حاصل کلام یہ کہ بنک زرنقد کے بجائے صرف چک لکھنے کا حق دیکر دوسرے لوگوں کو قرض دیتے اور خود اُن کے خزانچی بن جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ بنک کل زرقرض دینے کا ذمہ کرتا ہے - لیکن چونکہ بالعموم قرض دار بذریعہ چک زرقرض وصول کرتا ہے بنک کو زرنقد ادا کرنے کی کم نوبت آتی ہے - قرض کی رقمیں بیشتر رجسٹروں میں گھومتی رہتی ہیں - حتیٰ کہ کچھہ عرصہ میں بنک کو قرضدار سے قرض وصول ہوجاتا ہے - اور اس وقت اگر قرض دار کے لکھے ہوئے چک کا زرنقد بھی ادا کرنا پڑے تو کچھہ مضایقہ نہیں - نتیجہ یہ نکلا کہ بنک زرنقد کے بجائے بیشتر اپنا اعتبار قرض دیتے ہیں - قرض دار بنک کے نام جو چک لکھتے ہیں وہ یا تو اس بنک کے پاس واپس آجاتے ہیں یا بنکوں کے باہمی حساب میں غائب ہوجاتے ہیں زر نقد ادا کرنے کی نوبت مدتوں نہیں آتی حتیٰ کہ قرض دار سے قرض بھی وصول ہوجاتا ہے اگر بنک صرف زرنقد قرض دیتے تو اُن کی حیثیت محض دلال کی سی ہوتی کہ کچھہ لوگوں سے روپیہ لیتے اور کچھہ کو سود پر قرض دیتے - سود میں سے جو کچھہ بطور کمیشن کاٹ کر باقی روپیہ والوں کو دیدیتے لیکن زرنقد سے کہیں زیادہ بنکوں کا اعتبار قرض پر چلتا ہے اور ایسے قرض کی مقدار کروروں و اربوں روپیہ نظر آتی ہے - یہی وجہ ہے کہ بنکوں کی رقموں کے سمجھنے میں عوام کو دہوکا ہوتا ہے مثلاً برطانیہ عظمیٰ کے بنکوں میں جمع شدہ رقموں کی مقدار تیرہ ارب پچاس کرور سے زیادہ دکھائی جاتی ہے - تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عوام نے اس قدر زرنقد بنکوں میں جمع کر رکھا ہے - بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس رقم کا ایک بڑا حصہ مقرض ہوں گے جو بظاہر

زر نقد معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اعتبار سے زیادہ کچھ نہیں اور جن کا شکل زر نقد کوئی وجود نہیں۔

اس کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ بنک ملک کے بہت زیادہ اندوختوں کو بطریق احسن کام میں لاتے ہیں اور ایک ایک روپیہ سے دس دس روپیہ کا کام لے کر طرح طرح سے کاروبار کی ترقی میں ناگزیر مدد دیتے ہیں۔ جس ملک میں عمدہ بنک جاری نہ ہوں وہاں کی معاشی ترقی کی رفتار نہایت سست ہونی لازمی ہے۔

چونکہ کا مختصر حال اوپر بیان ہوا ذیل میں بنک کا ایک چٹھہ پیش کیا جاتا ہے جس سے بنک کے کاروبار کی ایک جھلک نظر آجائے گی رہی بنک کی تفصیل۔ سو یہ وہ دریا نہیں جو کوزہ میں بند ہو سکے۔

بنک کا چٹھہ

(۳) چٹھہ ایک مجمل فرد حساب کتاب ہوتا ہے جس میں جانب راست تو وہ کل رقوم درج ہوتی ہیں جو بنک کو لوگوں سے وصول ہوتی ہیں اور جو اس کو واجب الادا ہوں اور جانب چپ وہ جو کہ بنک نے دوسروں کو دی ہوں اور جو کہ اس کو واجب الوصول ہوں یا کہ جو اس کے پاس موجود ہوں۔ گویا جانب راست بنک کی رقم واجب الادا دکھائی جاتی ہے اور جانب چپ بنک کا اثاثہ اور رقوم واجب الوصول ذیل میں ہم نمونتہً ایک چٹھہ پیش کرتے ہیں

	لاکھ		لاکھ
اصل وصول شدہ	۱۸	نقد بدست	۴۳
اندوختہ	۱۰	قرض عند الطلب و اطلاع قرض	۳۰
زر بعہد امانت	۱۵۰	خرید ہنڈیات او ترمیم ضمانت	۱۵
زر بعہد دوران	۱۰۰	تشغیل اصل	۵۰
مد نفع نقصان	۲	بنک گھر	۷
	۲۸۰		۲۸۰

حصہ چہارم باب ہشتم

اب اس چٹھہ کی مختصر تشریح سنیئے اوّل یہ بتانا ضروری ہو کہ جن لوگوں کا بنک سے تعلق ہوتا ہو اُن کی دو قسمیں ہیں ایک شرکا یا حصہ داران بنک دوسرے بنک کے گاہک جب بنک جاری کرنا مقصود ہوتا ہو تو کچھ لوگ سب سے پہلے ایک رقم اپنی طرف سے مہیا کرکے بنک کی بنیاد ڈالتے ہیں یہی وہ رقم ہو جو بنک کا اصل کہلاتی ہو اس کا مقصد یہ ہوتا ہو کہ لوگ بنک کو معتبر سمجھیں اور جو لوگ بنک سے لین دین کریں اُن کو اطمینان ہو کہ بنک کے پاس اس قدر اصل موجود ہو کہ اگر کبھی بنک کو نقصان پہنچے یا اس کا دیوالہ بھی نکل جائے تو لوگوں کی رقمیں اس اصل سے وصول ہوسکیں گی۔ گویا اصل سے عوام کی نظر میں بنک کی وقعت اور اعتبار قائم ہوتا ہو۔

اصل مہیا کرنے کا قاعدہ یہ ہو کہ کبھی تو چند لوگ ملکر بطور خود جمع کر دیتے ہیں اور کبھی بنک کے نام سے حصے فروخت کیے جاتے ہیں جن کی قیمت سے اصل کی مطلوبہ رقم حاصل ہو جاتی ہو جو لوگ اصل بطور خود جمع کریں یا حصے خریدیں وہ شرکا یا حصہ داران بنک کہلاتے ہیں۔ اور ان ہی کو بنک کا مالک سمجھنا چاہیئے۔ کل مصارف ادا کرنے پر جو کچھ منافع بچتا ہو ان ہی میں تقسیم ہو جاتا ہو اور وہ ان کے کاروبار کا منافع شمار ہوتا ہو۔

اوّل چٹھہ مندرجہ بالا کی جانب رہت والی رقوم واجب الادا پر نظر ڈالیے ۱۸ لاکھ اصل وہی رقم ہو جو شرکا یا حصہ داران بنک نے مہیا کی ہو اور جس کو بنک کا سنگ بنیاد کہنا بیجا نہو گا یہ ۱۰ لاکھ اندوختہ کہاں سے آیا۔ بات یہ ہو کہ جب بنک کامیابی سے چلتا ہو اور شرح منافع اعلیٰ ہوتی ہو تو مالکان بنک کل منافع لینے کے بجائے ایک مناسب مقدار پر قناعت کرتے ہیں اور باقی کو بچا بچا کر بمد اندوختہ جمع کرتے رہتے ہیں اصل کی طرح اندوختہ بھی انہیں کی ملک ہوتا ہو اور اس سے بھی بنک کا رسوخ اور اعتبار بڑھتا ہو۔ اگر فرق ہو تو صرف اس قدر کہ اصل بنک قائم ہوتے وقت مہیا کیا جاتا ہو اور اندوختہ بنک کے منافع سے پس انداز ہو جاتا اندوختہ سے بنک کی مالی حیثیت بھی عمدہ نظر آنے لگتی ہو اور بنک کی [illegible] بھی نمودار

ملتا ہو۔ مزید براں اندوختہ بھی دوسری مدوں کے روپیہ کی مانند کاروبار میں لگا رہتا ہو اور مالکوں کو اس سے آمدنی حاصل ہوتی ہو یہ نہیں کہ وہ بیکار پڑا رہتا ہو۔ اس کو ہم خرما وہم ثواب کا مصداق سمجھنا چاہیئے اور جن بنکوں کے پاس اندوختہ ہو وہ بہت خوش قسمت خیال کیے جاتے ہیں ۲ لاکھ مد نفع و نقصان سے مراد وہ رقم ہو جو کل مصارف ادا کرنے کے بعد بطور منافع مالکوں کو بچے لیکن چونکہ اس مد میں کبھی زاید بچنے کے بجائے الٹی کمی پڑنے کا بھی اندیشہ ہوسکتا ہو اس لیے اس کو محض نفع کے بجائے نفع، نقصان سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جو رقم دکھائی جاے وہ صرف اس مدت سے تعلق ہوتی ہو جس کی بابت کاروبار کا چٹھہ شایع کیا جاے مثلاً ہر ششماہی یا سالانہ کے بعد۔

پس معلوم ہوا کہ تین رقمیں یعنی ۱۸ لاکھ اصل ۱۰ لاکھ اندوختہ اور ۲ لاکھ نفع و نقصان کل ۳۰ لاکھ شرکا یا حصہ داران بنک کی ملک ہو۔ لیکن تعجب ہوگا کہ جب یہی لوگ مالکان بنک ٹھیرے تو پھر اس رقم کو بنک کی طرف سے واجب الادا شمار کرنے کی کیا ضرورت ہو یہاں تو ادا کرنے اور پانے والے وہی لوگ ہیں بھلا کوئی اپنا دین دار خود کیونکر ہوسکتا ہو اور خود اپنے کو ادا کرنا کیا معنی اس میں شک نہیں کہ اس رقم کے دین دار اور لین دار وہی لوگ یعنی مالکان بنک ہیں لیکن بغرض صفائی حساب اُن کی دونوں حیثیتیں علحدہ کہی جاتی ہیں۔ گویا کہ بنک حصہ داروں سے کوئی جدا چیز ہو اور جو کچھ اُن سے لیتا ہو اس کی واپسی کا ذمہ دار ہو اصل کے ساتھ وصول شدہ کی تشریح اس وجہ سے ضروری ہو کہ عوام کو دھوکا دینے کے لیے بعض بنک اصل کی مد میں کوئی بڑی رقم شایع کر دیتے ہیں جس سے اصل کی مقدار کل مراد ہوتی ہو۔ حالانکہ درحقیقت حصہ داروں سے صرف اس مقدار کا نصف یا تہائی چوتھائی وصول کیا جاتا ہو۔ مثلاً بیس لاکھ روپیہ قیمت والے چار چار سو روپیہ کے ۵ ہزار حصے اس شرط پر فروخت کیے جاویں کہ خریداروں کو ۲۰۰ سو روپیہ حصہ تو خریدتے وقت

حصہ چہارم
باب ہشتم

ادا کرنے پڑیں گے اور باقی باقساط معین عند الطلب۔ تو اس صورت میں بنک کا اصل کل ۲۰ لاکھ ضائع کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ صرف ۱۱ لاکھ اصل موجود ہے۔ لہذا اصل کے ساتھ وصول شدہ کی تصریح قانوناً لازمی قرار دیدی گئی۔

یہاں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کہنے کو تو بنک نے (۲۸۰ - ۲) ۲۷۸ لاکھ روپیہ کا کاروبار کر کے کہیں ۲ لاکھ کمایا گویا شرح منافع ۳/۴ فیصدی کے قریب ہی لیکن مالکان بنک کو یہ کل منافع ۱۸ لاکھ اصل پر وصول ہوا۔ گویا اُن کے نزدیک منافع ۱۱ فیصدی سے بھی زیادہ ملا۔ پس بنک کی کامیابی کے دو بڑے راز معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل اعتبار دوم کاروبار میں کم منافع لینا۔ جب بنک پر اعتبار کر کے لوگوں نے اپنا (۱۰ + ۱۵۰) ۲۵ لاکھ روپیہ بمد امانت و مد رواں بنک کے سپرد کر دیا تو اس کو بھی کاروبار میں لگا کر اوسطاً صرف ۳/۴ فیصدی منافع لیکر بنک نے اپنے ۱۸ لاکھ اصل پر ۲ لاکھ منافع کما لیا

اوپر کے بیان سے واضح ہوا کہ جانب رہست تین رقمیں یعنی اصل۔ اندوختہ اور نفع نقصان جن کی مجموعی تعداد ۳۰ لاکھ ہوتی ہے خود مالکان بنک کو بنک کی طرف سے واجب الادا ہیں۔ اب باقی دو رقمیں لیجئے۔ ۱۵ لاکھ بمد امانت اور ۱۰۰ لاکھ بمد رواں۔ ان دونوں مدوں کا مفہوم اوپر بیان ہو چکا ہے یہاں پر صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ ان رقموں کا مالک وہ دوسرا گروہ ہوتا ہے جس میں بنک کے گاہک شامل ہیں گویا گاہک وہ لوگ ہیں جو بنک کے مالک تو نہوں لیکن اس سے لین دین رکھتے ہوں۔ اس میں اپنا روپیہ جمع کریں یا اس سے کچھ روپیہ قرض لیں۔

رقوم واجب الادا کی تو تشریح کی جا چکی۔ اب جانب چپ رقوم اساسہ و رقوم واجب الحصول پر نظر ڈالیے بنکوں کو اپنے نام کے چک فوراً ادا کرنے کے واسطے ہر وقت تیار رہنا ضروری ہے ورنہ وہ اگر کبھی ایک چک ادا کرنے سے بھی معذور ہوا تو فوراً دیوالیہ قرار پا جائے گا اور سب کاروبار تہ و بالا ہو جائیگا

وجب نہیں ۴۴ لاکھ بدست تو وہ رقم ہی جو ادائگی چیک کے خیال سے احتیاطاً ہروقت بشکل زر موجود رکھی جاتی ہی۔ قرض عند الطلب و اطلاع قریب کی ۱۰ لاکھ رقم غالباً دلالوں کو اس شرط پر قرض دی گئی ہوگی کہ بنک جب چاہی فوراً یا صرف دو ایک روز کی اطلاع دیکر اپنا قرض واپس لے لے چونکہ دلال رقم قرض سے ہنڈی کی تجارت کرتے ہیں اور ہنڈی ہروقت فروخت ہوسکتی ہی اُن کو اس قدر جلد قرض واپس کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی مزید براں اس سخت شرط کی رعایت سے اُن کو سود بھی کم دینا پڑتا ہی۔ اس دس لاکھ رقم کی حالت بھی قریب قریب زر نقد کی سی ہی۔ پس نقد بدست اور قرض عندالطلب یا اطلاع قریب کی دونوں رقمیں مجموعی طور پر **سرمایہ محفوظ** کہلاتی ہیں۔ اس سرمایہ سے مراد وہ رقم ہی جو چک ادا کرنے کے واسطے ہر وقت تیار رہی۔ سرمایہ محفوظ سے کچھ روپیہ جو روزمرہ کے چک ادا کرنے کے واسطے باہر رہتا ہی۔ بنک کا **گلہ** کہلاتا ہی۔ انگریزی داں ناظرین کے واسطے یہاں ایک نکتہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہی کہ اکثر بنکوں کے حساب میں دو اصطلاحیں نظر آتی ہیں ایک **ریزرو فنڈ** جس کو **ریسٹ** بھی کہتے ہیں اور دوسری محض **ریزرو**۔ واضح ہو کہ ریزرو فنڈ یا ریسٹ سے مراد اندوختہ ہی اور ریزرو سے سرمایہ محفوظ۔ گلہ جس کو انگریزی اصطلاح میں **ٹل منی** کہتے ہیں سرمایہ محفوظ کا ایک جزو ہوتا ہی جو روزمرہ کام آئے باقی رقم احتیاطاً اڑے وقت کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہی۔ تیسری مد کو چھوڑ کر آخری دو مدوں کو پہلے سمجھنا مناسب معلوم ہوتا ہی۔ تفصیل اصل کی ۵۰ لاکھ وہ رقم ہی جس سے کارخانوں کے حصے یا سرکاری رقعے خریدے گئے ان پر بمقدار معین سود وصول ہوتا رہتا ہی اور بوقت ضرورت یہ بھی فروخت ہوسکتے ہیں بنک گھر کا ۱۰ لاکھ روپیہ بنک کی زمین اور عمارت اور سامان کی قیمت ہی اب بٹہ کی ہنڈیوں اور قرض بہ ضمانت کی سب سے بڑی مد لیجیے جس میں ۱۵۰ لاکھ روپیہ لگا ہوا ہی۔

بنک بٹہ کاٹکر ہنڈیاں خریدتے ہیں اور چونکہ ہنڈیاں ہروقت فروخت ہوسکتی

حصہ چہارم
باب ہشتم

ہیں۔ ان کی تجارت بھی بنکوں کو بہت مرغوب ہے۔ مالی ضمانت لیکر معتبر لوگوں کو روپیہ بھی قرض دیا جاتا۔ لیکن عجیب و غریب طریق سے یعنی بنک قرض خواہوں کو اپنے نام بمقدار قرض صرف چک لکھنے کا حق دیدیتے ہیں۔ جن کو زر نقد میں ادا کرنے کی نوبت کم آتی ہے حتیٰ کہ زر قرض وصول ہو جاتا ہے۔ ایسے قرض داروں کا چک لوگ اس وجہ سے لے لیتے ہیں کہ وہ معتبر بنک کے نام لکھا ہوتا ہے۔ اور بنک سے چک کا زر نقد لینے کی عجلت نہیں گویا کہ بنک قرض خواہوں کو صرف اپنا اعتبار قرض دیدیتے ہیں جو کہ زر نقد کا کام دیتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک نہایت عجیب اور پیچیدہ طریق لین دین کا ہے جو غور کیے بغیر سمجھ میں آنا دشوار ہے۔ بنک کے قرض کی ہم اس سے قبل بھی چک کے تحت میں تشریح کر چکے ہیں۔

اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ بنک خواہ دالوں کو عندالطلب قرض دے یا دوسرے لوگوں کو میعادی قرض دے یا بٹہ کاٹکر ہنڈی خریدے ہر صورت زر نقد دینے کے بجائے وہ صرف چک لکھنے کا حق دیدیتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاملہ ہوتے ہی رقم بنک کے چٹھہ میں حساب جیب یا خرید ہنڈی کی مد میں شامل ہو جاتی ہے۔ گویا کہ بنک نے زر نقد ادا کیا اور جانب راست بھی وہ بمد رواں شمار ہو جاتی ہے گویا کہ پانے والے نے زر نقد بنک میں جمع کیا۔ حالانکہ درحقیقت اس وقت نہ کوئی زر نقد دیا جاتا ہے اور نہ جمع کیا جاتا ہے۔ صرف اندراج ہی اندراج ہے لیکن بنک کے اعتبار سے بھی زر نقد ہی کا سا کام نکلتا ہے اور مدتوں یہ رقمیں محض جمع ہی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ قرض دار اپنا قرض بنک کو ادا کر دے یا ہنڈی پٹ جائے یا فروخت کر دی جائے۔

چٹھہ مندرجہ بالا میں رقوم واجب الادا اور واجب الوصول حسب ذیل نظر آتی ہیں

	لاکھ		لاکھ
شیئر کا یا حصہ داران	۳۰	نقد بدست	۴۳
گاہک	۲۵۰	شغل اصل	۵۰
		بنک گھر	۷
		قرض گاہکوں کو	۱۸۰
	۲۸۰		۲۸۰

گاہکوں کو ۲۵۰ لاکھ واجب الادا ہے گویا کہ یہ کل رقم انہوں نے بنک میں جمع کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ۱۸۰ لاکھ اُن سے بنک کو واجب الوصول بھی ہے گویا کہ بنک نے یہ کل رقم اُن کو قرض دی ہے لیکن بنک قرض بشکل زر نقد کم دیتا ہے اور رقم قرض ہر دو حساب درج کر دیتا ہے۔ گویا کہ کل رقم بنک نے بشکل زر نقد دی اور قرض گیر نے وہی رقم بنک میں بمد رواں جمع کر دی۔ پس معلوم ہوا کہ بمد امانت و رواں ۲۵۰ لاکھ کی جو رقم دکھائی گئی ہے اس میں سے صرف (۲۵۰ − ۱۸۰) ۷۰ لاکھ تو نقد جمع کی گئی ہے اور باقی ۱۸۰ لاکھ وہ رقم ہے جو بنک نے قرض دیکر دونوں جانب درج کر دی۔ سوائے اعتبار کے اُس وقت تک اس رقم کا کوئی وجود نہیں جب تک کہ وہ قرض داروں سے وصول نہ ہو جائے یا ہنڈیاں نہ پٹ جاویں کیسے تعجب کی بات ہے کہ بنک کے پاس کل (۳۰ + ۷۰) ۱۰۰ لاکھ روپیہ بشکل زر نقد موجود ہے ۴۳ لاکھ تو بطور نقد بدست بیکار پڑا رہتا ہے۔ ۷ لاکھ بنک گھر کی قیمت ہے اور صرف ۵۰ لاکھ کاروبار میں لگتا ہے لیکن اس سے (۱۸۰ + ۵۰) ۲۳۰ لاکھ کا کام نکلتا ہے۔ اور دو لاکھ منافع حاصل ہوتا ہے جو کہ ۱۸ لاکھ اصل پر حصہ داروں میں بشرح ۱۱ فیصدی تقسیم ہوگا۔ یا اگر حصہ دار کچھ کم منافع مثلاً ۸ فیصدی لینا قبول کریں تو باقی رقم اندوختہ میں شامل ہو جائے گی اور وہ بھی حصہ داروں ہی کی ملک ہے۔ گاہکوں کو مد امانت کی رقم پر جو سود دیا گیا ہوگا وہ اس دو لاکھ کے منافع سے خارج ہے۔

حصہ چہارم
باب ہشتم
نوٹ چیک
ہنڈی یا
سرکاری
تمسک اور
سکہ جات

(۴) نوٹ کیا ہے؟ سرکار یا کسی بنک کی طرف سے تحریری وعدہ کہ اس کا حامل جب چاہے نوٹ کے معاوضہ میں رقم مندرجہ نقد یعنی شکل زر فلزاتی وصول کر لے۔ جب کہ لوگوں کو وعدہ پر اعتبار ہوتا ہے تو زر فلزاتی کی مانند نوٹ بلا تکلف لین دین میں چلتا ہے اور مدتوں اس کے معاوضہ میں زر نقد کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ نوٹ کے انتقال میں توقیع کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ تاہم زیادہ قیمتی نوٹوں کی پشت پر صرف دینے والے کے دستخط کرا لیے جاتے ہیں نوٹ کی حالت دستور سکہ کی سی ہے۔ حتیٰ کہ اس کو انتہائی قسم کا زر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس پر کچھ سود نہیں ملتا لہٰذا لوگ صرف بقدر ضرورت نوٹ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ باقی کسی بنک میں بطور امانت داخل کر کے ان پر سود وصول کرتے ہیں۔ نوٹ میں سہل اور معین رقوم درج ہوتی ہیں مثلاً پانچ دس، پچاس اور سو روپیہ۔ جب کسی کو بہت سی رقمیں ادا کرنی پڑتی ہوں تو اُن کی تعداد بڑی مختلف ہوں گی مثلاً ۱۱ یا ۲ روپیہ ۹ آنہ ۶ پائی۔ ایسی رقموں کی ادائگی بذریعہ نوٹ دقت طلب ہے۔ یعنی کچھ نوٹ اور کچھ زر فلزاتی دینا ضروری ہے لیکن روز مرہ کے خرچ کے نوٹ بھی لوگ بنک میں بمد رواں جمع کرا دیا کرتے ہیں۔ تاکہ جتنی رقم درکار ہوئی اسی کا چیک بنک کے نام لکھ دیا اور چیک پانے والے نے رقم مندرجہ بنک سے وصول کر لی چنانچہ ہر ترقی یافتہ ملک میں نوٹوں کی بڑی تعداد رائج ہے۔

چیک بنک کے نام ایک تحریری حکم ہے کہ وہ اس کے لکھنے والے کی طرف سے رقم مندرجہ اس کے حامل کو ادا کر دے۔ کبھی حامل کا نام درج کر دیا جاتا ہے اور کبھی نہیں پہلی قسم کی چیک کا اصطلاحی نام **جوگ** اور دوسری قسم **دہنی جوگ** کہلاتی ہے اگر لکھنے والا اور نیز بنک جس کے نام چیک لکھا جائے پورے طور پر معتبر ہوں تو چیک نوٹ کے ہم پلہ ہو جاتا ہے اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ چیک کی رقمیں نوٹوں کی مانند معین نہیں ہیں ہر کوئی رقم چیک میں درج کی جا سکتی ہے لیکن ہر شخص اور ہر بنک کی حالت سے پورا پورا واقف ہونا ہر کسی کو دشوار ہے بلکہ ممکن ہے

کہ چیک لکھنے والے کا بنک میں اب کچھ جمع نہ ہو یا رقم مندرجہ چیک اس کی جمع کردہ رقم سے زیادہ ہو یا بنک کا دیوالہ نکل جائے بہر صورت چیک پانے والے کو بہت دقت اور حیرانی اٹھانی پڑے گی پس چیک انہی ملکوں میں چل سکتا ہے جہاں عوام بیدار و خوش خیال ہوں اور کاروبار میں ایمانداری برتیں۔ چیک کی انہی کمزوریوں کی وجہ سے اس کو زر قانونی قرار نہیں دیا جاتا یعنی کوئی لین دار چیک لینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا گو وہ چاہے تو رقم واجب الوصول زر قانونی میں طلب کر سکتا ہے۔ چونکہ نوٹ سرکار یا بااجازت سرکار کسی معتبر بنک کی طرف سے جاری ہوتے ہیں ان کو زر قانونی کا مرتبہ حاصل ہے پس چیک نوٹ کی مانند بطور زر نہیں چلتا اگر چیک کی صورت ہوتی تو چیک پانے والا بنک سے رقم مندرجہ بشکل زر قانونی وصول کرے گا۔ ورنہ چیک بمد امانت پا کر وہ اپنے بنک میں جمع کر دے گا اور بوقت ضرورت اپنے لیے چیک لکھ کر جتنی رقم درکار ہوگی بنک سے لیتا رہے گا یا دوسرے کے لیے چیک لکھ کر بنک سے اس کو زر دلوا دے گا۔ چیک کی رقمیں متعدد بنک کے رجسٹروں میں ادھر سے ادھر گھومتی رہتی ہیں ان کو بشکل زر نقد ادا کرنے کی نوبت کم آتی ہے اور چیک بہت کم مثل نوٹ دست بدست منتقل ہوتا ہے

ہنڈی کسی شخص کی طرف سے جس کو لکھنے والا کہتے ہیں۔ دوسرے شخص کے نام جو پانے والا کہلاتا ہے ایک تحریر ہوتی ہے کہ فلاں رقم شخص اول الذکر کی آخر الذکر پر واجب الادا ہے شخص دوم اس پر لفظ قبول اور اپنے دستخط لکھ کر اس کی تصدیق کر دیتا ہے۔ ہنڈی میں اکثر اس مال کی قیمت درج ہوتی ہے جو لکھنے والا پانے والے کے ہاتھ فروخت کرتا ہے اب اگر لکھنے والا چاہے تو وقت معینہ پر رقم مندرجہ خود وصول کرے یا اس سے قبل بطریق توقیع وہ کسی دوسرے کے ہاتھ ہنڈی فروخت کر کے اپنے دام وصول کر لے ہنڈی کا خریدار رکھنے والا کہلاتا ہے اور اس کو بھی لکھنے والے کی طرح پانے والے سے رقم مندرجہ وصول کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

ہنڈی عندالطلب اور چیک یکساں ہیں اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ چیک صرف بینک کے نام لکھا جاتا ہے اور ہنڈی تجار کے نام بھی لکھی جاتی ہے۔ میعادی ہنڈی پر البتہ سود ملتا ہے۔ لیکن قبل از وقت ادائگی فروخت کرنے پر اُن کی رقم مندرجہ میں سے بٹہ کٹ کر قیمت ملتی ہے۔ ہنڈی کی اصلی عرض میعادی ہنڈی سے بذریعہ اولیٰ پوری ہوتی ہے اور اسی قسم کی ہنڈیاں بہت زیادہ رائج ہیں۔

قرض عامہ کے سرکاری رقعے اور کارخانوں کے حصے آج کل مثل ملک و جائداد بکثرت فروخت ہوتے ہیں اُن کے مالکوں کو سود بشرح معین یا غیر معین ملتا ہے اور جو لوگ کاروبار یا ریاست کے بکھیڑوں میں پڑنا پسند نہ کریں وہ ایسی چیزوں میں اپنا روپیہ لگا کر آمدنی کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔

حساب گھروں اور دفتروں میں جا کر دیکھئے تو خدا کی قدرت نظر آئے گی کہنے کو تو اربوں روپیہ روز کا کاروبار ہوتا ہے مگر وہاں کاغذ کے پرزوں کے سوائے ایک پیسہ نظر آئے تو ہمارا ذمہ آج کل کے کل طریق کاروبار اعتبار پر جاری ہیں اگر اعتبار اُٹھ جائے تو وہ تلاطم برپا ہو کہ دیکھا چاہئے مگر چونکہ اعتبار میں سب کا فائدہ ہے طرح طرح کے رسم و رواج اور قوانین سے ایسی پیش بندیاں کی ہیں کہ اعتبار بہت مستحکم نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ موجودہ جنگ یورپ بھی اس کو کوئی قابل لحاظ صدمہ نہیں پہنچا سکی۔ اس کا رسوخ دنیا میں برابر قائم ہے۔

تجزیہ (۱) زر کے کام (۲) قیمت اشیا اور قدر زر کا تعلق (۳) انڈکس نمبر (۴) مسئلہ مقدار زر (۵) مادی سونے کی قدر و قیمت (۶) رسد و طلب زر (۷) اضافہ مقدار زر کے نتائج (۸) سونے کی پیداوار

(۱) اس سے قبل بھی جا بجا زر کا بیان آچکا ہے۔ یہاں پر زر کے متعلق سب سے پیچیدہ اور نازک بحث یعنی مسئلہ قدر زر پیش کرنا مقصود ہے۔ اس غرض کے لیے اول زر کے کاموں پر نظر ڈالنی ضروری ہے زر سے چار کام متعلق مانے جاتے ہیں۔ سب سے اول وہ آلہ مبادلہ ہے یعنی اُس کے وسیلہ سے خرید و فروخت ہوتی ہے دوم وہ معیار قدر ہے یعنی اُس کے حوالہ سے چیزوں کی باہمی قدر مقرر ہوتی ہے۔ سوم وہ خزینۃ القدر ہے یعنی لوگ اس کو بطور اندوختہ محفوظ رکھتے ہیں چہارم مستقبل داد و ستد بھی اسی کے حوالہ سے بوقت حاضر قرار پاتے ہیں مثلاً ملازموں کی تنخواہ مکانات کا کرایہ۔ زمینوں کا لگان پہلے ہی سے کچھ ماہ یا سال کے واسطے بشکل زر معین کر دیا جاتا ہے۔ جب سے معاشی ترقیات کی بدولت کاروبار میں اعتبار کا دخل بڑھا چوتھے کام کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ پس ماندہ ممالک میں بیشتر کاروبار عین وقت پر نقد ہوتا ہے۔ لیکن ترقی یافتہ ممالک میں اعتبار کا وہ زور بندھا ہے کہ کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ کے لین دین پہلے ہی سے سالہا سال مستقبل کے واسطے قرار پا جاتے ہیں گویا کہ زر کی قدر معین ہے کہ وقت گذرنے سے اس میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوتا اور اس کی جو قدر آج ہے دو۔ چار۔ دس۔ پانچ سال بعد بھی وہی رہے گی اور ابذا زر کی مستقبل داد و ستد موجودہ قدر کے موجب اس وقت قرار دینے میں کوئی قباحت

صفت چہارم ہیں اس وقت تھا، نہ آیندہ ہوگی نہ اس میں اضافہ ہوتا ہے نہ تخفیف حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے

ثبات قدر عام طور سے واضح ہوگا کہ زر کے پہلے کام کے واسطے اس میں **مقبولیت** کی صفت لازمی

یعنی اگر لوگ کسی قسم کی چیز کو مبادلہ میں قبول کرنے لگیں تو وہ من حیث آلہ مبادلہ کا کام

دے سکتی ہے۔ مگر جب اُس چیز کا معاوضہ اور خرید و فروخت ہونے لگیں تو اُن کی باہمی قدر

بوسیلہ زر قرار پانے لگی مثلاً اگر سیر بھر گھی چار سیر شکر دس سیر گیہوں اور ۱۶ سیر

نمک کی جدا جدا قیمت ایک روپیہ ہو تو یہ سب سیریں آپس میں ہم قدر شمار ہوں گی۔ پس

ثابت ہوا کہ زر آلہ مبادلہ کا کام کرتے کرتے معیار قدر کا کام دینے لگا ہے اور ان دونوں

کاموں کے واسطے اس میں مقبولیت کی صفت لازمی ہے۔ سونا چاندی کی مقبولیت عالمگیر ہے

لہٰذا ان دونوں کاموں کا سرانجام بخوبی پاسکتا ہے لیکن باقی دو کام کہ وہ

مرتبۃ العدد بھی ہوتا ہے اور اس لئے زر حال سے بدلہ ہو پہلے متمائز ہیں اور جو بعد میں پائے

ہیں ان کے واسطے زر میں **ثبات قدر** کی صفت درکار ہے یعنی اُس کی قدر ہمیشہ

یکسان ہو۔ اس میں کوئی کمی بیشی نمودار ہو ایک روپیہ کی قدر آج بھی وہی ہو جو دس بیس

سال قبل تھی اور آیندہ بھی وہی برقرار رہے۔

دلیل کی تفصیل سے واضح ہوگا کہ اگرچہ بمقابلہ دیگر زر طلائی میں ثبات قدر کی صفت بدرجہ

اعلیٰ پائی جاتی ہے لیکن پھر بھی اس کی قدر کو کامل ثبات حاصل نہیں اس میں ردوبدل ممکن

ہے بلکہ عرصہ سے مسلسل تخفیف جاری ہے۔ البتہ یہ غنیمت ہے کہ تبدیلی اس قدر آہستگی

سے عمل میں آتی ہے کہ کہیں سالہا سال بعد اس کا اثر قابل لحاظ محسوس ہوتا ہے۔ پس بلحاظ

دو چار سال کے تو زر طلائی کو ثابت القدر شمار کرنا کچھ مضائقہ نہیں لیکن دس بیس

کے عرصہ میں اس کی قدر پر عدم ثبات کا نقص ضرور عائد ہوتا ہے اور اس میں تغیر نمایاں

ہوجاتا ہے۔ البتہ یہ مسلم ہے کہ زر طلا کو جس حد تک بھی ثبات قدر حاصل ہے کسی دوسری

چیز کو اتنا بھی حاصل ہونا دشوار ہے۔

حصہ چہارم
باب ہشتم
قیمت اشیا اور قدر زر کا تعلق

(۲) اصطلاح قدر کا مفہوم اس سے قبل مسئلہ قیمت کی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔ کسی چیز کی قدر سے مراد دوسری چیزوں کی وہ مقداریں ہیں جو اُس کے مبادلہ میں دستیاب ہو سکیں مثلاً اگر دس سیر گیہوں چھہ سیر دودھ چار سیر شکر اور سیر بھر گھی کا ایک دوسرے سے مبادلہ ہو سکے تو یہ سب آپس میں ایک دوسرے کی قدر شمار ہوں گے۔ لیکن زر کی وہ مقدار جو مبادلہ میں لی دی جاوے اصطلاحاً اس چیز کی قیمت کہلائے گی مثلاً اگر مذکورہ بالا اشیاء میں سے ہر ایک کا ایک روپیہ سے مبادلہ ہو سکے تو روپیہ ان میں سے ہر ایک کی قیمت شمار ہوگا۔ گویا کسی چیز کی قیمت اس کی وہ قدر ہے جو بمعیار زر قرار پائے جب کہ کسی چیز کا زر سے مبادلہ ہو۔ زر تو اس چیز کی قیمت کہلایا۔ لیکن وہ چیز بحوالہ زر کیا کہلاتی جاہیئے اس کو بھی اصطلاحاً قدر زر سے تعبیر کریں گے۔ مثلاً اگر گیہوں کا نرخ ۴ روپیہ من ہو تو ۴ روپیہ ایک من کی قیمت کہلاویں گے۔ اور ایک من چار روپیہ کی قدر شمار ہوگا
اب قیمت اشیا اور قدر زر کے تعلق پر غور کیجئے۔ جب چیزیں ارزاں ہوں گی یعنی اُن کی جو پہلے قیمت مقرر تھی وہ قیمت گھٹے گی تو زر کی قدر میں اضافہ ہوگا اس کے برعکس جب چیزیں گراں ہوں یعنی اُن کی قیمت میں اضافہ ہو تو زر کی قدر گھٹ جائے گی۔ اوپر کی مثال میں ایک من گیہوں کی قیمت ۴ روپیہ اور ۴ روپیہ کی قدر ایک من گیہوں تھے فرض کرو کہ گیہوں ارزاں ہو کر ۴ روپیہ کے بجائے ۳ روپیہ من فروخت ہونے لگیں تو اب تین روپیہ کی وہی قدر ہوئی جو پہلے ۴ روپیہ کی تھی یعنی ایک من گیہوں اور موجودہ ۴ روپیہ کی قدر بجائے ایک من کے ۱ ۱/۳ من ہوگی۔ گویا ارزانی کی بدولت قدر زر میں ۳۳ فیصدی اضافہ نمودار ہوگیا اور اگر گیہوں گراں ہو کر ۵ روپیہ من فروخت ہوں تو موجودہ ۵ روپیہ سابق ۴ روپیہ کے ہمقدر ہوں گے اور موجودہ ۴ روپیہ کی قدر ۴/۵ من یعنی ۳۲ سیر گیہوں ہو جائیں گے

حصہ چہارم باب سوم

گویا گرانی کے باعث قدر زر ۲۰ فیصدی گھٹ جائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ قیمت اشیاء اور قدر زر کے باہم نسبت معکوس قائم ہے ایک کے گھٹنے بڑھنے سے دوسری میں اضافہ وتخفیف پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں گویا ایک ترازو کے دو پلڑے ہیں ایک کے جھکنے سے دوسرے کا چڑھنا لازمی ہے اور چڑھنے سے جھکنا۔

آج کل بیشمار چیزوں کی خرید و فروخت جاری ہے اُن کی قیمتوں میں لگاتار عارضی اور دیرپا تغیر و تبدل ہوتے رہتے ہیں کبھی ارزانی یا گرانی صرف چند روز یا ہفتوں کے لیے نمودار ہوتی ہے تو کبھی برسوں قائم رہتی ہے اور پھر یہ نہیں کہ ایک وقت کل چیزوں کی قیمت میں ایک ہی تبدیلی نمودار ہو بلکہ سیکڑوں ارزاں ہوتی ہیں تو ہزاروں گراں اور سیکڑوں گراں تو ہزاروں ارزاں۔ غرضکہ قیمت اشیا کی تبدیلیاں حد و حساب سے باہر ہیں۔ اور ہر ایسی تبدیلی سے قدر زر میں تبدیلی معکوس لازم آتی ہے۔ گویا گرانی و ارزانی سے قدر زر میں بھی بیشمار تخفیف اور اضافے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ایک چیز کے جداگانہ حوالہ سے قدر زر کی حالت مختلف نظر آئے گی۔ کہیں اضافہ اور کہیں تخفیف اور پھر اُن کے بیشمار مدارج اور جب چیزیں کثیر التعداد ہوں تو قدر زر کی مجموعی حالت کا پتہ چلانا اہتمام طلب ہے۔ چنانچہ قدر زر کے تخمینہ کرنے کا طریق ہم مختصراً بیان کرتے ہیں۔

انڈکس نمبر

(۳) کسی معاملہ کے متعلق اعداد و شمار فراہم کر کے اُن کے اوسط اور تخمینے نکالنا اور معاشی قوانین و اصول اُن کے ذریعہ سے تحقیق کرنا یا جانچنا ایک نہایت وسیع اور مہارت طلب معاشی فن ہے جس کو انگریزی میں اسٹیٹسٹکس کہتے ہیں۔ اس کا اردو نام فن اعداد نا موزوں نہ ہوگا۔

اس کام کے واسطے کل ترقی یافتہ ممالک میں خاص محکمے قائم ہیں۔ قیمت اجرت پیداوار۔ درآمد۔ برآمد اور ایسے ہی کل ضروری معاملات کے متعلق اعداد و شمار

حصہ چہارم باب ہفتم

تیار کرکے محفوظ رکھے جاتے ہیں اور پھر ان سے کام لیکر نہایت ضروری اور نتیجہ خیز معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں یوں تو مدت سے یہ کام تہوڑا بہت جاری ہے لیکن کچھ عرصہ ہوا کہ پورے اہتمام کے ساتھ ایک جدا محکمہ قائم کر دیا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً عوام کی آگاہی کے واسطے اپنی تحقیقات کی مفصل رپورٹ شائع کرتا رہتا ہے۔ اس فن کے بہت سے اصول و قواعد ہیں اور ان میں سے کثیر تفصیل طلب ہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق جدا گانہ کتابیں موجود ہیں بوجہ قلت گنجائش ہم ان کے مختصر بیان سے بھی معذور ہیں۔ یہاں پر صرف ایک خاص چیز **انڈکس نمبر** کی تشریح مقصود ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کی تبدیلیوں کا باسانی پتہ چل جاتا ہے۔ اس کے بنانے کے اصول و قواعد بھی بجائے خود بہت کچھ بحث طلب ہیں جن کو ہم قلم انداز کرتے ہیں۔ یہاں پر انڈکس نمبر کی ایک سادہ مثال پیش کی جاتی ہے جس میں قدر زر کا مجموعی تغیر و تبدل صاف نظر آجائے گا۔

فرض کرو ہم کو یہ دریافت کرنا مقصود ہے کہ گذشتہ ۱۵ سال کے اندر قدر زر میں کیا تبدیلی نمودار ہوئی۔ بہ طریق ذیل ایک انڈکس نمبر تیار کرنے پر یہ امر قابل اطمینان حد تک تحقیق ہو جائے گا۔ چند ایسی چیزیں جن کی طلب عام ہو مثلاً گیہوں۔ روئی۔ شکر۔ نمک۔ گوشت۔ گھی لو سنہ ۱۹ء میں اُن کی قیمت کا جو جو اوسط رہا ہو اس کو ۱۰۰ فرض کرو اس کے بعد سنہ ۱۹۱۵ء میں اُن کی قیمتوں کا جدا جدا اوسط لو سنہ ۱۹ء کی قیمتوں کے اوسط کا سنہ ۱۹۱۵ء کے اوسطوں سے مقابلہ کرو اور چونکہ اوسط اول الذکر ۱۰۰ فرض کیے جا چکے ہیں آخر الذکر اوسطوں کو اُن کے حوالہ سے بطریق فیصدی ظاہر کرو۔ مثلاً گیہوں کی قیمت کا اوسط سنہ ۱۹ء میں ۴ روپیہ من تھا جو کہ ۱۰۰ فرض کر لیا گیا تو اگر گیہوں کی قیمت کا اوسط سنہ ۱۹۱۵ء میں ۵ روپیہ من ہو تو بحوالہ پہلے اوسط کے دوسرا اوسط ۱۲۵ فیصدی شمار ہوگا اور اگر سنہ ۱۹۱۵ء میں اوسط ۳ روپیہ من سمجھا جائے

حصہ چہارم
باب نہم

تو وہ ۵ ر فیصدی کہا جائے گا یہی طریق دوسری چیزوں کے اوسطوں کے مقابلہ میں برتا جائے گا۔
فرض کرو کہ نتیجہ حسب ذیل نکلے

	سنہ ۱۹	سنہ ۱۹۱۵
گیہوں	۱۰۰	۱۳۰
روئی	۱۰۰	۱۴۰
شکر	۱۰۰	۱۲۵
نمک	۱۰۰	۹۰
گوشت	۱۰۰	۹۵
گھی	۱۰۰	۱۲۰
	۶۰۰	۷۰۰

دونوں سال کے اوسطوں کے مجموعوں کا مقابلہ کرنے سے واضح ہوگا کہ قیمت میں بقدر (۷/۶ - ۱) ۱/۶ یا ۱۶ ۲/۳ فیصدی اضافہ ہوگیا اور قدر روپیہ میں (۱ - ۶/۷) ۱/۷ یا ۱۴ ۲/۷ فیصدی تخفیف ہوگئی۔

لیکن صاف ظاہر ہے کہ مذکورہ مال اشیاء میں مقابلتہً بعض کی طلب زیادہ ہے اور بعض کی کم۔ مثلاً گیہوں دس لاکھ روپیہ کے فروخت ہوں روئی ۷ لاکھ کی۔ شکر۔ گھی۔ گوشت اور نمک علی الترتیب ۵-۴-۳ اور ایک لاکھ کے۔ ان کی قیمتوں کی باہمی نسبت اُن کا **وزن** کہلاتی ہے۔ مثلاً نمک ایک لاکھ کا فروخت ہوا۔ اب اگر اس کا وزن ایک فرض کیا جائے تو گیہوں۔ روئی۔ شکر۔ گھی اور گوشت کے وزن علی الترتیب ۱۰ - ۷ - ۵ - ۴ اور ۳ ہو گئے۔ اب ان میں سے ہر ایک کے وزن کو اس کے سنہ ۱۹۱۵ء کی قیمت کے اوسط سے ضرب دو اور حاصل ضربوں کے مجموعہ کو ان وزنوں کے حاصل جمع سے تقسیم کردو تو حاصل تقسیم

سنہ ۱۹۱۵ء کی قیمتوں کا مجموعی اوسط ہوگا - اور یہ اوسط پہلی مثال کے اوسط سے زیادہ صحیح ہوگا

	سنہ ۱۹۱۵ء	وزن	حاصل ضرب
گیہوں	۱۳۰	۱۰	۱۳۰۰
روئی	۱۴۰	۷	۹۸۰
شکر	۱۲۵	۵	٦۲۵
نمک	۹۰	۱	۹۰
گوشت	۹۵	۳	۲۸۵
گھی	۱۲۰	۴	۴۸
		۳۰	۳۷٦

۱۰ کے بجائے قیمت اب ۳۷٦۰/۳۰ یا ۱۲۵ ہوگئی گویا اس میں ۲۵ فیصدی اضافہ ہوا پس قدر روپیہ میں ۲ فیصدی تخفیف ہوگئی -

مثال دوم میں وزن سے کام لیا گیا لہذا اس کے مجموعی اوسط اصطلاحاً **وزن شدہ** اور مثال اوّل کے **غیر وزن شدہ** کہلاتے ہیں ان اوسطوں کو بغرض یاددہانی ہم پھر پیش کرتے ہیں -

مطابق غیر وزن شدہ اوسط اضافہ قیمت ۱٦ ۲/۳ و تخفیف قدر روپیہ ۱۴ ۲/۷ فیصدی

مطابق وزن شدہ اوسط اضافہ قیمت ۲۵ و تخفیف قدر روپیہ ۲ فیصدی یہی اوسط زیادہ صحیح مانے جاتے ہیں ۔

یہ تو انڈکس نمبر کی ایک سادہ مثال ہے ان کے بنانے میں بہت کچھ احتیاطیں اور قاعدے برتے جاتے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں اوّل تو جن چیزوں کے اعداد وشمار لیے جاویں اُن کا انتخاب دوم اعداد وشمار معلوم کرنے کے ذرائع ۔ سوم جس وقت

حصہ چہارم
باب نہم

کے متعلق اعداد وشمار لیے جاویں اس کا تعین چہارم اُن کے اوسط نکال لینے کے طریق اور ایسے بہت سے مسائل ہیں جن کا لحاظ کرنا ضروری بھی ہے ۔ اور دشوار بھی بہر حال عمدہ انڈکس نمبر تیار کرنا دشوار کام ضروری ہے لیکن جب کوئی ایسا انڈکس نمبر تیار ہو جاتا ہے تو اس سے اگر مکمل طور پر نہیں تو کم از کم نہایت قابل اطمینان حد تک تبدیلی مطلوبہ کا صاف پتہ چل جاتا ہے ۔ آج کل اجرت قیمت عمر امراض وغیرہ کے متعلق انڈکس نمبر شائع کیے جاتے ہیں

The Quantity Theory

(۴) بہر حال قیمت اشیاء میں جو کچھ کمی بیشی اور ساتھ ہی ساتھ اس کے برعکس قدر زر میں جو اضافہ اور تخفیف ہوتی ہے انڈکس نمبر کے ذریعہ سے اس کا مجموعی اوسط دریافت ہو سکتا ہے ۔ جیسا کہ ابھی مثال دوم میں اضافہ قیمت کا اوسط ۲۵ فیصدی اور لہذا قدر زر کی تخفیف کا اوسط ۲۰ فیصدی نکلا ۔ یوں فرداً فرداً چیزیں گراں بھی ہوتی رہتی ہیں اور ارزاں بھی لیکن تحقیقی طور پر معلوم ہوا کہ بحیثیت مجموعی ہر ملک میں گرانی بڑھ رہی ہے اور زر کی قدر گھٹتی جاتی ہے ۔ اب ایک دشوار سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس عام تبدیلی کے اسباب کیا ہیں ۔ اس مسئلہ پر بہت کچھ رد و قدح اور موشگافیاں ہو چکی ہیں موجودہ عالمگیر گرانی کے اسباب چند در چند ہیں جن میں سے اکثر ہندوستانی گرانی کے تحت میں ہم آگے چل کر بیان کریں گے یہاں پر ان میں سے صرف ایک یعنی مقدار زر کا اثر واضح کرنا مطلوب ہے ۔ چونکہ زر معیار قدر کہلاتا ہے اور ہر معیار مقرر و معین ہوتا ہے لہذا گز کی لمبائی یا من کے وزن کے مانند زر کی قدر بھی ہم معین خیال کرتے ہیں ۔ لیکن یہ ایک مغالطہ ہے غور کرو تو معلوم ہوگا کہ منجملہ اُن بیشمار چیزوں کے جن کا باہمی مبادلہ ہوتا ہے زر بھی ایک چیز ہے اس میں فرق صرف اس قدر ہے کہ لوگ مبادلہ میں اس کو بلا عذر و حجت قبول کر لیتے ہیں لیکن قدر و قیمت زر کی بھی اسی طرح قانون طلب و رسد کی پابند ہے جیسے اور کل چیزوں کی ۔ یعنی زر کی مقدار بڑھنے سے اس کی قدر گھٹتی ہے اور مقدار گھٹنے سے قدر بڑھتی ہے ۔ چنانچہ

اگر کسی ملک کے زر کی مقدار دوگنی سہ گنی کر دی جائے تو اس کی قدر میں بھی تخفیف مثلاً ۵۰ یا ۳۳ فیصدی نمایاں ہوگی۔ چنانچہ زر کی تاریخ میں ایسے مستند واقعات موجود ہیں کہ ادھر زر کی مقدار بڑھی ادھر اس کی قدر گھٹی یعنی کثرتِ زر گرانی کا باعث ہو جاتی ہے۔ اس پیچیدہ واقعہ کی ایک سادہ مثال یہ سمجھنا چاہیے کہ کسی شخص کے پاس روپیہ جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے اس کی نظر میں روپیہ کی قدر کم ہو جاتی ہے اور چیزیں خریدنے میں بطور قیمت روپیہ کی زیادہ مقدار ادا کرنے میں اس کو کوئی بار محسوس نہیں ہوتا۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک کی یہی حالت ہے۔ وہاں چیزوں کی نرخ بھی اعلیٰ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قحط پڑ رہا ہے اور پھر لوگ بکثرت اُن کو خرید بھی سکتے ہیں گویا کہ وہ ارزاں ہیں اس کے برعکس پس ماندہ ممالک میں چیزوں کے نرخ مقابلتہً ادنیٰ بھی ہوں تو لوگ اُن سے محروم رہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی رندگی ہم کو اپنے قدرِ زر کے معیار سے نہایت گراں بار نظر آتی ہے لیکن ان ممالک کے باشندے اس کو سبک محسوس کرتے ہیں وجہ وہی ہے کہ اُن کی نظر میں زر کی قدر کم ہے اور کم ہونے کا باعث زر کی کثرت ہے۔

یہ واقعہ کہ زر کی مقدار گھٹنے بڑھنے سے اس کی قدر میں بیشی کمی ہوتی ہے اصطلاحاً **مسئلہ مقدارِ زر** سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قدرِ زر کا گھٹنا بڑھنا تو عام مشاہدہ ہے لیکن زر چونکہ معیارِ قدر مانا جاتا ہے۔ زر کی قدر معین خیال کر کے لوگ ہر ایک تبدیلی چیزوں کی قیمت سے منسوب کر دیتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک درخت گز بھر بلند ہے اور کچھ عرصہ بعد ناپ میں وہ دوگز نکلے تو اس طرح کی دو صورت ہو سکتی ہیں یا تو گز اپنی سابق حالت پر قائم ہے۔ درخت کی بلندی دوگنی ہو گئی یا درخت کی بلندی تو اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی صرف گز سکڑ کر نصف لمبا رہ گیا اور جو بلندی پہلے ایک گز معلوم ہوتی تھی اب دوگز معلوم ہونے لگے۔ ایسے ہی فرض کرو کسی شخص کا وزن من بھر ہے اب اگر من تو وہی چالیس سیر وزنی رہے لیکن اس شخص کا وزن دو من نکلے تو یقیناً

حصہ چہارم
باب نہم

اس کے وزن میں یک چند اضافہ ہو گیا ہو گا لیکن اگر خود من گھٹکر صرف ۲۰ سیر وزنی ہو جائے تو بھی وہ شخص ۲ من وزنی معلوم ہو گا اگرچہ اس کے وزن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا صرف معیار وزن گھٹ گیا۔ لمبائی اور وزن کے معیار تو معین ہیں گز ہمیشہ ۳۶ انچ لانبا ہو گا اور من ۴۰ سیر وزنی۔ لیکن اگر یہ ممکن ہو کہ گز کبھی پھیل کر ۴۰ انچ ہو جائے اور کبھی سکڑ کر صرف ۳۰ انچ رہ جائے تو پھر چیزوں کی لمبائی میں جو فرق نمودار ہو اس کا اصلی باعث دریافت کرنا کس قدر دشوار ہو گا معیار قدر یعنی زر کا بعینہ یہی حال ہے ارزانی یا گرانی کبھی تو قیمت اشیا کے تغیر و تبدل سے نمودار ہوتی ہے اور کبھی محض قدر زر کے گھٹنے بڑھنے سے۔ مثلاً کسی چیز کی رسد طلب سے بہت گھٹ بڑھ جاوے تو وہ علی الترتیب گراں اور ارزاں فروخت ہو گی لیکن کبھی زر کی کثرت قلت سے خود زر کی قدر میں کمی بیشی ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چیزیں ارزاں و گراں ہو گئیں۔ چونکہ قیمت اشیا اور قدر زر میں نسبت معکوس ہے کسی ایک کی تبدیلی سے دوسرے میں بھی تبدیلی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن یہ دریافت کرنا کہ تبدیلی درحقیقت کس جانب سے نمودار ہوئی دشوار کام ہے۔ زر چونکہ معیار ہے اور معیار ہمیشہ مقرر ہوتا ہے اضافہ و تخفیف قیمت کو لوگ عموماً چیزوں کی قلت و کثرت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں حالانکہ خود اس معیار میں بھی ربڑ کی طرح گھٹنے بڑھنے کی خاصیت موجود ہے خود اس کی قلت و کثرت سے جو اس کی قدر میں بیشی کمی پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ سے چیزیں ارزاں اور گراں فروخت ہوتی نظر آتی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ارزانی و گرانی کا باعث کبھی قیمت اشیا میں مضمر ہوتا ہے اور کبھی قدر زر میں۔

زرعی پیداوار ضرور قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے اور مصنوعات قانون تکثیر حاصل کی پیروی کرتی ہیں۔ کبھی تو یہ چیزیں بوجہ قلت کے بہت بیش قیمت ہو جاتی ہیں۔ مثلاً غلہ یا روئی کی فصل ماری جاوے اور ان کا قحط پڑے یا جنگ کی وجہ سے کسی خاص

حصہ چہارم
باب نہم

چیز کی طلب بہت بڑھ جائے یا مصنوعات کی تیاری رک جائے۔ چنانچہ آج کل روئی۔ چمڑے اور رنگ کی علی الترتیب یہی حالت نظر آتی ہے اور کبھی چیزوں کی رسد میں کوئی تخفیف نہیں ہوتی۔ اور نہ طلب میں کوئی خاص اضافہ اور پھر بھی عام طور پر اُن کی قیمتیں چڑھنے لگتی ہیں اور لطف یہ کہ لوگ اُن کو ایسی ہی سہولت سے خریدتے رہتے ہیں کہ گویا وہ ارزاں ہیں یہ علامت کثرت زر کی ہے اور زر کی قدر گھٹنے سے چیزوں کی گرانی کا دھوکا ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں یہی حالت پھیلی ہوئی ہے۔

اگر غور کرو تو زر کی مقدار بڑھنے سے اس کی قدر گھٹنے کا واقعہ قانون طلب و رسد کا قدرتی نتیجہ ہے۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ لیکن اس کو سنکر لوگ اس وجہ سے چونکتے ہیں کہ وہ زر کو معیار قدر جانتے ہیں اور معیار ہمیشہ مقرر ہوتا ہے مگر زر ایک عجیب معیار ہے کہ خود بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اوّل اوّل اس واقع کے سمجھنے میں لوگوں کو ہر طرح کے الجھن اور شکوک محسوس ہوئے۔ لیکن جب زر کو بھی بجائے معیار کے ایک معمولی چیز کی حیثیت سے دیکھا تو اس کی قدر کو بھی قانون طلب و رسد کا پابند پایا اور مزید براں تجربہ سے ثابت ہوا کہ جب کسی ملک کے زر کی مقدار بڑھی۔ اس کی قدر میں کم و بیش تخفیف بشکل عام اضافۂ قیمت ضرور نمودار ہوئی چنانچہ اصولاً اور عملاً مقدار زر کا مسئلہ تحقیق ہو گیا۔ اور اب وہ مسلم شمار ہوتا ہے۔

چاندی سونے
کی قدر و قیمت

(۵) چاندی اور بالخصوص سونے کی قدر و قیمت بہت مستقل مانی جاتی ہے۔ چنانچہ ان دہاتوں کو بطور زر استعمال کرنے کا ایک خاص سبب اُن کی ثبات قدر و قیمت ہے۔ لیکن غور اور مشاہدہ سے واضح ہوگا کہ اگرچہ بمقابلہ اور چیزوں کے اُن کی قدر و قیمت میں کمتر تغیر ہوتا ہے تاہم کامل ثبات اُن کو بھی میسر نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بیسیوں صدی سے دنیا میں چاندی سونا فراہم ہوتا چلا آتا ہے۔ یہ دونوں دہاتیں بیحد دیرپا ہیں جس کا

نتیجہ یہ ہی کہ اُن کی مقدار کثیر جمع ہو چکی ہی اور ہر سال کانوں سے جو نئی مقدار نکلتی ہی وہ موجودہ ذخیرہ کا نہایت قلیل جزو ہوتی ہی زیادہ سے زیادہ دو تین فیصدی پس سالانہ رسد کا اُن کی مجموعی مقدار پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن مثل مشہور ہی قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔ دس بیس سال کے عرصہ میں ان سالانہ اضافوں کی مجموعی مقدار اچھی خاصی ہو جاتی ہی۔ ساتھ ہی ساتھ طلب بھی بڑھی ضروری ہی۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ رسد کا پلہ پھر بھی بھاری رہتا ہی۔ چنانچہ قانون رسد و طلب کے مطابق ان دونوں دہاتوں کی قدر قیمت میں بھی تخفیف ہو رہی ہی مگر کم و بیش تدریج چنانچہ چاندی کی آج جو قدر ہی امریکہ دریافت ہونے کے وقت وہ اس کی چھہ گنی تھی اور انقلاب فرانس تک وہ سہ گنی رہی لیکن ایک طرف تو امریکہ اور آسٹریلیا کی نئی کانوں سے اس کی بڑی بڑی مقدار نکلنی شروع ہوئی اور دوسری طرف اکثر ممالک نے اس کو بطور زر قانونی استعمال کرنا ترک کر دیا گویا اس کی مقدار بڑہی اور طلب میں خاص کمی ہوئی۔ نتیجہ یہ ہی کہ اس کی قدر میں عرصہ سے مسلسل تخفیف جاری ہی۔ چاندی کی طرح سونے کی بھی امریکہ اور آسٹریلیا میں نئی نئی کانیں نکلیں۔ سونے کی مقدار میں بھی اضافہ ہوا لیکن نہ اتنا قدر جتنا کہ چاندی کی ہیں۔ دوم یہ کہ چاندی ترک کرکے اکثر ممالک نے سونا بطور زر قانونی رائج کیا گویا سونے کی مقدار بڑہی لیکن چاندی سے کم اور ساتھ ہی سونے کی طلب میں بھی خاص اضافہ ہوا۔ پس قدر تو سونے کی بھی گھٹی لیکن نہ اس قدر جتنی کہ چاندی کی پندرہ بیس برس کے اندر اوسطاً دس بارہ فیصدی تخفیف ہوتی رہتی ہی۔

ترقی یافتہ ممالک میں زر مستند بطور زر قانونی رائج ہی۔ یعنی وہاں کے زر کی قدر فلزاتی اور قدر قانونی برابر ہوتی ہی۔ پس ایسے ممالک میں زر اور طلا کا بہ شرح معین مبادلہ ہوتا رہتا ہی مثلاً انگلستان میں قانون ہی کہ جو شخص ایک آونس سونا دار الضرب

میں داخل کرے اس کو مبادلہ میں ہمیشہ ۳ پونڈ ۱۷ شلنگ ۱۰½ پینس ملیں گے اس سے بہت سوں کو مغالطہ ہوتا ہی کہ سونے کی قیمت مقرر ہی اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی اور ایک معنی میں یہ خیال صحیح بھی ہی لیکن اس تقرر قیمت کا درحقیقت مفہوم یہ ہی کہ سکوں میں بحساب ۳ پونڈ ۱۷ شلنگ ۱۰½ پینس فی آونس سونا صرف ہوتا ہی پس اگر کوئی چاہی تو سونا دیکر اس کے ہمقدر سکے لے لے ۳ پونڈ ۱۷ شلنگ ۱۰½ پینس کو ایک آونس سونے کی قیمت کے بجائے اس کے سکے سمجھنا زیادہ قرین حقیقت ہوگا۔ پس جہاں زر مستند رائج ہی وہاں سونے اور سکے میں بہت قریبی تعلق ہی جو کوئی چاہی اپنے سونے کے ہم وزن سکے تیار کرا سکتا ہی مصارف سکہ زنی برائے نام ہوں تو ہوں اس صورت میں سونے اور زر کی قدر ایک سطح پر رہتی ہی اور مقدار طلا بڑھنے کا زر کی قدر پر براہ راست وہی اثر پڑتا ہی جو مقدار زر بڑھنے کا اور اس کی وجہ وہی سونے کے ہمقدر سکے ہونے کی سہولت ہی۔

سونے کے صرف سکے ہی نہیں ڈھلتے بلکہ اس سے بیشمار کام لیے جاتے ہیں جو حسب ذیل چاروں مدوں میں ترتیب پا سکتے ہیں۔ دفینہ۔ زیور و سامان سکے اور بنکوں کا سرمایہ محفوظ سونے کے پہلے دو مصرف اس کی قدر کو گھٹنے سے روکتے ہیں لیکن سونا سکے بنکر اکثر اپنی اور زر کی قدر کم کر دیتا ہی اور سرمایہ محفوظ میں پہنچکر تو وہ زر کی مقدار اسقدر بڑھا دیتا ہی کہ دونوں کی قدر میں کم و بیش تخفیف ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

پس ماندہ ممالک میں اب تک سونے کی بڑی بڑی مقداریں بطور دفینہ رکھنے کا رواج ہی جس کے وجوہات کی بحث سے ہم اسوقت معذور ہیں یہاں صرف یہ جتانا مقصود ہی کہ اس رواج سے اضافہ رسد کا اثر ضعیف ہو جاتا ہی۔ سونے کی مقدار جو کان سے نکلتی ہی وہ پھر زمین میں دفن کر دی جاتی ہی اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا گویا کہ

حصہ چہارم
باب ہم

وہ مقدار پیدا ہی نہیں ہوئی۔ البتہ جب کبھی سونا دفینوں سے نکلے گا تو اس کا نتیجہ ضرور بشکل اضافہ رسد نظر آئے گا سونے کا زیور اور سامان بھی بکثرت تیار ہوتا ہے اس کا اثر اضافہ طلب ہے۔ جو کہ سونے کی قدر گھٹنے سے روکتا ہے۔ مشرقی ممالک میں خاص طور سے سونا بطور دفینہ و زیور استعمال ہوتا ہے یورپ اور امریکہ والے والے سونے کو دفینوں میں تو بیکار نہیں ڈالتے لیکن اس سے زیور اور سامان ضرور تیار کرتے ہیں ان دونوں استعمالوں نے رسد گھٹا کر اور طلب بڑھا کر سونے کی قدر بہت کچھ سنبھال رکھی ہے اگر سونے سے یہ کام نہ لیے جاتے تو اس کی قدر بہت زیادہ گھٹ چکی ہوتی۔ جوں ہی امریکہ میں نئی کانوں سے سونا چاندی نکلنا شروع ہوا کیپ آف گوڈ ہوپ ہو کر یورپ امریکہ سے ہندوستان آنے کا راستہ دریافت ہوا۔ ان دھاتوں کی ہندوستان میں بہت مانگ تھی اور ان سے بیشتر یہی دو کام لیے جاتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ پس مدتوں یورپ والے امریکہ سے یہ دھاتیں ہندوستان بھیجتے اور ہندوستان کی پیداوار معاوضہ میں لیتے رہے اگر نئے سونے چاندی کی ایک مقدار کثیر ہندوستان یوں جذب نہ کرتا تو یورپ و امریکہ میں اس کی قدر خدا جانے کسقدر اور کم ہو جاتی طلا جذب کرنے کی خاصیت اب تک ہندوستان میں نمایاں ہے تخمینہ کیا گیا ہے کہ ۱۸۹۸ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان گزشتہ ۱۴ برس کے اندر ہندوستان نے بشکل دفینہ و زر و سامان تقریباً دو ارب روپیہ قیمتی سونا جذب کیا اور یہ مقدار اسی عرصہ میں نکلے ہوئے سونے کی مجموعی مقدار کی ۱۵ فیصدی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پیداوار کا کس قدر حصہ اس طرح پر کل ممالک میں جذب ہو جاتا ہوگا۔ تخمینہ کیا گیا کہ ۱۹۰۸ء میں سالانہ پیداوار کا ایک تہائی سونا صرف زیور اور سامان میں صرف ہوا اور دفینے جدا رہے ایک اور تخمینہ سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیان گزشتہ ۲۰ سال میں

امریکہ - یورپ اور ہندوستان میں جس قدر سونا بڑھا اس میں سے ⅗ دفینوں اور زیور میں جذب ہوگیا - اور باقی سکوں اور سرمایہ محفوظ میں کام آیا -

مقصد چہارم
باب نہم

رسد و طلب زر

(۶) سونا صرف ہونے کی دو مدیں یعنی دفینہ اور زیور و سامان کی رسد کا اثر ضعیف کرکے اور طلب بڑھا کر اس کی قدر میں تخفیف ہونے سے روکتی ہیں - لیکن اس کے باقی دو مصرف یعنی زر اور سرمایہ محفوظ کا سونے اور خود زر کی قدر پر کیا اثر پڑتا ہے اس کی اب ہم تشریح کرتے ہیں - کچھ لوگ جن کو کاروبار چلانے کے واسطے زر درکار ہے سونے کے سکے سرکاری دارالضرب میں ڈھلوا لیتے ہیں - یعنی سونا داخل کرکے بشرح معین سکے لے لیتے ہیں - مثلاً انگلستان میں ایک آونس سونے کے ۳ پونڈ ۱۷ شلنگ ۱۰½ پنس ملتے ہیں - جب کاروبار کی گرم بازاری ہوتی ہے خرید و فروخت کے واسطے زیادہ زر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور سونے کی ایک مقدار زر کی شکل اختیار کرلیتی ہے -

مقدار زر بڑھنے کی ایک شکل تو اوپر بیان ہوئی - لیکن جب سے بنک قائم ہوئے اور نوٹ اور چک نے رواج پایا اضافۂ زر میں بیحد سہولت ہوگئی صرف بقدر ۲۰ - ۲۰ فیصدی سونا بطور سرمایہ محفوظ رکھا اور نوٹ یا چک جاری کر دئیے اور ان کے اجرا کا وہی اثر پڑتا ہے جو خود زر فلزاتی کے بڑھنے کا اس طرح پر سونے سے دو چند سہ چند مقدار زر کا کام لے لیا جاتا ہے - اس واقعہ کی ہم اس سے قبل تشریح کرچکے ہیں جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں - نہایت معتبر تخمینوں سے پتہ چلتا ہے کہ محض اعتبار نے زر کی مقدار سہ چند چہار چند بڑھا رکھی ہے - یعنی سرمایہ محفوظ کا ایک روپیہ تین چار کا کام دے رہا ہے - اور تخمینہ کیا گیا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں ۱۳ ارب روپیہ قیمتی سونا یورپ اور امریکہ کے بنکوں میں بطور سرمایہ محفوظ موجود تھا اس سے

حصہ چہارم باب ہم

اضافہ زر کا اندازہ کرنا دشوار نہیں - اگر چیک اور نوٹ کے ذریعہ سے زر کی مقدار نہ بڑھائی جاتی تو غالباً زر فلزاتی موجودہ کار و بار چلانے کے واسطے ناکافی ثابت ہوتا اور باوجود ہزار اضافہ کے اگر اس کی قلت رہتی ہے اور قدر میں اضافہ ہوتا تو عجب نہ تھا -

تخمینہ کیا گیا ہے کہ سنہ ۱۹ء میں صرف انگلستان - فرانس جرمنی امریکہ اور ہندوستان کے حساب گھروں میں تقریباً سوا سات کھرب روپیہ کا لین دین طے ہوا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کاروبار کس وسیع پیمانہ پر چل رہا ہے - بنک کے بیان میں واضح ہو چکا ہے کہ حساب گھروں میں ایک پیسہ دا اور وصول کرنے کی نوبت نہیں آتی سب داد و ستد چیک کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے - اب غور کرنا چاہئے کہ محض اعتبار کی بنا پر بنک تھوڑے سے سرمایہ محفوظ سے کیسے بڑے کام لے رہے ہیں اور اگر یہ طریق اختیار نہ کیا جاتا تو زر فلزاتی کی اس قدر زیادہ مقدار درکار ہوتی کہ اس کا مہیا ہونا دشوار تھا اور اس کی کثرت سے قدر گھٹنے کا تو ذکر ہی کیا ہے اور جب زر کی کافی مقدار دستیاب ہوتی تو کاروبار کو موجودہ عروج میسر آنا محال تھا اور بفرض محال اگر کافی مقدار موجود بھی ہوتی تو اس قدر کثیر مقدار میں زر فلزاتی کا استعمال نہایت تکلیف دہ بلکہ کاروبار میں ہارج ثابت ہوتا - اب اس معاشی مقولہ کا مفہوم سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ کاروبار کی موجودہ ترقی کا راز اعتبار میں مضمر ہے -

اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ زر کی مقدار بشکل سکہ اس قدر بڑھنی محال تھی کہ بوجہ کثرت اس کی قدر گھٹ سکتی - صرف جدید طریق اعتبار نے نوٹ اور چیک کے ذریعہ سے اضافہ زر کی گنجائش اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ باوجود جذب طلا و ترقی کاروبار زر کی قدر میں بوجہ کثرت بتدریج تخفیف ہو رہی ہے -

مذکورہ بالا دو صورتوں کے علاوہ اضافہ زر کی ایک صورت اور بھی ہے زر جس قدر جلد جلد دست بدست گھومے گا - ایسا معلوم ہوگا کہ گویا اس کی مقدار زیادہ ہے مثلاً

کوئی ریل گاڑی دو اسٹیشنوں کے درمیان آتے جاتے دن میں دو مرتبہ گذرے۔ اب اگر اس کی رفتار دوگنی کر دیجائے اور دو مرتبہ کے بجائے دن میں وہ چار مرتبہ گزرنے لگے تو نتیجہ وہی نکلے گا کہ گویا ایک کے بجائے دو ریل گاڑی چلتی ہیں۔ بعینہ یہی حال زر کا سمجھنا چاہئے کاروبار میں زر کی گردش جس قدر تیز ہوگی اسی قدر وہ زیادہ مقدار کا کام سر انجام دے گا اس کے برعکس اگر زر مدتوں جابجا پڑا رہے اور اس سے کاروبار میں کام نہ لیا جائے تو اس کا وہی اثر محسوس ہوگا جیسا کہ مقدار گھٹنے کا۔ زر کی جلد جلد گردش کرنے کی حالت اصطلاحاً کارکردگی زر سے تعبیر کی جاتی ہے زر میں جس قدر کارکردگی اعلیٰ ہوگی اس سے اُسی قدر بڑی مقدار کا کام نکلے گا گویا کارکردگی زر سے وہی نتیجہ نکلتا ہے جو زر کی مقدار بڑھانے سے۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ اضافہ زر کی تین صورتیں ہیں سونے کی نئی نئی مقدار زر کی شکل میں لائی جائے۔ اعتبار کی بنا پر نوٹ اور چیک کے ذریعہ سے زر کی مقدار بڑھائی جائے اور زر کی کارکردگی کو ترقی دیکر وہی نتیجہ حاصل کیا جائے جو زر کی مقدار بڑھانے سے حاصل ہوتا۔

رسد زر کی تین صورتیں تو معلوم ہوگئیں اب طلب زر کی مدوں کو لیجئے زر کا پہلا کام آلہ مبادلہ ہے۔ یعنی اس کی وساطت سے خرید فروخت ہوتی ہے۔ پس کسی ملک میں جس قدر آبادی زیادہ ہوگی اور جس قدر کاروبار بکثرت جاری ہوگا اُسی قدر زر کی زیادہ مقدار درکار ہوگی۔ اب تک کوئی ایسا اصول اور طریق دریافت نہ ہو سکا کہ کسی ملک کے واسطے زر کی جس قدر مقدار مناسب ہو ٹھیک اندازہ کر کے اس کو مقرر کیا جا سکے جب خرید و فروخت کے واسطے زر کی موجودہ مقدار ناکافی ثابت ہوتی ہے تو لوگ اس کی مقدار بڑھانی شروع کر دیتے ہیں اور خصوصاً نوٹ اور چیک کے ذریعہ سے بوجہ سہولت

حصہ چہارم
باب نہم

دوری صفت کبھی کبھی زر کی مقدار حد اعتدال سے بہت زیادہ بڑھا دی جاتی ہے اسی اندیشہ سے اجرائے زر کا عذی پر خاص قانونی نگرانی رکھی جاتی ہے زر خزینۃ القدر کا بھی کام دیتا ہے یعنی لوگ اس کو بطور اندوختہ محفوظ رکھتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت کام آئے ایسا کل زر بقدر اپنے مجموعہ کے موجودہ زر کی مقدار گھٹا دیتا ہے - یعنی جب تک وہ کام میں نہ لایا جائے زر کی قدر پر اس کی موجودگی کا کوئی اثر نہیں پڑتا - مثلاً ہندوستان میں کل پچاس کروڑ روپیہ موجود ہو - جس میں سے ۲۰ کروڑ مدفون ہو اور تیس کروڑ کاروبار میں چلتا ہو - روپیہ کی قدر پر اس تیس کروڑ کا اثر پڑے گا - باقی بیس کروڑ جب تک مدفون ہے بلحاظ اس اثر کے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے البتہ جب وہ دفینوں سے نکلے گا تو صرور قدر روپیہ پر اپنا اثر ڈالے گا - مشرقی ممالک میں اب تک زر سے خاص طور پر خزینۃ القدر کا کام لیا جاتا ہے - خود ہندوستان میں زر کی مقدار کثیر دفینوں میں مقید ہے اور ہوتی رہتی ہے البتہ اب کچھ عرصہ سے لوگوں میں شوق پیدا ہوا ہے کہ اپنے اندوختوں کو بنک میں داخل کریں یا بطور خرید حصص کاروبار میں لگا دیں جوں جوں زر دفینوں سے باہر آئے گا اس کی مقدار بڑھے گی اور قدر میں کم و بیش تخفیف ہوگی -

زر کی رسد و طلب کی مختصر تشریح کے بعد اب یہ جتانا مقصود ہے کہ زر کی قدر بھی مثل اور چیزوں کی، قدر کے رسد و طلب کے باہمی تعلق سے قرار پاتی ہے - یہ ضرور نہیں کہ ہر اضافۂ رسد کے بعد زر کی قدر گھٹے - اگر رسد کے ساتھ ساتھ طلب میں بھی برابر یا زیادہ اضافہ ہو تو گھٹنے کے بجائے یا تو قدر برقرار رہے گی یا الٹی اور بڑھ جائے گی اس کے برعکس اگر رسد برقرار رہے لیکن طلب میں کسی وجہ سے کمی آجائے تب بھی قدر میں تخفیف ہو جائے گی - چنانچہ زر کی تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں کہ کاروبار کے عروج کے ساتھ زر کی مقدار بھی بڑھی لیکن اس کی قدر میں کوئی کمی

کمی نہیں آئی بلکہ الٹا اضافہ ہوا لیکن جب کاروبار میں تنزل ہوا تو خود بخود بغیر مزید اضافہ کے موجودہ زر کی قدر گھٹنے لگی جیساکہ اس سے قبل بھی بتایا جاچکا ہے اگر صرف زر فلزاتی سے کام لیا جاتا تو موجودہ کاروبار چلانے کے وہ کافی نہو سکتا اور باوجود ہزار اضافہ پھر بھی زر کی قدر بڑھی ہی رہتی۔ لیکن خدا بھلا کرے زر کاغذی کا کہ اس نے اضافۂ زر کی بہت گنجائش پیدا کردی چونکہ زر کاغذی کا اجرا سہل بھی ہے اور مفید بھی لوگ اس کی مقدار بڑھانے میں حد اعتدال سے گزر جاتے تھے۔ لیکن اب ایسی قانونی پابندیاں عائد کردی گئی ہیں کہ اس کا اجرا مناسب حدود کے اندر اندر رہتا ہے پھر بھی رسد و طلب زر میں بالعموم ایسی نسبت رکھی جاتی ہے کہ رسد طلب کا نہ صرف ساتھ دے بلکہ کچھ پیش پیش رہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زر کی قدر میں مسلسل مگر بتدریج تخفیف ہو رہی ہے اور بحیثیت مجموعی ایسی تخفیف ملک کے حق میں مفید ہے چنانچہ اس واقعہ سے ہم ابھی آگے چلکر بحث کریں گے۔

اب تک ہم نے زر طلائی سے بحث کی اور زر قانونی کو زر مستند مانا۔ یورپ اور امریکہ میں تو زر کی حالت انہی مفروضات کے مطابق ہے لیکن ایشیا کے ممالک میں ابتک زر نقرئی اور وہ بھی زر مستند نہیں بلکہ زر وضعی بطور زر قانونی رائج ہے خود ہندوستان کا زر قانونی چاندی کا روپیہ ہے جو کہ سراسر زر وضعی ہے اس کی قدر فلزاتی قدر قانونی سے یک ثلث گھٹی رہتی ہے یا یوں کہئے کہ قدر فلزاتی سے قدر قانونی یک نصف زیادہ رہتی ہے جیسے کہ انگلستان کا زر مستند بشرح معین سونے کے مبادلہ میں مل سکتا ہے۔ یعنی ایک اونس کے بدلے میں ۳ پونڈ ۱۷ شلنگ ۱۰½ پنس ہر وقت دارالضرب سے لیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں چاندی اور روپیہ کا بشرح معین مبادلہ نہیں ہوسکتا اور اس کی وجہ یہی روپیہ کا زر وضعی ہونا ہے روپیوں کے حساب سے بھی چاندی کی قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ چاندی عوام کے ہاتھوں زیور اور سامان میں کام آتی ہے۔ روپیہ سے

حصہ چہارم
باب نہم

آن کا براہ راست کوئی تعلق نہیں عوام اپنی چاندی کے روپیہ نہیں ڈھلوا سکتے۔ روپیہ کا اجرا
قطعاً سرکار کے ہاتھ میں ہے وہ جب ضرورت دیکھتی ہے نئے روپیے ڈھالکر دیدیتی ہے جب
چاہتی ہے نہیں دیتی۔ زرِ ستند کے اضافہ میں جس قدر اختیار عوام کو دیگر ممالک میں ہے
زرِ وضعی کے اضافہ میں ہندوستان میں نہیں۔ اُن ممالک میں سکہ سازی آزاد ہے اور ہمارے
ہاں مخصوص۔ اگر ہندوستان میں بھی سکہ سازی آزاد کردی جائے تو کل لوگ اپنی اپنی چاندی
کے روپیہ ڈھلوالیں حتیٰ کہ روپیوں کی قدر اس قدر گھٹے کہ قدرِ قانونی اور قدرِ بلذاتی میں کوئی فرق
نہ ہو اگرچہ زرِ بلذاتی کا اضافہ بالکل سرکار کے اختیار میں ہے اور زرِ وضعی کے ساتھ ایسا اہتمام لابد
ہے لیکن نوٹ و چیک کے ذریعہ سے یہاں بھی زر کی مقدار میں معقول اضافہ ہو رہا ہے اور روپیہ
کی قدر میں تخفیف ہوتی جاتی ہے۔ ہندوستان میں جو گرانی پھیل رہی ہے اس کے اسباب و
نتائج سے ہم آگے چلکر جداگانہ بحث کریں گے یہاں صرف ہندوستان کے زر کی مثال سے
چاندی اور زرِ نقرئی کا تعلق دکھانا مقصود تھا۔ چین کا زرِ قانونی بھی نقرئی ہے اور وہ بھی غالباً
زرِ وضعی ہے یورپ اور امریکہ میں زرِ نقرئی محض بطور محدود زرِ قانونی رائج ہے۔

اضافۂ مقدار زر کے نتائج

(۶) یہ تو تحقیق ہو گیا کہ شے اور چیزوں کی قدر کے زر کی قدر بھی قانون رسد و طلب کے تابع ہے۔
رسد و طلب زر کی مدیں بھی مختصراً واضح کردی گئیں نیز معلوم ہوا کہ زر کی رسد بالعموم طلب سے
کچھ پیش پیش رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زر کی قدر میں عرصہ سے مسلسل مگر تدریجی تخفیف ہو
رہی ہے اور بحیثیت مجموعی چیزوں کی قیمت بڑھتی معلوم ہوتی ہے کہ گویا گرانی پھیل رہی ہے۔
اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ زر کی مقدار اس قدر بڑھانا کہ اس کی قدر گھٹنے لگے اور چیزوں کی
قیمت چڑھ جائے۔ آیا ملک کے حق میں مضر ہے یا مفید۔ بظاہر تو یہ طریق سراسر عبث ہے
بلکہ خلاف عقل معلوم ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ روپیہ کی مقدار دوگنی کرنے سے اس کی قدر صرف
نصف رہ جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ جو کام پہلے ایک روپیہ سے نکلتا تھا اب دو سے

حصہ چہارم
باب ہشتم

نکلے گا اور سوائے اس کے کہ لوگوں کو اتنے ہی کاروبار میں زر کی دوگنی مقدار برتنی پڑے اور کیا فائدہ ہوگا - بلکہ دو چند زر کی گراں باری سے لوگوں کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچے گی - بیشک اگر زر کی طلب اس قدر محدود اور معین ہو کہ مقدار دوگنی کر دینے سے زر کی قدر نصف رہ جائے تو ایسا اضافہ فضول بلکہ مضر ہوگا - لیکن اصلی حالت اس مفروضہ کے خلاف ہے - ہر ترقی یافتہ ملک میں کچھ کاروبار روپیہ دستیاب ہونے کی وجہ سے ہم یاں پڑے رہتے ہیں لیکن جوں ہی روپیہ کی افراط ہوتی ہے وہ اسی طرح پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے کہ بارش ہونے سے خشک درخت پھوٹ نکلتے ہیں - ایسا بہت کم ممکن ہے کہ ترقی کاروبار کی گنجائش بالکل ختم ہو جائے اور زر کی طلب میں اضافہ قطعاً ممکن نہ ہو کثیر واقعہ یہ ہوتا ہے کہ زر کی جدید مقدار میں سے ایک بڑا حصہ تو نئے نئے کاروبار جاری کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور کچھ باقی رہ کر تخفیف قدر کا باعث ہوتا ہے اس کی مثال بعینہ یوں سمجھنی چاہئے کہ بارش کا زیادہ تر پانی تو زمین میں جذب ہو کر نباتات اگاتا ہے اور کچھ سطح زمین پر بہتا پھرتا ہے - لیکن اگر زر کی مقدار بیحد و حساب بڑھا دی جائے تو اس کی کثرت سے کاروبار کا وہی حشر ہوگا جو پانی کے سیلاب سے زراعت کا ہوتا ہے - پس کاروبار کی حالت دیکھکر اس کے مطابق زر کی مقدار بڑھائی چاہئے اور بڑھائی جاتی ہے - زر میسر نہ آنے کی وجہ سے جو جو کاروبار رکے پڑے تھے وہ بھی جاری ہو جاتے ہیں اور کثیر قدر زر میں بھی تھوڑی بہت تخفیف نمودار ہو جاتی ہے - اگر اضافہ زر میں بہت زیادہ احتیاط برتی جاوے تو شاید قدر میں تخفیف نہ ہو یا بہت کم ہو لیکن جب نوٹ اور چک نے زر کا اضافہ نہایت سہل بنا دیا ہے زر کی رسد طلب سے دو قدم آگے چلتی ہے اور قدر میں تخفیف ہوتی رہتی ہے مگر بتدریج نہ کہ بہت زیادہ تاکہ غیر معمولی گرانی سے عوام میں بے اطمینانی اور کاروبار میں ابتری نہ پھیلے - حاصل کلام یہ کہ زر کی مقدار بڑھنے سے ترقی یافتہ ممالک میں بالعموم دو اثر نمودار ہوتے ہیں - [illegible] کاروبار پھیلتے

کاروبار ترقی پاتے ہیں اور قدرِ زر میں معتدل تخفیف ہو جاتی ہی۔ خود قدر کی تخفیف بشرطیکہ حدِ اعتدال سے تجاوز نکرے اور اس قدر زیادہ نہو کہ ناقابل برداشت بنکر کاروبار کو درہم برہم کر دے معاشی ترقیات کی معاون ہی اور بحیثیت مجموعی عوام کے حق میں مفید۔ چنانچہ اب ہم اسی واقعہ کی تشریح کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص کو ایسے چار روپیہ دیے جاویں جن کی قدر گھٹ کر سابق ۲ روپیہ کے برابر رہ گئی ہو اور پھر ایک ایسا روپیہ دیا جاوے کہ جس کی قدر بڑھ کر سابق ۲ روپیہ کے برابر رہ گئی ہو تو اگرچہ یہ ۴ روپیہ اور ایک روپیہ ہمقدر ہوں گے یعنی ان کے مبادلہ میں برابر برابر چیزیں مل سکے گی اور درحقیقت لوگوں کو زر کی قدر سے غرض ہی نہ کہ مقدار سے لیکن یہ بات یقینی ہی کہ ۴ روپیہ ملنے سے دل کو جو خوشی حاصل ہوگی ایک روپیہ ملنے سے نہیں ہو سکتی۔ یہ کچھہ طبیعت کا خاصہ معلوم ہوتا ہی کہ زر ملتے وقت قدر کا تو کچھہ خیال نہیں ہتا۔ صرف مقدار کا فوری اثر محسوس ہوتا ہی۔ سکوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہاتھ آتی ہی پانے والا اسی قدر اپنے کو دولت مند خیال کرنے لگتا ہی۔ اگر چیزیں گراں ہوں لیکن مزدور کو اجرت میں زر کی زیادہ مقدار ملے اور چیزیں ارزاں ہوں لیکن اجرت کی مقدار کم ہو اور دونوں حالتوں میں اجرت صحیحہ برابر ہو تو اجرت متعارف کی کمی بیشی کا مزدور کی ہمت اور کوشش پر ضرور اثر پڑے گا اور مقابلتہً بحالت اول وہ زیادہ خوش و خرم نظر آئے گا اگرچہ زر کی قدر کم ہی لیکن اس کی مقدار کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو زیادہ آمدنی والا خیال کرے گا اور اس کے برعکس بحالت دوم اس کو مقدار کی کمی کی وجہ سے آمدنی کم نظر آئے گی حالانکہ زیادتی قدر کی وجہ سے اس کی مالی حالت میں کوئی فرق نہیں۔ اگرچہ قدر نظر انداز کر کے مقدار زر سے آمدنی کا تخمینہ کرنا محض مغالطہ ہی لیکن اس کا اثر عوام کی ہمت اور کوشش پر اس قدر گہرا پڑتا ہی کہ اس کا لحاظ کرنا اشد ضروری ہی۔ جب زر کی قدر گھٹتی ہی تو اول قیمت

اور کچھہ کچھہ عرصہ بعد اجرت - لگان - کرایہ ان سب مدوں میں اضافہ ہمودار ہونے لگتا ہے
اور ان کے مالک خیال کرتے ہیں کہ ان کی آمدنی بڑھ رہی ہے اور وہ زیادہ دولت مند ہوتے
جاتے ہیں - ہر طرف اطمینان اور کاروباری گرم جوشی نظر آنے لگتی ہے - اضافۂ قیمت سے
کارخانہ داروں اور تاجروں میں کاروبار کا جوش پھیلتا ہے - زیادتی اجرت متعارف سے
مزدوروں کے دل بڑہتے ہیں - بیشی لگان سے زمیندار یا کاشتکار بہحال ہوتے ہیں ہمرما
کہ قدر گھٹنے کی حالت میں مقدار زر کے اضافہ کو اضافہ آمدنی شمار کرنا سراسر دہوکا ہے -
لیکن یہ دہوکا عام طبیعتوں میں اس قدر راسخ ہے اور کاروباری حالت پر اس کا اس قدر
گہرا اثر پڑتا ہے کہ اس کا پیدا ہونا ملک کے حق میں مفید ہے - چنانچہ تجربہ سے بھی ثابت ہوچکا ہے کہ
خواہ قدر نہ بڑھے لیکن صرف مقدار زر بڑہنے سے لوگ اپنی آمدنی میں اضافہ خیال کرنے لگتے ہیں
اور خوشی خوشی کاروبار میں زیادہ توجہ اور تندہی سے مصروف ہوجاتے ہیں - چنانچہ جو
گرانی اضافہ مقدار زر کی بدولت ہو پہلے اس کا اثر کاروبار پر بہت موافق پڑتا ہے آمدنی کے
زیادتی کے خیال میں لوگ گرانی کی پرواہ نہیں کرتے اور اپنے کو خوشحال تصور کرنے لگتے ہیں اور
بزعم خود زیادہ دولت مند بننے کی کوشش کرتے ہیں کثرت زر کی پیدا کی ہوئی گرانی بجائے
بار محسوس ہونے کے سمند دولت اندوزی پر تازیانہ کا کام کرتی ہے - چنانچہ کثرت زر گرانی اور
معاشی ترقیات کچھہ لازم و ملزوم سی پائی جاتی ہیں یا مقدار زر بڑہنے اور قدر گھٹنے سے کاروباری
طبقوں میں ایک نئی روح پھونک جاتی ہے - وہ تو قیمت - اجرت - لگان اور کرایہ بڑہاکر
تخفیف زر کی خاصی تلافی کرلیتے ہیں اور مزید براں مقدار زر بڑہنے سے ایسے ہی خوش ہوتے
ہیں کہ گویا ان کی آمدنی میں کوئی حقیقی اضافہ ہوا - لیکن اس حالت میں دو طبقے ضرور نقصان
میں رہتے ہیں - اول تو قرض خواہ اگر قرض ادا کرتے وقت قرض دینے کے وقت کے
مقابلہ میں زر کی قدر ۲۰ فیصدی کم ہوجائے تو قرضدار سو روپیہ کی شکل میں صرف ۸۰

حصہ چہارم
باب ہم

روپیہ ادا کرتا ہے اور قرض خواہ کو ہر سینکڑے پر اپنے دیئے ہوئے بیس روپیہ کم ملتے ہیں۔ لیکن یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جبکہ قرض متعدد سال بعد ادا کیا جاوے۔ قرض خواہ صرف زر کی مساوی مقدار پانے کا مستحق ہوتا ہے۔ قدر کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ آج کل سود اس غیر اختیاری نقصان کی تلافی بھی شمار ہو سکتا ہے دوم تخفیف قدر سے اُن لوگوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے جن کی آمدنی مقرر ہو مثلاً ملازم پیشہ لوگ کہ اُن کی تنخواہیں مقرر ہیں اُن کو حسب استحقاق ترقیاں ضرور ملتی ہیں لیکن قیمت واجرت وغیرہ کی مانند تخفیف قدر زر کے لحاظ سے اُن کی تنخواہوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا جاتا۔ ایک تو یوں ہی معیار زندگی اعلیٰ ہونے کی وجہ سے مصارف بڑھ گئے ہیں۔ دوم قدر زر بھی گھٹ رہی ہے گرانی ہر طرف مسلط ہے لیکن ان کی تنخواہوں کی مقدار زر مثلاً بیس پچاس۔ سو۔ یا ہزار روپیہ مقرر ہے۔ اب گذر ہو تو کیسے ہو۔ تنخواہ تو بڑھنے سے رہی بالآخر رشوت کا دست غیب چلنا شروع ہو جاتا ہے دیندار لوگوں میں عام شکایت ہے کہ بدنیتی کی بدولت دنیا سے خیر و برکت اُٹھ گئی کسی زمانہ میں چھوٹی چھوٹی تنخواہوں والے کنبہ پالتے تھے اور اب بڑی بڑی تنخواہیں والے بلا امکان رشوت لیتے ہیں مگر پورا نہیں پڑتا۔ ان کی شکایت بالکل بجا ہے اور ان کی توجیہہ گو بھولی بھالی سہی لیکن پاکیزہ دلوں کو تسکین ضرور دیدیتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ مقدار زر کا اضافہ اور اُس کی قدر کی تخفیف بشرطیکہ حد اعتدال سے تجاوز نہ کرے معاشی ترقیات اور عام مرفہ الحالی کو معاون ثابت ہوتی ہے۔ صرف جن طبقوں کی آمدنی کی مقدار زر معین ہو ان کو گرانی کم و بیش زیر بار ضرور کرتی ہے۔ طرح طرح کی ترکیبوں سے وہ بھی اپنے نقصان کی تلافی کر ہی لیتے ہیں۔ اب تک ہم نے جس گرانی کے نتائج دکھائے وہ وہ گرانی ہے جو کثرت زر سے پیدا ہو۔ اگر گرانی قلت پیداوار سے بشکل قحط نمودار ہو تو عوام کے حق میں مضر بلکہ تباہ کن ثابت ہوگی ریل جہاز اور تار نے

حصہ چہارم
باب ہم

کرہ ارض کی طنابیں کھینچ دی ہیں اکثر بیدا اوار ملک ملک گھومتی ہی اور دنیا کے گوشہ گوشہ کی حالت سب پر عیاں رہتی ہی۔ اب کسی خاص ملک میں تو قحط کا اندیشہ باقی نہیں۔ رہا البتہ عالمگیر قحط سے خدا محفوظ رکھے۔

سونے کی پیداوار

(۷) میکزیکو۔ کناڈا۔ برازل۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ ٹرانسوال۔ آسٹریلیا۔ کیلی فورنیا اور سائبریا میں خاص طور پر سونا نکلتا ہی۔ ہندوستان میں ریاست میسور میں سونے کی کان ہی تخمینہ کیا جاتا ہی کہ جب سے امریکہ کا پتہ چلا یعنی سنہ ۱۴۹۳ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۲ء تک تقریباً ساڑھے پینتالیس ارب روپیہ قیمتی سونا دنیا بھر میں نکل چکا ہی۔ جس میں سے تقریباً اکیس ارب روپیہ کا سونا صرف گزشتہ ۲۲ سال میں یعنی سنہ ۱۸۹۰ اور سنہ ۱۹۱۲ء کے درمیان دستیاب ہوا گذشتہ چند سالوں سے اوسطاً سوا اور ڈیڑھ ارب روپیہ کے درمیان ہر سال کانوں سے سونا نکل رہا ہی اور یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہی کہ کل دنیا میں جس قدر سونا موجود ہی اس کا دسواں حصہ ہندوستان میں ہی اور کل موجودہ چاندی کا پانچواں حصہ لیکن علاوہ زر کے ہندوستان میں سونے چاندی سے دفینوں زیور اور سامان کا بھی کام بکثرت لیا جاتا ہی۔

باب دہم

ہندوستان میں گرانی کے اسباب و نتائج

تجزیہ (۱) گرانی کی تحقیقات (۲) گرانی کی حالت (۳) گرانی کے اسباب (۴) رسد و طلب پیداوار (۵) محصول برآمد کی تجویز (۶) اضافہ زر (۷) اسباب داخلی و خارجی (۸) سکوں کا اثر (۹) گرانی کے نتائج (۱۰) مسئلہ اصلاح

(۱) کچھ عرصہ سے ہندوستان میں عام طور پر گرانی بڑھ رہی ہی۔ اکثر چیزوں کی قیمت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہی۔ لوگوں میں گرانی کا چرچا پھیلا ہوا ہی اخباروں اور جلسوں میں اس پر بحث مباحثہ ہوتا رہتا ہی اور کیوں نہ ہو جب صریحاً گرانی کا موافق یا مخالف اثر ہر شخص کی مالی حالت پر پڑتا ہی تو عوام کا اس پر غور کرنا بالکل قدرتی امر ہی۔ پس اس گتھی کا سلجھانا ذرا دشوار کام ہی اس کے واسطے خاص قسم کی معلومات درکار ہی جو عوام بطور خود حاصل نہیں کر سکتے پس مسئلہ گرانی کو سمجھنے کا ہندوستان میں اشتیاق بھی ہی اور سمجھانے کی ضرورت بھی مزید براں گزشتہ باب میں ہم نے صرف قدر زر اور گرانی کا تعلق دکھایا تھا ہندوستانی گرانی کی بحث سے علاوہ تخفیف قدر زر گرانی کے اور گوناگوں اسباب بھی واضح ہو جائیں گے جس سے گرانی کی اصولی بحث میں مزید وسعت نظر پیدا ہو گی ع - چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار مسئلہ گرانی سے عوام کو جو دلچسپی ہی اور اس کی تشریح کی جس قدر ضرورت ہی اس کا لحاظ کر کے سرکار ہند نے سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک خاص کمیشن مقرر کیا تھا کہ وہ کافی تحقیقات کر کے ہندوستان میں گرانی کی حالت اور اس کے اسباب و نتائج کی مفصل رپورٹ مرتب کرے

تین سال تک تحقیقات جاری رہ کر سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک نہایت جامع رپورٹ تین جلدوں میں شائع ہوئی جس میں سنہ ۱۸۹۰ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۲ء تک ۲۲ سال کا حال درج ہوا اعداد و شمار تو اس رپورٹ کے سب سے زیادہ مستند ہیں اور اکثر پیش کردہ اسباب و نتائج بھی صحیح ہیں البتہ کبھی کبھی ان میں اختلاف رائے کی گنجائش بلکہ ضرورت نظر آتی ہے ہمارے اس باب کا سنگ میاد وہی کمیشن کی رپورٹ ہے باب ہم و دہم میں تقریباً کل اعداد و شمار اسی رپورٹ سے تخلیصۃً منقول ہیں۔ البتہ اسباب و نتائج کی بحث میں بشرط ضرورت اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے ہندوستان کے معاشی حالات کا خاکہ پیش نظر ہو جائے گا۔ اور مسئلہ گرانی کی علمی بحث میں بھی اس سے قابل قدر مدد ملے گی

مدجامع مانے ہم

(۴) کچھ عرصہ سے گرانی عالمگیر نظر آتی ہے۔ ہر ملک میں قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ یہ جو آئے دن مزدوروں میں اسٹرائک ہوتے رہتے ہیں ان کا خاص باعث بھی یہی گرانی سمجھی جاتی ہے جب کہ اس کی بدولت اجرت صحیحہ میں تخفیف ہو جاتی ہے تو مزدور بھی اجرت متعارف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ بہرحال تمام ملکوں میں قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور زندگی ایسی خرچ ہوتی جاتی ہے یورپ تو اکثر ممالک کی قیمتوں کے متعلق سنہ ۱۸۹۰ سے لیکر سنہ ۱۹۱۲ء تک ۲۲ سال کے انڈکس نمبر موجود ہیں [illegible] بخوف طوالت ہم صرف سنہ ۱۹۱۰ اور اس کے بعد والے انڈکس نمبر پیش کرتے ہیں جن سے ہر ملک میں جدا جدا اضافہ قیمت کے مدارج معلوم ہوں گے سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۸۹۹ء تک دس سال کی قیمتوں کا اوسط سو فرض کر کے ذیل کے انڈکس نمبر تیار کیے گئے ہیں اور قیمتیں بحساب رطل درج ہیں۔

گرانی کی حالت

[illegible] انڈکس نمبر متعلق تغیرات قیمت

سنہ	انگلستان	جرمنی	فرانس	امریکہ	آسٹریلیا	ہندوستان
سنہ ۱۹	۱۰۳	۱۰۶	۱۰۴	۱۰۳	۹۹	۱۲۶

سنہ	انگلستان	جرمنی	فرانس	امریکہ	آسٹریلیا	ہندوستان
سنہ ۱۹۰۱	۹۸	۱۰۲	۱۰۶	۱۰۲	۱۰۸	۱۲۰
سنہ ۱۹۰۲	۹۶	۹۹	۹۸	۱ ۶	۱۱۶	۱۱۵
سنہ ۱۹۰۳	۹۷	۱۰۵	۱۰۰	۱۰۷	۱۱۶	۱۱۱
سنہ ۱۹۰۴	۱۰	۱۰۶	۹۹	۱۰۶	۹۸	۱۱۰
سنہ ۱۹۰۵	۱۰	۱۰۹	۱۰۰	۱۰۹	۱۰۱	۱۲۰
سنہ ۱۹۰۶	۱۰۷	۱۱۸	۱۱	۱۱۵	۱۰۵	۱۳۲
سنہ ۱۹۰۷	۱۱۳	۱۲۷	۱۱۶	۱۲۳	۱۱۳	۱۳۸
سنہ ۱۹۰۸	۱۰۴	۱۱۵	۱۰۵	۱۱۵	۱۲۳	۱۴۷
سنہ ۱۹۰۹	۱۰۵	۱۱۹	۱۰۷	۱۱۹	۱۱۰	۱۳۸
سنہ ۱۹۱۰	۱۱۰	۱۲۳	۱۱۲	۱۲۴	۱۱۱	۱۳۷
سنہ ۱۹۱۱	۱۱۴	۱۳۳	۱۲۰	۱۲۱	۱۱۱	۱۳۹
سنہ ۱۹۱۲	۱۲۳	۰۰۰		۱۲۸	۱۳۰	۱۴۷

سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک پانچ سال کی قیمتوں کا مجموعی اوسط حسب ذیل تھا جس سے معلوم ہوگا کہ اس عرصہ میں ملک کی قیمتوں میں کتنا کتنا اضافہ ہوا یہاں پر بھی وہی سنہ ۱۸۹۰ سے سنہ ۱۸۹۴ تک پانچ سال کا مجموعی اوسط سو فرض کرکے باقی قیمتیں بحساب فیصدی دکھائی گئی ہیں۔

انڈکس نمبر متعلق قیمت مابین سنہ ۱۹۰۷ و سنہ ۱۹۱۱ء

ہندوستان	۱۴۰
جرمنی	۱۲۴

حصہ چہارم

باب نہم

اِنڈکس نمبر متعلق قیمت مابین سنہ ۱۹۰۱ء سنہ ۱۹۱۱ء

امریکہ	۱۲۰
آسٹریلیا	۱۱۳
فرانس	۱۱۲
انگلستان	۱۰۹

ہر ملک کی قیمتوں کے تغیرات جدا جدا دکھائے گئے ہیں لیکن مختلف ملکوں کی قیمتوں کے تغیرات کا باہمی مقابلہ کہیں بھی نہیں کیا گیا مختلف ممالکوں کے اوسطوں کا مقابلہ کرنے میں ایک مغالطہ ممکن ہے جو کہ مثال ذیل سے بخوبی واضح ہوگا۔ فرض کرو کہ انگلستان میں گیہوں کا نرخ ۴ روپیہ من ہو اور ہندوستان میں ۳ روپیہ من ہے اب اگر اُن کی قیمت میں بقدر ایک روپیہ من اضافہ ہو تو بحساب فیصدی سابق قیمت انگلستان میں اس کی قیمت ۱۲۵ دکھائی جائے گی اور ہندوستان میں ۱۳۳۔ حالانکہ قیمت میں اضافہ دونوں جگہ بقدر مساوی یعنی ایک روپیہ من ہو۔ گویا قیمت کے مساوی اضافہ کا اثر ارزاں نرخ پر زیادہ نظر آتا ہے اور گراں نرخ پر کم۔ ہندوستان دوسرے ملکوں کو کثرت سے پیداوار خام بھیجتا ہے جس کی قیمت بمقابلہ دوسرے ملکوں کے ہندوستان میں بقدر مصارف آمد و رفت کم رہتی ہے یا یوں کہئے کہ درآمد والے ملکوں میں بڑھی رہتی ہے نتیجہ یہ ہے کہ ایسی پیداوار خام کے یکساں اضافہ قیمت کا اثر ہندوستان کی کمتر قیمت میں بہت نمایاں نظر آتا ہے اور دوسرے ملکوں کی اعلیٰ قیمت میں اس سے کم۔ منجملہ اور متعدد وجوہات کے جن سے ہم آئندہ بحث کریں گے۔ ہندوستان کی قیمت میں اور ملکوں سے زیادہ اضافہ نظر آنے کا ایک باعث یہ بھی ہے جو ہم نے ابھی بیان کیا۔

بغرض سہولت موازنہ ہم نے ہندوستانی قیمتوں کے تغیرات بھی بحساب زر طلائی

حساب انگریزی پونڈ درج کی ہیں لیکن ہندوستان میں زر نقرہ یعنی روپیہ رائج ہے روپیہ کے حساب سے ہندوستانی قیمتوں میں سنہ ۱۸۹۰ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۲ء تک جو تغیرات نمودار ہوئے وہ ذیل کے انڈکس نمبر سے ظاہر ہے اس میں بھی سنہ ۱۸۹۰ء سے لیکر سنہ ۱۸۹۴ء ۴ سال کی قیمتوں کا اوسط سو فرض کرکے سالہائے مابعد کی قیمتیں بحساب فیصدی درج ہیں۔

انڈکس نمبر متعلق تغیرات قیمت در ہندوستان بحساب فیصدی مابین سنہ ۱۸۹۰ و ۱۹۱۲

سنہ	انڈکس	سنہ	انڈکس
سنہ ۱۸۹۰	۹۷	سنہ ۱۹۰۲	۱۱۱
سنہ ۱۸۹۱	۹۸	سنہ ۱۹۰۳	۱۰۷
سنہ ۱۸۹۲	۱۰۳	سنہ ۱۹۰۴	۱۰۶
سنہ ۱۸۹۳	۱۰۲	سنہ ۱۹۰۵	۱۱۶
سنہ ۱۸۹۴	۱۰۰	سنہ ۱۹۰۶	۱۲۹
سنہ ۱۸۹۵	۱۰۱	سنہ ۱۹۰۷	۱۳۳
سنہ ۱۸۹۶	۱۰۳	سنہ ۱۹۰۸	۱۴۳
سنہ ۱۸۹۷	۱۲۱	سنہ ۱۹۰۹	۱۳۳
سنہ ۱۸۹۸	۱۰۶	سنہ ۱۹۱۰	۱۳۲
سنہ ۱۸۹۹	۱۰۴	سنہ ۱۹۱۱	۱۳۳
سنہ ۱۹۰۰	۱۲۲	سنہ ۱۹۱۲	۱۴۱
سنہ ۱۹۰۱	۱۱۶		

انڈکس نمبر بالا میں سنہ ۱۹۰۵ خاص طور پر قابل توجہ ہے اس سے قبل قیمتیں کبھی بڑھیں تو کبھی گھٹ بھی گئیں اور تغیرات ۲۰ - ۲۲ فیصدی کے اندر اندر رہے۔ لیکن اس سال سے قیمتوں میں نمایاں اضافہ شروع ہوتا ہے اور اس سے ماقبل سالوں کی قیمتیں روز بروز خواب و

سنہ	گیہوں	جو	چنا	چاول	شکر	روئی	سن	چمڑا	عمارتی سامان
۱۹۱۰ سنہ	۱۳۳	۱۲۲	۱۲۳	۱۲۲	۱۱۲	۱۴۱	۱۱۹	۱۶۴	۱۴۲
۱۹۱۱ سنہ	۱۲۱	۱۲۲	۱۱۶	۱۲۶	۱۰۹	۱۴۵	۱۴۴	۱۵۹	۱۴۶
۱۹۱۲ سنہ	۱۳۴	۱۴۶	۱۳۴	۱۳۰	۱۱۱	۱۳۷	۱۶	۱۶۲	۱۴۹

سنہ ۱۹۰۹ء سے سنہ ۱۹۱۲ء تک چار سال کے اندر قیمتوں کا مجموعی اوسط حسب ذیل تھا

چمڑا	۱۵۹	چاول	۱۳۷
جو	۱۴۴	روئی	۱۳۳
چنا	۱۴۲	سن	۱۳۱
سامان عمارت	۱۴۲	شکر	۱۰۹
گیہوں	۱۴۱		

عالمگیر اور بالخصوص ہندوستانی گرانی کا ایک سادہ خاکہ پیش کر کے اب ہم اس کے اسباب پر نظر ڈالتے ہیں۔

گرانی کے اسباب

(۲) معلوم ہوا کہ دنیا بھر میں چیزوں کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ ہندوستان میں جو قیمتوں کا اضافہ سب ملکوں سے بڑھا ہوا نظر آتا ہے اس کا باعث ایک تو وہی نکتہ ہے جو واضح ہو چکا کہ مساوی مقدار اضافہ کا اثر ارزاں نرخ پر زیادہ نظر آتا ہے اور گراں نرخ پر کم ہندوستان سے پیداوار خام بکثرت دوسرے ملکوں کو جاتی ہے اور کم از کم بقدر مصارف آمد و رفت اُن کی قیمت بھی ہندوستان میں گھٹی رہتی ہے۔ پس تغیر کا اثر ہندوستان کے ارزاں نرخ پر زیادہ پڑتا ہے اور دوسرے ملکوں کے گراں نرخ پر کم۔

ایک ہی تغیر کا مختلف نرخوں پر اثر نمودار ہونا تو علم الحساب کا ایک نکتہ تھا اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں اکثر ضروری چیزوں کی قیمت مسلسل طور پر کیوں بڑھ رہی ہے

اس ور افزوں گرانی کے اسباب چند در چند ہیں اور آپس میں ایسے گتھے ہوئے کہ ان میں کامل تفریق تو محال ہی اور نہ اُن کے اثرات کا تخمینہ جدا جدا ممکن - البتہ اس قدر تحقیق ہی کہ کچھہ اسباب مل جلکر گرانی بڑھا رہے ہیں -

گرانی یا اضافۂ قیمت کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو بوجہ قلت پیداوار خود قیمت بڑھ جائے یا بوجہ کثرت زر خود زر کی قدر میں تخفیف ہو - اور ایسا معلوم ہو کہ گویا گرانی پھیل رہی ہی ہندوستان میں یہ دونوں صورتیں یکجا نظر آتی ہیں - اوّل تو پیداوار کی رسد بمقابل طلب ناکافی ہی جس کی وجہ سے خود قیمت بڑھتی ہی دوم مقدار زر میں اضافہ ہونے سے اس کی قدر میں بھی کم و بیش تخفیف ہو رہی ہی - جو گرانی نمایاں کرنے میں سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہی -

(۴) ہندوستان اب محض ایک زرعی ملک رہ گیا ہی اور یہاں کی گرانی خاص طور پر سامان خوراک سے متعلق ہی اوّل گرانی کی پہلی صورت یعنی پیداوار کی قلت کو لیجئے ہندوستان میں زرعی پیداوار کی رسد بمقابل طلب ناکافی ہونے کے خاص خاص اسباب درج ذیل ہیں -

(ا) زراعت کی بربادیاں -

(ب) کھیتوں کی ناکافی تیاری -

(ج) اعلیٰ درجہ والی زمین کی قوت پیداآوری میں انحطاط -

(د) ادنےٰ درجہ والی زمینوں کی کاشت -

(ہ) سامان خوراک کے بجائے دوسری چیزوں کی کاشت

(س) بمقابل افزونی آبادی کاشت کی ناکافی توسیع -

(ط) برآمد پیداوار -

(ا) زراعت کی بربادیاں - ہندوستان ایک اچھا خاصہ براعظم ہی اُس کا عام پیشہ

حصہ چہارم
باب ہم

زراعت ہے اور زراعت بیسیوں خطروں میں گھری رہتی ہے تنا دونا در کوئی ایسا مبارک سال گذرتا ہے جب کہ فصل اچھی پیدا ہو ورنہ کسی نہ کسی صوبہ یا صوبوں میں کسی نہ کسی طرح زراعت کو نقصان پہنچ ہی جاتا ہے گو نہروں سے آبپاشی میں قابل قدر مدد ملتی ہے۔ تاہم زراعت کی شادابی بیشتر بارش پر منحصر ہے اور بارش بھی حسب ضرورت ہو نہ کم نہ زیادہ اور ٹھیک وقت پر ورنہ بے قرینہ بارش سے جتنا بھی نقصان پہنچے کم ہے پھر سیلاب۔ اولوں اور آندھی کے طوفان۔ کہرے کا گہراؤ اور ٹڈی دل۔ ان میں سے ہر ایک زراعت کو خاک میں ملانے کے لیے کافی ہے۔ سنہ ۱۸۹۰ء سے سنہ ۱۹۱۲ء تک ہندوستان کی زراعت کو اکثر سوء اتفاق پیش آیا کیے اور جلد جلد نامساعد حالات اس کو گھیرتے رہے اس بائیس سال کے دوران میں صرف دو سال سنہ ۱۸۹۲-۳ اور سنہ ۱۹۰۳-۴ ایسے مبارک آئے کہ جب کل ملک میں پیداوار اچھی ہوئی۔ ورنہ ہر سال زراعت پر کوئی نہ کوئی بلا نازل ہوتی رہی۔ چنانچہ ہر سال کی مختصر حالت پیش کی جاتی ہے۔

سنہ ۱۸۹۰ - بنگال بہار میں سیلاب سے فصلیں تباہ ہوگئیں۔ اور ممالک متوسط میں اولوں کا طوفان آیا۔

سنہ ۱۸۹۱-۲ بنگال بہار اور پنجاب و مدراس میں بوجہ قلت بارش زراعت کو سخت نقصان پہنچا۔ صوبہ متحدہ میں اولوں کا طوفان آیا۔

سنہ ۱۸۹۲-۳ تمام ملک میں پیداوار اچھی رہی۔

سنہ ۱۸۹۳-۴ ممالک متوسط میں بوجہ کثرت بارش و سیلاب فصل ربیع تباہ ہوگئی۔ صوبہ متحدہ میں آندھیوں اور ٹڈی دل سے فصل کو نقصان پہنچا۔

سنہ ۱۸۹۴-۵ کثرت بارش اور سیلاب سے صوبہ متحدہ اور پنجاب میں فصل ماری گئی۔

حصہ چہارم
باب نہم

سنہ ۱۸۹۵-۶ صوبہ متحدہ میں بے وقت بارش ہونے سے اور پنجاب میں قلت بارش سے فصل خراب ہوگئی۔

سنہ ۱۸۹۶-۷ بوجہ قلت بارش ہندوستان کے کل صوبوں کی فصلیں خشک ہوگئیں اور تمام ملک میں قحط پھیل گیا۔

سنہ ۱۸۹۸-۹ بوجہ قلت بارش و ٹڈی دل پنجاب کی فصل ماری گئی۔ بہار میں سیلاب اور بنگال میں ٹڈی دل سے فصل برباد ہوئی۔

سنہ ۱۸۹۹-۱۹۰۰ بنگال بہار میں بارش بکثرت اور بے وقت ہوئی۔ پنجاب میں بارش کی بہت قلت رہی تینوں صوبوں میں فصل خراب ہوگئی۔ ممالک متوسط بمبئی اور مدراس کا حشر بھی پنجاب کا سا ہوا۔ گویا تمام ملک میں قحط پھیل گیا۔

سنہ ۱۹۰۰-۱ بارش بے وقت ہونے سے صوبہ متحدہ کی فصل خراب ہوگئی۔

سنہ ۱۹۰۱-۲ بنگال بہار میں بارش بے وقت ہوئی۔ بمبئی ممالک متوسط میں بارش کی قلت رہی۔ چاروں صوبوں کی فصل خراب رہی۔ پنجاب میں اولوں کا طوفان آیا۔

سنہ ۱۹۰۲-۳ بارش بے وقت ہونے سے ممالک متوسط کی فصل ماری گئی۔

سنہ ۱۹۰۳-۴ ملک بھر میں زراعت خوب اچھی رہی۔

سنہ ۱۹۰۴-۵ صوبہ متحدہ اور بہار میں کہرے اور قلت بارش سے اور بمبئی میں ٹڈی دل اور بے وقت بارش سے فصلوں کو نقصان پہنچا۔

سنہ ۱۹۰۵-۶ بمبئی میں قلت بارش اور بے وقت بارش سے فصل بالکل تباہ ہوگئی اور قحط نمودار ہوگیا۔

سنہ ۱۹۰۶-۷ بنگال بہار میں کثرت بارش و سیلاب اور پنجاب میں بے وقت بارش سے

فصلیں خراب ہوگئیں -

سنہ ۱۹۰۷-۸ بنگال بہار میں فصلیں پھر کثرت بارش اور سیلاب کی مار رہوئیں - صوبہ متحدہ میں قلت بارش اور پنجاب میں اولوں کے طوفان اور بے وقت بارش سے فصلیں ماری گئیں - ممالک متوسط اور بمبئی میں بھی بارش کی قلت رہی - مدراس میں بارش بے وقت ہوئی یہاں کی فصلیں بھی ماری گئیں اور ملک بھر میں خوب قحط پھیلا -

سنہ ۱۹۰۸-۹ بہار میں بارش کی قلت اور بنگال میں بارش کی کثرت سے فصلوں کو نقصان پہنچا - بمبئی میں کہیں بارش کی کثرت رہی کہیں قلت اور کہیں بے وقت ہوئی - نتیجہ یہاں بھی فصل کی تباہی نکلا -

سنہ ۱۹۰۹-۱ بمبئی اور مدراس میں بارش کی کمی سے فصلوں کو نقصان پہنچا - پنجاب میں اولوں کا سخت طوفان آیا -

سنہ ۱۹۱۱-۱۲ پنجاب بمبئی اور مدراس میں بارش بے وقت ہوئی اور کم - جس سے فصلوں کو نقصان پہنچا -

دوسرے ملکوں سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر ہندوستان میں بارش کی حالت غیر معین ہے کہیں ا درہیں اور یہاں زراعت کو بھی قدم قدم پر خطرے پیش آتے ہیں - خدا ہی فصل تیار کرا دیتا ہے ورنہ ہر وقت متعدد قدرتی دشمن اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں - بائیس سال کے مختصر دوران میں تین قحط پڑے سنہ ۱۸۹۷ء سنہ ۱۹۰۰ اور سنہ ۱۹۰۸ میں صرف دو سال ملک بھر میں فصل اچھی ہوئی سنہ ۱۸۹۳-۹۴ اور سنہ ۱۹۰۳-۴ میں اور باقی ۲۰ سال برابر کسی نہ کسی صوبہ یا صوبوں کی زراعت ناموافق حالات کا شکار ہوتی رہی - جب کسی صوبہ میں فصل ماری جاتی ہے جیسا کہ اکثر واقع ہوتا رہتا ہے

تو گویا ہندوستان کی مجموعی پیداوار میں کمی آجاتی ہے اور ریلوں کی بدولت ملک بھر میں تقریباً یکساں اضافہ قیمت نمودار ہو جاتا ہے

(ب) کاشتکار بالعموم اب کھیت ایسی اچھی طرح تیار نہیں کرتے جیسے کہ کیا کرتے تھے نتیجہ یہ ہے کہ فصلیں بھی پہلی سی روئیدار نہیں ہوتیں - چرس اور ہل کھینچنے میں بیل کام آتے ہیں - بحالت مجبوری بھینسے بھی لگائے جاتے ہیں - اُن کی مدد بغیر کنوؤں سے آب پاشی اور کھیتوں کی جوتائی محال ہے عمدہ جوتائی اور کافی آب پاشی کی اہمیت محتاج تشریح نہیں - پس زراعت میں بیل اور بھینسوں کی مدد ناگزیر ہے اور ان مویشیوں کی یا تو بعض صوبوں میں تعداد گھٹ رہی ہے یا اگر کہیں اضافہ ہوا ہے تو موجودہ ضروریات کے لحاظ سے سراسر ناکافی ہے - نتیجہ یہ ہے کہ زراعت میں کام آنے کے قابل بیل بھینسے نایاب اور گراں ہوتے جاتے ہیں بہت سے کسان عمدہ مویشی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے کمزوروں سے زراعت کا کام نہیں چلتا - نہ کھیت اچھی طرح پر جوتے جاتے ہیں - نہ اُن کے حسب دلخواہ کنوؤں سے آب پاشی ہوتی ہے - پھر فصلیں کیونکر سرسبز اور بارآور ہو سکتی ہیں - قلت مویشی کے کئی سبب ہیں - اول تو وہ قحطوں میں بہت ضائع ہوتے ہیں - چارہ تو میسر آتا نہیں یا تو وہ خود بھوکے مر جائیں یا فاقہ کش لوگ اُن کو کھا ڈالیں - مزید براں ایک جماعت کثیر معمولاً اُن کا گوشت خوراک کے کام میں لاتی ہے کچھ عرصہ سے ہندوستانی مویشی کا گوشت خشک ہو کر کے بیرون ملک بھی جانے لگا ہے اُن کے خون سے رنگ تیار ہوتا ہے - چمڑہ اور ہڈی کی قیمت بڑھ رہی ہے - سینگ اور کھُرتک کے دام اُٹھ آتے ہیں - غرضکہ چند در چند وجوہات سے مویشی زیادہ زیادہ ذبح ہونے لگے ہیں اور اُن کے کام سے فائدہ اُٹھانے کے بجائے خود اُن کے جسم سے دام اُٹھائے جاتے ہیں - اس پر طرہ یہ کہ زراعت بھی ملک میں پھیل رہی ہے - گویا

چاہی آب پاشی اور جوتائی کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔ جب ایک طرف تو مویشی کی رسد گھٹے اور دوسری طرف زراعت کے واسطے اس کی طلب بڑھے تو اس قلت کی بدولت اس کی قیمت جتنی بڑھے کم ہے۔

چنانچہ کاشتکاروں کو عام شکایت ہے کہ کھیتی باڑی کے قابل مویشی اس قدر گراں ہوگئے ہیں کہ بہت سوں کو خریدنے کی استطاعت نہیں اور مجبوراً اچھی طرح سے جوتے بغیر کھیتوں میں فصل بوتے ہیں۔ کنوؤں سے حسب دلخواہ آب پاشی بھی نہیں کر سکتے ایسی حالت میں پیداوار کم ہوئی کیا عجب ہے۔ مویشی کے علاوہ قلت کھاد کی بھی شکایت سنی جاتی ہے۔ پرانے کھیتوں کی تو قوت پیداآوری بوجہ کثرت استعمال گھٹ ہی رہی ہے اُن کی حالت بیشتر سن رسیدہ لوگوں کی سی ہے جن کی طاقت بحال رکھنے کے واسطے مقویات درکار ہوں چنانچہ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ خود بخود فصل پیدا کرنے کی قوت زرخیز زمینوں میں بھی کم ہوتی جاتی ہے اور اُن کو زیادہ زیادہ کھاد دینے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ نئی زمینیں جن پر زراعت پھیل رہی ہے اول ہی سے کم زرخیز ہیں اُن کی حالت ضعیف نوجوانوں کی سی سمجھی چاہیئے جو عہد جوانی ہی میں قوت افزائی کے واسطے خاص اہتمام کے محتاج ہوں۔ غرضیکہ کھیت پرانے ہوں یا نئے سب کو زیادہ زیادہ کھاد کی ضرورت ہے لیکن کھاد بھی روز بروز گراں ہو رہا ہے اور بہت سے کاشتکار بوجہ استطاعت نہ ہونے کے کافی کھاد ڈالے بغیر بلکہ کبھی تو بلا کھاد ہی کاشت کر لیتے ہیں اس سے ثابت ہے کہ کھاد کی رسد ناکافی ہے اور ایسی اچھی فصلیں پیدا نہیں ہوتیں جیسی کہ ہو سکتی ہیں۔

ہر ایک کاشتکار کی زبان پر بھی شکایت ہے کہ زراعت کے کام کے قابل مویشی نہایت گراں ہو رہے ہیں اور کھاد بھی نایاب ہے نہ کھیت اچھی طرح پر جوت سکتے ہیں نہ حسب دلخواہ کنوؤں سے آب پاشی ہوتی ہے نہ کھاد سے کھیت کی زرخیزی بڑھتی ہے پس فصل

عمدہ ہو تو کیونکر ہو۔

(ج) اعلیٰ درجہ والی زمین کی قوت پیدا آوری میں انحطاط۔ جس طرح کہ بچہ کو دودھ پلانے سے ماں کی طاقت گھٹتی ہے فصل اُگانے سے زمین کی زرخیزی بھی کم ہوتی ہے۔ جوان اور تندرست ماں بچہ کو دودھ پلانے سے کوئی کمزوری محسوس نہیں کرتی۔ دودھ بکثرت ہوتا ہے اور اس کا پینے والا بچہ بھی توانا رہتا ہے۔ لیکن کچھ بچوں کی پرورش کے بعد ضعف نمودار ہوتا ہے دودھ کی مقدار گھٹتی ہے اور خاص طور پر مقوی غذا ملے بغیر بچہ کو دودھ پلانا دشوار ہو جاتا ہے۔ بعینہ یہی حال زمین کا نظر آتا ہے۔ جب کسی نئی زمین پر کاشت کی جاتی ہے تو بشرطیکہ وہ قدرتاً زرخیز ہو اول اول اس میں نہایت زبردست فصلیں تیار ہوتی ہیں لیکن کچھ عرصہ بعد اس کی قدرتی زرخیزی بھی کم ہونے لگتی ہے اور جس قدر پیداوار کسی زمانہ میں بغیر کھاد حاصل ہوتی تھی بعد کو کھاد ڈالنے پر بھی مشکل ہاتھ آتی ہے زمینوں میں جس قدر زیادہ عرصہ تک مسلسل اور جلد جلد کاشت کی جائے گی اُن کی قدرتی زرخیزی اُسی قدر سرعت سے زائل ہوگی اور اُن کے واسطے روز بروز زیادہ کھاد درکار ہوگا ورنہ پیداوار بہت گھٹ جائے گی کسی زمانہ میں بالعموم سال بھر میں ایک فصل اگائی جاتی تھی اب سال میں دو دو فصل بونے کا عام رواج ہے زمینیں کبھی زیر کاشت ہوتی تھیں تو کبھی سالوں پڑی رہتی تھیں لیکن تقریباً ایک صدی ہونے کو آئی کہ ہندوستان کے بعض حصوں میں زمینوں پر مسلسل کاشت ہو رہی ہے ایسے مقامات میں زمینوں کی قوت پیدا آوری ضرور مضمحل ہوتی جا رہی ہے قدرتی زرخیزی تو بوجہ کثرت کاشت بہت کچھ زائل ہو چکی ہے اب ان کی زرخیزی کا دارومدار بیشتر کھاد پر ہے جتنا کھاد دیا جائے گا اتنی ہی پیداوار ہوگی۔ یہ نہیں کہ پہلے کی طرح کھاد دیے بغیر یا تھوڑا سا کھاد دینے پر قدرتی زرخیزی کے زور سے زبردست فصلیں پیدا ہوں ہندوستان میں

حصہ چہارم
باب دہم

جو بڑے بڑے زرخیز حصے تھے وہ بالعموم اسی حالت میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں بہت بہت کھاد دیئے بغیر اب اُن کی زرخیزی قائم رہنی دشوار ہے۔ بیکاری اور کم کاشت کے زمانہ میں جمع ہوئی قدرتی زرخیزی بہت کچھ کام آچکی۔ اب جو نئی نئی زمینیں زیر کاشت آرہی ہیں ان میں پہلے ہی سے قدرتی زرخیزی کم ہے ان کے نئے ہونے سے پیداوار میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی وہ بھی قدیم زرخیز زمینوں کی طرح کھاد کی محتاج ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ عرصہ دراز تک مسلسل اور بکثرت کاشت کے ہوتے ہوئے زرخیز زمینوں کی قوت پیداآوری میں کمی آرہی ہے ان کو کھاد دینے کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے جو زمینیں حال میں زیر کاشت آرہی ہیں وہ قدرتاً زرخیز کم ہیں اور کھاد بغیر اُن سے کہیں کام نہیں چلتا۔ اور کھاد کی قلت و گرانی اس سے قبل بیان ہوچکی۔

(د) ادنےٰ درجہ والی زمینوں کی کاشت ۔ اعلیٰ درجہ کی زرخیز زمینوں کی تو کاشت ہوتے مدت گذر گئی حتیٰ کہ اب ان میں پہلی سی قوت پیداآوری بھی نہیں ہے اب ان کی زرخیزی اسی طرح کھاد پر منحصر ہے جیسے کہ بوڑھے کی طاقت عمدہ غذا پر۔ لیکن خود ملک میں آبادی بڑھ رہی ہے۔ نیز دوسرے ملکوں کو زرعی پیداوار بکثرت جانے لگی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ درجہ والی زمینوں پر بھی کاشت پھیل رہی ہے اور اُن کی پیداوار کا اوسط اور بھی کم پڑتا ہے۔ کمی مقدار کے علاوہ اُن کی پیداوار میں وہ خوبی بھی نہیں جو زرخیز زمینوں کی پیداوار میں ہے یا ہوا کرتی تھی۔ تاہم بوجہ اضافہ طلب اُن کی ناقص پیداوار بھی ناگزیر ہے۔

(س) سامان خوراک کے بجائے دوسری چیزوں کی کاشت ۔ ہندوستان زرعی ملک ہے اور یہاں سامان خوراک خاص طور پر پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ دوسرے ملک بھی اپنی خوراک یہیں سے خریدتے ہیں یہاں کی گرانی بیشتر سامان خوراک کی قلت

حصہ چہارم باب ہم

سے متعلق ہوتی ہے جس سے روئی اور سن کی قیمت بڑھی ہے۔ ان کی کاشت بدرجہ اتم ہوتی جاتی ہے اوران دونوں چیزوں کے واسطے زرخیز زمین درکار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زرخیز قطعات میں روئی اور سن غلہ کے جانشین ہوتے جاتے ہیں جس سے غلہ کی پیداوار گھٹ کر گرانی کو اور بڑھا دیتی ہے خصوصاً اگر روئی کی کاشت میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا رہا تو عنقریب اس کی کاشت غلہ کے بہت زیادہ کھیتوں پر قبضہ کرلے گی۔ حتیٰ کہ غلہ کی گرانی روئی کی قیمت کا مقابلہ کرنے لگے اور دونوں کی کاشت سے یکساں نفع حاصل ہو۔

(اس) مقابل فروغی آبادی کاشت کی ناکافی توسیع باوجودیکہ ۱۸۹۱ء سے مسٹر پلیگ ہندوستانی آبادی کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہیں اور ۱۹۱۲ء تک ہی لاکھ انسانوں کی جگہ خالی کرچکے ہیں ۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۱ء تک تقریباً ۹۳ لاکھ انسان ہیضہ صاحب کی نذر ہوئے اور اسی عرصہ میں دس لاکھ کے قریب بی چیچک نے سگوائے ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۲ء تک ۲۲ سال کے اندر تین زبردست قحط پڑے جن میں خدا جانے کتنے بھوکے مرگئے۔ اور پھر اسباب موت کی کوئی شمار نہیں۔ لیکن اس قطع برید کے بعد بھی آبادی میں جس قدر اضافہ ہوا نہ کاشت میں اس قدر توسیع ہوئی نہ غلہ کی کاشت پھیلی اور نہ پیداوار غلہ میں اضافہ ہوا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ آبادی تو بڑھی لیکن خوراک کے واسطے غلہ کی پیداوار میں کافی اضافہ نہیں ہوا اور سامان خوراک بوجہ قلت گراں ہوگیا۔

ہندوستان کی آبادی۔ مجموعی کاشت غلہ کی کاشت اور پیداوار غلہ میں جس جس قدر اضافہ ہوا ذیل کے انڈکس نمبر میں درج ہے جس سے ان چاروں اضافوں کا باہمی مقابلہ کرنا نہایت سہل ہے۔

	سنہ ۱۸۹۰-۵	سنہ ۱۸۹۶-۱۹۰۰	سنہ ۱۹۰۱-۵	سنہ ۱۹۰۶-۱۰	سنہ ۱۹۱۱	سنہ ۱۹۱۲
آبادی	۱۰۰	۱۰۱ ۳/۵	۱۰۳ ۷/۱۰	۱۰۵ ۴/۱۰	۱۰۷ ۳/۵	۱۰۸ ۲/۵
مجموعی رقبہ کاشت	۱۰	۹۸	۱۰۳	۱۰۵	۱۰۸	۱۰۶
رقبہ کاشت غلۂ خوراک	۱۰۰	۹۶	۱۰۱	۱۰۲	۱ ۶	۱۰۳
پیداوار غلۂ خوراک	۱۰۰	۹۸	۱۰۵	۹۹	۱۱۳	۱۰۹

اوپر کے اعداد پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غلۂ خوراک کے مقابلہ میں آبادی زیادہ بڑھی یعنی سامان خوراک کی رسد بمقابل طلب کم رہی - غذا کی ایک مقدار کثیر گائے بیل بھینس گھوڑا جیسے مویشیوں کے کھلانے میں بھی صرف ہوتی ہے - گرانی کے زمانہ میں ان غریب جانوروں کا دانہ کم کر دیا جاتا ہے - مزید براں سالہائے گذشتہ میں برما سے بھی غلہ اچھی خاص مقدار میں آتا رہا ہے - اس طرح پر غلہ کی قلت تھوڑی بہت رفع ہوا کی -

(ط) مندرجہ بالا اسباب سے پتہ چلتا ہے کہ اوّل تو غلہ کی رسد پر طرح طرح کی بندشیں قائم ہیں دوم پیداوار کے مقابل خود ہندوستان میں آبادی زیادہ بڑھ رہی ہے لیکن بایں ہمہ اگر ہندوستان کو اپنے ہی باشندوں کے واسطے خوراک مہیا کرنی ہوتی تو گرانی اس قدر نہ بڑھ سکتی لطف تو یہ ہے کہ غلہ کی مقدار کثیر دوسرے ممالک کی خوراک کے واسطے بھی اس کو باہر بھیجنی پڑتی ہے - برآمد غلہ کی مقدار اور تغیرات - برآمد کا انڈکس نمبر حسب ذیل ہے -

	سنہ ۱۸۹۰-۵	سنہ ۱۸۹۶-۱۹۰۰	سنہ ۱۹۰۱-۵	سنہ ۱۹۰۶-۱۰	سنہ ۱۹۱۱	سنہ ۱۹۱۲
مقدار برآمد بحساب من	۴ کروڑ	۳ کروڑ	۴ ۱/۲ کروڑ	۴ کروڑ	۵ ۳/۴ کروڑ	۸ ۲/۳ کروڑ
انڈکس نمبر	۱۰۰	۷۵	۱۱۵	۱۰۰	۱۴۵	۲۲۲

حصہ چہارم
باب دہم

ہندوستان کے قحطوں کا اثر دوسرے اور چوتھے دور پر صاف نمایاں ہے اور ۱۱-۱۹۱۰ء و ۱۲-۱۹۱۱ء میں مقدار برآمد بڑھنے کی وجہ عمدہ فصل کے علاوہ طلب خارجہ کی زیادتی بھی ہے۔ ۱۶-۱۹۱۱ء کے دوران میں اگر ۱۹۰۸ء قحط والے سال کی برآمد شمار نہ کی جائے تو باقی ۴ چار سالوں کی مجموعی برآمد کا انڈکس نمبر بجائے ۱۰۰ کے ۱۱۷ ہو جائے گا ۱۹۰۸ء کی برآمد کم رہنے سے پانچ سال کا انڈکس نمبر صرف ۱۰۱ رہ جاتا ہے۔

پس واضح ہوا کہ مقدار برآمد بھی ۱۹۰۵ء سے خاص طور پر اضافہ شروع ہوا جو کہ بڑھتے بڑھتے چھ سات سال کے اندر دوچند ہو گیا۔ اسی دوران میں غلّہ کی قیمت میں مستقل اضافہ نمودار ہوا۔ نرخ بڑھ تو جاتا ہے لیکن گھٹنے کا نام نہیں لیتا۔

محصول
برآمد کی
تجویز

(۵) عام مشاہدہ ہے کہ برآمد غلہ کا اس کے نرخ پر بین اور نہایت قوی اثر پڑتا ہے جب چند روز کے واسطے بھی کسی وجہ سے برآمد بند ہوئی ہے تو نرخ ضرور تخفیف کی طرف مائل ہوتا ہے۔ لیکن اِدھر برآمد شروع ہوئی اُدھر نرخ میں دن دونا رات چوگنا اضافہ نمودار ہوا۔ ہفتوں میں سیروں کا فرق پڑ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ برآمد گرانی کا خاص باعث خیال کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ برآمد و گرانی کا مذکورہ بالا تعلق بدیہات میں شمار ہوتا ہے گرانی سے تنگ آکر لوگ سرکار ہند کو مشورہ دیتے ہیں بلکہ اُس سے التجا کرتے ہیں کہ ہندوستان کی زرعی پیداوار خصوصاً غلہ پر محصول برآمد قائم کر دے۔ اس سے سرکار کو بھی کچھ آمدنی ہاتھ آئے گی اور ملک میں گرانی بھی کم ہو گی خصوصاً غلہ مقابلتہً کافی ارزاں ہو جائے گا۔ لیکن اس تجویز سے بعض صاحبان خاص طور پر چراغ پا ہوتے ہیں اور اس کو سراسر لغو بلکہ ہندوستان کے حق میں سخت مضر قرار دیتے ہیں۔ یہ خیال تو صحیح ہو گا کہ چونکہ ممالک یورپ اور بالخصوص انگلستان بہت کچھ سامان خوراک ہندوستان سے لیتا ہے برآمد میں رکاوٹ شاید اس کے

حصہ چہارم اب دہم

حق میں مضر ہو۔ لہذا ہندوستان کی خیر طلبی کے پردہ میں خود غرضی سے آزادی برآمد پر اصرار کیا جاتا ہے اور محصول برآمد میں سو سو عیب و نقص نکالے جاتے ہیں۔ ایسی تنگدلی مہذب اقوام سے بہت بعید ہے۔ تاہم برآمد میں کاوٹ جن جن وجوہات پر ہندوستان کے حق میں مضر قرار دیجاتی ہے وہ کافی تشفی بخش نہیں معلوم ہوتیں سنہ ۱۹۱۰ء والی سرکاری کمیشن نے گرانی کے متعلق تین سال تحقیقات کرکے جو رپورٹ شائع کی ہے اس میں بھی محصول برآمد کی تجویز کو فضول بلکہ مضرت رساں ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن خاص اس بحث پر ذرا اختصار سے کام لیا گیا معلوم ہوتا ہے اور لہجہ بھی کسی قدر محتاط ہے۔

رپورٹ مذکور میں محصول برآمد کے خلاف تین عذر پیش کیئے ہیں۔ دیگر مخالفین بھی معلوم ہوتا ہے بزعم خود اعتراضوں کو مسکت خیال کرتے ہیں کیونکہ اُن کی طرف سے یہی اکثر شد و مد کے ساتھ پیش ہوا کرتے ہیں۔ پس ان تینوں عذرات یا اعتراضات پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔

سب سے اول کہا جاتا ہے کہ اب تک مقدار برآمد پیداوار کی مجموعی مقدار کی ۴-۵ فیصدی سے کبھی نہیں بڑھی اور کثر ۲-۳ فیصدی رہی۔ پس اس قدر قلیل مقدار کی برآمد کیونکر گرانی کا باعث ہو سکتی ہے اور اگر یہ مقدار ہندوستان ہی میں رہتی تو موجودہ مقدار میں ایسا کونسا معقول اضافہ ہو جاتا کہ ارزانی عود کر آتی یا گرانی رفع ہو جاتی گویا مقدار برآمد مجموعی مقدار کے مقابل اس قدر قلیل ہے کہ ملک میں اس کے رہنے نہ رہنے کا گرانی پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس اعتراض کو پڑھتے ہی تو سکوت لابد معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے کے بعد برآمد اور گرانی میں ایک دوسرا تعلق نظر آتا ہے۔ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک خود تو صنعت و حرفت

حصہ چہارم
باب دہم

مرلٹو ہو رہی ہیں اور بیشتر سامان نو کی پیدا وار خام یس ما دہ ممالک سے لیتے ہیں
یہ وہاں بہ لوجہ کثرت رقیمتیں بہ ... ڑھی بڑھی رہتی ہیں اور پھر بھی لوگوں کو گراں
محسوس نہیں ہوتیں - لیکن جب سے ریل جہاز اور تار نے ذرائع آمد و رفت و معلومات
وسیع اور سہل کر دئے ہیں اکثر چیزوں کی قیمت تمام دنیا میں ایک سطح پر رہنے لگی ہے
جہاں کہیں بھی قیمت کچھہ بڑھتی ہے وہیں کو مال جانا شروع ہو جاتا ہے حتی کہ وہاں کی قیمت
تمام سطح پر آجائے - ان قیمتوں میں ایک فرق ضرور رہتا ہے اور وہ ملک ملک کے
میاں مصارف آمد و رفت ہیں - لیکن غور کرنے سے واضح ہوگا کہ خود یہ فرق عالمگیر مساوات
قیمت کی شرط ہے - مثلاً اگر ہندوستان سے ولایت غلہ بھیجنے کے مصارف ۵ فی من ہوں
اور ولایت میں غلہ کا نرخ للعہ من ہو تو ہندوستان میں تقریباً ۳ روپیہ من رہے گا اور
یہ دونوں نرخ ۵ کے فاصلہ سے ایک دوسرے کی پیروی کریں گے - اگر ولایت میں
نرخ ۵ روپیہ ہو جائے تو ہندوستان میں بھی نرخ ضرور ۳ روپیہ من سے بڑھ جائے گا
معمولاً غلہ کی رسد سے طلب کچھہ بڑھی رہتی ہے اوّل تو بمقابل آبادی اس قدر پیدا نہیں
ہوتا کہ اس کی کثرت سے قیمت میں کوئی نمایاں تخفیف ہو سکے - دوم غلہ کسی قدر
دیرپا بھی ہے - بآسانی سال دو سال رہ سکتا ہے - سوم اگر کسی سال پیدا وار عمدہ ہوتی ہے
تو سالہائے ما بعد میں فصلیں خراب بھی ہوتی رہتی ہیں - چہارم غلہ کی طلب غیر تغیر پذیر
ہے - یعنی چونکہ غلہ ناگزیر ضروریات میں نمبر اوّل ہے - اس کی قیمت خواہ کسی قدر بڑھ
جائے بقدر استطاعت ہر شخص اس کو خریدنے پر مجبور ہے - پس ایسی حالت میں غلہ
کی قیمت بیشتر قیمت طلب کی پیرو ہوگی اور جب کہ خریداران کی ایک جماعت اعلےٰ
قیمت دینے پر آمادہ ہو تو باقی خریداروں سے بھی اعلیٰ قیمت وصول کرنی دشوار نہ ہوگی
یہی وجہ ہے کہ جب ولایت میں غلہ کا نرخ چڑھتا ہے تو خواہ ہندوستان سے

حصہ چہارم باب نہم

تھوڑی ہی سی مقدار روانہ ہو لیکن نرخ یہاں بھی اچھا خاصا بڑھ جائے گا۔ چنانچہ مشاہد ہو کہ ہندوستان میں گیہوں وغیرہ کا نرخ لندن والے نرخ کی مستعدی سے پیروی کرتا رہتا ہی اور مصارف آمد و رفت کے علاوہ قیمت میں بہت کم فرق رہتا ہی اس واقعہ کی مثال یوں سمجھنی چاہیئے کہ بازار میں کسی چیز کی کل مقدار کے خریدار موجود ہوں اور اُن میں سے ہر ایک کو وہ چیز تھوڑی بہت خریدنی ناگزیر ہو۔ اب اگر چند نئے خریدار اس چیز کی تھوڑی سی مقدار ہی قیمت بڑھا کر خریدنا شروع کر دیں تو باقی خریداروں کو بھی بشرط استطاعت وہی قیمت ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہی۔ صاف ظاہر ہی کہ اضافۂ قیمت کے باعث نئے خریدار ہیں خواہ انہوں نے تھوڑی ہی مقدار کیوں نہ خریدی ہو۔ لیکن ایک مثال تو قائم کر دی فروشندوں کو سمجھا دیا کہ اس قدر قیمت وصول ہو سکتی ہی۔ ہم نے مانا کہ برآمد والے غلہ کی مقدار مجموعی پیداوار کے مقابل بہت تھوڑی ہی اور ملکی رسد کی قلت و کثرت پر اس کا کوئی نمایاں اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ لیکن جب کہ رسد اور طلب یوں ہم پلہ ہوں تو اس تھوڑی سی مقدار کا بشرح اعلیٰ فروخت ہونا عام اضافۂ قیمت کا باعث ہو سکتا ہی جس کا نتیجہ یہ ہی کہ اگر باہر جانے کے بجائے اس قدر غلہ ملک میں کم پیدا ہوتا تو قیمت میں اتنا اضافہ نہ ہوتا جتنا کہ برآمد سے ہو رہا ہی۔

کاغذ پر لکھا ہوا اصول یا قانون جب عمل انسانی کا تختۂ مشق بنتا ہی تو اس کی اصلی ہیئت میں بہت کچھ فرق آنا ممکن بلکہ اغلب ہی۔ کہنے کو مقدار برآمد مجموعی مقدار کی ۲ - ۳ فیصدی ہی اور اس کا رسد کی قلت پر کوئی قابل لحاظ اثر نہ پڑنا چاہیئے اور یہی وجہ سے قیمت میں کوئی قابل شکایت اضافہ نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اب ذرا برآمد کا عمل ملاحظہ فرمائیے یہی دو تین فیصدی کی نوبت سات سات آٹھ آٹھ کروڑ من تک پہنچتی ہی کہ جس کو سنکر عوام کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار اور اوسط جو اس قدر استمام

حصہ چہارم

مات ہم

اور تحقیق سے دریافت ہوئے ہیں روزمرہ کے کاروبار میں کتنوں کے پیش نظر رہتے ہیں کتنے فروخت دے اور خریداران عام اصولوں کے پابند ہیں جو کچھ واقع ہو رہا ہے وہ یہ کہ ادہر خبر اُڑی کہ ولایت سے غلہ کی مانگ آئی ہے ادہر دکانداروں کے کان کھڑے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ سردست کرور من غلہ درکار ہے فی نفسہ یہ مقدار کیا کچھ حقیر معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اس کی پرواہ نہ کریں۔ عوام کے تخیلات پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ دوکاندار فوراً نرخ بڑہانا شروع کرتے ہیں گویا کہ اس برآمد کی بدولت غلہ کی بہت قلت ہو گی حالانکہ غلہ اب بھی کھیتوں میں بھرا پڑا ہے اور اس کے سامنے ایک کرور من کی شاید نصف یا ایک فیصدی سے زیادہ حقیقت نہیں عوام کو غلہ خریدے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ جب تک استطاعت ہو گی جس قیمت بھی ملے گا خریدیں گے مزید براں دوکانداروں کو غلہ بیچنے کی خاص عجلت بھی نہیں۔ دو ایک سال تو آسانی کھیتوں میں رکھ سکتے ہیں اور حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر رکھی ہے کہ رسد میں اضافہ کے بجائے تخفیف زیادہ اغلب رہتی ہے مثلاً ۲۲ سال معلومہ میں صرف دو سال تو پیداوار عمدہ رہی ورنہ تین زبردست قحط پڑے اور باقی سال بھی زراعت پر کوئی نہ کوئی اور کہیں نہ کہیں آفت نازل ہوتی ہی رہی پس غلہ روکنے میں خطرۂ نقصان کے بجائے فائدہ کی امید زیادہ قوی رہتی ہے پس جب کہ غلہ روک روک کر رسد قابو میں رکھی جا سکے۔ طلب روز افزوں اور غیر تغیر پذیر ہو اور پھر عوام اعلیٰ نرخ پر کرورہا من پیداوار بیرون ملک جاتے دیکھیں تو پھر قیمت کا اس قدر بڑہنا کون تعجب کی بات ہے کاروبار میں ہزار اصول اور حساب سے کام لیا جائے۔ لیکن پھر بھی تخیلات کا اس قدر اثر پڑتا رہتا ہے کہ اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے اگر ۸ ارب من میں ۴ کرور من غلہ کم پیدا ہو تو اس نصف فی صدی کمی کا بہت سوں کو وہم و گمان بھی نہ ہو۔ لیکن اگر ۴ کرور من غلہ بیرون ملک جاتے دیکھیں تو محسوس ہو کہ گویا ملک غلہ سے خالی ہوا چاہتا ہے اور اضافہ قیمت

گویا اقتضائے حالات ہی جب دوکاندار مال روک سکتے ہیں تو پھر ان کو کیا ضرورت ہو کہ بہت سا مال فروخت کرکے قیمت دوبارہ گھٹائیں - مزید براں غلہ ناگزیر ہی پس اضافہ قیمت سے طلب میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑتا اور جدید قیمت کم و بیش مستقل ہوجاتی ہی۔ ۱۹۰۵ء سے برآمد میں خاص اضافہ شروع ہوا۔ اسی زمانہ میں ایک قحط پڑچکا تھا گیہوں کی قیمت بڑھ کر دس سیر فی روپیہ ہوگئی اس کے بعد دو ایک سال پیداوار اچھی بھی ہوئی لیکن تخفیف قیمت کی نوبت نہ آنے پائی کچھ تو اضافہ برآمد کا اثر تخیلات پر پڑا اور تخفیف قیمت کے خلاف ہا اور کچھ ذخیروں نے اضافہ رسد کی قوت توڑ دی نتیجہ یہ ہوا کہ دس سیر معمولی قیمت قرار پاگئی۔ اور اب قیمت بڑھ تو جاتی ہی لیکن گھٹنے کا نام نہیں لیتی اسی ماہ نومبر ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہی کہ گیہوں کا نرخ ۹½ سیر تھا لیکن خبر اُڑی کہ ولایت سے غلہ کی مانگ آئی ہی اور ہفتہ کے اندر قیمت بڑھ کر ۸½ سیر ہوگئی تو کیا کوئی کہہ سکتا ہی کہ برآمد کی وجہ سے اس قدر قلت ہوئی کہ قیمت میں دس فیصدی سے زیادہ اضافہ ہوگیا ہرگز نہیں۔ اس کا باعث وہی فطری خاصہ ہی کہ لوگ مقدار پر نظر رکھتے ہیں اوسط کا حساب کون نکالتا ہی اور سچ پوچھیے تو مقدار خون نکا دینے کے واسطے کافی ہی۔

بہرحال یہ ایک عام مشاہدہ ہی کہ ادہر ولایت سے مانگ آئی ادہر نرخ چڑھا جو کہ برآمد کے بعد بھی کم و بیش قائم رہتا ہی۔ پھر اگر کچھ عرصہ کے واسطے برآمد رکنے کا اعلان کردیا جاوے تو قیمت خود بخود اُترنے لگتی ہی۔ برآمد کی مقدار تو مجموعی پیداوار کی ۲-۴ فیصدی ٹھیری یہ کیسے ممکن ہی کہ اس مقدار کے باہر جانے سے ملک میں کوئی قابل لحاظ قلت پیدا ہوسکے۔ پس باوجود مقدار برآمد نسبتاً بہت کم ہونے کے قیمت میں فوری اور نمایاں اضافہ ہونے کا راز وہی معلوم ہوتا ہی جو ہم نے قیاس کیا۔ لیکن اس توجیہہ کو انسانی فطرت اور تخیل سے بھی خاص تعلق ہی۔ گو بظاہر قانون رسد و طلب کے

بہت موافق نہ بھی لیکن امید ہے کہ غور کرنے پر قرین حقیقت نظر آئے گی اور اس کا قانون سے اختلاف بھی محض سطحی ثابت ہوگا۔

بحالت موجودہ غلہ کی برآمد قطعاً روکنا ممکن نہ مفید۔ ہندوستان کی آج صنعت و حرفت تو نہایت ابتر حالت میں ہے۔ سب کچھ کھو کر اسکے لیے ایک عام پیشہ زراعت رہ گیا ہے۔ بیشمار مصنوعات جن میں سے بعض ناگزیر ضروریات اور اکثر تعیشات ہیں۔ وہ دوسرے ملکوں سے منگاتا ہے۔ بوجہ آزادی تجارت اس کی صنعت و حرفت سنبھلنے کی تو امید کم ہے اور بوجہ عادی ہو جانے کے وہ مصنوعات منگانا ترک نہیں کر سکتا بحالت موجودہ مصنوعات کی درآمد جاری رہنی یقینی ہے۔ علاوہ ازیں ہر سال ہندوستان ۲۲ کروڑ روپیہ بنام مطالبات وطن انگلستان کو ادا کرتا ہے۔ ان مطالبات کی اس سے قبل تفصیل ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کے ملازم انگریزوں کی تنخواہیں پنشنیں اور انگلستان سے لیے ہوئے قرض عامہ کا سود ان مطالبات کی خاص مدیں ہیں۔ یہ وہ رقم ہے کہ جس کی ادائگی سے ہندوستان کو کوئی مفر نہیں۔ تو اب غلہ اور پیداوار خام کے سوا ہندوستان کے پاس کیا دھرا ہے کہ وہ قیمت درآمد اور مطالبات وطن ادا کرے موجود درآمد و برآمد کے معاشی نتائج سے ہم قانون بین الاقوام کے تحت میں مفصل بحث کر چکے ہیں یہاں صرف اس قدر جتانا مقصود ہے کہ ہندوستان سے غلہ کی برآمد روکنا ممکن نہیں۔

لیکن برآمد غلہ کی بدولت ملک میں گرانی پھیل رہی ہے غلہ چونکہ ناگزیر ضروریات میں سب سے اوّل نمبر ہے لوگ جہانتک مقدور ہے خریدتے ہیں۔ لیکن اضافۂ قیمت کے ہاتھوں پریشان ضرور ہیں اور اگر ہندوستان کی معاشی حالت سے بحث کرنے والے خوش حال مصنف دیہات اور قصبات میں گھومیں تو زرد رو چہروں ضعیف جثوں پست قامتوں کی جدید کثرت صاف خبر دے گی کہ لوگوں کو کھانا کافی اور عمدہ نہیں ملتا۔

اُن کے بوسیدہ لباس ٹوٹے پھوٹے مکانات اور اُن کے ہاں ضروری سامان کی عدم موجودگی سے ثابت ہو گا کہ اگر وہ کچھ کماتے بھی ہیں تو بوجہ گرانی بیشتر خوراک کی نظر ہو جاتا ہی اور اتنا پس انداز نہیں کر سکتے کہ اپنی ظاہری حالت درست کر سکیں پس یہ خیال صحیح نہو گا کہ موجودہ گرانی کا بار لوگ محسوس نہیں کرتے - اسی کی بدولت بہت سوں کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا اور بہت سے دیگر ضروریات سے محروم رہ جاتے ہیں - اب سوال پیدا ہوتا ہی کہ بحالت موجودہ آیا کسی طرح اس گرانی کا کم ہونا ممکن ہی - برآمد تو رکنے سے رہی اور رسد جو کچھ ہی غنیمت ہی اس میں کسی نمایاں اضافہ کی گنجائش نظر نہیں آتی تو پھر قیمت کیونکر کم ہو سکتی ہی اس کی ایک صورت سمجھہ میں آتی ہی - اس سے قبل واضح ہو چکا ہی کہ مختلف ملکوں میں کسی عام چیز کی قیمت میں بقدر مصارف آمدورفت فرق رہتا ہی کہ مثلاً ہندوستان سے غلہ بھیجنے کے مصارف عہ من ہوں تو اگر ولایت میں غلہ کا نرخ صہ من ہو تو ہندوستان میں تقریباً للعہ من رہیگا - اب فرض کرو کہ غلہ پر عہ من محصول برآمد قائم کر دیا جائے تو گویا مجموعی مصارف آمدورفت عہ ر کے بجائے دو روپیہ ہو جائیں گے - اور ہندوستان اور ولایت کے درمیان غلہ کے نرخ میں بقدر عا فرق رہ سکے گا - اب سوال یہ ہی کہ اس جدید عہ کا بار کس ملک پر پڑے گا - چونکہ انگلستان میں غلہ اور دیگر پیداوار خام کناڈا - آسٹریلیا - مصر اور امریکہ سے بھی آتی ہی اور ہندوستان کو ولایت کے بازار میں ان ملکوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہی - ولایت میں تو اس محصول برآمد کی وجہ سے قیمت نہیں بڑھ سکے گی - البتہ ہندوستان میں قیمت گھٹ جائے گی مثلاً جب کہ ولایت میں قیمت صہ من تھی اور مصارف آمدورفت عہ تو ہندوستان میں نرخ للعہ من رہتا تھا - لیکن مصارف عا ہونے پر ولایت میں تو نرخ وہی صہ رہیگا - ہندوستان میں نرخ گھٹکر سے من کے قریب ہو جائے گا - اس

مثال سے محصول برآمد کا اثر دکھانا مقصود تھا۔ لیکن یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ محصول برآمد کی شرح ایسی متناسب اور موزوں ہونی چاہئے کہ برآمد بھی جاری رہے اور اندرون ملک قیمت بھی گھٹ جائے اگر محصول ضرورت سے زیادہ گرانبار ہوگا تو ہندوستان دوسرے ملکوں سے ولایت کے بازار میں مقابلہ کرنے سے معذور ہو جائے گا۔ برآمد رکے گی۔ چند در چند دقتوں کا سامنا ہوگا اور رہی تخفیف قیمت اس کی بھی ایک حد ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ محصول برآمد جس قدر زیادہ ہو اسی نسبت سے قیمت میں تخفیف بھی ہو اگر قیمت میں صرف بقدر عہ من تخفیف کی گنجائش ہے تو ۸عہ من محصول برآمد قائم کرنے سے برآمد رک جائے گی اور قیمت عہ سے زیادہ نہ گھٹ سکے گی۔ کس قدر محصول برآمد ہندوستان کے واسطے موزوں ہوگا کہ برآمد بھی نہ رکے اور ملک میں قیمت بھی واجبی رہے اس مسئلہ پر بہت کچھ اختلاف رائے ممکن ہے۔ لیکن محصول برآمد کی تجویز یہ کہکر ٹال دینا کہ گرانی کو برآمد سے کوئی تعلق ہے۔ برآمد کی مقدار مجموعی پیداوار کا نہایت قلیل جزو ہے برآمد کے معاوضہ میں نہایت ضروری ضروری چیزیں دوسرے ملکوں سے آتی ہیں۔ برآمد رکنے سے غلہ کی گرانی تو کم ہوگی نہیں البتہ سامان برآمد کی قیمت اور بھی گراں ہو جائے گی اور بحیثیت مجموعی ملک کو نقصان پہنچے گا یہ غیر متعلق استدلال معلوم ہوتا ہے اس قلیل مقدار کی برآمد روکنی اور خصوصاً بحالت موجودہ نہ تو ممکن اور نہ مفید برآمد تو جاری ہے لیکن بشرح مناسب محصول برآمد ضرور قائم کر دیا جائے تاکہ ہندوستان میں قیمت زیادہ بڑھنے نہ پاوے اس صورت میں برآمد کے فوائد بھی حاصل رہیں گے اور عوام بھی گرانی کی زیر باری سے بچ جائیں گے البتہ اگر کچھ نقصان ہوگا تو کاشتکاروں اور زمینداروں کا کہ اب غلہ کی بہت سی قیمت وصول ہونی دشوار ہو گی سو اس مسئلہ سے ہم ذیل میں جداگانہ بحث کرتے ہیں۔

محصول برآمد پر دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ غلہ کی قیمت گھٹنے سے کاشتکاروں کا نقصان ہوگا اور دو ثلث آبادی اسی زمرہ میں داخل ہے۔ لہذا بحیثیت مجموعی ارزانی ہندوستان کے حق میں مصر ہے۔ اس اعتراض میں ایک دلچسپ نکتہ مضمر ہے اس سے پہلے اعتراض میں یہ استدلال کیا گیا تھا کہ محصول برآمد سے ارزانی کے عود کرنے کی امید بھی عبث ہے۔ لیکن یہاں پر امکان ارزانی تسلیم کرکے فی نفسہ ارزانی کو بحیثیت مجموعی ہندوستان کے واسطے مضر قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں گروہ کثیر کا نقصان ہے پھر اب اس کا حال سنیئے۔ بیشک ۶۶ فیصدی آبادی کی وجہ معاش زراعت ہے لیکن کیا اس سے یہ مراد ہے کہ یہ سب گروہ خود کاشت زمینداروں کا ہے۔ یعنی سب کاشتکار مالک زمین ہیں۔ بقدر اپنی ضرورت کے غلہ رکھکر باقی فروخت کرتے ہیں اور گرانی کی بدولت خوب روپیہ لوٹتے ہیں اگر ایسا ہوتا بھی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ باقی ایک ثلث غیر کاشتکاری پیشہ آبادی پر گرانی کا یوں بار ڈالنا کہانتک مآل اندیشی اور بہبودی عامہ کے مطابق ہوتا۔ لیکن اس ۶۶ فیصدی میں سے تقریباً ۱۶ فیصدی تو غریب مزدور ہیں جو اجرت پر کاشتکاروں کا کام کرتے ہیں ان کی تو مثل ہے وہی کنواں کھودنا وہی پانی پینا۔ دن بھر کی سخت محنت سے جو کچھ کماتے ہیں شام کو بازار سے سامان خوراک خرید کر اپنی اور اپنے کنبہ کی پرورش کرتے ہیں۔ گرانی تو چشم زدن میں نمودار ہوجاتی ہے۔ لیکن ان کو اپنی اجرت بڑھوانے میں کچھ عرصہ لگتا ہے اور جب تک کہ یہ اجرت متعارف سابق صحیحہ کی برابر نہو جائے ان کو گرانی سے زیر باری ہوتی ہے ان کی اجرت میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ اس بار کے متحمل ہوسکیں۔ اب باقی رہے ۵۰ فیصدی اس میں کاشتکار اور زمیندار دونوں گروہ شامل ہیں سوائے موروثی کاشتکاروں اور خود کاشت زمینداروں کے۔ باقی کاشتکاروں کو

گرانی سے بہت کم فائدہ پہنچتا نظر آتا ہے اور ان ہی کا گروہ بڑا ہے جوں جوں پیداوار کی قیمت بڑھتی ہے زمیندار لگان بڑھاتے جاتے ہیں بہت سے کسانوں کو اپنے کھانے تک کے واسطے غلہ خریدنا پڑتا ہے ہمیشہ اڑے وقت وہ مہاجن کے پاس دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں اور بالآخر انہی کی عنایت کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں - رہے زمینداروں سو اُن کو الگ شکایات ہیں - موجودہ قوانین نے کاشتکار کو کچھ ایسی راہ بتائی ہے کہ بحالت استطاعت بھی بغیر نالش وڈگری وہ روپیہ دینا گوارا نہیں کرتا اور ان کارروائیوں کی دقتیں اور قانونی و رسمی مصارف اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ زمینداروں کا بھی ناک میں دم ہے حضرت اکبر نے اپنے اس قطعہ میں زمینداروں کا ہو بہو فوٹو کھینچا ہے۔

محتاج در وکیل و مختار ہیں آپ سارے عملوں کے ناز بردار ہیں آپ
آوارہ و منتشر ہیں مانند غبار معلوم ہوا مجھے زمیندار ہیں آپ

یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ وصولیابی لگان کی دقتیں اور مصارف بہت بڑھ گئے ہیں اور اُن کا باعث عدم استطاعت کے علاوہ کاشتکاروں کی نادہندی بھی ہے اور یہ بری عادت موجودہ قوانین کی الٹی چیونے ڈال دی ہے - حالانکہ اس میں کاشتکار اور زمیندار دونوں کا نقصان ہو رہا ہے عدم استطاعت کی حالتیں سو اُن سے خود ثابت ہے کہ غلہ کی گرانی سے کاشتکار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا - لگان خواہ وصول ہو یا نہو سرکاری مالگذاری ٹھیک وقت پر ادا کرنی لازمی ہے - مالگذاری کہنے کو تو لگان کی ۵۰ فیصدی ہے - لیکن عملاً اس کا اوسط زیادہ پڑتا ہے - مزید براں مختلف ناموں سے سرکاری مطالبات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ کاشتکاروں کی صرف ایک مختصر جماعت کو تو گرانی سے فائدہ ضرور پہنچا ورنہ اضافہ قیمت پیداوار کو زمیندار ہتھگوا لیتے ہیں - حالانکہ اُن کو شکایت ہے

حصہ چہارم
حاشیہ

کہ اُن کے پلہ بھی کم پڑتا ہی۔ سچ پوچھئے تو کاشتکار ہی کی خوش حالی مقصود بھی ہی۔ یہ زمانہ زمینداروں کے تو خلاف نظر آتا ہی اور اُن کی آمدنی پر رشک بلکہ حسد کی نظریں پڑ رہی ہیں۔ پس اگر گرانی سے زمینداروں کو فائدہ پہنچا بھی تو موجودہ رائے کے مطابق کچھ اچھا نہیں ہوا۔ البتہ کاشتکاروں کو کچھ پہنچتا تو ایک بات بھی تھی اُن کی مرفہ الحالی سے زراعت کی حالت سدھرتی۔ اول تو ہندوستان کی ۷۰ فیصدی آبادی کاشتکار نہیں بلکہ اُن میں زراعتی مزدور اور زمیندار بھی شامل ہیں دوم کاشتکاروں کی جماعت کثیر گرانی سے مستفید نہیں ہو رہی پس ایسے خود کاشت زمیندار اور موروثی کاشتکار جن کو درحقیقت گرانی غلہ سے نفع مل رہا ہی۔ کل آبادی کے ۲۰ - ۲۵ فیصدی ہوں تو ہوں۔ پس ارزانی سے ۷۰ فیصدی آبادی کو نقصان پہنچنے کا عذر زیادہ قرین حقیقت نظر نہیں آتا۔

ہندوستان میں ارزانی و گرانی کے متعلق جو اصول بتائے جاتے ہیں اُن میں گاہ گاہ ہی تضاد نمایاں ہو جاتا ہی۔ غلہ کیسی ناگزیر ضرورت ہی کہ اس کو خریدے بغیر چارہ ہی نہیں اور اسے بغیر دو روز بھی زندگی دشوار ہی لیکن اس کی گرانی مفید بتائی جاتی ہی کیونکہ اس میں کاشتکاروں کا فائدہ ہی اور بہت سی مصنوعات ہیں کہ جن کی چنداں ضرورت نہیں لیکن جب اُن کی درآمد پر محصول تامین تجویز کیا جاتا ہی تاکہ ہندوستان کے صناعوں کو سہارا ملے اور سودیشی تحریک میں جان پڑے تو فوراً جواب ملتا ہی کہ ہندوستان غریب ملک ہی یہاں چیزیں ارزاں سے ارزاں فروخت ہونی چاہئیں ذرا سی گرانی بھی بیشمار غربا پر ظلم ہوگا اور صناعوں کے فائدہ کی خاطر عوام کی زیرباری گوارا نہیں کی جا سکتی۔ ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا۔ ترقی زراعت کی اس قدر فکر۔ کاشتکاروں کی اس قدر سرپرستی صنعت و حرفت کی طرف

حصہ چہارم
باب دہم

ایسی عدم توجہی - صناعوں سے ایسی سرد مہر - معاشی پالیسی کا یہ فرق بہت اہمیت رکھتا ہے - تجارت بین الاقوام اور ہندوستانی تجارت خارجہ کی سرگذشت ان دونوں عنوان کے تحت میں ہم اس سے مفصل بحث کر چکے ہیں -

ایک تیسرا اعتراض یہ بھی ہے کہ جب غلہ ارزاں ہوگا تو زراعت گھٹ جائے گی - اور قلت رسد کی بدولت پھر گرانی عود کرے گی - ہمارے خیال میں ایسی زمین کہ موجودہ قیمت بغیر جن کی کاشت محال ہو زیادہ نہیں ہیں - بلکہ باوجود مناسب قیمت بھی بہت زیادہ کھیتوں کی کاشت بحال رکھنی ممکن ہے - البتہ موروثی کاشتکار اور زمینداروں کی آمدنی ضرور گھٹ جائے گی - پس غلہ کی ارزانی ان دو گروہوں کے حق مضر ہو تو ہو ورنہ عوام کو اس سے ضرور نفع پہنچے گا -

حاصل کلام یہ کہ گرانی کی پہلی صورت یعنی جو گرانی طلب کے رسد سے بڑھنے پر نمودار ہو رہی ہے چند در چند اسباب کا نتیجہ ہے جن میں سے اکثر کی اصلاح و ترمیم ہمارے قبضۂ قدرت سے باہر ہے - تاہم پر شرح مناسب محصول برآمد قائم کرنے سے گرانی کم ہونے کی امید نہ بیجا نہیں معلوم ہوتی اور کم از کم تجربہ کی ضرور مستحق ہے -

اضافہ زر

(۲) گذشتہ باب میں قدر زر اور مسئلہ گرانی کے عنوان سے واضح کیا جا چکا ہے کہ کثرت زر بھی اضافۂ قیمت کا باعث ہو سکتی ہے - چنانچہ یورپ اور امریکہ کی گرانی کا یہی حال ہے اضافہ زر کی تین صورتیں ہیں - زر فلزاتی کا اضافہ - بنکوں کے تمام نوٹ اور چک کا رواج - گردش زر کی تیزی - جس کو اصطلاحاً کارکردگی زر کہتے ہیں زر کے دو مصرف ہیں - اول کاروبار - دوم پس اندازی - معاشی ترقیات کی بدولت زر سے روز بروز پہلا کام زیادہ لیا جا رہا ہے -

ذیل میں ہم روپیہ نوٹ بنک چک اور کاروبار کے متعلق اعداد و شمار

حصہ چہارم
باب پنجم

اور انڈکس نمبر درج کرتے ہیں ۔ جن کے مطالعہ سے ہر ایک کے اضافہ کے مدارج واضح ہوں گے ۔

تفصیل زر

	سنہ ۱۸۹۰	سنہ ۱۸۹۵	سنہ ۱۹۰۰	سنہ ۱۹۰۵	سنہ ۱۹۱۰	سنہ ۱۹۱۱	سنہ ۱۹۱۲
(ا) روپوں کی مجموعی تعداد	ایک ارب ۲۰ کرور	ایک ارب ۲۸ کرور	ایک ارب ۲۱ کرور	ایک ارب ۴۲ کرور	ایک ارب ۷۶ کرور	ایک ارب ۸۰ کرور	ایک ارب ۸۵ کرور
(ب) کل نوٹ بحساب روپیہ	۲۶ کرور	۲۶ کرور	۳۰ کرور	۴۵ کرور	۵۵ کرور	۶۱ کرور	۶۹ کرور
(ج) روپیہ جو بطور نوٹوں کے سرمایہ محفوظ کے سرکاری خزانہ میں رہا	۱۸ کرور	۱۸ کرور	۹ کرور	۱۴ کرور	۲۶ کرور	۱۵ کرور	۱۷ کرور
(د) سرمایہ محفوظ طلا	۔	۔		۔	۳ کرور	۳ کرور	۶ کرور
(ھ) دس دس ہزار روپیہ والے نوٹ	۸ کرور	۴ کرور	۷ کرور	۹ کرور	۱۳ کرور	۱۴ کرور	۱۸ کرور
(س) کل زر جو بشکل روپیہ نوٹ جاری ہے	ایک ارب ۲۱ کرور	ایک ارب ۳۶ کرور	ایک ارب ۳۳ کرور	ایک ارب ۷۳ کرور	ایک ارب ۹۹ کرور	۲ ارب ۹ کرور	۲ ارب ۱۳ کرور
سنہ ۱۸۹۰-۹۴ کا اوسط ۱۰۰ مان کر جاری مانند زر کا انڈکس نمبر	۹۲	۱۰۱	۱۰۳	۱۲۶	۱۵۲	۱۶۰	۱۶۴

حصہ چہارم
باب دہم

اوپر کے نقشہ میں مد ۱ میں روپوں کی وہ تعداد درج ہی جو ملک میں موجود تھی۔ واضح ہو کہ جب چاندی اس قدر ارزاں نہ تھی اور روپیہ کی قدر فلزاتی اس کی قدر قانونی کے برابر تھی تو روپیہ پگھلا پگھلا کر لوگ اس سے زیور اور نقرئی سامان تیار کرتے تھے۔ جیسا کہ آج کل اشرفی کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہی۔ نیز روپیہ اب تک برطانوی مشرقی افریقہ کو جاتا رہتا ہی جہاں وہ بطور زر چلتا ہی۔ چنانچہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ ۱۸۸۴ء میں ایک ارب ۹ کروڑ روپیہ موجود تھا۔ ۱۸۸۵ء سے لیکر ۱۹۱۲ء تک کل ایک ارب ۶۲ کروڑ جدید روپیہ بنا جس میں سے اسی عرصہ میں تقریباً ۸۶ کروڑ روپیہ زیور سامان اور برآمد میں کام آیا گویا اس دوران صرف تقریباً ۷۶ کروڑ خالص اضافہ ہوا اور ایک ارب ۹ کروڑ روپیہ پہلے ہی موجود تھا۔ پس ۱۹۱۲ء میں روپیہ کی مجموعی تعداد ایک ارب ۸۵ کروڑ روپیہ تھی۔ نیز اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ روپیہ کی تعداد ۱۸۹۵ء میں ایک ارب ۲۸ کروڑ رہ کر سنہ ۱۹ء میں ایک ارب ۲۰ کروڑ کیوں رہ گئی۔ اس کا باعث وہی روپیہ کا بطور زیور و برآمد استعمال ہی۔

مد ب میں وہ کل نوٹ درج ہیں جو سرکار نے جاری کیے۔ لیکن ان نوٹوں کے بدلے میں ہر وقت عند الطلب روپیہ دینے کا سرکار نے پکا وعدہ کر لیا ہی۔ پس نوٹ بھنانے کی غرض سے سرکار جس قدر روپیہ احتیاطاً ہر وقت موجود رکھتی ہی وہ مد ج میں دکھایا گیا ہی۔ سرکار نے ایک اور فنڈ بنام سرمایہ محفوظ طلا قائم کیا ہی جس کے اغراض و مقاصد کا بیان یہاں بے محل ہوگا۔ صرف اتنا جاننا کافی ہی کہ اس فنڈ کا روپیہ بھی نوٹوں کے سرمایہ محفوظ کے روپیہ کی مانند بیکار پڑا رہتا ہی۔ یہ فنڈ د کی مد میں درج ہی۔ دس دس ہزار روپیہ کے نوٹ بھی بیشتر بطور خزینۃ القدر کام آتے ہیں وہ لوگوں کے پاس رکھے رہتے ہیں کاروبار میں شاذ و نادر چلتے ہیں۔ پس ج ۔ د اور س مدیں ہیں

کہ جن کا زر بیکار رکھا رہتا ہے اور کاروبار میں کام نہیں آتا ان تینوں مدوں کا مجموعی زر۔ کل روپیہ اور نوٹوں کے مجموعے سے منہا کرنے کے بعد مد ص حاصل ہوتی ہے جس میں وہ زر درج ہے جو خواہ بشکل روپیہ یا نوٹ کاروبار میں جاری ہے۔ اسی زر کی مقدار کے انڈکس نمبر بمد ص درج ہیں جن میں وہی سنہ ۱۸۹۰ کا اوسط سو فرض کیا گیا ہے۔

اضافہ زر کی کیفیت تو معلوم ہو چکی۔ اب بنکوں کا حال سُنئے۔ ہندوستان میں ایسے ۳۰ بنک جاری ہیں جن کا اصل وصول شدہ اور اندوختہ پانچ لاکھ یا اس سے زیادہ ہے۔ ان بنکوں کے ۷۴۳ دفتر ہندوستان کے ۱۴۰ شہروں میں قائم ہیں مزید براں ان سے چھوٹے چھوٹے بنک بھی ہیں اور نیز ہند و مہاجن زر کا کاروبار کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا ۳۰ بنکوں کی مجموعی ترقی نقشۂ ذیل سے ظاہر ہے۔

	اصل و اندوختہ	عوام کا جمع کردہ روپیہ	بنکوں کے کل روپیہ کی تعداد	انڈکس نمبر
سنہ ۱۸۹۰	۴ کرور ۹۹ لاکھ روپیہ	۲۵ کرور ۱ لاکھ	۳۰ کرور	۹۷
سنہ ۱۸۹۵	۵ ″ ۸۵ ″ ″	۲۹ ″ ۹ ″	۳۴ ″ ۹۴ لاکھ	۱۱۴
سنہ ۱۹۰۰	۶ ″ ۸۷ ″ ″	۳۱ ″ ۴۶ ″	۳۸ ″ ۳۳ ″	۱۲۵
سنہ ۱۹۰۵	۷ ″ ۸۶ ″ ″	۵۱ ″ ۳۰ ″	۵۹ ″ ۱۶ ″	۱۹۲
سنہ ۱۹۱۰	۱۰ ″ ۶۷ ″ ″	۸۲ ″ ۳۱ ″	۹۲ ″ ۹۹ ″	۳۰۲
سنہ ۱۹۱۱	۱۱ ″ ۱۳ ″ ″	۸۴ ″ ۹۱ ″	۹۶ ″ ۴ ″	۳۱۳

کلکتہ بمبئی۔ مدراس اور کراچی کے حساب گھروں میں بمقدار ذیل چک پیش ہوئے

سنہ ۱۹۰۱	۲ ارب ۱۳ کرور ۲۸ لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۰۲	۲ ″ ۳۲ ″ ۱۷ ″ ″
سنہ ۱۹۰۳	۲ ″ ۴۷ ″ ۳۱ ″ ″

سنہ	ارب		کرور		لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۰۴	۰ ارب	۵۴	کرور	۷۳	لاکھ روپیہ
سنہ ۱۹۰۵	۳	//	۳	//	۷۰ //
سنہ ۱۹۰۶	۳	//	۳۴	//	۴۹ //
سنہ ۱۹۰۷	۳	//	۶۹	//	۶۹ //
سنہ ۱۹۰۸	۳	//	۶۲	//	۶۴ //
سنہ ۱۹۰۹	۳	//	۶۷	//	۲ //
سنہ ۱۹۱۰	۴	//	۱۷	//	۶۳ //
سنہ ۱۹۱۱	۴	//	۶۲	//	۱۴ //
سنہ ۱۹۱۲	۵	//	۲۸	//	۳۸ //

بنکوں کے بیان سے واضح ہوا کہ ہندوستان میں طریق اعتبار روز بروز ترقی کررہا ہے اور اعتبار گویا اضافۂ زر کی عام صورت بنا ہوا ہے۔ اس واقعہ کی اس سے قبل بھی تشریح ہوچکی ہے اضافۂ زر کی تیسری صورت اُس کی گردش کی تیزی ہے سو اس کا صحیح اندازہ کرنا محال ہے۔ تاہم تیزی گردش بڑھی ضرور ہے۔

روپیہ کی قدر فلزاتی قدر قانونی سے گھٹی۔ دفینوں میں اشرفی اور سونا روپیہ کا قائم مقام بن رہا ہے۔ اور روپیہ دفینوں سے باہر نکل رہا ہے۔ پس روپیہ کا صرف ایک مصرف کاروبار ہی باقی ہے۔ سو اس میں بھی نمایاں ترقی ہورہی ہے۔

اب ہم اضافۂ زر اور رواج اعتبار کے انڈکس نمبر درج کرکے اول سد زر کی حالت دوم کاروباری ترقی کے انڈکس نمبر سے طلب زر کی کیفیت پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ بحیثیت مجموعی زر کی رسد اس کی طلب سے بیش بیش رہی اور زر کی قدر میں بھی تھوڑی بہت تخفیف ضرور ہوئی۔

حصہ چہارم
باب دہم

انڈکس نمبر	سنہ ۱۸۹۰	سنہ ۱۸۹۵	سنہ ۱۹۰۰	سنہ ۱۹۰۵	سنہ ۱۹۱۰	سنہ ۱۹۱۱	سنہ ۱۹۱۲
زر	۹۲	۱۰۱	۱۰۳	۱۲۶	۱۵۲	۱۶۰	۱۶۳
اعتبار	۹۶	۱۱۶	۱۳۲	۱۸۶	۲۷۰	۲۸۹	
کاروبار	۹۷	۱۱۰	۱۲۸	۱۶۳	۲۰۲	۲۲۲	

اسباب داخلی و خارجی

(۷) گرانی کے جس قدر اسباب اوپر بیان ہوئے وہ سب ایک کے سوا داخلی ہیں یعنی وہ خود ہندوستان کے اندر ہی اندر نمودار ہوکر اپنا اثر ڈال رہے ہیں لیکن برآمد پیداوار سبب خارجی اس وجہ سے کہلاتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے دوسرے ملکوں کی گرانی کا بھی اثر پڑتا ہے۔ مثلاً اگر امریکہ یا مصر میں روئی کی فصل ماری جائے یا کناڈا اور آسٹریلیا میں غلہ کم پیدا ہو تو ہندوستان کی روئی اور غلہ کی طلب دوسرے ملکوں میں معمول سے زیادہ ہوگی۔ اور خود ہندوستان میں گرانی پھیلے گی۔ ہندوستان کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی طرح طرح کے داخلی و خارجی اسباب کم و بیش گرانی بڑھا رہے ہیں۔

جنگوں کا اثر

(۸) منجملہ بہت سے اسباب کے جنگوں نے بھی دنیا بھر میں کچھ کم گرانی نہیں پھیلائی۔ گرانی کے زمانہ میں کثیر المقدار اصل و محنت جس سے زراعت اور صنعت میں بہت کچھ ترقی ہوتی۔ سامان جنگ کی تیاری اور کشت و خون میں کام آتی ہے۔ کھیت اجڑ جاتے ہیں۔ کارخانے ویران ہو جاتے ہیں۔ بے شمار اصل گولہ بارود میں اڑ جاتا ہے۔ لاکھوں مزدور کٹ جاتے ہیں۔ ہر جنگ کے دوران میں فوری گرانی نمودار ہوتی ہے جس کا کہیں مدتوں بعد معاشی ترقیات سے ازالہ ہوتا ہے سنہ ۱۸۹۹ سے لڑائیوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ گزشتہ ۱۸ سال کے اندر اندر ۵ لڑائیاں تو ختم ہو چکیں و چھٹی جنگ جو تاریخ عالم میں سب سے بڑی شمار ہونے کے قابل ہے ابھی تک جاری ہے اور عنقریب ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ اسی دوران میں اول اسپین اور امریکہ میں لڑائی ہوئی۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ کے باشندوں نے انگلستان سے

لڑائی لڑی۔ بعدہ روس و جاپان میں معرکہ عالم جنگ ہوئی۔ پھر جنگ طرابلس اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی سلسلہ میں ٹرکی جنگ بلقان میں گرفتار ہو گئی اور مجروحوں کے زخم بھی نہ بھرنے پائے تھے کہ اگست ۱۹۱۴ء سے یورپ میں وہ جنگ چھڑی ہے کہ خدا کی پناہ۔ اس جنگ کے جان و مال کا نقصان اعداد و شمار سے باہر ہے۔ کروڑہا انسان ضائع اور ناکارہ ہو چکے۔ لیکن ہر ملک میں فوجوں کی بھرتی جاری ہے۔ مصارف جنگ کا مجموعہ بھلا کوئی کیا شمار کر سکتا ہے۔ ابتدا جنگ سے صرف انگلستان کے مصارف جنگ کا روزانہ اوسط ساڑھے سات کروڑ روپیہ یعنی پڑ رہا ہے۔ اسی سے فرانس۔ روس جرمنی آسٹریا ٹرکی اور دوسرے چھوٹے شرکا کے مصارف کا تخمینہ کرنا چاہئے۔ پھر کروڑہا روپیہ قیمتی سامان و اسباب جہازوں میں ہر روز غرق ہوتا رہتا ہے۔ معرکۂ جنگ کے قرب و جوار میں گولہ باری اور لوٹ مار سے جدا بربادی پھیل رہی ہے۔ صدیوں کی جدوجہد بعد جو دنیا نے مالی ترقی کی تھی دو سال کی لڑائی نے اس کو بہت کچھ خاک میں ملا دیا۔ دنیا کے حق میں اس جنگ کی مثال ایسی نظر آتی ہے کہ کسی نہایت توانا اور تندرست آدمی کی فصد لی جائے اور اتنا خون خارج ہو کہ اس پر بہت زیادہ ضعف مسلط ہو جائے۔ اب اگر اعضائے رئیسہ خراب نہوئے تو ممکن ہے کہ بتدریج مدتوں میں پھر اتنا ہی خون پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ ۱۸۷۰ء کی جنگ میں فرانس نے جرمنی سے سخت زک اُٹھانے کے باوجود ۲۵ - ۳۰ سال کے اندر اندر اپنی حالت سنبھال لی۔ ورنہ ضعف بیام موت تو ہوتا ہی ہے۔ اور کسی قوم کے اعضائے رئیسہ کیا ہیں۔ اتفاق۔ آزادی۔ محنت اولوالعزمی اور استقلال۔ اس موقعہ پر بھی انگلستان اپنے قومی خاصہ استقلال کی حیرتناک مثال دکھا رہا ہے اور دنیا میں استقلال بڑی زبردست طاقت ہے۔

حصہ چہارم باب دہم

المختصر علاوہ گوناگوں اسباب کے گزشتہ جنگ بھی گرانی کے خاص اسباب ہیں اور خصوصاً موجودہ جنگ یورپ کا اثر تو قیمتوں پر نہایت نمایاں پڑ رہا ہے اور عرصہ تک بحال رہے گا۔

گرانی کے نتائج

(۹) یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ بعض طبقوں کی آمدنی بھی گرانی کے ساتھ جلد جلد بڑھتی ہے اور بعض کی آمدنی مقابلتہً مستقل ہوتی ہے طبقہ اول الذکر کو تو گرانی کا بار محسوس نہیں ہوتا یا بہت کم ہوتا ہے۔ لیکن آخر الذکر طبقہ خوب زیر بار ہوتا ہے۔ مزدوری پیشہ لوگ جب قیمتیں بڑھنے سے اجرت صحیحہ میں کمی دیکھتے ہیں تو اجرت متعارف بڑھانے پر زور دیتے ہیں اور باوجود مزاحمت رسم و رواج اپنی اجرت میں اضافہ کرا ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ ہر قسم کے مزدور کی اجرت کم و بیش بڑھ رہی ہے اور اُن کی اجرت جوں جوں بڑھتی ہے گرانی کا بار کم محسوس ہوتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ ہر طبقے کے مزدوروں کی اجرت متعارف میں جو اضافہ ہوا اور ہو رہا ہے وہ اجرت صحیحہ کو بحال رکھتا ہے اور گرانی کا بار محسوس نہیں ہونے دیتا لیکن ہندوستان میں اجرت صحیحہ پہلے ہی سے اس قدر ادنےٰ ہے کہ مزدور کو محتاج زندگی پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ زندگی کے ادنےٰ ادنےٰ لطفوں سے بھی وہ اکثر محروم رہتا ہے یورپ اور امریکہ کے مزدوروں کی عیش و عشرت تو اس کے خواب و خیال سے بھی باہر ہیں۔ پھر ایسی صورت میں اگر سابق اجرت صحیحہ برقرار بھی ہے تو کون اطمینان اور فخر کی بات ہے اور اگر اس میں کچھ اضافہ بھی ہوا تو اس قدر قلیل کہ نہونے کی برابر۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی مزدور کو اب کھانا کپڑا اور مکان اچھا ملتا ہے۔ اور وہ ادنےٰ درجہ کی تعیشات کا بھی لطف اُٹھاتا ہے۔ یہ قول اس حد تک صحیح نہیں جتنا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں معاشی ترقیات کے اس قدر وسائل یکجا ہیں کہ اگر اُن سے کام لیا جاتا تو ایک صدی کے امن و امان بعد

ہندوستان کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق نمودار ہو سکتا تھا۔ زرخیز زمین ضروری معدنیات کی کثرت۔ جنگل۔ پہاڑ۔ دریا۔ ہر قسم کا موسم اور آب و ہوا باشندے بھی جفاکش اور کفایت شعار۔ اور اُن کی صنعت و حرفت کی گزشتہ ترقیات سے ثابت ہو کہ ذہانت اور جدت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ جہالت اور بدامنی یہ دو وبال تھے جنھوں نے ملک کو ابھرنے نہ دیا لیکن اس پر بھی جو ترقیاں اس نے کر کر دکھائیں واقف کار لوگ اتنک انگشت بدنداں ہیں موجودہ حالت پر لوگ خوش اور نازاں ہیں لیکن ملک کے پورانے واقف کار کف افسوس ملتے ہیں۔ صنعت و حرفت بہت کچھ غائب ہو کر بس زراعت اندہر کی ایک لکڑی ہاتھ میں رہ گئی ہو اور جبکہ دیگر ممالک میں بوجہ مرفہ الحالی مزدور بہچانے نہیں پڑتے یہاں کے مزدور کا پیٹ بھر روٹی کہانا اور کم قیمت ولایتی کپڑا پہننا ترفہ ات سمجھی جاتی ہو۔ مصنوعات کی درآمد میں جو روز افزوں اضافہ دکھا کر مرفہ الحالی ثابت کی جاتی ہو اس سے ملکی صنعت و حرفت کی تباہی اور عوام کے بیجا اسراف بھی تو ظاہر ہوتے ہیں کیا عجب ہو کہ موجودہ عیش و عشرت پر گھر پھونک تماشا دیکھنے کی مثل صادق آئے اور جب قدیم اندوختہ ختم ہو لے تو رنگ دگرگوں ہو جائے۔ پرتگال اور بالخصوص اسپین نے کیا کیا لطف نہ اُڑائے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں کیا حشر ہوا۔ اب بھلا سو بھلا۔ دوسرے درآمد کی بڑی مقدار دیکھکر مرعوب ہونا بھی غلطی ہو ہندوستان کی تیس کروڑ آبادی بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہو۔ تب کہیں معلوم ہو گا کہ اوسط درآمد کیا رہا اور ہندوستان میں کس قدر مصنوعات صرف ہوئے۔ جو کہ مرفہ الحالی کی علامت بتائی جاتی ہو۔ اگر دیگر ترقی یافتہ ممالک کا معیار زندگی ہندوستان کو میسر ہوتا تو درآمد کی دس گنی مقدار بھی تو کافی نہ ہوتی۔

سوم ہندوستان میں سب سے بڑی جماعت غریب مزدوروں کی ہو اور انہیں کی حالت ملکی حالت کا معیار سمجھی جاتی ہو۔ لیکن درآمد میں اُن کے صرف کا جو مال آتا ہو وہ نسبتاً بہت کم ہوتا ہو اور بڑی مقدار خود سرکار۔ یورپین صاحبان اور روسا و والیان ملک کے حصہ کی ہوتی ہو۔ گویا اگر ہم درآمد ہی کو معیار مرفہ الحالی مان لیں تب بھی اس سے قابل اطمینان حالت منکشف نہیں ہوتی۔

ہندوستان کے گروہ کثیر یعنی مزدوری پیشوں کی حالت تو مختصراً اوپر بیان ہوئی اب ملازمت پیشہ۔ پنشن خوار اور اُن لوگوں کو لیجئے جن کی آمدنی مستقل ہو اور اجرت کی مانند بر بنائے گرانی اس میں اضافہ ممکن نہیں اُن کی حالت ضرور سقیم ہوتی جاتی ہو اور ہونا کیا عجب ہو۔ جب آمدنی معین ہو اور بوجہ گرانی مصارف بڑھیں تو خود بخود تنگدستی آگھیرے گی۔ سرکاری ملازموں میں جو حق نذرانے اور تحفہ تحائف کی شکل میں رشوت ستانی کی وبا کھلم کھلا پھیل رہی ہو۔ اس کا باعث علاوہ اخلاقی کمزوری کے گرانی بھی ہو۔ جن لوگوں کی آمدنی معین ہو وہ سو طرح پر جائز اور ناجائز اضافہ کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی مرفہ الحالی کم نصیب ہوتی ہو اور یہ گروہ گرانی سے بہت نالاں رہتا ہو۔

ہندوستان میں ایک طبقہ وہ بھی ہو جن کے مصارف آمدنی سے ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں جو کہ خود ناکارہ ہو لیکن بزرگون کی میراث و اندوختہ سے رنگ رلیاں مناتا ہو۔ یہ گروہ بھی سامان درآمد کا بہت شائق ہو اور اس کے صرف سے مرفہ الحالی اخذ کرنا حقیقت کے برعکس ہوگا ایسے فیشن ایبل جنٹلمینوں پر حضرت اکبر نے بھی خوب فقرے کسے ہیں اور اُن کا لطف لطف چیاں ہوتا ہو۔

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے ‫‬ لطف کیا گر لد لیے موٹر پہ رہ کے زور سے

تارک الصنعوں میں دو چار نے پایا عروج ‫‬ خیر اتنے شہد اتھے تو یہ غازی بھی سہی

حصہ چہارم ماہ دہم

ان کی سب باتوں کو اکبر سیکھ لے خود وہ فرمائیں گے پھر آ بھبک لے
آج وہ ہنستے ہیں میرے جبہ و شلوار پر ایکدن اُن کو فلک بدہوائے دہوتی تو سہی

امیر زادے تو درکنار متوسط الحال لوگوں کی اولاد بھی فیشن پر ایسی لٹو ہی کہ اُن کے اسراف سے والدین کا ناک میں دم ہی۔ بہت سے بنتے کام بگڑ جاتے ہیں اور چند ہی روز میں گھر کا صفایا ہو جاتا ہی۔ ایسی افسوسناک مثالوں کی کوئی کمی نہیں بلکہ اُن کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہی اگر معیار زندگی کی ایسی ترقی مرفہ الحالی کی علامت ہی۔ تو نہ معلوم خستہ حالی کی پھر کیا صورت ہوسکتی ہی۔

ریل - معدنیات - کارخانجات وغیرہ بھی معاشی ترقی کے ثبوت میں پیش کیئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہی کہ ان میں سے اکثر کام خارجی اصل سے چل رہے ہیں اور ان کا منافع ملک سے باہر جاتا ہی۔ البتہ کچھہ قلیوں مزدوروں اور کلرکوں کو جو تنخواہیں ملتی ہیں وہ ہندوستان کا حصہ ہی۔ نیز ہندوستانیوں کو اپنے کاروبار میں بھی ان ترقیات سے کچھہ مدد ضرور ملتی ہی۔

حاصل کلام یہ کہ ہندوستان میں جو گرانی پھیلی ہوئی ہی اس کے اسباب و نتائج ترقی یافتہ ممالک کے مقابل بالکل مختلف ہیں یہاں اس کا باعث قلت رسد ہی اور وہاں کثرت زر یہاں پر گرانی بار محسوس ہوتی ہی اور وہاں الٹی اُبھارتی ہی یہ جو کثرت درآمد اور ملکی معاشی ترقیات سے عام مرفہ الحالی کا ثبوت دیا جاتا ہی اس میں چند دقیق نکات مضمر ہیں۔ جن کے نظر انداز ہونے سے بہت کچھہ مغالطہ ممکن ہی۔ مرفہ الحالی اس کے عشر عشیر بھی نہیں بڑہی جو ظاہری علامات سے ثابت کی جاتی ہی اور اگر اس قدر مرفہ الحالی تسلیم بھی کرلی جائے تو ہندوستان کے معاشی وسائل پر نظر کرتے ہوے دیگر ممالک کے مقابلہ میں وہ قابل اطمینان نہیں شمار ہوسکتی۔ مزید براں مرفہ الحالی

حصہ چہارم
باب دہم

کی بھی دو قسم ہیں - ایک چندروزہ اور دوسری مستقل - جن ملکوں کو صرف دولت میں ہے وہ بھی چاہیں تو کچھ روز لطف اُڑالیں لیکن یار دن کی چاندنی پھر وہی اندھیری رات ذرا پرتگال اور اسپین کا حشر ملاحظہ ہو - اس کے برعکس جن ملکوں نے ذرائع پیدائش دولت اپنے قابو میں کرلیے ہیں ہمیشہ مرفع الحالی اُن کے قدموں سے لگی رہی گی - امریکہ کا طرز بھی خاص طور پر سبق آموز ہے - تجارت بین الاقوام میں ہم بالتفصیل واضح کرچکے ہیں کہ صنعت وحرفت چھوڑ کر زراعت پر قناعت کرنا مآل اندیشی کے خلاف ہے - یہ دونوں صیغہ پیدائش پہلو بہ پہلو ترقی کریں - دیرپا معاشی ترقی کی یہی صورت ہے - اور ہندوستان میں اس کی تکمیل ممکن ہے - خوش قسمتی سے ہماری سرکار کو بھی ترقی صنعت وحرفت کی طرف روز بروز توجہ بڑھ رہی ہے اور وہ چاہے تو اب بھی تلافی مابعد کر دکھائے اور ایسا ہی ہوگا بھی انشاء اللہ تعالیٰ -

مسئلہ افلاس ہند

(۱۰) آیا ہندوستان میں مرفہ الحالی بڑھ رہی ہے یا افلاس - یہ ایک نہایت پیچیدہ اور تفصیل طلب مسئلہ ہے اس کتاب میں جہاں جس قدر گنجائش نظر آئی ہم نے اس کی توضیح کردی لیکن بلحاظ اہمیت اس کی مفصل بحث از حد ضروری ہے اور اس کے واسطے ایک جداگانہ کتاب زیادہ موزوں ہوگی - یورپین صاحبان اکثر مرفہ الحالی کے موید ہیں اور ہندوستانی حضرات افلاس کے شاکی - دولت ہندی کے افسانوں سے تو سیول رپورٹیں لبریز رہتی ہیں لیکن افلاس کی شکایت کا شور گاہے گاہے اُٹھتا رہتا ہے - چنانچہ ناظرین کی دلچسپی کے واسطے اوّل ۷ نومبر سنہ ۱۹۱۶ء کے اخبار نئی روشنی کا ایک مضمون بعنوان **ہندوستان کا افلاس** پیش کرتے ہیں جس کو عام خیالات کا عکس سمجھنا خلاف واقع ہوگا رہی مضمون کی صحت گو اس پر کچھ خدشہ ہونے کا اعتراض ہوسکے لیکن وہ بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا - بعدہٗ اسی لب ولہجہ کا ایک مختصر نوٹ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء کے اخبار

صداقت سے لیکر درج کرتے ہیں جس کی صحت میں کلام نہیں ہوسکتا۔

نئی روشنی

۷۔ نومبر سنہ ۱۹۱۲ء

ہندوستان کا افلاس

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں گھر میں بہار آئی ہے

جس زمانہ میں ہم کالج میں پڑھتے تھے ہمارے کالج کے پروفیسر اقتصادیات نے ایک لکچر دیا تھا جس میں یہ ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان کی دولت دن بدن ترقی کر رہی ہے اور اس کا ثبوت انہوں نے درآمد کے شمار و اعداد سے پیش کیا تھا کہ اگر ہندوستان کی دولت بڑھ نہیں رہی ہے تو آخر بغیر روپیہ کے ہر سال غیر ممالک کے چیزوں کی خریداری میں اضافہ کیسے ہو رہا ہے۔ افسوس! ہمارے پروفیسر صاحب اس حقیقت سے واقف نہ تھے کہ ہندوستانی گھر پھونک تماشا دیکھ رہے ہیں۔ غیر ممالک کی اشیاء کی خریداری اُن کی مالی ترقی کی علامت نہیں ہے بلکہ اُن کے اسلاف کے پس ماندہ سرمایہ کی تباہی کا نشان ہے یہ گلوگیر طوق کالر صرف اُن کی گردنوں کو لقمہ کبوتر نہیں بنائے ہوئے ہے بلکہ اُن کی اقتصادی ترقی کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ یہ ڈاسن اور ہتھ کے بوٹ اُن کے پانوں کا حُسن نہیں بڑھا رہے ہیں بلکہ افلاس سے اُن کو پابہ زنجیر کر رہے ہیں۔ ہندوستان باوجود اپنی زرخیزی اور شادابی کے اسوقت دنیا میں سب سے زیادہ نادار و مفلس ملک ہے دنیا کے مختلف ممالک کا خیال اس کے برعکس ہے۔ ماضی کے افسانے سُنکر وہ اب بھی یہی تصور کر رہے ہیں کہ دولت کی دیوی کا جلوہ اگر کہیں دکھلائی دیتا ہے تو وہ سرزمین ہند ہیں لیکن

حصہ چہارم
باب دہم

حقیقت یہ ہی کہ ہندوستانیوں کے دروازوں پر افلاس کا دیو پہرا دیا کرتا ہی۔ ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ ہندوستان کے وسائل آمدنی کسی ملک سے کم ہیں بلکہ خدا کے فضل سے اس کی زرخیزی یورپ سے براعظم سے آنکھ ملا رہی ہی لیکن موجودہ حالت یہ ہی کہ ہم بستر ناداری پر پڑے ہوئے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ آئیے ہم آپ کو ہندوستان کی ناداری اور بے سروسامانی کا ثبوت شمار اور اعداد کے ذریعہ سے دیں غالباً سر رابرٹ گفن کے نام سے آپ ناواقف نہوں گے موصوف برطانیہ عظمیٰ کے بہت بڑے حسابی مشیر خیال کیے جاتے تھے ایک مشہور اقتصادی رسالہ بھی آپ کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔ آپ رائل سوسائٹی کے فیلو بھی تھے سنہ ۱۹۰۳ء میں برٹش ایسوسی ایشن کا جو جلسہ ہوا ہی اُس میں آپ نے ہندوستان کی مالی حالت پر ایک نظر ڈالی ہی آپ کا تخمینہ ہی کہ ہندوستان کی سالانہ آمدنی ۶۰ کروڑ ہی اس لیے فی ہندوستانی ۲ پونڈ یا ۳۰ روپیہ کا اوسط پڑا لارڈ کرومر نے بھی متذکرہ بالا تخمینہ کی تائید کی ہی اور اگر ہمارا خیال غلطی نہیں کرتا تو لارڈ کرزن کا تخمینہ بھی اس کا مؤید تھا ہندوستانی محاسبین اور ڈگ بائی کے ایسے بعض روشن خیال انگریز اس تخمینہ کو مبالغہ آمیز سمجھتے ہیں اور آمدنی کو اس سے کم خیال کرتے ہیں لیکن ہم اس سرکاری اندازہ کو صحیح سمجھ کر یہ کہتے ہیں کہ یہ اوسط تو کل آبادی کا ہی۔ اب ہندوستان میں مفلوک الحال اور مرفہ الحال دونوں قسم کے باشندے موجود ہیں کچھ ایسے ہیں جن کی آمدنی ۳۰ روپیہ سے کم ہی تلاش کیجئے تو بہت سے ایسے افراد ملیں گے جن کی کوئی آمدنی ہی نہیں۔ یہ لوگ یا تو خیرات پر زندگی بسر کرتے ہیں یا چوری سے پیٹ پالتے ہیں اس آمدنی کو دیکھکر آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں غور کیجئے تو ہندوستان کے آزاد باشندے اپنے احتیاج کی فراہمی میں اُن قیدیوں سے بھی بدتر ہیں جن کی آزادی سلب کر لی جاتی ہی دنیا کے قیدخانوں کا یہ عام دستور ہی کہ قیدی جرائم کے پاداش میں محبس بھیجے جاتے ہیں۔ یہ

کوشش کی جاتی ہے کہ اُن کو صرف اس قدر سامان خورونوش اور اسباب پوشش دیا جائے کہ اُن کی تندرستی میں فرق نہ آئے اس کے علاوہ سامان تعیش اُن سے بالکل دور رہے۔ لیکن پھر بھی وہ قیدی ہم سے اچھے ہیں ہم ذیل میں چاروں صوبوں کے جیل خانجات کی رپورٹ چشم عبرت کے مطالعہ کے لیے پیش کرتے ہیں یہ رپورٹ ۱۹۱۵ء کی ہے۔

جیل خانجات	غذا	پوشش	دوا	میزان
صوبجات وسطی وبرار	۳۱ روپیہ ۴ آنہ ۹ پائی	۴ روپیہ ۲ آنہ ۱۱ پائی	۲ روپیہ ایک آنہ ۴ پائی	۳۷ روپیہ ۹ آنہ
ممالک متحدہ	۴۱ روپیہ ۳ آنہ	۴ روپیہ ۷ آنہ ۳ پائی	۲ روپیہ ۱۱ آنہ ۸ پائی	۴۸ روپیہ ۵ آنہ ۱۱ پائی
بہار اُڑیسہ	۴۳ روپیہ ۹ آنہ ۹ پائی	۴ روپیہ ۱ آنہ ۹ پائی	۶ روپیہ ۳ آنہ ایک پائی	۵۵ روپیہ ایک آنہ ۸ پائی
بنگال	۴۷ روپیہ ۷ آنہ	۶ روپیہ ۲ آنہ ۳ پائی	۷ روپیہ ۱۰ آنہ ۱۰ پائی	۶۱ روپیہ ۴ آنہ ایک پائی

ممالک متوسط اور برار میں قیدیوں کے اخراجات سب سے کم ہیں لیکن اس کمی پر بھی آزاد ہندوستانی کی آمدنی سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ایک آزاد ہندوستانی کی ۳۰ روپیہ آمدنی صوبجات متوسط کے قیدی کے خوراک کے برابر ہے۔ اس تقابل پر شاید کوئی جدت پسند یہ اعتراض کرے کہ آزاد آبادی میں بچوں کا بھی شمار ہے اس لیے اُن کے اخراجات بھی کم ہوں گے تو ہم یہ کہیں گے کہ بچوں کے اخراجات نوجوانوں سے بہت کم نہیں ہوتے آزاد لوگوں کو قیدیوں کے اخراجات کے علاوہ بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔ وہ مکان کی تعمیر اور درست کرتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم کا بار اُٹھاتے ہیں۔ مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں ضروری سفر کے اخراجات کیے

حصہ چہارم باب دہم

منتقل ہوتے ہیں ایک طرف تو طرز معاشرت گرا بار ہو رہا ہی دوسری طرف آمدنی سوائے گھٹنے کے آگے نہیں بڑھتی - کیا یہ زندگی وحشیوں کی زندگی نہیں ہی پھر اُن مہذب قوموں کی نگاہوں میں جن کے ادنیٰ مزدور کئی پونڈ ہفتہ پیدا کرتے ہیں ہماری کیا وقعت ہو سکتی ہی - ایک معترض کہہ سکتا ہی تم یہ دلخراش افسانہ جو بیان کر رہے ہو یہ واقعات سے بہت دور ہی آخر جب آمدنی کا سالانہ اوسط ۳۰ روپیہ ہی تو فاضل اخراجات کہاں سے پورے ہوتے ہیں ہم مسند راحت پہ بیٹھنے والوں کو ہندوستان کے بلاکشوں کی مصیبتوں کا صحیح احساس نہیں کرا سکتے لیکن اُن سے یہ کہیں گے ؎

ذرا گور غریباں کی طرف بھولے سے آنکلو   اس آبادی کو بھی دیکھو جسے ویرانہ کہتے ہیں

یہ بدنصیب فلاکت زدہ باشندے ناداری کی وجہ سے ٹوٹے گھروں میں رہتے ہیں - فاقے کرتے ہیں - کہنہ و بوسیدہ کپڑے پہنتے ہیں - بہت سے ایسے بھی وطنی بھائی ہیں جن کا بستر خدا کی پھیلی ہوئی زمین - جن کا تکیہ اُن کا ہاتھ - جن کا سایہ آسمان کی نیلی چھت بہت سے ایسے خدا کے بندے ہیں جو قرض پر بسر کرتے ہیں اور اُن کی کئی نسلیں بار قرض سے دبی رہتی ہیں بہت سے بدطینت ان مصیبتوں کا سامنا نہیں کر سکتے اور چوری اور ڈکیتی کی طرف مائل ہوتے ہیں اس ناداری سے جو نقصانات پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ظاہر آتنی وسعت نہیں کہ صفائی کا انتظام کریں گند کی بدولت وبا نمودار ہوئی جس نے پورے طور سے گھر کی صفائی کر دی فاقہ کرتے کرتے اعضاء کی قوت سلب ہو گئی دوسرے ممالک کے قوی تن انسانوں کے مقابلہ میں بٹیر بنے ہوئے ہیں - عمریں کم ہو رہی ہیں - تعلیم کا نقدان ہی - بزدلی رگ وپے میں سرایت کر گئی ہی سفید چمڑے سے روح فنا ہوتی ہی - گداگری کا منحوس طریقہ رائج ہو گیا کیا ہم اس ذلت کے دھبہ کو اپنی ناموری کے دامن سے دور نہیں کر سکتے ہیں ہم کر سکتے ہیں لیکن ہاتھ پانوں والے بنکر بے دست و پا ہیں - ہندوستان کا خزانہ ہمارے قبضہ میں نہیں اگرچہ اس وقت آمدنی کم ہی لیکن پھر بھی اس کے ذریعہ سے مصیبت زدگان ہند کے لیے بہت کچھ ہو سکتا ہی

ہم وطنی حکومت کے سو آرزو مند ہیں تو اسی نقطۂ خیال سے کہ ہماری شب غم کی صبح اگر ہو سکتی ہے تو وطنی حکومت کے اُفق سے۔ حصہ چہارم مارچ ہم

صداقت

۱- دسمبر ۱۹۱۶ء

ہندوستان دولت مند ہے یا مفلس

ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کی دولت کے افسانے اقالیم دنیا میں مشہور تھے اور کہتے ہیں کہ یہی جنس تھی جس نے ایشیا اور یورپ کی جنگجو اور عالی ہمت اقوام کو اس سرزمین کی طرف کشاں کشاں کھینچا تھا۔ یونانی عرب ترک و تاتار آئے اور بے شمار زر و جواہر اور دیگر بیش بہا سامان لے گئے۔ اکبر اعظم نے ہندوستان کو اپنا گھر قرار دیا اور پھر ہندوستان کی دولت ہندوستان میں ہی رہی اورنگ زیب جب سریر آرا سلطنت ہوا تو اس نے آگرہ اور دہلی کے خزانوں کی جانچ پڑتال کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ چھ ماہ تک کئی ہزار نفوس صرف چاندی کے سکّے تولنے میں مصروف رہے اور معلوم ہوا کہ خزانہ شاہی کا صرف ایک گوشہ تولا جا سکا ہے۔ اشرفیوں اور جواہرات کی نوبت بھی نہیں آئی۔ اورنگ زیب فوراً اس مہم کو بند کرا کے دکن کی مہم پر چلا گیا۔ لیکن اب خدا معلوم اس دولت کو زمین کھا گئی یا آسمان ماہرین اقتصادیات جو اعداد پیش کرتے ہیں اُن میں ہندوستان دنیا کی ادنےٰ سے ادنیٰ سلطنت سے بھی گرا ہوا ہے خود سلطنت متحدہ برطانیہ میں اس کی حیثیت کا اندازہ ذیل کے اعداد سے کیا جا سکتا ہے۔

برطانیہ عظمےٰ	سالانہ آمدنی	۳۰,۵۰,۰۰۰,۰۰۰ روپے
کینڈا	,,	۵,۲۵۰,۰۰۰,۰۰۰ ,,

آسٹریلیا	سالانہ آمدنی	۳،۴۵۰،۰۰۰،۰۰۰	روپے
جنوبی افریقہ	"	۸۲۰،۰۰۰،۰۰۰	"
نیوزیلینڈ	"	۸۲۵،۰۰۰،۰۰۰	"
ہندوستان	"	۱۰،۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰	"
ممالک محروسہ شاہی نوآبادیان	"	۱۹،۶۵۰،۰۰۰،۰۰۰	"

لیکن ان میں ہندوستان کے اعداد خاصے طویل نظر آتے ہیں اگر آبادی کو مد نظر رکھا جائے تو ہندوستان کی فی کس سالانہ آمدنی حسب ذیل نکلتی ہے۔

برطانیہ عظمیٰ	۸۲۵	روپے
کینیڈا	۷۵۰	"
آسٹریلیا	۷۶۵	"
جنوبی افریقہ	۱۲۰	"
نیوزیلینڈ	۸۲۵	"
ہندوستان	۱۳۲ - ۱۲ - ۰	"
ممالک محروسہ شاہی نوآبادیات	۶۰ - ۰ - ۰	"

حصہ پنجم

صَرفِ دولت

تجزیہ - (۱) صرف کا مفہوم (۲) صرف کے مباحث (۳) نفع المصرف (۴) افادہ اتم (۵) معیار زندگی (۶) مسئلہ آبادی -

صرف کا مفہوم

(۱) دولت اور اس کی پیدائش کا مفہوم - عاملین پیدائش دولت - زمین محنت اصل اور تنظیم دولت کی تقسیم بشکل لگان - اجرت - سود - اور منافع اور مبادلہ دولت کا قدیم و جدید طریق - دولت کے متعلق یہ سب باتیں تو اوپر بیان ہو چکیں - بس اب صَرفِ دولت کی بحث باقی ہے - سو اوّل ہم صَرف کا مفہوم واضح کرتے ہیں - پیدائش دولت کے مفہوم میں بتایا جا چکا ہے کہ انسان کو تخلیق پر برائے نام بھی قدرت حاصل نہیں - وہ کسی چیز کو نیست سے ہست نہیں کرتا - البتہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا مقام یا ان کی ترکیب یا نیز ان کی شکل بدلکر ان کو اپنے واسطے کارآمد بنا لیتا ہے گویا چیزوں میں خدا نے جو افادہ ودیعت کیا ہے اس پر اپنی دسترس بڑھاتا ہے اور بیش اس اجمال کی تفصیل اوپر موجود ہے - اب صرف دولت کے مفہوم کو لیجئے - صرف سے مراد کسی چیز کو نیست کرنا نہیں بلکہ افادہ سے کام لینا ہے - جو کہ کسی چیز میں موجود ہے - اور جس پر بذریعہ عمل پیدائش دسترس حاصل کی جا چکی ہے انسان کے ہر دو عمل کو چیزوں کے افادہ سے سروکار ہے - پیدائش سے افادہ ہاتھ آتا ہے اور صرف میں وہ اپنا کام پورا کرتا ہے یعنی اس سے احتیاجات رفع ہوتی ہیں - ہر شخص پائیدار اور دیرپا چیز کو پسند کرتا ہے جس سے عرصہ دراز تک افادہ حاصل ہوتا

رہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ صرف کا مقصود کسی چیز کے افادہ سے کام لینا ہے۔ خود چیز کا نیست کرنا نہ تو مفید اور نہ ممکن البتہ حسب قوانین قدرت کبھی تو صرف میں آتے ہی چیزوں کی شکل بدل جاتی ہے۔ مثلاً غلہ پھل ترکاری جلانے کا تیل اور لکڑی کہ ان میں سے ہر ایک چیز ادھر استعمال میں آئی اودھر اس کی شکل بدلی اور بہت سی چیزیں ایک شکل میں قایم رہ کر مدت تک صرف میں آتی رہتی ہیں حتی کہ کہنہ و فرسودہ ہوتے ہوتے وہ از کار رفتہ ہو جاویں مثلاً لکڑی پتھر اور لوہے وغیرہ کا سامان۔ لیکن واضح ہو کہ اوّل تو جلد یا دیر میں چیزوں کی صرف شکل بدل جاتی ہے۔ نیست ان میں سے کوئی بھی نہیں ہوتی۔ دوم تغیر شکل ہی کچھ صرف پر منحصر نہیں بلکہ اکثر چیزیں پڑے پڑے صرف میں آئے بغیر ہی قدرتی اسباب کے اثر سے شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ پس جس طرح پیدایش دولت کا منشا چیزوں کے افادہ کو قابو میں لانا ہے اسی طرح صرف دولت سے مقصود اس افادہ سے احتیاجات رفع کرنا ہے۔ رہیں خود چیزیں۔ خدا ہی نے اُنکو پیدا کیا ہے۔ خدا ہی چاہے تو ان کو فنا کر دے گا۔ ہم تو بچوں کی طرح چیزوں سے کھیل کھیل کر لطف و راحت اُٹھاتے رہتے ہیں کبھی ان کا مقام بدل دیتے ہیں۔ کبھی اُن کو نئے نئے طریق سے توڑتے جوڑتے ہیں اور کبھی بمعاونت قوانین قدرت ان کی شکل بھی بدل دیتے ہیں لیکن اس سب الٹ پلٹ کا منشا، صرف اسقدر ہے کہ چیزوں میں خدا نے جو افادہ ودیعت کر دیا ہے ہم اسپر بدرجہ اتم قابو پا کر اس سے پُورا پُورا کام لیں یعنی اپنی احتیاجات پوری کریں اور عمل پیدایش و صرف دولت کا یہی لب لباب ہے۔ المختصر خدا نے ہمارے واسطے کیسی کیسی بے شمار نعمتیں پیدا کر دی ہیں تا کہ ہم اُن سے آرام پاویں لطف اُٹھاویں اُسکی قدرت کی نشانیوں سے اُسکو پہچانیں اور اس کے جود و کرم کا شکر ادا کرتے رہیں۔

یہ تو معلوم ہوا کہ صرف دولت سے مراد چیزوں کے افادہ سے احتیاجات رفع کرنا ہے اب صرف کے متعلق ایک نکتہ جتانا اور باقی ہے۔ مصنوعات کی تیاری میں جو پیداوار خام کام آتی

ہے وہ بھی صرف میں شمار ہوتی ہے۔ مثلاً کپڑا بننے میں اُون یا روئی صرف ہوتی ہے۔ کتاب چھپنے میں حصہ بہم کاغذ صرف ہوتا ہے۔ انجن چلانے میں تیل اور کوئلہ صرف ہوتا ہے۔ غور کرنے سے واضح ہوگا کہ چیزوں کا ایسا صرف عمل پیدایش کا جزو ہے۔ یعنی یہ چیزیں صرف ہو ہو کر اس چیز کی پیدایش میں مدد دیتی ہیں جو کہ اصل مقصود ہے۔ پس ایسی ابتدائی درمیانی چیزوں کے صرف کو جو مل جلکر انتہائی مطلوبہ چیز تیار کریں **صرف پیدا آور** کہتے ہیں اور انتہائی مطلوبہ چیز کا تیار ہوکر انسان کے کام آنا محض **صرف** کہلاتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو احتیاج بھی اسی صرف سے رفع ہوتی ہے مثلاً جوتے کی تیاری میں چمڑے سوت لوہے اور پالش کا کام آنا **صرف پیدا آور** ہے اور خود جوتہ کا محض پہاجانا صرف شمار ہوگا۔ مذکورہ چاروں چیزیں صرف میں آکر جوتہ کی پیدایش میں مدد دیتی ہیں اور جوتہ صرف ہونے پر ایک احتیاج رفع ہوتی ہے۔ جب لوگ اُسکو پہنتے ہیں تو پاوں زمین کی نمی۔ سردی اور گرمی سے محفوظ رہتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ جو چیز براہ راست ہماری احتیاج رفع کرے اس کا استعمال تو صرف کہلاتا ہے اور جو چیزیں ایسی چیز سازی میں کام آئیں ان کا استعمال صرف **پیدا آور** کہلاتا ہے۔

(۲) احتیاجات تسکین پذیر و غیر تسکین پذیر ضروریات و تعیشات طلب تغیر پذیر و غیر تغیر پذیر صرف قوانین تکثیر و تقلیل افادہ۔ افادہ کلی۔ و افادہ مختتم اور مسائل نفع المصرف و افادہ اتم یہ سب مباحث کے جو بنظر موزونیت موقعہ مسئلہ قدر قیمت کے تحت میں بیان ہو چکے ہیں در اصل صرف دولت سے ساحت متعلق ہیں۔ ان میں سے مسئلہ نفع المصرف اور افادہ اتم کو از سر نو ہم یہاں بالتفصیل بیان کرتے ہیں باقی کا محض حوالہ کافی ہے۔

(۳) جب ہم کوئی چیز خریدنا چاہتے ہیں تو اُس کی زیادہ سے زیادہ قیمت اپنے ذہن میں معین کر لیتے ہیں۔ اگر فروشندہ اس قیمت تک رضامند ہوجاتا ہے تو چیز خرید لیتے ہیں ورنہ نہیں۔ خریدنے کی حالت میں اکثر جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ اس زیادہ سے زیادہ قیمت سے کم ہوتی

حصہ چہارم

ہے جو کہ خریدار ادا کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ آخر الذکر قیمت کا اول الذکر قیمت سے زاید حصہ اصطلاحاً نفع المصرف کہلاتا ہے۔ فرض کرو کہ ہم کوئی چیز زیادہ سے زیادہ پانچ روپیہ تک خریدنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن وہ ہمکو للعہ میں ملجاوے تو اس خرید میں ہمکو جو بقدر آٹھ آنہ بچت رہی اور یہی نفع المصرف کا معیار ہے۔ بنظر اظہار حقیقت ضمناً یہ نکتہ جتا ما ضروری معلوم ہوتا ہے کہ معیار بالعموم معین ہوتے ہیں لیکن یہ معیار غیر معین ہے۔ غریب آدمی کے نزدیک آٹھ آنہ کی جو قدر ہے امیر آدمی کی نظر میں ۸؍ کی قدر اسکی عشر عشیر بھی نہیں۔ گویا اگر غریب اور امیر دونوں کو بقدر آٹھ آنہ نفع المصرف حاصل ہو تو اس معیار کی ظاہری مساوات سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ اس حالت میں غریب کو بمقابل امیر کہیں زیادہ نفع المصرف حاصل ہوگا۔ مثلاً اگر غریب کی نظر میں آٹھ آنہ کی وہی قدر ہو جو امیر کے نزدیک پانچ روپیہ کی تو غریب کا مذکورہ بالا آٹھ آنہ کا نفع المصرف امیر کے آٹھ آنہ والے نفع المصرف کا دس گنا ہوگا۔ حالانکہ دونوں کے معیار برابر آٹھ آٹھ آنے ہیں یہ نکتہ اسی عام مشاہدہ کی تشریح ہے کہ اگر غریب کو دو چار روپیہ بھی کسی سودے میں بچت ہوتی ہے تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ حالانکہ امرا سو پچاس روپیہ کے فائدہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ واضح ہو کہ بعض چیزوں کے خریدنے میں ہم کو خاص طور پر بہت زیادہ نفع المصرف حاصل ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر ان کی جو قیمت ہم ادا کرتے ہیں وہ اس سے بہت کم ہے جو ہم گوارا کر سکتے تھے پانی نمک اور دیا سلائی عمدہ مثالیں ہیں۔

مسئلہ قدر و قیمت کے تحت میں قانون تقلیل افادہ افادہ کلی افادہ مختتم اور نفع المصرف کے متعلق جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس کو اس موقع پر بغور پڑھنا ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ مقدار خرید بڑھنے سے نفع المصرف بھی بڑھتا ہے اور اس کے گھٹنے سے گھٹتا ہے بخوف طوالت اس بحث کو یہاں نہیں دوہرایا صرف حوالہ پر اکتفا کیا گیا۔

ذیل کی بحث سے واضح ہوگا کہ چیزوں کی گرانی اور ارزانی کا خریداران کے نفع المصرف پر

کیا کیا اثر پڑتا ہے۔ بغرض سہولت وصفائی بیان ہم اول فرض کرتے ہیں کہ کسی چیز پر محصول قائم کیا جاتا ہے اور اسی کی برابر قیمت رسد میں اضافہ نمودار ہوجاتا ہے۔ گویا چیزیں گراں ہوجاتی ہیں۔ دوم کسی چیز کی پیدایش پر سرکاری امداد ملتی ہے اور اس کے حساب سے قیمت رسد بھی گھٹ جاتی ہے یعنی چیزیں ارزاں ہوجاتی ہیں۔ بالفاظ مختصر جبکہ محصول کی برابر قیمت رسد بڑھ جاوے اور سرکاری امداد کی برابر گھٹ جاوے تو ایسے محصول اور سرکاری امداد کا خریداران کے نفع المصرف پر کیا اثر پڑے گا اس باقاعدہ اضافہ اور تخفیف قیمت کی مثال سے عام گرانی وارزانی اشیا کا نفع المصرف پر اثر بہت واضح ہوجائیگا اور دراصل اسی مسئلہ کی توضیح مقصود بھی ہے۔

اوّل ایسی چیزیں لیجیے جو کہ قانون استقرار حاصل کی پابند ہیں۔ خواہ ان کی تھوڑی مقدار پیدا کی جاسکے یا بہت زیادہ۔ مصارف پیدایش کی نسبت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور بحالت مقابلہ چھوٹی اور بڑی مقداروں کے واسطے قیمت رسد وہی ایک رہتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک ہزار چیزیں فروخت ہوں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کل چیزوں کا نفع المصرف مساوی نہیں ہوسکتا۔ بعض کا بہت زیادہ ہوگا اور بعض کا کم۔ مسئلہ قدر وقیمت کی بحث بحوالہ بالامقامات دیکھنے کے بعد یہ نکتہ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے مثلاً ان چیزوں کا جداگانہ نفع المصرف حسب ذیل ہو۔

تعداد اشیا	نفع المصرف فی شے	مجموعی نفع المصرف
۱۵۰	۴ روپیہ	۶۰۰
۲۵۰	۲ روپیہ	۵۰۰
۳۰۰	۱ روپیہ	۳۰
۲۰۰	۱۲ آنہ	۱۵۰
۱۰۰	۸ آنہ	۵۰
۱۰۰۰		۱۶۰۰

حصۂ پنجم فرض کرو کہ ان ہزار چیزوں پر ایک روپیہ فی چیز محصول قائم کیا جاوے اور اسکی وجہ سے قیمت رسد میں بھی ایک روپیہ فی چیز اضافہ نمودار ہو تو صاف ظاہر ہے کہ ۱۰ اور ۲۰ چیزوں کی خریداری جن پر نفع المصرف آٹھ آنہ اور بارہ آنہ فی شے حاصل ہوتا ہے بالکل بند ہو جاوے گی۔ ۳۰ کی خریداری بحال رہیگی لیکن چونکہ نفع المصرف کی مقدار ایک روپیہ فی شے ہے اور اتنا ہی قیمت میں بھی اضافہ ہو گیا پس ان کا نفع المصرف بالکل غائب ہو جائیگا۔ رہیں ۲۵ اور ۵۰ چیزیں ان پر البتہ اب بھی ایک روپیہ اور تین روپیہ نفع المصرف حاصل ہوتا رہیگا۔ گویا محصول قایم ہونے کے بعد (۱۰۰+۲۰۰) تین سو چیزوں کی خریداری رک جاوے گی اور صرف (۳۰۰+۲۵۰+۱۵۰) سات سو کی بحال رہے گی۔ ان پر سرکار کو بحساب ایک روپیہ فی شے سات سو روپیہ بطور محصول دستیاب ہوگا لیکن اس سے کہیں زیادہ خریداروں کا نفع المصرف ضائع ہو جائیگا یعنی ۱۰ اور ۲۰ چیزوں کا نفع المصرف (۵۰+۱۵۰) ۲۰۰ روپیہ۔ ۳۰ چیزوں کا ۳۰۰ روپیہ اور ۲۵ و ۵۰ چیزوں کے نفع المصرف میں سے ۲۵۰ اور ۱۵۰ روپیہ کل بقدر (۵۰+۱۵۰+۳۰۰+۲۵۰+۱۵۰) ۹۰۰ روپیہ نفع المصرف ضائع ہوگا۔ گویا محصول کی بدولت سرکار کو صرف ۷۰۰ روپیہ آمدنی حاصل ہوئی اور خریدار ۹۰۰ روپیہ نفع المصرف سے محروم ہو گئے۔ اب اگر محصول بغیر چیز کا نرخ بطور خود بڑھایا جاوے تو اسی طرح فروشندوں کو ۷۰۰ روپیہ زاید ملے گا اور خریداروں کے ہاتھ سے ۹۰۰ روپیہ کے قریب نفع المصرف نکل جائیگا۔

مثال بعیر اس واقعے کی مختصر تشریح یوں کی جاسکتی ہے قیمت بڑھنے پر کچھ چیزوں کی خریداری ترک ہو جاوے گی۔ کیونکہ ان کا نفع المصرف اضافہ قیمت سے کم ہوگا۔ ایسی چیزوں کے کل نفع المصرف سے خریدار محروم ہو جائیں گے اور جبکہ خریداری رک جاوے گی تو فریق ثانی کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئیگا بعض چیزوں کا نفع المصرف۔ اضافہ قیمت کے برابر برابر ہوگا انکی خریداری تو بحال رہے گی لیکن کل نفع المصرف۔ فریق ثانی کی طرف منتقل ہو کر خریداروں کے

ہاتھ سے نکل جاوے گا۔ البتہ کچھ چیزوں کا نفع المصرف اضافہ قیمت سے زیادہ ہوگا۔ ان کی خرید و فروخت سے بقدر اضافہ قیمت نفع المصرف فریق ثانی کی قبضہ میں آجاوے گا اور باقی خریداروں کے پاس رہے گا۔ پس مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ فریق ثانی کو خواہ وہ بحالت قیام محصول سرکار ہو یا بحالت اضافہ قیمت فروشندہ جسقدر رقم بطور محصول یا اضافہ قیمت وصول ہوگی۔ اس سے زیادہ رقم کا قیمتی نفع المصرف خریداروں کے ہاتھ سے نکل جائیگا گویا اول الذکر فریق کو جسقدر نفع حاصل ہوگا آخرالذکر کو اُس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچے گا۔

قیمت رسد کے بڑھنے کا نفع المصرف پر جو اثر پڑتا ہے وہ اوپر محصول کی مثال سے واضح ہو چکا ہے۔ اب اسکے برعکس دیکھنا یہ ہے کہ قیمت رسد کے گھٹنے سے نفع المصرف میں کیا فرق پڑتا ہے اس تحقیق میں بھی بغرض سہولت و صفائی بیان ہم فرض کرتے ہیں کہ چیزوں کی پیداوار پر سرکاری امداد ملے اور بقدر امداد قیمت رسد میں بھی تخفیف ہو جاوے مثلاً کوئی چیز دس روپیہ کو فروخت ہوتی ہو لیکن جب سرکار کی طرف سے فی چیز ایک روپیہ مدد ملنے لگے تو اُس کی قیمت رسد گھٹ کر صرف نو روپیہ رہجاوے۔

فرض کرو کہ ایک ہزار چیزیں دس روپیہ فی چیز کے حساب سے فروخت ہوں۔ قانون تقلیل افادہ کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے کہ کسی مقدار یا تعداد اشیا کی قیمت ہمیشہ افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہے۔ یا اس سے کم۔ افادہ مختتم سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس میں سراسر خریدار کا نقصان ہے۔ پس ان ہزار چیزوں میں کچھ تو مثلاً ۸سو ایسی ہونگی جن پر تھوڑا بہت نفع المصرف حاصل ہوتا ہے یعنی جو کہ دس روپیہ کے بجائے بارہ بلکہ پندرہ تک فروخت ہوجائیں۔ اور باقی دو سو وہ ہیں جن کا افادہ دس روپیہ قیمت کے مساوی ہے یعنی جو دس سے زیادہ پر فروخت نہوتیں اور جن کے خریداران کو کوئی قابل لحاظ نفع المصرف نہیں ملتا انھی دو سو چیزوں کا افادہ تو اصطلاحاً افادہ مختتم کہلاتا ہے اور کل چیزوں کی قیمت اُسی کے برابر قرار پاتی ہے

حصہ پنجم

اب اگر قیمت رسد گھٹ کر لعہ آنہ رہ جائے تو غالبًا ایک ہزار کے بجائے بارہ سو چیزیں فروخت ہونگی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان جدید دو سو چیزوں کا افادہ دس روپیہ سے تو یقینًا کم ہے اور اسی وجہ سے وہ بہ نرخ دس روپیہ نہیں خریدی جاتی تھیں لیکن چونکہ وہ لعہ آنہ کے نرخ سے خریدی گئی لہذا صاف ظاہر ہے کہ یا تو ان کا افادہ لعہ آنہ کی برابر ہے یا اُس سے کچھ تھوڑا سا زیادہ۔ اب اگر قیمت اور بھی گھٹ کر صرف نو روپیہ رہجاوے تو غالبًا ڈیڑھ ہزار چیزیں فروخت ہونگی۔ ان جدید تین سو چیزوں کا افادہ لعہ سے تو یقینًا کم ہے لیکن وہ یا تو لعہ کے مساوی ہے یا اُس سے کچھ یونہی زیادہ۔ حاصل کلام یہ کہ ایک ہزار چیزوں کا افادہ مختتم ۱۰ ہے بارہ سو کا لعہ اور ڈیڑھ ہزار کا لعہ گویا ہزار کے بعد دو سو کا افادہ لعہ ہے اور اُن کے بعد تین سو کا صرف لعہ۔ جبکہ سرکار ایک روپیہ فی چیز امداد دے اور قیمت رسد دس روپیہ سے گھٹ کر لعہ فی چیز ہو جاوے۔ ایسی حالت میں ہمارے مفروضہ کی رو سے بجائے ایک ہزار کے ڈیڑھ ہزار چیزیں فروخت ہونگی اور سرکار کو بھی ایک روپیہ فی چیز کے حساب سے ڈیڑھ ہزار روپیہ بطور امداد دینا پڑے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس امداد اور تخفیف قیمت کی بدولت خریداروں کے نفع المصرف میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے پہلے ایک ہزار کے خریداروں کو تو صریحًا ایک ہزار روپیہ کے بمقدار مزید نفع المصرف حاصل ہوگا۔ جبکہ وہ ہزار چیزیں دس روپیہ کے نرخ سے خریدتے تھے اور اب لعہ کے نرخ سے لیتے ہیں تو اُن کے نفع المصرف میں بمقدار ایک ہزار اضافہ صاف ظاہر ہے لیکن ہزار کے بعد دو سو چیزوں کے خریداروں کو صرف ۸ فی چیز کے حساب سے بقدر سو روپیہ نفع المصرف ملے گا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ لعہ کے نرخ سے ۲ سو چیزیں خرید سکتے تھے۔ لیکن اب وہ اُن کو لعہ کے نرخ سے مل گئیں۔ اور سو روپیہ کے بمقدار نفع المصرف حاصل ہوا۔ حالانکہ سرکار کو ان دو سو چیزوں پر بھی دو سو روپیہ امداد دینی پڑی۔ گویا سرکار کی گرہ سے تو دو سو روپیہ گئے

حصہ پنجم

اور خریداروں کو صرف بقدر سو روپیہ نفع المصرف ملا۔ اب باقی تین سو چیزوں کے خریداروں کو لیجئے۔ ہمارے معروضہ کے مطابق وہ لعہ رسے زیادہ قیمت پر یہ چیزیں نہ خریدتے گویا ان میں سے اکثر چیزوں کا افادہ لعہ رکے برابر ہے۔ ان پر کچھ نفع المصرف نہیں ملتا۔ پس جب قیمت عنٓہ سے گھٹ کر لعہ رہوجاوے اور یہ تین سو چیزیں بھی فروخت ہوسکیں۔ تو ان پر کچھ نفع المصرف نمودار نہوگا اور ہوگا بھی تو نہایت کم۔ گویا سرکار کو تو ان پر بھی مثل دوسری چیزوں کے بحساب عہ فی چیز تین سو روپیہ بطور امداد دینا پڑا لیکن خریداروں کو بہت ہی کم نفع المصرف میسر ہوا۔ حاصل کلام یہ کہ سرکار کو تو ڈیڑھ ہزار روپیہ بطور امداد دینا پڑا۔ لیکن خریداروں کے نفع المصرف میں تخمیناً ۱۱۔ ۱۲ سو روپیہ کے بمقدار اضافہ ہوا اور بس۔ یہی واقعہ جو مثال سے بالتفصیل واضح کیا گیا۔ مختصراً یوں بیان ہوسکتا ہے کہ سرکاری امداد سے جب بقدر امداد قیمت گھٹے اور چیزوں کی خرید بڑھے تو ان چیزوں پر جو قبل امداد ہی خریدی جاتی تھی خریداروں کو اسیقدر زاید نفع المصرف حاصل ہوگا جتنی امداد کہ سرکاری چیزوں کے واسطے دے لیکن جو چیزیں کہ بوجہ تخفیف قیمت بعد امداد خریدی جاویں۔ ان پر سرکار جسقدر امداد دے گی۔ اس سے کم مزید نفع المصرف خریداران کے ہاتھ آئیگا۔ اب اگر فروشندے بغیر امداد بطور قیمت خود قیمت رسد گھٹائیں تب بھی اُن کے اور خریداروں کے مابین وہیں نتائج ظہور پذیر ہونگے۔ جسقدر قیمت میں جسقدر مجموعی تخفیف ہوگی۔ نفع المصرف میں اسکے مقابل اضافہ کم ہوگا۔

اوپر کی بحث کا ماحصل یہ نکلا اگر کسی چیز کی پیدائش قانون استقرار حاصل کی پابند ہو اُس پر محصول قائم کیا جاوے اور بقدر محصول اس کی قیمت رسد میں اضافہ نمودار ہو۔ تو اس طریق سے سرکار کو جو آمدنی حاصل ہوگی اُس سے کہیں زیادہ خریداروں کا نفع المصرف ضائع اور برباد ہوجاوے گا۔ اگر کارخانے بطور خود قیمت بڑھاویں تو ان کی حیثیت محصول لینے والی سرکار کی سی ہوگی اور اُن کے اور خریداروں کے مابین وہی نتایج پیدا ہونگے جو اوپر بیان ہوئے اسی

حصہ پنجم

طرح پر اگر سرکار امداد دے اور بقدر امداد قیمت رسد میں تخفیف ہو جاوے تو اس طرح پر سرکار جس قدر امداد میں صرف کرے گی۔ خریداراں کے نفع المصرف میں اس سے کم اضافہ ہو سکے گا نیز اگر قیمت رسد میں بطور خود تخفیف کردیجاوے تو مجموعی تخفیف کی مقدار اضافہ نفع المصرف سے زیادہ رہیگی گویا جبکہ پیداوار قانون استقرار حاصل کی پیرو ہو تو (۱) ایسے محصول سے جو کہ بشکل اضافہ قیمت نمودار ہو۔ سرکار کو جسقدر آمدنی ہوتی ہے اُس سے کہیں زیادہ خریداروں کے نفع المصرف میں کمی آجاتی ہے۔ (ب) ایسی سرکاری امداد میں جو تخفیف قیمت کا باعث ہو سرکار کو جسقدر صرف کرنا پڑتا ہے۔ خریداروں کے نفع المصرف میں اس سے کم اضافہ ہوتا ہے۔

پس عملی نتیجہ یہ نکلا کہ جو چیز قانون استقرار حاصل کے ماتحت ہو اس پر ایسا محصول عاید کرنا قیمت رسد میں بمقدار اضافہ کردے یا اُس کو سرکاری امداد دینا تاکہ قیمت میں بمقدار تخفیف ہو جاوے۔ مضر یا کمتر مفید ہے۔ بحالت اوّل تو سرکار کو جسقدر آمدنی ہوتی ہے۔ خریداروں کے نفع المصرف کا اس سے کہیں زیادہ نقصان ہو جاتا ہے اور بحالت دوم سرکار جسقدر خرچ کرتی ہے خریداروں کے نفع المصرف میں اتنا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ اس سے کم رہتا ہے

محصول اور سرکاری امداد کی مثال لیکر اب اضافہ و تخفیف قیمت کا ایسی چیزوں کے نفع المصرف پر اثر دریافت کرنا مقصود ہے جو قانون تقلیل حاصل کی پابند ہوں کئی طرح پر یہ تحقیق سرانجام پاسکتی ہے۔ لیکن یہاں پر سب سے سادہ اور مختصر طریق اختیار کیا جاتا ہے۔ جبکہ محصول قائم ہونے سے قیمت میں اضافہ ہو تو چیزوں کی خرید میں اور لہذا پیداوار میں ضرور تخفیف ہوگی اور چونکہ قانون تقلیل حاصل پیدایش پر مسلط ہے۔ مقدار پیداوار گھٹنے سے مصارف پیدایش میں ضرور تخفیف ہوگی۔ نتیجہ یہ ہے کہ محصول قائم ہونے کے بعد قیمت میں جو اضافہ ہوگا وہ مقدار محصول سے کم ہوگا اور اس کمی کا باعث وہی تخفیف مصارف پیدایش ہے جو قانون تقلیل حاصل کی بدولت۔ مقدار پیداوار گھٹنے سے نمودار ہوئی۔ اس حالت میں تین نتیجے ممکن ہیں اگر قانون

مذکور کا عمل ضعیف ہے گویا مقدار پیداوار بہت زیادہ گھٹے تب کہیں مصارف پیدایش میں تھوڑی سی تخفیف ہو سکے تو سرکاری آمدنی کے مقابل زیادہ نفع المصرف ضائع ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی اسقدر زیادہ نہیں جتنا کہ قانون استقرار حاصل کی صورت میں ہوتا اعتدالی حالت میں ممکن ہے کہ سرکاری آمدنی اور ضائع شدہ نفع المصرف برابر رہیں یا بہت تھوڑا فرق رہے۔ لیکن اگر قانون تقلیل حاصل کا عمل بہت قوی ہوتا کہ تھوڑی سی مقدار پیداوار گھٹنے سے مصارف پیدایش میں بہت بڑی تخفیف ہو جاوے تو اس صورت میں سرکاری آمدنی کے مقابل بہت کم نفع المصرف ضائع ہوگا۔ گویا قیام محصول کی یہ سب سے بہتر صورت ہے۔ سرکار کو تو معقول آمدنی ہوتی ہے اور خریداروں کا بہت کم نفع المصرف ضائع ہوتا ہے۔

لیکن سرکاری امداد کی حالت بالکل برعکس ہے۔ قیمت گھٹنے سے چیزوں کی خرید اور لہذا پیداوار بڑھے گی لیکن قانون تقلیل حاصل کے مطابق مقدار پیداوار بڑھنے سے مصارف پیدایش میں اضافہ ہوگا۔ لہذا سرکاری امداد کی بدولت قیمت میں جو تخفیف ہوگی وہ اتنی نہ ہو سکے گی جتنی کہ قانون استقرار حاصل کی صورت میں ہوتی۔ اس فرق کا باعث وہی مصارف پیدائش کا اضافہ ہے۔ لیکن اس سے قبل واضح کیا جا چکا ہے کہ قانون استقرار حاصل کی حالت میں بھی سرکار امداد میں جسقدر صرف کرے اس کی برابر نہیں بلکہ اس سے کم نفع المصرف بڑھ سکتا ہے پس قانون تقلیل حاصل کی صورت میں تو سرکاری امداد کے مقابل نفع المصرف میں اور بھی بہت کم اضافہ ہوگا اور مذکورہ بالا تین صورتوں میں جبکہ قانون تقلیل حاصل کا عمل ضعیف۔ معتدل یا قوی ہو۔ علی الترتیب نفع المصرف میں بہت بہت کم اضافہ ہو سکے گا پس واضح ہوا کہ سرکاری امداد کی یہ سب سے ناموزوں صورت ہے۔ سرکار تو بہت کچھ خرچ کرے اور خریداروں کے نفع المصرف میں بہت کم اضافہ ہو

جیسا کہ ہم تمہید میں واضح کر چکے ہیں۔ بحث میں سہولت بیشک ضروری اور مفید ہے مگر حد اعتدال تک۔ جو سہولت غور و فکر کی ضرورت نہ چھوڑے وہ دماغ کے واسطے

حصۂ پنجم

مضر اور مقصد تعلیم کے منافی ہے۔ قانون تقلیل حاصل کی مذکورہ بالا بحث اعدادی مثالوں کے ذریعہ سے اور بھی سہل ہو سکتی تھی۔ اگرچہ طویل بھی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اسی اصول کو مدنظر رکھکر ہم نے قصداً صرف مختصر مگر صاف بیان پر اکتفا کیا ہے۔ اور یہی طریق ذیل میں قانون تکثیر حاصل کے ساتھ برتا ہے۔ ناظرین سوچ سمجھکر خود مثالیں تیار کریں تو مباحث بھی بدرجہ اولی ذہن نشین ہو جاوینگے اور دماغی نشو ونما پر بھی ایسی کوشش کا نہایت مفید اثر پڑے گا۔

اب تیسری حالت کو لیجئے یعنی جبکہ پیداوار قانون تکثیر حاصل کی تابع ہو محصول قائم ہونے سے جو قیمت بڑھے گی اور چیزوں کی خرید کم ہونے سے جو پیداوار گھٹے گی تو مصارف پیدائش بھی مقابلۃً ضرور بڑھ جاویں گے گویا قیمت میں محصول کی مقدار سے زیادہ اضافہ نمودار ہوگا۔ قانون استقرار حاصل کی بحث میں واضح ہو چکا ہے کہ جب قیمت میں مقدار محصول کے مساوی بھی اضافہ نمودار ہو تو سرکاری آمدنی سے بڑھ کر نفع المصرف ضائع ہو جاتا ہے پس اس حالت میں جبکہ قیمت مقدار محصول سے بھی بڑھ جاوے۔ سرکاری آمدنی کے مقابل کہیں زیادہ نفع المصرف سے خریدار محروم ہو جاویں گے۔ گویا محصول قائم کرنے کے لئے یہ سب سے ناموزوں حالت ہے۔ لیکن اسکے برعکس اگر ایسی پیداوار پر سرکار امداد دے تو قیمت گھٹنے پر جو خرید اور لہذا پیداوار میں اضافہ ہوگا تو بمعاونت قانون تکثیر حاصل مصارف پیدائش میں سرکاری امداد سے کہیں زیادہ تخفیف ہو سکے گی۔ بالخصوص اگر قانون کا عمل قوی ہے تو قیمت میں اسقدر کمی ہو جاوے گی کہ سرکار کو امداد میں جسقدر صرف کرنا پڑے اُس سے کہیں زیادہ نفع المصرف خریداروں کو حاصل ہوگا۔ گویا سرکاری امداد کے واسطے یہ حالت از حد موزوں ہے۔

اوپر کی کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ:۔

(الف) بحالت عمل قانون استقرار حاصل محصول سے جسقدر آمدنی ہوگی۔ اُس سے زیادہ

نفع المصرف ضائع ہوگا اور امداد پر جسقدر صرف ہوگا نفع المصرف میں اُس سے کم اضافہ ہوسکے گا۔

(ب) بحالت عمل قانون تقلیل حاصل محصول سے جسقدر آمدنی ہوگی نفع المصرف میں اس سے کم تخفیف ہوگی گویا یہ محصول کسی واسطے سب سے موزوں صورت ہے اور سرکاری امداد پر جسقدر صرف ہوگا نفع المصرف میں اس سے بہت کم اضافہ ہوسکے گا۔ گویا سرکاری امداد کے واسطے یہ سب سے ناموزوں حالت ہے۔

(ج) بحالت عمل قانون تکثیر حاصل محصول سے جسقدر آمدنی ہوگی اُس سے بہت زیادہ تخفیف نفع المصرف میں نمودار ہوجاوے گی۔ گویا محصول کے واسطے یہ ازحد ناموزوں حالت ہے اس کے برعکس سرکاری امداد پر جسقدر صرف ہوگا نفع المصرف میں اس سے بہت زیادہ اضافہ ہوسکے گا۔ گویا سرکاری امداد کے واسطے بغایت ناموزوں حالت ہے۔

تینوں مندرجہ بالا صورتوں میں اگر محصول یا امداد کے بغیر قیمت رسد میں بطور خود اضافہ یا تخفیف کی جاوے تو فروشندوں اور خریداروں کے باہم وہی نتائج ظہور پذیر ہونگے جو سرکار خریداروں کے باہمی واضح کیے گئے خریداروں کا فریق تو وہی رہے گا۔ صرف فریق ثانی بجائے سرکار کے فروشندے بنجاویں گے۔

خاتمہ پر ایک نکتہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اوپر کی کل بحث میں بغرض سہولت و اختصار ہم نے فریقین یعنی سرکار اور خریداروں کے معیار افادہ کو یکساں مان لیا ہے یعنی یہ فرض کرلیا ہے کہ مثلاً عہ روپیہ ۸ر کا ہمقدار اضافہ سب کی نظر میں مساوی ہے مالی حالت کے فرق کی وجہ سے جو معیار افادہ بدل جاتا ہے اور غریب آدمی کا ۴ر کا ہمقدر افادہ امیر کے عہ کے ہمقدر افادہ سے بڑھ جاتا ہے۔ سو اس تفاوت کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ اگر کیا جاوے تو پھر متعدد دقیق مگر دلچسپ و مفید نتائج نکلیں گے جنکی تفصیل بخوف

حصۂ پنجم طوالت ترک کی جاتی ہے لیکن جن کا استخراج کچھہ دشوار نہیں۔ شائق ناظرین اگر چاہیں تو خود غور کرکے ایسے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ کم از کم اس نکتہ کا خیال رکھنا ضروری ہے اسکو نظر انداز کرنے سے حالات واقعی اور نتائج علمی میں بُعد بلکہ تضاد پیدا ہو جاوے تو عجب نہیں علم المعیشت بالخاصہ وسعت نظر کا خواستگار ہے۔ گرچہ وہ سہولت کم کردے لیکن اس سے صحت میں ضرور قابل قدر اضافہ ہوگا۔

بیع المصرف علم المعیشت میں ایک نازک مسئلہ شمار ہوتا ہے۔ اس سے قبل بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ یہاں پر اُس کے متعلق تازہ ترین تحقیقات کا ماحصل مختصر اور سیدھے سادھے طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آیندہ اس مسئلہ کو روز افزوں توجہ حاصل ہوگی اور علم المعیشت کی ترقی کے واسطے ابھی اس شعبہ میں بہت کچھہ گنجایش باقی ہے۔

افادۂ اتم (۴) اس سے قبل افادہ کا مفہوم اُسکی قسمیں مثلاً افادہ مختتم و افادہ کلی اور نیز قوانین تکثیر افادہ و تقلیل افادہ۔ بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں پر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ افادہ کلی کی مقدار کیونکر بڑھتی ہے۔ اس کا اضافہ کس کس طرح ممکن ہے۔ انگریزی میں تو افادہ کلی کی سب سے بڑی قابل حصول مقدار کا ایک جداگانہ نام رائج ہے۔ لیکن ہم کوئی نئی اصلاح بڑھانے کے بجائے اس کو **افادۂ اتم** سے تعبیر کرنا بہتر سمجھتے ہیں پس افادہ اتم سے افادہ کلی کی وہ بڑی سے بڑی مقدار مراد ہے جو کسی چیز سے حاصل ہو سکے۔

جا بجا یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ مبادلہ یا خرید و فروخت سے ہر فریق کے افادہ کلی میں کیونکر اضافہ ہوتا ہے مثلاً جبکہ دو شخص آپس میں گھوڑے اور سائیکل کا مبادلہ کریں تو صاف ظاہر ہے کہ ہر فریق کی نظر میں دوسرے کی چیز کا افادہ بڑھا ہوا ہے۔ گھوڑا دینے والے کو سائیکل میں زیادہ افادہ نظر آتا ہے اور سائیکل دینے والے کو گھوڑے میں اگر ایسا نہوتا تو مبادلہ ہی کیوں عمل میں آتا۔ پس مبادلہ سے قبل ان دو چیزوں کا جو جو افادہ کلی تھا۔ بعد

حصۂ پنجم

مبادلہ وہ ضرور تھوڑا بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ یہ ایک مسلمہ معاشی مسئلہ ہے کہ مبادلہ سے اشیا ئے متبادلہ کے افادۂ کلی کی مقداریں بڑھ جاتی ہیں اگر سیدھے سادھے مبادلہ کی بجائے خرید و فروخت کو لیجیئے تو مبادلہ میں زر کے توسل ہونے سے اس کی اس خاصیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف عمل ذرا پیچیدہ ہو جاتا ہے یعنی براہ راست چیزیں لینے دینے کے بجائے زر کے وسیلے سے اُن کو لیتے دیتے ہیں اور خرید و فروخت میں بھی ہر فریق کا افادہ کلّی اس طرح بڑھتا ہے جیسے کہ مبادلہ میں۔

افادہ کلّی کے اضافہ کا طریق تو دریافت ہو گیا کہ وہ مبادلہ ہے۔ اب تحقیق طلب یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کو افادہ اتم کیونکر حاصل ہوتا ہے اور کس حالت میں فریقین کے افادہائے کلی کی مجموعی مقدار سب سے بڑی رہیگی جو کہ بدرجہ اولیٰ افادۂ اتم کہلانے کی مستحق ہو گی۔ گویا افادۂ اتم کے دو مفہوم ہوئے کسی ایک فریق کے افادہ کلّی کی سب سے بڑی مقدار یا ہر دو فریق کے افادہائے کلّی کی سب سے بڑی مجموعی مقدار افادۂ اتم حسب موقع ہر دو مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن ہر جگہ مفہوم مقصود واضح کر دیا گیا ہے۔ ہر دو مفہوم کا فرق ظاہر کرنے کے علاوہ یہیں پر یہ جتا دینا بھی برمحل ہو گا کہ اس بحث کا اصل مقصود آخر الذکر افادۂ اتم ہے۔ یعنی ہر دو فریق کے افادہائے کلی کی سب سے بڑی مجموعی مقدار۔

فرض کرو لوگ صہ ر کے نرخ سے صرف ہزار چیزیں خریدنے پر آمادہ ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں تو غالباً ان میں سے بہت سی چیزوں کا افادہ خریداروں کی نظر میں صہ ر سے زیادہ ہو گا۔ افادہ کی یہ زاید مقدار نفع المصرف کہلائیگی۔ بعض کا افادہ صہ ر کے مساوی بھی ہو تو عجب نہیں۔ اس افادہ کو افادہ مختتم سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن لوگ جو ہزار سے زاید چیزیں نہیں خریدتے تو معلوم ہوا کہ ہزار کے بعد والی چیزوں کا افادہ قانون تقلیل افادہ کے بموجب ان کی نظر میں صہ ر سے کم ہے۔ گویا ہزار چیزیں خریدنے سے جسقدر افادہ

حصۂ پنجم

حاصل ہوا۔ وہ افادہ کی سبب سے بڑی قابل الحصول مقدار ہے۔ اصطلاحاً ہزار چیزوں کا افادہ۔ افادہ اتم کہلائیگا۔ ہزار کے بعد کوئی چیز بہ نرخ صہ؍ خریدنے سے افادہ کی موجودہ مقدار میں اضافہ ہونے کے بجائے اُلٹی تخفیف ہوگی۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہزار پر خریداری بند کر دیتے ہیں اصطلاحی زبان میں اس واقعہ کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ لوگ افادۂ اتم کی حد تک چیزوں کی خریداری پسند کرتے ہیں اور اسی حد کا اصطلاحی نام افادہ مختتم ہے۔ اب اگر فروشندے ہی صرف ایک ہزار چیزیں صہ؍ کے نرخ سے فروخت کرنے کو تیار ہوں یعنی ان کو بھی اسی مقدار کی فروخت سے افادۂ اتم حاصل ہو تو یہ حالت اصطلاحاً توازن طلب ورسد کہلائیگی اور فریقین کے افادوں کی مجموعی مقدار سب قابل حصول مقداروں سے بڑھی رہے گی۔ کیونکہ اگر فروشندے ہزار سے کم مثلاً صرف ۸ سو چیزیں فروخت کرنے پر رضامند ہوتے تو اُن کو تو افادہ اتم حاصل ہو جاتا۔ لیکن خریداروں کو حاصل نہوتا کیونکہ وہ ہزار چیزیں خریدنا چاہتے تھے اور ۲۰۰ چیزوں کے افادہ سے وہ محروم رہتے۔ اسکے برعکس اگر فروشندے ہزار سے زیادہ مثلاً ۱۲ سو چیزیں فروخت کرنے کے خواہشمند ہوتے تو خریداروں کو تو ایک ہزار خریدنے سے افادہ اتم حاصل ہو جاتا۔ لیکن فروشندے ۲ سو کے افادہ سے محروم رہتے۔ حاصل کلام یہ کہ توازن طلب و رسد کی حالت میں تو ہر دو فریق کو افادہ اتم حاصل ہو جاتا ہے اور لہذا ان کی مجموعی مقدار سب سے زیادہ رہتی ہے اور بدرجہ اولی افادہ اتم کہلاتی ہے اور عدم توازن کی حالت میں کسی ایک فریق کو افادہ اتم حاصل ہوتا ہے اور دوسرے کو نہیں۔ اسلئے مجموعی مقدار گھٹی رہتی ہے۔ پس اب اس معاشی مقولہ کا سمجھنا دشوار نہوگا کہ توازن طلب و رسد کی حالت میں افادۂ اتم حاصل ہوتا ہے۔ دوسری حالت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ اسی مقولہ میں افادۂ اتم میں فریقین کے افادوں کا مجموعہ شمار کیا جاتا ہے صرف کسی ایک فریق کے افادۂ اتم سے بحث نہیں۔

حصہ پنجم

واقعہ یہ ہے کہ جبتک قیمت طلب قیمت رسد سے بڑھی رہتی ہے۔ خرید و فروخت جاری رہتی ہے۔ حتی کہ یہ دونوں قیمتیں برابر آلگیں۔ فروشندے جو زیادہ سے زیادہ قیمت خریدار دیکیں اور جو کم از کم قیمت فروشندے لے سکیں وہ مقدار مساوی ہوں اسکے بعد اگر قیمت طلب قیمت رسد سے گھٹی تو لازماً خریداری بند ہوجاوے گی۔ اب اگر وہ زیادہ سے زیادہ مقداریں جو اس قیمت پر فریقین خریدنا اور فروخت کرنا چاہیں مساوی ہوجاویں تو یہی حالت توازن طلب و رسد سمجھنی چاہیے اور جبکہ ایک ہی زیادہ سے زیادہ مقدار کی قیمت طلب و قیمت رسد بھی مساوی ہوجاویں تو فریقین میں ہر ایک کو افادۂ اتم حاصل ہوگا اور انکی مجموعی مقدار بدرجہ اولی افادۂ اتم شمار ہوگی اور یہی آخر الذکر افادۂ اتم اس بحث کا مقصود ہے۔

جبکہ لوگوں کو کاروبار میں کامل آزادی حاصل ہو جیسی کہ آج کل ہے۔ جو چیز چاہیں اور جس قیمت پر چاہیں خرید و فروخت کریں۔ تو بیشک توازن طلب و رسد کی حالت میں فریقین کو جسقدر افادۂ کلی حاصل ہوتا ہے وہی افادۂ اتم ہے اس خاص حالت میں یہ معاشی مقولہ بالکل بجا اور درست ہے لیکن وسعت نظر سے کام لیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ اگر اس آزادی کو بخوشی یا جبراً چند اصول کا پابند بنا دیا جاوے تو توازن طلب و رسد سے جسقدر افادہ کلی حاصل ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ افادۂ اتم حاصل ہونا ممکن ہے۔ البتہ یہ سوال کہ مجوزہ طریق پر عملدرآمد کہانتک ممکن اور قرین مصلحت ہی اس کا جواب آسان نہیں اور نہ اس بحث کو چھیڑنے کا یہاں موقع۔ صرف مجوزہ طریق کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جتائے دیتے ہیں کہ اس پر عمل درآمد کرنے میں اور بھی بہت سے پہلو پیش نظر رکھنے ضروری ہیں جن کی طویل تفصیل اشتراک اور مالیات کے مباحث میں تلاش کرنی چاہیے۔

اوّل توازن طلب و رسد کو لیجیے۔ فرض کیجیے کہ ہزار چیزیں اور صرف ہزار صر کے نرخ سے خرید و فروخت ہو سکیں۔ اب اگر کسی وجہ سے ان چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہے یعنی انکی قیمت میں معمولی اضافہ ہونے سے ہی طلب میں کوئی قابل لحاظ کمی واقع نہو۔ اگر خریدار

حصہ پنجم

خوش حال ہیں اور چیزیں بنانے والے غریب لوگ ہیں اور وہ متفق ہو کر چیزوں کی قیمت ۱۰ کر دیں تو توازن درہم برہم ہو جائیگا۔ کیونکہ نئی شرح سے لوگ غالباً نو سو سے زیادہ چیزیں نہ خریدیں گے اور بنانے والے بارہ سو تک فروخت کرنے پر آمادہ ہوں گے لیکن یہ جو جدید نو سو روپیہ خوش حال خریداروں کی جیب سے نکلکر غریب فروشندوں کے ہاتھ آئیں گے۔ اُن کے افادہ میں زمین آسمان کا فرق پڑجائیگا۔ ایک روپیہ کا جو افادہ امیر کی نظر میں ہوگا غریب کو اُس کا چند در چند نظر آئیگا۔ گویا یہ نو سو روپیہ غریب لوگوں میں پہنچکر امیروں کے معیار سے کئی ہزار روپیہ کی برابر افادہ دینگے۔ خصوصاً اگر پیداوار قانون تقلیل حاصل کی پیرو ہوئی تو ہزار کے بجائے نو سو چیزیں بننے سے مصارف میں کمی آکر فروشندوں کو نو سو کے علاوہ کچھ اور بھی بچت ہو سکے گی۔ قانون تکثیر حاصل کی صورت میں نتیجہ برعکس ہوگا یعنی اضافہ مصارف کی بدولت بچت نو سو سے بھی کم رہے گی۔ حاصل کلام یہ کہ اگر چیزیں بنانے والے غریب لوگ ہوں اور خریدار امیر اور چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہو تو قیمت میں اضافہ ہونے سے خواہ طلب و رسد کا توازن غائب ہو جائے لیکن فریقین کے افادہ کی مجموعی مقدار بڑھ جاوے گی۔ اسکے برعکس اگر فروشندے خوش حال ہیں اور خریدار غریب اور فریق اوّل بلا لحاظ توازن طلب و رسد کے اپنا نقصان کرکے بھی چیزیں ارزاں فروخت کرے تو فریقین کے افادہ کی مجموعی مقدار ضرور بڑھ جاوے گی۔ قیمت گھٹنے سے طلب کم و بیش ضرور بڑھے گی۔ اب اگر پیداوار قانون تقلیل حاصل کی پابند ہے تو فروشندوں کو سخت دقت کا سامنا ہوگا۔ ایک طرف تو قیمت گھٹی اور دوسری طرف مصارف بڑھ گئے۔ لیکن اگر قانون تکثیر حاصل کا دور دورہ ہوا تو پھر کیا کہنا۔ تخفیف قیمت سے اگر فروشندوں کو کچھ نقصان بھی برداشت کرنا پڑے تو تخفیف مصارف اُس کی کم و بیش تلافی کرتی رہے گی۔ امیر فروشندے تو کم خسارہ اٹھائیں گے لیکن غریب خریدار مالامال ہو جائیں گے۔ اشتراک کا ایک اساسی

اُصول سے ہے کہ اگر امرا کی دولت غربا میں تقسیم کردی جاوے تو مجموعی افادہ کی مقدار بہت کچھ بڑھ سکتی ہے اسی انتقال دولت کی دو شکلیں اوپر بیان ہوئیں اور اسی اصول کے مطابق مجموعی افادہ میں اضافہ ہوگا۔

اب آزادی خرید و فروخت کو لیجیئے۔ اگر لوگ خود خیال کرکے یا کسی قانون کی مجبوری سے اپنی دولت اس طرح پر صرف کریں کہ غریب لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو تو اس صورت میں دولت کا مجموعی افادہ بہت بڑھ جائیگا لیکن اگر صرفِ دولت سے امیر طبقے کی آمدنی میں اسیقدر بلکہ اُس سے زیادہ بھی اضافہ ہو تو افادہ کا مجموعہ اوّل الذکر مجموعہ سے ضرور کم رہیگا امیر آدمی کو عہ ملنے سے اُتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی کہ غریب کو ایک آنہ ملنے سے یعنی غریب کو ایک آنہ دینے سے جسقدر افادہ بڑھتا ہے امیر کو عہ دینے سے نہیں بڑھتا۔ اکثر رحم دل لوگ جہانتک ممکن ہوتا ہے خاص خیال کرکے غریب مزدور سے کام کراتے ہیں۔ غریب دُکاندار سے سامان خریدتے ہیں۔

افادہ اتم بڑھانے کی جو دو صورتیں اوپر بیان ہوئیں۔ اُن میں ایک گروہ خوشحال فرض کیا گیا اور دوسرا غریب لیکن اگر سب لوگوں کی مالی حالت یکساں مان لی جاسے تب بھی افادہ اتم کے اضافہ کی دو صورتیں قابل توجہ ہیں۔

جو لوگ ایسی چیزیں خریدتے ہیں جنکی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے وہ اسکی طلب بڑھاکر اسکو گراں بناتے ہیں۔ گویا سب کی آمدنی کے افادہ کی مقدار گھٹاتے ہیں۔ اُسکے برعکس جو لوگ قانون تکثیر حاصل کی پیرو چیزیں خریدتے ہیں وہ ان کی طلب بڑھاکر قیمت گھٹاتے اور سب کی آمدنی کے افادہ میں اضافہ کردیتے ہیں گویا ہم اپنی دولت صرف کرکے چیزوں کی گرانی وارزانی بڑھا سکتے ہیں اور عوام کی دولت کا افادہ گھٹانا بڑھانا بہت کچھ افراد کی خرید و فروخت پر منحصر ہے۔ جہانتک ہوسکے اول قسم کی چیزوں سے دست کش رہنا چاہیئے

حصۂ پنجم اور قسم دوم کو صرف میں لانا چاہیئے۔ اس میں سب کا فائدہ ہے۔

اگر عوام مذکورہ بالا ہدایت پر کاربند ہوں تو سرکار اُن کو ایک حد تک کاربند بنا کر۔ افادہ میں معقول اضافہ کر سکتی ہے۔ طریق یہ ہے کہ قانون تقلیل حاصل والی چیزوں پر ٹیکس یا محصول قائم کر دے اور قانون تکثیر حاصل والی چیزوں کو مالی امداد دے۔ نفع المصرف کی بحث میں واضح ہو چکا ہے کہ عوام کے حق میں بحیثیت مجموعی یہ ترکیب مفید ہو گی۔

واضح ہو کہ عوام کے افادہ کی مجموعی مقدار بڑھانے کی جو تجاویز اوپر بیان کی گئیں وہ از حد سادہ ہیں۔ ان کو پیش کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ افادہ اتم جیسے اہم مسئلہ پر خیالات دوڑانے کی راہیں سوجھائی جائیں۔ ایسی تجاویز کو قابل عمل بنانا گورکھ دھندے سلجھانے اور بھول بھلیوں کا پتہ لگانے سے کم نہیں۔ مالیات اور اشتراک کی بیسیوں ضخیم ضخیم کتابیں اس قسم کی تجاویز اور اُن کی نکتہ چینیوں سے لبریز ہیں۔ گو اس مسئلہ کا کوئی قطعی حل دشوار بلکہ محال ہے لیکن تحقیقات سے جن اصول کا پتہ لگا ہے۔ اُس پر عمل درآمد ہونے سے یقیناً عوام کو بہت کچھ فائدہ پہونچ رہا ہے۔ گو تشریح کی گنجائش نہ تھی لیکن کم از کم اس مسئلہ کا حوالہ دینا یہاں پر ضروری معلوم ہوا۔

معیار زندگی (۵) اس مسئلہ پر بھی از حد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے زندگی کا کون معیار بہتر ہے۔ آیا ہمکو چند سیدھی سادھی ضروریات پر قناعت کرنا اچھا ہو گا یا دنیا کی نعمتوں اور تعیشات سے دل بھر کر لطف اُٹھانا چاہیئے۔ حکما کے ایک طبقہ نے تو نفس پروری اور عشرت پرستی کو زندگی کی غرض و غایت قرار دیدیا اور دوسرے نے نفس کشی اور ریاضت کو زندگی کا اعلیٰ مقصد ٹھیرایا۔ سچ پوچھئے تو یہ دونوں فرقے افراط و تفریط میں جا پھنسے۔ خدا کی بے شمار عطیات سے خواہ مخواہ کشمکش رہنا بھی کفران نعمت ہے۔ اور تمام عمر تن پروری کی نذر کر دینا اور بھی گمراہی ہے۔ دُنیا کی لذتوں کا لطف اٹھانا اور پھر بھی نفس پر قابو رکھنا گو دشوار ہے لیکن زندگی کا سب سے کامیاب طریق بھی ہے اور اسلام نے اپنے پیروؤں کو اسی طریق کی ہدایت

کی ہے۔ کسی زمانہ میں مسلمان ایک ہی وقت میں پکے دنیادار اور خداپرست اور صاحب ثروت اور فقیرمنش بنکر اس طریق کی خوبیاں دنیا پر ثابت کر چکے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا روم نے اس نکتہ کی یوں توضیح کی ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

مذہبی اور اخلاقی پہلو سے قطع نظر کرکے یہی طریق اعتدال معاشی نقطۂ نظر سے اصولاً اور تجربۃً بہترین ثابت ہو رہا ہے۔ اگر لوگ صرف چند مایحتاج زندگی پر قناعت کر بیٹھتے مثلاً سیدھا سادھا کھانا موٹا جھوٹا کپڑا چھوٹے اور کچے جھونپڑے تو سب کی حالت گویا موجودہ پس ماندہ قوموں کی سی ہوتی۔ یا یوں کہو کہ وہ اپنی صدیوں پہلی حالت پر قائم رہتے اور موجودہ ترقی کا دیکھنا نصیب نہوتا۔ جب لوگ تھوڑے پر قانع ہوتے تو پیدا بھی تھوڑا ہی کرتے اور ہر قسم کی قدرتی نعمتیں اور انسانی قوتیں یوں ہی بیکار پڑے پڑے ضائع ہوا کرتیں اور اگر انسان محض دولت پرستی اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیں، تب بھی تمدن اور معاشرت کی حالت ضرور ابتر ہو جائیگی۔ انسان بہت سی بے بہا خوبیوں سے عاری ہو جائیگا۔ اور ایسی زندگی خود اُسکے حق میں وبال جان بنجائیگی۔ یورپ اور امریکہ میں عشرت پرستی کا زور رہے۔ لوگوں نے خوردن برائے زیستن کے بجائے زیستن برائے خوردن اپنا مسلک بنا رکھا ہے اور اُن کی زندگی کسی طرح پر بھی قابل رشک نظر نہیں آتی۔ اگرچہ تعین دشوار ہے لیکن یہ تحقیق ہے کہ جسم قوم میں دولت کی حالت خون کی سی ہے۔ اُس کی قلت اور کثرت دونوں مضرت رساں ہیں۔ دولت اسقدر ہونی چاہیے کہ لوگ اعلیٰ اخلاق و عادات قائم رکھکر زندگی کا لطف اُٹھا سکیں نہ دولت کو ترسیں نہ اُس میں ڈوبیں نہ اُس سے نفرت کریں نہ اُس کو پوجیں۔ دولت کے صحیح مصرف میں کوتاہی نہ کریں اور بیجا طور پر برباد نہ کرسکیں جبکہ اربوں روپیہ شراب اور آوارگی جیسی آتش جہاں سوز کے مشتعل

حصۂ پنجم کرنے پر صرف ہو تو ایسی دولت کے ہونے سے نہ ہونا اچھا ہے۔

ہماری احتیاجات کے باہم مقابلہ جاری ہے یعنی وہ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرتی رہتی ہیں۔ کوئی شخص بہت معمولی لباس پہنتا ہے لیکن کھانا بہت عمدہ کھاتا ہے کوئی عمدہ لباس کا شوقین ہے اور اُس کا کھانا بہت سادہ ہوتا ہے۔ کوئی شخص کھانے پہننے میں بہت کم صرف کرتا ہے لیکن کسی خاص شوق کی چیز مثلاً کتابوں گھوڑوں عمارتوں یا رفاہ عام کے کاموں پر دولت لٹاتا ہے۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی چند در چند احتیاجات کے رفع کرنے میں بعض پر بہت زیادہ صرف کرنا پسند کرتا ہے اور بعض پر کم۔ احتیاجات کے مراتب قرار دینے میں بہت احتیاط شرط ہے کیونکہ اُس سے بیحد فائدہ اور مضرت پہنچنا ممکن ہے مثلاً لوگ خورد و نوش اور لباس و مکانات میں صرف بقدر ضرورت کرکے اشاعت تعلیم تحفظ صحت اور درستی اخلاق پر دل کھولکر دولت لٹاویں تو ملک میں ترقی کے سرچشمہ جاری ہوجاویں اس کے برعکس اگر محض نمایش اور آرایش کی چیزوں پر لٹو رہیں بیش قیمت خوراک لباس اور سامان پر اپنی کمائی ضایع کریں اور وسائل ترقی کی طرف سے بے خبر رہیں تو چندہی روز بعد پچتانا بھی عجب نہوگا۔ جو لوگ ہندوستان کے معیار زندگی میں ترقی دکھا کر افزایش دولت ثابت کرنا چاہتے ہیں اُن کو مراتب احتیاجات پر توجہ دلانا ضروری ہے عام مشاہدہ ہے کہ لوگ لباس اور سامان آرایش کے واسطے جو یورپ کے مصنوعات بکثرت خریدتے ہیں تو یہ مصارف دیگر احتیاجات کے رفع ہونے میں اکثر حارج ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ احتیاجات قابل فوقیت ہیں۔ اگر ہمارے نوجوان کروڑہا روپیہ فینسی جرابوں رومال۔ ٹائیوں۔ خوشبو و صابون اور جوتوں میں برباد نکریں تو نہ صرف اُن کے بلکہ اُن کے خاندانوں کے بہت سے بگڑے کام بن جاویں۔ ہماری طالب علمانہ زندگی ہماری مالی حیثیت سے زیادہ بیش خرچ ہے۔ اور اُس سے تعلیم کی اشد ضروری اشاعت میں بڑا حرج ہو رہا ہے۔ ہمارے طالب علمانہ مصارف

حصہ ہجم

میں کفایت کی ضرور گنجایش موجود ہے اور اس اندوختہ کے واسطے بہت سے اعلیٰ مصرف منتظر ہیں۔ یہی حال متوسط درجہ والوں کا ہے ہر شخص اپنے مصارف پر غور کرے۔ اکثر کو محسوس ہوگا کہ بحالت موجودہ احتیاجات کے مراتب قابل اعتراض ہیں اکثر اعلیٰ احتیاجات کو پس پشت ڈالکر اور گردونواح سے متاثر ہوکر ہم ادنے خواہشات کی حدست گذاری میں مصروف ہیں تفصیل کی تو گنجایش نہیں لیکن مجملاً اتنا اشارہ ضروری ہے کہ بحالت موجودہ صحت کے بعد تعلیم کا نمبر ہونا چاہیئے۔ اور ایسے مصارف جو صحت واخلاق کو برباد کررہے ہیں اور بدقسمتی سے روز افزوں تسلط پا رہے ہیں جلد سے جلد ترک کر دیے جاویں خصوصاً تمباکو اور شراب کے رواج کی روک تھام بہت عجلت طلب اور ضروری ہے اور زیبائش جسمانی اور آرائش مکانات کے واسطے جو ولایتی مصنوعات خریدے جاتے ہیں وہ بھی ہماری مالی حالت کے لحاظ سے قبل ازوقت ہیں ابھی ہمکو افلاس سے پیچھا چھڑانا ہے جب مالی حالت مستقل طور پر عمدہ ہوجائے تب ان چیزوں کا موقع اور لطف ہوگا۔ بحالت موجودہ تو اُن کا استعمال گویا گھر پھونک تماشا دیکھنا ہے۔

واضح ہو کہ خرچ چلانے کے چار ذریعے ہوسکتے ہیں۔ یا تو انسان خود اپنی قوت بازو سے کافی روپیہ کمائے۔ یا اُس کے پاس بزرگوں کا کچھ اندوختہ ہو یا وہ چوری کرے یا بھیک مانگے ہونہار اور ترقی پذیر قومیں۔ خاندان یا افراد خود پیدا کرکے زندگی کا لطف اُٹھاتے ہیں ایسی حالت میں وہ عام ترقی کا بھی باعث بنجاتے ہیں اور اعلیٰ معیار زندگی اُن کے واسطے ہر طرح پر مناسب اور موزوں ہے پست ہمت ناعاقبت اندیش لوگ خود تو کمانے سے رہے جو کچھ بزرگوں کا اندوختہ ملتا ہے اُس کو بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی چندروزہ عیش وعشرت کی خاطر خاک میں ملاکر مدتوں کے واسطے افلاس ونکبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ بہت سے لوگ جو یہ نہیں سمجھتے کہ جتنی چادر ہو اُتنے ہی پیر پھیلانے چاہئیں خواہ آمدنی کم ہو لیکن انکے دل میں ہر چیز کا شوق موجزن رہتا ہے۔ ایسے لوگ بالآخر چوری پر اُتر آتے ہیں خواہ وہ دھوکوں سے قرض

حصۂ سوم لیں۔ یا رات کو نقب زنی کریں۔ یا دن دہاڑے عہدوں کی کرسیوں پر بیٹھکر رشوت لیں اگر اپنی خواہشات کے غلام بننے کے بجائے اپنے نفس کو قابو میں رکھتے تو نہ دنیا میں اُس کی رسوائی ہوتی اور نہ عاقبت میں اُنکو عذاب بھگتنا پڑتا۔ ایسی پر لطف زندگی سے جو چوری کے سہارے بسر ہو ایمانداری کی سیدھی سادی غریبانہ زندگی ہزار درجہ بہتر ہے۔ گلی کوچہ بھیک مانگنا تو بہت لوں کو عار ہوتا ہے لیکن امرا و حکام کے خوشامدی مصاحب اور متوسلین اس غریب فقیر سے زیادہ ذلیل ہیں جو افلاس سے تنگ آکر بھیک سے اپنا پیٹ پالتا ہو۔ وہ تو لاچار ہے اور اپنی بقا کی خاطر بھیک کی ذلت گوارا کرتا ہے لیکن اوّل الذکر لوگ اکثر ہٹّے کٹّے اُسٹنڈے مگر بے غیرت ہوتے ہیں۔ چاہتے تو اپنے قوت بازو سے آبرو کے ساتھ روزی کماتے لیکن تن آسانی کے ہاتھوں اُن کی غیرت سپر انداز ہو جاتی ہے اور خودداری کا بے بہا جوہر لذائذ نفسانی کی زد سے پاش پاش ہو کر ہمیشہ کے واسطے آبرو خاک میں ملا دیتا ہے حضرت شیخ سعدی کی ہدایت جو کہ غیرت سے لبریز ہے اس زمانہ میں بہت سوں کو عجیب معلوم ہوگی۔

بدست آہک تفتہ کردن خمیر
بہ از دست بر سینہ پیش امیر

حاصل کلام یہ کہ لذات دنیا سے لطف اُٹھانے میں مضائقہ نہیں بلکہ زندگی کا معاشی معیار اعلیٰ ہونا بھی ترقی کا خاص باعث اور اس کا لازمی نتیجہ ہے بشرطیکہ تن پروری زندگی کے دیگر اعلیٰ مقاصد کو دل سے محو نہ کردے عیش و عشرت مخرب اخلاق و صحت نہوں سب احتیاجات حسب مراتب رفع ہوتی رہیں یہ نہیں کہ چند احتیاجات تو بدرجہ اعلیٰ پوری ہوں اور دیگر بدرجہ ادنیٰ جیسا کہ ہندوستان کے سفید پوشوں کا حال ہے اور سب سے بڑی شرط یہ بھی ہے کہ انسان جسقدر خرچ کرے اُس سے زیادہ کمائے بھی حقیقی خوشحالی کی علامت یہ ہے کہ زندگی کا معیار اعلیٰ رکھتے پر بھی لوگ اپنی آمدنی میں سے پس انداز کرتے رہیں ورنہ بزرگوں کا اندوختہ خاک

حصۂ پنجم

میں لاکر یا کسی مہذب یا غیر مہذب طور پر چوری کر کے یا بھیک مانگ کر اگر چند روزہ لطف اٹھایا تو سمجھدار اور غیرت مندوں کی نظر میں وہ فاقہ کشی سے بدتر ہے اور ایسے لوگوں کا انجام اکثر عبرتناک ہوتا ہے۔ جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کی نصیحت کسقدر سادہ مگر پرمعنی ہے **شعر**

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

اکثر لوگ ہندوستان میں ولایتی عطر۔ صابون۔ ٹائی۔ کالر۔ فینسی جراب و چھڑی۔ رومال۔ عینک۔ سگریٹ اور شراب جیسی تعیشات کی فروخت بڑھتی دیکھکر۔ خوش اور مطمئن ہوتے ہیں ایسے معیار زندگی کے اعلےٰ ہونیکو خوش حالی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس معیار زندگی کے ہاتھوں ملک و جائداد قرق و نیلام ہو رہی ہیں چوری اور بھیک عجب عجب بھیس بدلکر ہرطرف رواج پا رہے ہیں۔ اخلاق مائل بہ پستی ہیں اور ترقی کے سرچشمے اولے ٹمسدود ہوتے جاتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کا موجودہ معیار زندگی باوجود دیگر ممالک سے مقابلۃً ادنیٰ ہونے کے یہاں کی مالی حالت پر بڑا بار ہے۔ اسکی مثال بعینہ اس جام شراب کی سی ہو جو چند لمحوں کے سرور کی خاطر کوئی جیب خالی کر کے خریدے اور جس کا خمار بالآخر اُس کو بدرجہا مضمحل کر دے ممکن ہے کہ خدا وہ دن بھی لائے جبکہ ہمکو صحیح مفہوم کے مطابق خوش حالی نصیب ہو اور تب ہی معیار زندگی بلند کرنیکا لطف ہے۔ ابھی ہم کو بہت کچھ محنت اور صرف کر کے ملک میں تعلیم پھیلانا ہے۔ صنعت و حرفت سنبھالنا ہے ایسے عظیم الشان کام پیش ہوتے ہوئے ہم کو تن آسانی کا موقع کیونکر مل سکتا ہے۔ ابھی ہمکو ترقی کا کھیت بونا ہے فصل کاٹنے کا کیا ذکر ہے۔ اسوقت ہر کسی کو لازم ہے کہ مآل اندیشی سے کام لیکر اپنی احتیاجات کے مراتب پر غور کرے اور اپنے خرچ کی مدّوں کو جانچے تو حساب میں اکثر بیجا اور خلاف مصلحت اخراجات نظر پڑیں گے ضبط سے کام لیکر اُن کو جلد سے جلد ترک کر دیجے۔ اور جو کچھ پس انداز ہو اُسکو بہتر احتیاجات کے رفع کرنے میں صرف

کرے۔ ایک دن آئیگا کہ دولت ملک میں اس طرح بڑھے گی جیسے کھیت میں غلہ اُگتا ہے۔ درخت میں پھل آتے ہیں۔ سب ترقی یافتہ ملک اسی راہ پر چلکر منزل مقصود تک پہنچے ہیں۔ جاپان کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور جب خدا ہندوستان کو بھی یہ دن دکھائیگا تو ہم یا ہماری آیندہ نسلیں دوسرے ملک والوں کی طرح زندگی کا لطف اُٹھاوینگی۔

ہماری قطعی راے ہے کہ ہندوستان میں بہت سی تعیشات کا استعمال قبل از وقت لہٰذا برباد کن ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کی مانند محنت اور خرچ کرکے ذرایع پیداوار بڑھائے بغیر اُن کا سا لطف اُٹھائیں یعنی کھیت بوئے بغیر فصل کاٹیں۔ درخت لگائے بغیر پھل پائیں۔ ابھی ہمکو از حد محنت و خرچ طلب اہتمام درپیش ہے تعلیم پھیلانا ہے صنعت و حرفت میں دوبارہ جان ڈالنا ہے اور مہذب زندگی کے دیگر شعبوں کو اصلاح اور ترقی دینا ہے۔ تعیشات سے لطف اُٹھانے کے واسطے اسوقت نہ ہمارے پہلو میں دل ہونا چاہیے اور نہ ہمارے پاس وقت اور روپیہ ہے۔ ہم کو تو ایثار اور جفاکشی کی کٹھن منزل درپیش ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ بھی ہے۔ ترقی پذیر اور ہونہار قوموں کی زندگی کا حالی مرحوم نے جو سادہ مگر پُر اثر خاکہ کھینچا ہے اور ہم کو جو دلسوزی سے ہدایت کی ہے اُس کو یہاں پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔ ولہ

سننے ہو سامعین با تمکین — سننے ہو حاضرین صدر نشین
جو ہیں دنیا میں قوم کے ہمدرد — بندۂ قوم اُنکے ہیں زن و مرد
باپ کی ہے دعا یہ بہر پسر — قوم کی میں بناؤں اسکو سپر
ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مراد — قوم پر سے نثار ہو اولاد
بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں — تو اگر مال دے تو میں دوں جاں
قوم کی خاطر اُن کے ہیں سب کام — خواہ اُس میں سفر ہو خواہ مقام

سینکڑوں گل رُخ اور مہ پارے لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے

جان اپنی لئے ہتھیلی پر کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر

گو سفر میں اٹھائے رنج کمال کر دیا پر وطن کو اپنے نہال

اہلِ ہمت کما کے لاتے ہیں ہموطن فائدے اُٹھاتے ہیں

کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری دخل اور خرج جنکے ہیں بھاری

اور کہیں ہوتے ہیں کلب قایم مبحث حکمت و ادب قایم

نت نئے کھلتے ہیں دوا خانے بنتے ہیں سینکڑوں شفا خانے

ہیں اب اُن کے گواہِ حُبِّ وطن در و دیوار پیرس و لندن

سیکھئے دنیا کا جن کو باغ جنان ہے فرانس آج یا ہے انگلستان

کام ہیں سب بشر کے ہم وطنو! تم سے بھی ہو سکیں تو مرد بنو

چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ بس بہت سوئے اُٹھو ہوش میں آؤ

قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں؟

قافلوں سے اگر ملا چاہو ملک اور قوم کا بھلا چاہو

گر رہا چاہتے ہو عزّت سے بھائیوں کو نکالو ذلّت سے

کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمہارے جو ہے غذا اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جن پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہنا دو کہ ہے اُترن تمہاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر ہے کوئی اُنمیں خشک اور کوئی تر

حصّہ حکم

اُن کی عزّت تمہاری عزّت ہے ۔۔۔ اُن کی ذلّت تمہاری ذلّت ہی
قوم کا بیتدل ہے جو انساں ۔۔۔ بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز ۔۔۔ ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز
عزّت قوم چاہتے ہو اگر ۔۔۔ جاکے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور ۔۔۔ اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے ۔۔۔ علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دَور آئے گا ۔۔۔ بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات ۔۔۔ یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

المختصر یہ وقت ملک میں علم و ہنر صنعت و حرفت۔ بیداری اور آزادی پھیلانے کا ہے اور ان کاموں میں جسقدر بھی صرف کیا جاوے کم ہے۔ تن پروری اور عشرت پرستی ہمارے حق میں سم قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ البتہ جب خدا یہ سب کام پورے کرا دے گا تو ہمارا ملک بھی رشک جناں بن جائیگا۔ اور اُسوقت معیار زندگی بلند کرنے کا بھی موقع اور لطف ہو گا۔ بالفعل ہم پر لازم ہے کہ نہایت ایثار کے ساتھ ازحد سادہ طور پر زندگی بسر کرکے جو کچھ بن پڑے ملک کی خدمت میں بے دریغ صرف کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ کچھ روز فیشن کا بھوت سر پر سوار رہنے کے بعد برادران وطن میں سادہ زندگی اور عالی حوصلگی کا مبارک رجحان پیدا ہو چلا ہے اللھم زد فزد۔

مسئلہ آبادی

(۶) چونکہ یہ کتاب بالخصوص ہندوستانی ناظرین کے واسطے مقصود ہے اصول بحث کے تحت میں ہندوستان کی معاشی حالت کا بھی خفیف ذکر چھڑ جاتا ہے اور کچھ نہ کچھ بیان

حصّہ پنجم

کے بغیر نہیں رہا جاتا۔ مختصراً ابھی بتایا جا چکا ہے کہ معیار زندگی کا بلند ہونا ترقی کا باعث بھی ہی اور نتیجہ بھی۔ خواہ مخواہ معیار زندگی پست رکھنا گویا ترقی سے دست بردار ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے یہاں معیار زندگی بڑھانا قبل از وقت نظر آتا ہے اور اس سے وسائل ترقی اُلٹے مسدود ہونے کا اندیشہ ہے۔ لیکن یورپ اور امریکہ میں زندگی کا معیار بہت بلند ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے جو چیزیں کبھی امرا کے تعیشات میں شمار ہوتی تھیں وہ اب غربا کی ضروریات میں داخل ہیں دوسرے ممالک بھی اپنی اپنی بساط کے موافق افزایش دولت کی کوشش میں سرگرم ہیں۔ علم کے زور سے قدرت کے مادی خزانے کھول کھول کر زندگی کو پُرلطف بنانا۔ تہذیب جدید کا یہ عالمگیر رجحان نظر آرہا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مرفہ الحالی کی کوئی حد بھی ہے۔ آبادی اور وسائل پیداوار یا بالفاظ دیگر طلب و رسد دولت کا موازنہ کرنے پر کیا انجام قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ آیا جسقدر انسان دولت چاہے گا پیدا کرتا رہے گا۔ یا پیداوار محدود ہے اور کبھی ایسی نوبت بھی آئیگی کہ انسان کو بوجہ قلت پیداوار اپنی ضروریات روکنی اور گھٹانی پڑینگی۔ یہ سوال اصطلاحاً **مسئلہ آبادی** کہلاتا ہے اور معیشت کے ایک مشہور عالم **مالتھس** نے اس سے خاص طور پر بحث کی ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق جدید ترین تحقیقات کا مختصر خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

ہماری اکثر ضروریات براہ راست یا بالواسطہ زمین سے حاصل ہوتی ہیں۔ زمین کی مقدار محدود ہے۔ اور اُس کی پیداآوری قانون تقلیل حاصل کی پابند ہے۔ آدمی سے آدمی پیدا ہوتا ہے اور جس سرعت سے اور جس حد تک آبادی ترقی کر سکتی ہے زمین کی پیداوار کو اُس کا ساتھ دینا دشوار ہے یعنی اندیشہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد آبادی اسقدر بڑھ جائیگی کہ سب کے واسطے زمین کافی ضروریات مہیا نہ کر سکے گی۔ اور اسوقت بڑی دقت کا سامنا ہوگا۔ گذشتہ چار صدی اُنکے نزدیک صرف قدیم براعظم امریکہ آسٹریلیا اور نیز چند نئے جزائر دریافت ہوئے

دوسری طرف ریل اور دخانی جہازوں کی ایجاد کی بدولت دور دراز سفر میں بے حد سہولت ہوگئی۔ قدیم ممالک کے لوگ نئے نئے ملکوں میں جاکر آباد ہونے شروع ہوئے اور اُن ممالک کی پیداوار قدیم ملکوں میں آنے لگی۔ جدید مقامات دریافت ہونے اور دُور اُفتادہ ممالک کے درمیان آمد و رفت کے سہل ذرایع قایم ہونے سے عرصہ کے واسطے آبادی کا مسئلہ حسب دلخواہ طے ہوگیا اور یہ خطرہ کہ آبادی از حد بڑھ جانے کی وجہ سے ضروریات دستیاب ہونی دشوار ہونگی مدت تک پیش نہیں آسکتا۔ لیکن آیندہ نئے نئے ممالک دریافت ہونے کی اب بہت کم امید باقی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جزیرے ملیں تو ملیں ورنہ غالباً امرکیہ یا آسٹریلیا جیسا کوئی بڑا عظم اب نامعلوم نہیں رہا۔ گویا زمین کے رقبہ میں اب کوئی بڑا اضافہ نہوسکیگا ایجادات بھی منتہائے کمال کو پہنچ چکیں اور اگر اُن کا سلسلہ جاری رہا بھی تو جیسا انقلاب دخانی انجن نے کر دکھایا آیندہ ایسا ہونا دشوار ہے پس معلوم ہوتا ہے کہ جو خطرہ اور اندیشہ مسئلہ آبادی میں مضمر ہے یعنی ضروریات دستیاب نہونا وہ صرف ملتوی ہوگیا ہے۔ ہمیشہ کے واسطے رفع نہیں ہوا۔ اور اب نہیں تو ہزار سال بعد اس کا وقوع ممکن ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو مستقبل بعید کے متعلق رائے قائم کرنا اندھیرے میں تیر چلانا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اب سے پانچسو یا ہزار سال دنیا کو کیا کیا صورتیں پیش آئیں گی لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً آبادی کبھی اس قدر نہ بڑھے گی کہ ضروریات ملنے میں دقت ہو افزونی آبادی پر جو خاص خاص کارگر بندشیں قائم ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) دولتمند طبقوں میں بچے کم پیدا ہوتے ہیں۔ غالباً تعیشات کا اثر مضر پڑتا ہے آبادی کے اضافہ میں غربا اور متوسط الحال لوگوں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ دولتمندی پھیلنے سے اضافہ آبادی کی رفتار مدہم ہوجاتی ہے۔

(ب) تعلیم کا حال بھی دولتمندی کا سا ہے۔ دماغی محنت کی کثرت سے نفسانی خواہشات

ضعیف ہو جاتی ہیں۔ اور تعلیم یافتہ فرقہ کی ایک جماعت کو شادی سے رغبت ہی نہیں رہتی اشاعت تعلیم سے بھی افزونی آبادی کی روک تھام ہو رہی ہے۔

(ج) ترقی یافتہ ممالک میں مستورات کو آزادی کی ایسی ہوا لگی ہے کہ وہ بیوی اور ماں کے فرائض سرانجام دینے کے بجائے گھر اور بال بچوں کے جنجال سے بچکر مردوں کی طرح سیاست اور انتظام ممالک میں حصہ لینا چاہتی ہیں۔ تعلیم اور بھی سونے پر سہاگہ کا کام کر رہی ہے۔ ایسی مستورات کی تعداد بڑھ رہی ہے جو شادی کر کے اور دو طرح طرح کی ترکیبوں سے اولاد سے بچی رہتی ہیں۔

(د) معیار زندگی بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے بہت سوں کو کنبہ پالنا دشوار ہے غریب اور ادنی طبقوں کے بچے چھوٹی ہی عمر سے کچھ نہ کچھ کمانے لگتے ہیں اُنکے مصارف نہایت کم ہوتے ہیں اور وہ جلد شادی کر سکتے ہیں لیکن اسکے برعکس خوش حال اور اعلےٰ طبقوں میں بچوں کی پرورش اور اُن کی تعلیم و تربیت پر بہت کچھ صرف کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ وہ جوان ہو کر خود کما نے کھانے کے قابل ہو جاویں۔ اسی وجہ سے آبرو دار فرقے شادی میں دیر کرتے ہیں۔ اور جبتک کنبہ پالنے کی استطاعت نہو وہ اولاد کی ذمہ داری اپنے سر باندھنا نہیں چاہتے۔ نیز جدید طریقوں سے کام لیکر وہ اولاد کی پیدایش بھی حسب دلخواہ محدود کر دیتے ہیں اور بالعموم بڑے کنبے سے بچتے ہیں۔

(س) نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر گر کنبہ پروری کی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے لوگ ناجائز تعلقات سے دل کی ہوس نکالتے ہیں اور ایسے طریق بکثرت رائج ہو رہے ہیں کہ اولاد پیدا نہو۔ اس رواج کا ایک بڑا باعث پردہ داری کی بھی مصلحت ہے۔

(ص) ہر ملک کے طبیب اور ڈاکٹر شاہد ہیں کہ لوگوں میں ایسی عادات بد بکثرت بڑھ

رہی ہیں کہ جن سے قوت مردمی زایل یا ضعیف ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اسکول۔ کالج اور کارخانوں میں جہاں مختلف عمر کے لڑکے یکجا کام کریں ایسی عادات کا بڑا زور ہے بدچلنی کے ہاتھوں ایسے امراض بھی بہ نسبت سابق اب بہت پھیل رہے ہیں جو انسان کو نہ صرف ناکارہ بلکہ زندہ درگور بنا دیتے ہیں اور چونکہ وہ متعدی ہیں بہت سے ناکردہ گناہ اُن کا شکار ہو جاتے ہیں اور آیندہ معصوم نسلیں بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوتی چلی جاتی ہیں ضعف۔ نامردی۔ اور سوزاک و آتشک جیسے امراض خبیثہ ہر طرف شعلۂ آتش کی طرح پھیل رہی ہیں اب تک تو ڈاکٹر لوگ اظہار حقیقت سے شرماتے تھے۔ لیکن اب تنگ آکر اُنھوں نے موجودہ شرمناک حالت کا اعلان شروع کر دیا ہے اور حال ہی میں اکثر ممالک کے متعلق چند مستند رپوٹیں شایع ہوئی ہیں۔ جن کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اگر کچھ روز اور غفلت برتی گئی تو ان عادات ملعونہ اور امراض خبیثہ کی آتش جہاں سوز نسل انسان کو جھلس کر کام تمام کر دے گی۔

مذکورہ بالا اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ پیدایش اولاد کی رفتار یورپ اور امریکہ میں روز بروز سست ہوتی جاتی ہے خصوصاً فرانس کی حالت تو اسقدر نازک ہو گئی ہے کہ وہاں آبادی بڑھانے کی خاص تجاویز پر غور ہو رہا ہے اور یہ کوئی خیالی بات نہیں بلکہ اعداد و شمار اُس پر شاہد ہیں۔

(ص) کون ایسی مبارک صدی گذری ہے جس میں دو چار جنگ نہ ہوئی ہوں اور تیر کمان چھوڑ۔ تلوار۔ بندوق کے زمانہ تک بھی لڑائی میں لوگ مقابلۃً بہت ضایع ہوتے تھے لیکن خدا سائنس کا بھلا کرے۔ جب سے مشین گن۔ ہاوٹزر اور بمب ایجاد ہوئے۔ میدان میں سپاہی یوں گرتے ہیں جیسے کہ غلہ کے

کھیت کٹتے ہیں۔ پھر آتش باری اور فاقوں سے بے شمار عوام الگ برباد ہوتے ہیں۔ موجودہ جنگ میں ضایع شدہ اور مجروح سپاہیوں کی مقدار ایک کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے اور فوجوں کی بھرتی برابر جاری ہے۔ تسخیر شدہ اور مفتوحہ مقامات میں جس قدر عوام تباہ ہوئے ہوں گے اُن کا کوئی حساب نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ جنگ میں سب سے بڑی مقدار توانا تندرست نوجوانوں کی کام آتی ہے۔ بچے بڈھے اور بیوہ عورتیں بچیں بھی تو کیا۔ جنگوں میں جو آبادی سے تخفیف ہوتی رہتی ہے اور اُس کے آیندہ اضافہ میں جسقدر ہرج ہوتا ہے اظہر من الشمس ہے۔

(ط) وبائیں امراض زلزلے اور طوفان اور حادثات۔ غرضیکہ چند در چند کارکُن قدرت کی طرف سے موجود ہیں جو آبادی کی اسی طرح کاٹ چھانٹ کرتے رہتے ہیں جیسے کہ مالی درختوں کو قلم کرتا ہے اور یہ عاملین اجل ایسے زبردست ہیں کہ انسان کا ان کے سامنے کچھ بس نہیں چلتا اور وہ انسان کو یوں پکڑے جاتے ہیں جیسے کہ چوہے کو بلّی دبوچتی ہے۔

(ع) انسان کی عمر طبعی گھٹ رہی ہے اور بہ نسبت سابق وہ جلد رخصت ہو کر دوسروں کے واسطے دنیا میں جگہہ خالی کر دیتا ہے۔ پس واضح ہوا کہ آبادی حد سے زیادہ بڑھنے اور ضروریات کے میسر نہ آنے کا خدشہ خلاف قرائن ہے جو خدا پیدا کرتا ہے وہ ہی سب کی ضروریات کا کفیل ہے۔

علم المعیشت کا بیان ختم ہوتا ہے اب صرف آخری نکتہ جتانا باقی ہے کہ اگر کل پہلوؤں پر غور کر کے بنی نوع انسان اپنے زندگی کے واسطے بہترین معاشی اصول دریافت کرنا چاہے تو اُس کی ہدایت کے واسطے اللہ

جل شانہ نے دریائے حکمت کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ قرآن پاک میں معاشی زندگی کے متعلق بہت سی ہدایتیں موجود ہیں اور صدہا سال کا تجربہ بھی آج انہیں ہدایات کا مؤید نظر آتا ہے۔ ہم صرف ایک آیت شریفہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہو ہذا۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

حصۂ چہارم

Exchange of Wealth — مبادلۂ دولت

حصۂ پنجم

THE END

ضمیمہ سوم

خلاصہ مباحث

بزبان اُردو و انگریزي

حصہ اول

1. **Introduction** — (۱) مقدمہ

حصہ دوم

Production of Wealth — پیدائش دولت

Meaning of Production — (۱) باب اول- پیدائش کا مفہوم
Agents of Production — (۲) باب دوم - عاملس پیدائش

Explanation of the agents of Production — (۱) فصل اول- عاملس پیدائش کي تفصیل
Land — (۲) فصل دوم - زمین
Labour — (۳) فصل سوم - محنت
Capital — (۴) فصل چهارم - اصل

Mode of Production — (۳) باب سوم - طریق پیدائش

حصہ سوم

Distribution of Wealth — تقسیم دولت

The sharers of Wealth — (۱) باب اول - دولت کے حصہ‌دار
Rent — (۲) باب دوم - لگان
Wages — (۳) باب سوم - اجرت

Laws of Wages — (۱) فصل اول - قوانین اجرت
Explanation of Wages — (۲) فصل دوم - شرح اجرت
The Progress of Labourers — (۳) فصل سوم - ترقیات مزدوران

(63) Hirst · Stock Exchange
(64) Clare Money Market Primer.
(65) Bagehot Lombard Street
(66) Fisk The Modern Bank
(67) Cannon Clearing Houses.

XIII —INTERNATIONAL TRADE —

(68) Bastable International Trade
(69) Hobson International Trade
(70) Marshall Memorandum on the Fiscal Policy of International Trade

XIV —FREE TRADE —

(71) Avebury Free Trade
(72) Summer Protectionism
(73) Bastiate Sophism of Protection

XV —PROTECTION OF TRADE —

(74) List The National System of Political Economy
(75) Patten Economic Basis of Protection
(76) Thomson Protection to Home Industry

XVI,—FORIEGN EXCHANGES —

(77) Goschens Theory of Exchanges
(78) Clare A B C of Foreign Exchanges
(79) Clare Money Market Primer.
(80) Hirst Stock Exchange

VIII —Socialism —

(42) Kirkup History of Socialism
(43) John Rae Contemporary Socialism
(44) Leveleye Socialism of Today
(45) Menger Right to the Whole Produce of Labour
(46) Graham Socialism
(47) Ely Socialism and Social Reform

IX —Taxation —

(48) Saligman Essays in Taxation
(49) Bastable Public Finance
(50) Armitage Smith Principles and Methods of Taxation

X —Value and Price —

(51) Smart, Introduction to the Theory of Value
(52) Price Short History of Prices
(53) Fisher and Brown Purchasing Power of Money

XI —Money —

(54) Carlile The Evolution of Money
(55) Jevons Money
(56) Kinley Money
(57) Del Mar The Science of Money
(58) Laughlin Principles of Money
(59) Withers Meaning of Money

XII —Banking —

(60) Macleod. Elements of Banking
(61) do Theory and Practice of Banking
(62) Taylor Credit System

(17) Flux Economic Principles
(18) Marshall Principles of Economics

IV —Distribution of Wealth —

(19) Carver The Distribution of Wealth
(20) Clark The Distribution of Wealth
(21) Commons The Distribution of Wealth.
(22) Smart The Distribution of Income
(23) Hobson Economics of Distribution

V —Land and Rent —

(24) Walker Land and its Rent
(25) Wallace Land Nationalisation
(26) Nicholson Tenant's gain, Landlord's loss.

VI —Labour and Wages —

(27) Walker Wages Question.
(28) Moore Laws of Wages
(29) Smith , Labour and Capital
(30) Booth Life and Labour in London.
(31) Henry George Condition of Labour
(32) Pigou Unemployment.
(33) Gilman Profit sharing
(34) Gilman Methods of Industrial Peace
(35) Well Industrial Democracy

VII —Capital and Interest —

(36) Karl Marx Capital
(37) Hobson The Evolution of Capitalism.
(38) Bohm-Bawerk Capital and Interest
(39) Cassel Nature and Necessity of Interest
(40) Fisher Nature of Capital and Income
(41) Blissard The Ethics of Usury and Interest

ضمیمہ دوم

علم المعیشت کی مستند انگریزی تصانیف کی مختصر فہرست جن میں سے بعض موجودہ کتاب کی تیاری میں بھی کم و بیش کام آئیں

I —Introduction —

(1) Jevons Primer of Political Economy
(2) Wood Primer of Political Economy
(3) Cannon Elementary Political Economy
(4) Walker Elementary course in Political Economy
(5) Ely and Wicker Elementary Economics
(6) Bullock An Introduction to the Study of Economics
(7) Clay Economics for the General Reader.

II.—Elementary Principles —

(8) Fawcett Manual of Political Economy
(9) Walker Political Economy
(10) Gide Principles of Political Economy.
(11) Roscher Principles of Political Economy

III.—Advanced Principles —

(12) Adam Smith Wealth of Nations
(13) Mill Principles of Political Economy
(14) Sidgwick Principles of Political Economy.
(15) Nicholson Principles of Political Economy.
(16) Seager Introduction to Economics

Wage Fund Theory	مسئلہ اجرت فنڈ
Want	احتیاج
Warren Hastings	وارن ہیسٹنگس
Washington, President	پریزیڈنٹ واشنگٹن
Waterloo, battle of	جنگ واٹرلو
Wealth	دولت
Wellesly, Lord	لارڈ ولزلی
Wholesale	تھوک فروشی
William Bentinck, Lord	لارڈ ولیم بینٹنک
Willian Meyer, Sir	سر ولیم میئر
William Pitt	ولیم پٹ
Wilson, H H	ولسن
Wilson, President	پریزیڈنٹ ولسن
Woolfe, General	جنرل وولف

Z.

Zamoren	زمورن

Telegraphic transfer	ارسالات تار برقی
Theory	مسئله
Theoretical Economics	معیشت اصولی
Thomas Cook and Sons	تامس کک اینڈ سنس
Thomas Munro, Sir	سر تامس منرو
Till Money	گلّه
Time wages	اجرت مختص بالزمان
Token Money	زر وضعی
Total cost	مصارف کلی
Total Produce	پیداوار کلی
Trades Unions	انجمن اتحاد مزدوران
Tram Car	ٹرام کار
Transferable	منقوله
Transvaal	ٹرانسوال

U.

Unearned increment	ماحصل غیر مکتسب
Unfavourable Exchange	مبادله ناموافق
Uniformity of price	مساوات قیمت
United East India Company	متحده ایسٹ انڈیا کمپنی
United States of America	ریاست هائے متحده امریکه
Uuproductive Labour	محنت بے ثمر
Unskilled Labour	محنت بے مهارت
Utility	افاده
— Curve	خط افاده

V.

Value	قدر
Vas-co-de Gama	واسکوڈی گاما
Vertical movement	حرکت عمودی

W.

Wages	اجرت

Speculation	تخمین
Stability of value	ثبات قدر
Standard of life	معیار زندگی
Standard of value	معیار قدر
Standard Money	زر مستند
State Revenne	محاصل سرکاری
State Socialism	اشتراک سرکاری
Statistics	استے تس تکس
Strike	اسٹرائک
St David	سینٹ ڈیوڈ
Subject of tax	مورد تکس
Subsidiary Industries	صنائع ضمیمی
Substitution, principle of	اصول بدل
Supply	رسد
— price	قیمت رسد
Supplementary Industries	صنائع ضمیمی
— earnings	اجرت ضمیمی
Surplus Value, theory of	مسئلہ قدر زائد
Survival of the fittest	بقائے اصلح
Sweden	سویڈن
Switzerland	سوئٹزر لینڈ

T.

Tax	تکس - محصول
— Direct	تکس بلا واسطہ
— Indirect	تکس بالواسطہ
— Beneficial	فیض رساں تکس
— Onerous	بے فیض تکس
— Progressive	تکس مترائد
— Proportionate	تکس متناسب
— Subject of	مورد تکس
— Incidence of	تعدیہ تکس
Technical Education	تکنیکل (صنعتی) تعلیم

Revolutionary Socialism	اسراک انقلابي
Right of coinage	حق الصرف
Risk	خطرہ
— Charges	مطالبات خطر
Romesh Chander Dutt	رومیش چندر دت

S.

Sale	فروخت
Salisbury, Lord	لارڈ سالس بري
Satiable	تسکین پذیر
Savings	اندوختہ
Saving Bank	سیونگ بنک
Scarcity	قلت
— Rent	لگان قلت
Scope	وسعت
Services	خدمات
Shareholders	حصہ دار
Siberia	سائبریا
Single tax system	طریق تیکس مفرد
Site	موقع
— Value	قدر موقع
Skill	مہارت
Skilled Labur	محنت بامہارت
Socialism	اشتراک یا سوسیلزم
— Evolutionary	اشتراک ارتقائي
— Revolutionary	اشتراک انقلابي
— State	اسراک سرکاري
Sociology	علم تمدن
Social Philosophy	فلسفہ تمدن
Specialisation, Princip of	أصول تخصیص
Specialised skill	مہارت تخصیص طلب
Specie points	معاملات زر

Promissory Note	پرامیسری نوٹ
Proportionate tax	ٹیکس متناسب
Prospectiveness	انتظار شئی
Protection of trade	تامین تجارت
Protection Duty	محصول تامین
Public Debt	قرض عامه
Public Services	خدمات عامه
Pulicat	پلی کٹ

Q

Quantitative Theory of Money	مسئله مقدار زر
Quasi Rent	مثل لگان
Quebeck, battle of	جنگ کوئبے بک

R.

Radium	ریڈیم
Rarity	ندرت
Rate	نرخ - شرح
— of Exchange	شرح مبادله
Raw material	پیداوار خام
Real Wages	اجرت صحیحه
Relative Value	قدر اضافی
Rent	لگان
Representative Firm	کارخانه معیاری
— Paper Money	نیابتی زر کاغذی
Reserve	سرمایه محفوظ
— Fund	اندوخته
Restricted coinage	مخصوص سکه سازی
Retail Sale	خرده فروشی
Return	حاصل
Revenue	مالگذاری
— Duty	محصول مال

Plassey, Battle of	جنگ پلاسی
Political Economy	علم المعیشت (تدبیر مدن)
Pondicherry	پانڈیچری
Population	آبادی
Portability	نقل پذیری
Portugal	پرتگال
Portuguese	پرتگیز
Positive Science	علم التحقیق
Postulates	مسلمات
Practical Economics	معیشت عملی
Preface	تمہید
Premium	بڑھوتری
Price	قیمت
— Average	قیمت متوسط
— Demand	قیمت طلب
— Market	بازاری قیمت
— Normal	معمولی قیمت
— Supply	قیمت رسد
Prime Costs	مصارف مقدم
Private Property	انفرادی املاک
Produce or Product	پیدا وار
Productivity	پیدا آوری
Production	پیدائش
— on large scale	پیدائش بر پیمانہ کبیر
— on small scale	پیدائش بر پیمانہ صغیر
Productive	پیدا آور
— Labour	محنت بار آور
— Duty	محصول مال
Profits	منافع
— Gross	منافع خام
— Net	منافع خالص
Progress	ترقی
Progressive tax	ٹیکس متزاید

— Profits	منافع خالص
Nitrogen	نائٹروجن
Nominal	متعارف
— Value	قدر متعارف
— Wages	اجرت متعارف
Non Occupancy Tenant	کاشتکار غیر دخیلکار
Normal Price	معمولی قیمت
Normative Science	علم الہدایت
No Rent Land	زمین بے لگان
Northbrook, Lord	لارڈ نارتھ بروک
Note	نوٹ

O.

Occupation	پیشہ
Occupancy Tenant	موروثی کاشتکار
Onerous Tax	بے فیض ٹیکس
Organisation	تنظیم

P.

Palladium	پلیڈیم
Paper Currency	زر کاغذی
— Reserve	سرمایہ محفوظ زر کاغذی
Par Value	قیمت مساوات
Parity of Exchange	مساوات مبادلہ
Park	پارک
Partners	شرکاء
Patent Letters	سند ایجاد
Physiocrats	حکماء مدوکیین
Ppysiocratic System	طریق دوکل
Piece Work Wages	اجرت مختص بالعمل
Pitt, W	پٹ
Place Value	قدر مختص بالمکان

Mercantilists	مستبدین
Mercantile System	طریق استبداد
Metallic Money	زر فلزاتی
— Value	قدر فلزاتی
Method	طریق
Mexico	مکزیکو
Mill, J S	مل
Mine	کان
Mint	دار الضرب
Mobile	نقل پذیر
Mobility	نقل پذیری
Money	زر
— Metallic	زر فلزاتی
— Paper	زر کاغذی
— Standard	زر مستند
— Token	زر وضعی
— Quotations	نرخ نامہ زر
Monopoly	اجارہ
— Revenue	ماحصل اجارہ
Monopolist	اجارہ دار
Montagomery Martin	مونٹگمری مارٹن
Multiple Tax System	طریق ٹیکس مرکب

N.

Napoleon	نپولین
Nature	قدرت
Natural	قدرتی
National Wealth	قومی دولت
Necessaries	ضروریات
Negative Services	خدمات منفی
Net	خالص
— Earnings	اجرت خالص
— Interest	سود خالص

Law — قانون
—of gravitation — قانون کشش مرکزی
Legal Tender — زر قانونی
—Limited — محدود زر قانونی
Legal Value — قدر قانونی
Leroy-Beaulieu — لیرائے بیولو
Liberal Education — لبرل یا غیر صنعتی تعلیم
Limited Legal Tender — محدود زر قانونی
Loan at call — قرض عندالطلب
Loan at short notice — قرض اطلاع قریب
Localisation of Industries — تحصیر صنائع
Long Bill — میعادی هنڈی
Luxuries — تعیشات

M

Machine — مشین-کل
Mahe — ماهی
Manager — منیجر
Management — تنظیم
Manufactures — مصنوعات
Marginal — مختتم
— Cost — مصارف مختتم
— Dose — جرعه مختتم
— Produce — حاصل مختتم
— Productivty — پیدا آوری مختتم
— Utility — افاده مختتم
Margin of Cultivation — اختتام کاشت
Market — بازار
— Price — بازاری قیمت
Marshall, Prof — پروفیسر مارشل
Maximum Satisfaction — افاده اتم
Means of Subsistence — وجه معاش
Medium of Exchange — آله مبادله

—Subsidiary	صنائع تصیبی
—Supplementary	صنائع تصمیمی
Insatiable wants	احتیاجات غیر تسکین پذیر
Insurance	بیمه یا ضمانت
—Form	پروانه ضمانت
Intensive cultivation	کاشت عمیق
Interest	سود
Internal Economics	کفایات داخلی
International Trade	تجارت بین الاقوام
—Wealth	بین الاقوامی دولت
Intrinsic value	قدر ذاتی
Introduction	مقدمه
Inverse proportion	نسبت معکوس
Investment of capital	شغل اصل

J.

James	جیمس
John Malcolm, Sir	سرجان ملکم
John Stuart Mill	جان استوارت مل
Joint demand	طلب مشترک
Joint supply	رسد مشترک
Joint stock company	کارخانه سرمایه مشترک
Justice	عدل

K.

King King & Co	کنگ کنگ ایند کو

L.

Labour	محنت
Labourer	مزدور
Laisser Faeru	اصول غیر مداخلت
Land	زمین

Goods	مال سامان
Grindley & Co	گرنڈلے اینڈ کو
Gross earnings	اجرت خام
—Intrest	سود خام
—Profits	منافع خام
Guernsey	گرنسی

H.

Hansa	هنسا
Henry St. George Tucker	هنری سینٹ جارج تکر
Holland	ها لینڈ
Home Charges	مطالبات وطن (انگلستان)
Homogeneity	یک جنسی
Honour a bill	هنڈی پٹانا
Horizontal movement	حرکت افقی
House Tax	هاؤس تکس
Hume	هیوم
Hoypothesises	مسلمات

I

Import	در آمد
Incidence of taxation	تعدیه محصول یا تکس
Income tax	انکم تکس
Inconvertible Paper Money	غیر بدل پذیر زر کاغذی
Increasing Return, Law of	قانون تکثیر حاصل
Increasing Utility, Law of	قانون تکثیر افاده
Indestructibility	بے زوالی
Index Number	انڈکس نمبر
Indirect tax	تکس بالواسطه
Individual wealth	شخصی دولت
Industry	صنعت و حرفت
—Complementary	صنائع تضمینی

Exclusive ownership	تملیک کلی
Expense of Production	پیدائش کی لاگت
Exploitation theory	مسئلہ غصب
Export	برآمد
Extension of demand	کشائش طلب
Extension of supply	کشائش رسد
Extensive cultivation	کاشت وسیع
External Economics	کمایات خارجی

F.

Factory	فکٹری - کارخانہ
Factors of Production	عاملین پیدائش
Family Earnings	اجرت خاندانی
Favourable Exchange	مبادلہ موافق
Fertility	زرخیزی
Fiduciary Paper Money	اعتباری زر کاغذی
Finance	مالیات
Fixed Capital	اصل قایم
Fixed proportion	نسبت مستقیم
Foreign Exchanges	مبادلات خارجہ
Foreign Trade	تجارت خارجہ
Fort William	فورٹ ولیم
France	فرانس
Francis Buchanan, Dr	ڈاکٹر فرانسس بوچانن
Fredrick the great	فریڈرک اعظم
Free coinage	آزاد سکہ سازی
Free competition	آزاد مقابلہ
Free Trade	آزاد تجارت
Functions of money	زر کے کام

G

Germany	جرمنی

E.

Earnings	اجرت
— of management	اجرت تنظیم
East India Company	ایسٹ انڈیا کمپنی
Economics	اکنامکس- علم المعیشت
Economy	کفایت
Economic activity	معاشی جد و جہد
Economic Art	فن معاشي
Edward	ادورڈ
Efficiency	کارکردگي
— Wages	اجرت مختص بہ کارکردگي
Efficient demand	طلب کامل
Elasticity	تغیر پذیري
— of demand	تغیر پذیري طلب
Elgin, Lord	لارڈ الجن
Elizabeth, Queen	ملکہ الزبتھ
Employer	آجر
Endorsement	توقیع
Engine	انجن
Equality of sacrifice	مساوات ایثار
Equilibrium	توازن
— point	مقام توازن
— price	قیمت متوازن
Evolutionery Socialism	اشتراک ارتقائي
Exchange	مبادلہ
— Above par	مبادلہ فوق مساوات
— At par	مبادلہ مساوات
— Below par	مبادلہ تحت مساوات
— Favourable	مبادلہ موافق
— Unfavourable	مبادلہ ناموافق
Exchangibility	استبدال
Excise	محصول ملکی پیداوار

Debit and Credit	داد و ستد
Deduction	استخراج
Definiteness	تعین
Definition	تعریف
Demand	طلب
Denmark	ڈنمارک
Deposit	جمع کرنا
Depositor	جمع کنندہ
Deposit account	مد امانت
Depreciation charges	مطالبات فرسودگي
Difference of Exchange	پهروا
Diminishing point	مقام تعلیل
Diminishing Return, Law of	قانون تعلیل حاصل
Diminishing Utility, Law of	قانون تعلیل افادہ
Direct	بلا واسطه
— tax	ٹکس بلا واسطه
Discount	بٹه یا بٹه کاٹنا
Dishonour a bill	هنڈي لوٹانا
Distribution	تقسیم
Divisibility	سهم پذیري
Division of Labour	تقسیم عمل
Domestic	خانگي
— Economy	تدبیر منزل
Dose	جرعه
— Marginal	جرعه منتهم
Draft	چٹهي
Draw a bill	هنڈي لکهنا
Drawee	لینے والا
Drawer	لکهنے والا
Dr Francis Buchanan	ڈاکٹر فرانسس بوچنان
Duch	ڈچ
Dutt, R. C.	رومیش چندر دت

Complementary Industries	صنائع تصمیدی
Composite demand	طلب مرتب
Composite supply	رسد مرتب
Constant Return, Law of	قانون استمرار حاصل
Consumption	صرف
Consumer's surplus	نفع المصرف
Contraction of demand	تسب طلب
Contraction of supply	قسب رسد
Convenience	سہولت
Conventional Paper Money	رسمي زر کاغذي
Covertible Paper Money	بدل پذیر زر کاغذي
Co-operation	امداد باهمي
Co-operative Society	انجمن امداد باهمي
Cost	مصارف
— of Production	مصارف پیدائش
Countervailing Duty	محصول مساوان
Cox, Mr	مسٹر کا٘س
Credit	اعتبار
— bill	اعتباري هنڈي
Cuba	کیوبا
Cultivation	کاشت
— Extensive	کاشت وسیع
— intensive	کاشت عمیق
Currency	زر
Current account	مدروان
Customers	گاهک
Customs Duties	محصول در آمد و برآمد

D.

Dam laput	دمدپت
Days of grace	رعایتي دن
Debenture	ڈبنچر

Capability of being owned	استملاک
Capital	اصل
— Circulating	اصل دائر
— Fixed	اصل قائم
Capitalist	اصل دار
Cash a bill	هنڈي بھنانا
Cash in hand	نقد بدست
Certificate	سرٹیفکٹ - پروانہ
Chandernager	چندر نگر
Change	تغیر
Charges	مطالبات
— Depreciation	مطالبات فرسودگی
— Insurance	مطالبات ضمانت
— Risk	مطالبات خطر
Charles	چارلس
Cheque	چک
— payable to bearer	دهنی جوگ
— payable to named person	نام جوگ
Chinsura	چنسورا
Circulation	اجرا - گردش
Circulating capital	اصل دائر
Clearing House	حساب گھر
Clive, Lord	لارڈ کلائو
Cochin	کوچن
Coin	سکہ
Coined money	زر مسکوک
Cognate Sciences	علوم متجانسہ
Cognisability	شناخت پذیري
Columbus	کولمبس
Commission	کمیشن - دستوري
Comparative cost, Law of	قانون موازنہ مصارف
Compensation	تلافي
Competition	مقابلہ

— of account	توازن حسابات
— of debit and credit	توازن داد و ستد
— of import and export	توازن در آمد و بر آمد
— sheet	چتها
— of trade	توازن تجارت
Bank	بنک
— draft	بنک کي چتهي
— of England	انگلستان بنک
Barter	مبادله
Below par	تحت مساوات
Beneficial tax	تکس فیضرساں
Bill after date	هنڈي بعد تحریر
— after sight	هنڈي بعد قبولیت
— at sight	درشني هنڈي
— on demand	عند الطلب هنڈي
— Long	میعادي هنڈي
Bill broker	هنڈي دلال
Bill of credit	اعتباري هنڈي
Bill holder	هنڈي رکھنے والا
Bill of Exchange	هنڈي
Bill of Lading	حواله نامه
Blank bill	ساده هنڈي
Bohm-Bawerk, Prof.	پروفیسر بام باورک
Boiler	بائلر
Bond	موثق - رقعه
Bounty	سرکاري امداد
Brazil	برازل
Brougham, Lord	لارڈ بروگہم
Business	کار و بار

C.

California	کلي فورنیا
Canada	کناڈا

ضمیمہ اول

مکمل فہرست انگریزي و اُردو مرادف اصطلاحات وغیرہ مندرجہ کتاب علم المعیشت

A.

Above par	فوق مساوات
Abstinence Theory	مسئلہ احتیاط
Acceptance	قبولیت
Accept a bill	ہنڈي قبولنا
Acceptability	مقبولیت
Acceptor	قبولنے والا
Agents of Prduction	عاملین پیدایش
Agriculture	زراعت
Agricultural	زراعتی – زرعيْ
Aluminium	الومینیم
Amount	مقدار
Analysis	تجزیہ
Applied Economics	معیشت عملی
Art	فن
Art of Economics	فن معیشت
At par	مساوات
Austria	آسٹریا
Australia	آسٹریلیا
Average	اوسط – متوسط
Average price	قیمت متوسط

B.

[illegible]